نگار

قیمت فی کاپی ۸عہ

"نگار" بک ایجنسی لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار" بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصۂ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز (حصۂ دوم)

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب نقادی حیثیت رکھتے ہیں وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہے انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے رنگینی تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اسکی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی (یا)

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب (سہ جلد)

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۲ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے

قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول

جملہ حقوق نقل و اقتباس، اخذ و التقاط
بہ حق نگار بک ایجنسی محفوظ ہیں

ماجدولین

ترجمہ : حکیم رشید احمد معتصم بریلوی

اصلاح و ترمیم : نیاز فتحپوری

"ماجدولین" یا "زیرِ سایۂ زیز فون" فرانس کے
بےمثال ادیب "الفونس کار" کا ایک شاہکار ہے، جسے
مصر کے ادیب شہیر "مصطفیٰ لطفی المنفلوطی" نے
عربی دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا — یہی
عربی ترجمہ اس اُردو ترجمہ کا ماخذ ہے۔

ماجدولین کی طرف سے سوزان کے نام

خواہ تم میرے اس خط کو پڑھو یا پھاڑ کر پھینکدو، اس میں تمھیں ایسی کوئی چیز نہ ملے گی جو تمھاری توجہ اپنی طرف جذب کرسکے یا تمھاری معلومات میں کسی اضافہ کا باعث ہو۔

میں تمھیں کونسی نئی خبر سناؤں بجز اس کے کہ موسم گل کے آتے ہی پیڑوں نے ہنس ہنس کر پھولوں سے جھولیاں بھرلی ہیں اور نسیم بہار اس وقت بھی جبکہ میں تمھیں اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی یہ خط لکھ رہی ہوں، بنفشہ اور یاسمن کی خوشبوؤں میں ڈوبی ہوئی آتی ہے اور میرے دل و دماغ کو معطر کرجاتی ہے۔

ہرچند مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ میرے نزدیک ان باتوں کا کوئی مفہوم ہے تاہم میں تمھیں ایک خبر سناتی ہوں۔ ہمارے مکان کے بالاخانہ پر جو کمرہ خالی تھا، حال ہی میں استیفن نامی ایک نوجوان اُس میں آکر ٹھہرا ہے۔ اُس کی وحشت اور اُس کے انقباض کا عجیب عالم ہے اگر تم اسے دیکھو تو خیال کرو کہ وہ کوئی بڑا ہی بدنصیب اور مصیبت زدہ شخص ہے۔

وہ روز صبح کو اپنے ہاتھ میں ایک کتاب لئے ہوئے بالاخانہ سے اُتر کر باغ میں آتا ہے، کتاب کھولکر بیٹھ جاتا ہے اور جس راہ پر اس کی نگاہ جا پڑتی ہے اسی پر اپنی نگاہیں جمالیتا ہے اور میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ زمین ہی کو تکتا رہتا ہے گو دیکھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ وہ کچھ پڑھ رہا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے سامنے سے مجھے گزرتا ہوا دیکھتا ہے تو سر اُٹھاکر مجھے دیکھنے لگتا ہے، ایک مختصر سا سلام کرتا ہے اور پھر اپنی جگہ سے ہٹ کر یا تو درختوں میں غائب ہوجاتا ہے یا اپنے بالاخانہ پر چڑھ جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرے اور اسکے درمیان آج تک کسی قسم کا کوئی ربط پیدا نہیں ہوسکا اور نہ شاید آئندہ ہوسکے، کیونکہ نہ میں اس بات کی متمنی ہوں اور نہ غالباً وہ اس کا خواہشمند ہے۔

بہت ممکن ہے تم بھی مجھسے وہی سوال کرنے لگو جو عام طور سے عورتیں اس موقعہ پر کیا کرتی ہیں، تو میں تمھیں بتائے دیتی ہوں کہ یہ نوجوان کچھ خوبصورت نہیں ہے اور نہ اپنے اندر کوئی خاص کشش رکھتا ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہ سکتی ہوں کہ اس کے چہرہ میں ایک طرح کی خشونت و سختی ہے جو دیکھنے والے کی نظر کو متنفر کرسکتی ہے، لیکن ہاں اس میں ایک خوبی بھی ہے۔ ایک رات جبکہ میرے کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا، میں نے اسے بہت ہی پُر درد لہجہ میں گاتے ہوئے سُنا، ہوسکتا ہے کہ اس کا گانا اُصولِ موسیقی پر پورا

نہ اُترتا ہو اور ماہرینِ فن کی نگاہوں میں پسندیدہ نہ ہو، تاہم وہ ایک غم نصیب دل اور ایک مجروح سینہ کو تڑپا دینے والا ضرور تھا۔

میرے والد کو کچھ دیر اس کے پاس بیٹھنے کا موقعہ ملا ہے، کہتے تھے کہ وہ بڑا ہوشیار نوجوان ہے۔

اے سوزان میرا خیال ہے کہ میں ایک غیر متعلق شخص کا ذکر چھیڑ کر جس کا مجھ سے اور تم سے کوئی تعلق نہیں یقیناً تمھارے لئے باعث کلفت ہوئی ہوں گی، لیکن تم مجھ پر ناراض نہ ہونا کیونکہ ایک لڑکی جو چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہو، تصویروں اور بتوں کی طرح خاموش زندگی گزارتی ہو، جس کے صبح و شام اور رات دن میں کوئی فرق نہ ہو، اور جہاں سورج نہ کبھی کسی نئی چیز پر نکلتا ہو اور نہ کسی عجیب چیز پر ڈوبتا ہو، اس کے علاوہ اور لکھ بھی کیا سکتی ہے۔

"ماجد ولین کا خط سوزان کے نام"

موسم کتنا خوشگوار اور آسمان کسقدر شفاف ہے، زمین گل بوٹے کھلا رہی ہے، درختوں کے ہرے ہرے چمکدار پتے نکھر رہے ہیں اور ہلکی ہلکی ہوائیں جسم سے مس ہو کر عجیب پُر لطف کیفیت پیدا کر رہی ہیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں میرے لئے بے حقیقت ہیں اور میری زندگی پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

میں محسوس کرتی ہوں کہ میری زندگی بالکل تاریک ہے اور یہ دنیا اپنی وسعتوں اور پہنائیوں کے باوجود میرے لئے گوشۂ قبر سے زیادہ نہیں، میں نہیں کہہ سکتی کہ دُنیا کدھر جا رہی ہے۔ جو کچھ میں دیکھتی ہوں سمجھ نہیں سکتی اور جو سمجھتی ہوں وہ بیان نہیں کر سکتی۔ کچھ عجیب وحشت ہے، عجیب بےچینی ہے، کسی پہلو آرام نہیں، جب گھر سے گھبرا جاتی ہوں تو باغ میں نکل جاتی ہوں اور جب وہاں بھی چین نہیں ملتا تو پھر گھر میں چلی آتی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے میں کسی چیز کو ڈھونڈ رہی ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی ہی گمشدہ روح کی تلاش میں ہوں لیکن نہیں پاتی، بس جب تھک جاتی ہوں تو زیتون کے درختوں کے سائے میں ذرا دم لینے کے لئے بیٹھ جاتی ہوں اور جوں ہی میری نگاہ کسی ایسے پھول پر پڑتی ہے جو مجھے زیادہ محبوب ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا میں آہستہ آہستہ اس مادی دنیا سے کسی خیالی مگر خوبصورت دنیا کی طرف منتقل ہو رہی ہوں اور ایک ایسے بلند پرواز طائر کی طرح جو بادلوں کی وسعتوں میں اُڑا چلا جا رہا ہو، اس خیالی دُنیا میں مصروف پرواز ہو جاتی ہوں اور گھنٹوں اسی حالت میں کھوئی رہتی ہوں اور جب تک کہ کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر نہیں پڑتی مجھے اپنی اس کیفیت کا احساس بھی نہیں ہوتا اور جب مجھے ہوش آتا ہے تو دیکھتی ہوں

ہوں کہ میری نگاہ اُسی پھول پر جمی ہوئی ہے جس پر پڑی تھی۔

کہتے ہیں کہ موسم بہار محبت کا زمانہ ہے، جس میں عشق و محبت کے سوئے ہوئے جذبات جاگ اُٹھتے ہیں، روحوں سے روحیں مانوس ہو جاتی ہیں اور دلوں سے دل قریب آجاتے ہیں۔ سبزہ زار اور باغ مختلف قسم کے پرندوں سے بھر جاتے ہیں۔ جو درختوں اور پھولوں کی شاخوں پر بیٹھ کر چہچہانے لگتے ہیں، لوگ ٹولیاں بنا بنا کر نکلتے ہیں اور درختوں کے نیچے گلگشت کرتے ہیں، لیکن اے سوزان مجھے تو ان میں سے ایک چیز بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ میرے نزدیک تو زندگی کی بہترین ساعت وہ ہے جب میں خود اپنے آپ سے ہمکلام ہوں، اپنے ہی دل سے اپنی غم آلود سرگوشیوں میں مصروف ہوں اور دوسرا شخص کوئی نہ ہو۔ میں خود ہی رو رو کر اپنے آتشکدہ دل کو ٹھنڈا کروں اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

اس سے بڑھکر عجیب بات یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیوں اور کس لئے روتی ہوں۔ غم و اندوہ کی جو چنگاریاں میرے سینہ میں سلگ رہی ہیں معلوم نہیں کس انگارے سے پیدا ہوئی ہیں۔ مجھے اپنی یہ حالت دیکھ کر بعض وقت خیال ہوتا ہے کہ شاید میں پاگل ہوں اور میرا یہ خوف و اضطراب روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں اپنے رنج و غم کے اسباب معلوم ہوں، کیونکہ ان کے پاس زندگی کے لئے کم از کم ایک سہارا تو ہے، وہ کوئی آرزو تو رکھتے ہیں، جس کی روشنی سے وہ اپنے مستقبل کو روشن کر سکیں۔ لیکن کس قدر بدقسمت اور کم نصیب ہوں میں کہ مجھے نہ اپنا درد معلوم ہے اور نہ اس کی دوا۔

یوں تو تمام اسباب راحت میرے لئے مہیا ہیں۔ اور میرے والد کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ وہ مجھے خوش نصیب اور ہنستا ہوا دیکھیں اور انکے لئے اس دنیا میں اس سے زیادہ دلخوش کُن بات کوئی نہیں کہ وہ مجھے مسکراتا اور اپنے باغ کے پھولوں کو کھلتا ہوا دیکھیں، بلکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میری ناز برداری اور دلجوئی نے انھیں پھولوں جیسی عزیز چیز سے بھی بے نیاز بنا دیا پھر میری انتہائی ناشکر گزاری اور ناسپاسی ہوگی اگر اس تمام سامان راحت کے ہوتے ہوئے حرف شکایت زبان پر لاؤں لیکن معلوم نہیں وہ کونسی خلش ہے جو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی اور وہ کیسا درد ہے جو ہر وقت بیقرار رکھتا ہے۔

اے سوزان، مجھے وہ دن اب بھی یاد ہیں جو ہم نے تم نے ایک ساتھ گزارے تھے اور اس مُبارک زمانہ کی یاد ابھی تک تازہ ہے جس کی فضاؤں میں ہم امیدوں اور آرزؤں کے پر لگا کر اُڑا کرتے تھے۔ آج میں ان پر روتی اور ماتم کرتی ہوں اور ان کی واپسی کی اسی طرح مشتاق و متمنی ہوں جس طرح خشک سالی کے بعد بارش کی اور رات کی تاریکی کے بعد طلوع فجر کی تمنا کی جاتی ہے، کاش میری اس رات کے بعد

پھر وہی صبح طلوع ہوتی اور امید کے افق سے کچھ بادل اُٹھ کر میرے ارمانوں کی خشک کھیتی پر برس پڑتے۔

ایڈورڈ کا خط اسٹیفن کے نام

اب مجھے معلوم ہوا کہ تمھیں نہ مجھ پر اطمینان ہے نہ بھروسہ، اور تم مجھے بھی اسی نظر سے دیکھتے ہو جس سے اپنے ان عزیزوں کو جنسے تمنے کنارہ کشی اختیار کی، تم نے مجھ سے وہ بات چھپائی جس کی مجھے امید تھی کہ تم خود بیان کر دو گے اور مجھ سے کچھ نہیں کہا کہ تمھارا مقصد اس سفر سے کیا ہے؟

اے اسٹیفن، ہم دونوں ایک ہی مٹی سے ایک ہی آسمان کے نیچے پیدا ہوئے، ایک ہی فضا اور ایک ہی ماحول میں پلے اور بڑھے۔ لیکن پھر اس طرح جدا ہوئے جیسے ایک مٹی سے اُگنے والے دو درخت اپنی شکل وصورت اور پھل پھول میں مختلف ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تم مجھسے بھاگتے اور دور رہتے ہو اور میں زندگی کے راستوں میں جس راستے پر چلتا ہوں تم اس کے خلاف دوسرا راستہ اختیار کرتے ہو۔

میں جس زندگی کو مُبارک اور جس سکون کو سکون سمجھتا ہوں تم اسے نامبارک اور باعث اضطراب خیال کرتے ہو، مجھے جو نغمہ وجد میں لے آتا ہے وہی نغمہ تمھارے کانوں پر گراں گزرتا ہے، تم نہیں چاہتے کہ میری پیشانی میں تمھیں وہ آئینہ نظر آئے جس میں تم اپنے خد و خال کو روشن اور غیر مبہم دیکھ سکو۔

اے اسٹیفن تمھیں مجھ سے نفرت نہ سہی، پھر بھی تم میری صورت دیکھنا نہیں چاہتے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ تم جانتے ہو کہ زندگی کے متعلق میرے خیالات تمھارے نقطۂ نظر سے جدا ہیں اور میرا مسلک تمھارے مسلک سے علٰحدہ ہے۔

تم میری زبان سے اپنے توہمات و تصورات کے خلاف سنتے ہوئے ڈرتے ہو، تمھیں خوف ہے کہ میری وجہ سے تمھاری وہ لذت عیش جس سے تمھاری خیالی مگر تاریک دنیا معمور ہے، کہیں مکدر نہ ہو جائے اور تم اس چیز سے محروم ہو جاؤ جو عموماً غم نصیب شعراء کے لئے باعث زندگی ہوا کرتی ہے۔

جو چاہو بنو! اور جس طرح چاہو رہو! جوانی ہمیشہ رہنے والی نہیں، اور جب یہ خمار اُترے گا اسوقت تمھارا طائرِ فکر تھک کر میری ہی سرزمین پر گرے گا اور ہم ایک دوسرے کو بھول جانے کے بعد پھر پہچان لیں گے، کٹ جانے کے بعد پھر مل جائیں گے اور جیسے تھے ایک دفعہ پھر ویسے ہی ہو جائیں گے۔

بیشک اب ہمیں الگ ہو جانا چاہئے، کیونکہ ہم متحد نہیں ہو سکتے، لیکن کل یقیناً ہمیں ایک دوسرے سے ملنا ہے اس لئے اگر ہم باہمی خط و کتابت بند نہ کریں تو کیا حرج ہے اور اگر تعلقات دیرینہ کی رعایت

وحفاظت کے لئے نصف ملاقات کے اس دروازہ کو مسدود نہ کریں تو کیا نقصان ہے۔

تمھارے گھر والے تمھاری طرف سے بہت حیران ہیں، ان کا خیال ہے کہ تم نے اپنے اغراض ومقاصد سے بے خبر رکھ کر انھیں دھوکا دیا ہے، تم اپنے ارادے اور نیت سے مطلع کئے بغیر چپکے سے نکل کھڑے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ تمھارے اس طرح چلے جانے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم اس لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتے جسے انھوں نے تمھارے لئے پسند کیا ہے۔

میرے نزدیک ان کا یہ خیال صحیح ہے اور تم اپنے اس ارادے میں یقیناً خطا وار ہو۔ تم خوب جانتے ہو کہ تمھارے والد ایک معمولی حیثیت کے آدمی ہیں، اور بجز اس کے کہ معمولی طور پر زندگی گزار سکیں اور ان کے پاس کیا ہے، ایسی صورت میں اگر تم اس لڑکی سے شادی کر لیتے تو یقیناً تمھاری زندگی سدھر جاتی اور زندہ رہنے کی ایک صورت نکل آتی، مگر اسٹیفن بڑی مصیبت یہ ہے کہ تم شاعر ہو اور ایک شاعر کے نزدیک سعادت و نیک بختی کا مفہوم تمام انسانوں سے مختلف ہوا کرتا ہے۔

تمھارا بھائی تم سے بیحد محبت کرتا ہے اور میری طرح وہ بھی تمھیں ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہے۔ اب تم اپنی خیریت اور مفصل کیفیت سے مطلع کرو۔

"والسلام"

"اسٹیفن کے اندیشے"

"رات بہت تھوڑی سی رہ گئی ہے، اور صبح کی پیشانی سے رات کی سیاہ زلفیں اب ہٹنے ہی والی ہیں لیکن نہ مجھے نیند آتی ہے، نہ میری بے چینی کم ہوتی ہے، آرام چاہتا ہوں مگر نہیں ملتا، آنکھیں بند کرتا ہوں مگر سو نہیں سکتا۔

ایڈورڈ اپنے خط میں میرا مذاق اُڑاتا ہے، مجھے بیوقوف بناتا ہے اور اُس دن سے ڈرا رہا ہے جب میں اپنی تمناؤں اور تمام عمر کے دیکھے ہوئے خوابوں کو پورا ہوتے نہ دیکھ سکوں گا، اس کا خیال ہے کہ زندگی کی وہ مسرتیں جو میں حاصل کرنا چاہتا ہوں، شاعروں کی تخیلی بد اعتدالیاں ہیں، جن میں وہ تمام عمر مبتلا رہتے ہیں۔ پھر اگر یہ سچ ہے تو زندگی کتنی تلخ اور دُنیا کس قدر بے مزہ ہے!

لیکن نہیں! جس نے یہ خوشنما آرزوئیں میرے دل میں پیدا کی ہیں وہ اپنے لطف وعنایت سے ان کی آبیاری بھی کرے گا اور جس ذات نے دُنیا کی تمام راحتوں کو چھین کر صرف ایک لذت امید میرے لئے چھوڑ دی ہو، وہ یقیناً کبھی ایسا نہ کرے گا کہ اس حقیر عیش کو جو میرا تنہا سرمایۂ زندگی ہے مجھ سے چھین کر اس وسیع دُنیا کو

میرے اوپر تنگ کردے۔

میں نے کیا نئی بات چاہی ہے، اور کون سی بڑی چیز طلب کی ہے؟ یہی ناکہ اس دنیا کی تمام نیرنگیوں اور اس عالم کی بے پناہ وسعتوں میں ایک ایسا دل چاہتا ہوں جس کا وجود میرے لئے باعث سکون ہو اور جس کے ساتھ رہ کر تلخی حیات کو فراموش کرسکوں۔

پھر وہ کونسی چیز ہے جو خدا کی قدرت سے باہر ہے اور عقول انسانی میں وہ کونسی عقل ہے جو اُن سے زیادہ بلند اور عجیب چیزوں کا تعقل کرسکتی ہے جن کو خدا پیدا کرتا رہتا ہے، ہمارا ذہن جن چیزوں کا احساس کرسکتا ہے اور ہماری عقل جس جولانگاہ میں اُڑسکتی ہے ——— وہ اس عالم کے حقایق اور اس دُنیا کی بوقلمونیوں کے مقابلہ میں یقیناً بہت ہی حقیر اور بے رنگ ہیں۔

اگر کوئی شخص چڑھتے ہوئے سورج، بڑھتی ہوئی رات، جنگلوں کے حُسن وجمال اور بلند پہاڑوں کی داستانِ عظمت وجلال کو سُنے اور پھر چشم تصور سے نہیں بلکہ اپنی ان آنکھوں سے اُنھیں دیکھے تو اسے معلوم ہوگا کہ جمالِ کائنات جمالِ تصورات سے کہیں بڑھ کر ہے، اور دُنیا کی حقیقتیں ہمارے حُسنِ تخیل سے بہت بلند ہیں اسی وجہ سے میرا یہ عقیدہ ہے کہ جس سعادت کو میں نے اپنے لئے چاہا ہے چونکہ وہ اسی دُنیا کی چیز ہے اس لئے مجھے ضرور حاصل ہوگی اور وہ دن جب میں اپنی امیدوں کو مٹتا ہوا اور رشتۂ آرزو کو کٹتا ہوا دیکھوں میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔

وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو ناآشنائے آرزو ہو، اور وہ دل بھی کوئی دل ہے جو محبت کی تڑپ سے خالی ہو"

"محبت"

Indefinable

ایک روز صبح کو اسٹیفن پائیں باغ میں پہونچا تو دیکھا کہ ماجدولین کا باپ ایک روش کے کنارے اپنی کلہاڑی کے سہارے کھڑا ہوا ہے، اس نے مجبوراً سلام کیا اور مولر نے بھی بڑے تپاک سے اس کا جواب دیا۔

وہ چاہتا تھا کہ یوں ہی نکلا چلا جائے مگر اس نے دیکھا کہ مولر کی نگاہیں اُسے روکنا چاہتی ہیں اور الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکلنے کے لئے بیتاب ہیں۔ چنانچہ وہ کچھ شرما کر کھڑا ہوگیا۔ اور مولر بولا:

"دیکھو آج سورج کتنا خوبصورت ہے اور آسمان کیسا صاف ہے"

اسٹیفن نے چاہا کہ اس کا جواب دیکر سلسلۂ کلام کو جاری رکھے، لیکن اس کے ذہن میں اسکے علاوہ

اور کوئی بات نہ تھی کہ وہ فقط اسکی لڑکی کی خیریت دریافت کرے۔ لیکن پھر فوراً ہی اسے خیال ہوا کہ اگر اسنے ایسا کیا تو یقیناً موکر کو شک ہوگا۔

اسکے لئے یہ بالکل پہلا موقعہ تھا کہ اسے خیال ہوا کہ ایک مرد کا دوسرے مرد سے اس کی لڑکی کے متعلق کچھ پوچھنا شک میں ڈالنے والی چیز ہے۔

موکر نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا:- "اور یہ وقت بھی کس قدر سہانا اور خوشگوار ہے۔ اگر رعشہ کی یہ تکلیف جسے میں اپنے ہاتھ پاؤں میں پاتا ہوں، نہ ہوتی تو میں اس سے بہت لطف اندوز ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑھاپا بھی بڑی مصیبت ہے اور اس کا ذائقہ نہایت تلخ۔ عہد شباب بھی کیا زمانہ تھا جب نہ طوفانوں کا خوف تھا اور نہ تپتی ہوئی زمینوں کا۔" آہ! وہ دن جب میں ہر روز صبح اٹھکر ننگے سر ننگے پاؤں پہاڑوں کی چوٹیوں، دریاؤں کے کناروں، لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور لہراتے ہوئے سبزہ زاروں میں کھیلتا کودتا اور میدانوں میں شکار کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔ آج یہ دن ہے کہ اس کونے میں بیٹھا ہوا سورج کی سفید شعاعوں سے اپنے جسم مرتعش کے لئے چادریں بنتا رہتا ہوں اور اس عہد گزشتہ کو یاد کرتا ہوں ـــــ ماجد ولین کی چھوٹی چھوٹی سہیلیاں جب اس چھوٹے سے سفید ٹیلے پر آکر اس کے ساتھ کھیلتی ہیں تو میری آنکھوں کو کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

اس موقعہ پر اسٹیفن گفتگو کے میدان کو ذرا وسیع پاکر بول اٹھا:

"آج ماجد ولین اپنی حسب عادت نیچے نہیں اتریں، اچھی تو ہیں؟"

"ہاں بخیریت ہیں کل شام ہمارے عزیزوں میں سے ایک صاحب مہمان آئے ہیں اس لئے مجبوراً انکی خاطر مدارات کے لئے گھر پر چھوڑ آیا ہوں، اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ باغ میں آئے بغیر اسے چین نہیں پڑسکتا، اور سورج کی وہ چند سفید شعاعیں جو روشن دان سے اس کے کمرے میں پہونچ جاتی ہیں، اسے کھلے ہوئے آفتاب کے نظارے سے بے نیاز نہیں بنا سکتیں۔"

اس کے بعد وہ دونوں مختلف عنوانات پر گفتگو کرتے رہے کہ یکایک گھر کا دروازہ کھلا اور "ارشمید" و "ماجد ولین" آپس میں ہنستے بولتے گھر سے باہر نکلے، جب وہ ماجد ولین کو مخاطب کرتا تو اس کا چہرہ شگفتہ ہوجاتا، اور جب وہ اس سے بات کرتی تو وہ مسکرا دیتا۔ ان کا انداز گفتگو کچھ ایسا تھا جیسے دو چاہنے والے باہم لطف و محبت کی باتیں کررہے ہوں۔

اس وقت اسٹیفن نے وہاں ٹھہرنا کچھ مناسب نہ سمجھا کیونکہ یہ منظر اسے تکلیف پہونچا رہا تھا، اب وہ دونوں اسکے قریب آچکے تھے اور اسٹیفن ذرا ہٹ کر پھولوں کے دیکھنے میں مشغول ہوگیا تھا۔ وہ یہاں سے

بھاگ جانا چاہتا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ دونوں اس کے راستے میں حایل تھے۔ ان دونوں نے قریب آکر اسے سلام کیا اور اسٹیفن نے بڑی سرد مہری اور ڈوبی ہوئی آواز میں سلام کا جواب دیا اور انھیں وہیں چھوڑ کر ایک طرف کو چلا گیا، ابھی وہ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ اس نے پیچھے سے نوجوان کے قہقہے کی آواز سُنی، اُسے یقین ہوگیا کہ وہ دونوں اُسی پر ہنس رہے ہیں۔ چنانچہ اس نوجوان کی طرف سے اس کے دل میں ایک جذبۂ نفرت پیدا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اگر اسے موقعہ مل جاتا تو شاید اس کے چہرے کو خون سے رنگ دیتا اور بتا دیتا کہ وہ کسی کے مذاق کا نشانہ نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد وہ کچھ سوچنے لگا اور اس عجیب و غریب کیفیت کا جو اس وقت اس پر طاری تھی محاسبہ کرنے لگا۔ "مجھے اس نوجوان سے کیا واسطہ؟ میں کیوں اپنے دل میں اس کی طرف سے غم و غصّہ کے جذبات پاتا ہوں؟ کچھ میں اس لڑکی پر عاشق تو نہیں ہوں اور نہ اسے اس کے ہاتھ سے چھین لینا چاہتا ہوں، اور خود وہ بھی میری محبت میں حایل نہیں ہے پھر کیوں میں اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں"۔

وہ دیر تک اپنے آپ سے اسی قسم کے سوالات کرتا رہا جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا، اور نہ اُنکی عقل اس معاملہ میں اس کی رہنمائی کرنے کو طیار تھی۔ اس کے بعد وہ کان لگا کر چاروں طرف سننے لگا، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہر جگہ سکون مسلط تھا چنانچہ وہ جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر آیا اور اپنے سامنے کسی کو نہ پاکر درختوں اور جھاڑیوں سے ہوتا ہوا ایک عالم بیخودی میں باغ سے باہر نکل گیا، اور جب ذرا شام ہونے لگی تو وہ اپنے کمرہ کی طرف واپس ہوا اور اپنے بالاخانہ پر چڑھ گیا، لیکن جوں ہی وہ ماجدوکین کے کمرے کے سامنے سے گزرا اندر سے باتوں کی آواز اس کے کانوں میں آنے لگی اور ابھی ابھی جس چیز کو بھلا چکا تھا پھر اس کی یاد تازہ ہوگئی کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت ماجدوکین اپنے عزیز ارشمید سے ہمکلام ہے اور یہ خیال اس پر بہت شاق و گراں گزرا، چنانچہ اس کے قدم سُست پڑگئے۔ اور جب اسے یقین ہوگیا کہ اگر وہ دروازے کے قریب پہونچگیا تو کسی کو اس کی موجودگی کی خبر نہ ہوگی تو وہ آگے بڑھا اور ان کی باتوں کو کان لگا کر سننے لگا، لیکن باوجود کوشش کے ایک حرف بھی نہ سُن سکا اس کے بعد وہ دونوں خاموش ہوگئے۔ اور ایک نہایت ہی غمگین اور پر درد لہجے میں ماجدوکین گانے لگی، جو یقیناً اسٹیفن کے لئے بہت ہی خوشگوار ہوتا اگر کوئی دوسرا شخص اس موج کوثر و تسنیم میں، ڈوبنے کے لئے موجود نہ ہوتا۔ اس کے بعد گانا ختم ہوگیا، اور اسٹیفن نے کسی کو دروازے کی طرف آتے ہوئے محسوس کیا۔ چنانچہ وہ فوراً اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اور وہی نوجوان دروازے سے باہر نکلا۔ اور اسکے پیچھے پیچھے ماجدوکین اسے رخصت کرنے کے لئے باہر آئی۔

وہ ایک نہایت ہلکے اور سفید لباس میں ملبوس تھی جسے لڑکیاں عموماً اسی وقت پہنتی ہیں جب وہ اپنے

دوستوں یا ہم عمر عزیزوں کے سامنے ہوں۔

آج اسٹیفن کو ماجدولین میں ایک نئی شکل نظر آرہی تھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور خود اسے اپنے پہلو میں ایک عجیب و غریب کیفیت محسوس ہو رہی تھی جو آج سے پیشتر اسے دیکھ کر کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی اسے رخصت کرکے وہ اپنے کمرہ میں لوٹ آئی اور اندر جاکر دروازہ بند کرلیا۔ اسٹیفن بھی وہاں سے ہٹ کر پھر اپنی پہلی جگہ پر لوٹ آیا۔

وہ خوب سمجھ رہا تھا کہ آج جو چیز اس کی طبیعت پر مستولی ہے، اور جس خلش کو وہ اپنے سینہ میں محسوس کر رہا ہے، محض وسواس یا جنون نہیں ہے اور نہ بخار کی گرمی بلکہ یہ وہی چیز ہے جسے محبت کہتے ہیں۔

"دعوت"

ایک روز موکر، ماجدولین کے پاس آیا اور کہنے لگا:۔

"بیٹی میں نے اپنے پڑوسی کو جو ہمارے مکان کے بالاخانہ پر رہتا ہے، آج شام کو کھانے پر مدعو کیا ہے اس کے لئے تمھیں کو کھانے کا انتظام کرنا ہوگا، اور ہاں تمھیں ہماری خاطر آج شب میں کچھ گانا بھی پڑیگا کیونکہ میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں۔ میں اس شخص کی بلند ہمتی، ذہانت اور علم نباتات میں اس کی وسعت معلومات کا اس قدر معترف ہوں کہ اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس سے دوستانہ تعلقات پیدا کروں۔" اتنا کہکر موکر وہاں سے اُٹھا اور باغ میں چلا گیا، جب شام ہونے لگی تو وہ گھر واپس آیا اور اپنے کمرے کی اُس کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جو باغ کی طرف کھلتی تھی اپنے مہمان کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بیٹھا ہی ہوا تھا کہ یکایک اس نے اسٹیفن کو باغ کے دروازے سے نکلتے اور بڑی تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا، چنانچہ وہ چلاکر اپنی لڑکی سے کہنے لگا:۔

"ماجدولین میرا خیال ہے کہ ہمارے پڑوسی نے اپنے وعدے کا کچھ خیال نہیں کیا۔ میں نے اسے ابھی ابھی باغ کے دروازے سے نکلتے اور بڑی تیزی سے سامنے والی سڑک پر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے"۔

ماجدولین کہنے لگی:

"بہت ممکن ہے اُسے اس وقت کوئی ایسا کام پیش آگیا ہو جس کا پہلے سے اُسے خیال نہ آیا ہو، ہمیں ضرور اس کا انتظار کرنا چاہئے۔"

غرض وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ماجدولین ہنستی رہی اور موکر اپنی سگرٹ سے اپنا وقت کاٹتا رہا اور جب انھیں یقین ہوگیا کہ وہ واپس نہیں آئے گا تو انھوں نے بیٹھکر کھانا کھایا اور پھر سونے کے لئے چلے گئے۔

"ملاقات"

موٹر اپنی بیٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اُس نے ستاروں پر ایک غلط انداز نگاہ ڈالی اور کہنے لگا:

"میرا خیال ہے کہ آج رات بڑی زور کی بارش ہوگی"

ماجدولین کہنے لگی:

"لیکن اباجان آپ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سیکڑوں غریب مسافر ایسی انھیری راتوں اور سر پر پڑتی ہوئی پانی کی بوچھاروں اور راستہ کی دلدلوں سے کیسی کیسی ناقابل برداشت تکلیفیں اُٹھائیں گے، میں تو سمجھتی ہوں کہ شقاوت و بدبختی ہر چیز میں پنہاں ہے اور وہی ایک چیز جو ایک کے لئے پروانۂ رحمت ہے، دوسرے کے لئے باعث زحمت ہوتی ہے"

موٹر کو یہ تنقید کچھ پسند نہیں آئی اور کہنے لگا:

"ہاں ماجدولین ان کی شقاوت و بدبختی میں کسے شبہ ہوسکتا ہے اور یقیناً اسٹیفن بھی انھیں بدنصیب انسانوں میں سے ہے۔ غضب خدا کا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے اور وہ ابھی تک نہیں لوٹا۔ حالانکہ وہ کل رات بھر کہیں باہر رہ چکا ہے"۔

اس جملہ نے ماجدولین پر گہرا اثر کیا، اس نے اپنا سر جھکا لیا اور ایک عالم محویت میں کتاب کے ورقوں سے کھیلنے لگی۔

یہ دونوں اسی طرح خاموش بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک آہستہ آہستہ کسی نے دروازے پر دستک دی، ماجدولین پریشان ہوگئی اور موٹر بھی گھبرا گیا، جنفاف (خادمہ) اُٹھکر گئی اور دروازہ کھول کر دیکھا تو اسٹیفن کھڑا ہوا تھا، اس نے اندر آنے کی اجازت چاہی اور یہ کہتا ہوا اندر داخل ہوا:

"حضرت! معاف فرمایئے گا آپ کو ضرور خیال ہوا ہوگا کہ میں نے اپنے وعدہ کے ایفا کا کچھ لحاظ نہیں رکھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے میرے بھائی کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ میں اس سے لشکرگاہ میں جاکر مل لوں اور لڑائی پر جانے سے پہلے اس سے رخصت ہو لوں۔ اس خط کو دیکھ کر مجھے خیال نہیں رہا اور اس عجلت میں، آپ سے اپنی غیر حاضری کی معذرت بھی نہ چاہ سکا، میں یہاں سے نکل کر سیدھا دس میل تک چلا گیا اور ایک ایسے دل سے اسے رخصت کیا جس میں رنج و خوشی دونوں ملے ہوئے تھے، خوشی تو اس بات کی کہ میں نے اسے بہت ہی خوش و خرم دیکھا وہ کبھی رجز پڑھتا تھا، کبھی اپنے گھوڑے سے کھیلتا تھا اور کبھی خود پہنکر اور تلوار لگا کر اکڑا اکڑ کر چلتا تھا، لیکن غم اس بات کا کہ مبادا مشیت خداوندی مجھ سے پہلے اسکی طرف

سبقت کرے اور میرے اور اس کے درمیان حائل ہوجائے اور میں اس نامراد دنیا میں اتنا تنہا اور بے یار و مددگار رہجاؤں کہ نہ میرے آس پاس کے دلوں میں کوئی دھڑکتا ہوا دل مجھے غمزدہ دیکھ کر آزردہ ہو۔ اور نہ ان بے شمار دیکھنے والی آنکھوں میں کوئی آنکھ مجھے روتا ہوا دیکھ کر اشک آلود ہو"۔

اتنا کہکر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور قریب تھا کہ ماجدولین بھی رونے لگے، لیکن اسکی نسوانی شرم و حیا مانع ہوئی اور اپنی غم آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی، لیکن وہ نہ دیکھ سکا کیونکہ جوں ہی وہ اس کی طرف متوجہ ہوا اس نے اپنی نگاہیں پھر اپنی کتاب کے صفحہ پر جمادیں۔

اسٹیفن کو اس طرح آبدیدہ دیکھ کر موکر کہنے لگا:

"اے میرے بچے روؤ نہیں، غم نہ کرو" اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر چائے کی میز پر لے گیا اور دونوں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

اس وقت موکر اپنے مہمان سے چائے اس کی جائے پیدایش، اس کے طریق کاشت، اس کے پتوں اور ڈنٹھلوں، اس کے مختلف اقسام و الوان، اس کے طریق استعمال اور پکانے کے آداب اور علماء و نباتات کی رایوں اور ان کی باہمی اعتراضات و جوابات کا ذکر کرنے لگا اور اس خیال سے کہ اسٹیفن ان کی گفتگو کو ہمہ تن گوش ہوکر سُن رہا ہے بحث کو طول دیتا رہا۔ حالانکہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ موکر نے کیا کہا۔ وہ تو اس فکر میں تھا کہ کسی طرح چپکے چپکے دزدیدہ نگاہوں سے ماجدولین کو دیکھ لے، اور وہ بھی جب اسے موقعہ مل جاتا تو ایک نگاہ اس پر ڈال لیتی تھی، یہاں تک کہ وہ دونوں چائے سے فارغ ہوگئے اور موکر نے اپنی بیٹی سے گانے کی فرمائش کی۔

چنانچہ اس نے ایک ایسا نغمہ شروع کیا جس میں خوف کی کپکپاہٹ اور غم کی تھرتھراہٹ شامل تھی اور یہ نغمہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اسٹیفن پر ربودگی سی طاری ہونے لگی، اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا دنیا اسکے سامنے گھوم رہی ہے۔ اور زمین و آسمان بدل گئے ہیں وہ گھبرا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو یہ وارفتگی باعث رسوائی ہو، چنانچہ وہ جانے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ موکر بھی اس کے ساتھ دروازہ تک آیا اور کہنے لگا:

"اے اسٹیفن کبھی کبھی چلے آیا کرو۔ تمہاری پذیرائی کے لئے یہ دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے"۔

اسٹیفن ایک نئے دل و دماغ کے ساتھ وہاں سے واپس ہوا، اور آج اس کے پہلو میں ایک نئی چمک تھی جس کا احساس اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

"عورت"

ماجدولین نے ساری رات عبادت خانہ میں سربسجود گزاری اور یہی دعا کرتی رہی کہ خدا اس کی مدد کرے اور

اس نئی زندگی کی تاریکیوں میں جو اس کی طرف بڑھتی چلی آرہی ہیں اس کی رہنمائی فرمائے۔ اس وقت اس کا دل عجیب عزیب خیالات کا جولانگاہ تھا۔ خوف و محبت رنج و راحت امیدیں اور مایوسیاں سب ایک جگہ جمع تھیں وہ کبھی ہنسنے لگتی اور کبھی اس قدر روتی کہ چادر تک تر ہوجاتی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کیوں ہنستی ہے اور کیوں روتی ہے۔ غرض دیر تک ان کی یہی حالت رہی اور پھر وہیں اپنی جانماز پر لیٹ کر سوگئی۔

ادھر اسٹیفن نے ساری رات اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے گزار دی، وہ سر اُٹھا اُٹھا کر آسمان کو دیکھ لیتا تھا، گویا آسمان کے تاروں سے اس نے کوئی عہد بیداری کیا تھا اور اس وقت جو راحت و مسرت اسے حاصل ہوئی تھی اس کا پیغام انھیں پہونچا رہا تھا۔

جو چیز اس کے لئے باعث مسرت تھی وہ یہ تھی کہ جس گم شدہ محبت کی اسے مدت سے تلاش تھی وہ اسے مل گئی، اور وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

"خدا کا شکر ہے میں جس زندگی کو پسند کرتا تھا مجھے مل گئی اور جس عورت کا تصور میں نے اپنے ذہن میں قائم کیا تھا وہ مجھے حاصل ہوگئی۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت ہی وہ افق ہے جہاں سے آفتاب سعادت طلوع ہوکر اس دنیا کی تاریکیوں کو دھو دیتا ہے، اور یہی وہ مُبارک قاصد ہے جس کے ہاتھوں معبود حقیقی کے انعامات بندوں تک پہونچتے ہیں، اور یہی وہ نسیم خوش خرام ہے جو انسان کی زندگی میں روح عمل پھونکا کرتی ہے، عورت ہی وہ معراج ہے جس کے ذریعہ سے انسان اس دنیائے آب وگل سے بلند ہوکر عالم ارواح کی بلندیوں تک پہونچ سکتا ہے اور یہی خدا کا وہ پیامبر ہے جس کے خد وخال میں جمال وجلال الٰہی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ جس لڑکی سے آج میری ملاقات ہوئی ہے اس کی پیشانی میں مجھے اپنی زندگی اپنی سعادت اور اپنے یقین وایمان کی جھلک نظر آتی ہے"

وہ دل ہی دل میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جس محبت نے اسکے دل کی فضا کو معمور کردیا ہے وہ چھلک کر کائنات کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی ہے، وہ اسوقت آسمان کے نیلگوں دامن میں محبت کی صورت دیکھ رہا تھا۔ آج اسے ہر ہر ذرہ ہنستا ہوا اور درختوں کی ایک ایک ٹہنی بربط و رباب نظر آرہی تھی۔ وہ انہی خیالات وتصورات میں رات بھر جاگتا رہا یہاں تک کہ صبح کی پیشانی سے رات کا آنچل ڈھلکنے لگا اور وہ کچھ دیر کے لئے سوگیا۔ سو کر اُٹھا تو باغ میں آیا اور ماہد ولین کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن دوپہر ہوگئی اور وہ نہ آئی۔ اب اس کے دل میں مختلف شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے۔ اور موٹر کے پاس جانے کے علاوہ کوئی دوسری تدبیر سمجھ میں نہیں آئی چنانچہ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہاں پہونچا اور دروازہ پر دستک دی۔ اس وقت اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے دل کا کوئی

ٹکڑا علحدہ ہوکر کہیں دور جاگرا ہے، اور بولنے اور بات کرنے کی طاقت اس سے سلب ہوچکی ہے، اسے سخت شرمندگی اور ندامت تھی کہ اس نے یہاں آنے کے بجائے کوئی دوسرا ذریعہ کیوں نہ اختیار کیا اور چاہ رہا تھا کہ کاش خادم کو یہاں تک آتے آتے اتنی دیر لگ جائے کہ وہ اپنے ہوش وحواس مجتمع کرسکے اور اتفاقاً اس کی یہ آرزو پوری ہوئی کیونکہ جنفیان نے اس وقت تک کواڑ نہیں کھولے جب تک کہ وہ اپنے کام سے فارغ نہیں ہوگئی

اسٹیفن نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا "موکر کہاں ہے؟"

جنفیان نے اسے لیجاکر مہمانوں کے کمرے میں بٹھا دیا اور خود موکر کو اطلاع دینے چلی گئی جو اسوقت اپنے کتب خانہ میں بیٹھا ہوا مطالعہ میں مصروف تھا۔

اسٹیفن جب تنہا رہ گیا تو اس نے اس کمرے کا ایک عام جایزہ لینا شروع کیا۔ اس نے اپنے قریب ہی ایک دروازہ دیکھا جو اتفاق سے کھلا ہوا تھا اور اس کی دوسری طرف ایک سیاہ مسہری بچھی ہوئی تھی وہ سمجھ گیا کہ ماجد ولین کا کمرہ ہے۔ وہ دروازہ کے قریب آیا اور کان لگاکر سننے لگا مگر کمرہ خالی تھا اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا شوق اور بڑھا اور اندر جانے لگا، وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ اقدام مناسب نہیں لیکن اس وقت وہ اُس دور سے گزر رہا تھا جب عقل دل کا ساتھ نہیں دیتی۔

چنانچہ وہ اندر چلا گیا اور اس نے دیکھا کہ بستر پر شکنیں ابھی تک موجود ہیں، اور تکیہ کا وہ حصہ جس پر ماجد ولین اپنا سر رکھکر سوئی تھی ابھی تک دبا ہوا ہے، مسہری کے سامنے پانی سے لبریز ایک تشت رکھا ہوا ہے اور اسی کے برابر ایک کرسی پر ایک بھیگی ہوئی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ پھر اس نے زمین کو دیکھا جس کی نمی میں چھوٹے چھوٹے قدموں کے نشانات اب بھی موجود تھے، وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی بستر ہے جس پر ماجد ولین سوئی تھی، یہ وہی پانی ہے جس سے اس نے اپنا منھ دھویا تھا یہ وہی تولیہ ہے جس سے اس نے اپنا منھ پوچھا تھا اور یہ وہی زمین ہے جس پر وہ اپنے پاؤں دھوکر چلی تھی۔

وہ ایک سنگین بُت کی طرح ساکت وصامت اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "کس قدر خوش نصیب ہے یہ مسہری جس پر وہ سوتی ہے، کتنا قابل رشک ہے یہ تولیہ جس سے وہ اپنا منھ پوچھتی ہے، کیسی مقدس ہے یہ زمین جس پر وہ اپنے قدم رکھتی ہے، اور کیسا خوش قسمت ہے وہ پانی جسے وہ اپنے بدن پر ڈالتی ہے"۔

یہ کہتے کہتے وہ کرسی پر پڑی ہوئی تولیہ کی طرف بڑھا اور اسے چومنے لگا جس طرح کوئی پوجاری اپنے مندر کے پردے کو چومتا اور آنکھوں سے لگاتا ہے۔ وہ زمین پر جھک گیا اور دیر تک ماجد ولین کے نشانات قدم پر پیشانی رگڑتا رہا۔ اتنے میں کسی کے آنے کی آہٹ اُسے محسوس ہوئی اور وہ فوراً اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ

بیٹھا ہی تھا کہ موکر اندر داخل ہوا اور سلام کے بعد کہنے لگا:

"اے اسٹیفن معاف کرنا مجھے تمھارے پاس آنے میں اس لئے دیر لگی کہ میں لغت کی کتابوں میں علم نباتات کے بعض ناموں کی تحقیق کر رہا تھا اور آج کا تمام دن اسی میں صرف ہو گیا، کیا تم اس میں میری مدد کر سکتے ہو اگر ایسا ہے تو وعدہ کرو کہ کھانا کھانے سے پہلے تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔"

اسٹیفن یہ سُنکر مسکرایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اتنا وقت وہ ماجد وکین کے گھر گزاریگا، اور اس سے زیادہ خوش بختی اس کی اور کیا ہو سکتی تھی۔

وہ دونوں اُٹھکر کتب خانہ میں چلے گئے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تب موکر نے اسٹیفن کے سامنے اُن تمام ناموں کو پیش کیا جو آج ان کی تمام مشغولیت کا باعث تھے اور ان کے مطالب و معانی انکے مصادر و اشتقاق کے متعلق علماء نباتات کی رائیں اور پھر اپنی تحقیق بیان کرنے لگا، جہاں کہیں اثنائے کلام میں کسی کتاب کا ذکر آتا وہ فوراً کتابوں کی الماری کی طرف جاتا اور کتاب نکال کر اسکے اوراق کو لوٹنے لگتا اور جب وہ موضوع اُسے مل جاتا تو ایک تبسم کے ساتھ اسے پڑھتا اور کہتا کہ "دیکھو فلاں عالم کا اس کے متعلق یہ خیال ہے، لیکن میرا عقیدہ اس کے برعکس ہے اور اس میں حرج ہی کیا ہے اگر میری تحقیق اس کی تحقیق کے خلاف ہو۔ علم کسی خاص مصنف یا مولف کی میراث نہیں ہوتی بلکہ وہ حجت سے حجت کے ٹکرانے اور رائے کا رائے سے مقابلہ کرنے ہی کا نام ہے"۔

وہ یوں ہی مجذوب کی طرح بڑبڑا رہا تھا اور اسٹیفن ان تمام باتوں سے بیخبر، رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اس خیال سے کہ شاید وہ ماجد وکین کو اندر آتے ہوئے دیکھ سکے۔

موکر اس کی اس کیفیت کو سمجھ گیا اور کہنے لگا: "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بار بار دروازے کی طرف دیکھتے ہو۔ شاید تمھیں خیال ہے کہ کوئی غیر شخص اندر آکر ہماری تنہائی میں مخل ہو گا تو تم مطمئن رہو کہ اس گھر میں کوئی شخص مداخلت نہیں کر سکتا اور میری اجازت کے بغیر میرے کمرے میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

اتنے میں خادمہ کی آواز آئی جو اسے کھانے پر بلا رہی تھی۔ مگر اس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ ختم نہیں کیا، خادمہ نے پھر آواز دی اور موکر بڑی گرانی اور آہستگی کے ساتھ اُٹھا اور اسٹیفن سے باتیں کرتا ہوا کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔

اسٹیفن کو یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا کہ میز کے آس پاس صرف دو کرسیاں پڑی ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ ایک تو اسکے لئے ہے اور دوسری موکر کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ فرطِ غم اور شدت الم سے اس کی زبان بند ہو گئی اور چُپ چاپ بیٹھا ہوا کھانا کھاتا رہا۔ نہ اس نے کوئی لفظ کہا اور نہ ایک حرف سُنا یہاں تک کہ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو گئے۔

موکر کہنے لگا:۔ "تمھیں یہاں بھیجکر خدا نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے آج مجھے اس تنہائی میں کسی مونس اور اس دسترخوان پر کسی رفیق کی امید نہ تھی کیونکہ آج ہی صبح میری لڑکی اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ شام سے پیشتر واپس نہیں ہو سکے گی۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے باغ میں چلو اور کچھ چہل قدمی کر لو"۔

چنانچہ وہ دونوں باغ میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ہی خادمہ نے کھڑکی میں سے چلاکر ماجد ولین کے آنے کی خبر دی۔ موکر نے اسٹیفن کو رخصت کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھادیا اور اُسے مبہوت و متحیر چھوڑ کر چلتا ہوا، آج اسکے رنج و غم کی کوئی حد و انتہا نہ تھی۔

"حیرت"

اس کے بعد سے اسٹیفن کی یہ حالت ہوگئی کہ جب کبھی وہ ماجد ولین کو باغ میں دیکھ لیتا تو فوراً اس کے سامنے سے ہٹ جاتا اور اُس راستہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتا وہ اپنے لئے ایک ایسی تنہائی کا طالب تھا جہاں وہ اپنے آپ کو عالم تصور میں ماجد ولین کے سامنے دیکھے اور ایک محبّت بھرا اسلام اس تک پہونچا سکے، لیکن قبل اس کے کہ اس کا یہ ارادہ پورا ہو، ماجد ولین اپنے کمرہ کی طرف لوٹتی ہوئی نظر آتی، یہ دیکھ کر اسے اس قدر صدمہ ہوتا کہ راتوں کی نیند اُڑ جاتی بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا اور کسی پہلو قرار نہ ملتا۔ وہ مجبور ہو کر جنگلوں اور ویرانوں میں نکل جاتا پہاڑوں کی چوٹیوں اور دریا کے کناروں پر حیران و سرگرداں پھرتا رہتا کہ شاید اسی طرح روح کی حدت اور دل کی جلن میں کوئی کمی ہو۔

ان باتوں کو ایک عرصہ گزر گیا، وہ نہ باغ میں گیا نہ اس نے ماجد ولین کو دیکھا اور نہ موکر ہی سے اس کی ملاقات ہوئی، آخر اس کا دل بیٹھنے لگا اور ہر طرف سے مایوس ہوگیا، ایک روز جب وہ کہیں سے واپس ہوا تو اس کو تیز بخار چڑھا ہوا تھا، بیچینی اور کمزوری انتہا کو پہونچ چکی تھی، وہ اپنے کمرے میں آکر گر پڑا اور پھر کئی روز تک اُٹھنے کے قابل نہ ہو سکا اس کا جسم اور جان دونوں علیل تھے اور قوت برداشت بالکل مفقود تھی۔

جنفیاف کو اس کی علالت کی خبر ہو چکی تھی، چنانچہ اس نے جاکر موکر سے کہا موکر اس کی بیماری کا حال سُن کر اس کی عیادت کے لئے اوپر آیا لیکن پوچھنے پر بھی اس نے اپنی صحیح صحیح کیفیت سے مطلع نہیں کیا بلکہ یونہی سی کچھ بات بنا دی، موکر اس سے ایک گھنٹہ تک باتیں کرتا رہا اور جب جانے لگا تو اسٹیفن نے بنفشہ کے پھولوں کا ایک گلدستہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اشارہ کیا جو اسکے سرہانے گلدان میں بڑی خوبصورتی سے رکھا ہوا تھا اور کہنے لگا:۔

"یہ چند پھول میں نے ماجد ولین کے لئے چُنے ہیں کیونکہ میں جانتا ہوں اُنھیں ان پھولوں سے بہت دلچسپی ہے

بیٹھا ہی تھا کہ موکر اندر داخل ہوا اور سلام کے بعد کہنے لگا:

"اے اسٹیفن معاف کرنا مجھے تمہارے پاس آنے میں اس لئے دیر لگی کہ میں لغت کی کتابوں میں علم نباتات کے بعض ناموں کی تحقیق کر رہا تھا اور آج کا تمام دن اسی میں صرف ہوگیا، کیا تم اس میں میری مدد کر سکتے ہو اگر ایسا ہے تو وعدہ کرو کہ کھانا کھانے سے پہلے تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔"

اسٹیفن یہ سُنکر مسکرایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اتنا وقت وہ ماجد ولین کے گھر گزاریگا، اور اس سے زیادہ خوش بختی اس کی اور کیا ہو سکتی تھی۔

وہ دونوں اُٹھکر کتب خانہ میں چلے گئے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تب موکر نے اسٹیفن کے سامنے اُن تمام ناموں کو پیش کیا جو آج ان کی تمام مشغولیت کا باعث تھے اور ان کے مطالب و معانی انکے مصادر و اشتقاق کے متعلق علماء نباتات کی رائیں اور پھر اپنی تحقیق بیان کرنے لگا، جہاں کہیں اثنائے کلام میں کسی کتاب کا ذکر آتا وہ فوراً کتابوں کی الماری کی طرف جاتا اور کتاب نکال کر اسکے اوراق کو لوٹنے لگتا اور جب وہ موضوع اُسے مل جاتا تو ایک تبسم کے ساتھ اسے پڑھتا اور کہتا کہ "دیکھو فلاں عالم کا اس کے متعلق یہ خیال ہے، لیکن میرا عقیدہ اس کے برعکس ہے اور اس میں حرج ہی کیا ہے اگر میری تحقیق اس کی تحقیق کے خلاف ہو۔ علم کسی خاص مصنف یا مؤلف کی میراث نہیں ہوتی بلکہ وہ حجت سے حجت کے ٹکرانے اور رائے کا رائے سے مقابلہ کرنے ہی کا نام ہے۔"

وہ یوں ہی مجذوب کی طرح بڑبڑا رہا تھا اور اسٹیفن ان تمام باتوں سے بیخبر، رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اس خیال سے کہ شاید وہ ماجد ولین کو اندر آتے ہوئے دیکھ سکے۔

موکر اس کی اس کیفیت کو سمجھ گیا اور کہنے لگا: "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بار بار دروازے کی طرف دیکھتے ہو۔ شاید تمھیں خیال ہے کہ کوئی غیر شخص اندر آکر ہماری تنہائی میں مخل ہوگا تو تم مطمئن رہو کہ اس گھر میں کوئی شخص مداخلت نہیں کر سکتا اور میری اجازت کے بغیر میرے کمرے میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

اتنے میں خادمہ کی آواز آئی جو اسے کھانے پر بلا رہی تھی۔ مگر اس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ ختم نہیں کیا، خادمہ نے پھر آواز دی اور موکر بڑی گرانی اور آہستگی کے ساتھ اُٹھا اور اسٹیفن سے باتیں کرتا ہوا کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔

اسٹیفن کو یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا کہ میز کے آس پاس صرف دو کرسیاں پڑی ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ ایک تو اسکے لئے ہے اور دوسری موکر کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی، فرطِ غم اور شدت الم سے اس کی زبان بند ہوگئی اور چُپ چاپ بیٹھا ہوا کھانا کھاتا رہا، نہ اس نے کوئی لفظ کہا اور نہ ایک حرف سُنا یہاں تک کہ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہوگئے۔

موکر کہنے لگا:- "تمھیں یہاں بھیجکر خدا نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے آج مجھے اس تنہائی میں کسی مونس اور اس دسترخوان پر کسی رفیق کی امید نہ تھی کیونکہ آج ہی صبح میری لڑکی اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ شام سے پیشتر واپس نہیں ہو سکے گی۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے باغ میں چلو اور کچھ چہل قدمی کر لو"۔

چنانچہ وہ دونوں باغ میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ہی خادمہ نے کھڑکی میں سے چلاکر ماجد ولین کے آنے کی خبر دی۔ موکر نے اسٹیفن کو رخصت کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور اُسے مبہوت و متحیر چھوڑ کر چلتا ہوا، آج اسکے رنج و غم کی کوئی حد و انتہا نہ تھی۔

"حیرت"

اس کے بعد سے اسٹیفن کی یہ حالت ہوگئی کہ جب کبھی وہ ماجد ولین کو باغ میں دیکھ لیتا تو فوراً اس کے سامنے سے ہٹ جاتا اور اُس راستہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتا وہ اپنے لئے ایک ایسی تنہائی کا طالب تھا جہاں وہ اپنے آپ کو عالم تصور میں ماجد ولین کے سامنے دیکھے اور ایک محبت بھرا اسلام اس تک پہونچا سکے، لیکن قبل اس کے کہ اس کا یہ ارادہ پورا ہو، ماجد ولین اپنے کمرہ کی طرف لوٹتی ہوئی نظر آتی، یہ دیکھ کر اسے اس قدر صدمہ ہوتا کہ راتوں کی نیند اُڑ جاتی بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا اور کسی پہلو قرار نہ ملتا۔ وہ مجبور ہو کر جنگلوں اور ویرانوں میں نکل جاتا پہاڑوں کی چوٹیوں اور دریا کے کناروں پر حیران و سرگرداں پھرتا رہتا کہ شاید اسی طرح روح کی حدت اور دل کی جلن میں کوئی کمی ہو۔

ان باتوں کو ایک عرصہ گزر گیا، وہ نہ باغ میں گیا نہ اس نے ماجد ولین کو دیکھا اور نہ موکر ہی سے اس کی ملاقات ہوئی، آخر اس کا دل بیٹھنے لگا اور ہر طرف سے مایوس ہوگیا، ایک روز جب وہ کہیں سے واپس ہوا تو اس کو تیز بخار چڑھا ہوا تھا، بےچینی اور کمزوری انتہا کو پہونچ چکی تھی، وہ اپنے کمرے میں آکر گر پڑا اور پھر کئی روز تک اُٹھنے کے قابل نہ ہو سکا اس کا جسم اور جان دونوں علیل تھے اور قوت برداشت بالکل مفقود تھی۔

جنفیاف کو اس کی علالت کی خبر ہو چکی تھی، چنانچہ اس نے جاکر موکر سے کہا موکر اس کی بیماری کا حال سُن کر اس کی عیادت کے لئے اوپر آیا لیکن پوچھنے پر بھی اس نے اپنی صحیح صحیح کیفیت سے مطلع نہیں کیا بلکہ یونہی سی کچھ بات بنا دی، موکر اس سے ایک گھنٹہ تک باتیں کرتا رہا اور جب جانے لگا تو اسٹیفن نے بنفشہ کے پھولوں کا ایک گلدستہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اشارہ کیا جو اسکے سرہانے گلدان میں بڑی خوبصورتی سے رکھا ہوا تھا اور کہنے لگا:-

"یہ چند پھول میں نے ماجد ولین کے لئے چُنے ہیں کیونکہ میں جانتا ہوں اُنھیں ان پھولوں سے بہت دلچسپی ہے

امید ہے کہ آپ میری طرف سے یہ گلدستہ ان کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔"

موکر نے شکریہ کے ساتھ اسے لیا اور رخصت ہو گیا۔

اس کے کئی دن بعد جب وہ اچھا ہو گیا تو ایک روز باغ میں اُترا اور اپنے دل میں ماجد ولین کے سامنے سے نہ بھاگنے کا پختہ ارادہ کر کے اُترا اور یہ عزم کر لیا کہ کچھ ہو اس کے پاس جا کر ضرور سلام کرے گا اور اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کرے گا، ابھی وہ اسی خیال میں محو تھا کہ ماجد ولین سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ بھاگ جانا اسکے لئے ممکن نہ تھا اس لئے بڑھ کر سلام کیا۔ ماجد ولین نے بھی جواب دیا، اسٹیفن نے نگاہیں نیچی کر لیں اور ماجد ولین نے سر جھکا لیا۔ دونوں خاموش تھے اور متحیر۔ وہ اس سکوت کو توڑنے کے لئے الفاظ تلاش کر ہی رہا تھا کہ ماجد ولین نے ابتدا کی اور کہنے لگی:

"آپ کے چہرے سے ضعف و نقاہت کے آثار ابھی تک ظاہر ہیں۔ طبیعت کی افسردگی اور پژمردگی بتلاتی ہے کہ اس مرتبہ آپ نے سخت تکلیف اُٹھائی۔"

اسٹیفن کے منھ سے بجز ہاں کے اور کچھ نہ نکل سکا۔ اور پھر وہ کہنے لگی: "میں آپ کے اس قیمتی ہدیہ اور خوبصورت تحفہ کی جو آپ نے میرے لئے بھیجا تھا بیحد ممنون ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر کس قدر حیرت ہوئی کہ آپ نے وہی پھول بھیجے جو مجھے بیحد پسند ہیں، سچ تو یہ ہے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ الہام ہے۔ مجھے شاعروں پر تعجب ہے کہ وہ اپنے اشعار میں بنفشہ کے پھولوں کا ذکر کبھی نہیں کرتے حالانکہ جن پھولوں کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ ان کے مقابلہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے اور نہ اپنے حُسن و جمال میں اُن کے برابر ہو سکتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ سوائے "گیٹے" کے کسی دوسرے شاعر کا کوئی شعر ان کی تعریف میں میں نے کبھی پڑھا ہو۔"

اس موقعہ پر اسٹیفن کو شعر و شاعری پر اظہار خیال کرنے کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آ گیا اور اس موضوع پر بہت دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ ماجد ولین کی واپسی کا وقت آ گیا اور وہ رخصت ہو گئی۔ اسٹیفن بھی اپنے بالاخانہ پر چڑھ گیا۔ آج وہ طے کر چکا تھا کہ جس چیز کو وہ اس سے زبانی نہیں کہہ سکا ہے اسے لکھ کر اس کے سامنے پیش کرے گا۔

سوزان کا خط ماجد ولین کے نام

"اے ماجد ولین، میں اپنے والد کے ہمراہ تمہارے گاؤں تم سے ملنے کے لئے آنے والی تھی لیکن ایک عجیب و غریب واقعہ مانع آیا۔ ہم لوگوں کو ہمارے ایک دوست نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی اس کا گھر ہمارے گاؤں سے کوئی تین میل کی مسافت پر ہے اور غالباً تمہارے گھر سے تو بہت ہی قریب ہے۔ ہم لوگ ایک روز صبح کو ان کے یہاں گئے

اور چند گھنٹے تک ٹھیرے رہے، ذرا دن ڈھلے سب لوگ اپنے اپنے گھروں سے سیر و تفریح کے لئے میدانوں، باغوں اور سبزہ زاروں کی طرف نکل کھڑے ہوئے، اور اے ماجد ولین تمھیں تو معلوم ہی ہے مجھے فطرت کی اُن تمام نیرنگیوں اور بوقلمونیوں سے جن کا شعراء ذکر کیا کرتے ہیں کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی، جنگلوں اور بیابانوں کے نظارے، پہاڑوں اور نیستانوں کے مناظر میرے لئے اپنے اندر کوئی سامانِ مسرت نہیں رکھتے، پانی کی روانی اور نسیم کا خرام بادلوں کی گرج اور سورج کی تپش پہاڑوں کی چوٹیاں اور ریگستانوں کے نشیب و فراز میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، تاہم میں ان کے ساتھ گئی، میں خاموش تھی اور یہ لوگ گاؤں کی دلچسپ فطرت کے محاسن کے بیان میں رطب اللساں تھے مگر ان لوگوں کی حالت بھی ان مکار اور زمانہ ساز مصنفوں سے کچھ بہتر نہ تھی جو دہقان کی اہمیت اور اس کی تعریف میں ورق کے ورق سیاہ کر دیتے ہیں اور اُس کے ہاتھوں کی ثنا و صفت میں جو نوع انسانی کی خدمت کے لئے وقف ہیں قصیدے لکھ مارتے ہیں۔ لیکن یہی مسکین اگر کبھی ان لوگوں کے پاس سے نکل جاتا ہے اور غلطی سے مصافحہ کے لئے ان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیتا ہے تو ان کے ہاتھ رک جاتے ہیں، اس ڈر سے کہ کہیں اس کے میلے اور کالے ہاتھ انکے نرم و نازک ہاتھوں کو آلودہ نہ کر دیں۔

ہم لوگ اسی طرح باتیں کرتے چلے جا رہے تھے یہاں تک کہ دریا کے قریب پہونچ گئے، ہم نے دیکھا اور یہ دیکھ کر ڈر گئے کہ دریا کے دوسرے کنارے پر بہت سے لوگ جمع ہیں، ایک دوسرے کو ڈھکیل رہے ہیں انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر پانی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور ہر طرف سے "دوڑو پکڑو ڈوبا ڈوبا" کی آوازیں چلی آ رہی ہیں ان کی یہ چیخ پکار سن کر ہم بھی اسی طرف کو دیکھنے لگے جدھر یہ لوگ اشارے کر رہے تھے۔

ہم نے دیکھا کہ ایک شخص موجوں کی قربانگاہ پر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ موت اور موت اس پر قابو پانا چاہتی ہے۔ جب وہ اُبھرتا تھا تو لوگوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا تھا لیکن کوئی ہاتھ اسے اپنی طرف اُٹھتا ہوا نظر نہیں آتا تھا اور جب بیٹھ جاتا تھا اور پانی کی سطح اس کے اوپر ہموار ہو جاتی تھی تو خود ہمیں بھی اس کی موت کا یقین ہو جاتا تھا، الغرض وہ اسی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ڈوبتا اُچھلتا رہا، یہاں تک کہ اس کے بازو شل ہو گئے اور قوتیں جواب دے گئیں اس کی آنکھیں سفید ہو چلی تھیں اور رنگ بدل گیا تھا۔ دیکھنے والے کچھ تو رو رہے تھے اور کچھ چیخ رہے تھے اور کچھ ایک دوسرے کی طرف اس امید میں دیکھ رہے تھے کہ کون نیک دل اور بلند ہمت شخص اس کی مدد کے لئے بڑھتا ہے ہم ابھی اسی امید و بیم میں تھے ایک شخص برہنہ تن، بھیڑ کو چیرتا لوگوں کو ہٹاتا تیر کی طرح نکلا اور دریا میں کود پڑا اور دریا کی موجوں سے لڑتا ہوا ٹھیک اس جگہ پہونچ گیا جہاں وہ شخص ڈوبا تھا۔ وہاں پہونچکر اُس نے غوطہ لگایا۔ پانی طرفۃ العین میں پھٹا اور وہ اس شخص کا بازو پکڑے ہوئے پانی کے اوپر لے آیا۔ لوگوں نے اس کی ہمت و جرأت پر آفریں کہی لیکن قبل اس کے کہ ہمارے ہوش و حواس بجا ہوں، پہلے سے بھی زیادہ خوفناک نظارہ ہمارے سامنے تھا، ہم نے دیکھا کہ

ڈوبنے والا شخص اپنے بچانے والے کو دیکھ کر کچھ دیوانہ سا ہوگیا، شاید اسے خیال ہوا کہ یہ شخص اس کے ساتھ دشمنی کر رہا ہے اور اس کے بازو کو اس لئے پکڑے ہوئے ہے کہ اسے پانی کی گہرائیوں میں پہونچا کر اس کی قسمت پر آخری مہر لگا دے چنانچہ اس نے اپنے آپ کو اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی اور پوری قوت کے ساتھ اس کے سینہ میں ایک گھونسا مارا، اپنی اونگلیاں اسکی گردن میں پیوست کر دیں اور اُسے اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں رکھ کر کچھ اس زور سے دبایا کہ ہم تو یہی سمجھے کہ اس کی ہڈیاں چور چور ہوگئی ہوں گی۔ چنانچہ وہ خود بھی اپنی زندگی سے ناامید ہوگیا اور سمجھ گیا کہ اب موت یقینی ہے۔ اس نے اسی وقت اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دئے اور کسی کا نام لیا اور اے ماجد ولین شاید وہ تمھارا ہی نام تھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکی کہ اُس کا کیا مقصد ہے اور یہ کون ماجد ولین ہے۔ اتنے میں موجوں نے پھر ان دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا اور حسب معمول اتراتی ہوئی اوپر سے نکل گئیں۔ ہمارے دلوں کی دھڑکن تیز ہوگئی ہونٹ خشک پڑ گئے گلوں میں پھندے پڑنے لگے گردنیں اونچی ہوگئیں خون کی روانی ہلکی اور جسم کے جوڑ جوڑ ڈھیلے پڑ گئے کئی منٹ اسی طرح گزر گئے نہ ہوائیں رکیں اور نہ موج اُٹھی۔ میں حیران و پریشان اپنے والد کے پاس آئی اور پوچھنے لگی: "کیوں ابّا جان کیا ڈوب کر مرنے والوں کو بھی موت کی تکلیف ہوا کرتی ہے"؟ مجھے روتا ہوا دیکھ کر میرے والد بھی آبدیدہ ہوگئے اور کہنے لگے: "ہاں بیٹی بہت تکلیف ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ صورت ہوتی ہے کہ ڈوبنے والا پانی کی گہرائیوں میں کسی پتھر کو تلاش کرتا ہے تاکہ اس کی ایک ہی ضرب سے اپنے مصائب و آلام کا خاتمہ کر دے"۔

یہ سُن کر میں ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی اور ہاتھ اُٹھا کر خدا سے دعائیں کرنے لگی۔ میں اپنی دعاؤں میں کھوئی ہوئی اپنے گرد و پیش سے بیخبر تھی کہ یکایک دریا کے کنارے سے پھر وہی شور اُٹھا۔ اب دریا اس شخص کو پھر اُگل رہا تھا اور وہ تن تنہا پانی کی سطح پر اُبھر رہا تھا۔ لوگ اسے زندہ دیکھ کر اپنی اپنی طرف بلانے لگے کیونکہ اب خود اس کی اپنی زندگی خطرہ میں پڑ چکی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر غوطہ لگایا اور ڈوبنے والے کو کندھے پر لئے ہوئے نکل آیا اور بصد مشکل اسے کنارے تک لیجانے میں کامیاب ہوا۔ یہاں پہونچکر وہ دونوں گر گئے اور سب لوگ انھیں سنبھالنے میں مشغول ہوگئے۔ یہانتک کہ ڈوبنے والے کو ہوش آگیا اور رخصت ہوگیا۔ اُس کے بعد جب سب لوگ اِدھر اُدھر چلے گئے تو بچانے والا شخص بھی اپنی جگہ سے اُٹھا کپڑے پہنے اور بدقت تمام بنفشہ کے اُن پیڑوں کی طرف جو ساحل کے برابر برابر دور تک پھیلے ہوئے تھے روانہ ہوگیا اور اس کے پھول توڑ توڑ کر اپنے دامن میں جمع کرنے لگا۔

بہت ممکن ہے اس واقعہ کی یادگار میں کوئی گلدستہ بنانا چاہتا ہو۔ بس ہم لوگ اسے اسی حال میں چھوڑ کر خاموشی اور افسردگی کو اپنے ساتھ لئے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو واپس آگئے۔ اور اے ماجد ولین تمھاری ملاقات کی امید اُس روز پوری نہ ہوسکی۔

میں اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتی۔ کیونکہ جب مجھے اس واقعہ کا خیال آجاتا ہے تو مجھے اس قدر اذیت

و تکلیف پہونچتی ہے گویا یہ سب کچھ اسی وقت میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ اچھا اب پھر لکھوں گی خدا حافظ۔"

"انکشاف"

سورج اُفق مغرب کی طرف اُترنے لگا، تاریکی روشنیوں پر چھانے لگی، خاموشی ہر طرف بڑھ چلی اور گھونسلوں میں بسیرا لینے والے پرندوں کی آوازوں کے علاوہ تمام آوازیں خاموش ہوگئیں۔ اسٹیفن اسوقت باغ میں زیزفون کے درختوں کے نیچے بیٹھا ہوا ماجد وکین کے آنے کا انتظار کر رہا ہے، اس نے ماجد وتین کے نام ایک خط لکھا ہے اور جس چیز کے اظہار سے اس کی زبان قاصر تھی اسے زبانِ قلم سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس وقت اس خط کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے پڑھ رہا ہے اس کا خیال ہے کہ یہ خط کچھ زیادہ موثر و دلکش نہیں ہے اور اس کے ہر ہر جملہ میں کوئی نہ کوئی کمی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ وہ دوسرا خط لکھے گا جو اس سے زیادہ دلکش و موثر ہوگا وہ ابھی اسی خیال میں تھا کہ اس نے ماجد وکین کو ہاتھ میں ایک خط لئے ہوئے اور اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ قریب آکر وہ مسکرائی اور کہنے لگی:

"کیوں جناب آپ کو وہ جگہ تو یاد ہوگی جہاں سے بنفشہ کے وہ پھول لاکر آپ نے مجھے تحفتہً بھیجے تھے؟"

اسٹیفن اس سوال سے کچھ پریشان تو ہوا لیکن پھر سنبھل کر بولا:۔

"جی ہاں، یہاں سے دو تین میل کے فاصلہ پر ایک دریا ہے جسکے کنارے بنفشہ کے بہت سے درخت لگے ہوئے ہیں"

وہ خط اس کی طرف بڑھا کر کہنے لگی لیجئے اسے پڑھئے اس میں آپ ہی کا ذکر خیر ہے، اسٹیفن نے وہ خط اس کے ہاتھ سے لے لیا اور شروع سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا، یہ سوزان کا خط تھا۔ پڑھ کر اس نے خاموشی سے واپس کر دیا وہ حیران تھا کہ کیا کہے۔ آخر ماجد وکین نے خود ہی اس سکوت کو توڑا اور کہنے لگی:

"اسٹیفن تم مجھ سے اپنے دل کی باتیں چھپاتے ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ دریا کے اس حادثہ نے تمھارے ساتھ کیا کیا اور تم پر کیا گزرا اور یہ اسی کا اثر تھا کہ تم اتنے دن بخار میں مبتلا رہے"۔

یہ کہکر اس نے اسٹیفن کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ہاتھوں کا ملنا تھا کہ دل دھڑکنے لگے گویا بجلی کے دو تار تھے جن کے ملتے ہی فانوس روشن ہوگئے۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں اسی طرح خاموش بیٹھے رہے اور کچھ نہ بول سکے۔ مگر محبت کے اُن روشن نقوش کو جو ایسے وقت میں پیشانیوں پر اُبھر آتے ہیں نگاہیں ضرور پڑھتی رہتی ہیں۔ اسٹیفن نے بھی ماجد وکین کے چہرے میں محبت کی تمتماہٹ، عشق کا التہاب، غم کی جھلک اور اضطراب محسوس کیا اور اسٹیفن کے چہرے میں ماجد وکین نے بھی محبت، اور اس کی جگمگاتی ہوئی مسرتوں کو اس کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں میں دیکھ لیا، آخر کار وہ بھی ضبط نہ کرسکی اور محبت کا پہلا آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک پڑا۔ اسٹیفن اُسے

روتا ہوا دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور انتہائی دردمندی کے ساتھ اس نے ماجد وکین کا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ لیا۔

اس طرح شاید وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ جس محبت کا اظہار وہ زبان سے نہ کر سکا تھا جس دردِ پنہاں کی تصریح الفاظ سے ممکن نہ تھی اور جس آتشِ شوق کی لپٹیں اس تک نہ پہونچ سکیں تھیں وہ اسے خود محسوس کرلے، اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے، اس کے بعد وہ اس کے قدموں پر جھک گیا اور کہنے لگا:۔

"کیوں ماجد وکین کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نے پھر وہی سوال کیا لیکن وہ پھر بھی خاموش رہی اب اسنے نہایت ہی عاجزی سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا اور کہنے لگا:

"اے ماجد وکین رحم کرو، مجھے ڈر ہے کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں، اور یہ سب کچھ میرے ان خیالات کا پرتو تو نہیں جو خوابوں ہی میں میرے لئے وجہ سکون و سامان مسرت ہوا کرتے ہیں اور جب بیدار ہوتا ہوں تو طعنۂ نایافت کے علاوہ کچھ بھی میرے پاس نہیں ہوتا۔ لہٰذا اے ماجد وکین آج تم مجھ سے محبت کا اقرار کرو تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ تم میرے سامنے موجود ہو اور میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں"۔

وہ دونوں بہت دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے اور زندگی کی یہ ساعتیں کسقدر قیمتی تھیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اپنے زمانہ شباب میں یہ مبارک دن کبھی نصیب ہوا ہو، اس وقت انھیں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ دُنیا اور اسکے ہنگامہ سے گزر کر، عافیت و سکون کے ایک ایسے گوشہ میں پھر پہونچ گئے ہیں جو جنت سے کم نہیں ہے اور اس وقت ان کی روحیں قید جسم سے آزاد ہو کر فضاء بسیط میں کبھی آسمانوں پر سیاروں کی حرکت کا مشاہدہ کرتی ہیں اور کبھی فرشتوں کی صفوں سے گزر کر ان کی تسبیح و تہلیل کو اپنے کانوں سے سنتی ہیں اور کبھی فردوس میں پہونچکر اس کے لولو و مرجان کو پرکھتی اور اس کے باغ میں تفریح کرتی پھرتی ہیں۔

وہ اسی طرح عالم بیخودی میں کھڑے ہوئے تھے کہ ماجد وکین نے جنفیاف کے پکارنے کی آواز سُنی، وہ اُٹھ بیٹھی اور "کل اسی وقت اسی جگہ پھر ملوں گی" کہتی ہوئی اس نے اسٹیفن کی طرف رخصت کا ہاتھ بڑھایا، اس نے بھی اپنی محویت میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کی طرف اپنا ہاتھ پھیلا دیا، وہ چلی گئی اور وہ اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ اس کے دوپٹہ کا آخری سرا بھی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو گیا۔

اسٹیفن کچھ دیر تو اسی جگہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا جیسے ابھی تک ماجد وکین اس کے سامنے بیٹھی ہے، لیکن جب دروازہ بند ہونے کی آواز اس کے کانوں میں پہونچی اور اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہے۔

ماجد وکین کے چلے جانے کے بعد اسٹیفن کا جدھر کو منھ اُٹھا نکل گیا، وہ اس وقت بڑی تیزی سے چلا جا رہا تھا

اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آج وہ آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں، میدانوں اور دریاؤں بلکہ کائنات کے ہر ہر ذرہ کو اپنی خوش نصیبی اور مسرت پر گواہ بنانا چاہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سعادت جو اسے نصیب ہوئی ہے اس کی طاقت برداشت سے باہر ہے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ہر اس شخص سے جو اسے راستہ میں ملے اپنا قصّہ سُنائے اور اپنی خوش بختی کا کچھ حصہ اسے بھی بخشدے۔

وہ کھیلتے ہوئے بچّوں کے پاس سے گزرا اور انھیں اپنے آس پاس جمع کر کے ایک ایک کو پیار کرنے لگا اور جو کچھ اسکی جیب میں تھا وہ سب تقسیم کر دیا اور اگر اس کے پاس آج کائنات کے پوشیدہ خزانوں کی کُنجیاں ہوتیں تو ان لمحات محبت کی یاد میں وہ ان خزانوں کو لٹا دیتا اور صفحۂ زمین پر کسی کو بدقسمت اور بدنصیب نہ رہنے دیتا۔

وہ اسی طرح تاریکی کے پردوں کو چیرتا چلا جا رہا تھا، کہ باغ کے دروازہ کو کھُلا ہوا دیکھ کر اس میں داخل ہو گیا اور اُسی جگہ جا کر بیٹھ گیا جہاں اب سے کچھ دیر پہلے بیٹھا ہوا تھا اور ماجد ولین کے کمرے کی اس روشنی کو جو پردے میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی دیکھنے لگا۔

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ اس کے اُٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ اور کتاب کے ورق لوٹنے کی آواز سُن رہا ہے۔ وہ بیٹھا رہا یہاں تک کہ روشنی گل ہو گئی اور وہ اپنے کمرہ میں واپس آ کر ایسی میٹھی نیند سویا اور ایسے ایسے دلفریب خواب دیکھے جو بچپن کے بعد سے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

"اسٹیفن کا خط ماجد ولین کے نام"

"میں جس جگہ کل تمھارے سامنے کھڑا تھا اُس کی یاد ابتک میرے ذہن میں تازہ ہے اور اس وقت بھی میرا ہاتھ میرے سینہ پر رکھا ہوا ہے اور میں اپنے دل کو تلاش کر رہا ہوں اور ڈر رہا ہوں کہیں اس مسرت کی تاب نہ لا کر میرا دم نہ گھٹنے لگے۔

اے ماجد ولین، حُسن و جمال کی وہ نعمت جو خدا نے تمھیں بخشی ہے مجھے نہیں دی ہے۔ اور دلکشی و لطافت احساس کا جو زیور تمھیں ملا ہے میں اس سے عاری ہوں، اس لئے اے ماجد ولین اگر تم نے مجھ سے محبت کی ہے تو یہ ایک ایسے شخص کی محبت ہے جو نوجوانوں کی بعض پسندیدہ خوبیوں سے خالی ہے اور اس کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ تمھاری طرف اسی وسیلہ سے پہونچ سکے جس وسیلہ سے تم اس کی طرف پہونچی ہو، یا اُس سعادت کے بدلے تمھیں حاصل کر سکے جو تم نے اسے بخشی ہے۔ پس اگر تم سمجھتی ہو کہ پُر خلوص محبت، پاس عہد اور خالص جاں سپاری جس میں تاسف و شرمندگی کی آمیزش نہ ہو کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے محبت کی جا سکتی ہے تو اے ماجد ولین، میں یہ سب چیزیں تمھاری جناب میں پیش کرتا ہوں۔ تم میری طرف سے انھیں قبول کر لو اور کہ دو کہ تم نے اسے قبول کر لیا ہے۔"

عہد

اسٹیفن نے یہ خط اپنے ہاتھ سے ماجد ولین کو دیا، وہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی اور بڑی حیرت سے اُسے دیکھنے لگی، لیکن جب اسٹیفن نے اپنی ملتجی اور رحم طلب نگاہوں سے اُسے دیکھا تو وہ خط اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا اور کہنے لگی:

"اے اسٹیفن، کیا یہ صحیح ہے جیسا کہ سوزان نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ جس وقت تم اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اس وقت آخری لفظ جو تمھاری زبان سے نکلا وہ میرا نام تھا"

اس نے کہا "ہاں! اور یہ اسی نام کی برکت تھی کہ مجھے موت سے نجات ملگئی"۔

ماجد ولین بولی:

"اے اسٹیفن، یہ ضرور ہے کہ تمھیں اس حادثہ میں بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں، لیکن اس واقعہ کے بعد سے تمھارا شمار دنیا کے محسنین میں ہونے لگا ہے"۔ اس نے کہا "نہیں یہ بات تو نہیں ہے، لیکن اے ماجد ولین اس روز میرے اوپر جو کچھ گزرا وہ حقیقت میں میری قوت برداشت سے باہر تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں کسی گڈھے میں گرتا چلا جا رہا ہوں مگر جب میں نے تمھیں یاد کیا تو تمھاری یاد نے مجھے عجیب راحت بخشی اور میں جب کبھی بھی اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ تم ہی میری نجات کا سبب تھیں۔ کنارے پر پہونچکر میں نے وہ چند پھول جمع کئے تھے جو تمھارے اس احسان عظیم کی یاد میں تمھیں بھیجے تھے"۔

یہ سنکر ماجد ولین نے جیب میں سے جوہی کے پھولوں کا ایک گلدستہ نکالا اور کہنے لگی:

"آج صبح میرے والد نے میرے لئے یہ چند پھول جمع کئے تھے اور میں تمھاری اس پیشکش کے جواب میں یہ گلدستہ تمھیں نذر دینے لائی ہوں"

اسٹیفن نے وہ گلدستہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے توڑ کر اس کے پھولوں کو اپنے سامنے بکھیر دیا اور پھر انھیں ایک ٹے دھاگے میں گول حلقے کی شکل میں گوندھنے لگا یہاں تک کہ وہ ایک خوبصورت تاج کی طرح ہو گیا۔ پھر اسے ماجد ولین کے سر پر رکھ کر کہنے لگا کہ:

"جو شخص بھی اس چمکتے ہوئے تاج کو اس روشن پیشانی پر دیکھے گا یہی کہیگا کہ شادی کا سہرا دُلہن کے سر پر بندھا ہوا ہے"

اس جملے نے ماجد ولین پر بہت گہرا اثر کیا اور اس نے شرما کر گردن نیچی کر لی۔ پھر تھوڑی دیر بعد جب سر اُٹھایا تو دو خوبصورت اور چمکدار آنسو اُسکی آنکھوں میں چمک رہے تھے، اسٹیفن کہنے لگا:

"ہائیں، اے ماجد ولین، کیوں روتی ہو، اس دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو میرے اور تمھارے درمیان حایل ہو سکے"

ماجدولین بولی:

"میں تو محبت کے خوف سے روتی ہوں، تمھیں معلوم ہے کہ میں ایک غریب بے ماں کی لڑکی ہوں اور پھر اس لڑکی کی طرح جو اپنی ماں کی محبت سے محروم ہو چکی ہو، مسرت کے خیال سے کانپ اُٹھتی ہوں"

اسٹیفن بولا:

"اے ماجدولین محبت سے نہ ڈرو، یاد رکھو، جس خدا نے سورج کو چمک، پھولوں کو مہک اور آنکھوں کو نور بخشا ہے اسی خدا نے دلوں کو درد محبت دیا ہے اس لئے اے ماجدولین تم میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاؤ اور میرے ساتھ قسم کھاؤ کہ ہم کبھی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور اگر بدقسمتی سے ہمیں کسی روز جدا ہونا پڑا تو وہی دن ہماری زندگی کا آخری دن اور وہ فراق ہمارا دائمی فراق ہوگا"

چنانچہ ماجدولین نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا اور دونوں نے محبت کی قسم کھائی

"اسٹیفن کی طرف سے ماجدولین کے نام"

"میں نے تمھیں بہت بہت لکھا، لیکن تم نے تو مجھے تھوڑا یا بہت کچھ بھی نہ لکھا، غالباً دوسری لڑکیوں کی طرح تمھارا بھی یہی خیال ہے کہ وہ عورت جو اپنے حبیب کو محبت کا خط لکھتی ہے وہ یا تو گنہگار ہے یا جوہر شرافت سے خالی ہے، لیکن اس کے برخلاف میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو یہ اس کا تصنع ہے۔ کیونکہ وہ لڑکی جو اپنے دل کو خالص محبت کے زیر اثر واقعی اور حقیقی طور پر کسی کے نذر کر چکی ہو، وہ اسے عیب نہیں سمجھ سکتی کہ اپنے حبیب کو اسی طرح خط لکھے جس طرح وہ اس سے باتیں کیا کرتی ہے۔

اظہار محبت میں احتیاط در حقیقت ان عورتوں کا طریقہ ہے جو ہر روز اپنے لئے ایک نیا شخص تلاش کرتی ہیں اور پوری دیانتداری کے ساتھ اسے یقین دلاتی ہیں کہ اس سے پہلے ان کی آغوش محبت کبھی کسی دوسرے شخص کے لئے نہیں کھلی تھی، کیونکہ وہ ڈرتی ہیں کہ مبادا آج وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھیں جو کل ان کے حق میں ان کے بازار کو سرد کر دے لیکن شریف عورتیں، بہت بلند ہوتی ہیں ان کا عشق کامل اور محبت سچی ہوتی ہے وہ جو بات زبان سے کہتی ہیں اس کو لکھ بھی سکتی ہیں۔

اے ماجدولین، جو شخص تمھاری باتوں کو نہاں خانۂ دل میں چھپا سکتا ہے وہ تمھارے خطوط کی حفاظت بھی کر سکتا ہے اور خوب سمجھ لو کہ جو شخص تمھارے خطوں کو تمھارے خلاف پیش کر کے تمھیں بدنام کرنے کی کوشش کرے، وہ میرے علاوہ کوئی اور شخص ہوگا، اور جو لڑکی اس بات پر راضی ہو جائے کہ اپنے دل کو ایک ایسے شخص کی نذر کر دے جو عورتوں کے بھیدوں سے تجارت کرنے کا خواہشمند ہو وہ تمھارے علاوہ کوئی دوسری لڑکی ہوگی۔

"سمندر"

اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا کہ ماجد وکین اور اسٹیفن کبھی گھر میں، کبھی باغ میں، کبھی جنگل میں اور کبھی دریا کے کنارے برابر ایک دوسرے سے ملتے رہتے، اکثر وہ دونوں بنفشہ کی جھاڑیوں کے پاس بیٹھ جاتے اور دریا کے حادثہ کا ذکر اور اُس گلدستہ کی یاد ان کی گفتگو کا موضوع بن جاتی اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ وہ دونوں ایک چھوٹی سی کشتی پر سوار ہو کر سمندر کی سیر کو نکل جاتے۔

چنانچہ ایک روز وہ دونوں کشتی میں سوار ہو کر سمندر کی سیر کو روانہ ہوئے، شام ہو چکی تھی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخ چادر اُفق مغرب پر پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ سورج غروب ہو گیا اور چاند نمودار ہو کر اسکی نیابت کے فرائض انجام دینے لگا۔

وہ دونوں اس دلچسپ نظارہ سے متاثر ہو کر سمندر کو غور سے دیکھنے لگے۔ سمندر کا پانی آئینہ کی طرح شفاف تھا اور ہوا بہت لطیف تھی، سناٹا ہر طرف چھایا ہوا تھا اور سمندر میں گرتے ہوئے پانی کے علاوہ کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چاند خوب روشن تھا اور تاریکی کے پردے اُٹھ چکے تھے۔ اور اس کی نیلگوں شعاعیں کشتی، سمندر ساحل اور آس پاس کی تمام چیزوں پر برس رہی تھیں۔

یہ دلفریب نظارہ، یہ ہمہ گیر خاموشی اور یہ مکمل تنہائی کچھ اس درجہ بے اختیار کر دینے والی تھی کہ انھوں نے کشتی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا، اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔

اسٹیفن، ماجد وکین سے کہہ رہا تھا:

"اے ماجد وکین، میرا دل چاہتا ہے کہ آیندہ ہمارا گھر کسی دریا کے کنارے ہو، اور ہمارے پاس اس سے ذرا بڑی ایک کشتی ہو تاکہ چاندنی راتوں میں ہم اس میں بیٹھ کر دریا کی سیر اور مچھلیوں کا شکار کیا کریں، اس کے علاوہ میری یہ تمنا بھی ہے کہ ہمارے گھر میں ایک چھوٹا سا باغ ہو جس میں ہم اپنی خواہش کے مطابق انگوروں کی بیلیں، پھلوں کے درخت اور پھولوں کے پودے لگایا کریں، اور بنفشہ کے درخت تو میں خود تمھارے لئے اپنے ہاتھ سے لگاؤں گا اور پھر گھر کے متعلق میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس میں دو طبقے ہونا چاہئیں، بالائی منزل میں چار کمرے ہوں، ایک مہمانوں کے لئے، دوسرا کتابوں کے لئے، تیسرا کپڑوں کے لئے۔" یہ کہکر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر کہنے لگا اور چوتھا کمرہ صرف تمھارے اور میرے لئے۔"

ماجد وکین بولی:

"لیکن تم دو اور کمروں کا ذکر کرنا بھول ہی گئے ایک تمھارے بھائی اور دوسرا میرے والد کے لئے۔"

اسٹیفن نے کہا:

"بیشک یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ بالائی منزل میں چھ کمرے ہوں، اور نیچے کے طبقہ میں ایک کمرہ کھانے کا، دوسرا سامان کا اور تیسرا ملازمین کا ہو، مگر ایک حمام ہونا بھی ضروری ہے اور ایک ایسے کمرے کی بھی ضرورت ہے جو گھر کی بعض دیگر ضروریات کے لئے خالی رہے۔

ماجد ولین کہنے لگی:

"لیکن ایک بات آپ پھر بھول گئے، باغ اسی وقت خوشنما ہو سکتا ہے جب اس کے درمیان ایک چھوٹا سا فوارہ بھی ہو جس سے صاف و شفاف پانی اُچھلتا اور قطرے ہو ہو کر پھیلتا رہے"۔

اسٹیفن بولا:

"تم ٹھیک کہتی ہو ہم اس حوض میں رنگ رنگ کی مچھلیاں بھی پالیں گے۔ لیکن اے ماجد ولین، ہمیں اُسکے چاروں طرف کافی بلند جنگلا لگانا پڑے گا، ورنہ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچّوں کی پوری طرح حفاظت نہ ہو سکے گی"۔

یہ سُن کر ماجد ولین شرما گئی، اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی اور رونے لگی۔

اسٹیفن گھبرا گیا اور کہنے لگا:

"اے ماجد ولین، کیوں رو رہی ہو"۔ اس نے کہا:

"اے اسٹیفن، زمانہ بہت بخیل ہے وہ دُنیا کی تمام نعمتیں کسی ایک شخص کو نہیں دے سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہیں ہم اپنی ان آرزؤں میں ناکام نہ ہوں اور اپنے مستقبل کے اس تصور میں غلطی پر نہ ہوں۔ اس لئے میں تو یہ کہتی ہوں کہ زمانہ اگر آئندہ کسی وقت بھی ہمارے اور ہماری مسرتوں کے درمیان حائل ہو سکتا ہے تو وہ اسی وقت اپنا بیرحم ہاتھ ہماری طرف بڑھا کر اُس وقت سے پہلے ہی ہماری روحوں کو نکال لے تاکہ موت کی تلخی ہمارے لئے کچھ ہلکی ہو جائے"۔

اسٹیفن بولا: "اے ماجد ولین، ڈرو نہیں زمانہ کا بیرحم ہاتھ دو محبّت کرنے والوں کو اس وقت تک برباد نہیں کرتا جب تک کہ محبّت کرنے والے خود ہی اس چیز کے خواہشمند نہ ہوں، اس لئے مایوس نہ ہو تاکہ میں تمھاری محبّت و قوت کی طاقت سے جری ہو کر مصائب کو دعوتِ مقابلہ دے سکوں"۔

یہ سُنکر وہ چُپ ہو گئی اور پھر دریا اور اس میں کشتی کی روانی کو دیکھ کر کہنے لگی:۔ "اگر انسان اپنے لئے ہر چیز کی تمنا اور خواہش کر سکتا تو میں بھی تمنا کرتی کہ یہ راستہ جس پر ہم اس وقت چل رہے ہیں ابدیت اور دوام کا راستہ ہوتا اور یہ کشتی جو ہمیں لئے ہوئے بہتی چلی جا رہی ہے اس وقت تک کہیں نہ رکتی جب تک آسمان کے دروازوں میں داخل نہ ہو جاتی"۔

اس کے بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگی:۔ "اے اسٹیفن اب بس کرو، چاند چھپنے کے

قریب ہے اور میں اسے چھپتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ کیونکہ ڈرتی ہوں کہیں اس کے چھپتے ہی ہماری مسرتوں کا چاند بھی نہ چھپ جائے"۔

یہ سُن کر وہ بھی اس کی طرف خاموش اور غم آلود نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا خود اس کا دل بھی انھیں خطرات کا جولانگاہ بنا ہوا ہے، چنانچہ وہ اُٹھا اور پتوار اُٹھا کر کشتی کا رُخ پھیر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کنارے پر پہونچ گئے اور جب جدا ہونے لگے تو اسٹیفن نے ماجد ولین کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے قریب لاکر چومنا چاہا، لیکن جب وہ اس پر راضی نہ ہوئی تو اس کی پیشانی چوم لی۔ ماجد ولین کانپنے لگی اور اسٹیفن پر ایک نگاہ خشم آلود ڈالتی ہوئی لوٹ گئی۔

"ماجد ولین کی طرف سے اسٹیفن کے نام"

"اے اسٹیفن یہ تم نے کیا غضب کیا۔ گزشتہ رات میرے صبر و سکون کو لوٹ لیا۔ میں جب خیال کرتی ہوں کہ تم نے میری پیشانی کو داغدار بنا دیا تو میری حالت دگرگوں ہو جاتی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اب بھی میری پیشانی پر دہکتا ہوا انگارا رکھا ہے، افسوس میری کتاب زندگی کا جو ورق کل رات سے پہلے آئینہ کی طرح شفاف تھا، آج میں اُسمیں ایک سیاہ دھبہ دیکھ رہی ہوں، میں نے اسکے دھونے مٹانے اور دور کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکی رات بھر میری آنکھوں سے جوئے خون بہتی رہی ہے اور تمام شب میں جناب باری میں سربسجود رہی ہوں، معلوم نہیں میرا کیا حشر ہو اور اس جُرم کی پاداش کیا ملے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس سیاہ پیشانی کو لیکر قیامت میں کس طرح خدا کے سامنے ہو سکوں گی اور اپنی یہ گناہگار صورت کیونکر دکھا سکوں گی۔

اگر میں اپنے دل کو یہ کہکر تسلی نہ دے لیتی کہ اس گناہ کی تمامتر ذمہ داری تم پر ہے اور میری رضا و رغبت اس میں شامل نہ تھی تو یقیناً میں خودکشی کر چکی ہوتی، اے اسٹیفن آیندہ اس قسم کی جرأت کبھی نہ کرنا، ورنہ خوب سمجھ لو مجھے زندہ نہ دیکھ سکوگے۔

"اسٹیفن کی طرف سے ماجد ولین کے نام"

"اس سے پہلے مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ لڑکی جو محبت کرتی ہے اور خلوص و صداقت کے ساتھ پیمان وفا باندھتی ہے اپنے محبت کرنے والے کے پیار سے اس قدر مکدر ہو سکتی ہے۔ حالانکہ وہ پیار اس پیار سے کہیں زیادہ معصوم ہوتا ہے جو ایک بھائی اپنی بہن کی پیشانی کو چوم کر ظاہر کرتا ہے۔

اے ماجد ولین میرا خیال ہے کہ تم نے یہ سمجھ کر کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے خود اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے، کیونکہ تمھیں مجھسے محبت نہیں ہے۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ تمھاری آنکھوں کا میرے سامنے اشک آلود ہونا، تمھارے ہاتھ کا میرے ہاتھوں میں کانپنا اور تمھارے دل کی تڑپ کا مجھے دیکھ کر سوا ہو جانا، کچھ اس لئے نہ تھا کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے بلکہ صرف اس لئے کہ تم مجھ سے ملتے ہوئے ڈرتی ہو۔

تم مجھ سے کہتی ہو کہ رات بھر تم ایک عذاب الیم میں مبتلا رہیں، نہ چین سے لیٹیں نہ سو سکیں، لیکن میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اس رات سے زیادہ مبارک رات اپنی زندگی میں کبھی بسر نہیں کی، کیونکہ تمام رات میں تمھاری پیشانی سے چُنے ہوئے پھولوں کی یاد میں محو رہا۔

اے ماجد ولین مجھے معاف کرنا، میں نے تمھاری پیشانی کو اپنے ہونٹوں سے اگر آلودہ کیا تو صرف اس خیال سے کہ میں تمھیں اپنا شریک زندگی سمجھتا تھا، میرے نزدیک صدق و اخلاص کے اُس عہد و پیمان میں جو خلوتکدۂ محبت میں کیا جاتا ہے اور شادی کے اُس اقرار میں جو کسی کاہن کے سامنے ہو، کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔

میں اُس مختصر مسرت کے لئے جو تمھاری محبت کی رہین منت ہے تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک میں نے اس عہد کو جو تم سے کیا تھا نہیں توڑا ہے اور تم کو ہمیشہ محبت کی اسی نگاہ سے دیکھتا رہوں گا، کیونکہ میری محبت کچھ تمھاری محبت کا جواب نہ تھی اور نہ اس لئے تھی کہ تم بہت خوبصورت ہو، بلکہ اے ماجد ولین، میری محبت صرف محبت کے لئے تھی اور بس۔"

"ماجد ولین کی طرف سے اسٹیفن کے نام"

"اسٹیفن مجھے معاف کر دو، یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ تم میرے خط سے اتنا گہرا اثر قبول کروگے، یا میرے مختصر سے الفاظ تمھارے لئے اتنا وسیع مفہوم پیدا کر دیں گے۔ خیر مجھے معاف کرو میں غلطی پر تھی۔ خدا گواہ ہے میں نے یہ سب کچھ تمھارے لئے کہا تھا۔ آج اگر میں نے اپنے آپ کو تم سے بچایا تو اس لئے کہ کل کو اسے تمھارے حوالہ کر دوں، آج تم میرے محبوب ہو اور کل میرے شوہر ہوگے اور میں اپنے محبوب سے یہی چاہتی ہوں کہ وہ مجھے میرے شوہر کے پاس پاک و صاف بھیجے۔ جس مکر و فریب کا ذکر تم نے اپنے خط میں کیا ہے اس کے متعلق میرا یہ اعتقاد ہے کہ تم میرے متعلق ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جس کے غلط ہونے کا خود تمھیں بھی یقین ہے۔ لیکن چونکہ تم غصہ میں ہو اس لئے اپنے علم و ضمیر کے خلاف کہہ رہے ہو۔"

"مولر کا خط اسٹیفن کے نام"

"میں تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں، اور ندامت سے میرا ہاتھ کانپ رہا ہے، غم و اندوہ سے میری روح بےچین ہے۔ میں کبھی یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ میری زندگی میں کوئی وقت ایسا بھی آئے گا جب میں اپنے ایک ایسے دوست سے جس کی انتہائی عزت

کرتا ہوں یہ کہنے پر مجبور ہوں گا کہ میں آج سے اسے اپنے گھر میں خوش آمدید نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ جس گھر میں میں اور میری بیٹی ہو اس میں وہ اپنی سکونت برقرار رکھے۔ مجھے اپنی شرافت کا پاس دوستوں کی دوستی سے کہیں زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود میں تم سے بھی امید کرتا ہوں کہ میری طرح تم بھی مجھے اپنا مخلص دوست سمجھتے رہو گے اگرچہ زمانہ ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر رہا ہے"۔

"گفتگو"

ماجد ولین اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے لباس کی طیاری میں مشغول تھی، شاید وہ اپنی شادی کے لئے کوئی کپڑا تیار کر رہی تھی کہ اس کی سوئی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی، اس نے سر اُٹھایا تو اپنے والد کو دروازے میں کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ نہایت اطمینان سے ماجد ولین کی طرف بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا:

"اے ماجد ولین تمھیں خبر ہے میں نے ابھی جنفیاف کو ایک خط دیکر اسٹیفن کے پاس بھیجا ہے۔ آج سے میں نے اسے اپنے گھر آنے سے روک دیا ہے بلکہ اس مکان میں رہنے سے بھی منع کر دیا ہے"۔ ماجد ولین بولی: "مجھے ان باتوں کی مطلق خبر نہیں اور نہ مجھے یہ معلوم کہ آپ نے ایسا کیوں کیا"۔

موکر نے کہا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے"۔ اس نے کہا: "نہیں وہ مجھ سے محبت تو نہیں کرتا ہاں مجھ سے شادی کرنے کا خواہشمند ضرور ہے"۔ موکر بولا: "مگر ایسا نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تمھارے شوہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا"۔

ماجد ولین نے کہا: "میں جانتی ہوں کہ اسے آپ نے اپنی دوستی کا شرف بخشا ہے، اور آپ اس کی شرافت اور علمی قابلیت کے بھی بہت مداح ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ اپنی دوستی کے لئے تو اس کا انتخاب کر لیتے ہیں لیکن وہ آپ کی لڑکی کا شوہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا"۔

موکر نے کہا "ہاں، میں اسے اس لئے دوست رکھتا ہوں کہ وہ ایک نیک نفس اور خوش دماغ انسان ہے، لیکن اسے اپنا داماد نہیں بنا سکتا کیونکہ وہ فقیر اور تہیدست ہے۔ آج مجھے اس کا ایک خط پڑا ہوا ملا ہے اور میں اسے پڑھکر اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس کے پاس اتنا بھی نہیں کہ وہ خود زندہ رہ سکے، چہ جائیکہ وہ کسی اور کا بار اُٹھا سکے"۔

ماجد ولین کہنے لگی: "آپ ہی نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک ہونہار اور سمجھدار نوجوان ہے اور ایسا شخص مصارف زندگی میں کبھی بے دست و پا نہیں ہو سکتا"۔

موکر نے کہا: "مینے اس کے اخلاق و عادات میں خودداری اور خود پروری کی وہ جھلک دیکھی ہے جو اسکے اور اس کی کامیابیوں کے درمیان ہمیشہ حایل رہے گی"۔

ماجد ولین بولی:۔ "شاید آپ واقف نہیں کہ محبت اخلاق کی ہر کجی کو درست کر دیتی ہے اور بہت سی مردہ تمناؤں کو

حیاتِ تازہ بخشتی ہے، اس لئے اگر آپ نے ایسا کیا تو یقین کیجئے اس کی زندگی کی تباہی آپ کے سر ہوگی اور اس کی امیدوں کا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔"

"موکر نے کہا: "اے بیٹی لوگوں کے عادات و اخلاق اور انسانی نفسیات سے جس قدر میں واقف ہو تم نہیں ہو سکتیں اس شخص سے شادی کر کے میں تمھارے مستقبل کو برباد نہیں کر سکتا۔"

ماجد ولین یہ سُنکر اس کے سامنے جھک گئی اور رونے لگی لیکن اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا، آخر وہ تھک گئی اور اس کے قدموں پر گر پڑی اور موکر اسے اسی حالت میں چھوڑ کر یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ "آج جس چیز کو تم نہیں سمجھتی کل اُسے سمجھوگی۔"

۱۲ فروری

خبر

جس وقت جنفیان، اسٹیفن کے کمرے میں داخل ہوئی وہ چراغ کی دھیمی روشنی کے سامنے بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ جنفیان نے وہ خط اس کے ہاتھ میں دیا اور اُلٹے پاؤں واپس آئی۔

اُس کے نام یہ موکر کا پہلا خط تھا، وہ لفافہ چاک کر رہا تھا اور اس کا ذہن مختلف خیالات کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ مگر یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ اسے اس طرح لکھ سکتا ہے۔ لیکن خط پر ایک نظر ڈالتے ہی حقیقت روشن ہوگئی۔

اگر کسی تیر انداز کا کوئی تیر اس کے سینہ کے پار ہو جاتا تو شاید اس کی وہ کیفیت نہ ہوتی جو اس خط کو پڑھ کر ہوئی اس پر سکتہ طاری ہو گیا، اس کی آنکھوں کی جنبش ختم ہوگئی، دل نے دھڑکن اور نبضوں نے تڑپنا بند کر دیا۔ اگر کوئی شخص اس کو اس حالت میں دیکھتا تو وہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچتا کہ موت و حیات کے درمیان کوئی ایسی منزل بھی ہے جہاں احساسات کی روانی اگرچہ ختم تو نہیں ہوتی لیکن محسوسات کو دماغ تک پہونچانے کی قوت ضرور ختم ہو جاتی ہے۔

کچھ دیر وہ اسی طرح خاموش لیٹا رہا، پھر مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ وہ گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا گویا کسی کھوئی ہوئی چیز کو تلاش کر رہا ہے کہ اس کی نگاہ موکر کے خط پر پڑی جو اس کے پاس ہی پڑا ہوا تھا اور اسے اُٹھا کر دوبارہ پڑھنے لگا پھر اس نے اپنی پیشانی پر ایک ہاتھ مارا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"افسوس اُمید کا جو ایک سہارا تھا آج وہ بھی ختم ہوا۔ میں بھی موجود ہوں اور یہ خط بھی میرے سامنے ہے، نہیں خواب دیکھ رہا ہوں اور نہ یہ خط ہی دھوکہ دے رہا ہے۔ بیشک آج موکر نے مجھے اپنے گھر سے نکال کر میری تمام امیدوں کو ختم کر دیا۔ اس نے ماجد ولین کو مجھ سے علحدہ نہیں کیا بلکہ میری روح کو میرے جسم سے جدا کر دیا۔ اس نے یہ سب کچھ کیا، لیکن اسے کچھ خبر نہیں کہ اس نے کیا کیا۔

اس نے میرے اوپر مصیبت کا وہ پہاڑ توڑا ہے جو کبھی کسی نے کسی پر نہیں توڑا۔ وہ جانتا ہے کہ میں فقیر اور تہیدست

ہوں اور اس کے خیال میں فقیر ہونا ایک جُرم ہے جس کی سزا قتل ہے لہذا اسنے مجھے قتل کر دیا۔"

یہ کہتے کہتے اس پر ایک مجنونانہ کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح اپنی جگہ سے اُٹھا (ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا موکر اس کے سامنے موجود ہے) اور ایک قہر آمیز انداز میں اُس کی طرف بڑھا اور اس طرح گرجنے لگا:

"اے بیوقوف بڈھے ٹھہر جا، شاید تونے مجھے بھی کوئی ناتواں بکری سمجھ رکھا ہے کہ اپنے آپ کو تیری تیز چھری کے حوالے کر دوں گا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، مجھے ایسی تمناؤں کی ضرورت ہے جن کے سہارے زندہ رہ سکوں، اور میں ان کو حاصل کرنے کی اس وقت تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک میں اسے حاصل نہ کر لوں یا اس کے حصول میں اپنی جان نہ دیدوں۔ اے شخص تیرا خیال غلط ہے تو محبت کے مقدس رشتہ کو کاٹنے کی طاقت ہرگز نہیں رکھتا۔

بیشک تو مجھے اپنے گھر سے نکال سکتا ہے، کیونکہ تو اس گھر کا مالک ہے اور تو اپنی بیٹی کو بھی اپنے کمرے میں مقید کر سکتا ہے اس لئے کہ تو اس کا باپ ہے۔ لیکن ہمارے دلوں کو باہمی محبت سے روکنا اور ہماری روحانی مواصلت میں حائل ہونا تیری قدرت و اختیار سے باہر ہے۔

تو بڑا حریص اور لالچی ہے۔ تو دیکھ رہا ہے کہ تیری زندگی کا پانی اب خشک ہونے والا ہے اور تو ہماری طرف اسلئے بڑھ رہا ہے کہ ہماری نئی اور ترو تازہ زندگی کو تقسیم کرے۔ تیری مثال اس ظالم بادشاہ کی سی ہے جو بچوں کا خون اس لئے پیا کرتا تھا کہ ان بچوں کی زندگی جس قدر کم ہوگی اُسی قدر اس کی زندگی بڑھے گی۔

تونے اپنے خط میں اخوت، محبت اور صداقت و خلوص کا ذکر بھی کیا ہے اور گھر میں نہ گھسنے کا حکم امتناعی مجھے اس طرح لکھ رہا ہے گویا دعوتِ ولیمہ کا کوئی کارڈ ہے، تو ایک ایسے شخص کی تعظیم و تکریم کے لئے اپنی ٹوپی اُتار رہا ہے، جس کے خون سے تو اپنے خنجر کو آلودہ کرنا چاہتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے وہ تھک گیا، زمین پر مُنھ کے بل گر پڑا اور بچوں کی طرح رونے لگا اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر فریاد کرنے لگا:

"خدایا! مجھ پر رحم کر۔ تجھے معلوم ہے کہ میں ایک کمزور انسان ہوں جس کا مددگار اور دستگیر کوئی نہیں، تو ہی میری دستگیری کر اور مدد کو پہونچ۔ خداوندا مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا ہو کر تیری جناب قدس میں سوءِ ادب کا باعث ہوا ہوں اور جانتا ہوں کہ اپنے قوت بازو پر بھروسہ کر کے ایک بڑے گناہ کا مرتکب ہو چکا ہوں۔ بیشک میں تیرے قضا و قدر کو بھول گیا اور لاریب مجھے یاد نہیں رہا کہ نیک بختی و بدبختی کے بخشنے اور واپس لے لینے کی طاقت تیرے علاوہ کسی میں نہیں۔ میں اپنے لئے مستقبل کی تمام سعادتیں اور برکتیں سمیٹے بیٹھا ہوں حالانکہ میں ان میں سے کسی ایک کا بھی مالک نہیں ہوں۔ اور نہ تیری امداد و اعانت کے بغیر ان تک دست رسی ممکن ہے۔

میرے مالک میرے گناہوں کو بخش دے اور اس مصیبت میں میری مدد کر، میری قوتیں جواب دے رہی ہیں اور دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا ہے۔"

طوفان آنے کے بعد جس طرح سمندر خاموش ہو جاتا ہے، اسٹیفن بھی اس ہذیان کے بعد بہت دیر تک صامت و ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ اب بھی پھیلے ہوئے تھے اور سر آسمان کی طرف اُٹھا ہوا تھا، شاید وہ کسی ندائے غیبی کا منتظر تھا۔

کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے اندر سے اس نے کسی نورانی چیز کو اپنے سامنے چمکتے ہوئے دیکھا۔ چراغ پہلے ہی خاموش ہو چکا تھا اور اب صرف چاند کی کرنیں اس کے کمرہ میں اپنا عکس ڈال رہی تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے آنے والی چیز کو دیکھا تو وہ ماجد ولین تھی۔

"رخصت"

ماجد ولین، اپنے والد کے چلے جانے کے بعد اپنے کمرے میں پڑی ہوئی اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہی۔ اسے اپنی زندگی کی تاریک اور بھیانک راتوں میں کوئی روشن ستارہ یا امید کی کوئی ہلکی سی کرن تک نظر نہیں آتی تھی۔ وہ برابر روتی رہی یہاں تک کہ رات کا بیشتر حصہ گزر گیا اور صبح قریب آگئی، اس وقت اس نے ایک فیصلہ کیا اور دبے پاؤں اُٹھکر چلی۔

محبت کی آگ اس کے سینہ میں بھڑک رہی تھی اور اس کے دل کی دھڑکن سے زمین کا سینہ دھڑک رہا تھا وہ زینے کے قریب پہونچکر رُک گئی لیکن پھر آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اس کے بعد وہ اسٹیفن کے کمرے کی طرف بڑھی اور کمرے کے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکنے لگی، اُس نے دیکھا کہ اسٹیفن دوزانو بیٹھا ہوا دُعا میں مصروف ہے یہ دیکھ کر اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور اسے روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگی، یہاں تک کہ اسٹیفن نے آنکھیں کھولیں تو ماجد ولین اسکے سامنے موجود تھی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا، اس کی نگاہیں ماجد ولین پر جم کر رہ گئیں، جسم کے جوڑ جوڑ ڈھیلے پڑ گئے اور حرکت کرنے کی قوت سلب ہو گئی اور اس نے ماجد ولین کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا جو اس کے قریب آکر کہنے لگی:

"اے اسٹیفن میں تمھیں رخصت کرنے کے لئے آئی ہوں اور دیر تک تمھارے پاس نہیں ٹھہر سکتی۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ کیا تم مجھ سے یہ پختہ عہد کر سکتے ہو کہ غم مایوسی و نومیدی کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہیں دوگے، یہاں تک کہ خدا ہم دونوں کو پھر ملا دے۔"

اسٹیفن کہنے لگا: "یہ چیز تمھارے ہاتھ میں ہے۔ تمھیں مجھ میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کی قوت بخش سکتی ہو۔ اور تمھیں یاس و نومیدی کا کفن پہنا کر موت کی نیند سلا سکتی ہو۔"

ماجد ولین کہنے لگی: "اے اسٹیفن آج میں تمھارے سامنے اس چیز کا اظہار کرتی ہوں جس کے اظہار سے میری زبان

شرم وحیا آج تک مانع ہوئی۔ اور وہ یہ کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور میں نے خدا اور اپنے ضمیر کے سامنے تم سے شادی کا اقرار کیا ہے میں اپنے ضمیر سے خیانت اور اپنے خدا سے غلط بیانی نہیں کر سکتی۔ پس اے اسٹیفن اب تم اُٹھو اور سفر کی طیاری کرو اور جس جگہ اور جس راستے سے بھی سعادت حیات ملے اسے ڈھونڈھ نکالو اور اس سفر سے واپس ہو کر پھر تم میرے پاس آؤ میں جب تک زندہ ہوں تمھاری رہوں گی۔ اے اسٹیفن تمھارا جہاں دل چاہے جاؤ۔ ایک دو دس یا اس سے بھی زیادہ سالہائے دراز کے بعد جب تم لوٹو گے مجھے ویسا ہی پاک صاف اور مخلص و وفادار پاؤ گے۔ اے اسٹیفن تم کل یہاں سے رخصت ہو جاؤ اور جس نیک دید سے واسطہ پڑے اس کی اطلاع مجھے دیتے رہو تاکہ میں بھی تمھارے رنج وراحت میں تمھاری شریک رہوں۔ میں بھی تمھارے خطوں کا جواب برابر دیتی رہوں گی"۔

یہ سُنکر اس کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا اور کہنے لگا: "اے ماجد وکین میرا یہ سفر بہت طویل ہو گا کیا تم مجھے کوئی ایسی چیز دے سکتی ہو جو اس عالم غربت میں میری غمگسار ہو سکے"۔

ماجد وکین نے اپنا ہاتھ اپنے بالوں کی طرف بڑھایا اور ان میں سے ایک لٹ کاٹ کر اسٹیفن کو دیدی، جس کے جواب میں اس نے بھی اپنے بالوں کی ایک لٹ ماجد وکین کے حوالے کی اور دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

سفر

اسٹیفن روانگی کی صبح ذرا سویرے اُٹھا اور اپنے کمرے کی اس کھڑکی میں سے جو باغ کی طرف کھلتی تھی، جھانکنے لگا اس نے دیکھا کہ رات اپنے سیاہ پروں کو آہستہ آہستہ سمیٹ رہی ہے۔ اور سورج زرکار لباس پہنے ہوئے خراماں خراماں اُفق سے نمودار ہو رہا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اُفق میں بادلوں کے ٹکڑے ہر طرف آسمان پر بکھرے ہوئے ہیں اور سورج کی سُرخ شعاعوں کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ پھر اُس نے دیکھا کہ سورج کی سفید شعاعیں پھولوں پر پڑے ہوئے شبنم کے قطروں پر عجیب رنگ آمیزی کر رہی ہیں۔ گویا وہ الماس کے ٹکڑے ہیں۔

اس وقت فضا خاموش تھی اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی اُسنے اس منظر کا ایک عام جایزہ لیا اور جب اس کی نگاہیں اس کو دیکھ کر واپس ہوئیں تو وہ آنسوؤں سے لبریز تھیں، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اب اس گھر کو چھوڑ رہا ہے اور رخصت ہو رہا ہے۔ ریزفون (درخت) کے اُس سائے سے جہاں وہ ماجد وکین کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا، دریا کے اُس ساحل سے جہاں وہ دونوں ٹہلا کرتے تھے، اس کشتی سے جس میں بیٹھ کر وہ دونوں دریا کی سیر کیا کرتے تھے، باغ کی اس کرسی سے جس پر بیٹھ کر وہ ماجد وکین کے آنے کا انتظار کیا کرتا تھا، اس کمرے سے جس کی کھڑکی سے وہ اُس کی شیریں آواز کے نغمے سننے کے لئے اکثر جھانکا کرتا تھا اور بنفشہ و یاسمین کے ان گلدستوں سے جو ماجد وکین اسے تحفۃً بھیجا کرتی تھی اور جن میں وہ اس کی خوشبو سونگھا کرتا تھا۔

وہ دیر تک روتا رہا اور قریب تھا کہ روتے روتے اپنے تئیں ہلاک کر دے، لیکن ماجد ولین کی باتیں اسکو یاد آنے لگیں اور اس کے خلوص و وفاداری نے اس کے فراق کے صدمہ کو کچھ ہلکا کر دیا۔

اس کے بعد وہ اُٹھا اور اپنے کپڑے اپنے بکس میں رکھ کر باغ میں اُتر آیا اور وہاں کی ایک ایک چیز سے رخصت ہونے لگا ایسا کوئی درخت نہ تھا جسے اس نے نہ چوما ہو ایسی کوئی شاخ نہ تھی جسے اس نے اپنی آنکھوں سے نہ لگایا ہو، اور ایسی کوئی کرسی نہ تھی جس پر اس نے اپنے رخسار نہ ملے ہوں، اور اپنے آنسوؤں سے اسے نہ دھویا ہو۔ اس نے ہر درخت سے پھول توڑ کر ان سب کا ایک گلدستہ بنایا اور باغ کی ایک کرسی پر ماجد ولین کے لئے چھوڑ دیا۔

اس کے بعد مالی کے پاس آیا اور اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر کو بلانس تک پہونچا دے۔

"ماجد ولین کا خط اسٹیفن کے نام"

"اے اسٹیفن، تم چلے گئے اور مجھ سے بہت دور ہو گئے۔ اب کیا امید کروں کہ تم سے جلد ملاقات ہو سکے گی، آہ، میں بھی کتنی بدنصیب ہوں۔

میں نے تمھیں یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیکر سخت غلطی کی۔ میں سمجھتی تھی کہ میرے پہلو میں اتنا صبر و قرار ہے کہ فراق کے تلخ گھونٹ کو حلق سے اُتارنے پر مجھے توہی دل بنا دیگا لیکن تمھاری صورت نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ میں بہت ہی بدنصیب لڑکی ہوں اور وہ تمام نصیحتیں جو اس روز میں نے تمھیں کیں تھیں، عقل کی نصیحتیں تھیں، قلب و ضمیر کی آوازیں نہیں تھیں۔

میں بیتاب تھی کہ جس وقت تم یہاں سے رخصت ہو رہے ہو، میں اپنی کھڑکی میں کھڑے ہو کر تمھیں آخری سلام کروں اور محبت کی آخری نگاہ سے تمھیں رخصت کروں۔ لیکن ڈرتی تھی کہ کہیں مجھے روتا دیکھ کر تم بھی نہ رونے لگو۔ اور کہیں تمھیں آزردہ دیکھ کر میں اپنے تئیں ہلاک نہ کر لوں۔ اللہ اللہ، رخصت کا وقت بھی کیسا سخت وقت ہے اور وہ فراق اس سے بھی زیادہ سخت ہے جو رخصت کے بغیر نصیب ہو۔

میں تمھارے چلے جانے کے بعد باغ میں گئی تو ایک کرسی پر پھولوں کا ایک گلدستہ رکھا ہوا تھا جسے تم اپنی روانگی سے پہلے میرے لئے چھوڑ گئے تھے۔ اُسے اُٹھا کر میں نے اپنے ہونٹوں سے لگایا اور سچ تو یہ ہے کہ اُسے نہیں بلکہ تمھارے ہاتھوں کو۔ پھر میں اس کرسی کی طرف گئی جس پر ہم دونوں زیرفون کے پیڑوں کے نیچے بیٹھا کرتے تھے اور اس پر بیٹھ گئی اور تمھارے پچھلے خط اپنے سامنے پھیلا لئے۔ میں انھیں پڑھ رہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا تم میرے سامنے بیٹھے ہوئے مجھ سے باتیں کر رہے ہو۔ مگر آہ، زندگی کے وہ دلکش لمحے ختم ہو گئے، جنھیں ہم دونوں اس نیلگوں آسمان کے نیچے شاخوں کی جھرمٹ میں بیٹھ کر گزارا کرتے تھے۔"

"ماجد ولین کا خط اسٹیفن کے نام"

"رات میں نے سخت پریشانیوں اور تکلیفوں میں گزاری۔ آفتاب پردۂ اُفق میں ابھی پوری طرح چھپا بھی نہ تھا کہ ایک زبردست آندھی نے در و دیوار کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اور آسمان اپنی گہرائیوں میں سکڑنے سمٹنے اور سیاہ ہونے لگا۔

مجھے خیال ہوا کہ تم ابھی راستے ہی میں ہوگے اور اس وقت منزل کی تکلیفوں اور سردی کی شدت سے سخت مصیبت میں ہوگے۔ چنانچہ میں بھی اپنی چادر اُوڑھ کر کمرے کے ایک کونہ میں بیٹھ کر رونے لگی۔ کبھی تمھاری جدائی پر روتی اور کبھی اپنی بدقسمتی پر۔ رات کا بیشتر حصہ اسی حالت میں گزر گیا۔ لیکن صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو ہوا ٹھہر چکی تھی، سورج نکلا ہوا تھا اور موسم بہت خوشگوار تھا، میں یہ دیکھ کر خوش ہوگئی اور خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔

اے اسٹیفن میں گھڑیاں گن رہی ہوں اور تمھارے خط کے انتظار میں سخت بےچین ہوں، دیکھوں منزل مقصود تک تمھارے بخیریت پہونچنے کی نوید جانفزا مجھے کب تک ملتی ہے"

"ماجد ولین کا خط اسٹیفن کے نام"

"گزشتہ چالیس گھنٹے بھی میرے غم و اندوہ میں کوئی کمی نہیں کر سکے۔ اور اب کیا کہوں کہ میں نے یہ اوقات کس طرح بسر کئے میں اسی وحشت و سراسیمگی میں تمھارے کمرے میں جا پہونچی، صرف اس خیال سے کہ شاید کچھ دیر وہاں ٹھہرنے سے میرے دل کو کچھ سکون ملے، لیکن جب میں وہاں پہونچی اور دروازہ کھولنے کے لئے اس کی کنڈی پر اپنا ہاتھ رکھا تو میرا ہاتھ کانپنے لگا اور میں سر سے پاؤں تک لرز گئی، میں ایسا محسوس کر رہی تھی کہ اگر میں نے دروازہ کھول لیا تو تم اس کے پیچھے کھڑے ہوگے اور ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دوگے، لیکن دروازہ کھولنے پر سوائے وحشت، خاموشی، گرد آلود پلنگ، اور بکھرے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے کمرے کو درست کیا، بکھرے ہوئے کاغذوں کو جمع کیا، کھڑکیوں اور کرسیوں کو صاف کیا، در و دیوار پر جمی ہوئی خاک کو دور کیا اور کمرے کو اسی طرح صاف ستھرا بنا دیا جس طرح تمھارے زمانہ میں رہا کرتا تھا۔ آج سے میں خود اس کمرے میں رہوں گی اور اب بھی یہ کمرہ تمھارے ہی نام سے پکارا جائے گا خواہ تم اُس میں رہو یا نہ ہو۔

وہیں مجھے بٹوے میں ایک کرسی پر رکھے ہوئے چند روپے بھی ملے، میں سمجھ گئی کہ یہ کرایہ اس کمرے کا ہے جس کا تقاضہ میرے والد نے کیا ہوگا اور چونکہ تم ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے تھے اس لئے یہاں چھوڑ گئے ہو۔ وہ روپے میں نے اُٹھا لئے ہیں اپنے والد کو دیدوں گی اور انھیں اس پر راضی کر لوں گی کہ وہ ان روپوں سے میرے لئے کپڑا یا کوئی اور اچھی سی چیز خرید لیں اور میں اسے تمھارا تحفہ سمجھ کر استعمال کروں گی۔

اے اسٹیفن میں تمہاری جدائی پر صبر سے کام لوں گی اور اپنے دل کو یہ کہکر تسلی دوں گی کہ تم مجھ سے صرف اس لئے جدا ہوئے ہو کہ اور زیادہ قریب ہو جاؤ، اور اگر آج تم نے مجھے چھوڑ دیا ہے تو صرف اس لئے کہ تم اس غیر مطمئن ملاقات پر اس یکجائی کو ترجیح دیتے ہو جس میں فراق کا کھٹکا اور جدائی کا خوف نہ ہو۔

پس اے میرے محبوب تم اپنے راستہ پر برابر چلے جاؤ۔ اور راہ میں جو دقتیں بھی پیش آئیں انھیں اپنے یقین اپنے عزم اور اپنی ہمت سے دور کردو، تاکہ اس کے بعد جب ہم تم ایک دوسرے سے ملیں، تو میرے حال کی لذت ہمارے غم آلود ماضی کی تلخی کو دور کردے۔"

اسٹیفن کا خط ماجدولین کے نام

"کل تک ہم دونوں ایک ساتھ اور ایک گھر میں رہتے تھے اور آج ہمارے درمیان پچاس میل کی مسافت حایل ہے تمہارے ہاتھ کی گرمی آج میرے ہاتھ کو محسوس نہیں ہوتی، میری انگلیاں تمہارے بالوں سے آج نہیں کھیلتیں، میرے مشام جان کو تمہاری عنبریں سانسیں معطر نہیں کرتیں اور تمہاری پیاری آواز آج میرے دل کے گوشوں میں نہیں گونجتی، پہلے کی طرح آج آسمان میں اب وہ صفائی و دلفریبی نہیں، موسم میں وہ پہلی سی دلکشی نہیں۔ پانی میں وہ شیرینی اور ہوا میں وہ لطافت نہیں، باغوں میں وہ پھول اور پھولوں میں وہ مہک نہیں۔ اے ماجدولین، شاید کائنات کے حسن و جمال کا راز تمہیں تھیں۔

کوبلانس پہونچکر میں نے اپنے والد، دیگر اعزہ اور اکثر اہل وطن سے ملاقاتیں کیں، لیکن یہ ملاقاتیں مجھے تمہاری یاد سے غافل نہیں کرسکیں، اور نہ میں نے ان کے چہروں میں اُنس و محبت کی وہ پہلی سی جھلک دیکھی جو تمہاری ملاقات سے پیشتر نظر آتی تھی۔ خدا جانے یہ میری غربت و مسافرت کا زمانہ کب ختم ہوگا۔

مجھے یہ معلوم کرکے سخت رنج ہوا کہ تمھیں میری وجہ سے سخت دقتیں اور تکلیفیں اُٹھانا پڑ رہی ہیں، لیکن اے ماجدولین تم مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہو کیونکہ تم ایسی جگہ زندگی گزار رہی ہو جس نے ہماری خوش نصیبی کے دن دیکھے ہیں، لیکن میں اپنے ماحول میں بالکل اجنبی ہوں، اے ماجدولین، میں تمہارے حکم کے مطابق ضرور جرأت و ہمت سے کام لوں گا اور ہر اُس سنگ گراں کو جو میرے اور تمہارے راستے میں حائل ہوگا، پوری کوشش سے ہٹادوں گا۔ تم مجھے جلد جلد خط لکھتی رہو اور تمام ان واقعات و حالات سے جو تمھیں پیش آئیں مطلع کرتی رہو۔ تاکہ تم سے دور رہکر بھی تمہاری باتوں سے لطف حاصل کرتا رہوں۔

"محفلِ رقص"

ایک روز اسٹیفن کے والد نے اپنے گھر میں محفل رقص و سرود قایم کی اور اسٹیفن کو بھی اس کی شرکت پر مجبور کیا۔

اسٹیفن آج تک کبھی اس قسم کی محفلوں میں شریک نہیں ہوا تھا۔ مگر والد کے اصرار پر بادل ناخواستہ اسے منظور کرنا پڑا۔

جب سب لوگ جمع ہو گئے اور ناچنے کا بڑا کمرہ عورتوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھر گیا تو اسٹیفن نے حیرت و خجالت سے اُس بھیانک اور ڈراؤنے منظر کو دیکھا۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اسے یاد آیا کہ ان محفلوں میں اُٹھنے بیٹھنے کے کچھ قاعدے اور آنے جانے کے کچھ قوانین ہیں اور جو شخص ان قوانین سے ناواقف ہوتا ہے، مذاق و استہزاء کا ہدف بنجاتا ہے، وہ کسی طرح بھی اس ماحول میں بیٹھنا نہیں چاہتا تھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ جانے کے لئے بیقرار تھا۔

اس نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر بہت سی موم بتیوں کے درمیان ایک بتی ٹمٹما رہی ہے اور اس کی زندگی کا چراغ عنقریب گل ہونے والا ہے، اس لئے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور اس کی روشنی کو درست کرنے کے بہانے اُٹھ کر اُس کی طرف چلدیا۔ آج وہ اپنے ان کپڑوں میں بہت ہی عجیب معلوم ہو رہا تھا کیونکہ وہ اس کے اپنے کپڑے نہ تھے۔ بلکہ اپنے کسی عزیز سے مستعار لئے تھے، وہ شخص اسٹیفن سے زیادہ چوڑا چکلا اور بلند و بالا تھا۔ غرض جب وہ موم بتی کے قریب پہونچا تو اُسنے دیکھا کہ بتی کا ایک حصّہ موم پگھلنے سے کالا ہو گیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ پگھلے ہوئے موم کا حصّہ صاف کر دے لیکن جوں ہی اسنے قینچی کو بتی پر رکھا وہ گل ہو گئی اور اس کا موم اُڑ کر اس کے کپڑوں پر پھیل گیا۔ چاروں طرف سے اس پر آوازے کسے جانے لگے اور وہ گھبرا کر ایک خالی کمرے میں کرسی پر بیٹھ گیا اور قینچی کی دھار سے جمے ہوئے موم کو کھرچنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کا والد بھی وہاں آ پہونچا اور پھر اسے زبردستی اُٹھا کر لے گیا اور وہاں جا کر بٹھایا جہاں وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جسے وہ اُس سے منسوب کرنا چاہتا تھا۔

اس کے بعد اسٹیفن کے والد نے سب لوگوں کے سامنے اس کو سمجھانا شروع کیا کہ: "میں سال بھر سے اسی کوشش میں تھا کہ اس لڑکی سے تیری شادی کر دوں جس سے تیری ہی فلاح و بہبود مقصود تھی لیکن تو اپنی نافرمانی اور سرتابی سے باز نہیں آیا اور چلا گیا۔ لیکن اب جو تو واپس آیا تو مجھے خیال گزرا کہ شاید تیری خودسری ختم ہو چکی ہے اور اسی لئے میں نے یہ محفل منعقد کی تاکہ تو اس موقعہ سے فایدہ اُٹھا کر اس لڑکی سے جس کو ہم نے تیرے لئے پسند کیا ہے، ابتدائی ربط و ضبط پیدا کرے لیکن افسوس تو نے ہماری ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا اور اپنی سرکشی و سرتابی سے ہماری تمام تجویزوں کو ٹھکرا دیا۔ شاید تجھے یہ خیال ہو کہ میں تمام عمر تیری کفالت اور سرپرستی کے لئے بیٹھا رہوں گا یا تو یہ سمجھتا ہے کہ تیرا یہ علم جس پر تجھ کو ناز ہے کوئی سونے کی کان ہے جو آج تیرے اور کل تیری اولاد کے لئے سونا اُگلتی رہے گی۔ پھر اگر تو اس فریب میں مبتلا ہے تو تجھے معلوم ہو جانا چاہئے کہ میرا کل سرمایہ صرف اسی قدر ہے کہ میری زندگی کے لئے کافی ہو سکے۔ رہا تمہارا ذوق سو یاد رکھو یہ فنون لطیفہ جو تمہارا سرمایۂ حیات ہیں ہرگز یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ کس وقت بھی تمہارے لئے ذریعہ معاش بن سکیں اس لئے اگر تم میرا کہنا نہیں مانتے تو خدا کی زمین بہت وسیع ہے جہاں چاہو چلے جاؤ اور جس طرح چاہو کماؤ، تمہارا اس بیکاری اور بیروزگاری کی حالت میں میرے گھر پڑا رہنا مجھے گوارا نہیں۔"

اسٹیفن نے یہ سنکر اپنا سر اُٹھایا اور اپنے والد کی طرف متوجہ ہوکر بولا:- "مجھے اعتراف ہے کہ آپ نے زمانۂ گزشتہ میں میرے اوپر احسانات کئے ہیں۔ لیکن ان احسانات کا ذکر آپ کو کچھ زیب نہیں دیتا، کیونکہ بہر حال آپ والد ہیں اور اس رشتہ کی قیمت کچھ نہ کچھ ضرور ہے جو آپ کو ادا کرنا چاہئے تھی لیکن سچ پوچھئے تو آپ نے کبھی مجھ پر شفقت و محبت صرف نہیں کی، میری ماں کے مرتے ہی آپ نے مجھے اور میرے بھائی کو اپنے گھر سے نکال دیا اور میری عمر ابھی سات برس کی بھی نہ تھی کہ آپ نے دوسری شادی کرلی اور اپنے سے دور مجھے ایسے تنگ دل لوگوں میں بھیجدیا، جو کبھی کسی سے محبت نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد اگر کبھی اتفاقاً میں آپ کے پاس آیا بھی تو آپ نے سرد مہری سے میرا استقبال کیا۔ آپنے کبھی کسی اچھے لفظ سے مجھے یاد نہیں کیا اور نہ کبھی محبت کی آنکھ سے مجھے دیکھا۔ میں بیمار ہوا اور اکثر راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں لیکن آپ نے کبھی اپنے عیش و آرام کو نہیں چھوڑا۔ مجھے تکلیفوں اور مصیبتوں میں مبتلا دیکھ کر آپ کا دل کبھی نہیں دُکھا۔ نہ مجھے دیکھ کر آپ کبھی متبسم ہوئے اور نہ میری جدائی سے غمگین۔ پھر جب اس دنیا میں کوئی ایسا نہ ملا جس سے میں محبت کرتا یا جسے اپنے لئے منتخب کر سکتا تو میں اپنے نفس اور اپنی آزادی سے محبت کرنے لگا۔ اس لئے آج میں ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص میرے اس انتخاب پر مجھے خطا وار ٹھیرائے یا میرے اس حق کو چھین لینے کی کوشش کرے میری زندگی میرے لئے ہے اور میں اپنی قسمت کا آپ مالک ہوں۔ مجھ پر میرے علاوہ کسی کو کوئی اختیار نہیں اور نہ میرے معاملات میں کسی کو دخل دینے کی ضرورت ہے اپنا راستہ آپ ہموار کروں گا۔ اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مستقبل کی بنیادیں رکھوں گا۔ میں صرف اسی لڑکی سے محبت کر سکتا ہوں جسے میں خود اپنے لئے پسند کروں، اور صرف اسی عورت کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہوں جس کی خوشگوار محبت کا اندازہ اپنی سمجھ سے کر سکوں"۔

یہ کہکر اس نے ان لوگوں کی طرف سے منھ پھیر لیا اور اپنے کمرے کی طرف تیزی سے چلا گیا۔ وہاں پہونچکر اس نے اپنا لباس تبدیل کیا اور اپنا سوٹ کیس اُٹھا کر تاریکی کے پردوں کو چیرتا ہوا شہر سے باہر نکل گیا۔

اس کو جاتا دیکھ کر اس کا ایک ماموں زاد بھائی بھی جو اس کے بعض حالات سے باخبر ہو چکا تھا اس کے پیچھے ہولیا اور قریب پہونچکر کہنے لگا: "اے اسٹیفن تم کہاں جا رہے ہو" کہنے لگا: "میں جا رہا ہوں جہاں یہ لوگ مجھے بھیج رہے ہیں" اس کا یہ عزیز اس کی اس مصیبت پر رونے لگا اور بولا "اے اسٹیفن خدا تمہاری حالت پر رحم کرے"۔

پھر اس نے چپکے سے اسٹیفن کی جیب میں سونے کے چند سکے ڈالدئے جس کی خبر اسٹیفن کو اسکے چلے جانے کے بعد ہوئی۔

نفسِ بلند

عالی ہمت اور بلند حوصلہ لوگ حادثاتِ زمانہ کے آگے نہیں جھکتے، خواہ یہ حوادث کتنے ہی سخت صبر آزما کیوں نہ ہوں۔ اور نہ ان کی گردنیں مصیبتوں اور تکلیفوں کے سامنے خم ہوتی ہیں، خواہ یہ کتنی ہی ہمت شکن کیوں نہ ہوں۔

ایسے لوگ دوسرے عام لوگوں کے مقابلہ میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو شیر دوسرے درندوں کے درمیان رکھتا ہے کہ وہ دوسروں کے کئے ہوئے شکار کی طرف نگاہ اُٹھاکر نہیں دیکھتا اور کوئی ایسا کھانا جسے خود اس کے چنگل اور دانت فراہم نہ کریں اسے پسند نہیں آتا۔

مصیبتوں کے اس ہجوم کے بعد اسٹیفن کے نفس کی بھی یہی کیفیت تھی۔ نہ وہ گھبرایا اور نہ اس نے آہ و زاری کی، بلکہ اس نے گوبلانس کو اسی سکون کے ساتھ خیرباد کہا جس اطمینان کے ساتھ وہ اس میں داخل ہوا تھا۔ اس کا ضمیر مطمئن تھا اور اس کا دل خوداعتمادی سے لبریز تھا۔

وہ تمام رات پیدل چلتا رہا یہاں تک کہ جب صبح کا ستارا نمودار ہوا تو گوبلانس کے دھندلے سے نشانات ابھی تک دکھائی دے رہے تھے وہ دیر تک خاموش اُن کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا:۔

"اے مجھے اپنے سامنے سے دھتکار دینے والے انسانو رخصت! آج تم سب سے میں نے اپنے ہاتھوں کو اسی طرح جھاڑ لیا جس طرح کوئی شخص مردے کو مٹی دیکر اپنے ہاتھوں کو جھاڑ لیتا ہے۔ آج سے میری محبت، میری موت اور میری زیست اور ہر وہ چیز جو مجھ سے متعلق ہے صرف اس ذات کے لئے ہے جو میری ہے اور میں جسکے لئے ہوں۔ دُنیا کی کوئی ہستی اُسے مجھ سے جدا نہیں کر سکتی اور میرے دل کی گہرائیوں میں اس کی یاد کے ساتھ کسی اور کی یاد نہیں رہ سکتی وہ وقت قریب ہے کہ اس کی محبت میری زندگی کے اندھیروں میں ایک منارۂ نور کا کام دے اور اس کی روشنی میں میں حیات کی ان بلندیوں تک پہونچ جاؤں جن کی تمنا میرے دل میں ہے۔

اے سخت دل اور جفا پیشہ انسانو! اُس وقت تمھیں معلوم ہوگا کہ وہ فقیر و گمنام لڑکا جو کل تک تمھارے سامنے ذلیل و خوار تھا اور خجالت و شرمندگی سے تمھاری طرف آنکھ اُٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا وہ بڑا آدمی بن گیا ہے"

یہ کہکر اس نے اپنے قدم بڑھادئے اور پھر چلنے لگا، یہاں تک کہ شام کو وہ جونتج پہونچ گیا، جہاں اس نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اور بچپن کے اکثر ایام گزارے تھے۔

جونتج پہونچتے ہی اسٹیفن سیدھا اپنے موسیقی کے پرانے اُستاد "حومل" کے پاس آیا۔ حومل اس کے لئے ایک شفیق باپ کی طرح تھا وہ اس سے بیحد محبت کرتا تھا اور اسے اپنے تمام شاگردوں پر ترجیح دیتا تھا۔ لیکن جب وہ اس کے سامنے پہونچا تو شرم و حیا نے اس کی زبان کو بند کر دیا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن جب حومل نے خود حالات دریافت کئے تو اسٹیفن نے سارا واقعہ بیان کیا، حومل نے اسے مشورہ دیا کہ موسیقی سے زیادہ کوئی دوسرا فن اس کے لئے موزوں نہیں اور اسٹیفن اس کے پاس رہ کر اس فن کی تکمیل میں مصروف ہوگیا۔

"ماجد وتین کا خط اسٹیفن کے نام"

"میں تقریباً دو ماہ سے تمھیں کوئی خط نہیں لکھ سکی، کیونکہ اس عرصہ میں میں بہت بیمار رہی۔ اب خدا کا شکر ہے

اچھی ہوں اور اپنی بیماری کے قصے ہی سے اس خط کی ابتدا کرنا چاہتی ہوں۔

میں ایک رات اس ارادہ سے نکلی کہ "ہال" کے ڈاک خانہ میں جاکر تمہارے نام خط ڈال آؤں، لیکن جب میں اپنے گاؤں سے دور نکل گئی، تو یکایک ہوا کا ایک زبردست طوفان اُٹھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا وہ عنقریب مجھ پر ٹوٹ پڑنے والا ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج یا تو وہ میرے جسم سے میرے کپڑے اُتار لیگا یا خود مجھی کو کپڑوں سمیت اُڑا لیجائیگا۔ عقل کا فیصلہ تھا کہ جدھر سے آئی ہوں اسی طرف لوٹ جاؤں لیکن دل کا تقاضہ تھا کہ آگے بڑھوں۔ مجھے خیال آیا کہ تم بڑی بیچینی سے میرے خط کے منتظر ہوگے۔ اس خیال کے آتے ہی میرے سست قدم تیزی سے اُٹھنے لگے اور ہواؤں کے جھونکوں سے اُلجھتی ہوئی کبھی آگے کبھی پیچھے ہٹتی ہوئی اور اِدھر اُدھر گرتی پڑتی برابر آگے بڑھتی رہی —— مختصر یہ کہ دو گھنٹے کی اس کشاکش کے بعد میں وہاں پہونچ گئی اور خط ڈاک خانہ میں ڈالدیا —— جب میں وہاں سے واپس ہوئی تو ہواؤں کی شدت کم ہو چکی تھی لیکن صرف اس لئے کہ موسلادھار بارش کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ ہوائیں پوری طرح خاموش ہوں بارش ہونے لگی اور لحظہ بہ لحظہ تیز تر ہوتی گئی۔ میری چادر بھیگ گئی اور بدن کی بوٹی بوٹی کانپنے لگی اور رات اس قدر اندھیری ہو گئی کہ چلنا دشوار ہو گیا۔ میں چونکہ تھک کر چور چور ہو چکی تھی مینے سوچا کہ کیوں نہ میں کسی پہاڑ کی چٹان پر چڑھ کر اپنی موت کا انتظار کروں، لیکن پھر اس خیال سے رُک گئی کہ مجھے تمہاری خاطر زندہ رہنا ہے اور تمہاری زندگی کو خوشگوار بنانے کا جو عہد کر چکی ہوں اسے نباہنا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں چل پڑی اور جب گھر پہونچی تو بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔

میں نے اس بیماری میں بھی بڑی بڑی سختیاں اُٹھائیں، میں اپنی زندگی سے قطعاً مایوس ہو چکی تھی، میں سمجھ رہی تھی کہ بس اب تمھیں نہیں دیکھ سکوں گی۔ ایسے وقت میں جو چیز میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف کا باعث تھی وہ یہ خیال تھا کہ یہ تو خیر تم سُن ہی لوگے کہ ماجد ولین اس دنیا سے رخصت ہو گئی لیکن یہ تمھیں کون بتائے گا کہ وہ مرتے وقت بھی تمھیں کو یاد کرتی تھی۔

مینے سوچا کہ تمھیں ایک آخری خط لکھ کر ان حالات سے مطلع کر دوں، لیکن صبح کے وقت میرا بخار ہلکا ہوا اور خط تمہارے نام لکھنے لگی۔ میں نے اُس خط میں اپنی تمام چیزوں کی وصیت تمہارے حق میں کی تھی اور وہ چیزیں ہی کیا تھیں؟ یہی میری چند کتابیں تمہارے خطوط اور وہ انگوٹھی جو میں نے تمہارے بالوں کو گُنکر طیار کی تھی۔ ان کے علاوہ ایک چھوٹی سی تھیلی بھی تھی جس میں سونے چاندی کے کچھ سکّے تھے جنھیں میں اپنے خرچ سے بچا کر رکھ چھوڑتی تھی، یہ تھی میری کل کائنات! چنانچہ یہ وصیت نامہ لکھ کر میں نے جنفیاؔف کو دیدیا اور کہدیا کہ میرے مرنے کے بعد تمہارے سپرد کر دے۔ لیکن خدا نے ہم دونوں پر بڑا فضل کیا کہ نہ مجھی کو تم سے محروم کیا اور نہ تمھیں کو میری موت سے دلگیر۔ اچھا ہونے کے بعد جب

میں نے دوبارہ اس وصیت نامہ کو دیکھا تو میں بہت روئی، میں نے سوچا کہ اگر خدانخواستہ یہ وصیت نامہ تم تک پہونچ جاتا تو تمہاری کیا حالت ہوتی اور یہ تھا وہ خیال جو مجھے رُلا رہا تھا اور تمھیں عالم خیال میں روتا ہوا دیکھ کر خود بھی تڑپ رہی تھی۔

اے اسٹیفن، تم سے میری ایک آرزو ہے۔ آیندہ جب تم مجھے خط لکھو تو اپنے بھائی کا پتہ لکھ دینا کیونکہ میں تمھیں ایک تحفہ بھیجنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ اب میں تمہاری وجہ سے تمھارے بھائی کو بھی دوست رکھنے لگی ہوں اور بڑی بےچینی سے اس دن کی منتظر ہوں جب ہم تم اور وہ ایک ہی مکان میں زندگی کے دن گزاریں گے۔

اے اسٹیفن، میری بیماری کا حال پڑھ کر تم رنجیدہ نہ ہونا کیونکہ یہ تو ایک پُرانا واقعہ ہے جو گزر گیا اور ختم ہوگیا اور اب اس کا کوئی خفیف سا اثر بھی میری طبیعت پر نہیں ہے۔

اسٹیفن کا خط ماجدولین کے نام

"خدا تمھیں معاف کرے اے ماجدولین! کیا تمہارا خیال ہے کہ میں تمھارے بعد ایک گھنٹہ کے لئے بھی اس دُنیا میں زندہ رہ سکونگا جو تم نے اس قسم کا ایک وصیت نامہ مرتب کیا تھا۔

کیا تمھیں خبر نہیں کہ تم ہی اس دنیا میں میری زندگی اور میری روح ہو اور جس دن اس دُنیا میں تمھاری جگہ خالی ہوگی وہی دن اس دنیا میں میرا آخری دن ہوگا۔

مُردے نے مُردے کو کب تحفہ بھیجا ہے، اور قبر نے قبر کو کب وصیت کی ہے، اور کب کوئی محبت کرنے والا اپنے محبوب کے مرنے کے بعد اس دُنیا میں زندہ رہا ہے اور اگر جینا پڑا بھی ہو تو کب اس کی زندگی کا کوئی لمحہ مسرور و خوشگوار گزرا ہے۔

اوروں کی طرح خود میری زندگی بھی ہزاروں تمنّائیں رکھتی ہے، لیکن قسم ہے تمھاری محبت کی اگر میں ان تمام آرزؤں کو صرف اس ایک آرزو کے بدلے دیدینے طیار ہوں کہ میرا دم اس طرح نکلے کہ میرا سر تمھارے سینہ پر ہو، میری آنکھیں تمھارے خوبصورت اور روشن چہرے کو دیکھ رہی ہوں، تمھاری آواز آخری آواز ہو جو میرے کانوں میں پہونچے اور تمھاری صورت آخری صورت ہو جو مجھے نظر آئے۔

خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھیں صحت بخش کر تم پر، اور تمھاری زندگی کو میرے لئے محفوظ رکھ کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ زمانہ گزشتہ میں جو جو تکلیفیں اور مصیبتیں ہم پر پڑی ہیں کچھ اس لئے نہ تھیں۔ کہ خدا ہم سے ناراض ہے، یا ہم لوگوں کو تکالیف میں مبتلا دیکھ کر خوش ہونا چاہتا ہے، بلکہ صرف اس لئے کہ آج کی تکلیفوں سے ہم کل کے عیش و آرام کا صحیح اندازہ کر سکیں۔

میں اپنے بھائی کو اُس تحفہ کے متعلق لکھ دوں گا جسے تم بھیجنا چاہتی ہو۔ میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم اس پر

اس قدر مہربان ہو اور اس سے اتنی محبت کرتی ہو۔

قسمت

موسمِ سرما ختم ہو رہا ہے اور اسٹیفن اپنے اُستاد ہوگل کے پاس آتا رہتا ہے لیکن اب وہ وقت قریب ہے کہ اسٹیفن کا تمام سرمایہ ختم ہو جائے، وہ سخت پریشان ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا ہوگا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وہ وقت آیا کہ سوکھی روٹیاں چبانے لگا، پھٹے ہوئے کپڑے پہننے لگا، دو وقت کی بجائے ایک وقت پر قناعت کی اور شوربے کی جگہ روٹی کو پانی میں بھگو کر کھانے لگا۔

ایک دن وہ کسی دیوار کے نیچے کھڑا ہوا تھا کہ ایک خستہ حال نوجوان اس کے سامنے سے گزرا اور اس سے سوال کرنے لگا، اس نے شرمندگی سے اپنا منہ پھیر لیا۔ نوجوان نے کہا: "میرے آقا میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنی بیوی کو اپنے پیچھے اس حال میں چھوڑ آیا ہوں کہ وہ بھوک سے کھڑے ہونے کی طاقت بھی نہیں رکھتی۔ ہم دونوں پر پورے دو دن اس طرح بیت گئے ہیں کہ سوائے غم کھانے اور آنسو پینے کے کوئی تیسری چیز میسر نہیں ہوئی ہے"

اسٹیفن یہ سُنکر کانپ اُٹھا اور پوچھنے لگا:۔

"اے نوجوان کیا تم اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے ہو" کہنے لگا "ہاں میرے آقا اتنی ہی جتنی میں اپنی زندگی سے کرتا ہوں"

اسٹیفن نے تھوڑی دیر کے لئے اس نے اپنا سر جھکا لیا اور جو کچھ جیب میں تھا وہ سب اس کو دیدیا اور اپنی قیامگاہ پر اس حالت میں واپس آیا کہ اس کے پاس ایک وقت کے کھانے کا بھی سامان نہ تھا۔

ماجد ولین کا خط اسٹیفن کے نام

"آج میری سہیلی سوزان، اپنے گرمائی قیامگاہ سے واپسی پر کوبلانس جاتے ہوئے میرے پاس بھی اُتری۔ مجھے اس کی ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی، میری خواہش تھی کہ کاش تم بھی اس موقعہ پر ہمارے درمیان ہوتے اور تمہاری ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوتی جو نہ صرف اپنی شکل و صورت بلکہ اپنے عادات و خصایل کے اعتبار سے بھی ممتاز درجہ رکھتی ہے۔

میری سہیلی مختلف زبانیں جانتی ہے، مصوری سے خوب واقف ہے۔ مختلف قسم کے ساز بجا لیتی ہے، اور جس وقت گاتی ہے تو گاتی نہیں بلکہ جادو کرتی ہے۔ تصویر کشی اس کا خاص فن ہے۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت کھیلتی رہتی ہے، اور موتی سے دانت ہر وقت جھلکتے رہتے ہیں۔ سیر و تفریح اس کی زندگی کی جان اور رقص و سرود کی محفلوں

کی شرکت اس کا دین وایمان ہے، وہ بڑی شوخ وشریر ہے اور اے اسٹیفن میری التجا تم سے بھی یہی ہے کہ تم بھی اس سے اسی طرح محبت کرو جس طرح میں محبت کرتی ہوں اور پھر جب تم اسے دیکھو تو اس کے ساتھ بڑی الفت سے پیش آؤ، کاغذ میں اب اس قدر گنجایش نہیں کہ کچھ اور لکھ سکوں بجز اس کے کہ:

"تمھاری محبت کرنے والی"

اسٹیفن کی طرف سے ماجد ولین کے نام

اے ماجد ولین، میں تمھارے حکم کے مطابق تمھاری سہیلی سے ضرور محبت کروں گا، لیکن اس لئے نہیں، جیسا کہ تم کہتی ہو، وہ بہت شوخ وشریر ہے، کیونکہ تمھاری محبت نے مرے دل میں تمھارے علاوہ کسی دوسرے کے لئے گنجایش ہی کب چھوڑی ہے۔ اور نہ اس لئے کہ وہ خوب گاتی اور ناچتی ہے۔ کیونکہ میرا غمزدہ دل دنیا میں اب صرف دو ہی باتوں سے سکون پاسکتا ہے ایک تمھاری "ملاقات" دوسری "موت" بلکہ میں اس کی عزت کروں گا، صرف اس لئے کہ وہ تمھاری غمخوار وغمگسار ہے اور اسے دیکھ کر تمھاری تکلیفیں کچھ ہلکی ہو جاتی ہیں۔

اس لئے اے ماجد ولین، تم میری طرف سے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کردو اور سلام پہونچا دو۔ حالات ابھی تک ناسازگار ہیں اور تلخ کامیاں بدستور، لیکن میں صبر وتحمل کے ساتھ ان کا مقابلہ کر رہا ہوں۔

"اچھا خدا حافظ"

اوجین[1] کا خط اسٹیفن کے نام

"محترمہ ماجد ولین کا مرسلہ ہدیہ پہونچا۔ میں ان کی اس عنایت کا انتہائی شکر گزار ہوں، ان کے اس تحفہ کی بدولت مجھے ایک نئی چادر مل گئی جس کی مجھے سخت ضرورت تھی اور جسے ان حالات میں خریدنا بھی میرے لئے ممکن نہ تھا ان کو میرا شکریہ پہونچا دو۔ مجھے امید ہے کہ میں جلد ان کی زیارت سے شرف اندوز ہوں گا اور ان کی خدمت میں ایک بہترین تحفہ پیش کروں گا اور اگر بدقسمتی سے ایسا نہ کر سکا تو کم ازکم ان کو ایسے عجیب وغریب قصے تو ضرور ہی سناؤنگا جن کو سنکر وہ بہت خوش ہوں گی۔

کل میری نظر سے لڑائی کا پہلا واقعہ گزرا۔ پہلے تو میں اس خوفناک ٹکر کو دیکھ کر بہت ڈرا، لیکن جوں ہی گھوڑوں کی ہنہناہٹ، گولیوں کی سنسناہٹ، قرنا وبوق کی آوازیں اور جنگی گیتوں کے ترانے میرے کانوں میں پہونچے تو مجھیں

---

[1] اسٹیفن کا بھائی۔

ایک نئی روح دوڑ گئی اور اپنے گرد و پیش سے بےخبر ہو کر مینے اپنے گھوڑے کو تلواروں کی چھاؤں میں ڈالدیا۔

میں اس خوشی کا اظہار نہیں کر سکتا جب مینے دیکھا کہ دشمن کا لشکر ہمارے مقابلہ میں پسپا ہو رہا ہے، مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا میں نے ہی ان لوگوں کو شکست دی ہے اور بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میرے افسر نے اس موقعہ پر میری بہادری دیکھ کر میری بڑی تعریف کی۔ مجھے امید ہے کہ جلد تمھارے پاس لوٹوں گا۔"

اسٹیفن کا خط ماجد ولین کے نام

"اے ماجد ولین، زمانہ کے خشک ہونٹوں پر تبسم کے کچھ آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ میں بعض اسباب کی بنا پر چند ہفتوں سے اپنے استاد سے نہ مل سکا تھا۔ کل میری قیام گاہ پر وہ خود مجھ سے ملنے کے لئے آئے، اور مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ کسی ابتدائی مدرسہ میں انھوں نے میرے لئے کوئی جگہ تلاش کی ہے، جس کی تنخواہ گو اسوقت بہت کم ہے لیکن مدرسہ کے مہتمم نے آٹھ مہینہ کے بعد اس تنخواہ کو دوگنا کر دینے کا وعدہ کیا ہے میں اس احسان پر خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

اے ماجد ولین، زندگی کی عمارت کا پہلا پتھر بڑی مشکل سے رکھا جاتا ہے لیکن جب وہ رکھ جاتا ہے تو پھر اس کا بلند کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا، اس لئے آج ہم اس کو پاکر مبارکباد کے مستحق ہیں اور کل جب ہم زندگی کی اس برکت کو بھی پالیں گے جس کی تمنا ایک مدت سے ہے تو ہماری مسرتوں کا کیا ٹھکانا ہوگا۔

ایڈورڈ کا خط اسٹیفن کے نام

"اختلاف کی خلیج میرے اور میرے چچا کے درمیان اب تک حایل ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ میں عیش و آرام کی زندگی بسر کروں اور میں اس پر راضی نہیں کہ اپنے والد کے ترکہ سے اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق فایدہ نہ اٹھاؤں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیوں دوسروں کی دولت پر دندان آز تیز کئے ہوئے ہے۔ حالانکہ جب تک میں زندہ ہوں وہ اسے نہیں ملسکتی۔

خیر یہ بھی چند دن کی بات ہے، قانوناً میرے جوان ہونے میں صرف چند ماہ کی مدت باقی ہے اسکے بعد دیکھونگا وہ کیا کرتا ہے۔

تمھارے بعض حالات کی خبر مجھ تک بھی پہونچی ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تمھارے گھر والے تم سے بہت ناراض ہیں انھوں نے تمھیں علٰحدہ کر دیا ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم کو بلانس کو چھوڑ کر جو تنیج آگئے ہو اور فکر معاش میں سرگرداں ہو، اور ابھی تک تمھاری کوششیں بارآور نہیں ہوئیں۔

اے میرے دوست کاش تم میرا کہنا مان لیتے اور اس لڑکی سے شادی کر لیتے جو تمہارے عزیزوں نے تمہارے لئے پسند کی تھی اور اس کی دولت کے زیر سایہ عیش و آرام سے زندگی گزارتے۔

اے میرے دوست اس دُنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی خوش نصیبی نہیں کہ انسان مالدار ہو۔ انسانوں کے دماغوں میں جس قدر بھی علم و عقل ہے، ان کے جسموں میں جتنی بھی قوت و طاقت ہے اور ان کے پاس جو کچھ بھی شرف و فضیلت ہے وہ حقیقت میں سب مال حاصل کرنے اور دولت تک پہونچنے کے ذریعہ ہیں۔

میں اس شخص کے پاس رہتے رہتے تنگ آگیا ہوں۔ اور اب اس کے ساتھ ایک شہر میں ایک لمحہ کے لئے بھی رہنا گوارا نہیں کرتا۔ ارادہ ہے کہ جلد تمہاری ملاقات کے لئے جو تنج پہونچوں، اچھا رخصت۔ والسلام"

اسٹیفن کا خط ایڈورڈ کے نام

"اے میرے دوست مجھ سے ناراض نہ ہونا اگر میں یہ کہوں کہ زندگی کے متعلق میرا نظریہ تمہارے نظریہ سے جدا ہے میرے نزدیک روحانی مسرت سے زیادہ کوئی سچی مسرت نہیں، دولت بھی اسی روحانی مسرت کے حاصل کرنیکا ایک ذریعہ ہے پھر اگر یہ مسرت بغیر دولت کے مل جائے تو دولت کی کیا ضرورت ہے یا یہ کہ اگر تھوڑی سی دولت سے میسر آجائے تو زیادہ کی ہوس کیوں ہو۔

مال و دولت بیکار ہے اگر ساتھ ایسے انسان کا ہو جس سے محبت نہیں، اس لئے میری رائے میں جو شخص کسی لڑکی سے اس کی دولت کے لئے شادی کرتا ہے، کمینہ اور بے غیرت ہے۔ وہ روٹی کی خاطر اپنے جسم کو عورتوں کے حوالہ کر دیتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح بدکار عورتیں اُجرت لیکر اپنا جسم حوالہ کر دیتی ہیں۔

جیسا کہ تم کہتے ہو میں بیشک فقیر و محتاج ہوں۔ لیکن میں اپنی حالت سدھارنے کے لئے انتہائی کوششیں کر رہا ہوں اور کل سے مجھے اپنی کوششوں میں کامیابی کی ایک جھلک بھی نظر آنے لگی ہے، سردست مجھے ایک چھوٹی سی ملازمت مل گئی ہے اور میں نے اپنے لئے ایک معمولی سا کمرہ بھی کرایہ پر لے لیا ہے۔

اے ایڈورڈ، مجھے اُمید ہے کہ تم میری تلخ نوائی کو معاف کر دو گے، اور مجھ سے جو تنج آنے کا جو وعدہ تم نے کیا ہے اسے جلد پورا کرو گے۔"

اسٹیفن کا کمرہ

ملازمت ملنے کے بعد اسٹیفن ایک چھوٹے سے کمرہ میں رہنے لگا جو تقریباً دس فٹ لمبا اور سات فٹ چوڑا تھا۔
اس کمرہ میں اس نے لکڑی کا ایک پلنگ اور ایک چھوٹی سی میز بچھا رکھی تھی، رات کے وقت اس پر پڑھتا اور دن میں

کھانا کھاتا۔ دو کُرسیاں بھی اس کمرے میں موجود تھیں۔ ان میں سے جو زیادہ بڑی اور نسبتاً اچھی تھی وہ خود اس کے لئے تھی اور دوسری پر اس نے کپڑوں کا بکس رکھ چھوڑا تھا۔ پکانے کے لئے ایک چولھا اور پانی کا ایک گھڑا بھی وہاں موجود تھا ان کے علاوہ دو چار چیزیں اور بھی تھیں۔

اس کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی جو کچھ ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں کھُلتی تھی۔ اسٹیفن نے جب اس میں سے جھانکا اور اس بھیانک منظر کو دیکھا تو وہ کچھ افسردہ سا ہوا لیکن پھر خود ہی کہنے لگا:

"خیر کوئی مضائقہ نہیں میرے لئے یہی بہتر ہے کہ میرا یہ حال کسی کو معلوم نہ ہو"۔

پھر اس نے کچھ دور پر ایک بہت بڑا درخت دیکھا جو سرسبز و شاداب تھا اسے دیکھنے لگا: "میرے لئے یہی باغ ہے میں ہر روز صبح کو اُٹھکر سب سے پہلے اسی کو دیکھا کروں گا"۔

اس کے بعد اسے قریب ہی ایک گرجا دکھائی دیا جسے دیکھ کر اس نے کہا:۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اس گرجا کے گھنٹوں کی آواز وقت معلوم کرنے میں میری مدد کرے گی"۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے کانوں میں گھنٹے بجنے کی آواز آنے لگی، اسنے خوش ہو ہو کر ان کو گنا اور کہا، "اب مجھے گھڑی خریدنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں"۔

اسٹیفن اپنے نئے مکان کو دیکھ کر اس کے مختصر اور حقیر ہونے کے باوجود بھی بہت خوش تھا۔ کیونکہ یہ پہلا گھر تھا جس میں وہ اپنی قوت بازو کے بھروسے پر اُترا تھا۔ اور جس کا فرنیچر اس نے اپنے روپے سے خریدا تھا وہ اپنے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

"سچ تو یہ ہے انسان اپنے ہی گھر میں آزادی سے رہ سکتا ہے، جس طرح چاہے اُٹھے جس طرح چاہے بیٹھے کوئی ٹوکنے والا نہیں۔ وہ اچانک اپنے ہاتھوں کو ہوا میں پھیلا لیتا ہے، بلا لحاظ اس امر کے کہ یہ کسی دوسرے کے لگ جائے گا، غور و فکر کرتے وقت وہ جس طرح چاہتا ہے اپنا سر ہلاتا ہے، اپنی اُنگلیوں کو حرکت دیتا رہتا ہے بلا لحاظ اس کے کہ کوئی اسے پاگل کہے گا"۔

مگر ان حالات میں اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ انتہائی کفایت شعاری سے زندگی بسر کرے۔ چنانچہ اس نے اپنی آمدنی کو اپنے کھانے پینے پہننے، کرایہ اور ادائے قرض پر تقسیم کر دیا اور ایک خاموش اور پرسکون زندگی گزارنے لگا۔

نیا مہمان

ایک دن اتوار کی صبح کو اسٹیفن اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ درس و تدریس کی محنت و مشقت سے اسے اتوار ہی کے دن کچھ راحت نصیب ہو جاتی تھی، کہ اس نے اپنے زینہ پر بھاری قدموں کی آواز سُنی جو اس کی پڑوسن کے جوتوں کی آواز سے مختلف تھی۔

وہ گھبرا گیا اور اُس آواز کی طرف کان لگا کر سننے لگا۔ آنے والا شخص اس کا نام لیکر زور زور سے پکار رہا تھا۔ اسے

خیال ہوا کہ یہ آواز اس کے لئے نامانوس نہیں ہے، چنانچہ وہ جلد دروازہ کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر دیکھا تو اس کا دوست ایڈورڈ کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر باغ باغ ہوگیا اور بڑی دیر تک گلے سے لگائے رہا۔ پھر بولا:۔

میرے عزیز دوست تم نے اپنے وعدہ کو خوب پورا کیا، جس کے لئے میں تمھارا ممنون ہوں۔ میں تمھاری آمد کا بڑی بیچینی سے منتظر تھا۔"

ایڈورڈ کہنے لگا:۔"اب تو میں تمھارے اس مختصر سے گھر میں دو مہینہ تک مہمان رہوں گا۔ کیونکہ میرے سن بلوغ کو پہونچنے میں اتنی ہی مدت باقی ہے، میرے اور میرے چچا کے تعلقات بہت ناخوشگوار صورت اختیار کر چکے ہیں، چنانچہ میں اس کے گھر کو خیرباد کہہ چکا ہوں اور قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک ترکہ کا یہ جھگڑا ختم نہ ہو جائے گا میں ان کی صورت نہیں دیکھوں گا۔"

یہ کہکر وہ اندر آیا اور کہنے لگا: "تمھارا یہ کمرہ بہت ہی خوبصورت اور خوش قطع ہے اور میرے اندار سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔"

پھر اس نے اپنا بکس کھولا اور اس میں سے عطر کی ایک شیشی، ایک کنگھا اور چند ریشمی رومال نکال کر اسٹیفن کو پیش کئے جنھیں اسٹیفن نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ اس کے بعد اسٹیفن اُٹھا اور گوشت کا پارچہ جو اس نے کل کے لئے رکھ چھوڑا تھا بھونا اور دسترخوان بچھا کر اس پر رکھ دیا اور اس کے قریب ہی شراب کی بوتل اور پنیر کا ایک ٹکڑا بھی رکھا اور دونوں کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ وہ دونوں کھاتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔

دن بھر اسی طرح ہنس بول کر انھوں نے گزار دیا اور جب سونے کا وقت قریب آگیا تو اسٹیفن نے کمرے کے ایک کونے میں اپنے لئے فرش پر دری بچھالی اور پلنگ ایڈورڈ کے لئے خالی کر دیا اور سو گئے۔

صبح کو مدرسے جانے سے پہلے اسٹیفن نے جو کچھ اس کے پاس تھا ایڈورڈ کے حوالہ کیا اور کہنے لگا: "مجھے کل دو سو فرانک ماہوار ملتے ہیں، ساٹھ فرانک تو کھانے پینے میں صرف ہو جاتے ہیں اور باقی گھر کا کرایہ ادا کرنے اور سامان کی خریداری کے وقت جو قرض لیا تھا اس کی ادائی کے لئے بچا لیتا ہوں۔ میں گزشتہ دس دن میں پچاس فرانک صرف کر چکا ہوں اب جو کچھ باقی ہیں یہ ہیں، اب تم ہی انھیں خرچ کرو آج سے تم ہی اس گھر کے مالک اور اس کے نظم و نسق کے مختار ہو۔"

یہ کہکر وہ مدرسہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایڈورڈ نیچے اُترا، اور بازار جا کر گوشت، روٹی کچھ پھل اور شراب خرید لایا اور اس طرح بارہ فرانک سب کے سب خرچ کر دئے۔

جب اسٹیفن مدرسہ سے واپس آیا اور یہ سب سامان دیکھا تو بولا:۔

"اے ایڈورڈ، کیا آج کسی کی دعوت تو نہیں ہے؟" اس نے کہا: "ہاں میرے آنے کی خوشی میں آج دعوت ہے"

اسٹیفن مسکرایا اور کہنے لگا:۔ تم نے بہت اچھا کیا، جس بات کو میں بھول گیا تھا وہ تم نے یاد دلا دی" اور یہ کہکر پھر دونوں

کھانے میں مصروف ہو گئے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ایڈورڈ کہنے لگا:۔ "میں اس کمرہ میں چند چیزوں کی کمی محسوس کرتا ہوں براہ کرم مجھے ان کے خریدنے کی اجازت دو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ صرف وہی چیزیں خریدوں گا جو بہت ضروری ہیں اور کم سے کم قیمت صرف کرنے کی کوشش کروں گا"۔ اسٹیفن کہنے لگا:۔ "بہتر ہے جو تمھاری خواہش ہو کرو"۔

چنانچہ ایڈورڈ بازار گیا اور جب ایک گھنٹہ کے بعد واپس آیا تو ایک سیاہ تنومند کتے کی زنجیر اس کے ہاتھ میں تھی اور پیچھے ایک قد آدم آئینہ اور کپڑا ٹانگنے کا اسٹینڈ ایک مزدور کے سر پر تھا اس نے اسٹیفن سے کہا:۔ "مجھے وہ کمرہ بہت ہی بُرا لگتا ہے جس میں آئینہ نہ ہو، اور اس گھر سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے جس میں کتا نہ بھونکے، اے اسٹیفن تمھیں یہ سنکر تعجب ہوگا کہ میں نے ان تمام چیزوں کی خریداری میں صرف بیس فرانک صرف کئے ہیں"۔

اسٹیفن یہ سُنکر ہنسا اور کہنے لگا: "ایڈورڈ تمھارا جنون بھی کس قدر دلچسپ ہے"۔ اس نے کہا: "ہاں تو کیا زندگی بغیر جنون کے خوشگوار ہو سکتی ہے؟" اور اس طرح مہینہ کی بیس تاریخ سے پہلے ہی پہلے دونوں کے ہاتھ خالی ہو گئے اور کتا آئینہ یا اسٹینڈ کوئی فایدہ نہ پہونچا سکے۔

اسٹیفن کہنے لگا: "اے ایڈورڈ، اب کیا کرنا چاہئے"۔ اس نے کہا:۔ "یہ مسئلہ اس قدر دشوار نہیں میں ابھی تمھارے سامنے ایک تجویز پیش کرتا ہوں جو یقیناً بہت مفید ہوگی"۔

یہ کہکر وہ اُٹھا اور باہر چلا گیا اور کچھ دیر بعد اپنے ہمراہ ایک مزدور اور ایک کباڑئے کو لئے ہوئے واپس آیا وہ کمرے کے دروازہ میں کھڑا ہو گیا، اور اس شخص سے کہنے لگا: "لو اس پلنگ کو یہاں سے نکالو اس مختصر سے کمرے میں اس کی کوئی ضرورت نہیں اور سونے والے کے لئے زمین سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔ اور دیکھو یہ دونوں تکئے بھی زائد ہیں انھیں بھی یہاں سے ہٹاؤ اگر ایک تکیہ کو موڑ کر سر کے نیچے رکھ لیا جائے تو پھر دو تکیوں کی ضرورت نہیں رہتی"۔

یہ کہکر وہ اسٹیفن کی طرف دیکھنے لگا اور بولا "کیوں دوست میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں"۔

اسٹیفن یہ سنکر چونک پڑا، وہ اپنی میز پر سر جھکائے ہوئے ماجد ولین کے نام خط لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ اس کا مقصد سمجھ گیا اور کہنے لگا "ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو"۔

پھر ایڈورڈ نے پوچھا: "کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ نازک شیشہ جو اس کھڑکی میں لگا ہوا ہے موسم سرما کی تند و تیز ہواؤں کا مقابلہ کر سکے گا؟ یقیناً نہیں، تو پھر بجائے اس کے کہ ہم اسے ہواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں کیا یہ عقل کا تقاضہ نہیں ہے کہ ہم اس کی قیمت سے فایدہ حاصل کریں"۔

یہ کہکر وہ کھڑکی کی طرف بڑھا اور یکے بعد دیگرے اس کے تمام شیشے نکال کر مزدور کے حوالے کئے۔ اس کے بعد اس کی نظر پردے پر پڑی اور اسے دیکھ کر کہنے لگا:۔ "میرے خیال میں تو مختصر کمرے کے لئے اس قدر بھاری

پردے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ اور وہ بھی مزدور کو دیدیا۔

پھر کہنے لگا: "کیا تم اس صندوق میں کوئی ایسی چیز رکھنا چاہتے ہو جس کے چوری ہو جانے کا تمھیں خوف ہو؟"

اسٹیفن یہ سُنکر ہنس پڑا اور کہنے لگا: "اگر میرے پاس ایسی کوئی چیز ہوتی تو آج یہ نوبت ہی کیوں آتی"۔ "تو پھر اس میں زبردست تالے کی کیا ضرورت ہے؟" یہ کہکر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس تالے کو نکال کر مزدور کے سپرد کیا اور چاروں طرف کمرے میں اپنی تیز تیز نگاہیں دوڑانے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی نگاہیں میز پر پڑیں، اسٹیفن ڈر گیا اور کہنے لگا: "اے ایڈورڈ ٹھیرو میز کو اس وقت تک ہاتھ نہ لگانا جب تک میں اس خط کو پورا نہ کرلوں"۔

ایڈورڈ مسکرایا اور بولا: "اچھا میں اس میز کو ماجد ولین کی خاطر چھوڑے دیتا ہوں"۔

اس کے بعد اس شخص سے تمام سامان کی قیمت ٹھیرا کر تیس فرانک میں اس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ اسٹیفن کے پاس آیا اور کہنے لگا "یہ جو کچھ ہوا اس میں تمھاری کیا رائے ہے؟" اسٹیفن نے کہا "میری تو یہ رائے ہے کہ تم یہ قیمت مجھے دیدو، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ تم اس معاملہ میں کچھ زیادہ دور اندیش ثابت نہیں ہوئے"

ایڈورڈ کہنے لگا:۔

"میرے دوست میرا خیال ہے کہ اب ہمارے درمیان اختلاف رائے شروع ہو گیا ہے۔ کیونکہ تم جزرسی کو پسند کرتے ہو جو مجھے نہیں بھاتی، اور میں فراخ دستی کو محبوب رکھتا ہوں جو تمھیں پسند نہیں آتی، لہذا ہمارے تمھارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم تمھاری تنخواہ کو آدھا آدھا بانٹ لیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے حصے کو اپنی اپنی ضروریات پر صرف کرے"

یہ کہکر وہ ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا پھر کہنے لگا: "دیکھو ہماری یہ علٰحدگی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہماری رہنے کی جگہ بھی علٰحدہ نہ ہو۔ لہذا یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اس کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کرلیں، اور تم دیکھو گے کہ میں کیسے انصاف اور خوبصورتی سے اس کو تقسیم کرتا ہوں"۔

یہ کہکر وہ چونے کی ایک کنکری اُٹھا لایا اور کمرے کے عین وسط میں ایک خط کھینچ کر کہنے لگا: "دیکھو یہ نصف میرا ہے اس میں میرا کتا میرا آئینہ اور میرا اسٹینڈ رہیگا۔ اور باقی نصف تنہا تمھارے لئے چھوڑتا ہوں۔ تمھارا حصہ میرے حصے سے کہیں مفید اور بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں کھانا پکانے کا چولھا، خط لکھنے کی میز اور وہ کھڑکی بھی ہے جس سے تمھیں پہنتے یا چادر اوڑھتے وقت تم اپنا ہاتھ بھی باہر نکال سکتے ہو"۔

اسٹیفن یہ سُن کر بہت ہنسا اور اسے وہیں چھوڑ کر کسی کام سے باہر چلا گیا۔

الغرض ایڈورڈ اسی طرح اسٹیفن کے عیش و آرام کو مکدر، اس کے دماغی سکون کو برباد کرتا رہا اور اسٹیفن بڑے صبر و تحمل سے ان سب باتوں کو برداشت کرتا رہا کیونکہ وہ اس کا دوست تھا۔

قربانی

ایک دن جبکہ ایڈورڈ سیر و تفریح کے لئے گاؤں سے باہر چلا گیا تھا، اور اسٹیفن تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا صبح کے لکچر کے لئے موسیقی کے کچھ نوٹ مرتب کر رہا تھا کہ دفعتاً اس نے زینہ پر قدموں کی آہٹ اور لوگوں کے بولنے اور زور زور سے چیخنے کی آوازیں سنیں وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور دروازہ کھولکر دیکھنے لگا۔

اس نے دیکھا کہ ایک دراز قد تنومند چوڑا چکلا شخص کھدانوں میں کام کرنے والے آدمیوں کا لباس پہنے ہوئے، آنکھوں سے چنگاریاں برساتا اور منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا، دونوں ہاتھوں میں دو تلواریں لئے ہوئے زینے پر موجود ہے جوں ہی اس کی نگاہ اسٹیفن پر پڑی وہ پوچھنے لگا "کیا ایڈورڈ تم ہی ہو!"

اسٹیفن سمجھ گیا کہ یہ شخص کسی بُرے ارادے سے آیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے اس کے دوست کا صورت شناس نہیں ہے۔ اسے ایڈورڈ پر ترس آ گیا اور اس انتقام کا سبب دریافت کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا اور کہنے لگا:

"ہاں میں ہی ایڈورڈ ہوں، کہو تمہارا کیا مطلب ہے" اس کے جواب میں اس نے اسٹیفن کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور کہنے لگا: "شاید تیری وہ شجاعت اور بہادری جس نے تجھے میری بیوی کے ساتھ عشق کرنے اور میرے خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے پر اُبھارا، اس وقت تک تیرا پیچھا نہیں چھوڑے گی جب تک کہ اس دریا کے کنارے، یہ تلواریں فیصلہ نہ کریں، اور دیکھو یہ لوگ جو میرے ساتھ ہیں ہماری اس عزت و آبرو کی لڑائی پر گواہ ہیں، ہم میں سے ہر ایک کو اختیار ہے کہ ان میں سے جسے چاہے اپنا گواہ بنالے"۔

وہ معاملہ کی تہ کو پہونچ چکا تھا اور ایڈورڈ اور اس شخص کی بیوی کے تعلقات کے متعلق پہلے ہی کچھ کچھ سُن چکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے دشمن کے ساتھ خاموشی سے چلدیا اور جب وہ دریا کے قریب پہونچ گئے تو دونوں نے اپنی اپنی تلواریں سونت لیں۔

ایسے وقت میں اسٹیفن کو ماجد ولین کا خیال آیا، اور سوچنے لگا کہ اگر وہ اسے اس وقت چند آخری جملے لکھدیتا تو کیسا اچھا ہوتا چنانچہ وہ گواہوں کی طرف دیکھنے لگا اور بولا: "کیا آپ لوگوں میں سے کسی کے پاس سے کوئی چھوٹا سا لفافہ مل سکتا ہے"؟۔ ان میں سے ایک شخص نے ایک لفافہ نکال کر اسے دیدیا۔ اور اس نے اس میں یہ مختصر سا جملہ لکھدیا "میں ایک شریف مقابلہ میں اپنی جان دے رہا ہوں اور اس آخری وقت میں بھی تمہارے ہی متعلق سوچ رہا ہوں ۔ اے ماجد ولین رخصت"۔

یہ پیام لکھنے کے بعد وہ چاروں طرف دیکھنے لگا، ایک ملاح جو دریا کے کنارے، اپنی کشتی کے اگلے حصہ پر کھڑا ہوا تھا سمجھ گیا کہ وہ کسی ایسے شخص کی جستجو میں ہے جو اس کے اس خط کو مکتوب الیہ تک پہونچا دے، چنانچہ اس کی طرف

بڑھا اور بولا: ”جناب اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے اس خط کو جہاں حکم ہو پہونچا دوں“۔ اسٹیفن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور لفافہ کی پشت پر پتہ لکھ کر اس کے حوالہ کیا۔

اس کے بعد لڑائی شروع ہوگئی، اور چند لمحوں میں اسٹیفن کا بازو بیکار ہوگیا۔ گواہوں نے یہ دیکھ کر لڑائی کے بند کر دینے کا فیصلہ کر دیا اور دونوں دشمنوں نے مصافحہ کر لیا۔

ملّاح ابھی تک بدستور اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا اس لئے اسٹیفن زمین پر پڑے ہی پڑے اپنی کمزور آواز میں اُس سے کہنے لگا: ”تمھارے پاس جو خط ہے اسے پھاڑ ڈالو کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے“۔

یہ سُن کر اس نے اس خط کو چاک کر دیا اور اپنی جیب سے ایک رومال نکال کر اُس کے بازو پر باندھ دیا اور اُسے وہاں سے اُٹھا کر اس کے گھر لے گیا اور بستر پر لٹا کر مرہم پٹی میں مشغول ہوگیا۔

دوستی

اسٹیفن کا زخم بھر چکا ہے اور ایڈورڈ جو صبح کو یہاں سے جانے والا ہے اپنے دوست کے پاس بیٹھا ہوا اس سے کہہ رہا ہے۔

”اے اسٹیفن تم نے اپنے خون سے میرے دل کے صفحات پر محبّت کے جو نقوش قایم کئے ہیں وہ تا زیست محو نہیں ہو سکتے، اور تم نے اپنی اس تنگدستی و مصیبت میں جو غمخواری و مدارات کی ہے اُسے میں تمام عمر فراموش نہیں کر سکتا میں سمجھتا ہوں کہ کسی دوست نے اپنے دوست کے لئے اور کسی بھائی نے اپنے بھائی کے لئے وہ تکلیف برداشت نہ کی ہوگی جو تم نے میرے لئے برداشت کی ہے اور میں تمھارے ان احسانات کا بدلہ کبھی نہیں اُتار سکتا“۔

اسٹیفن کہنے لگا: ”میں نے تمھارے ساتھ کوئی ایسا احسان نہیں کیا جو بدلے کا مستحق ہو۔ تم میرے دوست ہو اور دوستی کے کچھ حقوق ہوا کرتے ہیں، اس لئے اگر تم شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہو تو تمھیں اس دوستی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جو بچپن سے ہم دونوں میں قایم ہے اور اگر کبھی کسی زمانہ میں تمھیں یہ موقعہ میسر ہو کہ تم میری مدد کے لئے اپنا اپنا ہاتھ بڑھاؤ تو صرف محبّت کے لئے ایسا کرنا، احسان کے بدلے کے خیال سے نہیں۔

اے ایڈورڈ میں تو پیدائشی بدنصیب ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں بدنصیبوں کو دوست رکھتا اور اُن سے محبت کرتا ہوں، اس دُنیا میں فقر و فاقہ کی دوستی سے زیادہ مضبوط کوئی دوسری دوستی نہیں ہو سکتی، اور اگر مجھے ایسے دو شخصوں کی دوستی میں انتخاب کا اختیار دیا جائے، جن میں سے ایک فقیر ہو، جو اپنے فاقہ کو میرے فاقہ سے ملا کر اسے دوچند کر دے، اور دوسرا مالدار ہو جو اپنی مدد کا ہاتھ میری طرف بڑھا کر میری مصیبت و تنگدستی کو دور کر دے تو میں پہلے کو دوسرے پر ترجیح دوں گا۔

یہی وہ چیز تھی اے ایڈورڈ کہ میں نے تم سے محبت کی اور تمہیں اپنا عزیز دوست سمجھا۔ ہماری بدقسمتی ایک ایسا مرکز تھی جہاں پہونچکر ہم نے اس بات کا عہد کیا کہ ہم میں سے ہر شخص دوسرے کی مدد کرے گا، خواہ یہ زمانہ کتنے ہی پلٹے کھائے"

اس کے بعد ایڈورڈ نے اسٹیفن کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر قسم کھائی کہ اس کے دل کی دھڑکن اس وقت تک کم نہیں ہو سکتی، اور اس کا سینہ اس وقت تک ٹھنڈا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اسے زمانہ پر فتحمند اور کامیابی سے ہم آغوش نہیں دیکھ لیگا۔ اس کے بعد اس نے نئی حاصل شدہ دولت میں سے اسٹیفن کو کچھ پیش کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ دنیوی آسودگی و سعادت کو اس قدر ارزاں خریدنا نہیں چاہتا ہے"۔

صبح کو اسٹیفن، ایڈورڈ کو رخصت کرنے کے لئے تھوڑی دور تک اس کے ساتھ گیا۔ یہاں تک کہ وہ ایسی جگہ پہونچ گئے جہاں سے انھیں جدا ہونا تھا۔ یہاں وہ دونوں دیر تک گلے ملتے رہے۔ اور جب اسٹیفن گھر واپس ہوا تو غم کے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے۔

اسٹیفن کا خط ماجد ولین کے نام

"میں کل رات ٹہلتا ہوا دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ جب صاف ہوا اور کھلی فضا میں پہونچا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا پتوں میں ایک قسم کی بےچینی پھیلی ہوئی ہے اور وہ اپنی نرم و نازک آواز سے کچھ کہ رہے ہیں۔ ہوائیں بھی بڑی گرانی کے ساتھ جھولتی ہوئی چل رہی تھیں اور گہرے سیاہ بادلوں کے ٹکڑے بھی فضا میں ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے، مجھے محسوس ہو رہا تھا گویا میں ان کی گہرائیوں میں ایک مبہم اور نہ سمجھ میں آنے والی آواز سن رہا ہوں، جو کبھی قریب آجاتی تھی اور کبھی دور ہو جاتی تھی۔

تھوڑی دیر میں، مینے دیکھا کہ وہ پرندے جو ابھی ابھی پانی پر اڑ رہے تھے جلدی جلدی اپنے گھونسلوں میں سمٹنے لگے۔ اور وہ جاندار جو ابھی پتھروں اور کنکریوں پر دوڑ رہے تھے اپنے اپنے بلوں میں سرکنے لگے۔ سیاہی ہر چیز کو اپنے رنگ میں رنگ رہی تھی اور پانی پر بھی اس کا سیاہ رنگ غالب آچکا تھا۔ آسمان و زمین اور ان دونوں کو ملانے والی چیز افق۔ کوئلے کی ایک گہری اور کھوکھلی کان معلوم ہو رہی تھی۔ جس کی ٹھوس دیواروں سے باہر نکلنے کے لئے بجلیاں بیتاب تھیں۔

فطرت کی یہ خاموشی اور بے زبانی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہی۔ کیونکہ فوراً ہی ایک زبردست طوفان نے اٹھکر در و دیوار کو جھنجھوڑ ڈالا، اور پتوں کو شاخوں سے علٰحدہ کر کے کہیں کا کہیں لیجا کر پھینکدیا۔ اور اس کے بعد بادلوں کے سینوں کو چیرتی ہوئی اور ان میں سے اپنے اور بجلیوں کے لئے راستے بناتی ہوئی بارش بھی آئی اور اس زور شور سے آئی کہ وادیاں لبریز ہو گئیں، میدان بھر گئے، نالے پانی اگلنے لگے۔ اس وقت میں اپنے دوست "قرتز" کی کٹی کے قریب پہونچ چکا تھا۔ یہ ایک غریب ملاح ہے جس نے پچھلوں دنوں میرے ساتھ وہ احسان کیا ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میں نے اس آسمانی مصیبت سے بچنے کے لئے اس کے گھر میں پناہ لی، میرا خیال تھا کہ وہ ایک وحشت خیز ویرانہ ہوگا مگر جوں ہی بجلی چمکی اور میں نے اس کے اندرونی منظر کو دیکھا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس قدر خوبصورت اور عجیب معلوم ہوا اس ملاح کی بیوی اور بچے دوزانو بیٹھے ہوئے بڑے ادب کے ساتھ آسمان کی طرف اپنے اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے غمگین اور درد بھری آوازوں میں خدا سے دعائیں مانگ رہے تھے اور ہرچند وہاں نہ کوئی چراغ تھا اور نہ کوئی دوسری روشنی، لیکن میں اس تاریکی میں بھی ان کے چمکتے ہوئے چہرے دیکھ رہا تھا۔

میری آہٹ پاکر اس کی بیوی میری طرف متوجہ ہوئی اور بولی: "قرنز، ابھی تک واپس نہیں آیا ہے، اور اسی پریشانی میں بیٹھے ہوئے ہم سب خدا سے دُعا کر رہے ہیں کہ وہ اسے بخیریت ہمارے پاس پہونچا دے" یہ سنکر میں بیحد متاثر ہوا اور میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر دعائیں مانگنے لگا۔

دُعا سے فارغ ہو کر جب میں نے اپنا سر اُٹھایا تو قرنز دروازے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی بیوی اسکے استقبال کے لئے دوڑی اور اس کی بھیگی ہوئی چادر اس کے سر سے اُتارنے لگی، اس کے بچے اس کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور وہ انھیں لپٹا کر پیار کرنے لگا۔ پھر سب ملکر جب دسترخوان پر گئے تو اس کی پریشانیوں اور تکلیفوں کے متعلق سوالات کرنے لگے۔ میں بھی ان سب کے پاس بیٹھا ہوا ان کی باتیں سُن رہا تھا، اور انکی سانسوں کی ٹھنڈک کو محسوس کر رہا تھا۔

ان کی اس حالت نے میری طبیعت پر بڑا گہرا اثر کیا، اور ہرچند میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کی خوش نصیبی پر حسد نہیں کیا، لیکن اس وقت میں ان پر حسد کئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں اپنے دل سے کہہ رہا تھا کہ وہ عورت جو اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے جو اس کی اُلفت میں رو سکتی ہے، اور اس کی تکلیف پر آنسو بہا سکتی ہے، اور وہ بچے جو اپنے معصوم ہاتھ خدا کے سامنے پھیلا کر اپنے باپ کی زندگی اور عافیت کے لئے دعا مانگ سکتے ہیں، اور وہ باپ جو اپنے بچوں کو اپنے سامنے ہنستا کھیلتا دیکھ کر خوشی سے رو دیتا ہے ——— کیا انکے علاوہ سچی مسرت کہیں اور نصیب ہو سکتی ہے اور اے ماجد و لین عنقریب ہمارا مستقبل بھی ایسا ہی ہوگا یعنی بہت ممکن ہے کہ ہم غریبوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں، لیکن اس عزبت و افلاس کے باوجود بھی ہم بڑے خوش نصیب کہلائیں گے۔

حسب وعدہ میری ترقی میں اب صرف تین مہینہ کی مدت باقی ہے۔ اس کے بعد میں تمھارے پاس دلفاتح آؤں گا، تمھارے والد کے سامنے اپنی شادی کی درخواست پیش کردوں گا اور اپنی ہستی کو تمھارے خوبصورت ہاتھوں میں دیدوں گا اور اس دن کے بعد بدبختی کو ہماری طرف آنے کے لئے کبھی کوئی راستہ نہیں مل سکے گا۔

ماجد ولین کا خط اسٹیفن کے نام

"سوزان اپنے گھر کو بلانس چلی گئی اور مجھے افسردہ و آزردہ چھوڑ گئی۔ لیکن میں بھی بہت جلد اس کے پاس جانے والی ہوں، کیونکہ میرے والد نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ ہم لوگ ایک ماہ بعد موسم سرما کے بقیہ دن وہیں گزاریں گے۔ وہاں پہونچکر تمھیں پھر خط لکھوں گی اور کیا عجب وہیں ملنے کی کوئی صورت نکل آئے اور میں تمھیں دیکھ سکوں ——— دور ہی سے سہی۔"

ماجد ولین کا خط اسٹیفن کے نام

"مجھے اور والد کو، کو بلانس آئے ہوئے آج تیسرا روز ہے، اور ہم دونوں سوزان کے گھر مہمان ہیں۔ میں اس سے ملکر بہت خوش ہوں۔

آج اس نے ہمارے لئے اوپیرا ہاؤس میں ایک کمرا مخصوص کرا لیا ہے۔ جہاں ہم لوگ ہر اتوار کی شام کو کھیل دیکھنے جایا کریں گے۔ دیکھو خوش قسمتی سے ہمیں ایک ایسی جگہ مل گئی ہے جہاں ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں اور اگر ممکن ہوا تو مل بھی سکتے ہیں۔

اے اسٹیفن، تم میرے پاس ضرور آنا اور یہ خیال کر کے نہ رک جانا کہ تمھیں دوبارہ اس منحوس شہر کی صورت دیکھنا پڑے گی جسے تم نفرت کے ساتھ چھوڑ چکے ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم میری خاطر ان باتوں کو بھول جاؤ گے۔"

نئی زندگی

ماجد ولین جب اپنے والد کے ہمراہ کو بلانس پہونچی، اور اپنی سہیلی سوزان کے گھر مہمان اُتری تو اس کے محل کی عظمت اور کمروں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے زرق برق سازو سامان، قیمتی فرنیچر، چمکدار ظروف اور آرائش کی چیزوں سے اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، خواصوں اور خدمتگاروں کی کثرت اور ان کے رنگ برنگ لباس نے اسے اور بھی تعجب میں ڈال دیا۔

جب وہ آئینہ کے سامنے اپنے آپ کو دیکھتی، اور پھر اپنے برابر کھڑی ہوئی خادمہ پر نظر ڈالتی تو شرما جاتی اور ایسا محسوس کرتی گویا وہ اس کا اور اس کے ان چھوٹے چھوٹے دھاری دار دیہاتی کپڑوں کا جنھیں اس نے اپنے ہاتھ سے سیا ہے، مذاق اُڑا رہی ہے۔

سوزان نے اس کے لئے مختلف قسم کے ریشمی، مخملی، سوتی، اُونی لباس تیار کر رکھے تھے۔ ایک بہت عمدہ سوٹ

اس کے ناچنے کے لئے، دوسرا کلب کے لئے اور تیسرا کھانے کے لئے سلوا رکھا تھا، گھر میں پہننے کی قمیصیں اور شب خوابی کے لباس بھی بنوا لئے تھے۔ چنانچہ ماجد ولین رفتہ رفتہ اس زندگی کی عادی ہو چلی اور کوبلانس کی دوشیزاؤں کے ساتھ ہنسنے بولنے لگی اور یہ نئی زندگی اس کے لئے اتنی دلچسپ ثابت ہوئی کہ اسٹیفن کی محبت کے علاوہ ماضی کی ہر چیز اسکی نظر میں بے کیف معلوم ہونے لگی۔

فتنہ

ایک روز رات کو ماجد ولین، سوزان کے کمرے میں اس سے ملنے کے لئے گئی۔ یہ کمرہ بہت ہی خوبصورت و دلکش تھا، اُس کی دیواریں اور فرش سُرخ سُرخ قالینوں سے آراستہ تھے، کھڑکیوں اور دروازوں پر سفید ریشم کے پردے پڑے ہوئے تھے، جن کے بیچ بیچ میں چاندی کے باریک تار جھلک رہے تھے اور کناروں پر چمکتے ہوئے موتیوں کی جھالر بہت ہی حسین معلوم ہو رہی تھی۔

کمرے میں چاروں طرف قیمتی کرسیاں اور خوش قطع میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ جن پر سونے چاندی کے برتن اور گلدان بڑے سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔

اس نے دیکھا کہ سوزان کے سامنے چاندی کے چھ چھوٹے چھوٹے صندوق رکھے ہوئے ہیں، سوزان اسے دیکھتے ہی کہنے لگی :۔ "آج میرے منگیتر نے میرے لئے شادی کا تحفہ بھیجا ہے کیا تم اسے دیکھنا پسند کرو گی" اور یہ کہکر سوزان نے وہ سب صندوق ایک ایک کر کے اس کے سامنے کھولنا شروع کئے، کسی میں ہار، کسی میں بالیاں، کسی میں کنگن، کسی میں جوشن غرض بہترین طرز کے قیمتی موتیوں سے جڑے ہوئے مختلف قسم کے زیورات ان میں بند تھے۔

ماجد ولین ان سب چیزوں کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئی اور گھنٹہ بھر تک ایک ایک چیز کو اپنے ہاتھ میں لیکر اُلٹتی پلٹتی رہی۔ اس کے بعد اس نے ہیرے کی چھوٹی سی بالیاں لیکر اپنے کانوں میں پہن لیں، یہ دیکھ کر سوزان نے ماجد ولین سے اصرار کیا کہ وہ تمام زیور پہن کر دیکھے۔ چنانچہ وہ تمام زیور اُس نے پہن لیا۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔

سوزان بولی :۔ "اے ماجد ولین، تیرا حُسن اس زیور کا اور یہ زیور تیرے حُسن کا کس قدر محتاج ہے اور میری تو خدا سے یہی آرزو ہے کہ تجھے ایک ایسے شخص کی دُلہن دیکھوں جو صاحب دولت و ثروت ہو اور تیری زندگی کو دولت محبت سے لبریز کر دے"۔

اس کے بعد وہ اُس خوبصورت محل کا ذکر کرنے لگی جو اسکے منگیتر نے اس کے لئے کوبلانس کے قرب و جوار میں بنوایا ہے اور جس میں عیش و عشرت کے تمام شاہانہ ساز و سامان اُس کے لئے فراہم کئے ہیں، یہ سنکر ماجد ولین نے اپنا

سر تھوڑی دیر کے لئے جھکا لیا۔ اُس نے اسوقت تک اپنی اور اسٹیفن کی محبت کے راز کو سوزآن سے چھپایا تھا لیکن اب شاید وہ چھپانے پر قادر نہ تھی اس لئے کہنے لگی :۔ "اے سوزآن، اگر میں اپنے کسی راز کا ذکر تمھارے سامنے کردوں تو کیا تم اس کے مخفی رکھنے کا وعدہ کرسکتی ہو؟" وہ بولی: "کیوں نہیں اگر تمھارے راز کو میں بھی نہیں چھپا سکتی تو پھر کون چھپا سکتا ہے؟"

اس کے بعد ماجد ولین نے اپنی اور اسٹیفن کی محبت کا پورا قصہ اسے سُنا دیا اور اس عہد کا بھی ذکر کیا جو ان دونوں نے آپس میں کیا تھا کہ موت کے علاوہ کوئی چیز ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کرسکے گی۔

سوزآن کہنے لگی: "ہاں، مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب وہ نیا نیا تمھارے گھر میں آکر رہا تھا تو تم نے مجھے اسکے متعلق لکھا تھا کہ وہ نہ خوبصورت ہے اور نہ اپنے اندر کوئی خاص جذب وکشش رکھتا ہے"۔

ماجد ولین کہنے لگی: "بیشک وہ ایسا ہی ہے، لیکن اُس کا اخلاق مجھے اس کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہے۔ کیونکہ جو شخص اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالکر ایک ناواقف شخص کے بچانے کے لئے دریا میں کود پڑے اور موت کی پروا نہ کرے وہ یقیناً بڑا بلند ہمت، عالی حوصلہ اور شریف انسان ہوگا اور اے سوزآن تم تو خود اس منظر کو دیکھ چکی ہو اور تمھیں نے تو یہ سب کچھ مجھے لکھا تھا! اس کے متعلق تم خود جانتی ہو"۔

سوزآن بولی: "تو کیا یہ وہی شخص ہے؟" اس نے کہا: "ہاں یہ وہی ہے"۔ سوزآن نے کہا: "تب تو میں اُسے خوب اچھی طرح جانتی ہوں، اور اس روز تو میں اسے دیکھ کر بڑے اچنبھے میں رہ گئی تھی۔ تو کیا یہ شخص کچھ مالدار بھی ہے؟"

ماجد ولین کہنے لگی، "نہیں مالدار تو نہیں ہے۔ لیکن وہ اس کوشش میں ہے کہ ضرورت کے لایق کما سکے اور پھر میرے لئے یہ کیا کم ہے کہ وہ مجھ سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ شاید ہی کسی نے کسی سے کبھی کی ہو"۔

سوزآن کہنے لگی، "اے ماجد ولین محبت دُنیا کی کوئی بڑی نعمت نہیں، خوشحالی اور دولت اس سے زیادہ بڑی نعمت ہے، اس لئے کوئی عورت پسند نہیں کرسکتی کہ دُنیا اور اس کی تمام دلچسپیوں کو چھوڑ کر کسی سنسان ویرانہ میں اپنی زندگی گزار دے"۔

ماجد ولین یہ سُنکر چپ ہوگئی، اس لئے نہیں کہ وہ اپنی سہیلی کی رائے سے متفق تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ بہت زیادہ شرمیلی اور باحیا لڑکی تھی۔ اس کے بعد وہ وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

تماشا گاہ

ماجد ولین اور سوزآن "اوپیرا" میں بیٹھی ہوئی ہیں، اور ان کے برابر ہی ماجد ولین کا پھوپی زاد بھائی البرٹ اور سوزآن کا چچا زاد بھائی اشمید بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں دو خوبصورت نوجوان ہیں، جو لباس کے دلدادہ

اور زیب و زینت کے فریفتہ ہیں، ان کی پوری زندگی صرف دو گھنٹوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ ایک پہننے کے لئے، دوسرا عورتوں کو اپنے اوپر مائل کرنے کے لئے اس لئے پہلے گھنٹے میں یہ لوگ اپنی عقل کھو بیٹھتے ہیں اور دوسرے گھنٹے میں اپنی دولت، یہاں تک کر ان کے پاس نہ وہ رہ جاتی ہے نہ یہ۔

یہ دونوں بیٹھے ہوئے اپنے سامنے کی عورتوں کو دیکھ رہے تھے، اگر انھیں کوئی خوبصورت چہرا نظر آجاتا تھا تو اسے دیکھ کر آنکھ مارنے لگتے تھے اور اگر کوئی بدصورت شکل دکھائی دیتی تھی تو زور سے ہنس پڑتے اور اس کا مذاق اڑانے لگتے تھے، سوزآن تو شروع ہی سے اس تمسخر میں ان کا ساتھ دے رہی تھی، لیکن اس کی دیکھا دیکھی ماجد ولین بھی کچھ دیر بعد شریک ہو گئی اور اس بے باکانہ مذاق سے مانوس ہو کر اس میں حصہ لینے لگی۔

یہ لوگ اسی خوش طبعی میں مصروف تھے کہ یکایک البرٹ چیخ اٹھا، اور ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے جو سب سے پچھلی صف میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہنے لگا:۔ "کیا آپ لوگوں نے اس انسان نما بندر سے زیادہ عجیب چیز کبھی دیکھی ہے؟"

ارشمید بولا: "ہاں، مجھے یاد پڑتا ہے کہ آج سے پہلے بھی میں نے اس جانور کو کہیں دیکھا ہے، مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کہاں"۔ سوزآن بولی: "شاید وہ ابھی ابھی اندر آیا ہے اور میرے خیال میں یہ وہی بھوت ہے جس سے بچپن میں ہمیں ڈرایا جاتا تھا اور وہ ہمیں نظر نہیں آتا تھا"۔

ارشمید نے کہا: "اگرچہ اس کا لباس قیمتی ہے لیکن بالکل ایسا جسے پہلے زمانہ میں صرف بھانڈ پہنا کرتے تھے"۔ البرٹ کہنے لگا:۔ "ممکن ہے کسی فرعون کی قبر یا کسی عجائب خانہ کی الماری سے چرا لایا ہو۔ کیونکہ وہ شخص جو اس قدر قیمتی لباس بنوا سکتا ہے، کیا ایک کنگھا نہیں خرید سکتا جس سے وہ اپنے بکھرے ہوئے پریشان بالوں کو درست کر لے"۔

سوزآن بولی:۔ "خیر مرد کے لئے بد شکل ہونا تو کوئی عیب نہیں ہے، شرم کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایسے خوبصورت کپڑے پہنے جو اس کی شکل و صورت سے مختلف ہوں"۔

اسکے بعد جب سب لوگ ماجد ولین کی طرف متوجہ ہوئے تو دیکھا وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر پیچھے جا کر بیٹھ گئی ہے اور کانپ رہی ہے سب لوگ اس کا حال پوچھنے لگے، وہ بولی "مجھے سردی لگ رہی ہے میرا جسم کانپ رہا ہے اور سر گھوم رہا ہے"۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ شخص جس کا یہ لوگ ابھی ابھی مذاق اڑا رہے تھے استیفن تھا اور وہ اس کی توہین برداشت نہ کر سکی تھی۔۔۔ ماجد ولین کو اس حالت میں دیکھ کر یہ لوگ ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گئے اور جب اس کی یہ کیفیت دور ہو گئی تو پھر اپنی جگہ واپس آکر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ماجد ولین استیفن کو دیکھنے لگی یہاں تک کہ اس نے بھی اسے دیکھ لیا اور ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ اسے سلام کیا جسے ماجد ولین کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھ سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھیل ختم ہو گیا

اور لوگ گھروں کو جانے کے لئے کھڑے ہوگئے، چلتے وقت ماجد ولین نے اسٹیفن پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور اس کے بعد سب لوگ رخصت ہوگئے۔

اسٹیفن کا خط ماجد ولین کے نام

"اے ماجد ولین، اُس روز جدائی کے پورے ایک سال بعد تمہیں دیکھا۔ اللہ اللہ! وہ بھی کیسی مُبارک گھڑی تھی جب میں نے زمانہ کی تمام بدسلوکیوں کو معاف کردیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں نے اپنی زندگی میں بدبختی کا تلخ ذایقہ کبھی چکھا ہی نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں دور ہی سے دیکھ کر میری خوشی کا یہ عالم ہے تو اس وقت میرا کیا حال ہوگا جب میری زندگی کا ہر لمحہ تمہاری قربت کی مسرتوں سے لبریز ہوگا۔

اے ماجد ولین، میں سمجھتا ہوں کہ میرا کمزور دل شاید اس خوش نصیبی کا تحمل نہ کرسکے گا اور جس دن یہ مسرت مجھے نصیب ہوگی، وہ غالباً میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔

اے ماجد ولین معاف کرنا۔ میں نے تمہارے متعلق ذرا بدظنی سے کام لیا تھا اس لئے ضروری ہے کہ تمہارے سامنے اپنے اس گناہ کا اقرار کرلوں اور تم سے اسے چھپا کر دوسرے گناہ میں مبتلا نہ ہوں۔

جس وقت تم جو تنیج کو چھوڑ رہی تھیں، اس وقت میرا دل وحشت و خوف سے دھڑک رہا تھا کہ مبادا اس نئی زندگی کا جس میں تم قدم رکھ رہی ہو، تم پر بھی وہی اثر پڑے، جو اُن کمزور طبیعت جوان لڑکیوں پر ہوا کرتا ہے، جن کے دل ہر نئے ماحول کے اثر سے بدل جاتے ہیں اور جن کی خواہشوں پر ہر اس فضا کا رنگ چڑھ جاتا ہے جس میں وہ سانس لینے لگیں لیکن جب میں نے تمہارے چہرے پر غم کی وہی جھلک دیکھی جو ہمیشہ نظر آیا کرتی تھی، اور تمہاری سوگوار نیم باز آنکھوں کو بدستور غم و اندوہ سے لبریز پایا تو تمہارے متعلق میرے تمام شکوک و شبہات جو در اصل محض محبت کی بدگمانیاں تھیں، بالکل دور ہوگئے۔

پھر بھی مجھے تم سے ایک بات کہنا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اسے غور سے سنو گی۔ اُس روز تماشا گاہ میں میں نے تمہیں بہت ہی باریک کپڑے پہنے ہوئے دیکھا۔ جس سے تمہارے بازو، تمہارے شانے اور تمہاری گردن صاف جھلک رہی تھی اور لوگوں کی بیتاب نگاہیں تم پر پڑ رہی تھیں۔ یہ بات مجھ پر بہت گراں گزری۔

میں سمجھتا ہوں کہ تم خود اپنی خوشی سے اس طرح لوگوں کے سامنے آنے پر راضی نہ ہوئی ہوگی۔ بلکہ تمہیں دوسروں کی رائے کے آگے جھکنا پڑا ہوگا۔ بہر حال تم سے میری یہی التجا ہے کہ تم اس لباس کو اُتار کر پھینک دو، اور وہی کپڑے پہن لو جو پہلے پہنا کرتی تھیں، تاکہ تمہارا جسم لوگوں کی گستاخ نگاہوں سے محفوظ رہ سکے۔

اچھا سلام شوق قبول کرو۔ محترمہ سوزان سے بھی آداب کہنا۔ میں ہر اتوار کی شام کو تمہارے دیکھنے

کے لئے اوپیرا پہونچا کروں گا، اور تم سے ملنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالوں گا۔"

سازش

سوزآن، ماجد ولین کے کمرے میں داخل ہوئی اور دیکھا کہ وہ بہت مغموم انداز میں ایک خط اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے پڑھ رہی ہے، اس نے جلدی سے یہ خط اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پڑھنے لگی۔ پڑھکر وہ پہلے تو مسکرائی، پھر بولی:

"اے ماجد ولین، اب یہی کسر رہ گئی ہے کہ اسٹیفن آیندہ تجھے یہ حکم دے کہ تو اپنی صورت بگاڑلے، اپنی ایک آنکھ پھوڑلے، اپنی ناک تھوڑی سی کاٹ لے، یا اپنے اگلے دو چار دانت اکھاڑدے، تاکہ لوگ تجھے دیکھ کر ڈر جایا کریں۔

بہتر تو یہ ہے کہ تو اپنے ہاتھ میں ایک بانسری لے لے اور جس طرح یونان و رومہ کے شاعر اپنے زمانوں میں کیا کرتے تھے تو بھی اپنے منگیتر کے حسن وجمال کے گیت گاتی پھرے۔ افسوس اسٹیفن بھی کس قدر بے وقوف اور کوتاہ نظر ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ اس نے ابھی سے تیرے لئے اپنے گھر میں کوئی پنجرا بنوالیا ہوگا اور شادی کے بعد اس میں تجھے بند کردے گا اور خود اس کے دروازہ پر کھڑا ہوکر پاسبانی اور نگہبانی کے فرائض انجام دے گا تاکہ تجھے گستاخ نگاہوں سے محفوظ رکھ سکے۔"

ماجد ولین کہنے لگی:- "میری بہن آپ اس پر غلط اتہام نہ لگائیں، وہ حد سے زیادہ مہذب اور انتہائی شریف النفس انسان ہے، لیکن وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور ہر چاہنے والا غیور و خود دار ہوا کرتا ہے۔"

سوزآن کہنے لگی: "خدا مجھے اور تجھے دونوں کو ایسی محبت سے محفوظ رکھے، خدا کی قسم اگر آسمانی فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ ملاء اعلیٰ کا تاج اپنے سر پر رکھ کر، جنت اور اس کی تمام ابدی لذتیں پیش کرکے مجھ سے اس شرط پر شادی کرنا چاہے کہ وہ مجھے کسی پنجرے میں بند کردے گا، تو خدا گواہ ہے میں اس ابدی زندگی پر، ناگہانی موت کو اور کسی بے آب و گیاہ جنگل کے ویران عبادت خانہ میں پڑے رہنے کو ہزار بار ترجیح دوں گی۔"

یہ کہکر وہ کھڑی ہوگئی اور بولی: "ناممکن ہے اے ماجد ولین کہ میں تجھے آگ میں ڈھکیل دوں اور اس وحشی درندے کے قبضہ میں رہنے دوں جو تیری زندگی کو برباد کردینا چاہتا ہے۔" یہ کہکر وہ اپنی خوابگاہ میں چلی گئی۔

اوجین کا خط اسٹیفن کے نام

"کمان اعلیٰ کا حکم صادر ہوا ہے کہ ہم لوگ سفر کے لئے تیار ہو جائیں، ہمیں کہاں جانا پڑیگا ابھی نہیں معلوم، لیکن

کمانڈر کا خیال ہے کہ بہت بڑی لڑائی پر جانا ہے، بہرحال اگر زندگی ہے تو پھر لکھوں گا ورنہ کسی اخبار میں میرا نام مقتولین کی فہرست میں پڑھ لینا۔

اے اسٹیفن مجھے ایک ضرورت ہے اور امید ہے کہ تم میری اس ضرورت کے پورا کرنے میں بخل سے کام نہ لوگے میرے گھوڑے کی زین پرانی ہوگئی ہے اور اس کے تسمے بہت کمزور ہو چکے ہیں، میں نے اپنی اس مہینہ کی پوری تنخواہ صرف کردی ہے۔ اور اب میرے پاس اس قدر نہیں ہے کہ نئی زین خرید سکوں۔ اس لئے دس دن سے پہلے پہلے مجھے دس فرانک بھیجدیجئے۔ لیکن اگر اس مدت میں نہ بھیج سکیں تو پھر زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ مجھے نہیں مل سکیں گے۔

محترمہ ماجد ولین کی خدمت میں آداب ۔ والسلام"

شادی

ایڈورڈ کے چلے جانے کے بعد اسٹیفن نے کوشش کی کہ وہ اپنی تنخواہ سے کچھ پس انداز کرے، چنانچہ مہینوں میں وہ بدقت پچاس فرانک جمع کر سکا تھا، لیکن اس میں سے سات فرانک تو اس نے اپنے اس لباس کے کرایہ میں صرف کردئے تھے جسے پہنکر وہ ماجد ولین کے دیکھنے کے لئے اوپیرا گیا تھا، اور پانچ فرانک میں ریل کا ٹکٹ خریدا تھا اس کے علاوہ کچھ کھانے پینے میں خرچ ہوا تھا اور ان تمام اخراجات کے بعد اب اس کے پاس صرف وہ فرانک بچ رہے تھے جو تنخ سے واپس ہونے کے بعد کئی دن تک وہ اپنے پچھلے خط کے جواب میں ماجد ولین کے خط کا انتظار کرتا رہا، لیکن بدقسمتی سے کوئی جواب نہ آیا، اسے خیال ہوا کہ شاید وہ اس کی پچھلی تحریر سے کچھ رنجیدہ ہوگئی ہے۔ اس لئے اس نے ایک دوسرا خط معذرت کا لکھا، اس کے جواب میں ماجد ولین کا خط آیا کہ بیشک وہ ناراض تھی، کیونکہ اس نے اس کے متعلق سخت بدگمانی سے کام لیا تھا لیکن اب اس نے معاف کردیا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی خواہش کی کہ وہ تماشا گاہ میں آنا نہ چھوڑے۔ چنانچہ اس نے ماجد ولین کے دیکھنے کے لئے اتوار کو وہاں جانے کا قصد کیا۔

جس دن وہ جانے والا تھا اسی دن صبح کو اسے اپنے بھائی کا خط ملا جسے پڑھ کر وہ بہت ملول و رنجیدہ ہوا اور دل میں سوچنے لگا کہ اس وقت اس کے پاس ان چند سکوں کے سوا کچھ نہیں اور آج اسے خود ان کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اسے ماجد ولین سے ملنے کے لئے جانا ہے۔ Salimullah 16.1.76

وہ حیران تھا اور کچھ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ آخرکار محبت کا جذبہ غالب آیا اور وہ سفر کی طیاری کرنے لگا۔ اس نے ایک نیا جوڑا جوتہ کا خریدا کیونکہ اس کا جوتا کافی بوسیدہ ہوچکا تھا۔ اس مرتبہ وہ اس لباس کو بھی کرایہ پر نہ لے سکا جو پچھلی مرتبہ لیا تھا اور مجبوراً اپنے موجودہ لباس ہی کو درست کرنا پڑا۔ جابجا اس نے پیوند لگائے،

اور بخیہ کے دھاگے جہاں جہاں سفید ہو گئے تھے انھیں روشنائی لگا لگا کر سیاہ کیا اور اس کے بعد ایک گاڑی پر سوار ہو کر کولاکس روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچکر ایک چھوٹی سی دوکان پر اس نے کھانا کھایا اور اوپیرا میں داخل ہو گیا

ماجد ولین اپنے درجہ میں موجود نہ تھی، لیکن اسے نہ پاکر وہ کچھ زیادہ پریشان نہیں ہوا اور سوچنے لگا:۔ "ممکن ہے کسی وجہ سے جلدی نہ آسکی ہو لیکن اس کا آنا یقینی ہے وہ ضرور آئے گی۔"

اس کے بعد وہ تماشہ دیکھنے لگا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک امیر شخص کسی عورت پر فریفتہ ہوا اور وہ عورت بھی اس مرد سے محبت کرنے لگی۔ شدہ شدہ اس مرد پر مالی مشکلات کا ہجوم ہوا اور وہ نادار ہو گیا، اس کا نادار ہونا تھا کہ اس عورت نے بھی اپنی نگاہیں پھیرلیں اور مرد نے بہت منت وزاری کی لیکن عورت پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے صاف صاف کہدیا کہ چونکہ اب وہ فقیر و محتاج ہو چکا ہے اس لئے وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

اسٹیفن تماشہ کے یہ مناظر دیکھ کر بہت مکدر رہا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ "یہ لوگ درحقیقت کسبیوں اور بدکار عورتوں کے اخلاق وعادات پردوں پر پیش کرتے ہیں، ماجد ولین ہی کو دیکھو کہ وہ میری محبت میں میری پرستش کرنے کو طیار ہے نہ میں کچھ خوبصورت ہوں جو مجھ میں اپنی خواہشات نفسانی کی پرستش کرے اور نہ مالدار ہوں جو مجھ میں اپنی زیب وزینت کو تلاش کرے۔ اچھا ہوا کہ اس نے یہ تماشہ نہ دیکھا ورنہ اس کو سخت اذیت وتکلیف ہوتی۔

اس کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک وہ اس کی آمد کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئی، وہ ڈر رہا تھا کہیں بیمار نہ ہو گئی ہو اس لئے جانے سے پہلے پہلے اس کا حال معلوم کرنے کے لئے وہ تماشا گاہ سے نکلا۔ سوزان کے محل کی طرف روانہ ہو گیا لیکن وہ حیران تھا کہ اس تک پہونچنے کی کیا صورت اختیار کرے۔

جب وہ محل کے قریب پہونچ گیا تو اس نے دیکھا کہ محل بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور بے شمار فانوس کمروں اور برآمدوں میں جل رہے ہیں، جن کی روشنی کھڑکیوں اور روشن دانوں میں سے نکل نکل کر باہر پڑ رہی تھی۔ محل میں ہر طرف گانا بجانا ہو رہا تھا اور مختلف قسم کے ساز چھڑے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ نوکر ادھر سے اُدھر شراب کے برتن ہاتھوں میں لئے، کھانوں کے طباق اُٹھائے آجا رہے ہیں۔

جب دروازے کے قریب پہونچا تو اس نے دیکھا کہ --- --- سامنے بہت سی گاڑیاں قطار اندر قطار کھڑی ہوئی ہیں، اور ایک گاڑی کے بالائی حصے پر ایک کوچوان تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا ہے، وہ اس سے پوچھنے لگا:۔

"آج اس محل میں یہ چہل پہل کیسی ہے"۔ اس شخص نے پہلے تو اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر کہنے لگا: "اس محل کے مالک کی لڑکی سوزان کی شادی ہے"۔

یہ سُن کر اسے اطمینان ہوا اور ماجد ولین کی صحت کی طرف سے جو فکر تھی وہ دور ہو گئی۔ اس کے بعد اسنے

لوٹ جانے کا ارادہ کیا، لیکن وہ چاہتا تھا کہ گھر جانے سے پہلے ماجد ولین سے کسی نہ کسی طرح دو باتیں کرلے چنانچہ وہ محل کے قریب ہی ایک سائبان کے نیچے جاکر کھڑا ہوگیا اور سوچنے لگا کہ اندر جانے کی کیا صورت ہوسکتی ہے اتنے میں اس نے ایک گاڑی کو آتے ہوئے دیکھا جس میں کوئی بڑا آدمی سوار تھا، گاڑی کے رکتے ہی تمام نوکر اسکی طرف دوڑ پڑے، اور یہ بھی ان لوگوں میں مل جل گیا کیونکہ خود اس کی ہیئت بھی ان لوگوں سے کچھ مختلف نہ تھی۔

آنے والا شخص گاڑی سے اُترا اور لوگوں کی جھرمٹ میں آگے بڑھا یہاں تک کہ صحن سے گزر کر ایوان رقص تک پہونچ گیا، اور اس کے پیچھے پیچھے سب نوکر بھی اندر چلے گئے۔ لیکن اسٹیفن تنہا دروازے پر رہ گیا اور دروازے کے شیشوں میں سے اندر کی طرف جھانکنے لگا۔

اُس نے دیکھا کہ یہاں رقص کا ہنگامہ برپا ہے اور گوشہ گوشہ سے مسرت اُبل پڑی ہے، اس کی نگاہیں ماجد ولین کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ دفعتاً اس نے ایک شخص کے ساتھ اسے ناچتے ہوئے دیکھا اور غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ اس کا دوست ایڈورڈ ہے۔ یہ دیکھ کر وہ کچھ زیادہ پریشان نہیں ہوا۔ لیکن جس بات نے اسے برہم و ملول کر دیا وہ یہ تھی کہ ماجد ولین باریک لباس پہنے ناچ رہی تھی جس سے اس کا سارا جسم جھلک رہا تھا، اس نے دیکھا کہ اس کا سینہ ایڈورڈ کے سینہ سے ملا ہوا ہے، اس کا سر اس کے کندھے پر رکھا ہوا ہے اور ایڈورڈ اس کا ہاتھ پکڑ کر ناچنے کی بجائے اسے بار بار اپنے سینہ سے لگا لیتا ہے۔ یہ دیکھ کر ایک شعلہ سا اس کے جسم سے نکلا اور کئی دفعہ اس کے جی میں آیا کہ دروازہ کھول کر اندر پہونچ جائے اور بزم عیش و طرب کو درہم و برہم کرتا ہوا ماجد ولین تک جا پہونچے، لیکن پھر اس شرم سے کہ لوگ اس کو موٹے اور دبیز کپڑوں میں دیکھ کر کیا کہیں گے وہ رک گیا اور اپنے دل کو سمجھانے لگا کہ ناچ میں ہمیشہ اور ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ سب لوگ اسی قسم کے کپڑے پہنا کرتے ہیں اور اسی قسم کی حرکتیں کیا کرتے ہیں، میں اسے کیوں ملامت کروں اور کیوں اس پر عتاب کروں، جو اس کا دل چاہے پہنے اور جس کے ساتھ اس کا دل چاہے ناچے، میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ ان تمام لوگوں میں تنہا میں ہی وہ شخص ہوں جس کی وہ پرستش کرتی ہے۔

اب ماجد ولین رقص سے فارغ ہوچکی تھی اور دروازے کے قریب ہی ایک سوفے پر بیٹھنے کے لئے ایڈورڈ کے ساتھ آرہی تھی۔

اسی وقت اچانک دروازہ کھلا اور ایک خوش لباس نوجوان اتراتا ہوا اور ایک کوڑا اپنے ہاتھ میں ہلاتا ہوا اندر سے باہر آیا، اور اسے دروازے پر کھڑا ہوا دیکھ کر کوئی نوکر سمجھا اور ڈپٹ کر کہنے لگا: "جاؤ اور ہمارے سائیس کو ہمارے آنے کی خبر کردو۔"

پہلے تو وہ کچھ دیر رکا، لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں اس کا راز فاش نہ ہوجائے، بیرونی دروازے کی طرف تیزی سے چلدیا، وہ سائیس کا نام بھول چکا تھا اور کوئی دوسرا نام لیکر پکار رہا تھا، یہ دیکھ کر اس نوجوان کو سخت

طیش آیا اور آگے بڑھ کر اس زور سے اُس کے منہ پر ایک کوڑا رسید کیا کر اس کا چہرہ زخمی ہوگیا۔ اسٹیفن نے اس ذلت کو خاموشی سے برداشت کیا اور چپکا نکلا ہوا باہر چلا گیا۔

وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپک کر اس کے زخمی رخسار تک پہونچا اور وہ تکلیف سے بیتاب ہوگیا۔

بیمار

اسٹیفن جب جو تنج واپس آیا تو اسے ایک عزیز کا خط ملا۔ اور یہ وہی عزیز تھا جس نے کوبلانس سے چلتے وقت اسٹیفن کی جیب میں کچھ سکے ڈال دئے تھے۔ اس خط میں لکھا ہوا تھا کہ وہ سخت بیمار ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے آخری لمحات زندگی میں ایک بار اور اسے دیکھ لے۔

اسٹیفن اس خط کو پڑھ کر بہت رنجیدہ ہوا، اس نے مدرسے سے چند روز کی رخصت طلب کی لیکن تین روز سے زیادہ کی اجازت نہ مل سکی اور وہ اسی قدر چھٹی لیکر روانہ ہوگیا۔

یہ شخص ایک مکان میں جو کوبلانس کے قریب واقع تھا تنہا رہا کرتا تھا اور یہاں وہ اور اس کے ملازم کے علاوہ کوئی تیسری صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس کی بیوی حال ہی میں مر چکی تھی اور اس کے قریبی رشتہ داروں میں سوائے اُسکے ایک چچازاد بھائی کے جو دولت مند تو تھا لیکن نہایت سخت دل، کوئی اور نہ تھا۔

رات کے وقت اسٹیفن وہاں پہونچا اور دیکھا کہ وہ درد وکرب سے کراہ رہا ہے، وہ اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ اس کو بات کرنا بھی دشوار تھا، اور جب کچھ کہنا چاہتا تھا تو آواز کبھی اسکے سینہ ہی میں رُک جاتی تھی اور کبھی ہونٹوں تک آکر رہ جاتی تھی۔

اسٹیفن اس کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور اس کو تسلی دینے لگا۔ اس کے مریض دوست نے کہا: "مجھے بیماری کے بستر پر پڑے ہوئے کئی مہینے ہو چکے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے علٰحدہ نہیں ہوا ہوں اور میں اب اپنی زندگی سے تنگ آگیا ہوں، اس لئے اے اسٹیفن وعدہ کرو کہ مجھے اس وقت تک چھوڑ کر کہیں نہ جاؤگے جب تک قدرت میرے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہ کرے"۔

چنانچہ اسٹیفن نے اپنی رخصت کے تینوں دن اس کے سرہانے بیٹھ کر گزار دئے اور تیسرے روز جب اپنے واپسی کا ارادہ کیا تو بیمار رونے لگا۔ اب اس کی حالت بہت خراب تھی، اس کا بدن بھاری پڑ چکا تھا، پتلیاں پھیل چکی تھیں اور دُنیا سے جدا ہونے میں چند دن باقی تھے۔

اس نازک حالت میں چھوڑ کر چلا جانا اسٹیفن کو بھی مناسب نہ معلوم ہوا اور اس نے اپنے مدرسہ کو لکھا کہ

اسے چند روز کی رخصت اور عطا کی جائے ۔۔۔ کئی روز کے شدید انتظار کے بعد آخر ایک روز جواب آیا کہ: "ہم نے دوسرے آدمی کا انتظام کر لیا ہے، اب آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں، مدرسہ کے ذمہ آپ کی جو تنخواہ نکلتی تھی وہ بھیجی جا رہی ہے۔"

موت

دُنیا کی آنکھوں میں نیند آچکی تھی اور خوابگاہوں پر خاموشی پوری طرح مسلط ہو چکی تھی، زمین پر چلنے والے رُک گئے تھے، اور آسمان میں اُڑنے والے ٹھہر گئے تھے، لیکن اسٹیفن اپنے قریب الموت بیمار کے سرہانے بیٹھا ہوا ابھی جاگ رہا تھا۔ اور رات کی خاموشی میں زندگی اور موت کی کشاکش کا بیمار کے چہرہ پر مطالعہ کر رہا تھا، اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کسی بے آب و گیاہ ڈراونے جنگل میں کھڑا ہوا ہے، جہاں سے بھوتوں کی چیخنے کی آوازیں چلی آرہی ہیں اور اس کا دل خوف و وحشت سے دھڑک کر باہر آجانا چاہتا ہے۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ مرنے والے کے سینہ میں جسم و روح کے درمیان جنگ جاری ہے، روح جسم سے نکل جانا چاہتی ہے، اور جسم اس سے چمٹ رہا ہے، یہاں تک کہ جسم اس مقابلہ میں تھک گیا، اور آنکھوں میں جنبش اور نبضوں کی تڑپ بھی ختم ہو گئی۔

اسٹیفن اس کے سینہ پر جھک گیا اور کان لگا کر سننے لگا، مگر کوئی آواز اس کے کانوں میں نہیں آئی، وہ سمجھ گیا کہ قصہ ختم ہو گیا، زندگی کے عناصر منتشر ہو کر اپنے مرکز کی طرف لوٹ گئے اور جو اُڑنے والے تھے وہ اُڑ گئے جو تہ نشین ہونے والے تھے وہ تہ نشین ہو گئے۔

اسٹیفن کبھی اس پر روتا اور کبھی خود اپنے اوپر۔ اس کی گزشتہ زندگی کی پوری کتاب اس کے سامنے تھی، وہ اسے صفحہ بہ صفحہ پڑھ رہا تھا، اور اس کی ہر ہر سطر بلکہ ہر ہر لفظ پر غور کر رہا تھا، اسے ہر جگہ بدقسمتی، بدبختی، احتیاج، غم، تنگدستی، ناکامی کے الفاظ لکھے ہوئے نظر آتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ اپنی کتاب زندگی کے آخری صفحہ پر پہونچا تو اسے مدرسے سے اپنی معزولی کی خبر ملی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی جس سے کمرہ کے در و دیوار گونج اُٹھے۔

وہ بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور خدا جانے کیا کیا سوچتا رہا، جب کوئی ایک گھنٹہ کے بعد اس نے اپنا سر اُٹھایا، تو اس کی دونوں آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں، اس کے چہرے کا رنگ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس پر ایک نئی کھال چڑھا دی گئی ہو، وہ اپنے چاروں طرف کمرے میں اس طرح نگاہیں دوڑانے لگا جس طرح کوئی سانپ اپنے سوراخ میں چکر لگا رہا ہو، یہاں تک کہ اس کی نگاہ اس صندوق تک پہونچی جس میں مرنے والے کی پونجی

جمع تھی وہ بہت دیر تک اس صندوق کو گھورتا رہا اور اسی پر اس کی نگاہیں جمی رہیں، ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اس وقت اسکی دونوں آنکھیں اس صندوق کی کیلوں میں سے دو چمکدار کیلیں ہیں۔

پھر وہ یک بیک کھڑا ہوگیا۔ وہ اسوقت کچھ دیوانہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ اور چیخ چیخ کر کہنے لگا:۔ "مجھے اپنی زندگی میں ضرور کامیاب ہونا ہے، زمانہ ہرگز مجھ پر غالب نہیں آسکتا۔ وہ صرف انہی لوگوں کو مغلوب کرسکتا ہے جو کمزور ہیں، اور انہی لوگوں پر غالب آسکتا ہے جو کند ذہن اور بیوقوف ہیں اور میں ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں ہوں اسلئے یقیناً یہ بڑی بزدلی اور پست ہمتی ہوگی اگر میں اپنی زندگی کو زمانے کے حوالے کر دوں، کون زمانہ؟ کیسا زمانہ؟ میں آپ اپنا زمانہ ہوں، میں آپ اپنی زندگی کا مالک ہوں، اگر کارزار زندگی میں لوگوں کے قدم اکھڑ گئے تو یہ وہی لوگ تھے جو صرف ایک نقطہ پر جمے رہے اور آگے نہ بڑھے، اگر یہ لوگ زندگی کے تھپیڑوں کے ساتھ ساتھ اپنا رخ بھی بدلتے رہتے تو ضرور کامیاب ہوتے۔

وہ کون لوگ ہیں جو عالیشان کوٹھیوں اور محلوں کے مالک ہیں، بڑی بڑی زمینوں اور شاداب باغوں کے ٹھیکہ دار ہیں، سونا جن کے خزانوں سے اس طرح ابل رہا ہے، جس طرح شعلے تنور سے کیا یہ لوگ جرائم پیشہ اور ڈاکو نہیں ہیں؟

پھر وہ کون لوگ ہیں جو رات بھر بھوک سے تڑپتے رہتے ہیں، دن بھر رزق کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں، لیکن روٹی کا ایک ٹکڑا اور پانی کا ایک گھونٹ انھیں اس وقت تک میسر نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کے عوض چلو بھر خون جگر پیش نہ کریں، کیا یہ لوگ شریف اور باعزت نہیں ہیں؟

ملکیت اور وراثت کا قانون مہمل چیز ہے، کیونکہ جو لوگ مالک ہیں وہ چور ہیں، اور جو لوگ ان کے وارث ہیں وہ چوروں کے بچے ہیں، لیکن میں اس وقت تک اپنے آپ کو چور نہیں کہہ سکتا جب تک میں کسی شخص کا لقمۂ حیات نہ چھین لوں اور نہ میں اس وقت تک اپنے آپ کو ظالم کہہ سکتا ہوں جب تک میں کسی سچے اور راست باز انسان پر ظلم نہ کروں۔

وہ انہیں خیالات و تصورات میں بڑبڑاتا رہا، اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر لانبے لانبے قدم رکھتا ہوا ٹہلتا رہا۔ پھر یکایک وہ ٹھہر گیا اور اپنے سامنے پڑی ہوئی لاش کو دیکھ کر کہنے لگا:

"اے شخص آخر کار تو مر ہی گیا۔ اب یہ مال جو تو نے چھوڑا ہے، تیرے کس کام کا، تیری بلا سے اب اس کا مالک تیرا کوئی دوست ہو یا دشمن، اے شخص کیا یہ تیرے لئے مناسب تھا کہ تو اس دولت کی وصیت میرے حق میں کر جاتا کیونکہ میں تیرا دوست تھا، وہ دوست جس نے تیرے آخری وقت میں تیری غمخواری کی، اور ایسے وقت میں تیرا ساتھ دیا جب کوئی دوست اور کوئی رفیق تیرا ساتھ نہ دے سکا میں تیرے چچا کے لڑکے سے کہیں زیادہ تیری دولت کا محتاج ہوں۔ وہ تو

پہلے ہی سے آسودہ حال ہے اور اسے کچھ پروا نہیں تیری دولت اُسے ملے یا نہ ملے، اسلئے جس کام کو تو اپنی زندگی میں نہ کرسکا میں اُسے تیرے مرنے کے بعد تیری طرف سے انجام دوں گا۔"

اس کے بعد وہ نعش کی طرف سے منھ موڑ کر روپے کے صندوق کی طرف بڑھا اور اس کی کنڈی پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ہاتھ کا رکھنا تھا کہ اُس کا تمام جسم کانپنے لگا، اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا گویا تمام کمرے میں ہر طرف آنکھیں ہی آنکھیں ہیں جو اُسے گھور رہی ہیں اور مردے کی روح اس کے جسم کے ایک ایک مسام سے غضب آلود نگاہیں اس پر ڈال رہی ہے۔

وہ تھوڑی دیر کے لئے وہیں کا وہیں ٹھٹک گیا۔ لیکن پھر ہمت کی اور کنڈی کو ہٹا دیا۔ کنڈی کے ہٹتے ہی دروازہ کھُلا اور ایک زور کی آواز اس کے کھُلنے سے پیدا ہوئی۔ وہ کانپنے لگا اور سمجھا کہ یہ کسی سپاہی کی آواز ہے جس نے اسے صندوق کھولتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔

وہ صندوق کے پاس سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور اپنے اردگرد دیکھنے لگا، لیکن وہاں کوئی نہ تھا اس نے پھر جو اس جمع کرکے صندوق سے نوٹ نکالے اور چراغ کی دھیمی روشنی میں انھیں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا لیکن اب اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خون جو کچھ دیر پہلے اس کی رگوں میں جوش مار رہا تھا، اب اس کی روانی ختم ہونے لگی ہے۔ اور ٹھنڈے پسینے کے قطرے پیشانی سے پے در پے اس کے چہرے پر ٹپکنے لگے اور اسے ایک ایسا گہر اسکون محسوس ہوا جیسے مرگی کے دورہ کے ختم ہونے کے بعد محسوس ہوا کرتا ہے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا صندوق اس کے سامنے جل رہا ہے، اور خود بخود پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے ایک چمکدار آئینہ کی شکل اختیار کرلی ہے اور اس آئینہ میں اسے اپنی شکل نظر آرہی ہے۔ وہ اپنی اس شکل کو دیکھ کر ڈر گیا اور اپنے تئیں نہ پہچان سکا۔ اس نے اپنے چہرے کی ہر شکن میں وہ مکروہ کیفیت دیکھی جو عام طور پر مجرموں اور گناہگاروں کے چہروں میں دکھائی دیتی ہے۔ اور اپنی دونوں آنکھوں میں وہ بے رنگی پائی جو عموماً ان لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے جن کے سروں پر جلاد تلوار لئے ہوئے کھڑا ہوتا ہے۔

وہ لرزنے لگا، کانپنے لگا اور نوٹ یکے بعد دیگرے اس کے ہاتھ سے گرنے لگے۔ اسی وقت یکایک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اپنا بھاری ہاتھ اسکے کندھے پر رکھ دیا ہے۔ پہلے تو اس نے اس طرف کچھ زیادہ توجہ نہ کی اور اسے بھی اپنے ہی متوحش خیالات کا نتیجہ سمجھا لیکن جب ہاتھ کی ٹھنڈک بھی اسے اپنے کندھے میں محسوس ہونے لگی تو وہ اپنی زندگی سے ناامید ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو اس طرح سکیڑ لیا جس طرح کوئی شخص اپنے سر پر کسی خطرناک چیز کو گرتے ہوئے دیکھ کر سکڑ جاتا ہے۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کنکھیوں سے پیچھے کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہی مردہ اسکے پیچھے کھڑا ہوا ہے

اور سر سے پاؤں تک برہنہ اپنی پتھریلی بے نور آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہے، اس نے ڈر کر ایک چیخ ماری اور اپنی پوری قوت کے ساتھ اسے اپنے پاس سے ڈھکیل دیا۔ چنانچہ وہ اپنے بستر سے دور زمین پر جاکر گر پڑا۔ اسکا سر کمرے کے پختہ فرش سے ٹکرایا اور پھر سناٹا چھاگیا۔ یہ دیکھ کر وہ کچھ پاگل سا ہوگیا، اس نے چراغ اپنے ہاتھ سے پٹخ دیا، اور دوڑا کہ جلدی سے دروازے کھولکر باہر نکل جائے، لیکن اندھیرے میں راستہ نہ پاسکا۔

وہ ہر طرف کمرے میں دوڑنے لگا، اس کا خیال تھا کہ نعش اس کے پیچھے دوڑ رہی ہے اور وہ جہاں جاتا ہے اسکے تعاقب میں پہونچ جاتی ہے۔ آخر وہ اس دوڑ دھوپ سے تھک گیا، اور بیہوش ہوکر گر پڑا۔

جو کچھ اس نے دیکھا، وہ کوئی وہم و خیال نہ تھا، بلکہ حقیقت تھی۔ ہوا یہ کہ اس کے دوست کے جسم میں کچھ کچھ جان باقی تھی، جب اس نے آخری مرتبہ اپنی آنکھیں کھولیں تو اس نے صندوق کو کھلا ہوا دیکھا اور ایک ایسے شخص کو جسے اب وہ پہچانتا بھی نہیں تھا اپنے کاغذات اُلٹتے پلٹتے ہوئے پایا۔ انسان کی فطری حرص جو پیدائش سے لیکر موت تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی اپنی پوری قوت کے ساتھ بھڑک اُٹھی، وہ بستر مرگ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جھپٹ کر چور کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھدیا۔ پھر جو ہونا تھا وہ ہوا، وہ کمرے کے فرش پر گرا اور گرتے ہی ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔

سٹیفن، رات بھر بیہوش پڑا رہا، یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور سورج کی کرنیں روشن دان میں سے گزر کر کمرے میں پھیلنے لگیں۔ اس وقت اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا، زمین پر پڑا ہوا چراغ، کھلا ہوا صندوق بکھرے ہوئے کاغذات اور زمین پر پڑی ہوئی لاش ——! یہ دیکھ کر یکے بعد دیگرے رات کے تمام واقعات اسکی آنکھوں میں پھر گئے۔ وہ بمشکل اُٹھا اور پھیلی ہوئی چیزوں کو اپنی اپنی جگہ رکھدیا، اور لاش کو اس کے بستر پر لٹاکر ایک چادر اُڑھادی۔

دن چھپنے سے پہلے پہلے لاش کو دفن کردیا گیا اور اسٹیفن، جوتنج کی طرف روانہ ہوگیا۔ لیکن جس وقت وہ گھر پہونچا تو تھک کر چور ہوچکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے بستر پر پڑگیا اور بہت دنوں تک اُٹھنے کے قابل نہ ہوسکا۔

ایڈورڈ

ایڈورڈ، ماجد ولین کے ساتھ اسی رات سے دلچسپی لینے لگا تھا جس رات اسٹیفن نے ان دونوں کو شیشوں کے پیچھے سے ایک دوسرے کے ساتھ ناچتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً سوزان کے گھر جانے لگا اور ماجد ولین بھی بہت جلد اس سے مانوس ہوگئی۔ وہ جب کبھی اس کے پاس بیٹھتا تو جلسوں کے قصے سنایا کرتا وہ نام بنام ہر اچھے والی اور ناچنے والے کا ذکر کرتا، فنی حیثیت سے ان کی اداکاری پر محاکمہ کرتا اور عشق و محبت کی تمام وہ داستانیں سناتا جو محفل رقص و سرود کا معمول ہیں۔

ماجد ولین، چونکہ اس دنیا میں نئی نئی داخل ہوئی تھی، اس لئے اس ذکر سے زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ ایڈورڈ کی عادت تھی کہ اگر اثنائے گفتگو میں کبھی اسٹیفن کا ذکر آجاتا تو اس کی بیحد تعریف کرتا اور زمانۂ گزشتہ میں ان دونوں پر فراخی و تنگدستی وسعت و احتیاج کے جو دو مختلف دور گزرے تھے اُن کا تذکرہ کرتا اور اس کے بعد بڑے پُر درد اور غمگین لہجہ میں اُسکی موجودہ زندگی کا حال بیان کرتا جسے وہ آجکل جو تنگی میں گزار رہا تھا۔

ایڈورڈ اسی طرح رفتہ رفتہ اسے اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوگیا یہاں تک کہ ماجد ولین اس کے بغیر بےچین سی رہنے لگی اور جب وہ اس کے پاس سے ہٹتا تو اسے ڈھونڈنے لگتی اور یہ سمجھتی کہ درحقیقت وہ محض اسٹیفن کی خاطر اس سے محبت کر رہی ہے، حالانکہ اگر فریب نفس کے پردے اس کی نگاہوں سے اُٹھ گئے ہوتے تو اسے معلوم ہوجاتا کہ وہ دراصل اس کی خاطر اسٹیفن کو فراموش کرنے لگی ہے۔

سوزان اپنی سہیلی ماجد ولین اور اپنے رشتہ دار ایڈورڈ کے تعلقات کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ ایڈورڈ کی بعض نالائقیوں سے خوب واقف تھی۔ لیکن اس کے خیال میں یہ عیوب اسی کی ذات سے مخصوص تھے، اور کسی دوسرے کی طرف تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے ایڈورڈ کو سمجھایا کہ وہ شیخ موکر سے اپنے تعلقات پیدا کرے اور چونکہ موکر علم نباتات کا بڑا شایق تھا اور جو شخص اس علم سے واقفیت رکھتا تھا وہ اس کی بڑی عزت کرتا تھا، اس لئے وہ ایڈورڈ سے بہت جلد مالوف ہوگیا کیونکہ اس نے بھی مدرسہ میں علم نباتات کے کچھ سبق پڑھے تھے، اور جو بات اسے معلوم نہ ہوتی تھی وہ اپنے باغ کے مالی سے پوچھ لیتا تھا۔ اس نے اپنے باغ میں مختلف قسم کے عمدہ عمدہ پودے پھولوں کے نصب کرائے اور انکی خصوصیات کا غور سے مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اس نے موکر سے دوستی کی ابتدا کی، اسے اپنے گھر بلایا اور اپنے پائیں باغ کی سیر کرائی۔ اور اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں موکر اُسے پسند کرنے لگا۔

عورت کا ضمیر

ماجد ولین کو نہ اسٹیفن سے نفرت ہوئی اور نہ ایڈورڈ سے محبت، لیکن وہ ایک نئے رنگ میں ضرور رنگ گئی، چونکہ اب وہ محفلوں اور جلسوں سے دلچسپی لینے لگی تھی، رقص گاہوں اور تفریح گاہوں سے مانوس ہوگئی تھی، دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی گاتے اور ناچنے لگی تھی اس لئے زندگی کا مفہوم اس کے نزدیک بھی وہی ہوگیا جو دوسروں کا تھا اور وہ اسٹیفن کو بھول گئی کیونکہ وہ بھی گزری ہوئی زندگی کی تصویروں میں سے ایک تصویر تھا اور ایڈورڈ سے مانوس ہوگئی، کیونکہ وہ اُسکی نئی زندگی سے تعلق رکھتا تھا۔

بایں ہمہ جب وہ خالی الذہن ہوکر غور کرتی، اور زندگی کے ہاے وہو سے الگ ہوکر جب اسے خلوت میسر ہوتی اور اپنے دل کی گہرائیوں پر ایک نگاہ ڈالنے کی فرصت ملتی تو اسٹیفن کی تصویر، اپنی ناتوانی و زرد روئی، محزونی و تنگدستی،

بدبختی و بدنصیبی کے ساتھ پھر اُس کے سامنے آجاتی۔ آنسوں سے بھری ہوئی اس کی آنکھوں کا منظر، عشق و محبت کی آگ میں اس کے جلتے ہوئے دل کا خیال اسے تڑپا دیتا، وہ اس کے لئے بیقرار ہو جاتی اور اشک آلود ہو جاتی، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب یہ بادل چھٹ جاتے اور ایوان رقص میں چمکتے ہوئے چہروں، متبسم نگاہوں، زرتار کپڑوں، خوش آب موتیوں، گردن میں پڑے ہوئے ہاروں اور ہنگامۂ مسرت و نشاط کا خیال آجاتا تو پہلی تصویر پھر دھندلی ہو جاتی

شادی کے دو ماہ بعد ایک روز صبح کو سوزآن، ماجد ولین کے کمرے میں آئی اور کہنے لگی: "ماجد ولین کچھ تمھیں خبر ہے کہ کل رات ہم نے اور تمھارے والد نے ملکر کیا طے کیا ہے؟" اس نے کہا "نہیں مجھے نہیں معلوم" کہنے لگی: "یہ طے کیا ہے کہ ہم سب لوگ یہاں سے "شان مارک" چلیں اور وہاں دو تین ہفتے سب میرے شوہر کے مہمان رہیں پھر وہاں سے "ولفاخ" چلیں جو قریب ہی چند میل کے فاصلے پر ہے اور ایک ہفتہ تمھارے یہاں ٹھیریں، اور کھیتوں اور باغوں کی اچھی طرح سیر و تفریح کریں اور پھر اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

یہ سنکر پہلے تو ماجد ولین کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا، لیکن پھر کسی خیال سے اس کے چہرے کی شگفتگی ختم ہو گئی اور وہ افسردہ نظر آنے لگی۔ کیونکہ یہ سیر و تفریح حقیقتاً عزیز دوستوں سے جدائی کا پیش خیمہ تھی اور سمجھتی تھی کہ چند ہی دن بعد پھر وہ اپنے گاؤں میں وحشت و تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گی اور کوبلاتس کی محفلوں اور وہاں کی چہل پہل سے دور ہو جائے گی۔

سوزآن اس کے دل کی اس کیفیت کو سمجھ گئی لیکن انجان بنی رہی اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "اور ہاں، اس سیاحت میں ایڈورڈ بھی ہمارے ساتھ ہوگا اور اس کی وجہ سے ہماری دلچسپیاں بہت بڑھ جائینگی کیوں، ماجد ولین تم بھی میری اس رائے سے ضرور متفق ہو گی؟"

ماجد ولین، اس اشارے کو پہچان گئی اور بولی: "تمھیں اختیار ہے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے جسے چاہو اپنے ساتھ لیجاؤ مجھے اس سے کیا بحث کہ کون شخص جائے گا اور کون نہیں جائے گا"

سوزآن یہ سُنکر مسکرائی اور بولی "نہیں اس سفر میں ایڈورڈ تمھارے منگیتر کی حیثیت سے تمھارے ساتھ ہوگا"

ماجد ولین یہ سُن کر پریشان ہو گئی اور بولی "اے سوزآن، میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی" سوزان کہنے لگی: "آخر کیوں کیا بات ہے؟ کیا کوئی لڑکی اس سے زیادہ عقلمند اس سے زیادہ ہوشیار اس سے زیادہ مہذب اور اس سے زیادہ شریف شوہر کی تمنا کر سکتی ہے؟ پھر یہ کہ وہ تم سے محبت بھی کرتا ہے اور اسکی زندگی کا بھی ایک مقصد ہے کہ وہ تمھیں مسرور و شادکام دیکھے!"

ماجد ولین کہنے لگی: "یہ سب کچھ سہی مگر استیفن کی سی محبت کہاں؟" سوزآن بولی: "ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے کیونکہ وہ تم سے عقلمند لوگوں کی طرح محبت کرتا ہے۔ احمق اور نادانوں کی سی محبت نہیں کر سکتا۔

وہ شخص جس کے متعلق تم یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ تمہاری محبت میں بیقرار ہے، وہ تم سے محبت قطعاً نہیں کرتا، بلکہ ایک ایسی خیالی عورت سے محبت کرتا ہے جو صرف اس کے ذہن و خیال کی پیداوار ہے وہ تمہاری پرستش نہیں کرتا، بلکہ تمہارے اندر اس خدا کی پرستش کرتا ہے جو اس کے خیال میں تمہارے جسم میں حلول کئے ہوئے ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے باپ دادا پتھر کے ٹکڑوں اور پیڑوں میں خداؤں کا جلوہ دیکھتے تھے۔

وہ تجھے آسمانی فرشتوں میں سے ایک فرشتہ سمجھتا ہے، جس کا چہرہ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، جس کے دو سفید و شفاف، سورج کی شعاعوں کی طرح چمکدار بازو ہیں اور جو خواہشات کے مفہوم سے ناآشنا اور لذتوں کی دنیا سے بیگانہ ہے۔ اے ماجدولین، یاد رکھ کہ تیری تباہی کا سب سے پہلا وہ دن ہوگا جب شادی کے بعد گزشتہ محبت کا پردہ اس کی نگاہوں سے اُٹھنے لگے گا اور تو اپنی اصلی رنگ روپ اور شکل و صورت میں اس کے سامنے موجود ہوگی۔ اُسوقت وہ تیرے اور تیری اس خیالی تصویر کے فرق کو محسوس کرے گا اور مجبور ہوگا کہ تجھے حقارت و نفرت کی نگاہوں سے دیکھے۔

اس لئے اے ماجدولین اگر تو چاہتی ہے کہ اپنی قدر و منزلت کو اس کے دل میں اُسی طرح محفوظ و برقرار رکھے، تو تیرے لئے ضروری ہے کہ تو اس سے کبھی شادی نہ کرے، کیونکہ تجھے کھو کر جو صدمہ اسے پہونچیگا وہ اس صدمہ سے زیادہ سخت نہ ہوگا جو اپنی امیدوں اور تمناؤں کے خلاف ایک ایسی عورت کو دیکھ کر ہوگا جو اس عورت کے علاوہ تھی جس کا وہ منتظر تھا اور جس کے لئے اُس کی آغوش محبت وا تھی۔

زندگی اور اس کی فریب کاریوں سے جسقدر میں واقف ہوں، اے ماجدولین، تم نہیں ہوسکتیں، زندگی کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ میاں بیوی کے تعلقات میں عشق کا تعلق بہت کمزور اور مصلحت کا تعلق بہت مضبوط و مستحکم ہے، محبت ایک پھول ہے اور دولت اس پھول پر پڑی ہوئی اوس ہے، پھر اگر یہ اوس چند روز تک اس پھول پر نہ پڑے تو اس کی پتیاں کمہلا کر گر پڑیں اور ہوا میں اُڑ جائیں۔

نفس کی وہ ہیجانی کیفیت جسے لوگ عام طور پر عشق و محبت، سوز و گداز کے نام سے یاد کرتے ہیں، درحقیقت ایک بیماری ہے، یاد رکھو کہ زندگی کو خوبصورتی سے گزارنے کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر بدقسمتی سے یہ چیزیں میسر نہ ہوں تو محبت کے تمام جذبات یکسر سرد پڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی محبت عداوت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ آگ اسوقت تک نہیں بجھتی جب تک موت ان دونوں کے درمیان حایل نہ ہو جائے۔

اے ماجدولین، تو غریب ہے اور اسٹیفن تجھ سے زیادہ غریب ہے، اس لئے تم دونوں کے لئے مناسب یہی ہے کہ تم میں سے ہر ایک اپنے لئے ایسا رفیق زندگی تلاش کرے جس کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ دوسرے کو خوش نصیب بنا سکتا ہے اور اس کی زندگی کو مسرت و شادمانی سے معمور کر سکتا ہے اور اگر تمہاری یہی خواہش ہے کہ تم اس سے

بیوفائی نہ کرو تو انسان کی سب سے بڑی وفاداری یہی ہے کہ وہ اپنی ذاتی منفعت پر دوسرے کی مصلحت کو ترجیح دے اور اس کی سعادت اور کامرانی کے راستے میں اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی قربان کر دے۔

اس لئے تو بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کر، اور اس کے فراق کی تلخی، اور رنج محرومی کو اس کی خاطر برداشت کر، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنی کوششوں میں ناکام و نامراد رہکر جرم کا ارتکاب نہ کر لے یا وہ زندگی کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے خودکشی نہ کر لے۔ اگر ایسا ہوا تو یاد رکھ اس کا خون تیری گردن پر ہوگا"

ماجد ولین یہ سنکر سر جھکائے ہوئے دیر تک روتی رہی اور پھر ذرا گردن اٹھا کر کہنے لگی:۔ "اے سوزان، اس وقت تم مجھے تنہا چھوڑ دو، میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی"

فوجی اخبار

"کل ہمارے لشکر کا دشمن کے لشکر سے مقابلہ ہوا، اور دس گھنٹہ تک برابر لڑائی ہوتی رہی، دشمن کی قوت ہم سے بہت زیادہ تھی اور قریب تھا کہ ہم مایوسی سے دوچار ہوں کہ یکایک ہمارا ایک کمانڈر جس کا نام "اوجین ولز" تھا، دشمن پر بلائے آسمانی کی طرح ٹوٹ پڑا اور اسے دیکھ کر پورے لشکر میں غیرت و حمیت کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس کی کمان میں پورے لشکر نے اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن شکست کھا کر بھاگ نکلا۔

مگر اس جنگ کے اختتام پر اس بہادر فوجی افسر پر ایک ایسا حادثہ گزر گیا جس نے ہماری فتح کی تمام خوشی کو خاک میں ملا دیا۔ جس وقت وہ دشمن کا پیچھا کرتا ہوا جا رہا تھا یکایک اس کے گھوڑے کی زین کا تسمہ ٹوٹ گیا، جو شاید پہلے ہی سے پرانا اور کمزور تھا، اور وہ گھوڑے سے گر گیا۔ فوج کے سپاہی اسے اٹھا کر لشکر گاہ میں لےگئے ابھی تک اس میں کچھ کچھ جان باقی تھی وہاں ایک گھنٹہ اس نے سخت تکلیف میں گزارا، اور اپنے کسی بھائی اسٹیفن کو یاد کرتا رہا، ہمارے لشکر کو اس کی موت کا سخت صدمہ ہوا"

نیا گھر

ایک روز اسٹیفن اپنے نئے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا، اور معمار اس کے بعض حصوں کی اصلاح و درستی میں مصروف تھا، کہ اس نے اپنے دوست "فرتز" کو آواز دی اور جب وہ قریب آ گیا تو اس سے کہنے لگا:۔

"اے فرتز، کیا وہ دونوں نئے کمرے جیسا کہ ہم چاہتے تھے مکمل ہو گئے؟"

اس نے کہا "جی ہاں، وہ تو مکمل ہو چکے ہیں، بلکہ دیواروں پر پلاسٹر بھی ہو چکا ہے اور کھڑکیوں میں شیشے بھی لگ گئے ہیں"

یہ سُنکر وہ بہت خوش ہوا پھر مالی کی طرف متوجہ ہوکر بولا:۔ "کیوں مالی کیا تم نے پھولوں کے وہ درخت جو میں نے کل بھیجے تھے لگا دئے؟"

مالی نے جواب دیا: "جی ہاں، لگا دئے، آپ دیکھیں گے کہ دیوار پر پھیلی ہوئی وہ انگور کی بیلیں کیسی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔" اسٹیفن نے کہا: "میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ چہار دیواری کے اندر اور باہر بنفشہ کی بیل چڑھانا نہ بھول جانا، یاد ہے نا؟"

مالی نے جواب دیا: "خوب یاد ہے جناب۔"

پھر اسٹیفن گھر کے اندر آیا، اور نیچے کی منزل پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالتا ہوا بالاخانہ پر چڑھ گیا، اور صحن میں کھڑے ہوکر جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے خود بخود کہنے لگا: "گھر تو بالکل ویسا ہی طیار ہوگیا جس کا خاکہ میں نے اور ماجد وکین نے آج سے دو سال پیشتر بیٹھ کر بنایا تھا، نیچے کی منزل میں کھانے کا کمرہ، باورچی خانہ، اسٹور روم اور نوکروں کا کمرہ ہے، بالائی حصے میں مہمانوں کا کمرہ، سونے کا کمرہ، شیخ موکر کا کمرہ اور کتب خانہ ہے۔"

اس کے بعد اُس نے پانچویں کمرہ کا دروازہ کھولا، اس پر ایک نگاہ ڈالی اور کچھ سوچکر رونے لگا، اسکی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور ایک آہ بھر کر کہنے لگا: "اے اوجین میری تو یہی آرزو تھی کہ تو میری خوشحالی میں بھی اسی طرح شریک ہوتا جس طرح میری بدبختی میں شریک رہا تھا۔ لیکن خدا کو یہی منظور تھا کہ میرے اور تیرے درمیان تفریق کردے، اے میرے بھائی میں تجھے عمر بھر رؤنگا اور جب تک زندہ ہوں تیرے غم سے نجات نہیں پاسکوں گا۔ دن یونہی گزرتے چلے جائیں گے، اور زمانہ یوں ہی کروٹیں بدلتا رہے گا، لیکن یہ کبھی نہ بھول سکوں گا کہ تو نے اپنی انتہائی ضرورت کے وقت چاندی کے چند سکے مجھ سے طلب کئے اور ان کے دینے میں مینے بخل سے کام لیا اور یہی تیری ہلاکت کا باعث ہوا، تو نے اپنی زین کی درستی کے لئے مجھ سے روپیہ طلب کیا تھا اور اگر میں بھیجدیتا تو شاید تیری زین کا تسمہ نہ ٹوٹتا اور آج تو زندہ ہوتا۔"

یہ کہکر اس نے کمرے کے دروازہ کو مقفل کر دیا اور کہنے لگا کہ "آج کے بعد سے یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔" پھر اس نے اپنے آنسوؤں کو پونچھا، اپنے دل کو تسلی دی اور باغ کو جھانک کر دیکھنے لگا، اسکی نگاہ پانی کے اُس حوض پر پڑی جو وسط صحن میں تھا اور دل ہی دل میں کہنے لگا: "یہ وہی حوض ہے جس میں عنقریب ہم رنگ برنگ کی مچھلیاں پالیں گے اور اس کے چاروں طرف وہی جنگلہ ہے جس کے لگانے کا ہمارا ارادہ تھا، تاکہ ہمارے بچے حوض میں گرنے سے محفوظ رہیں اور یہ بنفشہ کے وہی پھول ہیں جسے ماجد وکین سب پھولوں سے زیادہ پسند کرتی ہے، ماجد وکین کو کیا خبر کہ اسکے لئے کیا کیا سامان مسرت مہیا ہو چکے ہیں، ایک مدت سے میرے اس کے خط وکتابت نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے وہ آجکل کے انتہائی یاس کی حالت میں زندگی گزار رہی ہو۔ لیکن میں بہت جلد اسے یہ خوش خبری سناؤں گا کہ بدبختی اور بدنصیبی کا

زمانہ ختم ہوا اور ہم اپنے تلخ ماضی کو اب اس طرح یاد کریں گے جس طرح ہم اپنے بچپن کے رونے کو یاد کیا کرتے ہیں۔

اس کے بعد وہ نیچے اُتر آیا اور اپنے دوست فرتز کے ساتھ باغ میں ٹہلنے لگا، درختوں کی ترتیب اور روشوں کی درستی میں جو لوگ مصروف تھے ان کو ہدایتیں دیتا رہا اور باغ کے پودوں اور پھولوں کے درمیان ایسا خوش خوش گھومتا رہا، گویا اس نے اپنی عمر میں بدبختی کا ذائقہ کبھی چکھا ہی نہ تھا۔

مارا ستیفن

آج سے پہلے اسٹیفن کبھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ کسی کو کوئی حکم دے سکے یا کسی کام سے کسی کو روک سکے اسکے پاس نہ رہنے کو گھر تھا، نہ ٹہلنے کو باغ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا، جب اس تاریک اور ڈراؤنی رات کے بعد جو اس نے اپنے رشتہ دار کے گھر گزاری تھی، وہ جو تیج واپس ہوا تو بالکل خالی ہاتھ تھا، یہاں تک کہ اس کی تمنائیں تک اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں، چنانچہ چند روز تک وہ بستر علالت پر پڑا رہا، اور ناقابل برداشت تکلیفیں اُٹھاتا رہا۔ لیکن جب طبیعت ذرا سنبھلی تو اس کا دل مختلف خیالات و افکار کا جولانگاہ بنا ہوا تھا، کبھی وہ خودکشی کا ارادہ کرتا لیکن پھر اس خیال سے کہ وہ ماجدولین سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے گا اور پھر کبھی اسے نہیں دیکھ سکے گا وہ رک جاتا، کبھی سوچتا کہ اپنے اعزہ واقربا میں واپس چلا جائے اور ان کی مرضی اور خواہش کے آگے اپنا سر جھکا دے، لیکن جب پھر اسے ماجدولین کا خیال آجاتا، تو بھاگ کر کسی دوسری جگہ چلا جانا چاہتا ــ لیکن پھر اس ڈر سے کہ کہیں اس کی جدائی کا غم ماجدولین کو نصیب دشمناں ہلاک کردے وہ رک جاتا۔

وہ دیر تک انھیں خیالات و افکار میں سرگرداں رہا، کبھی کچھ سوچتا کبھی کچھ، آخر اس نے اپنے دل میں ماجدولین کے نام ایک خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک مدت سے اسے کوئی خط لکھا بھی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے تمام واقعات وحالات سے مطلع کردے کہ اب وہ اسے اسکے حلف وفاداری سے آزاد کرنا چاہتا ہے، اور اس پر سے عہد و میثاق کی تمام پابندیاں اُٹھا لینے کا خواہشمند ہے۔

وہ یہ خط لکھ ہی رہا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں گاؤں کے رجسٹرار کا ایک خط تھا اس خط میں لکھا ہوا تھا کہ:- "تمہارا فلاں رشتہ دار جو فوت ہو چکا ہے، اپنے وصیت نامہ میں تمہارے نام بیس ہزار فرانک کی رقم لکھ گیا ہے جو تمھیں اسی وقت مل سکتی ہے، اس کے علاوہ دس ہزار فرانک تمھیں ہر سال کے اختتام پر ملا کریں گے۔"

اسٹیفن یہ پڑھ کر خوشی سے مبہوت ہو گیا اور جب حواس ٹھکانے ہوئے تو اس نے وہ خط جو ماجدولین کے نام لکھنا شروع کیا تھا پھاڑ ڈالا۔ اس کے بعد وہ اپنے دوست "فرتز" کو ساتھ لیکر کسی ایسے چھوٹے سے گھر کی تلاش میں نکلا، جو دریائے جوتیج کے کنارے ہو۔ اور اُسی شکل و صورت کا ہو جس کی تمنا اس نے اور ماجدولین نے اس رات

کی تھی جب وہ دونوں کشتی میں سوار ہوکر اپنے مستقبل اور آرزؤں کے ہوائی قلعے تعمیر کر رہے تھے۔

خوش قسمتی سے اُسے ایک ایسا گھر مل گیا، جو بالکل اس کی خواہش کے مطابق تھا، چنانچہ اس نے اسے خرید لیا اور اپنی خواہش کے مطابق اس کو درست کرالیا۔ اس کے بعد اس نے اسے فرنیچر سے آراستہ کیا اور باغ میں مختلف قسم کے درخت لگوادیئے۔

وہ انھیں انتظامات میں مصروف تھا کہ اس نے ایک دن ایک فوجی اخبار میں اپنے بھائی کے مرنے کی خبر پڑھی، جسے پڑھکر وہ بہت رویا لیکن نئی خوشیوں میں وہ اس غم کو جلد بھول گیا اور ولفاخ جانے کی طیاریوں میں مصروف ہوگیا تاکہ جلد سے جلد وہ یہ خوشخبری ماجد ولین کو سنائے اور اس کے والد کو پیام نکاح دیکر اسے اپنے ہمراہ لیتا ہوا جونج واپس ہو اور اس نئے گھر کو دکھلائے جو اس نے اسکے لئے بنوایا ہے۔

چنانچہ ایک روز صبح کو وہ اپنی گاڑی پر سوار ہوکر ولفاخ کے لئے روانہ ہوگیا اس حال میں کہ خوشی سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جب وہ گاؤں کے قریب پہونچا تو اس نے گاڑی کو وہیں چھوڑ دیا اور سائیس سے کہدیا کہ اس کی واپسی کا انتظار کرے اور پیدل چلدیا۔ وہ آہستہ آہستہ جارہا تھا اور ان مقامات کو دیکھتا جاتا تھا جہاں اس نے اپنی محبت کے ابتدائی دن گزارے تھے، اور جن کی فضا سے اُلفت کی پہلی کرن اسکے قلب پر چمکی تھی۔

اس نے ان مرغزاروں کو دیکھا جہاں وہ چاندنی راتوں میں تنہا پھرا کرتا تھا اور دل ہی دل میں تمناؤں کی نقاشی کیا کرتا تھا، وہ اُس دریا سے بھی گزرا جس سے دو سال پہلے اس نے ایک ڈوبتے ہوئے شخص کو نکالا تھا پھر وہ اس چھوٹے سے سمندر کے کنارے پر کھڑا ہوگیا جہاں وہ اور ماجد ولین شام کے وقت اکثر تفریح کے لئے جایا کرتے تھے اور گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔

اب وہ شینج موتبر کے گھر کے قریب پہونچ چکا تھا۔ اور زیزفون کے درختوں کی بلندیاں جن کے سائے میں وہ اور ماجد ولین اکثر بیٹھا کرتے تھے اُسی طرح دکھائی دے رہی تھیں جس طرح گزشتہ زمانے میں نظر آیا کرتی تھیں اور اُن کے پتوں کی جھرمٹ میں اُسے اپنا وہ بالائی کمرہ بھی نظر آرہا تھا جس میں وہ رہا کرتا تھا۔

الغرض پچھلے دنوں کی یاد جو اس نے یہاں گزارے تھے ایک ایک کرکے اس کے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ وہی صبح وہی شام، وہی دن وہی راتیں سب اس کی آنکھوں میں پھرنے لگیں۔ رنج وغم، امید و نومیدی، بیماری و تندرستی، تنگدستی و فراخی، غرض ہر وہ چیز جو اس پر گزری تھی اس کے سامنے آگئی، یہاں تک کہ اسے خیال ہونے لگا کہ شاید وہ اب بھی اسی گھر میں مقیم ہے اور ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ وہ اپنے کسی کام سے باہر چلا گیا تھا اور اب واپس ہورہا ہے۔

وہ اسی قسم کے خیالات و تصورات میں اُلجھا ہوا یہاں تک کہ باغ کے دروازے کے قریب پہونچ گیا اور کھڑے ہوکر

سوچنے لگا: "یہ وہی دروازہ ہے جہاں سے کل میں دھتکارا گیا تھا، آج میں دروازے میں اس امن و اطمینان سے داخل ہو رہا ہوں، گویا وہ میرا ہی گھر ہے، اب نہ مجھے کسی رقیب کا ڈر ہے اور نہ کسی کے دیکھ لینے کا خیال، نہ مجھے زمانہ کی آفتوں کی پرواہے، اور نہ اس کی مصیبتوں سے بچنے کی فکر۔"

اس کے بعد وہ باغ میں داخل ہو گیا، اور اس کے پودوں، راستوں اور روشوں کو دیکھ کر کہنے لگا: "دیکھو یہ غربی دیوار کا شگاف ابھی تک اسی حالت میں ہے، اور یہ سیاہ پتھر دیوار کے نیچے بالکل اسی طرح پڑا ہوا ہے جس طرح میرے زمانہ میں تھا۔ اور دیکھو درختوں کی بالائی شاخوں پر پرندوں کے وہی گھونسلے ہیں، اور چڑیاں اب بھی اسی طرح آجا رہی ہیں جس طرح میرے سامنے آتی جاتی تھیں۔"

پھر وہ اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا اور کہنے لگا: "یہ وہی تنہ ہے جس پر میں نے اور ماجد ولین نے اپنے اپنے نام کھودے تھے۔" پھر وہ ذرا اور آگے بڑھا اور اس نے دیکھا کہ نام ابھی تک اسی طرح کھدے ہوئے ہیں یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں، وہ اس درخت کے سامنے جھک گیا، اور اپنے ہونٹ اس کے قریب لیجا کر اسے چوم لیا۔

اس اثنا میں ہواؤں کا ایک لطیف جھونکا، باغ کے پھولوں کی لطیف خوشبوؤں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے اس کے چہرے کو چھوتا ہوا نکل گیا، اور ان خوشبوؤں سے مہکا گیا، جن سے وہ ماجد ولین کے ساتھ لطف اٹھایا کرتا تھا۔

وہ اسی طرح دیکھتا بھالتا اور تاثرات میں غوطے کھاتا ہوا اس راستہ پر پہونچ گیا جو اسے اس بنچ تک لیجاتا تھا جس پر وہ اور ماجد ولین زیزفون کے سایہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ اب چونکہ وہ جگہ یہاں سے صرف چند قدم رہ گئی تھی، اس لئے اس کے تاثرات زیادہ تیز ہونے لگے اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اس کا خیال تھا کہ ماجد ولین اس وقت بھی یہیں پر بیٹھی ہوئی رو رہی ہوگی اور اس کے خط کے نہ آنے کا اسے سخت ملال ہوگا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اچانک اس خبر کو سنکر اسکے دل کی حرکت بند نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ دل ہی دل میں اس خبر کے سنانے کے مختلف طریقوں پر غور کرتا رہا تھا کہ یکایک اس نے ایک ذرا اپنے سر کو گھما کر دیکھا تو اسے اسی بنچ کا کنارا دکھلائی دیا اور اس پر ایک سفید ریشمی کپڑے کا دامن پڑا ہوا نظر آیا وہ اسے دیکھ کر مسرت و خوشی سے اچھل پڑا اور بولا دیکھو میرا خیال کتنا صحیح نکلا وہ جہاں بیٹھی ہوئی ہے۔

پھر وہ مڑا اور جوں ہی اس کی نظر نیچے پر پڑی اس کا چہرہ فق ہو گیا، رگوں میں خون کی روانی رک گئی اور تنفس کی آمد و شد بند ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ ماجد ولین کسی اجنبی نوجوان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں، نوجوان اپنے ہاتھ میں اسکا ہاتھ لئے ہوئے اور اس کے سینہ پر اپنا سر رکھے ہوئے اس کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

وہ اپنے دل میں کہنے لگا: "یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ کیا ہے؟ یہ تو یقیناً ماجدولین ہے۔ پھر یہ اس کے برابر کون بیٹھا ہے؟ کہیں یہ میرا دوست ایڈورڈ تو نہیں! ہاں بیشک وہی ہے، لیکن یہ اس گاؤں میں کیوں ہے؟ اس گھر سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اور پھر اس کے پاس اس بیباکانہ انداز سے بیٹھنا کیا معنی رکھتا ہے!"

اس نے اپنے دل کو مضبوطی سے تھام لیا، وہ پہلو سے نکلا جا رہا تھا اور وہ اُسے پکڑ رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں آہستہ آہستہ آگے بڑھا، اور ان دونوں کے قریب پہونچ گیا۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر گھبرا گئے اور کھڑے ہو گئے، لیکن پھر فوراً ہی اُن کی یہ کیفیت دور ہو گئی۔ ایڈورڈ اپنی مونچھوں سے کھیلنے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا، گویا وہ کوئی منجم ہے اور کسی نئے ستارہ کی تلاش میں آسمانوں کا بغور مطالعہ کر رہا ہے اور ماجدولین نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور ایک گہرا سکوت اس پر طاری ہو گیا۔

اسٹیفن کچھ دیر متحیر و مبہوت کھڑا ہوا ان دونوں کو دیکھتا رہا اور پھر وہ ماجدولین کی طرف بڑھا اور ایسی کیفیت کے ساتھ گویا کچھ اُس نے دیکھا تھا سب بھول چکا ہے وہ نہایت کشادہ پیشانی اور خندہ روئی سے بولا:

"اے ماجدولین، ہماری مصیبت کے دن ختم ہو گئے، اور خدا کا شکر ہے کہ میں اب مالدار ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس بہت دولت ہے، لیکن جس قدر ہماری خوش حالی اور خوش نصیبی کے لئے ضروری ہے اتنی مجھے مل گئی ہے اب میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اپنا وعدہ پورا کروں، اور تمہارے والد سے ملکر نکاح کی تاریخ کا تعین کر دوں، اور پھر تمھیں اپنے ہمراہ لیکر جونج جاؤں اور وہ گھر دکھلاؤں جو میں نے تمہارے لئے خریدا ہے۔ جب تم اسے دیکھو گی تو تمھیں معلوم ہوگا کہ وہ گھر بالکل ویسا ہی ہے، جیسا تم چاہتی تھیں"۔

ماجدولین یہ سُنکر لرز گئی، اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، اور بہت ہی پست و کمزور آواز میں کہنے لگی، گویا وہ خود اپنے آپ سے کچھ کہہ رہی ہے "جناب! میں آپ کو آپ کی اس خوش بختی پر مُبارکباد دیتی ہوں"۔

اسٹیفن کو یہ سُنکر سخت تعجب ہوا، اس کے ہوش اُڑ گئے اور اپنے دل میں سمجھنے لگا: "یا الٰہی یہ میں کیا سُن رہا ہوں وہ مجھے میری خوش نصیبی پر مبارکباد دے رہی ہے۔ گویا اس کے خیال میں میرا حال اس کے حال سے کوئی جُدا چیز ہے۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے اور آج اس طرح وہ مجھ سے کیوں مل رہی ہے؟" پھر اپنی جیب سے اس نے نکاح کی انگوٹھی نکالی اور ایک قدم اس کی طرف اور بڑھا، لیکن جوں ہی اس کی نگاہ اس کی اُنگلی پر پڑی، اس کا بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اس کے ہاتھ میں ایک نئی انگوٹھی دیکھی۔ اب اس کا اضطراب بڑھنے لگا، اُس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہو گئی اور حسرت سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا دل بھر آیا اور روتے ہوئے اپنے ہاتھ کو ماجدولین کی طرف بڑھا کہنے لگا:-

"کیوں ماجدولین، کیا تم مجھ سے بات نہ کرو گی"۔ یہ سُنکر ماجدولین نے اپنا سر اُٹھایا اور اس کی طرف اس انداز سے

دیکھنے لگی گویا وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنے سر کو جھکا لیا۔

ٹھیک اس وقت ایڈورڈ آگے بڑھا اور اسٹیفن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا: "اے اسٹیفن، بس کرو تم تو اسے ہلاک کئے دیتے ہو۔"

اسٹیفن چونک پڑا، گویا کہ اب تک اس نے اسے دیکھا ہی نہ تھا اور نیچے سے اوپر تک اسے دیکھنے لگا اور بولا:۔ "اے ایڈورڈ مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ تم مجھے یہاں اس جگہ ملوگے۔"

اس نے کہا: "تمھیں امید ہو یا نہ ہو لیکن تمھارے لئے ضروری تھا کہ یہاں آنے سے قبل اجازت لے لیتے، تمھیں یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ ملاقات کے اس ابتدائی اُصول کو بھی بھول جاؤ جو بچوں کو پہلے دن مدرسہ میں دیا جاتا ہے۔"

اسٹیفن یہ سُن کر بُری طرح کانپنے لگا، اس کی پیشانی پھیکی پڑنے لگی، جس کی سفیدی بڑھتے بڑھتے سارے چہرے تک پھیل گئی، وہ اولے کی طرح سرد ہوگیا، اور اس کے دونوں ہاتھ نیچے اُترنے والے پرندے کے بازوؤں کی طرح سُست پڑ کر لٹک گئے، پیروں کی طاقت سلب ہوگئی، اور اپنے اندر انتہائی کمزوری محسوس کرنے لگا، اور ذرا پیچھے ہٹ کر ایک درخت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگیا۔

اس نے ایڈورڈ کو ان آنکھوں سے دیکھا جن سے خون ٹپک رہا تھا اور اس سے وہی الفاظ کہے جو "جولیس سیزر" نے اس وقت کہے تھے جب اس کے ایک مخلص دوست نے پیچھے سے اسکی پیٹھ میں نیزہ مارا تھا کہ "ہائے تو نے ہی اے بروٹس۔"

یہ کہکر وہ ایک منٹ کے لئے چپ ہوگیا اور جب پھر اس کی سانس لوٹ کر آئی تو وہ ماجد ولین کی طرف متوجہ ہوا اور آہستہ آہستہ رُک رُک کر اس طرح جیسے اس کا نظام تنفس بگڑ گیا ہو، کہنے لگا:۔ "اے ماجد ولین کیا جو کچھ یہ شخص کہ رہا ہے صحیح ہے؟ اور کیا اس کی طرح تمھارا بھی یہی خیال ہے کہ میں نے بغیر پوچھے یہاں آنے میں غلطی کی ہے! اور کیا یہ ٹھیک ہے کہ یہ شخص تمھارے نزدیک یہ حیثیت رکھتا ہے کہ تمھاری طرف سے مجھ سے بازپرس کرنے کا حقدار ہو۔"

وہ اس قدر کہنے پایا تھا کہ ایڈورڈ ان دونوں کے بیچ میں آگیا اور ماجد ولین کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا: "آؤ اب یہاں سے چلیں، بہت دیر بیٹھے رہے، اب طبیعت کچھ پریشان ہو رہی ہے۔"

ماجد ولین نے بھی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا، اور خاموش سر جھکائے ہوئے اس کے ساتھ ہولی، وہ لحظہ بلحظہ اُس سے دور ہوتے گئے یہاں تک کہ نگاہوں سے غائب ہوگئے، اور اسٹیفن نے سُنا کہ انھوں نے اندر پہونچکر کواڑ بند کرلئے لیکن وہ برابر اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس میں وہ دونوں ابھی ابھی داخل ہوئے تھے، نہ اس کے جسم کو جنبش ہوئی نہ نگاہوں نے حرکت کی اور نہ رگوں میں کوئی غیر معمولی تڑپ پیدا ہوئی، کوئی ایک گھنٹہ تک وہ اسی طرح کھڑا رہا پھر خود بخود کہنے لگا:۔ "ایڈورڈ مجھ سے اس طرح خطاب کرتا ہے، گویا اس گھر میں اس کا مرتبہ میرے مرتبے سے بہت

بلند ہے۔ اور یقیناً خود ماجد ولین ہی نے اُسے یہ رتبہ بخشا ہوگا، جبھی تو وہ بلا چون و چرا اُس کے ساتھ چلی گئی اور جاتے وقت میری طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور پھر اسے گئے ہوئے بھی ایک گھنٹہ گزر گیا اور لوٹ کر خبر نہ لی کہ اُس کے چلے جانے کے بعد کسی پر کیا گزری۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ مجھ سے اس قدر کیوں برہم ہے اور ایڈورڈ کے ساتھ اس کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ انگوٹھی جو اُس کی اُنگلی میں ہے منگنی کی انگوٹھی ہے۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ماجد ولین نے مجھ سے بیوفائی کی ــــ! لیکن نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی، وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ میرے لئے ہے، مینے اُسے اپنے خون، اپنے آنسوؤں اور اپنی تمام مصیبتوں کے بدلے خریدا ہے اور میں نے اس کے لئے وہ وہ تکلیفیں اور مصیبتیں اُٹھائی ہیں، جن کا تحمل انسانی طاقت سے باہر ہے۔ میں فاقے کرتے کرتے مرنے کے قریب ہو گیا برہنگی سے دن میں باہر نکلنے کے قابل نہیں رہا، ٹھنڈی برفیلی راتوں میں گزرگاہوں پر سویا، رات کی تاریکیوں میں گھورے پر پڑے ہوئے نوالے اور چھوڑی ہوئی ہڈی کو اپنی جان بچانے کے لئے میں نے ڈھونڈا، قمیص پر اس قدر پیوند لگائے کہ قمیص قمیص نہ رہی بلکہ تمامتر پیوند ہو گئی، بلکہ اس کے راستہ میں کچھ اس سے بڑھکر بھی کیا۔ یعنی اپنے بھائی کو قتل کیا اور جس شخص نے نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی مجھ پر احسان کیا، اس کی شکل و صورت میں نے بگاڑ دی۔ میں نے اپنے دل میں اس کی دولت کو چرانے کی سرگوشیاں کیں، بلکہ اس کی طرف اپنا ہاتھ تک بڑھا دیا اور اس طرح مجرموں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔

الغرض مینے کیا نہیں کیا، تو کیا اب وہ اپنے آپ کو مجھ سے علٰحدہ کرے گی، نہیں، میں اس کے لئے ہوں، اور وہ میرے لئے۔ اس کا نام میرے نام کے ساتھ کھدا ہوا ہے اور یہ اُسی کے سر کے بال تو ہیں، جن کی انگوٹھی بنا کر میں دو سال سے پہنے ہوئے ہوں، اور یہ زمین و آسمان، یہ سورج اور چاند، یہ دریا اور طوفان، یہ سبزہ اور درخت، یہ پھول اور پرند سب ہماری محبت پر گواہ ہیں، ہماری تمناؤں اور آرزوؤں سے واقف ہیں، اور ہماری وفاداری کی قسموں پر شاہد!"

اس کے بعد اس نے ایک بڑی لمبی آہ کھینچی اور کہنے لگا: "کوئی ہے جو میری نصف زندگی صرف اس قیمت پر خریدے کہ مجھے اُس حقیقت سے آگاہ کر دے، جس سے میں ناواقف ہوں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر اسوقت میں ان دونوں کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا جب وہ میرے پاس سے بھاگ کر جا رہے تھے اور ہرگز اس وقت تک نہ جانے دیتا جب تک کہ وہ حقیقت کا اعتراف نہ کر لیتے، اور اسرار کے ان پردوں کو چاک نہ کر دیتے جو انھوں نے اپنے چہروں پر ڈال رکھے ہیں۔"

اس کے بعد وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور باغ کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ اس طرح جا رہا تھا جیسے کسی مخمور شرابی کے قدم ڈگمگا رہے ہوں، وہ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ پیچھے سے کسی کے بھاری قدموں کی آواز سُنی۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ ایڈورڈ باغ کے دروازے سے ایک سُرخ گھوڑے پر سوار نکل رہا ہے، اسے دیکھ کر استیفن ایک ٹیلہ کے پیچھے چھپ گیا اور جوں ہی وہ اس کے قریب سے نکلا، جھپٹ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

ایڈورڈ اسے دیکھ کر گھبرا گیا، لیکن ہمت و ضبط سے کام لیکر بولا: "اے اسٹیفن تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے کہا "میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کیوں آتے جاتے ہو؟ اور اس گھر سے تمھارا کیا واسطہ ہے؟"

ایڈورڈ کہنے لگا: "میں تمھارے اس سوال کا اس وقت تک جواب نہیں دیسکتا جب تک کہ تم میرے گھوڑے کی لگام پکڑے رہوگے۔ پہلے اسے چھوڑ دو اس کے بعد دریافت کرو۔"

اسٹیفن نے لگام چھوڑدی اور گھوڑے کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

ایڈورڈ کہنے لگا: "اگر تمھارے علاوہ کوئی اور شخص مجھ سے یہ سوال کرتا تو اُسے میں یہی جواب دیتا کہ میں بالکل آزاد ہوں اور اپنے معاملات میں خود مختار، جس طرح چاہتا ہوں کرتا ہوں، جس کے گھر چاہتا ہوں چلا جاتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں۔ لیکن اس دوستی کے خیال سے جو میرے تمھارے درمیان ہے میں تمھیں ایک مختصر سا جواب دئے دیتا ہوں۔ لو سنو! میں شیخ موکر کے یہاں اس لئے آتا جاتا ہوں کہ میں اُس کی بیٹی کا منگیتر ہوں اور ایک مہینہ کے بعد میری شادی اس کے ساتھ ہونے والی ہے۔ اگر تم پسند کرو تو تم بھی ہماری شادی میں شریک ہو سکتے ہو۔"

یہ سنکر اسٹیفن کے دونوں ہونٹ کانپنے لگے اور اسے یہ معلوم ہوا گویا موت آہستہ آہستہ اس پر طاری ہورہی ہے اور نہایت کمزور و پست آواز میں اُس کے منہ سے نکلا: "کیا تمھاری مراد ماجد ولین سے ہے" اس نے کہا: "ہاں، اس کے علاوہ موکر کی اور کونسی بیٹی ہے۔"

اسٹیفن نے ذرا دیر کے لئے اپنا سر جھکا لیا اور پھر سر اُٹھا کر بولا: "اے ایڈورڈ تمھیں معلوم ہے کہ میں اُس لڑکی سے محبت کرتا ہوں، وہ میری زندگی ہے اور اسے میرے ہاتھوں سے چھین لینا میری زندگی کو ختم کر دینا ہے پھر کیا تمھیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے ایک دوست، اپنے بچپن کے رفیق کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دو۔"

وہ کہنے لگا: "ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو، اور تم نے اپنی زندگی کے پچھلے دنوں میں اسکی دلجوئی بھی کی ہے اور اگر اس کا باپ درمیان میں نہ آگیا ہوتا تو وہ وقت قریب تھا کہ وہ اس جال میں پھنس جاتی جو تم نے اس کے لئے بچھایا تھا۔"

اسٹیفن بیچ میں بول اُٹھا: "مگر تم نے میرے اس سوال کا جواب نہیں دیا جو میں نے تم سے پوچھا تھا۔"

ایڈورڈ نے کہا: "کون سا سوال؟"۔ اس نے کہا: "یہی کہ تم میرے بھائی، میرے دوست اور میرے بچپن کے رفیق ہوکر مجھے کیوں اس بیدردی سے قتل کئے دیتے ہو۔"

اس نے کہا: "نہیں میں تمھیں قتل نہیں کرتا، بلکہ زندہ رکھنا چاہتا ہوں، میں نے اس طرزِ عمل سے تمھیں اپنی حالت پر غور کرنے کا ایک موقعہ دیا ہے اگر تم اپنے معاملہ میں ذرا سا بھی غور کروگے تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس پریشان اور پراگندہ زندگی بسر کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ تم اپنے گھر واپس جاؤ اور جس مالدار لڑکی سے تمھاری شادی کرنا چاہتے ہیں،

اس سے شادی کرلو، جو کچھ میں نے کیا اس میں سراسر تمہاری ہی فلاح و بہبود ہے۔"

اس سے قبل کہ ایڈورڈ کا جملہ پورا ہو، اسٹیفن کی آتش غضب بھڑک اُٹھی اور غیظ و غضب کی وہ بجلیاں جو ابھی تک سکون کے بادلوں میں پوشیدہ تھیں چمکنے لگیں۔ وہ اس پر ٹوٹ پڑا اور اُس کا گریبان پکڑ کر اس سختی سے جھنجوڑا کہ قریب تھا کہ اسے گھوڑے کی پیٹھ سے گرادے اور کہنے لگا:۔ "بدمعاش! مجھے اب معلوم ہوا کہ تم نے اس مسکین لڑکی کو کس کس طرح دھوکہ دیا ہے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا دل میری محبت سے لبریز ہے اور میری خوشنودی کے علاوہ اُس کی زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں ہے، تم نے اس کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ وہی میرے اس فقر و مسکنت کا سبب ہے، اور مجھے میری زندگی میں کوئی راحت اسوقت تک نہیں مل سکتی جب تک وہ اپنے دامن کو میرے ہاتھ سے نہ چھڑالے، اور محبت کے اس رشتے کو جو میرے اور اس کے درمیان قایم ہے منقطع نہ کرلے۔ یہاں تک کہ اس نے تم لوگوں کی باتوں کو سچ سمجھ لیا، وہ تمہارے سامنے جھک گئی اور جو کچھ تم اُس سے کہتے گئے وہ کرتی گئی، صرف میرے خیال اور میری محبت میں اور اس طرح تم اس قابل ہوگئے کہ اُس کی کمزوریوں سے ناجائز فایدہ اُٹھاکر اسے اپنی طرف مایل کرلو، ورنہ تمہیں نہ اس سے محبت ہے اور نہ مجھ سے، کیونکہ تم جیسے انسان کے لئے یہ تقریباً ناممکن ہے کہ اس کی باطنی خوبیوں اور اس کی شرافت و پاکیزگی کو سمجھ سکے تم بس اسی قدر سمجھ سکتے ہو کہ وہ ایک حسین و جمیل لڑکی ہے، جو اپنے حُسن و جمال میں ان نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں سے کسی طرح کم نہیں جنھیں تم نے اکثر دھوکہ دیا ہے اور جن کے عشرت کدوں میں اپنی اکثر راتیں تم نے گزاری ہیں اور پھر فوراً ہی انھیں چھوڑ دیا اور وہ اپنی زندگی اور آرزوؤں پر ماتم کرتی رہ گئیں، اور اگر تم اس لڑکی سے بھی وہی سلوک کرسکتے جو دوسری لڑکیوں سے کیا ہے اور اس سے بھی اسی طرح مستفید ہوسکتے جس طرح اور بہت سی لڑکیوں سے ہوئے ہو تو تم یہ بھی کر گزرتے، اور شادی کی ان اُلجھنوں اور بکھیڑوں میں اپنے آپ کو نہ ڈالتے۔"

ایڈورڈ کہنے لگا: "اگر ان باتوں سے تمہارا یہ مقصد ہے کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کی گئی ہے یا اسے کسی قسم کا فریب دیا گیا ہے، تو یہ تمہاری غلطی اور بدگمانی ہے کیونکہ اب وہ اپنے ماضی کو بھول چکی ہے اور اب اس کے سامنے اس کے منگیتر کی محبت اور خلوص کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے اور ابتو اس کی بھی آرزو ہے کہ جلد سے جلد اپنے آپکو اس کے پہلو میں خوش و خرم دیکھے۔"

اسٹیفن غصّے سے بھڑک اُٹھا، اور کہنے لگا:۔ "تو جھوٹ بولتا ہے وہ تیرے اس خیال سے بہت بلند ہے" یہ کہکر اس پر ٹوٹ پڑا، لیکن ایڈورڈ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے روکا اور بڑی عاجزی سے کہنے لگا: "اے اسٹیفن کیا تم مجھے قتل کردینا چاہتے ہو"

اسٹیفن یہ سُن کر پیچھے ہٹ گیا، اس کے ہاتھ سست پڑگئے اور اس پُرانی دوستی کا خیال جو ان دونوں میں رہ چکی تھی پھر سے تازہ ہوگیا۔ اور اس کی طرف ان آنکھوں سے دیکھنے لگا جن میں آنسو جھلک رہے تھے اور کہنے لگا:۔ "نہیں اے ایڈورڈ

میں تمہیں کیسے قتل کرسکتا ہوں تم میرے دوست ہو اور مجھے اپنی زندگی میں تمہاری خاطر خون کے چند قطرے دینے کا موقعہ ملا ہے، میں اپنے اس فعل پر کبھی شرمندہ نہیں ہوسکتا اور نہ اپنے اس ہاتھ کو کبھی واپس لے سکتا ہوں جو صرف خدا کے لئے پہلے تمہاری طرف بڑھایا تھا۔"

یہ کہکر اس نے اپنے سر کو اس کے گھوڑے کی زین پر رکھدیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں ایڈورڈ کا ہاتھ لیکر اپنے آنسوؤں سے بھگونے لگا اور بولا:۔ "اے ایڈورڈ، میں تمہیں اس ہستی کا واسطہ نہیں دلاتا ہوں، جس کے سینے سے ہم دونوں نے اپنے زمانۂ طفولیت میں ایک ساتھ دودھ پیا تھا اور جس کی آغوش محبت میں ہم نے ایک دو نہیں پورے پانچ سال کامل یکدلی اور محبت کے ساتھ اس طرح گزارے کہ تم نے میرے اور میں نے تمہارے بغیر کبھی کسی چیز سے دلچسپی نہیں لی۔ تمہیں اس قسم کا واسطہ دلاتا ہوں، جو تم نے اس رات کو مجھ سے کھائی تھی، جب تم جونیج سے رخصت ہو رہے تھے اور تم نے وعدہ کیا تھا کہ تمہارا سینہ اس وقت تک ٹھنڈا نہیں ہوسکتا اور تمہارے دل کی دھڑکن اسوقت تک کم نہیں ہوسکتی جب تک کہ تم مجھے میری زندگی میں بامراد اور کامگار نہیں دیکھ لوگے، میں تمہیں تمہاری رحمت و شفقت کا واسطہ دلاتا ہوں اور تمہارے فضل و کرم کے نام پر تمہیں پکارتا ہوں، کہ تم ایک صاحب کرم انسان ہو اور میں محتاج و مسکین، اور ایک فقیر و محتاج کی زندگی تمامتر صاحب کرم کی دست نگر ہوتی ہے۔"

ایڈورڈ نے مطلق کوئی پروانہ کی، اور اس دردناک گفتگو کا اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا، اس نے اپنے گھوڑے کو ایک ایڑ لگائی اور نکل گیا۔ تھوڑی دور تک تو اسٹیفن اس کے پیچھے بھاگا لیکن نہ پاسکا آخر تھک کر گر پڑا اور کہنے لگا: "وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ضرور صحیح ہوگا۔"

وہ اسی طرح پڑا رہا یہاں تک کہ کوئی راہگیر گزرا، اور چونکہ اس نے اسے آتے وقت دیکھ لیا تھا اس لئے پہچان گیا اور اس کے سائیس کو جاکر خبر کی، وہ بھاگا ہوا آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی پر سوار کرایا اور اسے لیکر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

اسٹیفن جب اپنے کمرے میں پہونچا اور اُسے تنہائی اور یکسوئی نصیب ہوئی تو وہ پاگلوں کی طرح چیخنے، چلانے اور کمرے کے در و دیوار سے سر پھوڑنے لگا۔ وہ برابر یہی کہہ رہا تھا: "آہ اے ماجد ولین، میں نے تجھے کھو دیا"

15.2.46

اسٹیفن کے خطوط

اے ماجد ولین، کیا یہ صحیح ہے کہ میرے اور تمہارے تعلقات ختم ہوگئے، اور ہم ایک دوسرے سے ناواقف اور انجان ہوگئے اور کیا یہ سچ ہے کہ اگر آج کے بعد ہم تم کہیں کسی راستے میں ملجائیں گے، تو ہم میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف سے منہ پھیر کر نکل جائے گا۔

آہ، یہ گردش لیل و نہار بھی کیا چیز ہے، کہ ایک ہی دن میں تمام وہ امیدیں ٹوٹ گئیں، جو مدتوں میں ہم نے استوار

کی تھیں اور جن کے لئے ہم نے بیشمار آنسو بہائے تھے؟۔ سچ ہے، قیامت بھی اسی طرح آئے گی، زلزلے بھی اسی طرح آئیں گے اور ستارے بھی اسی طرح ٹوٹیں گے۔

اے ماجد ولین، مینے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا اور تم نے مجھے اس کا کیا بدلہ دیا۔ میں نے تم سے اسقدر محبت کی کہ مجھ سے پہلے کبھی کسی نے کسی سے نہیں کی ہوگی، اور میں نے تمھاری پرستش کی اور اپنی زندگی کو تمھارے ہی خیال سے معمور رکھا، مینے جب دیکھا تو تمھاری طرف دیکھا اور جب خیال کیا تو تمھارا ہی خیال کیا۔ میں نکلتے ہوئے سورج کو دیکھ کر اسلئے خوش ہوتا تھا کہ اس میں تمھاری تصویر تھی۔ شاخ گل پر چہچہاتے ہوئے پرندوں کو اس لئے شوق سے سنتا تھا کہ ان میں تمھاری آواز تھی، ہنستے ہوئے پھولوں کو اس لئے دیکھتا تھا کہ اس کا رنگ تمھارے رنگ سے ملتا جلتا تھا اور اگر اس دنیا میں زندہ رہنے کی تمنا کی تو صرف تمھارے ساتھ رہنے اور تمھاری لذت دیدار سے شاد کام ہونے کے لئے۔

اگر تم سمجھتی ہو کہ میں تمھاری محبت کے قابل نہیں ہوں، اور اس کا مستحق نہیں کہ تمھارے دل کی گنجائشوں میں اپنے لئے کوئی جگہ نکال سکوں، تو اس محبت ہی سے محبت کرلو جو تمھاری میرے دل میں ہے اور اس عقیدت ہی کو پسند کرلو جو مجھے تمھارے ساتھ ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں تمھارے لئے جن جن مصائب و آلام کو برداشت کیا ہے، جن جن تکلیفوں اور آفتوں کو سہا ہے، دل کو خون اور خون کو پانی کی طرح بہایا ہے، اس کا بدلہ وہی دیدو جو تمھارے شایانِ شان ہے۔ بہت ممکن ہے تمھیں اس دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی مِلجائے جو اپنے حسن و جمال اور جاہ و ثروت سے تمھیں موہ لے لیکن خوب سمجھ لو کہ وہ شخص نہیں ملسکتا جو تم سے میری طرح محبت کرسکے۔

اے ماجد ولین، ان لوگوں نے تجھے دھوکہ دیا ہے اور مال و دولت کی خواہش اور حرص و ہوس کی تمنا کو تیرے سامنے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے تجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی نام ہے کھانے پینے کا، عالیشان محلوں میں رہنے اور عمدہ لباس پہننے کا، قیمتی ہاروں اور خوبصورت آویزوں کا۔

ان لوگوں کے خیال میں نکاح ایک ایسی مالی شرکت ہے، جس میں میاں بیوی مال و دولت جمع کرنے اور اس کے انبار لگانے کے لئے کوئی عہد کرتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ ایسا نکاح حقیقت میں ایک قسم کی بدکاری ہے اور جو عورت بھی کسی مرد سے اس کی دولت کے لئے شادی کرتی ہے، وہ حقیقتاً شادی نہیں کرتی، بلکہ اپنے جسم کو اس کے ہاتھ فروخت کرتی ہے جس طرح کوئی بدکار عورت چند سکوں کے بدلے اپنے آپ کو کسی مرد کے حوالے کردیتی ہے۔ بلکہ اس کا حال اس سے بھی زیادہ زبوں اور اس کا مقصد اس سے بھی زیادہ ذلیل ہے، کیونکہ وہ اپنے نفس کو اس لئے نہیں بیچتی کہ کوئی لقمہ اسکی خمیدہ کمر کو سیدھا کرسکے یا کپڑے کا کوئی ٹکڑا اُس کے برہنہ جسم کو ڈھک سکے، بلکہ اس لئے کہ اُسے ایک قیمتی ہار ملجائے جسکو پہنکر وہ اپنے سینے کو اور زیادہ خوبصورت بنائے یا اسے کوئی عمدہ لباس حاصل ہوجائے جس سے وہ اپنے ہمسنوں پر فخر کرسکے یا اسے رہنے کو کوئی خوبصورت محل ملجائے جس کی وسعتوں میں وہ مختلف قسم اور رنگ رنگ لذتوں سے مستفید ہوتی رہے۔

اے ماجد ولین، جس چیز نے تمھیں میری آنکھوں میں گراں قدر بنایا اور مجھے تمھاری پرستش پر مجبور کر دیا وہ یہی خیال تھا کہ ان تمام عورتوں میں تم ہی وہ عورت ہو جو اپنے پہلو میں ایک ایسا دل رکھتی ہے جو بہت ہی پاک وصاف ہے اور اس سے پاکیزہ محبت کے وہ چشمے اُبلتے ہیں جو دُنیاوی اغراض سے خالی ہیں، تو کیا میرا یہ خیال غلط تھا؟ نہیں! نہیں! میں جانتا ہوں کہ تمھارے پاس وہی دل ہے اور اسی لئے میں اب بھی روتا ہوں۔

تم ایڈورڈ کے متعلق کچھ نہیں جانتیں، اور مجھے اسکی حالت کا پورا پورا علم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے پہلو میں تمھارا جیسا دل نہیں ہے اور تمھارے شعور وجدان میں شریک ہونے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتا ہے کہ تم حسین ہو، اور محبت کرنے کے قابل ہو مگر خوبصورتی ختم ہو جانے والی چیز ہے اور نفسانی خواہشات زوال پذیر۔ مجھے ڈر ہے کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد تمھیں اس کے ہاتھوں اس بدبختی اور مصیبت کا منھ نہ دیکھنا پڑے جس سے بھاگ کر تم اس کے پاس جانا چاہتی ہو۔ اور اگر ایسا ہوا تو مجھ سے زیادہ بدقسمت اور بدنصیب اور کون ہوگا، کیونکہ بہر حال میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم جہاں بھی ہو تمھارے لئے دُعا کرتا رہتا ہوں۔

کاش مجھے معلوم ہو جاتا، اے ماجد ولین کہ کیا آج بھی میری آواز تمھارے دل کی گہرائیوں میں اسی طرح پہونچ رہی ہے جس طرح آج سے قبل پہونچا کرتی تھی اور کیا پہلے کی طرح آج بھی تم یہ تصور کر سکتی ہو کہ میں اپنی زندگی سے بڑھ کر تم سے محبت کرتا ہوں۔

V.V. 17.2.47

اسٹیفن کا خط ماجد ولین کے نام

اب مجھے شاید ہی کسی چیز پر رحم آتا ہو۔

دُنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہے اور کائنات ایک ویران وحشت کدہ! میری زندگی معلوم ہوتا ہے گویا ایک مسلسل رات ہے جس کی صبح شاید کبھی نہ ہوگی، لوگ اپنی اپنی خوابگاہوں میں محوِ خواب ہیں، اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا میں دُنیا سے بہت دور کسی بے آب وگیاہ صحرا میں پڑا ہوا ہوں۔ جہاں نہ دریا بہتے ہیں نہ پرندے چہچہاتے ہیں، نہ کسی انسان کا گزر ہے نہ کسی حیوان کا، میں رات و دن اس صحرا میں حیراں وسرگرداں پھر رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ یہاں سے نکل جاؤں لیکن نہیں نکل سکتا۔

اے ماجد ولین، تمھیں بتاؤ کب مجھے موت آئے گی؟ اور کب میرا وقت پورا ہوگا کہ زندگی کے ان مصائب وآلام سے چھوٹ جاؤں؟

اے ماجد ولین، تم سے چھٹ کر میں کسی طرح صبر پر قادر نہیں ہوں، کیونکہ تمھیں اس دُنیا میں میرے لئے سب کچھ ہو، میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے اپنی تمام دولت جوئے میں ہار دی ہو، اور اب احساس بیچارگی کے علاوہ اسکے پاس کچھ نہ ہو

آہ - میرے دل میں کیا کیا تمنائیں تھیں، کیسی کیسی آرزوئیں تھیں، میرا سینہ کن کن ارادوں سے معمور تھا میں اپنے اندر وہ قوت محسوس کرتا تھا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی مجھے بے حقیقت نظر آتی تھی، لیکن آج میں کس قدر کمزور، کتنا افسردہ مجروح، مایوس اور نا امید ہو گیا ہوں کہ نہ کچھ سوچ سکتا ہوں اور نہ سمجھ سکتا ہوں، گویا ایک پتھر ہوں، جو راہ میں صرف ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اے ماجدولین، کیا تم اس دن سے نہیں ڈرتیں، جب خدا تم سے پوچھیگا کہ تم نے ایک بیگناہ انسان کو کیوں قتل کیا اور جب میری آواز (تم جہاں بھی ہو) تمہارا پیچھا کرے گی، تمہاری خلوتوں اور جلوتوں میں، سوتے جاگتے ہیں، تمہارے شوہر کے آغوش اور تمہارے بچوں کے گہواروں میں۔

اے ماجدولین، کیا تم نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تم بھی میری اسی طرح پاسبانی کروگی جس طرح فرشتے انسان کی حفاظت کیا کرتے ہیں، اب کہ میں دُنیا میں سب سے زیادہ بدنصیب ہوں، تمہارے وہ تمام وعدے کیا ہوئے؟

ذرا تو میرے پاس آؤ، اور کچھ دیر تو میرے پاس ٹھیرو، تاکہ میں تمھیں نگاہ بھر کر دیکھ سکوں، اور تمہاری عرق آلود پیشانی میں اپنی لُٹی ہوئی تمناؤں کی تصویر اور برباد شدہ امیدوں کا عکس دیکھ سکوں، آؤ اور مجھے اپنی وہ شیریں آواز سنادو جو اس سے پہلے سُنایا کرتی تھیں، اور اپنی اُن محبت بھری نگاہوں میں سے صرف ایک نگاہ مجھے دیکھ لو جن سے تم مجھے حیات تازہ بخشا کرتی تھیں اور جھوٹ یا سچ بس اسقدر کہدو کہ تم مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہو، بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔

اے ماجدولین، سچ کہتا ہوں کہ اگر کبھی میں تمھیں اپنے راستے میں دیکھ لوں تو تمہاری طرف دوڑ پڑوں اور تمہارے قدموں پر اپنا سر رکھکر بھکاری کی طرح تم سے تمہاری محبت کی بھیک مانگوں، اور اگر تم مجھے دیکھ کر منھ پھیر لو تو تمہارے پیچھے پیچھے پھروں، جب تک کہ تم میری طرف متوجہ نہ ہو جاؤ اور میرا درد دل نہ سُن لو۔

اے ماجدولین، میں سخت تکلیف میں ہوں، اور میرا خیال ہے کہ جو دُکھ درد میں برداشت کر رہا ہوں وہ اس دُنیا میں کوئی نہیں اُٹھا سکتا، خدا کے لئے ماجدولین، مجھ پر رحم کرو، اور اگر تم مجھے اپنی محبت کے قابل نہیں سمجھتی ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو، یہ بھی اگر منظور نہ ہو تو پھر مجھے اجازت دو کہ تم جہاں بھی جاؤ میں تمہارے ساتھ ساتھ رہوں، جس طرح تمہارا کتا ہر جگہ تمہارے ساتھ رہتا ہے، تاکہ میں تمھیں ہر وقت دیکھتا رہوں، تمہاری آواز کو سنتا رہوں، کیونکہ میں اس دُنیا میں تم سے جدا رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

اسٹیفن کا خط ماجدولین کے نام

خدا میری غربت و بیچارگی پر رحم کرے، میری زندگی کا پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا، جرأت و ہمت کی جو آگ میرے دل میں روشن تھی، قوت و طاقت کی جو حرارت میری رگ و پے میں ساری تھی وہ ٹھنڈی پڑ گئی اور میرے اور دوسرے

تمام لوگوں کے درمیان جو چیز مشترک تھی وہ ختم ہو گئی، میرا بھائی دنیا سے رخصت ہوا، میرے والد نے مجھے گھر سے نکالا، میرے خاندان والوں نے مجھ سے دشمنی کی، اب اس عالم آب وگل میں تمہارے علاوہ میرے لئے اور کیا تھا، پر افسوس تم نے بھی میرا ساتھ نہ دیا، پھر اب کس امید پر جیوں، اور کس تمنا پر زندہ رہوں۔

اے ماجد ولین، تم جانتی ہو کہ میں اپنی موت پر زندگی کو کیوں ترجیح دے رہا ہوں حالانکہ مرجانا میرے لئے ان آفتوں کے اٹھانے سے کہیں زیادہ آسان ہے؟ صرف اس لئے کہ میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا اور مجھے ڈر ہے کہ اگر ایسا ہوا تو مجھ سے ان گزرے ہوئے خوبصورت دنوں کی یاد جن میں تمہاری الفت سے شادکام رہا ہوں، چھن جائے گی، حالانکہ میرا حاصل زندگی اور سرمایۂ زیست یہی ہے۔

اے ماجد ولین، تم نے میری زندگی کی ہر سعادت مجھ سے چھین لی اور پھر اس کے جواب میں مجھے ایسی کوئی چیز بھی نہ دی، جو میری زندگی کا سہارا بنتی، بلکہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا، جس طرح کوئی بیدرد مسافر اپنے زخمی اور پیاسے رفیق سفر کو تپتے ہوئے ریگستان میں جہاں نہ سایہ ہو نہ پانی، چھوڑ کر چلا جائے۔

اے ماجد ولین، آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ زمین کے ذخیروں میں سے وہ کونسا ذخیرہ ہے، اور آسمان کے خزانوں میں وہ کونسا خزانہ ہے، جو تم مجھ سے چاہتی ہو۔ کیا سنگ مرمر کا کوئی سفید محل چاہتی ہو، یا جواہر تابدار سے بھرا ہوا کوئی حوض مانگتی ہو، یا قیمتی موتیوں سے مرصع فرش کی خواہش ہے، یا سورج کی شعاعوں سے بنے ہوئے کسی زرتار لباس کی تمنا ہے یا کسی ایسے جڑے ہوئے تاج کی آرزو ہے جس کے سامنے بادشاہوں کے تاج ماند پڑ جائیں؟ تمھیں یہ سب کچھ مل سکتا ہے۔ بس اتنا کرو کہ میرے دل کو وہ امید واپس کر دو جسے تم نے مجھ سے چھین لیا ہے۔ پھر تم دیکھو گی کہ میری ایک جنبش نگاہ سے کس طرح قسمتیں بدل جاتی ہیں اور زمین و آسمان میری قوت و جبروت کے آگے کس طرح سر بسجود ہیں۔

آہ! کس قدر بے اندازہ تھی اس روز میری خوشی و مسرت، جس روز جونیہ میں ایک مختصر سا گھر میں نے تمہارے لئے طیار کرایا اور اس کے ایک نیلگوں کمرے میں تمہارے لئے ایک سفید مسہری بچھوائی، میں نے ایک خوبصورت باغ بھی طیار کرایا اور ہر وہ پھولدار درخت نصب کیا جسے تم پسند کرتی ہو، پھر جب کبھی میں اس گھر کے اندر آتا اور تھوڑی دیر کے لئے اسکے صحن میں کھڑا ہوتا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں تمہارے ساتھ اس گھر میں رہ رہا ہوں اور تمہاری شیریں آواز اس کی فضا میں گونج رہی ہے، اور گھر کے باغ میں ہمارے بچے سامنے کھیل رہے ہیں اور پیڑوں میں سے پھول توڑ توڑ کر ہمارے لئے لا رہے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اگر کبھی میں تمہارے سنگار کے کمرے میں چلا جاتا، تو مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا تم اپنے آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنے خوبصورت اور سنہرے بالوں میں کنگھی کر رہی ہو اور میں تمہارے پیچھے کھڑا ہوا تمہارے سنہرے اور چمکدار بالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے انھیں پیار کر رہا ہوں، لیکن آج اس گھر کی افسردگی و ویرانی دیکھو باغ پانی سے محروم ہے، پیڑ خشک ہیں اور پھول سوکھ گئے ہیں، دروازوں اور کھڑکیوں کو ہواؤں نے درہم برہم کر رکھا ہے

کمروں کی چھتوں اور فرشوں پر خاک نے ایک تہ بچھادی ہے اور اس کی حالت اُس دُلھن کی سی ہے جسے شادی کی پہلی ہی رات موت آگئی ہو۔

تم تو ایسی ہو گئیں کہ مجھے ایک حرف بھی نہیں لکھتیں، اور نہ میرے کسی خط کا جواب دیتی ہو، آج سے پہلے تو تمھاری یہ عادت نہ تھی، کاش تم مجھے ایک جملہ ہی لکھ دیتیں، اور اچھا یا برا جو دل میں آتا کہتیں، اب تو میں اپنے دل کو ہر آفت کے لئے طیار اور ہر مصیبت کے لئے ہموار کر چکا ہوں۔

اسٹیفن کا خط ماجد ولین کے نام

تم نے مجھے وہ دو حرف بھی نہ لکھے، حالانکہ مینے کس قدر خوشامد کی تھی، کیا تمھارا ماحول تمھیں اس زمانہ کی یاد نہیں دلاتا جو کسی وقت میں نے تمھارے ساتھ گزارا تھا، تمھارے سامنے وہی سورج ہے جسے ہم دونوں صبح کو نکلتے اور شام کو چھپتے ہوئے دیکھتے تھے اور وہیں وہ چاند بھی ہے جو آسمان کی بلندیوں سے ہمیں جھانکا کرتا تھا اور ہم دونوں کا اپنی سفید چاندنی کی چادر میں چھپا لیا کرتا تھا۔ اور وہاں وہی جگہ بھی ہے جہاں پانی اور سائے کے درمیان ہم بیٹھا کرتے تھے۔ تمھارا ہاتھ میرے ہاتھ میں، تمھارا سر میرے سینہ پر ہوتا تھا اور وہیں وہ چھوٹا سا سمندر بھی ہے جس کے کنارے ہم دونوں روز شام کے وقت ٹہلا کرتے تھے، اور اگرچہ ہماری زبانیں خاموش رہا کرتی تھیں، لیکن ہماری آنکھیں ہمارے دل کی ترجمانی کیا کرتی تھیں اور پھر لوٹتے وقت ہم یہ تمنا لئے ہوئے واپس ہوا کرتے تھے کہ کاش ہمیں اپنے بہاؤ میں کسی ایسی بستی تک پہونچا دے جہاں سے ہم پھر کبھی جدا نہ ہو سکیں اور وہیں وہ کمرا بھی ہے جس میں جدائی کی رات ہم ایک دوسرے سے ملے تھے، اور ہم نے رو رو کر اپنی آنسوؤں سے اس کی زمین کو تر کر دیا تھا اور جس کی چھت کے نیچے ہم نے قسم کھائی تھی کہ جب تک زندہ ہیں ایک دوسرے سے بد عہدی نہیں کریں گے۔

اے ماجد ولین، میں تمھیں دل میں سیکڑوں مرتبہ رو رو کر اور چیخ چیخ کر پکارتا ہوں، لیکن میری آواز تمھارے کانوں تک نہیں پہونچتی اور تمھیں میرے حال پر ذرا رحم نہیں آتا۔

اگر تم اپنی زندگی میں کسی ایسی عورت کو دیکھو جو اپنے شوہر کی قبر پر دوزانو بیٹھی ہوئی ماتم کر رہی ہو، اور انتہائی حسرت و یاس سے رو رہی ہو، کیونکہ وہ اس سے بے انتہا محبت کرتی تھی اور اس سے عین عالم شباب میں چند چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر جدا ہو گیا تھا اور اسے روتا دیکھ کر تم بھی رونے لگو۔

یا تمھیں راستہ میں کوئی غریب لڑکی نظر پڑے جو ماری ماری پھر رہی ہو، روتی جاتی ہو اور ہر آنے والے سے اپنے چھوٹے بیمار بھائی کی دوا کے لئے، جس کا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے، بھیک کے چند پیسے مانگنے کے لئے ڈرتا کانپتا ہوا ہاتھ پھیلا رہی ہو، اور تم رحم کھا کر اسے اپنے پاس ٹھکانا دیدو اور اس کی خواہش کو پورا کر دو۔

یا کبھی کسی دریا پر تمہارا گزر ہو اور تم اس کے کنارے ایک عورت کو چیختے ہوئے دیکھو جو رو رو کر لوگوں کو اپنے اُس اکلوتے بچّے کی مدد کے لئے بلا رہی ہو جو اس کی آنکھوں کے سامنے دریا میں ڈوبا جا رہا ہے، لیکن بچانے والا کوئی نہ ہو یہاں تک کہ وہ ڈوب جائے اور ڈوب کر پھر نہ اُبھرے - یہ دیکھ کر وہ پاگل ہو جائے اور اس بیخودی میں وہ بھی دریا میں کود پڑے اور تم اس کی اس مصیبت پر رو دو۔

یا تم اس غریب بڈھے کا قصّہ سنو، جو اپنی قریب المَوت بیوی اور بیمار لڑکی کے سرہانے دوزانو بیٹھا ہوا ہو، اور پولس کا سپاہی اُسے گرفتار کرنے کے لئے اسکے گھر میں گھس آئے ہوں، کیونکہ اس نے گزشتہ رات ان دونوں کی جانکنی کی تکلیف سے مجبور ہو کر ان کے لئے ایک روٹی چرائی تھی اور ہر چند وہ ان سپاہیوں سے التجا کرے کہ اسے ایک گھنٹہ کی مہلت دیدیں تاکہ اسے اپنی بیمار بیوی کے متعلق خدا کے آخری فیصلے کا علم ہو سکے! لیکن وہ سخت دل انکار کر دیں۔

یا تم اس شخص کے واقعہ کو سنو جو کسی بے آب و گیاہ صحرا میں راستہ بھول گیا ہو پیاس کی شدت برابر بڑھ رہی ہو اور وہ ہر طرف پانی کی تلاش میں حیران و سرگرداں پھر رہا ہو۔ لیکن پانی کہیں نہ ملے، یہاں تک کہ وہ تھک کر گر پڑے اور چلنے سے رہ جائے۔ پھر اُسے کہیں دور سے پانی کی چمکتی ہوئی سفید چادر دکھائی دے اور وہ بیتاب ہو کر گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا اور اپنے بہتے ہوئے خون سے میدان کی کنکریوں کو رنگتا ہوا اس کی طرف بڑھے، اور جوں ہی اس کے قریب پہونچے اور اس کے پانی کے درمیان ایک قدم سے زیادہ فاصلہ نہ رہے تو وہ پیاس کی شدت سے جان دیدے۔

یا تم اُس عورت کے قصّہ کو پڑھو، جسے لوگوں نے کسی قحط کے زمانہ میں اپنی جھونپڑی کے آگے بیٹھے ہوئے دیکھا ہو، اسکی گود میں گوشت کا ایک سُرخ ٹکڑا ہو اور اس کے سامنے چولھے پر چڑھی ہوئی ہانڈی سے دُھواں نکل رہا ہو، لیکن جب وہ اس کے قریب پہونچیں تو یہ دیکھ کر ڈر جائیں کہ اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری بھی ہے اور دو چھوٹے چھوٹے پاؤں ہانڈی سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اُس وقت اُنھیں معلوم ہو کہ فاقوں نے اسے پاگل بنا دیا ہے، اور گوشت کا سُرخ ٹکڑا جو اس کی گود میں ہے، حقیقتاً اس کے بچّہ کا گوشت ہے، جسے اُس نے ذبح کر کے چھُری سے اُس کا جوڑ جوڑ الگ کر دیا اور اب وہ اسے اپنے کھانے کے لئے پکا رہی ہے۔

اگر تم نے ان مصیبت زدوں کے حالات کبھی سُنے ہوں، اگر قید خانوں میں بیگناہوں کی آہ و زاری نے تمھارے کانوں کے پردوں کو کبھی ٹکرایا ہو، یا ہسپتالوں میں بیماروں کی چیخ و پکار نے تمھارے دل کو کبھی ہلایا ہو، تو اے ماجد ولین یقین کرو کہ میں اُن سب سے زیادہ بدنصیب اور اُن سب سے زیادہ تمھاری رحمت و شفقت کا محتاج ہوں۔

میرے صبر و تحمل کا پیمانہ اب بھر چکا ہے، اور اب اس سے زیادہ ضبط کی طاقت مجھ میں نہیں ہے، بہت ممکن ہے کہ اسکے بعد میں تمھیں کوئی خط بھی نہ لکھ سکوں، کیونکہ ناتوانی اپنی انتہا کو پہونچ چکی ہے، اور آنکھوں سے تیرگی کے باعث دیکھنا بھی دشوار ہے اسلئے اے ماجد ولین رخصت، زندگی بھر کے لئے رخصت اگر زندگی ابھی کچھ اور باقی ہو اور اگر نہیں تو ابھی سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رخصت

ماجدولین کا خط اسٹیفن کے نام

میرے آقا، میں نہیں کہہ سکتی کہ تمہارے خط پڑھ پڑھکر میں کس قدر روئی ہوں، لیکن ہر مرتبہ مینے اپنے دل کو یہی کہکر تسلی دی کہ یہ بھی یاس و نومیدی کی وہ سسکیاں ہیں جنہیں زمانہ اسی طرح بند کردے گا جس طرح اس سے پہلے یاس و محرومی کی بہت سی سسکیوں کو ختم کرچکا ہے۔

اور غالباً تمھیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ بھی ہوا اُس میں تمھاری ہی بھلائی مقصود تھی اور تمھارے لئے ایک ایسی زندگی کی بنیاد ہے جو اس زندگی سے کہیں زیادہ مُبارک ثابت ہوگی۔

اے اسٹیفن تمھیں خوب معلوم ہے کہ میں ایک غریب لڑکی ہوں، اور خود تمھارے پاس بھی اتنی دولت نہیں جو ایک شوہر اور ایک باپ کے لئے کافی ہو سکے۔ اس لئے ہمارے اور تمھارے لئے بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے لئے وہی راستہ اختیار کرے جس کے متعلق اُسے یقین ہو کہ وہ اُسے فلاح و بہبود کی منزل تک پہونچا سکے گا۔ خواہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں، اے میرے دوست تم پچھلی باتوں کو بھول جاؤ، اور کوبلانس جاکر اپنے والد اور دیگر اعزہ سے مصالحت کرلو اور جس لڑکی کو وہ تمھارے لئے پسند کرچکے ہیں، اُسی سے اب نکاح کرلو، اور میری طرف سے اطمینان رکھو کہ جب تک زندہ ہوں تمھاری وفادار دوست رہونگی اور اپنے دوست ایڈورڈ کی طرف سے بھی تم اپنے دل میں کوئی نفرت یا عداوت نہ رکھنا، کیونکہ خدا گواہ ہے اُس کا ان باتوں میں ہاتھ نہ تھا بلکہ یہ سب میری اپنی صوابدید تھی اور اپنے ضمیر و عقل کے علاوہ اس مسئلہ میں مینے کسی دوسرے سے کوئی مشورہ نہیں لیا۔ اس لئے اگر تم مواخذہ کرنا ہی چاہو تو صرف میں لائق تعزیر و دار و گیر ہوں۔

اسٹیفن کا خط ماجدولین کے نام

اے ماجدولین، تم تو ہر چیز کو بھول گئیں، خیر اب اپنی زندگی کے لئے جو مناسب سمجھو وہ پسند کرو، تمھارے خطوط تمھیں واپس کر رہا ہوں، کیونکہ اب ان کا میرے پاس رہنا کچھ مناسب نہیں ہے۔ میں تمھاری اس دوستی کا بھی اُسی وسعت قلب کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں جس وسعتِ قلب کے ساتھ میں اس سے پہلے تمھاری محبت کو قبول کرچکا ہوں۔ میں اپنے دل میں تمھارے یا تمھارے منگیتر کی طرف سے کوئی وجہ نفرت کی نہیں پاتا۔ بلکہ تم دونوں کے لئے سعادت و بہبود کا خدا سے طالب ہوں۔

شادی

قصبۂ دلفاخ کا گرجا آج مردوں اور عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور لوگ بڑی مسرت و شوق سے دولہا دلھن

کے انتظار میں دروازے کو تک رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گاڑیوں کے آنے کی آوازیں آنے لگیں، اور سب لوگ استقبال کے لئے صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے ایڈورڈ، ماجد ولین کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے گرجا میں داخل ہوا۔

ماجد ولین، نہایت سفید لباس پہنے ہوئے تھی، اس کے سر پر پھولوں کا ایک تاج تھا، جو اس کے خوبصورت اور سنہرے بالوں میں بڑی خوبصورتی سے چمک رہا تھا۔ اُن دونوں کے پیچھے شیخ مولر، سوزان، اس کا شوہر اور ماجد ولین کا چچازاد بھائی ارشنید اور سوزان کا چچازاد بھائی البرٹ اور دوسرے اعزہ یکے بعد دیگرے داخل ہوئے۔

اس کے بعد دُولہا دُلھن قربانگاہ کی طرف بڑھے اور پادری کے سامنے جُھک گئے، انھیں دیکھ کر اور لوگ بھی جُھک گئے اور استیفن بھی جو ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی گرجا آگیا تھا، زیر لب آہستہ آہستہ یہ دعا مانگ رہا تھا کہ:-

"اے خدا، تو اپنی نگاہ لطف و کرم سے اس کی حفاظت کر، اور اُسے اپنے دامن حمایت میں لے لے، زندگی کی تمام خوشیاں تو اسے بخشدے، اور جو کچھ میں اپنی زندگی کے لئے تجھ سے طلب کیا کرتا تھا، وہ سب کچھ تو اس کی کتاب زندگی میں لکھدے"۔

اس کے بعد پادری نے جب نکاح کا خطبہ شروع کیا تو استیفن کو ایسا محسوس ہوا گویا اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا ہے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے دل کو تھام لیا، نگاہیں نیچی کرلیں اور پھر اس پر بیہوشی طاری ہوگئی، ایک گھنٹہ کے بعد اُسے ہوش آیا تو دیکھا کہ گرجا خالی پڑا ہے، تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور رات کی ٹھنڈی ہوائیں روشن دانوں اور کھڑکیوں سے چلی آرہی ہیں، اس نے ایک آہ کھینچی اور کہنے لگا:- "جو ہونا تھا وہ ہو چکا، ماجد ولین میرے ہاتھ سے نکل گئی، پس اب میں کیا کروں؟ کیونکر زندہ رہوں؟ اور زندگی کے باقی دن کہاں گزاروں؟ اب اس دنیا میں میرے لئے کیا ہے جس کے لئے زندگی کی خواہش کروں؟" اس کے بعد وہ باہر آیا اور جدھر کو بھی منھ اُٹھا روانہ ہوگیا اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کدھر جا رہا ہے۔

ناگاہ اس کا گزر شیخ مولر کے گھر کے سامنے سے ہوا اور اس نے دیکھا کہ مہمان اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں، چنانچہ وہ وہیں اندھیرے میں باغ کی دیوار کے کنارے بیٹھ گیا۔ اور جب قدموں کی آہٹ ختم ہوگئی اور گھر مہمانوں سے خالی معلوم ہونے لگا تو وہ آگے بڑھا۔

اس نے دیکھا کہ ایک کمرے کے علاوہ باقی تمام کمروں کی روشنیاں گل ہوگئیں، وہ سمجھ گیا کہ دُلھن کا کمرہ یہی ہے اور ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح باغ کی دیوار کے چاروں طرف گھومنے لگا، اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیوں گھوم رہا ہے اور کہاں جانا چاہتا ہے۔ اسی آمد و شد میں اُس نے ایک جگہ باغ کی دیوار میں ایک بڑا شگاف دیکھا، اور اندر داخل ہوگیا وہ آہستہ آہستہ مکان کی طرف بڑھا اور اس کمرے کے دروازے تک پہونچ گیا، جس سے روشنی چھن چھن کر نکل رہی تھی، وہ دروازے کے

قریب پہونچکر رُک گیا، اندر سے بولنے کی آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں، اس کا تمام جسم کانپنے اور تھرتھرانے لگا اور اُسے ایسا معلوم ہوا گویا وہ کسی ایسے گڑھے میں اُتر رہا ہے جس کی گہرائی اتھاہ ہے۔

اس کے بعد اس نے دروازے کے سوراخوں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ دیکھ سکا، پھر ان پر اپنا کان رکھکر سننے لگا اور ماجد ولین کے یہ جملے اس کے کانوں میں آئے "تم تو میری زندگی ہو، اور تمہارے بغیر میرا جینا دشوار ہے۔"

یہ سُن کر وہ دیوانہ ہوگیا اور انتہائی غیظ و غضب میں وہ اپنے سینہ کو اپنے ناخنوں سے نوچنے لگا۔

خون بہ بہ کر اس کی قمیص میں جذب ہو رہا تھا، اور جلد کے ٹکڑے اس کی اُنگلیوں پر چپک رہے تھے، لیکن اسے نہ احساس درد تھا نہ شعور تکلیف، اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اس نے کیا کیا اور کیا ہوا، آخر وہ تھک گیا اس کے قدم لڑکھڑانے لگے اور زینہ سے نیچے گر پڑا۔

وہ رات بھر اسی طرح بیہوش پڑا رہا، صبح کو اس سے قبل کہ گھر کا کوئی شخص بیدار ہو جنفیاف کی آنکھ کھلی تو اُسنے دیکھا کہ اسٹیفن سیڑھیوں کے نیچے بیہوش پڑا ہوا ہے۔ وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئی، پھر اس کی نگاہ اس کے خون آلود کپڑوں اور ناخنوں پر پڑی، سمجھی کہ اسے کسی نے قتل کیا ہے، چنانچہ اسنے چیخنے کا ارادہ کیا، لیکن اس کی آواز نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ اس کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے اس کے قریب گئی تو دیکھا کہ تنفس کی آمد و شد باقی ہے، اس نے اس کی پیشانی پر پانی چھڑکا اور زخموں کو دھونے لگی، یہاں تک کہ اس نے آنکھیں کھولدیں اور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس نے جنفیاف کو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھا اور شرم سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور پوچھنے لگا: "کیا اسے اُس حال میں اس کے علاوہ کسی اور نے بھی دیکھا ہے؟" کہنے لگی "نہیں" تب اس نے چند لفظوں میں اپنا سارا قصہ بیان کیا اور اس سے عہد لیکر کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کرے گی، وہ بدقت اُٹھا اور افتاں و خیزاں اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔

ہذیان

فرتز کی بیوی جوزفائن جو اسٹیفن کی تیمارداری پر مقرر کی گئی تھی، طبیب سے کہنے لگی: "مجھے ڈر ہے کہیں یہ پاگل نہ ہو جائے، میں دیکھتی ہوں کہ اس کی زبان سے سوائے ماجد ولین کے نام کے کوئی دوسرا لفظ نکلتا ہی نہیں، ہر وقت اسکے متعلق پوچھتا رہتا ہے اور سوتے جاگتے اُسی کو دیکھتا رہتا ہے، کبھی وہ اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتا ہے، تو خوش ہو جاتا ہے اور مسکرا دیتا ہے اور کبھی وہ اپنے پاس سے جاتے ہوئے دیکھتا ہے تو رونے لگتا ہے، اور اسے روکنے اور پکڑنے کے لئے پلنگ پر سے اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ اس عورت کی ملاقات کے علاوہ کوئی دوسری صورت اس بیماری سے نجات پانے کی نہیں۔"

طبیب یہ سُنکر کہنے لگا:- "ہاں، آج میں ولفاخ گیا تھا اور بغیر کسی سابقہ تعارف کے ماجد ولین سے ملکر مریض کی

حالت بیان کی اور اس سے درخواست کی کہ صرف ایک مرتبہ جاکر اسے دیکھ لے، ممکن ہے اسے کوئی فائدہ پہونچ جائے، پہلے تو اس کے شوہر نے اس کی سختی سے مخالفت کی، لیکن اخیر میں وہ بڑی مشکل سے اس شرط پر راضی ہوا کہ ماجدولین تنہا نہ جائے جائے گی بلکہ وہ خود بھی اسکے ہمراہ آئے گا۔

اتنے میں کسی نے آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹایا، اور دروازہ کھلتے ہی ماجدولین اور اس کے پیچھے پیچھے ایڈورڈ اندر داخل ہوئے، لیکن اسٹیفن کو ان میں سے کسی کے آنے کی کوئی خبر نہیں ہوئی، تھوڑی دیر بعد اس نے خود ہی آنکھیں کھولیں اور جوز فائن کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:۔ "میرے وہ کپڑے کہاں ہیں جن کے لانے کے لئے میں نے تم سے کہا تھا! کیا تمھیں نہیں معلوم کہ آج اتوار ہے اور مجھے اپنی شادی کے سلسلہ میں کلیسا جانا ضروری ہے"۔

یہ سُنکر جوز فائن نے سر جھکالیا اور کچھ نہ بولی۔ اور ماجدولین نے بھی اس ڈر سے کہ کوئی اس کے چہرے کی زردی کو نہ دیکھ لے اپنا منھ پھیر لیا۔

اس کے بعد طبیب ماجدولین کی طرف بڑھا اور کہنے لگا:۔ "اب آپ ذرا اس کے قریب تشریف لے آئیں اور اسکا نام لیکر بلائیں شاید وہ آپ کو پہچان لے"۔ چنانچہ وہ اس کے پلنگ کے قریب آکر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اسٹیفن نے ایک کھوئی ہوئی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور اپنا منھ پھیر لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ سمجھ گئی کہ پہچانا نہیں، چنانچہ اسنے اس کا نام لیکر زیادہ نرم و شیریں آواز سے پکارا، چنانچہ ادراک و شعور کی خوابیدہ قوتیں دفعتاً بیدار ہوگئیں، اور بجلی کی ایک زبردست موج اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے کروٹ بدلی آنکھیں کھولدیں اور اپنے ایک ہاتھ کے سہارے سے اُٹھ بیٹھا اور اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں اس کے بعد وہ مسکرایا اور اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاکر کہنے لگا:۔

"اے ماجدولین میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے میرے پاس آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ میں تو خود ہی تمھارے پاس جانے والا تھا، مگر مجھے نیند آگئی اور سوگیا، اچھا آؤ اور اب میرے ساتھ چلو، کیونکہ وقت بہت تنگ ہے اور میرا خیال ہے کہ ہمارے احباب کلیسا میں بڑی بیچینی سے ہمارا انتظار کررہے ہوں گے، اور میں دیکھ رہا ہوں کہ سب لوگ صف بہ صف، حسرت و شوق سے ہمارے آنے کا انتظار کررہے ہیں، انگیٹھیوں میں سلگتے ہوئے عود اور اگر کی خوشبوئیں میری ناک میں یہاں تک آرہی ہیں اور ناقوس کے بجنے کی آوازیں مجھے مسلسل سُنائی دیرہی ہیں"۔

اس کے بعد اس نے ماجدولین کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہنے لگا: "اے ماجدولین تم کس قدر خوبصورت ہو اور یہ سفید چادر جو تم اوڑھے ہوئے ہو کتنی حسین ہے، بس اس وقت پھولوں کے ایک تاج کی کمی ہے"۔ یہ کہکر اسنے اپنے برابر پڑے ہوئے پھولوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور ان سے ایک خوبصورت سا تاج بنانے لگا۔ اس کے بعد اسنے طبیب کی طرف دیکھا اور اسے شیخ موتر سمجھ کر کہنے لگا: "ابا جان مجھے اجازت دیجئے کہ یہ تاج آپ کی صاحبزادی کو پہنادوں"۔

طبیب نے بڑی ملتجیانہ نگاہوں سے ماجد ولین کی طرف دیکھا اور اسٹیفن نے یہ تاج لیکر اس کے سر پر رکھدیا۔ وہ بُت کی طرح خاموش کھڑی تھی اور مردے کی طرح زرد پڑگئی تھی، گویا ابھی ابھی قبر سے باہر نکلی ہے۔

وہ کہنے لگا: "اے ماجد ولین کیا تمھیں یاد ہے کہ اب سے دو سال پہلے ہنسی ہنسی میں ہمنے کسی وقت ایسا ہی ایک تاج تمھارے سر پر رکھا تھا اور ہم نے اسے اپنے مستقبل کے لئے ایک فال نیک شمار کیا تھا۔ بس اب تم دیکھو کہ ہمارا خیال کیسا ٹھیک نکلا۔ ہم ان نعمتوں پر خدا کا جس قدر بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔

یہ کہکر وہ جوزفائن کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: "اس وقت میں اپنے سینے میں نہ معلوم کیوں ایک گھٹن سی محسوس کر رہا ہوں، تم ذرا اس کھڑکی کو کھول دو تاکہ آج کی لطیف ہواؤں میں زور زور سے سانسیں لے سکوں۔"

اس نے کھڑکی کھولدی اور وہ اپنا سر گھما گھما کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا اور بولا: "ہوائیں کیسی نرم ہیں، آسمان کتنا خوبصورت اور صاف ہے، اور سورج کس قدر روشن اور پُر نور ہے، ہم فطرت کے ان انعامات کا جس قدر بھی شکریہ ادا کریں کم ہے، اور میں زمانے کے اس احسان کا جس قدر بھی ممنون ہوں تھوڑا ہے کہ اس نے مجھے میری امید دل میں اس وقت کامیاب کیا جبکہ میں ان سے تقریباً مایوس اور ناامید ہو چکا تھا۔"

پھر اسکی نگاہ ایڈورڈ پر پڑی وہ اسکی موجودگی سے بہت خوش ہوا اُسے دیکھ کر مسکرایا اور اس سے کہنے لگا: "میرے دوست میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں، میرا خیال ہے کہ تمھیں نے ماجد ولین کو میری ملاقات کے لئے یہاں تک آنے پر رضامند کیا ہوگا، اور اگر تم ایسا نہ کرتے، تو اُن کی فطری شرم و حیا اسے یہاں تک کبھی نہ آنے دیتی۔ پس تم میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاؤ اور میرے دوستوں میں سب سے پہلے تم ہی مجھے مبارکباد دو۔ کیونکہ تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو، کیونکہ ایڈورڈ تمھیں وہ دن یاد ہیں جب ہم تم اس چھوٹے سے کمرے میں جس میں آج ہیں اپنی مصیبت و افلاس کے دن گزارا کرتے تھے اور میں تمھارے سامنے اپنے اور ماجد ولین کی محبت کا ذکر کیا کرتا تھا اور جب تم مجھے تمسخر اور استہزا کی نگاہوں سے دیکھتے تو میں تم سے کہتا کہ اس نے مجھ سے قسم کھائی ہے کہ موت کے علاوہ کوئی دوسرا یا تو اسے مجھ سے علٰحدہ نہیں کرسکتا، اور وہ کبھی بھی اپنے عہد سے نہیں پھر سکتی۔ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ میں اپنے تصورات و خیالات میں جھوٹا تو نہ تھا۔"

یہ کہکر اس نے ماجد ولین کا ہاتھ تھام لیا اور دفعتاً اس انگوٹھی کی شعاعوں میں سے ایک تیز شعاع جو اس کی اُنگلی میں چمک رہی تھی اُس کی نگاہوں میں کوندگئی۔ وہ بےچین ہو گیا اور اس کی نگاہوں کے سامنے وہ نظارہ آگیا، جب اسنے یہ انگوٹھی پہلی مرتبہ اس کے ہاتھ میں دیکھی تھی اور اسے ایڈورڈ کے برابر کھڑا ہوا پایا تھا۔

اس کا ہاتھ سُست پڑگیا اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا اور امید کی وہ کرن جو اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی غائب ہو گئی، اس کی پیشانی پسینہ سے تر تھی اور وہ بہت ہی کمزور اور لرزتی ہوئی آواز میں اس طرح کہ رہا تھا: "نہیں نہیں مجھے اس کے ہاتھ کو چومنے کا کوئی حق نہیں ہے، اب وہ میری نہیں ہے، اور نہ اس کے نزدیک میری کوئی حیثیت ہے۔"

یہ کہکر اس نے اپنا منہ اپنی چادر سے ڈھک لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ طبیب سے کہ رہا تھا: "ان سب لوگوں کو میرے پاس سے ہٹادو کہ اب نہ ان کا مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ میرا ان سے۔"

یہ دیکھ کر ماجد ولین رونے لگی اور اسی حالت میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا اور چاہتی تھی کہ اس کے پلنگ کے برابر بیٹھ جائے، لیکن ایڈورڈ نے زور سے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

دن ڈوبنے سے پہلے پہلے ایڈورڈ نے ولفاخ کو چھوڑ دیا اور اپنی بیوی کو لیکر کوبلانس چلا گیا۔

نا اُمیدی

اسٹیفن پورے دو مہینے بیمار رہا اور ان دو مہینوں میں ہر قسم کی جسمانی اور روحانی تکلیف اس نے اُٹھائی، لیکن جوں ہی اس کی حالت ذرا سنبھلی اور اپنے بستر سے اُٹھا تو رات دن حیراں و سرگرداں پھرنے لگا۔ جہاں کہیں سر ٹکانے کو جگہ ملجاتی پڑ رہتا اور جہاں کوئی نوالہ مل جاتا کھالیتا، وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں، داڑھی اور سر کے بال بڑھ گئے۔

وہ کبھی اتفاق ہی سے اپنے دوست فرتز کے گھر کی طرف آجاتا۔ لیکن جب کبھی آنکلتا تو اُس کی بیوی اور بچے سب اُس سے چمٹ جاتے۔ اسے اپنے گھر لیجاتے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر وحشت اس پر مستولی ہو جاتی اور وہاں سے بھاگ نکلتا۔

وہ اسی عالم آوارگی میں اپنے اس چھوٹے سے گھر سے گزرا جو اس نے جو تنج میں بنوایا تھا اور جس میں اپنی برباد رفتہ امیدوں اور تباہ شدہ آرزوؤں کے قلعے اس نے تعمیر کئے تھے، لیکن ہمیشہ منہ پھیر کر گزر جاتا اور بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ وہ دور ہی سے اس کی بلندیوں کا کوئی حصہ دیکھ کر لوٹ گیا کہ کہیں ادھر سے گزرنا اور اسے دیکھنا نہ پڑے۔

اس کی عادت تھی کہ جب کبھی وہ کسی راستہ پر گزرتا تو سیدھا چلا جاتا، نہ رُکتا تھا نہ ٹھہرتا تھا، اور نہ دائیں بائیں کسی طرف مڑکر دیکھتا تھا، جب اس کے سامنے کوئی دیوار آجاتی یا کوئی دریا اس کا راستہ روک لیتا، یا لوگوں کا مجمع اسے اپنے سامنے نظر آجاتا تو ہوش میں آتا اور پھر اُلٹے پاؤں واپس ہو جاتا۔

ایک دن صبح کے وقت وہ حسب عادت نکل کھڑا ہوا، اور چلتے چلتے دوپہر کے قریب کوبلانس تک پہونچ گیا اور وہاں کی گلیوں میں گھومنے لگا، لوگ اسے دیکھتے اور اس کی پریشان حالت اور پھٹی ہوئی آنکھوں کو دیکھ دیکھکر تعجب کرتے تھے۔

وہ اسی طرح گھوم رہا تھا کہ اس کے قریب ہی سے ایک گاڑی نکلی اور اس میں سے قہقہہ کی ایک آواز بلند ہوئی یہ آواز اس کے کانوں تک بھی پہونچی اور کچھ مانوس معلوم ہوئی اس نے مڑکر دیکھا تو ایڈورڈ اور

ماجدولین تھے یہ دیکھتے ہی وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اور جب دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ کوبلانس کی حدود سے باہر نکل گیا۔ یہاں پہونچکر اسے ایک دریا نظر آیا جو ایک سرسبز کھیت کے برابر برابر بہ رہا تھا۔ وہ اس کے کنارے بیٹھ کر سوچنے لگا:۔

"ہم خودکشی سے صرف اس لئے ڈرتے ہیں کہ زندگی ہمیں بہت پیاری ہے، اور زندگی تمام مصیبتوں اور غموں کے باوجود ہمیں صرف اس لئے پیاری ہے کہ ہم احمق و ناداں ہیں۔ ہم ایسی چیز کی خواہش کرتے ہیں جو ہماری دسترس سے باہر ہے۔ ہماری مثال اس جواری کی سی ہے جو جتنا زیادہ ہارتا ہے اسی قدر جیتنے کی حرص اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اسلئے اگر ہم اس دُنیا میں اپنی خوشی سے نہیں آئے ہیں تو پھر کیوں نہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہیں یہاں سے چلے جائیں۔"

آخر کار خودکشی پر اس کا ارادہ پختہ ہوگیا اور سوچنے لگا کہ اپنی زندگی کو کس طرح ختم کرے۔ خودکشی کی مختلف صورتیں اسکے سامنے تھیں۔ لیکن اس کے شاعرانہ اندازِ فکر نے اسے ایک نئی شکل کی طرف رہنمائی کی اور وہ یہ تھی کہ وہ ماجدولین کے نام ایک خط لکھے جس میں تفصیل کے ساتھ اپنے رنج و ملال کا ذکر کرے، اور پھر اسے اپنی خودکشی کے ارادے سے آگاہ کرے اور وہ جگہ بھی بتلادے جہاں سے وہ اپنے آپ کو دریا میں گرائے گا، پھر اگر ماجدولین آئی اور اس نے اسے دریا میں سے نکالا، تو اس پر اس کے اخلاص و وفاداری کا ضرور اثر ہوگا اور اس کی موت پر سخت ماتم کرے گی اور دل ہی دل میں شرمندہ ہوگی، اور جب تک زندہ رہے گی، آنسو بہاتی رہے گی۔

ٹھیک اس وقت اس کے کان میں اس قہقہہ کی آواز آئی جو اس نے تھوڑی دیر پہلے سنا تھا، جبکہ وہ گاڑی میں بیٹھی ہوئی اپنے شوہر کے ہمراہ جارہی تھی اور اس کی خودداری لوٹ آئی اور وہ اپنے دل سے کہنے لگا، کہ جو شخص اس قدر سخت دل اور بے رحم ہو وہ کب ان چیزوں کی پروا کرسکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے پاس میرا خط پہونچے اور وہ اسے نظر انداز کردے۔ پھر میری موت کی خبر کو سُنے اور ایک اطمینان کا سانس لے، اور دل ہی دل میں یہ سمجھ کر خوش ہو کہ چلو اچھا ہوا اس کے افقِ حیات پر جو سیاہ بادل چھایا ہوا تھا وہ چھٹ گیا۔

اس کے بعد اس نے ایک آہ کھینچی اور کہنے لگا: "بُرا ہو اس نامرادی کا، مجھ پر ہر چیز دشوار ہوگئی ہے حتّٰی کہ مرجانا بھی"

سعادت

ایک شام جبکہ اسٹیفن، فرتز کی کشتی میں سوار تھا اور وہ دریا کے بہاؤ پر موجوں کو چیرتی ہوئی بڑی تیزی سے جارہی تھی، وہ اسٹیفن سے کہنے لگا: "میرے آقا اب اپنے پر رحم کیجئے جو ہونا تھا وہ ہوچکا، گزری ہوئی باتوں پر افسوس بیکار ہے اور اگر میں آپ سے کچھ کہہ سکتا تو یہی کہتا کہ آپ کے لئے اس عزتِ نفس اور خودداری کے مالک ہوتے ہوئے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ اپنی پوری زندگی ایک ایسی عورت پر قربان کردیں جس کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ آپ کے ساتھ کوئی بہتر سلوک نہیں کرسکتی۔

میرے آقا، اس عورت نے آپ کی زندگی کی ساری تازگی و شادابی آپ سے چھین لی، اب جو کچھ رہ گیا ہے اسی کو غنیمت سمجھئے اور اس زندگی میں خدا نے جو جو نعمتیں مہیا کی ہیں ان سے فائدہ اُٹھائیے۔

میرے مولا، آپ تو شاعر ہیں، شاعر کا دل آئینہ ہوتا ہے جس میں کائنات کی صورتیں بڑی ہوں یا چھوٹی، ایک ایک کرکے نظر آتی ہیں۔ اگر سعادت باہر سے آپ کے پاس آنے میں بخل کرتی ہے تو آپ اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں تلاش کیجئے کیونکہ آپ کا دل تمام کائنات کی اور جو کچھ اس میں ہے ایک چھوٹی سی تصویر ہے۔

آسمان کس قدر خوبصورت ہے، اور شاعر وہی ہے جو اس کی خوبصورتی کے راز کو پالے، اور اپنی نگاہوں سے اس کے نیلگوں اور شفاف جسم سے گزر کر اس بلند دُنیا کو دیکھ لے جہاں تک نگاہیں نہیں پہونچ سکتیں۔

سمندر کس قدر مہیب ہے، اور شاعر وہی ہے جو اس کی عظمت و جلال کو محسوس کرے اور ان کے چمکتے ہوئے صفحات پر ان قوموں کی تاریخ کو پڑھ لے جنھیں وہ اپنی موجوں میں لپیٹ چکا ہے اور ان بستیوں کی تصویر کو دیکھ لے جنھیں وہ تہ و بالا کر چکا ہو اور ان سلطنتوں کے عکس کو پہچان لے، جن کے تختے وہ اُلٹ چکا ہے اور ابھی تک اپنی حالت پر بدستور ہے، نہ بدلتا ہے نہ متغیر ہوتا ہے، اور نہ گردش لیل و نہار سے پُرانا پڑتا ہے۔

رات بہت وحشت خیز ہے، لیکن شاعر وہی ہے جو اس کی خاموشی و سکون میں روتے ہوئے دلوں کی فریاد۔ دردمندوں کی آہوں اور آسمان کی طرف چڑھتی ہوئی دعاؤں کی آواز دل کو سُن لے،

شاعر کو ہر اس چیز میں جسے وہ دیکھتا یا سنتا ہے ایک حسن نظر آتا ہے، یہاں تک کہ مرجھائے ہوئے پھولوں اور گھانس کی سوکھی ہوئی پتیوں، بھنبھناتی ہوئی شہد کی مکھیوں اور آشفتہ سر پروانوں، چیونٹیوں کی قطاروں، ٹوٹی ہوئی دیواروں اور بیٹھی ہوئی قبروں، خوفناک سایوں اور خوشگوار خیالوں، سمندر کے کناروں پر پڑے ہوئے مینڈکوں اور پتھر کے دلمیں پیچ و تاب کھاتے ہوئے کیڑوں تک میں وہ اس حسن کو دیکھ لیتا ہے"۔

اسٹیفن یہ سُنکر تھوڑی دیر تک تو اپنا سر جھکائے بیٹھا رہا اور اسی اثنا میں اس کا دماغ مختلف خیالات کا جولانگاہ بنا رہا پھر سر اُٹھا کر بولا:۔ "اے فرتز، جو کچھ تم کہہ رہے ہو میں اس پر عمل کرنے کی بہت دنوں سے کوشش کرتا رہا ہوں۔ لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ ———— اگر ممکن ہوتا تو میں اپنے اس دل کو اپنے ہاتھوں سے مسل دیتا اور پھر اس کی خاک کو بگولوں کی نذر کر دیتا، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جانتا ہوں کہ میں ایک خاص مدت کے لئے جو میرے لئے مقدر ہو چکی ہے، اس ابتلا میں ڈالا گیا ہوں۔ تاہم میں اسوقت تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم مجھے آج کے بعد سے اس کا ذکر کرتے ہوئے نہیں دیکھو گے اور نہ اس کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے پاؤ گے۔ عشق و محبت کی جو چنگاریاں میرے دل میں دبی ہوئی ہیں، میں خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ان پر قدرت و طاقت عطا فرمائے"۔

———

سکون

محبت ایک ابرِ کرم ہے اور جب یہ کسی پاک سرزمین پر برستا ہے، تو رحمت و شفقت کا پھل لاتا ہے، لیکن یہی قطرہ جب کسی بنجر زمین پر ٹپکتا ہے تو حسد، غضب، شرارت و انتقام کی پیدائش کا سبب ہوتا ہے۔

اسٹیفن نیک طینت انسان تھا۔ چنانچہ اسکے مصائب و آلام جو ہر وقت اس کے دل میں ایک تلاطم بپا کئے رہتے تھے پاکیزہ احساسات میں تبدیل ہو گئے۔ وہ مصیبت زدوں کی مصیبت کو دیکھ کر رونے لگا اور غریبوں کی غربت و احتیاج کا حال سُنکر تڑپنے لگا۔

اس نے اپنے دوست فرتز سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا۔ اور ماجد ولین کا ذکر کرنا چھوڑ دیا، اس نے اپنے دل کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اسے بھول جائے اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے زمانہ کی یاد کو فراموش کر دے۔

اس کی تکلیفیں دل کے ایک خالی گوشے میں سمٹ گئیں اور اگر اس نے انھیں یاد کیا بھی تو اس طرح جس طرح کوئی ڈراؤنے خوابوں میں سے کسی بھولے ہوئے خواب کو کسی نہ کسی وقت یاد کر لیتا ہے اور پھر اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔

اب وہ دور و نزدیک جہاں کہیں کسی مصیبت زدہ کے متعلق سُن پاتا فوراً اس کے پاس جاتا اور اسکی امداد و اعانت کرتا۔ رات کی تاریکی ہو یا دن کی روشنی جس وقت بھی کوئی شخص اس کے دروازے کو اپنی کسی غرض کے لئے کھٹکھٹاتا وہ اس کی دستگیری کرتا، وہ فرتز کے خاندان کو اپنا خاندان سمجھنے لگا۔ ان کے ہر درد اور دُکھ میں ان کا شریک ہو گیا، انھیں کھانے اور پہننے کو دیا اور خود بھی انھیں کے ساتھ رہنے سہنے لگا۔ جو بڑے تھے وہ اسے بھائی اور جو چھوٹے تھے وہ اسے باپ سمجھنے لگے اور ان لوگوں کے ساتھ رہ کر اسکے دل کو وہ مسرت و سکون حاصل ہوا، جسے وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہ کر حاصل کرنے کا آرزومند تھا، اور اپنے پُرانے فن، فنِ موسیقی کی طرف لوٹ گیا جس کی طرف سے گزشتہ حالات و واقعات نے اسے غافل بنا دیا تھا۔

اسٹیفن موسیقی کا کوئی بڑا ماہر نہ تھا، لیکن وہ صاحب دل تھا اور دل ہی وہ پُرجوش سرچشمہ ہے جہاں سے شعر و موسیقی اور تمام فنون لطیفہ کے فوارے اُچھلتے ہیں، اس لئے اس نے بہت سے دل ہلا دینے والے نغمے ایجاد کئے اور اسکی حیثیت ماہر سے زیادہ ایک مخترع کی سی ہو گئی۔

ماجد ولین کا خط سوزان کے نام

میری تو یہی آرزو تھی کہ کو بلانس میں ہم تم دونوں زیادہ دنوں تک ایک ساتھ رہتے اور موت کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکتی۔ لیکن تمھارے شوہر کی یہی مرضی تھی کہ وہ تمھیں لیکر یہاں سے بہت دور

چلے جائیں۔ بہر حال مجھے امید ہے کہ تم اپنے نئے گھر میں بھی اسی طرح خوش و خرم ہو گی جس طرح کو بلآنس میں رہا کرتی تھیں۔
خدا کا شکر ہے میں بھی اچھی ہوں اور تمہاری محرومی دیدار کے علاوہ کوئی دوسری تکلیف نہیں ہے، ایڈورڈ بھی مجھ سے بہت محبت کرتا ہے جس کے لئے میں اس کی ممنون ہوں۔
اے سوزآن تم سے کیا چھپاؤں کہ میں دل ہی دل میں اس غریب نوجوان پر کس قدر کڑھا کرتی تھی، جس پر صرف میری وجہ سے بدبختی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن آج مجھے یہ معلوم کر کے بیحد خوشی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے سیدھے اور معتدل راستے کی طرف لوٹ آیا ہے، اور اپنے اس گھر میں جو اس نے جو تنج میں بنوایا تھا ایک ایسی خاموش اور پرسکون زندگی بسر کر رہا ہے جو رنج و غم کی آمیزش سے خالی ہے، بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اب وہ فن موسیقی سے بیحد دلچسپی لینے لگا ہے اور اس کے تمام لطیف جذبات و احساسات اسی میں صرف ہونے لگے ہیں اور جن لوگوں نے مجھ سے اس کا تذکرہ کیا ہے ان لوگوں کا خیال ہے کہ شاید چند سال بعد ہی وہ اس میں بہت بلند پایہ شخصیت شمار ہونے لگے گا۔ اس لئے میں خدا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا کیونکہ میں یہی سوچا کرتی تھی کہ اگر وہ اسی حالت میں مر گیا تو یقیناً میری زندگی بھی تلخ ہو جائے گی۔
اے سوزآن، ذرا جلدی جلدی لکھا کرو، تمہاری جدائی میں تمہاری باتیں ہی باعث تسکین ہوتی ہیں۔

ماجد ولین کا خط سوزان کے نام

میں تمہیں دلی رنج و تکلیف کے ساتھ یہ خبر بد سناتی ہوں کہ میرے والد خدا انھیں بخشے، پانچ ماہ کی طویل علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے، میں ان کی اس بیماری کے زمانہ میں ولفانخ ہی رہی اور وہیں ان کی تیمارداری کی۔ اب میں چند روز ہوئے کو بلآنس آگئی ہوں اور یہی وجہ تھی کہ تمہارے خطوں کا جواب بھی نہ دے سکی۔ مجھے امید ہے کہ تم میری اس غلطی کو معاف کر دو گی اور اس غم میں میرے ساتھ آنسو بہاؤ گی۔
میں نہیں کہہ سکتی کہ اس حادثۂ جانکاہ نے مجھ پر کیا اثر کیا، لیکن اس مصیبت میں میرے لئے جو چیز کسی قدر صبر و سکون کا باعث ہوئی وہ یہ تھی کہ میری بہت سی سہیلیوں، اور میرے شوہر کے بہت سے دوستوں نے مجھے تعزیت کے بہت ہی نرم و نازک خطوط لکھے اور میرے دل کے غم و اندوہ کو ایک حد تک ہلکا کر دیا، لیکن جس چیز نے مجھے انتہائی تعجب میں ڈال دیا وہ یہ تھی کہ انھی خطوں میں مجھے ایک خط استیفن کا بھی ملا، جس میں میرے والد کے انتقال پر دلی صدمہ کا اظہار کیا تھا، اور ایسے انداز میں مجھ سے خطاب کیا تھا جیسے کوئی اپنے بہترین دوستوں سے خطاب کرتا ہے۔
مجھے اس پر سخت تعجب ہوا اور دل ہی دل میں کہنے لگی کہ یہ شخص ان تمام باتوں کے باوجود جو میرے اور اسکے درمیان ہوئیں، اگر اب بھی اپنے دل میں میری اتنی عزت کرتا ہے تو یقیناً وہ بڑا شریف النفس انسان ہے۔

اے سوزان، کیا تم بھی اس غیر معمولی انسان پر تعجب نہ کرو گی کہ اس کی عقل پر کل تک ہم لوگ ہنسا کرتے تھے اور جسے ہم آشفتہ مزاج لوگوں میں گنا کرتے تھے، اب اس کی حالت کس قدر بدل گئی، اور اب وہ ایسا نیک دل ہو گیا ہے کہ کسی سے کوئی کینہ یا عداوت نہیں رکھتا اور ایک ایسے گناہ کے بخش دینے پر بھی آمادہ ہے، جسے کوئی دوسرا شخص نہیں بخش سکتا اور ایسی برائی کو بھی بھلا سکتا ہے، جسے کوئی دوسرا نہیں بھول سکتا۔

اپنے شوہر سے میرا اور ایڈورڈ کا سلام کہنا، اچھا رخصت، والسلام

ماجد ولین کا خط سوزان کے نام

اے سوزان تم نے مجھے تین مہینے میں صرف ایک خط لکھا، اور وہ بھی پانچ سطروں سے زیادہ نہ تھا میں تمہاری اس کوتاہ نویسی پر کبھی صبر نہیں کر سکتی۔

اے سوزان جب سے میرے والد کا انتقال ہوا ہے، میں اپنے سینہ میں ایک انقباض اور اپنے اندر ایک اضمحلال محسوس کرنے لگی ہوں، اور میں نہیں کہہ سکتی کہ ایڈورڈ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ پہلے کی بہ نسبت میری طرف سے کچھ بدل سا گیا ہے اور اب مجھے اس نگاہ سے نہیں دیکھتا جس نگاہ سے پہلے دیکھا کرتا تھا۔

میں یہ نہیں کہتی کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے، یا مجھ سے تنگ آ گیا ہے، لیکن اس قدر ضرور کہوں گی کہ اب اس کی آنکھوں میں اپنی طرف سے ایک برگشتگی، اور رکاوٹ محسوس کرنے لگی ہوں، جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، اب اس کا کوئی تبسم تصنع کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتا، حالانکہ اس سے پہلے اس میں محبت ہی محبت ہوتی تھی۔ اب ہماری گفتگوؤں میں طویل اور وحشت انگیز وقفے حائل ہونے لگے ہیں حالانکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔

اب یہ کیفیت ہے کہ میں جس چیز کو اچھا کہوں وہ اسے برا سمجھتا ہے، اور جس چیز کو میں برا کہوں وہ اسے اچھا کہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ جان بوجھ کر میری مخالفت کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ دوستوں سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا ہے اور گھنٹوں انھیں کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔

پہلے اگر میں کبھی کسی دوست کے سامنے ہنس دیتی تھی یا کسی کے تبسم کے جواب میں مسکرا پڑتی تھی یا کسی کے ساتھ کچھ بات چیت کرنے لگتی تھی، تو وہ یہ دیکھ کر چپ ہو جاتا تھا اور اس گہری خاموشی کا اثر اس کی آنکھوں اور زبان سے ظاہر ہونے لگتا تھا۔ لیکن اب وہ ان باتوں میں سے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا اور نہ ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ سچ تو ہے کہ غیرت ہی محبت کا دھواں ہے اور جب یہ آگ بجھنے لگتی ہے تو دھواں نکلنا بھی بند ہو جاتا ہے۔

اے سوزان میری ان باتوں سے تم غمگین نہ ہونا بہت ممکن ہے کہ یہ سب میرا وہم و خیال ہو، اور کیا عجب ہے کہ میں چند ہی روز بعد تمہیں لکھوں کہ میں بحمد اللہ خوش و خرم ہوں، اور اب ان توہمات کا کوئی اثر میری طبیعت پر نہیں ہے۔

سوزان کا خط ماجد ولین کے نام

اس میں شک نہیں اے ماجد ولین کہ تم بڑی وہمی ہو، ایڈورڈ یقیناً تم سے بیحد محبت کرتا ہے اور میں تمھیں مشورہ دیتی ہوں کہ تم اپنی ان آشفتہ خیالیوں کے ساتھ کسی کے سمجھنے کی کوشش نہ کیا کرو، کیونکہ یہ بڑی پریشان کن اور تھکا دینے والی بات ہے۔

یاد رکھو کہ سعادت ایک پھول ہے جو اسی وقت تک تر و تازہ رہتا ہے جب تک کہ اس کا دیکھنے والا اسکی خوشنمائی اور خوشبو پر اکتفا کرتا رہے، لیکن جب وہ اس سے بڑھکر اسے چھونے اور ہاتھ لگانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ مرجھا جاتا ہے اور اس کی رونق و خوبصورتی جاتی رہتی ہے۔

زیادہ بجز سلام کے اور کیا لکھوں، خدا حافظ۔

ماجد ولین کا خط سوزان کے نام

پچھلے دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جسے میں تم سے کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چند روز ہوئے مجھے اور ایڈورڈ کو ایک تفریحی جلسے میں شرکت کی دعوت دیگئی اور صاحب جلسہ نے دعوت دیتے وقت یہ بھی کہا کہ اس جلسہ میں ایک بڑا ماہر موسیقی بھی شریک ہوگا، ہم نے اس کا نام معلوم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا۔

چنانچہ میں اس جلسہ میں گئی اور میرے جانے کا اس کے علاوہ کوئی اور مقصد ہی نہ تھا کہ میں موسیقی کے اس ماہر کو دیکھوں اور اس کے گانے سنوں، چنانچہ میں برابر پیانو کی کرسی کی طرف نگاہیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہی تھی کہ ایک دُبلا پتلا سانولے رنگ کا نوجوان، ان لوگوں میں سے نکل کر اس کرسی کی طرف بڑھا یہ اسٹیفن تھا۔

میرے لئے اس کو پہچان لینا کوئی آسان کام نہ تھا، کیونکہ اب وہ پہلا پریشان حال انسان نہ تھا، بلکہ ایک دوسرا انسان تھا نہایت خوش طبع، خوش پوشاک اور خوش اخلاق۔

اس کے بعد اس کی اُنگلیاں پیانوں کے تاروں سے کھیلنے لگیں، ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ اس کے تاروں سے نہیں بلکہ دلوں اور جذبات سے کھیل رہی ہیں۔ اسی اثنا میں وہ نہایت ہی پر درد اور پر سوز لہجے میں گانے لگا، ہم سُن رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا ہم اس دُنیا سے کسی دوسری دنیا کی طرف منتقل ہو گئے ہیں اور یہ جو کچھ ہم سُن رہے ہیں اس عالم آب و گل کی آواز نہیں ہے بلکہ کسی اور دُنیا کی چیز ہے، یہاں تک کہ جب وہ آخری گیت پر پہونچا تو حاضرین نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس کی تعریف کرنے لگے۔

وہ بھی ان کی اس تعریف اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا رہا، اور بیچ بیچ میں ایک ایسے عجیب اور پر سکون تبسم کیساتھ

مسکرا تا رہا کہ اس کی طرف دیکھنے والا یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ بہ تکلف مسکرا رہا ہے۔ لیکن مجھے اس کے اس تبسم میں کسی اندرونی غم کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

جس وقت میں نے اور ایڈورڈ نے اسے مبارکباد دی، تو میں سمجھی کہ وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر منھ پھیر لیگا، لیکن جوں ہی اسکی نگاہ ہم دونوں پر پڑی، ایک ہلکی سی کپکپی تو ضرور اسکے ہونٹوں میں پیدا ہوئی، لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گیا اور ایسے سکون واطمینان کے ساتھ ہم سے باتیں کرنے لگا جیسے وہ کسی ایسے سلسلۂ کلام کو ختم کر رہا ہے جو پہلے سے ہمارے اور اس کے درمیان جاری تھا۔

اس کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کے اور ہمارے درمیان وحشت واجنبیت کی خلیج کم ہوتی گئی چنانچہ ہم نے اس سے مختلف موضوع پر گفتگو کی اور ایڈورڈ نے اس سے وعدہ کیا کہ عنقریب اس کی ملاقات کے لئے اس کے گھر آئے گا۔ اس کے بعد ہم لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

ماجد ولین کا خط سوزان کے نام

اے سوزان میرے سینے کے انقباض اور غم والم کا وہی عالم ہے۔ ایڈورڈ، اپنی عنایتوں کے لحاظ سے مجھ سے جس قدر قریب ہے، اپنے دل اور جذبات کے لحاظ سے اسی قدر دور ہے۔ اس نے اپنے دل کے خالی حصوں کو مختلف کیفیتوں سے بھر رکھا ہے، جنھیں نہ میں جانتی ہوں نہ سمجھتی ہوں اور محبت کے لئے صرف ایک چھوٹا سا کونہ رہنے دیا ہے، جہاں محبت کے لطیف جذبات گھٹتے سے محسوس ہوتے ہیں، اب میرے ساتھ اس کی محبت بہت سرد ہو گئی ہے، اور شاید وہ اس محبت سے زیادہ نہیں جو وہ اپنے گھوڑوں، اپنے محلوں اور باغوں سے رکھتا ہے۔

میں جانتی ہوں کہ اگر وہ اس سے زیادہ محبت کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کا نفس ایسا روشن اور پر شعور نفس نہیں ہے جو محبت کی راہوں میں سے ہر راہ پر چل سکے، وہ محبت کے صرف اُن مادی مفہوم کو جانتا ہے جس سے ایک حیوان بھی ناواقف نہیں۔

اور میری عزیز بہن، سچ تو یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے اُن ایام میں جو اس کے ساتھ گزارے باوجود اس سے محبت کرنے کے ایک دن بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میرا دل اس کے دل سے مل گیا ہے بلکہ ہمیشہ یہی خیال کرتی رہی کہ اگرچہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے، تاہم وہ میرے دل میں اس لطیف اور شاعرانہ محبت کا شعلہ روشن کرنے سے قاصر ہے جسکے بغیر ایک عورت اپنے شوہر سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔

میں بہت روز سے ایسا محسوس کر رہی ہوں گویا تمام دنیا سے دور ایک ایسے کونہ میں پڑی ہوئی ہوں جہاں نہ کوئی بات کرنے والا ہے نہ سننے والا۔ اس لئے جس وقت مجھے کوئی فکر ستاتی ہے یا کسی رنج و خوشی کی خبر کو سنکر میرے

دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے، تو میں ان میں سے کوئی چیز بھی اس سے بیان نہیں کر سکتی کیونکہ وہ اُسے سنکر یا تو سمجھیگا نہیں یا اسے حقیر سمجھ کر مجھے بھی حقیر سمجھنے لگے گا، اس لئے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا کہ میں اسے اپنے دل میں گھونٹ گھونٹ کر رکھوں۔

اے سوزان، کیا اب بھی تم یہی سمجھتی ہو کہ مجھے تمھاری احتیاج نہیں ہے اور میرے پاس آنے کی تمھیں کوئی ضرورت نہیں۔

سوزان کا خط ماجد ولین کے نام

میں دیکھتی ہوں کہ تم اپنے ہر خط میں اسٹیفن کا ذکر کرتی ہو۔ شاید تم اس چیز کو بھول گئی ہو کہ اب وہ تمھارے لئے ایک غیر آدمی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ تمھارا دیرینہ تعلق کبھی کا ختم ہو چکا ہے، مجھے ڈر ہے کہیں تمھارے اس رنج کا سبب اسٹیفن کی وہ ملاقات تو نہیں ہے جس کا ذکر تم مجھ سے کر چکی ہو، کیونکہ مجھے یاد نہیں آتا کہ آج سے پہلے بھی مینے تمھیں کبھی ایڈورڈ کی شکایت کرتے سُنا ہو، یا اس کے ساتھ رہنے میں اس حد تک بیزاری محسوس کی ہو، میں جو کچھ کہہ رہی ہوں تم اس سے متوحش نہ ہونا، کیونکہ نہ میں تم پر کوئی تہمت لگاتی ہوں، اور نہ تمھارے بارے میں، جیسا کہ تم خود جانتی ہو کوئی شک و شبہ رکھتی ہوں۔ لیکن مجھے تمھاری طرف سے اس قدر اندیشہ ضرور ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو تمھارے ماضی کی یاد تمھارے حال سے ٹکرائے اور اس طرح تم نہ ماضی کو پا سکو اور نہ حال سے فائدہ اُٹھا سکو۔

ماجد ولین کا خط سوزان کے نام

جس غم کو میں اس وقت اپنے اندر پاتی ہوں، اس کا اسٹیفن سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور میرے اور اس کے درمیان جو تعلق ہے وہ ان دو دوستوں کے تعلق سے زیادہ نہیں ہے، جن میں سے ایک نے دوسرے کے لئے انتہائی مصیبتیں اور تکلیفیں اُٹھائی ہوں اور اس دوسرے شخص نے اس کے ان احسانات کے بدلے میں اسکا صرف شکریہ ادا کیا ہو۔

تم اپنے خط میں جس چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہو، میں سمجھتی ہوں کہ اس کا میری طبیعت پر کوئی اثر نہیں ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ خود اس کی طبیعت پر بھی اس کا کوئی اثر نہ ہوگا، کیونکہ اس رات کے علاوہ جس کا ذکر تم سے کر چکی ہوں میں اس سے دو مرتبہ اور بھی مل چکی ہوں۔ مگر مینے اس کی نگاہوں میں یا اس کی گفتگو میں گزشتہ محبت کا کوئی نشان نہیں دیکھا غم کی ایک ہلکی سی جھلک اس کی آنکھوں میں ضرور نظر آتی ہے، لیکن غالباً وہ غمگین و افسردہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس کے گزشتہ غم کی تصویر ہے جو زمانہ نے اس کے چہرہ پر کھینچی تھی اور اب اک دھندلے خاکہ کی طرح باقی رہ گئی ہے۔ جس طرح

زخم کے مندمل ہو جانے کے بعد اس کا نشان رہ جاتا ہے۔

اس لئے اے سوزان تم مطمئن رہو، میرے متعلق تمہاری رائے آج بھی وہی ہونا چاہئے جو کل تک رہی ہے۔ اور میرے اور تمہارے درمیان جو یہ بعد ہے، اسے میرے اور تمہارے نفس کا حجاب نہ بن جانا چاہئے۔

اسٹیفن کی ترقیاں

اسٹیفن کی شہرت عام ہو گئی، اور اس کا شمار موسیقی کے ماہروں میں ہونے لگا۔ جو تنیج اور اس کے قرب و جوار سے لیکر کوبلانس تک بہت سے گانے والوں اور اداکاروں نے اس کے گاؤں میں آکر اس سے ملاقاتیں کیں اور گانے کی فرمائشیں کیں اور اس طرح دولت کے دروازے اس پر کھل گئے۔ اس کا باپ بھی مر چکا تھا اور جو کچھ اسنے چھوڑا اس کا وارث بھی وہی ہوا۔ چنانچہ جب وہ کسی کام سے ایک دو روز کے لئے کوبلانس جاتا تو اپنے ہی گھر میں قیام کرتا، اور وہیں اس کے دوست احباب اور اس کے معتقدین اسکی ملاقات کو آیا کرتے۔

اسے اپنی زندگی کے اس نئے راستہ میں ایک قسم کا سکون ملنے لگا تھا، لیکن اس کے باوجود بسا اوقات ان کی تنہائی و خاموشی میں تمام گزشتہ باتیں اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتیں کبھی وہ رات اس کو یاد آجاتی جب وہ کوبلانس سے بے یار و مددگار مارا مارا نکلا تھا، اور کبھی وہ رات جب وہ ماجد ولین کو دیکھنے کے لئے سوزان کی شادی میں گیا تھا اور ایک مہمان نے اس کے چہرے پر کوڑا مار کر اسے زخمی کر دیا تھا، کبھی اس رات کا خیال آجاتا جو اس نے اپنے ایک عزیز کے مرنے پر انتہائے خوف و ہراس کے عالم میں اس کے گھر گزاری تھی، اور کبھی اس رات کا جو اس نے ماجد ولین کی سیڑھیوں کے نیچے پڑے پڑے صبح کر دی تھی اور وہ اپنے شبستان عیش میں لیٹی ہوئی ایڈورڈ سے مصروف راز و نیاز تھی اور پھر اسکے سامنے کبھی اس کے بھائی کی تصویر آجاتی، کہ وہ میدان جنگ میں گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے پڑا ہوا ہے، گھوڑے اسے روند رہے ہیں اور اس کے جسم کو چھلنی بنا رہے ہیں، اور کبھی اس کی نگاہوں میں ماجد ولین کی صورت پھر جاتی کہ وہ ایڈورڈ کے ساتھ اپنے باغ کی بنچ پر بیٹھی ہوئی محبت کی سرگوشیاں کر رہی ہے۔

غرض اس طرح اس کی بدقسمتی کے دن اور بدنصیبی کی راتیں ایک ایک کرکے اس کے سامنے سے گزر جاتیں، اس کے بعد اس کی امیدوں کا باغ اپنی پوری تازگی و شادابی کے ساتھ اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتا، لیکن پھر فوراً ہی اسے دکھائی دیتا کہ حوادث کی باد سموم نے اس کے سبزہ زاروں کو خشک اور اس کے پھولوں کو کملا دیا ہے اور وہ ایک گرم و خشک ریگستان کی طرح نظر کے سامنے ہے۔ جہاں نہ شاخیں جھومتی ہیں، نہ پرندے چہچہاتے ہیں۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا کہ وہ تن تنہا عالم اور اس کی نیرنگیوں سے بہت دور زندگی بسر کر رہا ہے، کیونکہ ماجد ولین اس کے پاس نہیں ہے اور یہ مال و دولت اور یہ ثروت و عزت جو اسے حاصل ہے بے حقیقت ہے اور جو گیت وہ گاتا ہے وہ فی الحقیقت اسکی ناکام آرزو کا ماتم ہے۔

اس کا دل حسرت و اندوہ سے پگھل جاتا اور خوب روتا، یہاں تک کہ اس کا غم کچھ ہلکا ہو جاتا اور وہ پھر زندگی کی عام راہوں پر چلنے لگا۔

اس کی زندگی کے دن اسی طرح گزرتے گئے، یہاں تک کہ ماجد ولین سے اس کی وہ ملاقات ہوئی جس کا ذکر ماجد ولین نے سوزان کے خط میں کیا تھا، وہ اسے دیکھ کر خوش ہوا، لیکن اس خوشی میں اس کے ساتھ گزرے ہوئے زمانہ کی یاد کا رنج بھی شامل تھا۔ تاہم اس نے صبر و ضبط سے کام لیا اور اپنے جذبات کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔

کچھ روز بعد ایڈورڈ اپنے وعدے کے مطابق اس کی ملاقات کے لئے اس کے گھر گیا اور اپنے طرز عمل پر معافی کا خواستگار ہوا۔

دوسرے دن، سٹیفن اس کی بازدید کے لئے اس کے گھر پہونچا اور ماجد ولین سے بہت فراخدلی کے ساتھ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی وہ اس سے اپنے بعض دوستوں کے یہاں برابر ملتا رہا۔ نیز پبلک جلسوں میں اور کبھی ایڈورڈ کے یہاں اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ غرض وہ جب بھی ملتا اور جہاں بھی ملتا بڑی محبت سے ملتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ وہ اس سے تنہائی میں نہ ملے اور نہ معمولی بات چیت کے علاوہ اس سے کسی دوسری گفتگو کا موقعہ آئے، کیونکہ وہ گزشتہ زمانہ کو بھلا دینے پر آمادہ ہو چکا تھا اور اب اسے اپنے سینے کی دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے ہوا دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس کے علاوہ وہ دل ہی دل میں اسکی ان بیوفائیوں پر جو اس نے اسکے ساتھ کی تھیں، ہمیشہ ناراض رہتا تھا اور وہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ اس کی گفتگو یا اس کی نگاہوں میں اس غم کے اثر کو محسوس کرلے، کچھ تو اپنی خودداری اور خودپسندی کی خاطر اور کچھ اس خیال سے کہ جب وہی میری پروا نہیں کرتی تو پھر میں کیوں کروں، اور جب وہی اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم نہ رہی تو میں کیوں رہوں۔

الغرض یہ کہ اس کے ساتھ اُس کا معاملہ کچھ اس قسم کا تھا کہ ایک ہی وقت میں دو مختلف جذبات اسکے دل میں موجود رہتے۔ ایک جذبہ محبت اور دوسرا جذبہ ناراضگی، وہ اس سے محبت بھی کرتا، اور اپنے اختیار سے اسے چھوڑ بھی نہ سکتا — اس سے ناراض بھی رہتا اور یہ بھی نہ چاہتا کہ اسکی محبت کا اسے علم ہو۔

ماجد ولین کے حالات میں تبدیلی

ایڈورڈ کا ملال روز بروز بڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنے گھر سے بھی تنگ آگیا اور وہ تمام ان چیزوں سے اپنا دل بہلانے لگا جن سے کمزور طبیعتیں اپنی تنگدلی اور کبیدگی کا علاج چاہتی ہیں۔ چنانچہ اسنے جوا کھیلا، شرابیں پیں اور کبھی کبھی راتوں کو گھر سے باہر بھی رہنے لگا۔

ماجد ولین پر یہ باتیں بہت شاق گزریں، اسے ان باتوں کا سخت صدمہ ہوا اور اس کی نگاہوں میں مادیت

کے وہ تمام مظاہر جو اسے تھوڑی دیر پہلے بہت محبوب تھے، ایک ایک کرکے مکروہ معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ رقص گاہوں اور محفلوں میں اسنے شریک ہونا چھوڑ دیا، نمود و نمائش کو ٹھکرا دیا اور زیبائش و آرائش سے بھی دل برداشتہ ہوگئی۔ وہ دن رات اسٹیفن کے اس جملے کو دہراتی رہتی جو اسنے اپنے پچھلے کسی خط میں لکھا تھا کہ "اے ماجد ولین کبھی یقین نہ کرنا کہ اس دُنیا میں محبت کے علاوہ کوئی دوسری سعادت بھی ہو سکتی ہے اور اگر تم ایسا کروگی تو یقین جانو اپنے دل کی موت پر آپ دستخط کر دوگی"۔

اِس عالم بدنصیبی میں اگر کوئی چیز اس کے لئے باعث تسلی ہو سکتی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ وہ کبھی کبھی اسٹیفن کو دیکھ لیتی تھی، اس کی مجلسوں میں شریک ہو جاتی تھی، اور اس کی باتوں میں اب بھی وہ ملکوتی تصورات دیکھتی تھی جو ایک زمانہ تک اسے مسحور کر چکے تھے اور جب سوچتی کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی میں اسکے پاکیزہ اور شریف دل کی مالک رہ چکی ہے تو وہ خود اپنے اوپر فخر کرنے لگتی اور اس طرح گزشتہ زمانے کی خوش نصیبی کی یاد موجودہ بدبختی کی تلخیوں کو کچھ کم کر لیتی۔

ماجد ولین کا خط سوزان کے نام

چند روز ہوئے مجھے ایک خوفناک راز کا علم ہوا ہے۔ کاش مجھے اسکی خبر نہ ہوتی اور کاش میں اسکے سننے سے پہلے ہی مر گئی ہوتی۔

ایڈورڈ مفلس و قلاش ہوگیا، اس نے اپنی تمام جائداد فروخت کر دی، تاہم اس پر ابھی کچھ قرض اور باقی ہے جس کی ادائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اب میرے لئے اپنے جواہرات اور قیمتی کپڑوں کا فروخت کرنا ناگزیر ہے۔ شاید اسی طرح ہم اپنے رہنے کے مکان کو قرض خواہوں کی دستبرد سے محفوظ رکھ سکیں، مجھے کچھ نہیں معلوم کہ اس کے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا۔

گزشتہ رات مینے خود ہی ان حالات سے متعلق دریافت کیا۔ پہلے تو اس نے ٹالدینے کی کوشش کی آخر مجبور ہوکر اعتراف کیا کہ سب کچھ جوئے کی نذر ہو چکا ہے۔ میں نے اسکی ان حرکتوں پر اپنی ناراضی کا اظہار تو ضرور کیا، لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے اُسے کوئی سخت بات نہیں کہی۔ مگر اے سوزان تمھیں معلوم ہے اسنے مجھے کیا جواب دیا؟ کہنے لگا کہ "میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی غلطی کی ہے اور وہ یہ کہ میں نے ایک ایسی فقیر و محتاج لڑکی سے شادی کی جو مصیبتوں میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتی"۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے بہت ٹھیک کہا۔ کیونکہ ایک مالدار مرد کے لئے ضروری ہے کہ ایک مالدار لڑکی سے شادی کرے اور اسی طرح ایک فقیر لڑکی کیلئے بھی یہی مناسب تھا کہ ایک غریب مرد سے شادی کرے تاکہ دونوں کا معیار زندگی برابر رہے۔

اے سوزان، میں اپنی حالت پر نہیں روتی کیونکہ مینے تو اپنی زندگی کے اکثر دن فقر و احتیاج میں گزارے ہیں، بلکہ اس ننھی سی غریب جان پر روتی ہوں جو میرے شکم میں پرورش پا رہی ہے اور جسے شاید کل ہی فقر و احتیاج اور ذلت و بدبختی کے ساتھ جینا پڑے۔ اب تو میں ہر وقت خدا سے ناگہانی موت طلب کرتی ہوں، جو میرا اور اس کا جلد سے جلد خاتمہ کر دے۔

نیلگوں کمرہ

اس مصیبت کا ایڈورڈ کی طبیعت پر اسقدر گہرا اثر ہوا کہ وہ بیمار پڑ گیا اور ایسا سخت بیمار ہوا کہ مرنے کے قریب پہونچ گیا۔ لیکن زندگی کے دن ابھی کچھ اور باقی تھے، اس لئے بچ گیا، اور جوں ہی اس کی حالت ذرا بہتر ہوئی، فوراً ہی اسٹیفن نے جو کہ اس کی علالت کے زمانہ میں اس کے بستر کے پاس سے نہ ٹلتا تھا اور اس مصیبت میں اس کی ہر ممکن امداد و اعانت کرتا رہا تھا، اُس کو اپنے ہمراہ جوتنج لیجانے کی خواہش کی تاکہ اس کا دل ذرا بہل جائے۔ چنانچہ وہ راضی ہو گیا اور ماجد ولین بھی ان دونوں کے ہمراہ روانہ ہو گئی۔ یہاں تک کہ جب گاڑی گاؤں کے قریب پہونچی تو فرتز، اس کی بیوی اور اس کے بچوں نے دریا کے کنارے بڑے جوش و مسرت سے استقبال کیا۔

اسٹیفن نے بڑھکر فرتز سے ہاتھ ملایا اور دونوں دو عزیز دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے گلے ملتے رہے۔ پھر اس نے جوز فائن کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اس کے بچوں کو اپنے سینہ سے لگا کر انھیں پیار کرتا رہا، وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "اس مرتبہ تو آپ نے بہت دن لگا دئے ہمیں ڈر تھا کہ ہمیں چھوڑ کر وہیں نہ رہنے لگیں"۔

ان میں سے بڑا لڑکا جسکی عمر اسوقت تیرہ سال کی تھی اسٹیفن سے کہنے لگا: "دیکھئے یہ وہی نئی چادر اوڑھے ہوئے ہوں جو آپ نے میرے لئے بھیجی تھی"۔ اسٹیفن کہنے لگا: "اب تو تم بغیر دوسرے کی مدد کے خود ہی بادبان کھول لیتے ہوگے؟" کہنے لگا "جی ہاں، بلکہ ہوا کی تیزی کے وقت خود ہی اُسے لپیٹ بھی لیتا ہوں"۔۔ ان میں سے جو منجھلا تھا اور جس کی عمر اسوقت کوئی نو برس کی تھی اسٹیفن سے کہنے لگا: "ہماری جوتیاں تو پُرانی ہو چکی ہیں، کیا آپ ہمارے لئے نئی جوتیاں لائے ہیں!" اسٹیفن کہنے لگا: "ہاں میں تم سب لوگوں کے لئے بہت خوبصورت جوتے اور اچھے اچھے ٹوپ لایا ہوں"۔ یہ سنکر انکے چہرے خوشی سے چمکنے لگے، اور وہ سب اپنی ماں کے چاروں طرف جمع ہو کر اُسے یہ خوشخبری سُنانے لگے۔

سب سے چھوٹی بچی اسٹیفن کی چادر سے لپٹ گئی اور بولی: "آپ نے جو بکریاں دی تھیں اس کے ایک ننھا سا بچہ ہوا ہے اس کا رنگ سفید اور آنکھیں کالی ہیں ہمارے ساتھ چلو ہم تمھیں دکھائیں"۔ اسٹیفن یہ سُنکر مسکرانے لگا اور اسے چمٹا کر کہنے لگا:۔ "اچھا نکٹورین، میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں"۔ اسکے بعد وہ ماجد ولین کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا "یہ سب لوگ مجھ سے بیحد محبت کرتے ہیں اور میں بھی اب ان لوگوں میں اسی طرح رہتا ہوں گویا اپنے خاندان اور بال بچوں میں رہا ہوں"

ماجد ولین یہ سُنکر کانپ گئی اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا، اس کے بعد سب لوگ کشتی میں سوار ہو گئے اور چھوٹا ملاح کشتی کے بادبان کھولنے کے لئے آگے بڑھا اور اسٹیفن کو مخاطب کر کے کہنے لگا: دیکھئے جناب اب میں بغیر کسی کی مدد کے خود ہی بادبان کھول رہا ہوں"۔ اسٹیفن نے کہا: "شاباش میرے بیٹے بہت خوب"۔ اسکے بعد کشتی چلی اور دریا کے دوسرے کنارے سے جا لگی۔ ایڈورڈ، اسٹیفن کے بازو کا سہارا لیکر کشتی سے اُترا، اور سب لوگ ٹہلتے ہوئے گھر کی طرف جانے لگے کیونکہ وہ قریب

ہی ایک بلند ٹیلے پر واقع تھا۔ اس گھر کی کنجی فرتز کے پاس رہا کرتی تھی اسلئے اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور دروازہ کھلنے پر سب لوگ پائیں باغ میں داخل ہوگئے۔

سب سے پہلے ماجدولین کی نگاہ باغ کی چہار دیواری پر پڑی، اس نے دیکھا کہ دیواریں اندر سے چاروں طرف بنفشہ کے پھولوں کا ایک خوبصورت لباس پہنے ہوئے ہیں اور اسے اسٹیفن کا وہ خط یاد آگیا جو اس نے پانچ سال ہوئے ایڈورڈ سے شادی ہونے سے کچھ پہلے بھیجا تھا اور لکھا تھا کہ اس نے اس کے لئے جو گھر بنوایا ہے اس کے چاروں طرف بنفشہ کے وہی پھول ہیں جنھیں وہ بہت پسند کرتی ہے۔

جب وہ ذرا اور آگے بڑھی تو اسے باغ کے درمیان پانی کا ایک حوض نظر آیا اور اسکے چاروں طرف وہ جنگلہ دیکھا جس کے متعلق اسٹیفن نے اپنے کسی خط میں لکھا تھا کہ اس نے حوض کے چاروں طرف اپنے بچوں کے گر جانے کے خیال سے نصب کرایا ہے۔ پھر اس نے باغ کے ایک کونے میں ایک بڑی سی بنچ بچھی ہوئی دیکھی جس میں دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی اور اس کے دوسری طرف قریب ہی بچوں کے لئے ایک چھوٹا سا پالنا لٹک رہا تھا۔

اسوقت اسے اپنی ذلت و رسوائی کا احساس ہوا، اور دل ہی دل میں کہنے لگی: "اس نے مجھے معاف نہیں کیا ہے وہ مجھ سے بکشادہ پیشانی صرف اس لئے ملتا ہے کہ مجھے حقیر و ذلیل سمجھتا ہے اور اس قابل بھی نہیں جانتا کہ میرے کسی گناہ کا بدلہ لے اور جن پُرلطف نگاہوں سے وہ مجھے دیکھتا ہے وہ حقیقت میں ایک بڑے آدمی کی رحم آلود نگاہیں ہیں، جنھیں وہ ایک بدبخت انسان پر صرف اس لئے ڈالتا ہے کہ وہ اس کی رحمت و شفقت کا محتاج اور امیدوار ہے" ان خیالات نے اس کی طبیعت پر بہت برا اثر کیا اور وہ غمگین ہوگئی۔

اسٹیفن نے باغ میں ایک طرف اپنے سونے بیٹھنے اور دوستوں سے ملاقات کے لئے چند کمرے بنوائے تھے اور باقی تمام گھر کو یوں ہی خالی چھوڑ دیا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں ان چیزوں کو دیکھ کر اس کے گزشتہ جنون کی یاد پھر سے تازہ نہ ہو جائے وہ نہ کبھی اس طرف جاتا اور نہ اس میں ٹھہرتا۔ چنانچہ انھیں کمروں میں سے ایک کمرہ اس نے ایڈورڈ کے لئے بھی مخصوص کر دیا۔

اب رات ہو چکی تھی اور فرتز اور اس کے بیوی بچے اپنے گھر کو جا چکے تھے اور باغبان بھی اپنی کوٹھری میں جا چھپا تھا اور تنہا اسٹیفن، ماجدولین کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور اس جُدائی کے بعد اس سے تنہائی میں ملنے کا آج یہ پہلا موقعہ تھا، چنانچہ اس کے ذہن میں گزشتہ خوش نصیبی کی مٹی ہوئی تصویر پھر سے اُبھرنے لگی، اور اپنے دل میں کہنے لگا: "ہاں یہ وہی گھر ہے اور وہی باغ ہے، یہ وہی سبزہ ہے اور وہی پیڑ ہیں، یہ وہی رات ہے اور وہی چاند ہے اور یہ وہی آسمان ہے اور وہی چاندنی ہے یہ پانی کا وہی حوض ہے جس میں مچھلیاں دوڑتی پھر رہی ہیں اور یہ وہی ماجدولین ہے جو میرے پاس بیٹھی ہوئی ہے اور میرے اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں، لیکن میں اپنا ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھا سکتا بلکہ نظر بھر کر بھی اسے

نہیں دیکھ سکتا، کیونکہ اتنی سخت قربت کے باوجود بھی میرے اور اس کے درمیان وہ بعد ہے جو میرے اور افق پر چمکتے ہوئے اُس ستارے کے درمیان!

وہ اس خیال میں دیر تک مستغرق رہا، آخر ماجد ولین نے خود ہی گفتگو کی ابتدا کی اور بولی: "اے اسٹیفن تمہارا گھر کس قدر خوبصورت ہے اور اس کا نظارہ کیسا دلفریب ہے"۔ اسٹیفن سمجھا کہ وہ اس کے ساتھ مذاق کر رہی ہے اور اسکے غموں کو بے حقیقت سمجھ کر اس آزادی و بیباکی سے اُنھیں یاد دلانا چاہتی ہے۔ چنانچہ غیر شعوری طور پر اس کے دل میں وہ چیز آگئی جو خود اس کے ضمیر کے خلاف تھی اور کہنے لگا: "جو شخص ایسے خوبصورت اور عظیم الیشان محل میں رہتا ہو جس میں تم رہتی ہو وہ اس مختصر جھونپڑی کی کیا پروا کر سکتا ہے"۔ ماجد ولین یہ سمجھی کہ وہ اسے طعنہ دے رہا ہے۔ چنانچہ اس خیال سے وہ اپنے دل میں آزردہ تو ضرور ہوئی لیکن اس آزردگی میں راحت و مسرت کی ایک خفیف سی آمیزش بھی تھی کیونکہ اس طرح اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی یاد اس کے ذہن سے ابھی تک محو نہیں ہوئی ہے اور اس گزشتہ محبت کا کچھ نہ کچھ اثر ابتک اسکی طبیعت پر قایم ہے۔ چنانچہ اس نے ارادہ کیا کہ وہ اسکے دل کی گہرائیوں تک پہونچ جائے اور کہنے لگی: "انسان خواہ کتنے ہی چھوٹے سے گھر میں کیوں نہ رہے لیکن اگر وہ وہاں خوش ہے تو وہ چھوٹا سا گھر عالیشان اور خوبصورت محلوں سے کہیں بڑھکر ہے"۔

اسٹیفن نے یہ سُنکر ایک حسرت بھری نگاہ سے اس کی طرف دیکھا گویا یہ کہہ رہا تھا کہ "نہیں وہ خوش قسمت نہیں ہے، بلکہ روئے زمین پر سب سے زیادہ بدنصیب انسان ہے"۔ لیکن اس سے پہلے کہ ماجد ولین کو اس کی خبر ہو اس نے اپنی نگاہیں فوراً نیچے کر لیں اور خاموش رہا۔ اس کے بعد وہ بہت دیر تک اس کے ساتھ مختلف قسم کی باتیں کرتی رہی۔ یہاں تک کہ جب رات کا ایک حصّہ گزر گیا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور اسٹیفن بھی اس کے ساتھ ساتھ اُٹھ بیٹھا، اور دونوں باغ میں تھوڑی دور تک ٹہلتے ہوئے چلے گئے یہاں تک کہ وہ اس زینے کے قریب سے ہو کر گزرے جو بالائی منزل کی طرف جاتا تھا۔

ماجد ولین اسے دیکھ کر کہنے لگی: "کیوں اسٹیفن کیا تم مجھے اجازت دیتے ہو کہ میں اوپر چڑھ کر تمھارے گھر کو دیکھ آؤں، اور اگر تم بھی میرے ساتھ اوپر چلو تو بڑی مہربانی ہوگی"۔ پہلے تو اسٹیفن کچھ پریشان سا ہوا پھر کہنے لگا: "آپ کی مرضی" اور اسے ساتھ لیکر اس زینہ پر چڑھنے لگا جس پر پانچ سال سے اس نے قدم نہیں رکھا تھا اور اوپر پہونچکر وہ پہلے کمرے کی طرف گیا اور اس کا دروازہ کھول کر کہنے لگا: "یہ وہ کمرا ہے جسے میں نے اپنے بیٹھنے اور اپنے مطالعہ کے لئے بنوایا تھا لیکن اب مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ باغ کے کمروں میں سے ایک کمرہ مینے اپنے لئے منتخب کر لیا ہے"۔ پھر اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور کہنے لگا "یہ وہ کمرا ہے جسے مینے تمھارے والد مرحوم کے لئے اس وقت بنوایا تھا جب میرا خیال تھا کہ وہ اس گھر میں ہمارے ساتھ رہا کریں گے۔

اس نے دیکھا کہ اس کمرے کا فرش بہت خوبصورت اور سامان بہت عمدہ ہے اور پھولوں کے گلدان بھی رکھے ہوئے

ہیں۔ جنکے سوکھے ہوئے پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں کمرے میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اپنے والد کو یاد کرکے اسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس کے بعد وہ تیسرے کمرے کی طرف بڑھا، اس کی کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر فوراً ہٹا لیا اور بہت ہی پست اور دبی ہوئی آواز میں کہنے لگا:

"اے ماجد وکین، مجھے معاف کرنا میں اس کمرے کو کھولنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا، کیونکہ یہ وہی کمرہ ہے جسے میں نے اپنے بھائی اوجین کے لئے بنوایا تھا اور میں عہد کرچکا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں اسکے دروازوں کو نہیں کھولوں گا۔"

اس کی اس کیفیت نے ماجد وکین کے دل پر بڑا اثر کیا اور کہنے لگی: "کیوں اسٹیفن، کیا تم ابھی تک اوجین کے لئے غمگین ہو" وہ بولا: "ہاں، یہ وہ غم ہے جو تا زیست مجھ سے مفارقت نہیں کرسکتا۔"

اس کے بعد وہ سب سے آخری کمرے کی طرف بڑھا اور بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ کنڈی ہٹا کر دروازہ کھول دیا، اور خود ایک طرف کو ہٹ کر خاموش کھڑا ہوگیا۔

ماجد وکین نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور سب کچھ سمجھ گئی۔

یہ ایک وسیع و خوبصورت کمرہ تھا جس کی دیواریں نیلے رنگ سے رنگی ہوئی تھیں، زمین پر نیلا فرش بچھا ہوا تھا، ایکطرف مسہری بچھی ہوئی تھی، جس پر نیلے رنگ کی ریشمیں چادر پڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف خوبصورت سی میز رکھی ہوئی تھی، جس پر آرائش کی چیزیں سلیقے سے چنی ہوئی تھیں اور وہیں قریب ہی کپڑے رکھنے کی ایک الماری تھی، اور ایک قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا، اور دو شخصوں کے لایق ایک بڑا سا صوفا بچھا ہوا تھا۔ اسکے علاوہ چند اور نیلے رنگ کی کرسیاں بھی تھیں جو قرینے سے رکھی ہوئی تھیں، لیکن ان تمام چیزوں کے اوپر غبار کی ایک ہلکی سی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ وہی نیلا کمرہ ہے جس کا ذکر اسنے اپنے پچھلے خطوں میں کیا تھا اور بتلایا تھا کہ اس نے ماجد وکین کی شب خوابی کے لئے ایک کمرہ بنوایا ہے، اور اس کے لئے یہ رنگ صرف اس لئے پسند کیا ہے کہ وہ بنفشہ کے پھولوں کا رنگ ہے جسے وہ بہت دوست رکھتی ہے۔

ماجد وکین نے یہ دیکھ کر دل میں ایک جھٹکا سا محسوس کیا اور بے چین ہوگئی۔ اس نے اسٹیفن کی طرف دیکھا تو وہ سر نیچا کئے ہوئے خاموش کھڑا تھا اور آنسو بہ کر اسکے رخساروں پر گر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کا طوفان اُمنڈ آیا اور اسکے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیکر کہنے لگی: "اے اسٹیفن تمھیں کیا ہوگیا ہے" اسٹیفن نے آہستگی سے اپنے ہاتھ کو ماجد وکین کے ہاتھوں سے کھینچ لیا اور کہنے لگا: "کچھ نہیں! مجھے میرے بھائی اوجین کی یاد نے اسوقت بےچین کر دیا تھا" یہ کہکر اس نے اُسے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا، چنانچہ وہ دونوں اوپر سے نیچے اُتر آئے اور اپنی پہلی جگہ پر جاکر بیٹھ گئے۔

ماجد وکین کہنے لگی: "اے اسٹیفن تم اپنے حال پر رحم کرو، خدا کی مرضی میں کوئی دخل نہیں دے سکتا، اور گئی ہوئی چیز کو واپس نہیں لاسکتا، اور پھر تمھارا بھائی تو بڑی عزت و احترام کی موت مرا ہے، بہت کم لوگ ایسی موت مرتے ہیں اس لئے تمھارا صبر بھی اسی قدر بلند ہونا چاہئے۔"

یہ کہکر وہ اسکی طرف دیکھنے لگا اور بولا: "میں اپنی گزشتہ زندگی کے ہر دور کو بھول سکتا ہوں، لیکن یہ میری طاقت سے باہر ہے کہ میں اس زمانہ کو بھول جاؤں، ۔ جو ہم دونوں اپنے ماں باپ اور ان کی رحمت و شفقت سے دور جوتنج کے ایک مدرسہ میں گزارا تھا ہماری والدہ تو اپنی قبر میں ابدی نیند سو رہی تھیں اور ہمارے سخت دل باپ کو ہماری کچھ پروا نہ تھی، ہم پھٹا پرانا پہنتے تھے، سڑا بسا کھاتے تھے، ہماری جوتیوں میں پیوند ہی پیوند ہوتے تھے، اور ہماری ٹوپیوں میں سوراخ ہی سوراخ نظر آتے تھے اور ان کے سامنے ہم اپنی تباہ حالی کا کوئی صحیح عذر بھی پیش نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ اگر ہم ایسا کرتے تو باپ کی رسوائی ہوتی اور یہ ہمیں پسند نہ تھا۔ خود ہمارے مدرسہ کے طلبہ کا طرز عمل بھی ہمارے ساتھ مختلف تھا، کچھ تو ہمیشہ ہمارے ساتھ تمسخر و استہزا سے پیش آتے اور کچھ نیک دل بھی تھے جو ہماری حالت پر ترس کھاتے، لیکن ہمدرد کے آنسو بھی بیرحم کے تبسم سے کچھ کم نہیں ہوتے، دونوں زخم پر نمک چھڑکتے ہیں، ہمارے لئے ہر طرح مصیبت ہی مصیبت تھی، بسا اوقات ایسا ہوا کہ کوئی بڑا آدمی ہمارے کسی اُستاد کی ملاقات کو آیا اور ہمارے اُستاد نے ہمیں کلاس کے کسی اندھیرے حصے میں چلے جانے کا حکم دیدیا تاکہ اس مہمان کے سامنے ان کی سبکی نہ ہو، اور جب وہ آنے والا شخص چلا گیا تو ہم پھر اپنی اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔ ہمیں اس طرز عمل سے جسقدر رنج پہونچتا تھا اسے خدا کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ لڑکوں کا قاعدہ تھا کہ وہ سب کے سب اتوار کے دن اپنے اُستادوں کے ہمراہ جنگلوں بیابانوں، دریا کے کناروں یا پہاڑوں کی وادیوں میں عمدہ عمدہ لباس پہنکر سیر و تفریح کے لئے جایا کرتے تھے، لیکن ہم نہیں جا سکتے تھے اور جب ہم تنہا رہ جاتے، تو میں تو رونے پیٹنے لگتا تھا اور ادجین کھیلنے کودنے میں مصروف ہو جاتا، یہاں تک کہ میری طبیعت ٹھہر جاتی، آنسو خشک ہو جاتے اور مجبور ہو کر اس کا ساتھ دینے لگتا۔ میں ایک مہربان ماں کی طرح اس سے محبت کرتا تھا اور کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اسے روتے یا تکلیف اُٹھاتے دیکھوں۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر میں نے اسکے رخسار پر بہتا ہوا ایک آنسو بھی دیکھ لیا تو غم و اندوہ سے ہلاک ہو جاؤں گا اور بسا اوقات کھانے کے وقت جب میں دیکھتا کہ کھانا تھوڑا ہے تو میں بیمار بن جاتا یا عدم اشتہا کا عذر کر دیتا، تاکہ میرے حصے کا کھانا بھی وہ خود ہی کھالے اور میں بھوک کی کمزوری اُسکے چہرے پر نہ دیکھ سکوں، بسا اوقات ٹھنڈی برف سی راتوں میں اس خیال سے کہ کہیں اسے ٹھنڈ نہ لگ جائے میں اپنی رضائی بھی اُسی کو اڑھا دیتا اور اسے خبر بھی نہ ہوتی یہاں تک کہ جب صبح کو اس کی آنکھ کھلتی اور مجھے اپنے برابر بغیر رضائی کے سوتا ہوا دیکھتا تو مجھے اپنے سینے سے چپٹا لیتا۔

غرض ہم اسی طرح رہتے رہے، یہاں تک کہ ایک دن ایڈورڈ بھی جو ہماری طرح مصیبتوں کا مارا ہوا تھا ہم سے آملا، اور ہم تینوں ملکر ان تکلیفوں کو برداشت کرتے رہے لیکن زمانہ کے بیرحم ہاتھوں نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔"

اتنا کہکر اسکی آواز بھرانے لگی اور دیر تک سر جھکائے ہوئے بیٹھا رہا۔ جب اس نے اپنا سر اُٹھایا تو اسکی دونوں آنکھیں روتے روتے سُرخ ہو گئی تھیں، اس نے ماجد ولین پر ایک اشک آلود نگاہ ڈالی اور بولا: "اے ماجد ولین، کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں نے اس بھائی کے ساتھ جسے میں اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب رکھتا تھا کیا سلوک کیا؟" کہنے لگی "نہیں مجھے

نہیں معلوم"۔ کہنے لگا: "آہ میں نے ہی تو اُسے قتل کیا ہے"۔ ماجد ولین یہ سنکر زرد پڑگئی اور کہنے لگی: "میں نہیں سمجھ سکتی کہ تم کیا کہہ رہے ہو" اس نے کہا کہ "اوجین نے میدان جنگ سے لکھا تھا کہ اس کی زین پرانی ہوگئی ہے اور اسے ایک نئی زین خریدنے کے لئے بیس فرانک کی ضرورت ہے، اس وقت یہ رقم میرے پاس موجود تھی اور میں اسے دے سکتا تھا، لیکن مینے بخل سے کام لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عین عالم قتال میں اس کی زین کا تسمہ ٹوٹ گیا اور وہ گھوڑے کی پیٹھ سے زمین پر گر گیا، گھوڑوں کی ٹاپوں نے اسے روند ڈالا اور وہ مر گیا"۔

یہ سُنکر ماجد ولین کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور رونے لگی۔ اسٹیفن نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھا اور کہا: "تمھیں معلوم ہے کہ میں نے اس رقم کے دینے سے کیوں انکار کر دیا؟" کہنے لگی: "نہیں مجھے نہیں معلوم"۔ کہنے لگا: "صرف اس لئے کہ اس رقم کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہ تھا، اور میں حیران تھا کہ یہ رقم میں اسے بھیجدوں یا اس سفر میں خرچ کروں جو تمھیں دیکھنے کے لئے میں کرنے والا تھا۔ آخر میں نے اسکی زندگی پر تمھارے دیدار کو ترجیح دی"۔

ماجد ولین نے یہ سنکر اپنا سر جھکا لیا، اور شرم وحیا سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا، اسٹیفن سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا: "اور کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس سفر میں میرے اوپر کیا گزری؟" ماجد ولین نے کوئی جواب نہ دیا اور بُت کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ کہنے لگا: "میں تمھیں دیکھنے کے لئے تماشاگاہ میں پہونچا، لیکن تم وہاں موجود نہ تھیں میں بہت دیر تک تمھارا انتظار کرتا رہا لیکن تم پھر بھی نہ آئیں، مجھے تمھارے نہ آنے کا سخت صدمہ ہوا، اور وہاں سے نکل کر سوزان کے گھر کی طرف چلدیا، تاکہ معلوم تو کروں کہ تمھارے نہ آنے کا سبب کیا ہے؟ وہاں پہونچکر ایک اجتماع دیکھا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ کی سہیلی کی شادی ہے۔ تم سے اسقدر قریب ہو جانے کے بعد دل کسی طرح نہ مانا کہ تمھیں دیکھے بغیر لوٹ جاؤں، گو ایک ہی نظر سہی، پھر چونکہ اُس بزم خاص تک میرا یوں پہونچ جانا ناممکن تھا اس لئے میں جاکر نوکروں میں شامل ہوگیا، کیونکہ میرے کپڑے ان کے کپڑوں سے ملتے جلتے تھے، اور اس تدبیر سے میں محل کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا اور ایوان رقص کے دروازے تک پہونچ گیا۔ جب میں نے دروازے کے شیشوں میں سے اندر کی طرف جھانکا، تو تمھیں ایڈورڈ کے ساتھ ناچتے ہوئے دیکھا۔ اس روز تم اپنی نئی زندگی کا افتتاح کر رہی تھیں۔ میں یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ دفعتًہ دروازہ بڑے زور سے کھلا اور اندر سے کوئی مہمان باہر آیا۔ اس نے مجھے کھڑا ہوا دیکھکر کسی کام کا حکم دیا، جسے میں اچھی طرح سے پورا نہیں کر سکا اور اس نے طیش میں آکر میرے منھ پر ایک کوڑا اس زور سے مارا کہ اب تک میرے چہرے پر اس کا نشان باقی ہے۔

یہ کہکر اس نے اپنا ہاتھ اپنے رخسارے پر رکھدیا، گویا ابھی ابھی اس کے چہرے پر یہ کوڑا پڑا ہو اور زور زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور ماجد ولین کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلدیا، ابھی وہ کمرے کے دروازے تک ہی پہونچا تھا کہ ماجد ولین بھی اسکے پیچھے پیچھے آگئی اور روتے ہوئے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کی چادر پکڑ کر کہنے لگی: "اے اسٹیفن کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟"

اسٹیفن نے اپنی چادر کو کھینچ لیا اور کہنے لگا "آپ اپنے شوہر کے کمرے میں تشریف لیجائیے! وہ بیمار ہے اور ممکن ہے اسے آپ کی ضرورت ہو" یہ کہکر وہ اپنے کمرے میں داخل ہوگیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

ماجد ولین کا خط سوزان کے نام

اب میرے لئے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تمھارے سامنے ہر بات کا اقرار کرلوں، میں اسٹیفن سے اب اس قدر محبت کرنے لگی ہوں کہ اپنی گزشتہ زندگی میں بھی اس سے اتنی محبت نہیں کی تھی۔ کیونکہ اب میری یہ محبت امید و تمنا کی آمیزش سے پاک ہے۔

نہیں! بلکہ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ میں اس کے خیال سے ایک دن کے لئے بھی غافل نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کی یاد کبھی میرے دل سے محو ہوئی تھی۔ میں اس وقت اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی تھی جب میں نے یہ خیال کیا تھا کہ میں اس کے بغیر زندہ رہ سکتی ہوں یا اس کے علاوہ کسی دوسرے انسان کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہوں۔

وہ مجھ سے اب تک دیوانہ وار محبت کرتا ہے اور گزرے ہوئے زمانہ کو اس طرح یاد کرتا ہے گویا وہ اسوقت بھی اُس کی آنکھوں کے سامنے ہے، میں اس کی اس حالت سے بےخبر تھی اور بظاہر اس کی طبیعت پر اس کا کوئی اثر نہیں دیکھتی تھی۔ لیکن چند ہی روز کی بات ہے کہ مجھے اسکے ساتھ ایک رات تنہائی میں ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا، تو دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھیں اور اس کے سوتے ہوئے جذبات نے ایک طوفانی شکل اختیار کرلی۔ وہ رو دیا، اس وقت میں سمجھی کہ وہ مجھے بھولا نہیں ہے بلکہ اپنے قلبی کیفیات اور غموں کو مجھ سے چھپائے ہوئے ہے، مجھے سخت صدمہ ہوا اور اسے روتا دیکھ کر میں خود بھی رونے لگی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ مجھ پر اس کے خلوص و محبت کے اس شریف جذبہ کا کتنا اثر ہوا کہ وہ اس عورت پر اب بھی جان دیتا ہے جسنے اس کے ساتھ اتنی سخت بیوفائی کی تھی۔

اس نے اس وقت تک شادی کا خیال بھی نہیں کیا ہے، اور نہ اس نے اپنے مکان کی بالائی منزل کو جو اسنے میرے رہنے کے لئے بنوائی تھی، ایک رات کے علاوہ کبھی کھولا ہے۔ شادی کا کمرہ بھی بدستور اپنی حالت پر ہے اور گرد و غبار کی ایک تہ اس کے پلنگ، اس کی کرسیوں اور اس کے پردوں پر چڑھی ہوئی ہے، اس کمرے کو دیکھ کر میری وہی حالت ہوئی جو کسی پُرانی قبر کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

اے سوزان! میں ہر طرح سے نقصان میں رہی، وہ دولت بھی مجھ سے رخصت ہوئی جس کے عوض میں نے اپنی خوش نصیبی کو بیچا تھا اور وہ انسان بھی مجھ سے چھٹ گیا، جس کے سوا میں کسی دوسرے سے محبت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ ان تمام مصائب و آلام کے بعد دنیا میں میرے لئے کیا ہے؟

میرا جوڑ جوڑ کانپ رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ عذاب کا وقت بہت قریب آگیا ہے۔

ماجدولین کا خط سوزان کے نام

مصیبت کا زبردست پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ ایڈورڈ مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا لیکن کہاں گیا، مجھے نہیں معلوم۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمبرگ سے جہاز پر سوار ہو کر امریکہ چلا گیا ہے۔

خدا بھلا کرے اسٹیفن کا جنے مصائب نازل ہونے کے بعد اسکے حالات کو ایک حد تک درست کیا اور اسکی امداد و اعانت میں وہی سب کچھ کیا جو ایک بھائی دوسرے بھائی کے لئے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ ابھی اپنی اس لغزش سے پوری طرح سنبھلا بھی نہ تھا کہ اپنی پہلی عادت کی طرف لوٹ گیا اور اندھا دھند پاگلوں کی طرح جوئے میں کود پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں دو ہزار فرانک سے زیادہ کا مقروض ہو گیا اور مجبوراً اسے دیوالیہ ہو جانا پڑا۔ چنانچہ مینے اپنے تمام جواہرات اور قیمتی کپڑے فروخت کر دئے اس امید پر کہ شاید میں اسے اس مصیبت سے بچا سکوں لیکن میں کچھ نہ کر سکی۔ پھر ایک روز صبح کو میں اس کی خوابگاہ میں گئی تو وہ وہاں موجود نہ تھا۔ نوکروں سے دریافت کیا، تو ایک نوکر نے مجھے بتلایا کہ اسنے سورج نکلنے سے پہلے ہی دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور اسکے ہاتھ میں اس کا سفری سوٹ کیس تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں بتلا سکتا کہ کدھر گیا ہے۔

اسکے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اسنے اپنے سب سے بڑے قرض خواہ کے ہاتھ اپنا مکان فروخت کر دیا ہے اور ادائے قرض کے بعد جو بچا اسے لیکر چلا گیا اور باقی قرض خواہوں کو یوں ہی ان کے حال پر چھوڑ گیا۔ چنانچہ میں سمجھ گئی کہ اس نامناسب حرکت کے بعد جسکی کوئی شریف انسان جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی واپس نہ ہوگا۔

اب میرے لئے اسکے علاوہ کوئی صورت نہ تھی کہ اس کے بقیہ قرض کو، اسکی عزت و احترام کے خیال سے خود ادا کروں۔ چنانچہ مینے اپنا وہ گھر بھی فروخت کر دیا جو مجھے میرے والد کی طرف سے ترکہ میں ملا تھا، اور اسکے متصل جو زمین تھی وہ بھی بیچ دی۔ مینے ہر جگہ دریافت کیا اور جہاں جہاں میں سمجھتی تھی کہ اس کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے، میں اسے تلاش کرنے کے لئے خود گئی۔ لیکن مجھے اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب سے اب تک میں کس قدر آنسو بہا چکی ہوں اور اس مصیبت کے نازل ہونے کے بعد سے اب تک کیسی کیسی سختیاں اُٹھا چکی ہوں اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ کل ہی اس گھر کے نئے مالک نے میرے نام ایک خط بھیجا ہے اور گھر کے خالی کر دینے کا مطالبہ کیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں، نہ کوئی عزیز ہے جس کے گھر جا کر پڑ رہوں اور نہ کوئی دوست ہے جس سے مدد کی امید کروں، اور نہ اتنی قدرت کہ اس زندگی میں جو کچھ خدا کی طرف سے میرے لئے مقدر ہو چکا ہے اسے برداشت کر سکوں۔

اسٹیفن نے بھی کو بلانس آنا چھوڑ دیا۔ اب میں اسے نہیں دیکھتی اور نہ اس کی کوئی خبر سنتی ہوں معلوم نہیں وہ آتے آتے کیوں رک گیا بار ہا میرے دل میں آیا کہ خودکشی کر لوں۔ مگر پھر اس خیال سے رُک گئی کہ اگر مینے ایسا کیا تو میرے ساتھ ایک بیگناہ ننھی سی جان کا بھی خون ہوگا۔ اے سوزان تم یہاں میرے پاس چلی آؤ، یا مجھے اجازت دو کہ میں ہی تمہارے پاس آ جاؤں لیکن نہیں!

خود تمھیں کو آنا پڑیگا کیونکہ میں تو آج کل اتنی دور کا سفر نہیں کرسکتی جواب اس بوجھ سے سبکدوش ہونے کا زمانہ بہت قریب آپہونچا ہے۔ میں کل ہی سے تمھارے خط کا انتظار شروع کردونگی، کیونکہ تمھارے سوا میرا اس دنیا میں کون ہی جسپر بھروسہ کرسکوں۔

ماجدولین کا خط سوزان کے نام

میں کل تمھارے خط کا بڑی بیچینی سے انتظار کرتی رہی، لیکن نہیں آیا۔ کاش مجھے معلوم ہوجاتا کہ کیوں نہیں آیا۔ کیا تم بیمار ہوگئیں؟ یا کوئی ایسا ضروری کام پیش آگیا جو مجھے خط لکھنے کی فرصت بھی نہ مل سکی۔ بہرحال کچھ بھی ہو تم مجھے جلد خط لکھو، کیونکہ میری مصیبتیں اب اپنی انتہا کو پہونچ چکی ہیں۔ لوگوں نے میری پاس آنا جانا بھی بند کردیا ہے، اور اب نہ میری کوئی سہیلی ہی نظر آتی ہے اور نہ ایڈورڈ کے دوستوں میں سے کوئی دوست دکھائی دیتا ہے۔

زندگی میری آنکھوں میں اندھیرہے، اور آنکھیں روتے روتے خشک ہوچکی ہیں۔ اور خودکشی کا خیال آج ہمیشہ سے زیادہ مجھ کو ستارہا ہے۔ اے سوزان تم میرے معاملہ میں غور کرو، اور مجھے لکھدو کہ تم میرے پاس آرہی ہو، یا خود مجھے اپنے پاس چلے آنے کی اجازت دو۔۔۔ اگر کل بھی تمھارا خط نہیں آیا تو میں نہیں کہہ سکتی کہ پرسوں میرا کیا حشر ہو۔

فرڈریک کا خط ماجدولین کے نام

یہ خط میں تمھیں اس حالت میں لکھ رہا ہوں کہ سوزان اپنی علالت کے نہایت ہی نازک دور سے گزر رہی ہے۔ طبیب نے مجھے ہدایت کردی ہے کہ میں اسے ہر اس چیز سے بیخبر رکھوں جو اسکی طبیعت پر رنج یا خوشی کا کوئی اثر پیدا کرسکے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ابتک اسے ہر بات سے بیخبر رکھا، یہاں تک کہ ان خطوں کی بھی اطلاع نہیں دی جو اس زمانہ میں اسکی سہیلیوں کی طرف سے اسکے نام آتے رہے ہیں مجھے معاف کرنا کل شام مینے تمھارا آخری خط پھاڑکر پڑھ لیا۔ اس وقت مجھے تمھاری بعض تکلیفوں کا حال معلوم کرکے سخت صدمہ ہوا اور میں نے ارادہ کیا کہ سوزان کو یا تو تمھارے خطوں کی اطلاع کردوں، یا اسے خبر کئے بغیر ہی تمھیں لکھدوں کہ تم ہمارے پاس چلی آؤ، لیکن پھر اس ڈر سے رک گیا کہ کہیں تمھارے مصائب کا غم یا تمھاری ملاقات کی خوشی اسے ہلاک نہ کردے۔ لہذا میں تم سے استدعا کرتا ہوں کہ ابھی تم وہیں رہ کر چند ہفتے انتظار کرو یہاں تک کہ میں خود اسکے لئے کوئی تدبیر نکالوں، یا سوزان کی علالت میں تخفیف ہوجائے۔

مکافاتِ عمل

ماجدولین نے اس خط کو پڑھا اور سمجھ گئی کہ سوزان نہ تو بیمار ہے اور نہ اتنی نزار کہ اسکے خطوں کو پڑھ بھی نہ سکے، جیسا کہ اسکے شوہر نے لکھا ہے بلکہ وہ اسے ٹالنا چاہتی ہے۔ اسی اثنا میں اس کی ایک سہیلی جو سوزان کی بھی دوست تھی، اسکے پاس آئی اور ماجدولین نے اس سے پوچھا کہ اسکے پاس سوزان کا آخری خط کب آیا تھا؟ وہ کہنے لگی کہ "کل ہی تو اس کا خط آیا ہے جس میں اسنے

مجھے میری سالگرہ پر مُبارکباد لکھی ہے اور یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ میں یہ موسم بہار اسکے ساتھ برلن میں گزاروں۔ چنانچہ میں نے اس کی اس مُبارکباد کا شکریہ اور اپنے نہ آسکنے کی معذرت لکھ بھیجی ہے"۔

یہ سُنکر ماجد ولین چُپ ہوگئی اور جب وہ لڑکی چلی گئی تو دل ہی دل میں کہنے لگی: "اس کے اس فعل پر اظہار ناراضگی بیکار ہے۔ خدا کی مرضی یہی ہے کہ مجھے میری بیوفائی کا بدلہ بیوفائی، اور ناشکری کا بدلہ ناشکری سے دیا جائے"۔

آخری آنسو

ایک روز صبح کو جب قصبۂ دلفاخ کے رہنے والے بیدار ہوئے تو یہ دیکھ کر انھیں سخت تعجب ہوا کہ دیہاتی لڑکی جو کل اُن سے اس حال میں جدا ہوئی تھی کہ اسکا خوبصورت چہرہ تمام لڑکیوں سے زیادہ تروتازہ اور اس کا حال ان سب سے زیادہ سازگار تھا، آج انکی طرف اس حال میں لوٹی ہے کہ اسکا چہرہ کمھلاکر زرد پڑ گیا ہے، حالت تباہ اور رنگ فق ہے۔ پھٹے پُرانے کپڑے بدن سے لپٹے ہوئے ہیں، وفا سے بیچارگی اور ذلت کے آثار نمایاں ہیں، اور جب چلتی ہے تو گرانی سے اسکے قدم مشکل سے اُٹھتے ہیں۔ لوگ سے دیکھ کر انگشت بدنداں رہگئے

وہ اسی طرح اپنے گردوپیش سے بیخبر چلی جارہی تھی ——— کہ وہ اس گھر کے سامنے سے گزری جہاں اسنے اپنے بچپن اور جوانی کے دن گزارے تھے، اور جہاں ایک مدت تک ایک پاکیزہ اور شریف محبت نے اس کی زندگی کو مسرور بنا رکھا تھا، اس کا دل رنج و غم سے دھڑکنے لگا اور تھوڑی دیر کے لئے وہ اسکے سامنے کھڑی ہو کر اسے دیکھتی رہی، اسنے دیکھا کہ خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ ابتک خالی ہی پڑا ہے، چونکہ باغ کا دروازہ کھُلا ہوا تھا اس لئے اس کے دل نے اندر داخل ہونے کا مشورہ دیا اور وہ اندر چلی گئی۔

ابھی چند قدم گئی ہوگی کہ اسنے باغبان اور اس کی بیوی کو ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھے اور کھانا پکاتے ہوئے دیکھا، وہ قدم بڑھاتی ہوئی ان کے قریب پہونچگئی۔ انھوں نے اسے دیکھا اور جب کچھ دیر بعد پہچان لیا تو گھبرا کر کھڑے ہوگئے اور قریب پہونچکر سلام کیا۔ باغبان نے اسے غم آلود نگاہ سے دیکھا اور کہنے لگا: "یہ آپ کا کیا حال ہے"۔ اس نے اپنا مختصر قصہ بیان کیا اور کہنے لگی: "میں اس گھر کی بالائی منزل کو ایک یا دو مہینہ کے لئے کرایہ پر لینا چاہتی ہوں، کیا تم اس گھر کے مالک سے میرے لئے اس مدت کی اجازت لے سکتے ہو؟" باغبان یہ سُن کر رونے لگا اور ایک گھنٹہ کے اندر ہی اندر اس نے اس کے لئے اس کمرے کا انتظام کردیا جس کی خواہش اس نے ظاہر کی تھی۔ چنانچہ وہ اوپر چڑھ گئی اور اسے بدستور اسی حالت پر پایا۔

اس نے اس دن کو یاد کیا جب وہ اسٹیفن کے چلے جانے کے بعد اوپر آئی تھی اور اس کی جدائی کے غم میں اسکے فرش کو اپنے آنسوؤں سے بھگویا تھا، وہ پچھلے دنوں کو یاد کرنے لگی اور رونے لگی، کیونکہ زمانہ اپنے ترکش کے سارے تیر اس پر برسا چکا تھا، اور زندگی کے تمام راستے اس پر بند ہوچکے تھے۔

اس کا شوہر اسے چھوڑ چکا تھا، اس کی سہیلی اس سے خیانت کرچکی تھی اور جو اس کا محبوب تھا وہ اس سے بگڑ چکا تھا اور وہ دولت جس کے لئے اس نے اپنی وفاداری کو بیچا تھا اسکے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ اب اسکے لئے مرجانا بھی مشکل تھا،

کیونکہ اپنے بچے کو وہ اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کر سکتی تھی اور زندہ رہنا بھی آسان نہ تھا کیونکہ اسباب زندگی میں سے اسکے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

الغرض چند روز تک وہ اسی حالت میں رہی، آخر وہ دن آ پہونچا جس کا انتظار تھا، درد بڑھنے لگے — ایسے نازک وقت میں سوائے باغبان کی بیوی اور ایک دوسری بڑھیا کے جو اس کی پڑوسن تھی کوئی شخص اسکے پاس نہ تھا۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں ایک خوبصورت لڑکی نے اس دُنیا میں قدم رکھا، جسے دیکھکر پہلے تو وہ ذرا مسکرائی، لیکن پھر اسقدر پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے کوئی اپنے اکلوتے بچّے کو مرتے ہوئے دیکھ کر رونے لگتا ہے۔

اسکے چند ہی روز بعد اسے یہ خبر ملی کہ ایڈورڈ نے شکاگو کے کسی ہوٹل میں ایک رات جوئے میں سب دولت ہار کر، گلے میں پھندا لگا کر خودکشی کر لی۔ یہ خبر سنتے ہی وہ بیہوش ہو گئی اور جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک بُت کی طرح خاموش تھی۔ نہ کچھ کہتی نہ سنتی بلکہ اس وقت تک اپنی بچّی کو دودھ بھی نہ پلاتی جب تک اس کے رونے سے مجبور نہ ہو جاتی، نہ وہ صبح کو کھانا مانگتی نہ شام کو اور اگر کوئی اس کے سامنے لے بھی آتا تو ایک دو لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیتی تھی۔ گھنٹوں گزر جاتے اور وہ آسمان کی طرف تکتی رہتی اور جب اس کی طبیعت ذرا ٹھکانے ہوتی تو مالی سے بس اس قدر پوچھ لیتی تھی کہ کیا اس کے نام کوئی خط آیا تھا، یا اس کے متعلق کسی نے کچھ پوچھا تھا؟ اور جب وہ کہتا کہ نہیں، تو پھر اپنی پہلی سی خاموشی اور محویت کی طرف لوٹ جاتی تھی۔

۹۳

اس روز رات کو ماجدولین سے گفتگو کرنے کے بعد اسٹیفن کے زخم پھر ہرے ہو گئے اور اسکی شوریدگی نے سر سے اُبھر آئی، چنانچہ اس نے ایک طویل سفر اختیار کیا، موسیقی کے بڑے بڑے ماہروں اور مشہور ڈرامہ لکھنے والوں سے ملاقاتیں کیں، ان لوگوں نے بھی اسکے اعزاز میں بڑے بڑے جلسے کئے اور اسکے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے۔ اس نے اپنے اس سفر میں بہت سے گیت نظم کئے، اور پھر انھیں بڑی خوبی سے ادا کیا اور تمثیلی روایتوں اور افسانوں کے بہت سے گانوں کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا اور جن جن لوگوں نے اس کے گیتوں یا سازوں کو سنا سب نے متفقہ طور پر یہی کہا کہ بتہوفن کے بعد سے آج تک جرمنی کے آسمان پر ایسا سورج کبھی نہیں چمکا۔

وہ اپنی اس سیاحت میں کئی مہینے مصروف رہا، یہاں تک کہ ایک روز اسکے پاس کوبلانس سے اسکے ایک دوست کا خط پہونچا جس میں ایڈورڈ کے امریکہ چلے جانے اور وہاں پہونچکر اسکے خودکشی کر لینے کی اطلاع تھی، وہ اس خبر کو پڑھکر بہت غمگین ہوا اور سوچنے لگا کہ ——— معلوم نہیں اس مصیبت کے نازل ہونے کے بعد ماجدولین پر کیا گزری۔ چنانچہ وہ کوبلانس کے لئے روانہ ہو گیا، اور وہاں صرف ایک رات ٹھہر کر دوسرے دن صبح کو جوتنیخ کے لئے چلدیا اور یہاں پہونچکر اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی بچّی کے ساتھ اپنے پُرانے گھر کی بالائی منزل میں بدبختی و بدنصیبی کے دن گزار رہی ہے۔

اس وقت وہ اپنے غم و غصّہ کو بھول گیا اور صبح کے وقت اپنی گاڑی پر سوار ہو کر دلفاخ کے لئے روانہ ہو گیا اور پہر کے قریب

وہاں پہونچکر سیدھا موٹر کے گھر کی طرف گیا اور گاڑی سے اُتر کر مالی کے پاس آیا اور ماجد ولین کے متعلق دریافت کرنے لگا:۔

"اسنے اس کا سارا حال مختصراً بیان کیا اور کہا کہ غم اس پر اس درجہ مسلط ہے کہ قریب ہے اسے ہلاک کردے"۔ اسٹیفن نے کہا: "تم جاکر اسے میرے آنے کی خبر کردو"۔ وہ کہنے لگا "وہ اپنا اکثر وقت اُسی کرسی پر بیٹھ کر گزارتی ہے جس پر تم دونوں کسی وقت بیٹھا کرتے تھے اور میں اسے اس وقت بھی وہیں بیٹھا ہوا چھوڑ آیا ہوں"۔ اسٹیفن قدم بڑھا کر اس کرسی تک پہونچ گیا لیکن ماجد ولین کو اس کے آنے کی اسوقت تک خبر نہیں ہوئی جب تک کہ وہ اس کے سامنے نہیں پہونچ گیا۔

وہ اسے دیکھتے ہی کانپنے لگی، اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے اس کا تنفس بے ترتیب ہوگیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ بھی نہ سکی اسٹیفن اس کے برابر بیٹھ گیا اور اس کی مصیبت پر اسے تلقین صبر کرنے لگا اور جب رفتہ رفتہ اس کا دل ٹھہرا تو کہنے لگی:۔

"اے اسٹیفن اگر تم مجھے معاف کردو تو میں ان مصائب وآلام کو بڑے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرسکتی ہوں"۔

اسٹیفن دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اسنے اپنا سر اُٹھایا اور کہنے لگا: "لیکن معاف کردینا تو میری قدرت سے باہر ہے"۔ یہ سُنکر موت کی زردی اس کے چہرے پر چھاگئی اور اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کی روح اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ ہوکر ٹپک رہی ہے۔ اس نے کہا: "اے اسٹیفن کیا یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں تمھیں ہماری پچھلی باتوں میں سے کسی چیز کو یاد نہیں دلاتی؟" کہنے لگا: "ہاں، بس اس چیز کی یاد دلاتی ہے، جسنے میری تمام آرزوں اور تمناؤں کو برباد اور دل کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا کیا میں وہ وقت بھول سکتا ہوں، جب آج سے پانچ برس پہلے تم اسی جگہ مجھے تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلی گئی تھیں اور میری آنکھوں کے سامنے تم اپنے منگیتر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے کی طرف کو لے گئی تھیں، بغیر کچھ سوچے ہوئے کہ مجھ غریب پر کیا گزری، آیا میں زندہ بھی رہا یا نہیں۔ پھر اس کے بعد میں نے تم کو کیسے کیسے دردبھرے خط لکھے لیکن تم نے ان سب کو پس پشت ڈالدیا اور پھر ایک مدت کے بعد تم نے مجھے دو حرف لکھے بھی تو وہ جنھوں نے میری امید کا آخری دھاگہ بھی توڑ دیا۔

مجھے اسوقت تک یاد ہے کہ تم نے اپنے اس آخری خط میں مجھ سے یہ خواہش کی تھی کہ اب ہم گزشتہ زمانہ کی یاد کو بھول جائیں اور اور محبت کی جگہ دوستی کا رشتہ ہمارے درمیان قائم ہوجائے، پس اب میں اُسی دوستی کے نام پر تمھارے پاس آیا ہوں اور میں تمھاری ہر مدد کے لئے طیار ہوں"۔ ماجد ولین نے روتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہنے لگی: "اے اسٹیفن کیا میرے لئے تمھارے دل میں اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے"۔ یہ سُنکر اسٹیفن کا دل ہل گیا اور یہ دیکھ کر کہ اسکے دونوں ہاتھ بڑی عاجزی سے اسکی طرف پھیلے ہوئے ہیں، دل نے تقاضہ کیا کہ وہ اسے اپنی آغوش میں لے لے اور اسے اپنے سینہ سے لگائے، لیکن پھر فوراً ہی اسکی شادی کی وہ رات یاد آگئی جب وہ اسکے دروازے کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور وہ اپنے شوہر کی آغوش میں پڑی ہوئی اس سے محبت کی باتیں کررہی تھی، اس خیال کے آتے ہی غیرت و خودداری کا شعلہ پھر اسکے دل میں بھڑک اُٹھا۔

ماجد ولین اسکے دونوں ہونٹوں کی طرف برابر اس انداز سے دیکھتی رہی گویا ایک مجرم اپنے فیصلہ کے لئے قاضی کی جنبش لب کا منتظر ہے۔ وہ اس ایک لفظ کے انتظار میں تھی جو یا تو اسے خوش نصیبی کے اس آسمان پر پہونچا دے گا جس کے اوپر کوئی دوسرا

آسمان نہیں ہے، یا بدقسمتی کے اس گڑھے میں گرادے گا، جس سے نیچے کوئی زمین نہیں ہے۔

اس نے اسٹیفن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسکے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگایا اور پھر اپنی آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔ اسوقت وہ تمام باتوں کو بھول گیا۔ وہ اس پر جھک گیا اور جب ان دونوں کے ہونٹ ملنے کے قریب ہوئے تو ماجدولین بولی کہ: "تم تو میری زندگی ہو اور تمہارے بغیر میری زندگی ناممکن ہے"۔ اور یہ بالکل وہی الفاظ تھے جو اسنے آج سے پانچ سال پہلے حجلۂ عروسی کے اندر اپنے شوہر سے کہتے ہوئے سُنے تھے۔ جوں ہی یہ آواز اسکے کانوں میں پہونچی وہ دیوانوں کی طرح کود کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ایک ایسے جھٹکے کے ساتھ اسے اپنے پاس سے ہٹا دیا کہ وہ کُرسی سے نیچے گر پڑی اور گرجتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "نہیں میرے دل میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں"۔ اس کے بعد وہ اسے اسی جگہ چھوڑ کر سر جھکائے ہوئے چلا آیا اور جب باغ کے دروازے کے قریب پہونچا تو باغبان کو ایک سربمہر لفافہ دیکر بولا کہ: "اسے ماجدولین کو دیدینا"، اور اپنی گاڑی پر سوار ہو کر لوٹ آیا۔ باغبان لفافہ لیکر پہونچا تو وہ کُرسی کے نیچے پڑی ہوئی تھی اور سکرات موت کی سی تکلیف میں مبتلا تھی۔ وہ اسکے پاس بیٹھ گیا اور جب تک کہ اسکے ہوش و حواس درست نہ ہوگئے وہیں ٹھیرا رہا۔ اسکے بعد اس نے وہ لفافہ اسے دیدیا اور وہ خاموشی سے اسے لیکر اوپر چڑھ گئی اس وقت اسکے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اسنے وہ تمام رات چراغ کے پاس بیٹھ کر گزار دی۔ کبھی لکھتی تھی اور کبھی روتی تھی اور جب ان باتوں سے ذرا فرصت ملتی تو وہ اپنی بچّی کو اپنی چھاتی سے لگا لیتی تھی یہاں تک کہ صبح کا تڑکا نمودار ہو گیا۔

مُصیبت

ابھی سورج بلند نہ ہوا تھا کہ فرنز اپنی بیوی سے بولا: "دیکھو مجھے تو ابھی یہیں ٹھہرنا ہے، کیونکہ اسٹیفن کے لئے میں ایک خاص قسم کی مچھلی پکڑنا چاہتا ہوں، جسکے متعلق کل ہی اسنے مجھے ہدایت کردی تھی۔ تم اسکے پاس چلی جاؤ اور اسکے اُٹھنے کا انتظار کرو، لیکن چھوٹے بچّے کے علاوہ اور کسی کو اپنے ساتھ نہ لینا۔ آج وہ بہت دیر سے اُٹھیگا، کیونکہ کل وہ اپنے ولفاخ کے سفر سے بہت غمگین و افسردہ لوٹا ہے۔ اور ہاں اس کا خیال رکھنا کہ تمہارے بچّے کے رونے کی آواز اسے پریشان نہ کردے۔ میں بھی تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہونچتا ہوں"۔

چنانچہ وہ اپنے بچّے کو اپنے ہاتھ پر اُٹھائے ہوئے چلدی اور جب باغ کے دروازے کے قریب پہونچی تو ایک نقاب پوش عورت پھٹے پُرانے میلے کپڑے پہنے، تیزی کے ساتھ اسکے قریب سے ہو کر نکل گئی، اس نے کچھ خیال نہ کیا، لیکن جوں ہی اسنے دروازے میں قدم رکھا اسنے دیکھا کہ دروازے کے سامنے ایک چھوٹی سی گٹھری پڑی ہوئی ہے اور کوئی چیز اس میں ہل رہی ہے جب وہ اسکے قریب پہونچی تو دیکھا کہ ایک دودھ پیتا بچّہ کپڑوں میں لپٹا ہوا پڑا ہے اور ربڑ کی ایک چُسنی اپنے منہ میں لئے ہوئے چوس رہا ہے یہ دیکھ کر اسے وہ عورت یاد آگئی جو ابھی ابھی اسکے پاس سے تیزی کے ساتھ نکل گئی تھی اور اپنے دل میں کہنے لگی: "ہو نہ ہو اُن کا بچّہ ہے اور وہ اپنے گناہ کو چھپانے اور ذلت و رسوائی سے بچنے کے لئے اسکو یہاں پھینک گئی ہے"۔ یہ کہکر اُسنے ماں کو کچھ

آواز دی جو باغ میں کسی دوسری طرف اپنے کاموں میں مشغول تھا۔ چنانچہ اسکے آنے پر وہ اُس گٹھری کے متعلق اس سے پوچھنے لگی۔ مالی خود بھی اسے دیکھ کر گھبرا گیا اور اس سے اپنی ناواقفیت ظاہر کرنے لگا۔ لیکن اسنے یہی مناسب سمجھا کہ اسٹیفن کی رائے معلوم کئے بغیر کچھ نہ کرے۔ چنانچہ وہ اس کی خوابگاہ کی طرف گئی اور جھانک کر اسے دیکھنے لگی، وہ اپنے بستر پر پڑا ہوا جاگ رہا تھا۔

اسٹیفن نے اسے دیکھا اور اندر بلا لیا۔ اندر جاکر کہنے لگی کہ "میں تو سمجھتی تھی کہ آج آپ دوپہر سے پہلے نہیں اُٹھیں گے" کہنے لگا "نہیں میں تو ابتک سویا ہی نہیں" اسکے بعد اُس نے اُس گٹھری کا واقعہ بیان کیا، اور اس نقاب پوش عورت کا بھی ذکر کیا جسے اسنے باغ سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا یہ سُنکر اسے شک ہوگیا اور وہی رات کے معمولی کپڑے پہنے ہوئے بڑی تیزی سے باہر نکل گیا اسنے دیکھا کہ اس کے پاس ہی کوئی سفید سی چیز بھی پڑی ہے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک سربمہر لفافہ ہے اسنے اسے اُٹھا لیا اور اسکے عنوان کو پڑھنے لگا، اس پر لکھا ہوا تھا "ماجد وکین کی طرف سے اسٹیفن کے نام" چنانچہ بڑی تیزی سے اسنے اسے پھاڑا اور اس پر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتا ہوا چلا گیا اور آخر میں موت کا لفظ لکھا ہوا دیکھا تو وہ چیخ کر جوزفین سے کہنے لگا "وہ عورت جسکے متعلق تم کہ رہی تھیں کہاں گئی؟" وہ کہنے لگی اس طرف کو گئی ہے" اور دریا کے راستے کی طرف اشارہ کرنے لگی —— یہ سُنکر خط اسنے اپنے ہاتھ سے پھینکدیا اور بڑی تیزی کے ساتھ دریا کی طرف بھاگنے لگا۔ وہاں پہونچکر اسنے دیکھا کہ دریا کے کنارے سیکڑوں آدمی کھڑے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر شخص پانی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اسنے دیکھا کہ ڈوبنے والی، موجوں کے تھپیڑوں سے سخت مضطرب ہے اور برابر اپنے ہاتھوں کو کنارے کی طرف بڑھا رہی ہے، تند و تیز ہوائیں ہر طرف سے چل رہی تھیں اور اس کا دوست فرتز ڈوبنے والی کو بچانے کے لئے اپنی کشتی کو اس کی طرف بڑھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

اس نے اسے دیکھا اور چیخ چیخ کہنے لگا "اے فرتز اسے بچالے اے میرے دوست اسے پکڑلے، یہ ماجد وکین ہے" یہ کہکر اس نے اپنے کپڑے اپنے بدن سے اُتارے اور پانی میں کود پڑنے کے لئے آگے بڑھا۔

لوگ یہ دیکھ کر گھبرا گئے کہ کہیں اسے بھی کوئی صدمہ نہ پہونچ جائے، اور اس کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے مگر وہ ان سب کو ہٹاتا ہوا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور دریا میں کود پڑا اور کشتی کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ دریا کی موجیں کبھی اسے کشتی سے قریب کر دیتی تھیں، اور کبھی بہت دور لیجاکر پھینکدیتی تھیں۔ آخر اس کشاکش میں تھوڑی دیر کے بعد وہ کشتی کے قریب پہونچنے میں کامیاب ہوگیا اور اسے پکڑ لیا۔ اب کشتی بھی اس مقام کے قریب پہونچ چکی تھی جہاں ماجد وکین کے بال کبھی سطح آب پر تیرنے لگتے اور کبھی ڈوب جاتے —— اس وقت جبکہ لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے، ایک خوفناک موج پہاڑ کی طرح اُبھری اور بہت کر ڈوبنے والی کو بھی اپنے ساتھ لے گئی —— اسٹیفن گھبر کر پانی میں کود پڑا، اور جس جگہ وہ ڈوبی تھی اسی جگہ خود بھی غوطہ مارا۔ بہت دیر تک دونوں ڈوبتے اُچھلتے رہے اور پھر دونوں ڈوبنے والی کو اپنے ہاتھوں پر لئے ہوئے اُبھرتے نظر آئے۔ دونوں میں سے کسی کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ زندہ ہے یا مُردہ۔ یہاں تک کہ وہ دونوں پانی کو چیرتے ہوئے کنارے کی طرف بڑھے اور اسے زمین پر لٹا دیا۔ تمام لوگ اس پر جھک پڑے اور اسکے دل کی آوازوں کو سننے، اور تنفس کی آمد و شد کو محسوس کرنے لگے۔

اسٹیفن بھی ایک طرف کھڑا ہوا اس پر نگاہیں جمائے ہوئے دیکھ رہا تھا، یکایک وہ چونک پڑا۔ اسنے دیکھا کہ لوگ اسکے چاروں طرف جھکے ہوئے ہیں اور سب نے اپنے اپنے سروں سے اپنی اپنی ٹوپیاں اُتار لی ہیں اور آہستہ آہستہ دعا میں مصروف ہیں، یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا اور سمجھ گیا کہ ماجد ولین ختم ہو گئی۔

اسکے بعد سب لوگ ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے اور جب وہاں کوئی نہ رہا تو اسٹیفن اپنی جگہ سے اُٹھا اور ماجد ولین کی لاش کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھا کر اپنے گھر لے آیا، فرنز بھی ساکت و صامت پیچھے پیچھے آرہا تھا، اور اسے لیکر گھر کی بالائی منزل پر چڑھ گیا اور اسی نیلگوں کمرے میں لیجا کر اس مسہری پر لٹا دیا جو اس کی شادی کے لئے اس نے طیار کرایا تھا اور خود اس مسہری کے پایوں پر جھک گیا، اور کئی گھنٹے اسی حالت میں پڑا رہا نہ اسے جنبش ہوئی اور نہ اس کی آنکھوں میں حرکت ہوئی آخر دفن کا وقت آپہونچا اور ماجد ولین کے چہرے سے چادر ہٹا کر اسنے اسکی پیشانی کو چوما اور پھر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ماجد ولین کا خط اسٹیفن کے نام

"اے اسٹیفن، اب میں تمھارے بعد اس روپیہ کو لیکر کیا کروں گی؟ تمھیں کھو دینے اور اپنی دُنیا کو تمھاری دُنیا سے الگ کر لینے کے بعد یہ نامراد زندگی میرے کس کام کی؟

میری تو یہی خواہش تھی کہ میں تمھارے لئے زندہ رہتی، لیکن میرے اور میری اس خواہش کے درمیان افسوس ہے کہ تم حائل ہو گئے، اس لئے کہ تم مجھ سے ناخوش تھے اور تمھارے خیال میں تمھیں مجھ سے انتقام لینا ضروری تھا۔

اے اسٹیفن، خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں تمھارے سوا کبھی کسی سے محبت نہیں کی اور نہ تمھارے سوا کسی دوسرے کے ساتھ رہکر میرے دل کو کبھی کوئی سکون ملسکا، وہ شخص جس سے نکاح کرنے کی پاداش میں تم نے مجھ سے انتقام لینا پسند کیا، کبھی اس قابل نہ ہوا کہ اس محبت کو جو مجھے تمھارے ساتھ تھی ایک ذرہ بھی کم کرسکتا، اسلئے اگر تم میری غلطیوں سے چشم پوشی کر لیتے اور اپنے علم کو میری جہالت کی پردہ پوشی کی اجازت دیتے تو تم اپنے سامنے ایک ایسی لڑکی کو دیکھتے جو اپنے جذبات و میلانات کے لحاظ سے بالکل کنواری تھی۔

محبت کا پیالہ ہمارے سامنے چھلک رہا تھا اور ہمارے لئے بھی مناسب تھا کہ ہم اسے ایک ایک قطرہ کرکے پیتے یہانتک کہ اسکے آخری قطرے تک پہونچ جاتے اور پھر ہم دونوں ایک ساتھ خوشی خوشی مر جاتے، لیکن افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور ہم ایسے ہو گئے کہ اگر جئیں بھی تو لطف زندگی نہیں پاسکتے، اور اگر مریں بھی، تو آرام کی نیند نہیں سوسکتے۔

اے اسٹیفن، تم مجھے معاف کیوں نہیں کر دیتے، حالانکہ زمانہ میرے گناہوں کی پاداش میں مجھ سے سخت انتقام لے چکا ہے، اس نے مجھ سے وہ دولت چھین لی جسے دیکھ کر میں تم سے غافل ہو گئی تھی، وہ شوہر مجھ سے لے لیا جس کی خاطر میں نے تم سے بے وفائی کی تھی اور محبت کی اس چنگاری کو جو میرے دل کی تاریکیوں کو روشن کر دیا کرتی تھی، ایک ایسی کھا جانے والی آگ بنا

میں بدل دیا جو اس کے گوشے گوشے میں بھڑک اُٹھی اور اسکی گہرائیوں تک سرایت کر گئی اور مجھ میں ایسی کوئی جگہ نہ چھوڑی جہاں تمہارا غضب وانتقام سما سکے —— اے اسٹیفن کیا تم جانتے ہو وہ کون عورت تھی، کل جسکے پاس بیٹھے ہوئے تم ملامت و سرزنش کر رہے تھے، اور اسکے گناہوں کو ایک ایک کر کے گنا رہے تھے اور اسکی ذلت و خواری کے منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے؟ —— وہ کچھ نہ تھی مگر ایک تباہ و برباد ہستی، جسکے احساس و شعور اور آثار حیات میں اسے ایک ایسی آنکھ کے علاوہ جو کھلی ہو اور دیکھتی نہ ہو، ایک ایسے کان کے علاوہ جو سنتا ہو مگر سمجھتا نہ ہو، اور ایک اپنے نفس کے علاوہ جو ہر چیز سے حتیٰ کہ خود اپنی ہستی سے بھی بے خبر ہو، زمانہ نے کچھ نہ چھوڑا ہو —— یہی وہ عورت تھی جس پر تم نے ظلم کیا اور اسکی محرومی و ناتوانی پر ذرا ترس نہ کھایا اور اپنے مضبوط اور سخت ہاتھ کو اسکی طرف بڑھا کر اسے زخمی کر دیا حالانکہ وہ خود ہی زخموں سے چور چور تھی، اور پھر اس بری طرح زخمی کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکی —— اے اسٹیفن میں نے تمہیں معاف کیا۔ کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں جانتی ہوں کہ تم نے مجھ پر یہ تمام مظالم صرف اس لئے گوارا کئے کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت تھی۔ پس تم اپنی بخشش و مغفرت سے مجھے محروم نہ کرو اور ایک دفعہ پھر مجھے اپنے دل کی اُنھیں گہرائیوں میں جگہ دیدو جہاں اس سے پہلے مجھے جگہ دیا کرتے تھے اور جس کی خاطر میں آج اپنی زندگی قربان کر رہی ہوں۔ لیکن اگر تمھارے مذہب میں، ان کے گناہوں کا انتقام لینا ضروری ہو تو خدا کے لئے اس یتیم اور مسکین بچّی سے میرے گناہوں کا انتقام نہ لینا، جس کا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے۔ —— ہر چند وہ ایک ایسی عورت کی بچّی ہے جسنے تمہارے ساتھ بیوفائی کی ہے تاہم وہ اس عورت کی بھی بچّی ہے جسنے تم سے محبت کی ہے۔ میں اس وقت اسے تمہارے فضل وکرم کی پناہ میں دیتی ہوں جب تک تم زندہ ہو وہ زندگی کی تلخیوں سے ناآشنا رہے اور تمھاری آنکھوں کے سامنے زمانہ کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت اس پر نہ آئے —— اس سے پہلے بھی تم اسکے ماں باپ پر احسانات کرتے رہے ہو، اسے اپنے سینہ سے لگا لینا، آلام حیات اور مصائب روزگار کے مقابلہ کے لئے تنہا نہ چھوڑ دینا اور جس وقت وہ اپنی زندگی کے راستے میں سب سے بڑے پتھر کو ہٹا رہی ہو، اسوقت تم اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لینا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑے اور پھر اس بات کو بھی کبھی نہ بھولنا کہ اسکی ماں اس سے بیحد محبت کرتی تھی، اور اسنے موت کو زندگی پر صرف اسلئے ترجیح دی کہ وہ خود بدبخت اور ستائی ہوئی تھی اور ڈرتی تھی کہیں اسکی بدبختی کا اثر اسکی بچّی کی زندگی پر نہ پڑے

اے اسٹیفن رخصت! اے سارے جہان سے پیارے انسان رخصت! — اب میں اس زندگی کو چھوڑ رہی ہوں اور اس وقت تم ہی وہ شخص ہو جسکے متعلق سوچ رہی ہوں اور جس کی جدائی پر کف افسوس مل رہی ہوں۔ مجھے بھول نہ جانا اور کبھی کبھی میری قبر پر آتے رہنا، اگر سطح زمین پر قبر مجھے نصیب ہو، اور میری اس امانت کی حفاظت کرنا جو میں تمہارے سپرد کئے جا رہی ہوں۔

اچھا اے اسٹیفن رخصت! اب میں اپنی زندگی کے ان آخری لمحوں میں بس اسی قدر کہنا چاہتی ہوں کہ میں تم سے محبّت کرتی ہوں، اور تمہاری خاطر جان دے رہی ہوں۔

قبرستان

کہیں دوسرے دن شام کو اسٹیفن کے ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے اور آنکھیں کھولکر اسنے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ فرتز اور اسکے بیوی بچے قریب بیٹھے ہوئے رو رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ ان کو دیکھتا رہا لیکن پھر فرتز کی طرف متوجہ ہوکر بولا:۔ "کیا تم لوگوں نے دفن کردیا؟" فرتز نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور آہستہ سے کہنے لگا: "ہاں کل ہی دفن کردیا تھا" پھر بچی کو پوچھا تو معلوم ہوا کہ جوزفین کے پاس پڑی اسکے بعد پوچھا خط کہاں ہے؟ اور خط لیکر اُسے گھر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ وہ اپنے بیوی بچوں کو لیکر وہاں سے چلا آیا۔— جب اسٹیفن تنہا رہ گیا تو اسنے خط پڑھنا شروع کیا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کسقدر رویا۔ اسکے بعد اس پر بیہوشی کا دورہ پڑا اور جب آدھی رات کے بعد اسے ہوش آیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ دیوانہ ہوگیا ہے۔

وہ باغ میں نکل گیا اور کان لگا کر ہر طرف سننے لگا لیکن وہاں کوئی آواز نہ تھی اسنے دیکھا کہ باغبان اپنی کوٹھری میں پڑا ہوا سو رہا ہے اور اس کی کدال کوٹھری کے دروازے پر پڑی ہوئی ہے اسنے اسے اُٹھا لیا اور باغ کا دروازہ کھولکر چپکے چپکے باہر نکل آیا— اور قبرستان کا رُخ کیا— اس وقت تاریکی بہت گہری تھی، ہوائیں تیز چل رہی تھیں اور بادل چاند کے چہرے پر چھائے ہوئے تھے۔ قبرستان کو تین طرف سے ایک نیچی سی دیوار گھیرے ہوئی تھی جو کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور متعدد رخنے اور شگاف اس میں موجود تھے، اور اسکی چوتھی سمت دریائے جو تنج بہتا تھا، دریا کے کنارے کنارے اونچے اونچے اور گھنے درخت تھے۔ تند و تیز ہوائیں جب ان کے پتوں اور شاخوں کو زور سے جھنجوڑتیں تو انکی کھڑکھڑاہٹ دریا کے بہتے ہوئے پانی کے شور سے ملکر بہت مہیب آواز پیدا کرتی —— اسٹیفن اپنے راستہ پر چلا جارہا تھا یہاں تک کہ ان درختوں کے سرے اسے نظر آنے لگے اور انکے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اسے سنائی دینے لگی اور انکے نیچے سے اُبلتے ہوئے پانی کا شور اسکے کانوں میں پہونچنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ بھوتوں کے سیاہ سائے ہیں جو رات کی تاریکی میں ناچتے گاتے اسکی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں— لیکن وہ بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ قبرستان پہونچ گیا، چاند جب ذرا نکل آتا تو اسے راستہ ملجاتا تھا اور پھر ذرا دیر بعد جب بادلوں میں چھپ جاتا، تو وہ بھی چلتے چلتے رک جاتا تھا۔ چاند کی ہلکی سی روشنی میں وہ قبروں کو دیکھتا ہوا چلا جارہا تھا۔ جن کی مٹی خشک ہوچکی تھی اور ان پر لگے ہوئے پودے سوکھ چکے تھے کیونکہ اب ان کے لگانے والوں کے دلوں کا غم پرانا ہوچکا تھا اور وہ انکی نگہداشت سے غافل ہوگئے تھے— اسی طرح وہ قبروں کو ڈھونڈتا بھالتا چلا جارہا تھا، کہ اسے ایک نئی قبر دکھائی دی جسکی مٹی ابھی تک تر و تازہ تھی۔ چاند کی ہلکی سی روشنی میں جو اسوقت اس پر پڑنے لگی تھی، اسنے "ماجد ولیین" لکھا ہوا دیکھا، وہ اپنے دونوں گھٹنوں پر جھک گیا اور آہستہ آہستہ کچھ دعا پڑھی۔ اسکے بعد وہ سیدھا کھڑا ہوگیا اور اس کدال کو جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا اُٹھا لیا اور قبر کھودنے میں مشغول ہوگیا۔ کھودتے کھودتے اسکی کدال کسی ایسی چیز سے لگی جس سے ایک سخت آواز پیدا ہوئی اور خاموش فضا گونج گئی۔

اس کا سارا جسم کانپنے لگا، خون اسکی رگوں میں جمگیا، گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا اور کدال اسکے ہاتھ سے چھوٹ گئی

کدال در اصل اس تابوت پر پڑی تھی جس میں نعش رکھی ہوئی تھی، لیکن وہ غلطی سے یہ سمجھا کہ شاید وہ میت کے سر سے ٹکرائی ہو۔
اس وقت چاند بڑی آب و تاب سے بادلوں کے پیچھے سے نکل آیا تھا، اور تمام مقبرہ روشن ہو رہا تھا اور اسے ایسا نظر آ رہا تھا گویا تمام قبریں کھل گئی ہیں اور مُردے، اپنی اپنی قبروں سے جھانک رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر وہاں سے لوٹ آیا اور جب گھر پہونچا تو تھک کر گر پڑا اور زور زور سے کہنے لگا کہ "ہائے میں نے اسے قتل ہی نہیں کیا بلکہ اس کی صورت بھی بگاڑ دی"، پھر وہ مالی کو لے کر قبرستان گیا۔ چاندنی اس وقت بھی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، اسٹیفن سیدھا قبر تک گیا اور اس پر جھک گیا اسنے دیکھا کہ کدال کا نشان تابوت پر بنا ہوا ہے اور اپنے اُس خیال کی کوئی علامت اسے نظر نہیں آئی، اس نے مالی سے کہا کہ قبر پر مٹی ڈالکر اسے پہلے کی طرح درست کر دو۔ جب وہ اسے ٹھیک کر چکا تب اس نے اسے کدال اُٹھا کر گھر جانے کا اشارہ کیا اور وہ خود قبر کے برابر بیٹھ گیا، اس کی مٹی کو چومنے اور آنکھوں سے لگانے لگا اور چیخ چیخ کر رونے لگا کہ "اے ماجد ولین میری تو یہی آرزو تھی کہ میں تمھارے پہلو میں دفن ہوتا لیکن افسوس کہ یہ تمنا بھی پوری نہ ہو سکی، تاہم میں جانتا ہوں کہ یہ دن بھی کچھ دور نہیں ہے"۔

اسٹیفن اس روز سے بہت افسردہ خاطر اور غمگین رہنے لگا۔ اب وہ زندگی کو اس مسافر کی نگاہ سے دیکھنے لگا جو کسی ایسے گھر میں جا اُترے جہاں اس سے پہلے کبھی نہ اُترا ہو اور وہاں اس کا دل نہ لگے، اس کا حال روز بروز زبوں تر ہوتا گیا، وہ لوگوں سے نفرت کرنے اور انھیں دیکھ کر گھبرانے لگا اور ان کی آوازیں اسکے کانوں پر گراں گزرنے لگیں۔ حتےٰ کہ اسنے دوستوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ماجد ولین کا خیال، اسکے دریا میں ڈوبنے کا نظارہ، سطح آب پر اس کے بھورے اور سنہرے بالوں کے تیرنے کا منظر اور مدد کے لئے اس کا اپنے دونوں ہاتھوں کو بڑھانا لیکن کسی مددگار کو نہ پانا اور ڈوب جانا، ہر وقت اسکے سامنے رہنے لگے ——— ان باتوں کو یاد کر کے اس کے دل کو وہ اذیت ہوتی کہ اسے کسی طرح چین نہ ملتا تھا۔ اور وہ چیخ چیخ کر یہی کہتا تھا کہ ہاں میں نے ہی اسے قتل کیا ہے، میں نے ہی اس کے جگر کے ٹکڑے کو اس سے چھینا ہے، میں بھی کس قدر بدبخت اور بدنصیب ہوں۔ میری تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ میں ان تمام لوگوں کو جو اس زمین کے اوپر مجھ سے محبت کرتے ہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں، اور ان کے بعد بدنصیب اور گرفتار عذاب ہو کر ان پر ماتم کرنے کے لئے رہ جاؤں، نہ انھیں فراموش کر سکوں اور نہ اُن تک پہونچ سکوں۔

بیتھوون

کو بلانس کی مجلسوں، اور محفلوں میں اب اسٹیفن بالکل شریک نہ ہوتا تھا اور جب اسکے احباب کو حالات معلوم ہوئے تو انھیں بڑی فکر پیدا ہوئی کہ مبادا زمانہ کا بیرحم ہاتھ اس باکمال ہستی کو انکے ہاتھ سے چھین لے۔ چنانچہ ان حالات کے پیش نظر انھوں نے ایک بڑا جلسہ کیا، جس میں موسیقی کے بڑے بڑے ماہر، مشہور و مشہور تمثیل نگار، اور اصحاب شعر و ادب نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ اُس کی ملاقات کے لئے اسکے گھر چلنا چاہئے اور اس وقت تک اسکے پاس ٹھہرنا چاہئے جب تک کہ وہ اپنی اس گوشہ نشینی کو خیر باد نہ کہدے، اور اپنی پہلی زندگی کی طرف واپس نہ لوٹ آئے۔

چنانچہ انھوں نے اسے لکھا کہ ہم لوگ کل تمھاری ملاقات کے لئے آنے والے ہیں اور دوسرے روز شام کو یہ سب لوگ اپنی اپنی گاڑیوں پر سوار ہوکر، اور ان میں سے اکثر اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو ہمراہ لیکر اسکے گاؤں پہونچ گئے۔ اسٹیفن نے ان لوگوں کا استقبال بڑی خندہ روئی اور کشادہ پیشانی سے کیا، اور یہ کسی طرح ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اپنے پہلو میں کوئی رنج و غم چھپائے ہوئے ہے —— وہ لوگ اسے اس حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ یا تو وہ اپنے غم سے نجات پا چکا ہے یا عنقریب پانے والا ہے، اور یہ ہلکی سی زردی جو ہر وقت اس کے چہرے پر چھائی رہتی ہے گزشتہ واقعات کا اثر ہے جو خود بخود جاتا رہیگا اسٹیفن نے ان لوگوں کے رات کے کھانے کے لئے اپنے باغ میں ایک وسیع دستر خوان بچھوایا اور یہ سب مرد عورت جو تیس سے کچھ زیادہ تھے وہاں جاکر بیٹھ گئے اور وہ خود بھی ان سب کے درمیان میں بیٹھا ہوا اپنی دلچسپ اور لطیف باتوں سے سامان دلچسپی فراہم کرتا رہا تھا —— جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہوگئے تو چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بناکر باغ میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ یہانتک کہ رات کا کچھ حصہ گزر گیا۔ اس وقت ان میں سے ایک شخص نے یہ خواہش کی کہ باغ کی فضا میں پیانو منگوایا جائے اور پھر جو شخص بھی پسند کرے اسے بجانے کی تکلیف دیجائے۔ چنانچہ پیانو منگوایا گیا اور سب سے پہلے فرڈریک اٹھا اور موسیقار عظیم بیتھوفن کے راگوں میں سے ایک راگ بیٹھ کر گانے لگا —— سامعین اس راگ کو سنکر بیحد متاثر ہوئے اور ان میں سے ایک شخص کہنے لگا: سچ تو یہ ہے کہ بیتھووِن خدا کا ایک رسول تھا، کیونکہ تمام ماہرین موسیقی میں تنہا وہی شخص تھا جس نے فطرت کی زبان میں باتیں کیں اور اسی کے نغموں اور ترانوں کو دہرایا —— یہ سنکر شاعر سید روف کہنے لگا، اگر ہم میں سے کسی شخص کو اس کے آخری زمانے کے حالات معلوم ہوں تو براہ کرم بیان کرے۔ اسٹیفن کہنے لگا، میں آپ لوگوں کو اسکے حالات سناؤنگا میرا اُستاد ہومل اسکی زندگی کے آخری دنوں میں اس کا رفیق رہا تھا اور مرنے کے بعد اس نے اُسے اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا تھا۔ وہ اکثر زندگی کے آخری ایام کا تذکرہ کیا کرتا تھا اور پھر انھیں یاد کرکے گھنٹوں روتا رہتا تھا، چنانچہ میں آپ لوگوں کے سامنے اسی طرح بیان کرتا ہوں جس طرح کہ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا —— زمانہ نے بیتھووِن کے ساتھ جس بے رحمی کا سلوک کیا، وہ کسی کامل فن کے ساتھ کسی زمانہ میں نہ کیا گیا ہوگا۔ اس نے اس دُنیا کے لئے کیسے کیسے ملکوتی نغمے ایجاد کئے، لیکن دُنیا نے کوئی پروانہ کی، اسی کے ساتھ اسکے ہم پیشہ حاسدوں کی مصیبت بھی کچھ کم نہ تھی۔ یہی وہ لوگ تھے جو اس کے سامنے آکر اسکا راستہ روک لیتے تھے اور جب کبھی وہ انکے سامنے اپنا ستار لیکر کھڑا ہوتا تو یہ اس کا استہزا کرتے —— یہاں تک کہ انھوں نے اس کی زندگی کو مکدر کر دیا اور اپنی عظمت و شہرت میں خود اسے بھی شک ہونے لگا۔ اگر اس کا دوست ہومل جو اس کے لئے ایک سچے آئینہ کی طرح تھا اور جس میں کبھی کبھی وہ اپنے صحیح خدوخال دیکھ لیا کرتا تھا موجود نہ ہوتا تو یقیناً عالم یاس و نومیدی میں وہ موسیقی سے دست بردار ہو چکا ہوتا، پھر بھی گھبرا کر وہ نکل کھڑا ہوا اور شہر در شہر وں پھرنے لگا اس حال میں کہ اس کے پاس اسباب رزق میں سے سوائے اسکے ایک ستار کے اور کوئی دوسری چیز نہ تھی وہ جنگلوں بیابانوں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر جہاں فطرت کی آواز کے علاوہ کوئی دوسری آواز اسے سنائی نہ دیتی تھی، اپنے ستار کے تاروں پر اپنے

رنج وغم کو ظاہر کرتا اور ایسی حالت میں جبکہ وہ فاقے سے ہوتا، وہ بڑے عظیم المرتبت نغمے ایجاد کرتا، بسا اوقات ایسا ہوتا کہ وہ گھومتے گھومتے دریائے ڈینوب کے کنارے تک جا پہونچتا، اور اسکے ساحلوں پر گھومتا رہتا اور اگر دریا اپنے جانداروں میں سے کسی چیز کو اپنے کنارے پر پھینکدیتا، تو وہ اسے اُٹھا کر کھالیتا، یہاں تک کہ اس کے دوست ہوآل کو اسکی خبر ملتی اور وہ اسے آبادی کی طرف واپس لے آتا ـــــ پھر اسے اس حالت تک پہونچا کر بھی زمانہ کو چین نہیں پڑا، اور اسے اس کے آخری زمانہ میں بہرا کردیا، لیکن اسے اس حادثہ کا کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا، بلکہ اپنے دل میں کہنے لگا: "خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اسنے مجھے ان لوگوں کی آدھی شرارت سے محفوظ کردیا کاش ایسا ہوتا کہ وہ مجھے نصف آخر سے بھی اپنی حفاظت میں لے لیتا۔ تاکہ نہ میں ان کی صورتوں کو دیکھتا اور نہ ان کی آوازوں کو سُن سکتا ـــــ اخیر میں وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ اور شہر بادن کے قریب ہی ایک جنگل میں چلا گیا اور تن تنہا وہاں رہنے لگا۔ نہ اپنے دل کی آواز کے علاوہ کوئی دوسری آواز سنتا اور نہ ان اندرونی نغموں کے علاوہ جو ہر وقت اور مسلسل اسکے دل کی گہرائیوں میں بلند ہوتے رہتے، کوئی دوسری چیز اس کے کانوں تک پہونچتی۔ ہاں کبھی کبھی وہ اپنے دوست ہوآل سے مل لیتا تھا، چنانچہ جب کبھی وہ اسکے پاس جاتا تو اسے اپنے نئے نئے نغمے سنایا کرتا ـــــ وہ اپنی اس عزلت وتنہائی میں بھی بہت دنوں تک نہیں رہ سکا، کیونکہ اُسکے ایک بھانجے کا جو کردیانا میں رہتا تھا اور جسے اس نے اسکے بچپن ہی سے اپنا متبنی بنایا تھا اسکے پاس ایک خط آیا، جس میں لکھا ہوا تھا کہ اس پر ایک سخت تہمت لگائی گئی ہے، اور بغیر اسکے آئے ہوئے اس سے نجات پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

چنانچہ وہ اپنے دوست ہوآل سے ملے بغیر روانہ ہوگیا۔ اس وقت اس کے پاس اتنے روپے بھی نہ تھے جو اس سفر کے لئے کافی ہوسکتے۔ چنانچہ کبھی پیدل اور کبھی بار برداری کی گاڑیوں پر سوار ہوکر وہ اپنا یہ طویل سفر طے کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ بہت تھک گیا اور چلنے سے عاجز ہوگیا۔ منزل مقصود ابھی تک بہت دور تھی کہ ایک رات اس کا گزر ایک ایسے چھوٹے سے گھر پر ہوا جو گاؤں سے باہر بنا ہوا تھا وہ اسکے دروازے پر جاکر کھڑا ہوگیا اور ہلکے ہلکے اسے کھٹکھٹانے لگا۔ صاحب خانہ باہر آیا اور کہنے لگا کیا کام ہے۔ اس نے کہا "میں ایک بوڑھا، بہرا مسافر ہوں، رات ہوچکی ہے اور تکان کی زیادتی سے اب آگے بڑھنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔ آپ براہ کرم مجھے اپنے یہاں ایک رات ٹھہر جانے کی اجازت دیجئے اور اگر مناسب سمجھیں تو میرے لئے روٹی کے چند ٹکڑوں کا بھی انتظام کردیجئے" ـــــ چنانچہ اس شخص کو اس پر ترس آگیا اور اسے اپنے گھر میں لے آیا، اور بہت ہی عزت واحترام کے ساتھ لیجا کر بٹھا دیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر وہ ہال کے ایک کونے میں انگیٹھی کے قریب جاکر بیٹھ گیا اور صاحب خانہ جو موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا۔ پیانو کے سامنے جاکر بیٹھ گیا، اور اپنی دونوں بیٹوں کو بھی ستار اُٹھانے کا اشارہ کیا۔ بیتھوون اسے گاتا دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ہرچند وہ نہ سُن سکا کہ یہ کیا گارہے تھے لیکن انکی کیفیت سے یہ اندازہ کرسکا کہ ـــــ یہ لوگ جس گیت کو گارہے تھے اس کا ان کی طبیعتوں پر گہرا اثر تھا۔

بیتھوون اپنی جگہ سے اُٹھا اور انکے پاس جاکر کہنے لگا، "دوستو! میں تمہارے گانے کو کچھ بھی نہ سُن سکا۔ ہاں

اسی قدر سمجھ سکا ہوں کہ یہ بہت ہی پُر اثر نغمے تھے، اس مصیبت کے نازل ہونے سے پہلے جسمیں تم مجھے دیکھ رہے ہو میں بھی موسیقی کا از حد دلدادہ تھا اور مجھے اپنی زندگی میں گانے سے زیادہ کوئی چیز مرغوب نہ تھی۔ کیا تم مجھے اجازت دیتے ہو کہ موسیقی کے اس ورق کو ایک نظر میں بھی دیکھ لوں اور جس گیت کو تم اس وقت گا رہے تھے اسے پڑھ لوں ــــ اس نے وہ ورق اسکی طرف بڑھا دیا، اور بیتھوون اس پر جھک کر اسے پڑھنے لگا اور جوں ہی اس کی نظر اس پر پڑی اس کا رنگ زرد پڑ گیا، اس کا ہاتھ کانپنے لگا اور اس کی پیشانی پسینہ سے تر ہوگئی اور زور زور سے رونے لگا ــــ اسے روتا دیکھ کر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے اور چاروں طرف سے اسے گھیر کر اسکے رونے کا سبب پوچھنے ــــ اسنے کہا: میرے عزیزو یہ گیت میرا ہی ہے اور میں ہی بیتھوون ہوں ــــ وہ لوگ یہ سُنکر گھبرا گئے اور تھوڑی دیر تک تو عالم حیرت و وارفتگی میں اسے دیکھتے رہے پھر انھوں نے اپنے اپنے سروں سے اپنی اپنی ٹوپیاں اُتار لیں اور انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ اسکے سامنے جُھک گئے اور یکے بعد دیگرے اسکے ہاتھوں کو لیکر چومنے لگے اور یہی ساعت اس کی زندگی کی وہ ساعت تھی جس میں وہ عزت و احترام کی لذت سے آشنا ہوا اور یہی وہ ساعت تھی جب موت کا پرندہ اسکے سر پر سے اُڑتا ہوا نکل گیا کیونکہ ٹھیک اسی وقت اس نے اپنے پہلو میں ایک تکلیف دہ چمک محسوس کی، اور جہاں تھا وہیں گر پڑا۔ لوگوں نے اسے اپنے ہاتھوں پر لے لیا اور لیجا کر بستر پر لٹا دیا اور تمام رات اسکے سرہانے بیٹھے ہوئے اسکی تیمار داری میں مصروف رہے، کبھی تو اسکی حالت ذرا سنبھل جاتی اور کبھی پھر بے ہوش ہو جاتا ــــ اس کا دوست ہوفل اسکے اس سفر سے واقف ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ بھی اسکے پیچھے پیچھے، دیکھتا بھالتا، پوچھتا پچھتا چلا آرہا تھا، یہاں تک کہ اسے اس گاؤں کا پتہ چلگیا جہاں وہ اُترا تھا، اور اس گھر کا بھی جس میں وہ ٹھیرا تھا اور وہاں اسے دم توڑتے دیکھ کر رونے اور ماتم کرنے لگا تھوڑی دیر بعد بیتھوون کو اس کی موجودگی کا علم ہوا، اسے دیکھ کر وہ مسکرایا اور کہنے لگا "اے ہوفل کیا تم اپنے ساتھ میرے لئے میرا ستار بھی لائے ہو؟" ہوفل کہنے لگا: "جی ہاں لایا ہوں، لیجئے آپ کا یہ ستار حاضر ہے"۔ پس اسنے وہ ستار اسکے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے ایک ہاتھ کا سہارا لیکر اُٹھا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ان سب لوگوں کے سامنے اپنا مشہور اور پُر درد گیت "اے رب تو نے مجھے کیوں بد قسمت بنایا حالانکہ میں نے تیرے بندوں میں سے کسی کو نہیں ستایا" گانے لگا اور اسے ختم کرتے ہی اسکے دونوں ہاتھ کانپنے لگے، اس کی دونوں آنکھیں اُبھر آئیں اور پسینہ اسکی پیشانی پر بہکر ٹپکنے لگا۔ وہ اپنے تکیہ پر گر پڑا اور موت کی غشی اس پر چھا گئی۔ پھر ذرا دیر بعد اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے دوست ہوفل کو اپنے برابر بیٹھا ہوا دیکھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا: "اے ہوفل، کیا میں اپنی زندگی میں بڑا آدمی نہ تھا؟" وہ کہنے لگا "کیوں نہیں؟ بے شک آپ تو بہت بڑے آدمی تھے" یہ سُنکر اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا، اور اس نے اپنی آنکھیں یہ کہتے کہتے بند کرلیں: "اب میں اس دنیا سے بامراد رخصت ہو رہا ہوں" اس کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

نغمۂ موت

اسٹیفن نے یہ قصہ ابھی پوری طرح ختم بھی نہ کیا تھا کہ اسکے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور اسکا سر زمین کی طرف جھک گیا اس حالت میں دیکھ کر لوگ اسکی طرف متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ سے دل کو تھامے ہوئے ہے اور آنسو اس کے رخسار پر بہ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان میں سے ایک شخص نے پوچھا: "کیوں رو رہے ہو؟" تھوڑی دیر تو وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا پھر بولا، "میں اس شخص پر رو رہا ہوں، جو جب تک جیا بدبخت جیا اور جب مرا تو فقیر و محتاج مرا" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو اس دنیا میں کچھ کام کرنا چاہتے ہیں، یہی مقدر ہو چکا ہے کہ وہ یہاں ان عظیم الشان درختوں کی طرح زندگی بسر کریں جو کسی تپتے ہوئے جنگل میں کھڑے ہوں، گزرنے والے انکے سائے کی ٹھنڈک سے فائدہ اُٹھائیں اور وہ خود باد سموم کے جھونکوں میں جھلستے رہیں" — لوگ اسی طرح خاموش بیٹھے سُن رہے تھے کہ دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ پیانو کی کرسی کی طرف بڑھا اور حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا: "دوستو! میں تمھارے سامنے بیتھوون کے حالاتِ زندگی بیان کر چکا۔ اب اگر اجازت ہو تو میں تمھیں اسکا وہ گیت بھی سنا دوں جو وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں گایا تھا" چنانچہ اس نے وہی گیت شروع کیا: "اے رب تو نے مجھے کیوں بدقسمت بنایا حالانکہ مینے تیرے بندوں میں سے کسی کو نہیں ستایا" اور بہت ہی ہلکے اور نیچے سروں میں گانے لگا۔ لیکن اسکے جذبات اور زیادہ بھڑکنے لگے، اسکی آواز بلند ہونے لگی، اور اسکے نغمے فضا کی وسعتوں میں گونجنے لگے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ساز کے تاروں کو نہیں چھیڑ رہا ہے، بلکہ درد کی شدت سے تڑپ تڑپ کر رو رہا ہے اور اُسکی سانسوں سے اس کے جلتے ہوئے جگر کی بو آ رہی ہے — جتنا جتنا زیادہ گاتا جاتا تھا اس کا تاثر زیادہ بڑھتا جاتا تھا، اسکے جذبات اور زیادہ بھڑکتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے اور اپنے ماحول سے بیخبر ہو گیا اور وارفتگی و خود فراموشی کی ایک عجیب کیفیت اس پر طاری ہو گئی — جب وہ اپنے نغمے کے آخری حصے پر پہونچا جو زیادہ طویل اور فضا میں سب سے زیادہ گونجنے والا تھا، تو حاضرین کھڑے ہو گئے اور زور زور سے تالیاں بجانے اور "اسٹیفن زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے — ادھر یہ لوگ زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے، اسکی درازیٔ عمر کی دُعائیں مانگ رہے تھے، اُدھر اس کا سر اس کی کُرسی کی پشت کی طرف جھک چُکا تھا اس کا چہرہ کانپ رہا تھا، رنگ بدل چکا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو دبائے ہوئے تھا — یہ دیکھ کر لوگوں کے ہوش و حواس اُڑ گئے اور بستر پر لیجا کر لٹا دیا۔ طبیب نے آ کر اس کا معائنہ کیا اور پھر نگاہِ یاس سے سب کی طرف دیکھنے لگا — سب لوگوں نے نہایت خاموشی اور درد کے ساتھ گردنیں جھکا لیں، اس کے چاروں طرف آ کر کھڑے ہو گئے اور خدا کے ارادے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔ پھر فرتز کا نام لیکر پکارا جو وہیں موجود تھا۔ جب وہ سامنے پہونچا تو دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے ماجدولین کی لڑکی کا نام لیا اور جب وہ اس کے سامنے لائی گئی تو اسے اپنے سینہ سے لگایا

اور پیار کیا اسکے بعد وہ حاضرین کی طرف متوجہ ہوا اور نہایت پست اور ٹوٹے ہوئے لفظوں میں بولا:۔
"دوستو! میں تمھیں گواہ بناتا ہوں کہ میری کل دولت ان دو شخصوں کی ہے"! یہ کہکر اسنے فرتز اور ماجد ولین کی لڑکی کی طرف اشارہ کیا اسکے بعد وہ پھر غافل ہوگیا اور جب ایک گھنٹہ کے بعد اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور اپنے اردگرد لوگوں کو روتے دیکھا تو اسکے ہونٹوں پر تبسم کی ایک خفیف سی لہر دوڑ گئی اور بولا:" اے فرڈریک میں وصیت کرتا ہوں کہ تم میرے تمام گیتوں کو ایک کتاب میں جمع کر دینا، اور اے سید رؤف میں تمھیں یہ وصیت کرتا ہوں کہ تم میری زندگی کی تاریخ کو، جیسا کہ فرتز کو معلوم ہے، لکھ کر شایع کر دینا اور اے فرتز تم سے میری اتنی وصیت ہے کہ مجھے ماجد ولین کی قبر میں دفن کر دینا اور اس معصوم بچی کا ہر طرح خیال رکھنا اور جب وہ جوان ہو جائے تو کسی ایسے شخص سے جسے وہ اپنے لئے پسند کرے اس کی شادی کر دینا اور پھر میں تم سب کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ میری موت پر غمگین نہ ہونا کیونکہ اگرچہ میں اپنی زندگی میں بدقسمت رہا، لیکن جیسا کہ تم اس وقت دیکھ رہے ہو میں نہایت خوش قسمت مر رہا ہوں"
یہ کہکر اس نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

انجام

لیکن فرتز اور اس کے خاندان کی حالت سدھر گئی اور ان کی زندگی خوش حالی میں تبدیل ہو گئی۔ جسے سوائے اسٹیفن کے غم مرگ کے کوئی دوسری چیز مکدر کرنے والی نہ تھی۔ چھوٹی ماجد ولین کو فرتز نے اپنے دامنِ حمایت میں لے لیا، اور اپنے لڑکے برنار کے ساتھ پرورش کیا جس کے ساتھ اس نے اپنے بچپن میں دودھ پیا تھا اور اسے بالکل سادہ اور دیہاتی طریقے پر پالا، یہاں تک کہ وہ دونوں جوان ہو گئے اور ایک دوسرے سے نہایت شریفانہ اور پاکیزہ محبت کرنے لگے اور جسنے بعد کو شادی کی صورت اختیار کر لی، اسٹیفن کے گھر کو "جمعیتہ الموسیقی برلن" نے خرید لیا اور اُسے اسٹیفن کی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا۔ یہ گھر اس وقت تک زیارت گاہ عام و خاص ہے۔ لوگ دور دور سے اسکی زیارت کو آتے ہیں اور اُن تاریخی اوراق کو دیکھتے ہیں جنھیں شاعر سید رؤف نے مرتب کیا ہے۔ وہ اسکے باغ کو دیکھتے ہیں اور اس کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے بنفشہ کے پھولوں کو دیکھتے ہیں اور اس حوض کا جو باغ کے وسط میں بنا ہوا ہے اور اس جنگلے کا جو اس کے چاروں طرف لگا ہوا ہے طواف کرتے ہیں۔ پھر انھیں وہ کرسی نظر آتی ہے جس پر اسٹیفن اور ماجد ولین بیٹھا کرتے تھے اور پھر اس نیلگوں کمرے کو دیکھتے ہیں جو حجلۂ عروسی بننے کی جگہ ماتم کدہ بنا اور پھر اس کی لائبریری اس کے ستار اور اُس پیانو کو دیکھتے ہیں، جس پر اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اس نے نغمۂ موت گایا۔
اس گھر کی زیارت سے فارغ ہونے کے بعد لوگ مقبرہ کی طرف جاتے ہیں اور اُس قبر کو دیکھتے ہیں جہاں دونوں بدقسمت اور بدنصیب مدفون ہیں۔

اڈیٹر "نگار" کی تصانیف

توقیت
سنہ ۱ھ سے سنہ ۱۳۳۲ھ تک کے تمام اہم تاریخی واقعات۔ قیمت ۸؍

جھانسی کی رانی (ڈرامہ)
حضرت نیاز کے قلم سے حال ہی میں شایع ہوا ہے۔ قیمت ۶؍

نقشہائے رنگ رنگ
غالب کے فارسی کلام پر بے مثل تبصرہ۔ قیمت ۴؍

اصحاب کہف (ڈرامہ)
حضرت نیاز کے قلم سے جو حال ہی میں شایع ہوا ہے۔ قیمت ۱۲؍

نگارستان
حضرت نیاز کے ایام شباب کے ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔
قیمت تین روپیہ

جمالستان
اڈیٹر نگار کے افسانوں اور ادبی مقالات کا دوسرا مجموعہ۔
قیمت چار روپیہ

حسن کی عیاریاں
حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ۔ تاریخ و انشاء لطیف کا بے مثل امتزاج۔
قیمت دو روپیہ

مکتوبات نیاز (حصہ اول)
اڈیٹر نگار کے خطوط یعنی انشاء رنگین اور سلاست بیان کا بے نظیر مجموعہ۔
قیمت تین روپیہ

مکتوبات نیاز (حصہ دوم)
اس مجموعہ میں اکثر خطوط فن نقد اور شعر و شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔
قیمت تین روپیہ

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ طویل افسانہ جو سیرت نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے
قیمت ڈیڑھ روپیہ

ترغیبات جنسی
اس میں فحاشی کے تاریخی و نفسیاتی حقایق پر محققانہ انداز سے بحث کی گئی ہے
قیمت چار روپیہ

مجموعہ استفسار و جواب جلد ۲ و ۳
اُردو میں دائرۃ المعارف قسم کی پہلی تصنیف جسکی اہمیت صرف مطالعہ کے بعد معلوم ہو سکتی ہے
قیمت ہر حصہ تین روپیہ

انتقادیات (دو حصے)
حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ جس کے ادبی و انتقادی مباحث دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں
قیمت حصہ اول ۱؍ حصہ دوم ۱؍

مذاکرات نیاز
حضرت نیاز کی ڈائری ادب لطیف اور تنقید عالیہ کا بے مثل نمونہ۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد
جس میں تین مذہبی علماء کو بے نقاب کیا گیا ہے زبان و انشاء بے نظیر۔
قیمت آٹھ آنے

مذہب
اڈیٹر نگار کا وہ معرکۃ الآراء مقالہ جس میں بتایا گیا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے۔
قیمت ایک روپیہ

جذبات بھاشا
ہندی شاعری کے بے مثل نمونے۔
قیمت بارہ آنے

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ۔
قیمت بارہ آنے

فلاسفۂ قدیم
حضرت نیاز کے دو علمی مقالات کا مجموعہ۔
قیمت ایک روپیہ

فراست الید
ہاتھ کی لکیروں کا علم نہایت آسان زبان میں۔
قیمت ایک روپیہ

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں

چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کرکے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ۔ مشکی قوام۔ الائچی دانہ۔ تیل۔ عطر۔ عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ　　ٹیلی فون:۔ ہوڑہ، ۴۵۵

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

سیاسی بصیرت

حاصل کرنے کے اُردو کا واحد سیاسی ماہنامہ

نئی زندگی

مصوّر

ایڈیٹر: سید انیس الرحمٰن

قایم شدہ سنہ ۱۹۴۱ء

پڑھا کیجئے، جو محض سیاسیات پر بحث کرتا ہے

مستقل عنوانات

(۱) ایڈیٹوریل جس میں تمام ملکی سیاسیات پر سیر حاصل بحث ہوا کرتی ہے (۲) رفتار عالم۔ جس میں غیر ممالک کی سیاسیات پر دقیقہ رسی سے تبصرہ کیا جاتا ہے۔ (۳) صوبوں کی سیاسیات۔ (۴) اخبارات کی رائیں۔ یعنی مختلف ملکی مسایل پر ہندوستان کے اخبارات کیا کہتے ہیں۔ (۵) ریاستیں۔ ریاستوں کے اہم کوائف وحالات۔ (۶) دارالسلطنت۔ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی کی سیاسی سرگرمیاں۔ (۷) معلومات۔ اہم سیاسی معلومات، اعدادو شمار وغیرہ۔ (۸) ڈائری۔ ایک مہینہ کی دنیا اور ہندستان کی سیاسی ڈائری۔ (۹) صنعت وحرفت۔ (۱۰) تبصرے (۱۱) افسانے۔ (۱۲) فلمی تبصرے وغیرہ۔

ان مستقل عنوانات کے تحت ادارہ کے مضامین کے علاوہ ہر مہینے اہم ملکی وغیر ملکی سیاسی مسایل پر ہندوستان کے مفکرین علماء کرام اور رہنماؤں کے بصیرت افروز مضامین ہوا کرتے ہیں غرضکہ "نئی زندگی" ہندوستان وبین الاقوامی سیاسی کوائف کی ایک ماہانہ رپورٹ ہے جس کا مطالعہ موجودہ دور کی پیچیدہ سیاسیات کو سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے

علاوہ ازیں ہر مہینے سیاسی سرگرمیوں کی بہترین تصاویر

سالانہ چندہ ۷؍۔ ششماہی ۴؍۔ نمونہ کے لئے ۸؍ کے ٹکٹ۔ ممالک غیر سے ۱۴ شلنگ

مینجر ماہنامہ "نئی زندگی"۔ ۹۰ ہیوٹ روڈ۔ الہ آباد

جنوری سے مستقل خریدار بن جائیے

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۷ء

رسالہ عالمگیر برابر ۲۳ برس سے اُردو علم و ادب کی جو شاندار خدمات انجام دے رہا ہے اہلِ ذوق اُس سے ناواقف نہیں ہیں۔ ہندوستان کا یہ ممتاز ترین ماہنامہ عام پرچوں کے علاوہ ہر سال تین وزنی اور ضخیم خاص اشاعتیں اپنے سالانہ خریداروں کو مفت پیش کرتا ہے۔ یعنی اپریل میں افسانہ نمبر، جولائی میں سالانہ نمبر اور دسمبر میں خاص نمبر۔ حالانکہ اُن کی مجموعی قیمت چھ روپے اور ضخامت چھ سو صفحات سے کم نہیں ہوتی۔ اس گرانی و نایابی کے زمانہ میں بھی عالمگیر کے خاص اور سالانہ نمبر اُسی آن بان اور شان و شوکت سے شایع ہو رہے ہیں اور مضامین کے لحاظ سے بھی وہ رفتارِ وقت اور ماحول کے تقاضوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ چنانچہ جنوری میں خاص نمبر پیش کیا جا رہا ہے۔ جو ادبی و فنی خوبیوں کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہوگا۔ ضخامت دو سو صفحات۔ قیمت صرف دو روپے۔ سالانہ چندہ چھ روپے چار آنے مع محصول ڈاک۔ سالانہ خریداری کی رعایتوں سے مستفید ہونے کے لئے خاص نمبر سے اپنا سلسلۂ خریداری شروع کیجئے۔

خاص نمبر کے مضامین نظم و نثر کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے۔ اِس فہرست میں ہر روز قابلِ قدر اضافہ ہو رہا ہے ——— !

منیجر رسالہ عالمگیر۔ سید مٹھا بازار۔ لاہور

خاص نمبر کی ایک جھلک

شعر و سخن ———

اے جانِ من ——— جوش ملیح آبادی
شاہِ خوباں آ گیا ——— ڈاکٹر تاثیر
نغمہ و رقص ——— فراق گورکھپوری
خواجہ فرید ——— سید عطاء اللہ بخاری
کھیل ——— اثر لکھنوی
نغمۂ موج ——— راز یزدانی
بیوہ اور برسات ——— ثاقب کانپوری
دو آتشہ ——— ماہر القادری

علم و ادب ———

صولت سکندری ——— مہر محمد خاں شہاب
حالی غزلگو کی حیثیت میں ——— حامد حسن قادری،
اسلوبِ بیان ——— محمد عظیم
سلامِ جلیل ——— احمد علی شاب

افسانے اور ڈرامے ———

حُسنِ خوابیدہ ——— شبلی۔ بی، کام
شادی طے ہو گئی ہے ——— ستیش بترا۔ ایم۔ اے
کاش میں بھول سکتا ——— ظہور الحسن ڈار
اِک تیرے جانے سے پہلے ——— طفیل ملک
پرندے ——— ایوب سرور
پھانسی ——— معظم علی ایم۔ اے
ٹیلی گرام ——— مقبول حسین احمد پوری
کرٹ وارس ——— رحمٰن مذنب،
ناؤ ——— شاہین،
جھلکیاں ——— زینت جہاں بی۔ اے
چھایا پاتر ——— برق صہبائی

(نامکمل)

تن درستی
اور
چہرے کا قدرتی حسن
عُمدہ و صاف خون
کا آئینہ دار ہے

موسموں کی تبدیلی کے وقت بالخصوص موسم بہار
اور برسات میں خون کمزور اور ناصاف ہو جاتا ہے اور
انسان پھوڑے، پھنسیوں، خارش، داد، اگزیما
اور دوسری خون کی بیماریوں اور کمزوری کا شکار
ہو جاتا ہے،

صافی نہ صرف خون کو صاف کرتی ہے
بلکہ اسے طاقت ور بناتی ہے انسان کو چست اور
صحت مند رکھتی ہے صافی کو استعمال میں رکھنے
والے امراض سے محفوظ رہتے ہیں اور مریض جلد
مرض سے نجات پاتے ہیں
صافی بچے، بڑے اور عورت مرد سب استعمال
کر سکتے ہیں
صافی قبض نہیں رہنے دیتی،

صافی

خُون صاف کرنے کی قدرتی دوا
خون کو تازہ کرتی ہے
چُست رکھتی ہے

ہمدرد دواخانہ دہلی

HAMDARD DAWAKHANA LABORATORIES, DELHI

چند معیاری کتابیں

تاریخ السلام سید امیر علی کا مکمل سلیس اور با محاورہ ترجمہ از باری علیگ ۸ر

بانگ درا ... اقبال ... للعہ
بال جبریل --- " --- للعہ
ضرب کلیم --- " --- ے
زبورِ عجم --- " --- للعہ
شعلہ و شبنم --- جوش --- صہ
نقش و نگار --- " --- ۸ر
آیات و نغمات --- " --- صہ
شعرستان --- اختر شیرانی - عہ
الطاف کے گیت - الطاف مشہدی عہ
تعلقہ --- حاجی لقلق --- ۸ر
رنگ لبست --- اثر لکھنوی --- عہ
پیام شباب -- قاضی نذرالاسلام - ۸ر
کلیات فانی -- فانی --- ۶ے
مثنوی شہید ناموس - شاد ملیح آبادی - ۱۲ر
نقش چغتائی - دیوان غالب مصور عہ

مقالات جمال الدین افغانی - سلیم ڈی ایم اے ۸ر
پطرس کے مضامین -- پطرس -- عار
کیلے کا چھلکا --- سندباد جہازی - عار
جغرافیہ پنجاب مزاحیہ " " عہ
خوفناک دنیا کامل - سید محمد علیشاہ ۱۲ر
دہلی چلو --- شورش کاشمیری - ے
اُردو ادب جنگ عظیم کے بعد - ڈاکٹر عبد ۱۲ر
منٹو کے مضامین -- منٹو --- ۱۴ر
جاہ و جلال --- تبسم --- ۸ر
دروازہ -- کرشن چندر --- عار
گنج ہائے گرانمایہ - رشید احمد صدیقی - عار
لیلے کے خطوط - قاضی عبدالغفار ۸ر
مجنوں کی ڈایری " " ۸ر
اسنے کہا --- " " ۸ر
جواب --- کرنل مجید ملک -- عہ

خودکشی (ناول) --- ٹالسٹائی --- ے
افسانۂ زریں " --- اسماء بیگم --- ۸ر
شب غم -- " --- ایم اسلم --- ۱۴ر
خار و گل -- " --- " --- للعہ
طوفان --- " --- ٹیگور --- ے
نشان راہ -- " رشید اختر ندوی - ۸ر
کانٹوں کی سیج -- " --- ۸ر
نسیم -- " --- ۸ر
محمد بن قاسم " نسیم حجازی -- صہ
حیات محمد علی جناح - رئیس احمد جعفری ۸ر
غبار خاطر --- ابوالکلام آزاد -- للعہ
جرم و سزا -- باری علیگ --- ۸ر
فلسفۂ عجم --- اقبال --- ۸ر
مزاحیہ ڈرامے - خلیل --- ۶
گفت و شنید -- بشیر ہاشمی -- ۶

نوٹ:- مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

منیجر اُردو اکیڈمی لوہاری گیٹ لاہور

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے:-

عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے
مال اور مسافروں کو بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے لکھئے۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

معجون عنبری

[illegible]

ضرورت رشتہ

ایک معزز خاندان کے صحیح و توانا نوجوان (ام۔اے، ال۔بی) کے لئے جو محکمہ اکسائز میں انسپکٹر کے عہدہ پر مامور ہے، رشتہ کی ضرورت ہے۔ لڑکی قبول صورت، سلیقہ مند، خوش مزاج اور شریف خاندان کی ہونا چاہیے۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اس پتہ سے کی جائے:- ع۔ ز۔ بذریعہ منیجر نگار لکھنؤ

YOUR PITUITARY GLAND

آپ کا غدہ نخامیہ

BRAIN

اسے قدرت نے بھیجے کے درمیان ہڈیوں کے ایک نہایت مختصر گہوارے میں محفوظ رکھا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق اس سے ۶ ـــ ۷ مختلف قسم کے کیمیائی اجزا کی تراوش ہوتی ہے، اسی لئے اسے شاہ غدد کہتے ہیں یہ کیمیاوی جوہر جسم انسانی میں مختلف کام کرتے ہیں ایک ہڈیوں کی بالیدگی پر نظر رکھتا ہے اگر اس جوہر کی تراوش بند ہو جائے تو انسان بونا رہ جاتا ہے اور توالد وتناسل کی قوت باقی نہیں رہتی دوسرا جوہر جنسی غدود (سیکسول گلینڈ) پر کنٹرول رکھتا ہے، اور مردانہ قوت کو قائم رکھتا ہے دوسرے جوہر خون کے دباؤ کو درست رکھتے ہیں،

MAJUN
SHABAB-AWAR

معجون شباب آور

غدہ نخامیہ کے ان افعال کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے خاص قسم کی دواؤں اور جوہروں سے اس میں وہ تاثیر پیدا کی گئی ہے کہ یہ اس غدد کے افعال کو منتظم رکھتا ہے، اسی لئے شباب آور تن درستی برقرار رکھتا ہے، جسم کا نشوونما کرتا ہے، مردانہ قوت پیدا کرکے اسے بحال رکھتا ہے بہادر اور شجاع بناتا ہے کمزور نہیں ہونے دیتا۔ جنرل ٹانک ہے ذرا سی سستی اور تھکن اس کا اشارہ ہے۔ کہ آپ کے جسم اور اعصاب کو شباب آور کی ضرورت ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھئے۔ قیمت فی شیشی پانچ روپے

Hamdard ہمدرد دواخانہ لیبارٹریز دہلی

نگار

مدیر خصوصی: نیاز فتحپوری

جلد ۵۱ | فہرست مضامین اپریل ۱۹۴۷ء | شمارہ ۴

ملاحظات ۱
ہماری ازدواجی زندگی اور ہمارا عائلی نظام ... سید اختر علی تلہری ۵
اصغر کی شاعری ... خواجہ احمد فاروقی ام۔ اے ... ۱۴
مودودی صاحب اور مسئلہ امارت ... شوکت سبزواری ... ۳۲
مجنوں گورکھپوری۔ ایک مطالعہ ... خلش برنی ... ۳۱
قدیم سنسکرت لٹریچر ... ا۔ ح ... ۴۳
مالہ وما علیہ ۲۹
باب الاستفسار ۵۲
ہنگامہ لاہور پر دو آنسو ... حکیم اقبال حسن ... ۵۷
راستے میں (نظم) ماہر القادری۔ غزل ... شفق عماد آبادی ... ۵۹
کلام عرشی بھوپالی۔ غزل ... قہر اکبر آبادی ... ۶۰
غزل۔ میکش اکبر آبادی ... کلام راز یزدانی ... ۶۱

ملاحظات

حیدر آباد اور سر مرزا اسماعیل

بڑا آدمی ہونا بڑی بات ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایسا انسان آخر میں قوم کی ملکیت ہو جاتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی اسے جان جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خواص کے ساتھ عوام کا بھی ہدف رائے و نظر ہو جاتا ہے اور غالباً سر مرزا بھی عرصہ سے اسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔

جب تک سر مرزا میسور میں رہے، اس وقت تک وہ جنوبی ہند کے ایک بعید ترین گوشہ میں رہنے کی وجہ سے بڑی حد تک امن میں رہے، کیونکہ شمالی و وسطی ہند کے لوگوں کو ان سے زیادہ تعلق نہ تھا اور اگر تھا بھی تو صرف اس نوعیت کا کہ مسلمان ہندوؤں کی ایک بڑی ریاست کا دیوان ہونے کی وجہ سے ان پر فخر کرتے تھے اور ہندو اُن کو اس لئے گوارا کئے ہوئے تھے کہ ان کے زمانہ میں ہندوؤں نے وہاں جو کچھ حاصل کیا، وہ شاید کسی ہندو دیوان کے عہد میں بھی حاصل نہ کر سکتے۔ بہر حال میسور میں ان کا عہد وزارت وہ عہد تھا جب ان کی عظمت و شہرت کی بنیاد قایم بھی ہوئی اور استوار بھی، لیکن اس کا دایرہ اتنا وسیع نہ تھا کہ تمام جہات ہند میں وہ موضوع بحث قرار پاتی۔

اس کے بعد جب وہ میسور سے جدا ہونے کے بعد جے پور گئے، تو فضا کچھ بدلی ہوئی تھی اور گو جے پور بھی ہندو ریاست ہے لیکن حالات بہت مختلف تھے - وہ ایک ایسی ریاست کو چھوڑ کر آئے تھے جس میں وہ بہت کچھ کر چکے تھے اور ایک دوسری ایسی ریاست میں گئے تھے، جہاں انھیں بہت کچھ کرنا تھا - اسی کے ساتھ جنوبی ہند سے جدا ہو کر وہ ایسی سرزمین میں پہونچے جو شمالی و وسطی ہند سے قریب تر تھی اور جس کی گزشتہ تاریخ دہلی، پنجاب اور شمالی ہند سے زیادہ تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کی مقتضی تھی کہ وہاں کے تمام حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے - پھر سر مرزا نے جے پور پہونچکر جو اصلاحات بھی کی ہوں اور شہر کی تزئین و آرائش میں جو اضافہ بھی کیا ہو، اس کا تفصیلی علم تو ہمیں حاصل نہیں، لیکن اجمالاً اس قدر ضرور معلوم ہے کہ اپنی مختصر مدتِ وزارت ہی میں انھوں نے جے پور کی بہت سی پچھلی روایاتِ عظمت کو دوبارہ نئی زندگی بخشی اور اپنے جمالیاتی ذوق کی بہت سی یادگاریں قایم کر کے واپس آئے - البتہ وہاں کی دفتری زبان کا جھگڑا ضرور ان کے زمانہ میں رونما ہوا اور مسلمانوں میں ان کی طرف سے یہ بدظنی پیدا ہو گئی کہ انھوں نے اُردو کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا - اس واقعہ کی تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن مختصراً اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ میرے نزدیک سر مرزا نے اس مسئلہ میں بھی غیر معمولی ہوشیاری و فراست سے کام لیا اور اگر کوئی دوسرا شخص ان کی جگہ ہوتا تو غالباً اُردو وہاں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی ہوتی -

اس میں شک نہیں کہ سر مرزا سے قبل اور خود ان کے زمانہ میں بھی وہاں کی دفتری زبان اور تحریر اُردو ہی تھی، لیکن یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ سر مرزا کے پہونچنے سے قبل ہی وہاں رواجِ ہندی کی تحریک پوری طرح منظم ہو چکی تھی اور دوسری ہندو ریاستوں کی تقلید و اتباع میں وہاں بھی اُردو کو بالکل ختم کر دینے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا، چنانچہ سر مرزا نے وہاں پہونچتے ہی اس کو محسوس کر لیا اور یہ سمجھ کر کہ اس تحریک کو بالکل محو کر دینا ممکن نہیں ہے، انھوں نے وہ کیا جو کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا تھا یعنی ہندی، اُردو دونوں کو برابر درجہ دیکر اس تحریک سے جو مضرت اُردو کو پہونچ سکتی تھی، اسکو بڑی حد تک کم کر دیا اور جے پور کی سرزمین سے اُردو کو فنا ہونے سے بچا لیا - لیکن عوام نے غلطی سے یہی سمجھا کہ سر مرزا نے اُردو کے ساتھ دشمنی کی اور شاید اب تک یہ خیال ان کے دماغ میں موجود ہے -

جس زمانہ میں سر مرزا جے پور میں تھے، اسی وقت حیدر آباد کی صدارتِ عظمیٰ کا مسئلہ زیرِ غور تھا اور اہلِ نظر کی نگاہ بار بار سر مرزا ہی پر پڑتی تھی، لیکن کانگرس اور مسلم لیگ کے بڑھتے ہوئے اختلافات اور خود حیدر آباد کے انجمن اتحاد المسلمین کے رجحانات نے جو مسلم لیگ ہی کی دوسری صورت ہے، اس مسئلہ میں بہت پیچیدگی پیدا کر دی تھی اور فرمانروائے دکن کے لئے یہ فیصلہ دشوار ہو گیا تھا کہ وہ نواب صاحب چھتاری کے جانے کے بعد (جن کا جانا ناگزیر تھا) صدارتِ عظمیٰ کے لئے کس شخص کا انتخاب کریں - چونکہ سر مرزا، مسلم لیگ سے تعلق نہ رکھتے تھے (اور مسلم لیگی حضرات کے نزدیک ہر مسلمان جو انکی جماعت میں شریک نہ ہو، کانگرسی ہے یا بے دین) اس لئے ان کے متعلق بھی نہ صرف حیدر آباد کی انجمن اتحاد المسلمین بلکہ لیگ کے اکابر کا یہی خیال تھا کہ وہ ہندو پرست، کانگرس نواز اور اسلام دشمن انسان ہیں اور اسلئے انکا انتخاب حیدر آباد کی صدارتِ عظمیٰ کیلئے کسی طرح مناسب نہیں

یہ تھا وہ پروپاگنڈا جو سر مرزا کے حیدر آباد آنے سے قبل حیدر آباد کے اندر باہر پوری قوت کے ساتھ جاری تھا اور مسلم لیگ اور انجمن اتحاد المسلمین دونوں نے ایک زبردست محاذ سر مرزا کے خلاف قایم کرکے مسئلہ انتخاب کو ذرا پیچیدہ بنا دیا تھا۔ کیونکہ حضور نظام کے سامنے صرف مسلم لیگ اور انجمن اتحاد المسلمین ہی کا سوال نہ تھا، بلکہ ملک کی اکثریت کا بھی تھا۔ دنیا کی سیاسی فضا بھی ان کے سامنے تھی اور ہندوستان کے آیندہ انقلابات بھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حیدر آباد میں جہاں ہندو اور مسلمان میں تفریق نہیں کی گئی اور جہاں حکومت کا نظریہ کبھی مذہبیت سے متاثر نہیں ہوا کسی ایسی تحریک سے متاثر ہونا جو کسی مخصوص فرقہ و جماعت سے تعلق رکھتی ہو، حکومت دکن کے قدیم روایات کے منافی ہے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میلانات عصری اور رجحانات زمانہ کو نظر انداز کرکے کوئی ریاست یا حکومت اب زندہ نہیں رہ سکتی، الغرض وہ وقت کی پکار اور زمانہ کے مطالبات سے بخوبی واقف تھے، اس لئے انھوں نے صدارتِ عظمیٰ کی جگہ کے لئے سر مرزا کا انتخاب کرکے غیر معمولی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ کیونکہ اگر سر مرزا کی قسمت میں حیدر آباد کی صدارتِ عظمیٰ مقسوم ہو چکی تھی، تو اس کا وقت یہی تھا اور اُن سے زیادہ موزوں شخص اس خدمت کے لئے بحالات موجودہ اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

حیدر آباد کی مسلم آبادی اپنے ملک کے سیاسی حالات سے باخبر ہو یا نہ ہو لیکن سرزمین دکن کے آیندہ آئینی حکومت کے سلسلہ میں اس نے اپنے جن مطالبات و توقعات کا اظہار کیا ہے، ان سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی فضا سے یقیناً ناواقف ہے اور مستقبل پر اس کی نگاہ کم ہے۔

انجمن اتحاد المسلمین کو یقین ہے کہ پاکستان کا خواب پورا ہو کر رہے گا اور جنوبی ہند میں حیدر آباد کا "وحدتِ اسلامی" تسلیم کر لیا جانا بالکل یقینی امر ہے، لیکن انھوں نے غور نہیں کیا کہ سب سے زیادہ خطرہ حیدر آباد کو قیام پاکستان ہی کی صورت میں ہے اور دکن کا یہ آتش فشاں پہاڑ جو پھوٹ پڑنے کے لئے عرصہ سے جوش کھا رہا ہے اب تک اسی لئے ساکن و خاموش ہے کہ وہاں کی اکثریت کو حیدر آباد میں پاکستانی اسکیم کے بروئے کار آنے کی کوئی توقع نہیں۔

ہندوستان کے جدید آئین میں، سب سے زیادہ نازک پوزیشن ریاستوں ہی کی ہے اور ان کی ملوکانہ عظمت اگر کسی نہ کسی حیثیت سے قایم رہ سکتی ہے تو صرف اس طرح کہ رعایا کو یہ سمجھنے کا موقعہ نہ دیا جائے کہ بیرونی یا اجنبی جماعت برسر اقتدار ہے اور حکومت کو اکثریت و اقلیت دونوں کا اعتماد اسے حاصل ہو اور اسی لئے میں نے کہا کہ حیدر آباد کی صدارت عظمیٰ کے لئے اسوقت سر مرزا سے بہتر انتخاب کوئی اور نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ نہ صرف حیدر آباد و جنوبی ہند بلکہ دوسرے صوبے کے ہندو بھی اُن پر اعتماد رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعت بھی کم از کم اتنا تو جانتی ہی ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور خود ان کی عزت و خودداری اسکی مقتضی ہے کہ وہ حیدر آباد کی دیرینہ عظمت قایم رکھنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اُٹھا رکھیں۔

اس سے قبل میں حیدر آباد کی صدارت عظمیٰ کے کئی دور دیکھ چکا ہوں، ایک دور مہاراجہ بہادر کا، دوسرا سر اکبر حیدری کا اور تیسرا نواب صاحب چھتاری کا۔ لیکن اس مرتبہ جب میں حیدر آباد گیا تو وہاں کے حالات کو میں نے بہت بدلا ہوا پایا۔ جس حد تک شہر

کی آرائش و تزئین کا تعلق ہے، اسکے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے، کیونکہ سر مرزا اپنے ذوق کی اس خصوصیت کی وجہ سے بہت مشہور ہیں اور انکے جمالیاتی احساس نے ہر اس جگہ کو جہاں وہ پہونچے فردوس نظر بنا دیا — چنانچہ چند ماہ کے اندر ہی انھوں نے یہاں کی صورت اسقدر بدلدی ہے کہ بہت سے جامد و سنسان مناظر منہ سے بول اُٹھے ہیں، لیکن میری نگاہ زیادہ تر اس معنوی تزئین و آرائش پر ہے جو ان کی میرزایانہ ادائے حکومت کے تحت بالکل نئی کروٹ لیتی نظر آتی ہے۔

سر میرزا حد درجہ مختنی، بالغ نظر اور آئین پسند انسان ہیں۔ وہ جس طرح خود اپنے فرائض خدمت کو صحیح وقت پر انجام دیتے ہیں اسی طرح وہ دوسروں سے بھی اسی کی توقع رکھتے ہیں، جسکا نتیجہ یہ ہے کہ جو معاملات برسوں تک معرض التوا میں پڑے رہتے تھے وہ اب دنوں میں طے پا جاتے ہیں اور وہاں کا ایوان حکومت جو عوام کی دسترس سے بہت بلند واقع ہوا تھا، اب وہ عوام ہی کا درد دکھ سننے کے لئے وقف ہے۔ اور وہاں کی آبادی کو پورا یقین ہو گیا ہے کہ انصاف کے معاملہ میں سر میرزا کے سامنے امیر و غریب ایک حیثیت رکھتے ہیں، سر میرزا، شہر کے ایک ایک گوشہ میں، اضلاع کے ایک ایک گاؤں میں جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے پہونچ جاتے ہیں اور خود اپنے چشم و گوش سے حالات و واقعات کا مطالعہ کر کے مناسب احکام صادر کرتے ہیں اور اس طرح شاہ دکن کی نیابت کا وہ فرض ادا کر رہے ہیں، جس کی طرف اس سے قبل کسی صدر اعظم نے بہت کم کی تھی — اسوقت حیدرآباد کا کامیاب ترین صدر اعظم وہی ہو سکتا ہے جو خانوادۂ آصفی کے دیرینہ عظمت و جلال کو قایم رہنے دے (یہی خود انجمن اتحاد المسلمین کا بھی انتہائی مطمح نظر ہے) اور اس میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو وہاں کی ہندو اکثریت کا اعتماد حاصل کر سکے اور مسلم اقلیت کی روایات تہذیب و ثقافت کو فنا نہ ہونے دے اور اسی کے ساتھ ان دونوں میں صحیح توازن پیدا کر کے ملک کی آبادی سے شبہ و بدگمانی کے خیالات دور کر سکے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان تمام باتوں کو سر میرزا سے بہتر کوئی دوسرا شخص انجام دے سکتا ہے — اسی کے ساتھ مسلمانان حیدرآباد کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ انکی اقلیت میں اسوقت تک جو وزن اکثریت کا سا رہا ہے، اسکو اگر وہ قایم رکھنا چاہتے ہیں، تو اسکی تدبیر زمانہ سے جنگ کرنا ہے نہ حقیقتوں سے منھ موڑ لینا بلکہ صرف اُن رواداریوں سے کام لینا جو ہمیشہ ایک پُر عظمت قوم کا شعار رہا ہے اور ملک کی خدمت کرنے والوں کے ساتھ تعاون کرنا، اسلئے اسوقت ضرورت ہے کہ قلب و نظر دونوں میں وسعت پیدا کی جائے اور محض شبہات کی بنا پر آپس کے تعلقات کو ناخوشگوار نہ ہونے دیا جائے۔

سر مرزا اپنے سیاسی عقاید کے لحاظ سے یقیناً مسلم لیگ سے علحدہ ہیں، لیکن اسکا لازمی نتیجہ یہ نہیں کہ انھیں کانگریسی سمجھ لیا جائے، وہ در اصل کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے اور نہ یہ اُنکے لئے ممکن ہے جب تک وہ کسی ریاست سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی ہمیشہ دو اُصول کی پابند رہی ہے ایک فرائض کا احساس اور دوسرے امن پسندانہ اسلوب کار۔ یعنی انکی انتہائی کوشش ہر جگہ یہی رہی ہے کہ وہ امن و سکون کو قایم رکھیں اور جس خدمت کی ان سے توقع کی جاتی ہے اسکو انتہائی دیانت و امانت کے ساتھ انجام دیں۔ اور اب جبکہ پختگی عمر کے ساتھ ساتھ انکے ان اُصولوں میں بھی غیر معمولی استواری پیدا ہو گئی ہے۔ اہل حیدرآباد کو ان کی ان خصوصیات سے فایدہ اُٹھانا چاہئے اور ان پر اعتماد کر کے ان سے تعاون کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہندوستان میں جو موقف سلطنت دکن کو حاصل ہو چکا ہے اسکے قایم رکھنے کیلئے جذبات سے مغلوب ہونے کی جگہ فکر و تدبر سے کام لینے کی ضرورت ہے اور صرف ان توقعات کو سامنے رکھنے کی جو کسی "خیالی جنت" سے نہیں بلکہ ہماری عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہماری ازدواجی زندگی اور ہمارا عائلی نظام

نوع انسانی کی نفسیاتی و حیاتیاتی زندگی میں اگر ایک طرف "انفرادیت" کا زبردست رجحان موجود ہے تو دوسری طرف اجتماعی میلانات کا بھی اُس میں کافی حصہ ہے، نفس انسانی اپنی "انفرادیت" اگرچہ کسی وقت نظر انداز نہیں کرتا لیکن اُس کا یہ رجحان انفرادیت اپنے مظاہرے کے لئے اجتماعیت کے مختلف پہلو اور گوشے ڈھونڈھتا ہے۔ "انفرادیت و اجتماعیت" کے اس ناگزیر تعلق میں جب تک اعتدال ملحوظ رہتا ہے تب تک ہماری زندگی حقیقی معنوں میں انسانی زندگی رہتی ہے اور "افراط و تفریط" کی حدود میں جیسے ہی یہ تعلق قدم رکھتا ہے، ہماری زندگی غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ "رُہبانیت" "انفرادیت" ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے، "تمام اجتماعی مظاہر" سے دامن سمیٹ کر ایک بہت ہی محدود دائرے میں بند ہو جانا "انفرادیت" کی خود پسندی کا کرشمہ سہی مگر ہے مکروہ اور مضرت رساں۔ اسی طرح جب انفرادیت کا گلا گھونٹ کر انسانی زندگی میں تنہا اجتماعیت ہی کو کار فرمائی کا حق سپرد کر دیا جاتا ہے تو پھر زندگی ایک بے جان مشین کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ چونکہ یہ دونوں صورتیں نقطۂ اعتدال سے متجاوز ہیں اس لئے ان میں زندگی نہ صرف اپنی فطری دلکشی سے محروم رہتی ہے بلکہ اس کے خط و خال میں بدنمائی صاف صاف محسوس ہوتی ہے۔ جب انسانی زندگی کی نوعیت یہ ہے تو پھر صحیح معاشرتی تعلیم وہی ہو سکتی ہے جو انفرادیت و اجتماعیت کے اس معتدل مزاج و امتزاج پر کامل زور دے۔ "انفرادیت" کے لئے "اجتماعیت" کی حکیمانہ تربیت حاصل کرنے کا اصلی گہوارہ "منزلی نظام" ہے۔ اس کے بعد مدنی نظام پھر بین الممالکی نظام۔ ایسا بین الممالکی نظام جس کی بنیاد عملی طور پر مخلصانہ سچی خدمت ہو ابھی تک محض تصور ہی میں ہے لیکن مدنی نظام اور اس سے کم منزلی و عائلی نظام میں اس کے مواقع بیشتر حاصل ہیں اس لئے منزلی نظام کی طرف سے بے پروائی برتنا جائز ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے ساتھ ہماری وابستگی فطری بات ہے۔

یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ جب تک ہمارے معاشرہ (سوسائٹی) کا ڈھانچہ نہیں بدلتا اور اُسی کے ساتھ ہمارے حیاتیاتی نظام میں تغیر نہیں ہوتا عائلی نظام سے ہماری وابستگی کم نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں بعض مفکرین کا یہ خیال کہ اگر ماحول بدل دیا جائے تو "عائلی نظام" سے ہماری وابستگی ختم ہو سکتی ہے اور انسان تمام تر کسی تمدنی و بین الاقوامی نظام سے وابستہ ہو سکتا ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگر انسانیت کی ازدواجی پذیری مدنظر رکھتے ہوئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آگے چل کر حیاتیاتی نظام میں تغیر ہو جائے گا تب بھی یہ امر بہت زیادہ مشکوک ہے کہ اس قسم کا حیاتیاتی تغیر کسی صنوعی ماحول کے پیدا ہونے سے رونما ہو سکے گا اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ حیاتیاتی تغیر میں عائلی نظام سے وابستگی ختم ہی ہو جائے۔ عائلی نظام سے وابستگی

نہایت ہی نمایاں "وراثتی چیز" ہے جس کے نقوش اُس زندگی میں بھی ملتے ہیں جب انسان موجودہ ارتقائی نوعیت سے پہلے ڈاروِن کے مطابق "میمونی منزل" میں تھا۔ اگر ان مفکرین کا یہ خیال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ماحول کے بدل دینے کے ساتھ "حیاتیاتی نظام" میں بھی تغیر ہو جائے گا اور اس تغیر کے ساتھ منزلی نظام سے ہماری وابستگیاں ختم ہو جائیں گی تب بھی یہ عرض کیا جائے گا کہ عایلی نظام میں انسانیت کی جلا کے جو مواقع ہیں اُن کی افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے پسندیدہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس ماحول کے بدل دینے کی کوشش کی جائے۔ اب تک جتنے اجتماعی نظام وجود میں آئے ہیں اور جنھوں نے انسانیت کے دل کا ساز چھیڑا ہے وہ سب خاندانی نظام کی اہمیت ہمیشہ تسلیم کرتے اور اس کے لئے مختلف اُصول و قوانین وضع کرتے رہتے ہیں۔

مارکسی نظام معاشرت اور عایلی نظام ختم کرنے کے دعوے

مارکسی نظام معاشرت میں "عایلی نظام" ختم کر دینے کے جو دعوے ملتے ہیں وہ کسی دلیل کے منت کش نہیں ہیں۔

خود شورائیہ روس میں باپ بیٹے میاں بیوی کا رشتہ اب تک توڑا نہیں جا سکا ہے۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ رشتے اب بھی وہاں موجود ہیں اور بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ مستقبل میں بھی اسی طرح موجود نہ رہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ تعلقات دوسری بنیادوں پر قایم کئے جا رہے ہیں اور اس کے لئے دوسرے اُصول و قوانین تراشے جا رہے ہیں مگر یہ کہنا بہت ہی قبل از وقت ہے کہ یہ اُصول و قوانین اشتراکی سرزمین میں جڑ پکڑ لیں گے۔ زیادہ قرین قیاس تو یہ بات ہے کہ اس نئی تحریک کے اُبال میں جب اعتدال پیدا ہوگا تو یہ اُصول و قوانین دوسرا رنگ اختیار کر لیں گے۔ وسیع تر انسانیت کی خدمت ایک اعلیٰ مقصد ہے مگر اس کے لئے خاندانی نظام کا ختم کرنا کیوں ضروری ہے؟ انفرادیت کی اخلاقی تربیت اسی منزلی نظام کے آغوش میں ہوتی ہے اور وہ یہ تربیت حاصل کر کے مدنی نظام و بین الاقوامی نظام کو انسانیت کی بنیادوں پر قایم کرنے میں توانا بازوؤں کے ساتھ حصّہ لے سکتی ہے۔ زیادہ عملی نقطۂ نظر رکھنے والے جو اپنی خدمات کو ذات و رنگ کے تفرقوں سے بلند کر کے عام انسانیت پر وسیع کرنا چاہتے ہیں عایلی نظام کے ختم کر دینے پر کبھی مہر پسندیدگی ثبت نہیں کر سکتے۔

عایلی نظام کے عناصر

موجودہ معاشرتی مذاق میں عایلی نظام کے عناصر مرد عورت اور اُن کی مکمل یکجائی کے نتائج قرار دئے جا سکتے ہیں۔ انھیں عناصر کی الٹ پلٹ سے مختلف رشتے وجود میں آتے رہتے ہیں۔ موجودہ حالات میں جو معاشرتی نظام انسانی بہبود و خوش حالی و مسرت پیش نظر رکھتا ہے مجبور ہے کہ ان تعلقات کی نوعیت معین کرے۔ ان تعلقات کی تعیین و تشخیص کے سلسلے میں اختلاف کی کافی گنجایش ہے۔ ان تعلقات کی اہمیت و عدم اہمیت کے احساس کے مدارج کے لحاظ سے مفکرین کی رائیں خاندانی نظام کے مختلف عناصر کے باہمی روابط کی تعیین و تشخیص میں مختلف ہوتی جائیں گی۔ نہ صرف مشرق و مغرب بلکہ خود مشرق کے مختلف حصوں اور مغرب کے مختلف خطوں میں بھی یہ اختلاف ملے گا۔ البتہ یہ ایک بات ضرور ہے کہ مشرق و مغرب کی تہذیب و شایستگی کی رو چونکہ ایک حد تک مختلف سمتوں پر جا رہی ہے اس لئے ان میں خاندانی نظام کے متعلق بھی اختلاف ذرا زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ مغرب کا تصور زن و شو اور باپ بیٹے کے تعلقات کی نوعیت اور اہمیت کے متعلق مشرقی تصو

سے یقیناً بہت کچھ مختلف ہے، موجودہ دور میں چونکہ سلسلۂ رسل و رسایل و آمد و رفت بہت وسیع اور بہت سریع ہو گیا ہے، اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی سیل ایک دوسرے کی سرحد سے ٹکرا رہی ہے اس لئے ہمیں بھی باخبر و ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ تہذیبوں کے اس آنے والے تصادم کے خیال سے بعض دماغ یہ سوچنے لگے ہیں کہ اس کا نتیجہ نکلے گا کہ اس ٹوٹ پھوٹ کے بعد ایک عالمگیر تہذیب وجود میں آجائے اور مشرق و مغرب کی یہ ثقافتی تفریقیں بالکل ہی مٹ جائیں اور آخر میں نئی تہذیب اپنی بنیاد رکھنے کے لئے مارکس کے اشتراکی تصورات کا سہارا تلاش کرے۔ مستقبل کے تہذیب و ثقافت کا نقشہ کیا ہوگا؟ مارکس و انیگلز و لینن کے معاشرتی و اقتصادی افکار کا رنگ اس میں کتنا ہوگا؟ یہ فیصلہ تو قطعی صورت میں ابھی نہیں کہا جا سکتا لیکن بالفعل تو یہ خیال ایک خوش کن خواب کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے بلکہ مارکسی مزعومات کے بہت سے حصّوں سے تو اشتراکیت اب اپنا دامن جھاڑ کر الگ ہو گئی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آگے چل کر اس کا کیا انجام ہوگا۔ تاہم نتیجہ جو کچھ ہو ہم میں سے ہر اُس شخص کا جو انسانی زندگی کا ایاغ مسرتوں کی شراب لالہ فام سے پر کرنا چاہتا ہے یہ فرض ہے کہ وہ عائلی نظام کے مختلف عناصر کے باہمی تعلقات پر ہوشمندانہ طور سے غور کرتا رہے اور جس نوعیت کے تعلقات انسانوں کی خوش وقتی میں اضافہ کر سکیں اُنھیں خود قبول کرلے اور اُن کی معقولیت دوسروں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ اس خصوص میں لن یوٹنگ کے خیالات بھی غور کے قابل ہیں۔

لن یوٹنگ اور عائلی نظام

لن یوٹنگ موجودہ چین کا ایک مشہور مفکر و مصنف ہے، اُس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ The Importance of Living اُس کی ایک حجیم و ضخیم کتاب ہے۔ لن یوٹنگ نے اس کتاب میں زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اُس نے عیسائی والدین کے آغوش میں تربیت پائی تھی مگر جب ذمہ دارانہ طور سے سوچ سکنے کی اُس میں صلاحیت پیدا ہوئی تو اُس نے اپنے ہی قول کے بموجب رسمی عیسائیت سے علحدگی اختیار کرلی اور پرانے چینی خیالات و فلسفہ کا خوشہ چین بن گیا۔ حکیم کنفوشس اور لاؤ کا اُس پر بہت اثر ہے۔ اس کتاب میں عائلی نظام سے بحث کرتے ہوئے اُس نے اُن خیالات کا اظہار کیا ہے جن پر غور فایدہ سے خالی نہیں ہے خصوصاً اس حالت میں جبکہ ہمارا عائلی نظام بھی مغربیت سے متاثر ہوتا جا رہا ہے۔

عائلی نظام کے متعلق لن یوٹنگ نے جو چند ابواب لکھے ہیں اُن میں "تدبیر منزل" کے قریب قریب سب پہلو آجاتے ہیں۔ اس میں تجردی زندگی کے متعلق بھی اظہار خیال کیا گیا ہے جنسی دلکشی کے متعلق بھی بہت سی مفید باتیں بیان کی گئی ہیں بقائے نوع کے نقطۂ نظر سے بھی بحث کی گئی ہے۔ والدین اور اُن کی اولاد میں کس قسم کے تعلقات ہونا چاہئیے، لڑکے کی بیوی والدین وغیرہ کی پسند کی ہونا چاہئیے یا کیا؟ ان باتوں پر بھی اس میں نظر کی گئی ہے۔ لن یوٹنگ اس کتاب میں مشرقی تہذیب کے ہر خط و خال کے بلا امتیاز پُرجوش حامی معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی نگاہ میں چینی تہذیب کی کوئی ادا ایسی نہیں ہے جو عقل کے لئے دلکشی سے خالی ہو۔ اگر اُن کے خیالات سے غلو کو علحدہ کر دیا جائے، تو اُن کی بحثیں سنجیدہ فکر و نظر کی بھی حامل نظر آتی ہیں۔

انسان کا حیاتیاتی ہونا

لن یوٹنگ نے انسان کے "حیاتیاتی (Biological) ہونے پر کافی زور دیا ہے اور اسی کو نقطۂ آغاز بنا کر انھوں نے تاہلی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے :-

"مجھے احساس ہے کہ میں حیاتیاتی ہوتا جا رہا ہوں۔ کیونکہ اسے ہم خواہ پسند کریں یا ناپسند ہم بہرحال حیاتیاتی ہیں۔ ہر شخص حیاتیاتی طور پر خوش ہوتا ہے، غصہ ہوتا ہے اور حیاتیاتی طور پر مذہبی اور صلح پسند ہوتا ہے خواہ اُسے اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ چونکہ ہم حیاتیاتی مخلوق ہیں اس لئے یہ حقیقت بھی بھلائی نہیں جا سکتی کہ ہم سب پیدا ہوتے۔ اپنی ماؤں کا دودھ پیتے۔ ازدواجی تعلق پیدا کرتے اور اس طرح اضافۂ نسل کا سامان کرتے ہیں، ہر مرد کسی نہ کسی عورت سے پیدا ہوتا ہے اور ہر مرد کسی نہ کسی عورت کے ساتھ زندگی بسر کرتا اور لڑکوں اور لڑکیوں کا باپ بنتا ہے۔ اسی طرح ہر عورت کسی نہ کسی عورت سے پیدا ہوتی اور تقریباً تمام عمر کسی نہ کسی مرد کے ساتھ رہتی اور بچے پیدا کرتی ہے"۔

ضبط تولید

انسان کے حیاتیاتی پہلو پر بحث کرنے کے بعد لن یوٹنگ نے مغربی اقوام کے اس رجحان سے بحث کی ہے کہ وہ والدین بننے سے گریز کرنے لگے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں : "لیکن عورتوں اور مردوں کا محض تعلق کافی نہیں ہے۔ اس تعلق کا نتیجہ اولاد ہونا چاہئے ورنہ تعلق نامکمل ہے، کوئی تہذیب مرد یا عورت کو اولاد پیدا کرنے کے حق سے محروم کرنے کے لئے کسی قسم کا عذر پیش نہیں کر سکتی۔ فی زمانہ یہ امر حقیقت مسلمہ ہو گیا ہے کہ بہت سے مرد اور عورت شادی نہیں کرتے اور بہت سے ایسے ہیں جو شادی کے بعد کسی نہ کسی سبب سے اولاد پیدا کرنا پسند نہیں کرتے۔ سبب کچھ بھی ہو۔ میرا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ کسی مرد یا عورت کا لاولد مرنا سب سے بڑا جرم ہے"۔

دوسری جگہ یہی مصنف لکھتا ہے :- "مجھے اس پر اصرار ہے کہ عورت اپنی شریف ترین اور بلند ترین منزل پر محض ماں کی حیثیت سے پہونچتی ہے اور وہ بیوی جو اپنی مرضی سے ماں بننے سے انکار کرتی ہے فوراً اپنی سنجیدگی اور عظمت کا بڑا حصہ کھو دیتی اور ایک کھلونا بن جانے کے خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ میرے نزدیک ہر بیوی بغیر بچوں کے ایک داشتہ ہے اور ہر داشتہ جس کے بچے ہوں بیوی ہے، اُن کے تعلقات کی قانونی حیثیت خواہ کیسی ہی ہو۔ بچے داشتہ عورت کو پاک اور بلند کرتے ہیں اور بچوں کا نہ ہونا منکوحہ بیوی کو بھی حقیر کر دیتا ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کی بہت سی عورتیں بچہ پیدا کرنے سے انکار کرتی ہیں کیونکہ اُنھیں خطرہ ہوتا ہے کہ حمل سے اُن کی صورتیں بگڑ جائیں گی"۔

لن یوٹنگ کے مذکورۂ بالا اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ "ضبط تولید" کے عمل سے بہت ہی بیزار ہے۔ افزائشِ نسل کا سلسلہ مسلسل جاری رکھنے پر اُسے اتنا اصرار ہے کہ وہ اس کی ذرا سی خلاف ورزی کو بھی روا نہیں رکھ سکتا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ازدواج کا رشتہ قایم ہو جانے کے بعد تخلیقِ مثل یعنی تولید اولاد کا مسئلہ خاصی اہمیت رکھتا ہے، ایسی حالت میں ازدواجی تعلق کے سلسلہ میں "تخلیق مثل" ہی کو ہر حالت میں مطلقاً سب کچھ قرار دے دینا انتہا پسندانہ ذہنیت کا

نتیجہ ہے، ضبط تولید Birth Control پر اگر کوئی قوم عمومی حیثیت سے عامل ہو جائے گی تو اُسے اس غلط روش کے مختلف نقصان برداشت کرنا ہی ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی فرد بغیر کسی حکیمانہ غایت کے ملحوظ رکھے ہوئے محض عیاشانہ ذہنیت کے تحت ضبط تولید پر عمل کرتا ہے تو اُس کا بھی یہ فعل مستحق صد ملامت ہو سکتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ ضبط تولید کو مطلقاً بُرا سمجھا جائے۔ اگر عورت کی صحت حمل کی صعوبتیں برداشت کرنے کے قابل نہ ہو تو ضبط تولید پر عامل ہونے میں کوئی مضایقہ نظر نہیں آتا اسی طرح اگر اولاد کافی ہے اور آمدنی کے ذرایع ایسے نہیں ہیں کہ اور زیادہ اولاد کی تربیت کی جا سکے، تب بھی "ضبط تولید" پر عامل ہونے میں کوئی عقلی خرابی نظر نہیں آتی، اسی قسم کی اور بھی حکیمانہ غایتیں ہو سکتی ہیں جن کے تحت ضبط تولید پر عمل کرنے کی سفارش کی جا سکتی ہے، یہ خیال اسلامی فقہ کے بھی خلاف نہیں ہے کیونکہ شیعوں اور سنیوں دونوں میں "عزل" موجود ہے۔

ضبط تولید اور مسئلۂ عزل ہدایہ میں باب نکاح الرقیق میں جو عبارت درج ہے، اس سے بھی یہ بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر فریقین راضی ہیں تو پھر عزل شرعاً جایز ہے۔ ضبط تولید آخر ہے کیا وہی "عزل" کی سائنٹفک شکل، عزل کا مقصد بھی تو یہی ہے کہ بچہ نہ پیدا ہو، ضبط تولید کا بھی منشا یہی ہے ایسی صورت میں اگر زن و شو اسکے لئے راضی ہیں تو پھر فقہ حنفی کی بنا پر تو اس میں کوئی قباحت ہو ہی نہیں سکتی۔ شیعی فقہ میں بھی عزل کی اجازت اسی تفصیل کے ساتھ موجود ہے، شرایع الاسلام میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

اس مقام پر یہ امر بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ مسئلۂ مذکورہ میں عزل فریقین کی رضامندی پر چھوڑ دیا گیا ہے، مگر ایسی حالت میں انفرادی مصالح کی بنا پر اس کے جواز میں شک کی گنجایش ہی نہیں معلوم ہوتی۔

بعض حضرات کی طرف سے انفرادی مصالح کی موجودگی میں ضبط تولید کی یہ صورت تجویز کی جاتی ہے، کہ زن و شو مکمل یکجائی کے عمل سے احتراز کریں لیکن پند و موعظہ کا یہ سکہ رہبانیت کے دارالضرب کا طیار کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نفس استلذاذ خاص خاص مواقع پر جایز عنوان سے کوئی مذموم عمل نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اگر زن و شو شباب کی پُرکیف منزلیں طے کر رہے ہیں تو اُنھیں یہ پند و موعظ کرنا نہ صرف یہ کہ بالکل ہی غیر عملی چیز ہے بلکہ اُن پر ظلم بھی ہے۔

جنسی دلکشی پیدا کرنا ضبط تولید کے سلسلہ میں بحث کا دایرہ ذرا زیادہ بڑھ گیا، بہر حال آگے چل کر لن یوٹنگ نے ضبط تولید سے بحث کرتے ہوئے جنسی دلکشی پیدا کرنے کا سوال اُٹھایا ہے، جنسی دلکشی پیدا کرنے کے متعلق لن یوٹنگ کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اس پر اتنا زور دینا جتنا کہ آجکل امریکہ وغیرہ میں دیا جا رہا ہے صنف نسواں کے اصلی صنفی وقار کے منافی ہے، ایک جگہ لن یوٹنگ نے یہ لکھا ہے:

"مغربی عورتیں اپنے بناؤ سنگار کی طرف زیادہ آزادی سے ہر جگہ علانیہ متوجہ رہتی ہیں، اسی مقصد کے تحت غذا اور ورزش اور مالش کا خاص خیال رکھتی اور حسن جسمانی کو قایم رکھنے کے اشتہار بڑی توجہ سے پڑھتی ہیں، اپنے پیروں کو بستر پر اوپر

نیچے اس لئے پھینکتی ہیں کہ اُن کی کمر پتلی ہو۔ وہ یہ کام مذہبی انہماک سے انجام دیتی ہیں۔ اپنے چہروں کا حُسن بڑھاتی اور اپنے بالوں میں خضاب لگاتی ہیں اس عمر میں جبکہ کوئی چینی عورت ان آرائشوں کا خیال بھی نہیں کرتی۔

مغربی عورتیں لوشنوں اور عطر وغیرہ پر بھی کچھ کم روپیہ صرف نہیں کرتیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حُسن افزا چیزوں مثلاً دن کی کریم رات کی کریم، پوڈر کریم واشنگ کریم، فاونڈیشن کریم، فیس کریم، ہینڈ کریم، لپس کریم وغیرہ وغیرہ خوشبودار اشیاء کا کاروبار کافی ترقی پر ہے، ایسا شاید محض اس وجہ سے ہے کہ امریکی عورتوں کے پاس صرف کرنے کے لئے وقت اور روپیہ زیادہ ہے۔"

جہاں تک زن و شو کا ایک دوسرے کے لئے جنسی دلکشی پیدا کرنے کا سوال ہے یقیناً بڑی حد تک فطری اور "تخلیق مثل" کے منشا کے عین مطابق ہے۔ ازدواجی رشتہ کی بسم اللہ اس عنوان سے ستحسن اُسلوب پر ہوجاتی ہے۔ ایک دوسرے کے لئے ان آرائشوں سے باہمی جذب وکشش میں اضافہ ہوتا ہے۔ جوانی کو آخر فطرت نے ایک خوبصورت شگفتہ پھول کی رعنائیوں اور دلفریبیوں کا مالک کیوں بنایا ہے؟ اس کی ایک ایک ادا میں دُنیا بھر کی بہاریں کیوں بھر دی ہیں؟ اس کا آخر کوئی منشا ہونا چاہیے؟ اس منشا کے معلوم کرنے کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، بادی النظر میں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا منشا باہمی شوق وکشش کی آگ بھڑکانا اور باہمی مکمل اجتماع کے لئے حسین ماحول مہیا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اولاد پیدا ہوجاتی اور اس طرح ازدواجی رشتہ کے مستحکم رکھنے کے لئے ایک اور گرہ مہیا ہوجاتی ہے، تب جوانی کی رعنائیوں میں بھی شروع ہوجاتی ہے۔ مگر اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ ان آرائشوں ہی کو زندگی کا ماحصل سمجھ لیا جائے۔ ان آرائشوں کی یقیناً ایک حد ہے، افشاں، غازہ، مہندی، کریم، لپ اسٹک، آڑی ترچھی مانگ نکالنا ہی خوبصورت اور دلکش نسائیت کی دنیا میں سب کچھ نہیں ہے۔ ان آرائشوں کی ایک حد یہ بھی آسکتی ہے کہ خود ازدواجی مصالح کی تکمیل میں ان آرائشوں کی طرف توجہ مفرط سے نقصان پیدا ہو۔

والدین اور اولاد کا رشتہ اور اُسکی اہمیت "تخلیق مثل" کے بعد والدین و اولاد کے تعلقات کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اس ضمن میں بھی لن یوٹنگ نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ بہت کچھ ہیں، اولاد کی تعلیم وتربیت کے دوران میں والدین جو زحمتیں برداشت کرتے ہیں اور جو تکلیفیں اُٹھاتے ہیں اُن کا مقتضا ہے کہ اولاد اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کو سعادت سمجھے اور اُنھیں ہر طرح کی آرام وآسائش پہونچائے اُن کی ناز برداری کرے اُن کے بڑھاپے کی ضدوں پر تیوریاں نہ چڑھائے۔ آخر اُنھوں نے بھی، تو انھیں "بالک ہٹ" کی عمر میں انتہائی شفقتوں کی آغوش میں پرورش کیا ہے، ان کے بچپنے کی ضدیں مسکرا مسکرا کر پوری کی ہیں۔

بعض حضرات کی طرف سے خالص مادی نقطۂ نظر کی بنا پر کبھی کبھی یہ کہدیا جاتا ہے کہ عورت و مرد کی مکمل یکجائی اُستلذاذی چیز ہے جسے بیشتر لذت جو خواہش کے تحت اختیار کیا جاتا ہے۔ پیدائش اولاد ضمنی طور سے وجود میں آتی ہے اور بعض اوقات

تو یہ نتیجہ نہایت ہی تکلیف کے ساتھ برداشت کیا جاتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اس خاص عمل کے لئے اصلی محرک نفسانی لذت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، ایسی صورت میں اضطراری طور پر جو چیز وجود میں آجائے اُس کے صلہ کا استحقاق جتانا زبردستی کی بات ہے، اسی طرح اُن کی پرورش کے سلسلہ میں جو زحمتیں اُٹھائی جاتی ہیں وہ بھی خاص قسم کی نفسیاتی تسلی کا سامان بنتی ہیں۔ اولاد کی معقول تعلیم و تربیت سے جذبۂ تفاخر کی بھی تسکین ہوتی ہے اس لئے یہ زحمتیں بھی کسی معاوضہ کی مستحق نہیں قرار پاتیں۔

والدین کے حقوق سلب کرنے کے لئے بظاہر تو یہ حیلہ کامیاب معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، مکمل یکجائی کی صورت میں فوری غایت کے طور پر خواہ تخلیق مثل کا مقصد پیش نظر نہ رہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ازدواج کی طلائی زنجیر پہننے کے وقت یہ مقصد بھی پیش نظر رہتا ہے اور اگر یہ مقصد پیش نظر نہ ہوتا تو مکمل یکجائی کی مادی لذت کو تخلیق مثل کے نتیجہ سے بچتے ہوئے بھی "ضبط تولید" کے ذریعہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ذکر عام انسانوں کا ہے ورنہ یوں تو کچھ نہ کچھ ایسی مسخ شدہ ذہنیتوں کے انسان مل سکتے ہیں جو اولاد کی پیدائش کے نتیجہ کا کسی حالت میں خیر مقدم نہ کریں مگر ایسی شاذ مثالوں سے کسی قانون کا استحکام ختم نہیں ہوتا۔ اس کے ماسوا حقیقت تو یہ ہے کہ تخلیقِ مثل کا مقصد انسانی مشنیری میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود رہتا ہے۔ اس کی موجودگی کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں عورت و مرد دونوں کو اپنی زندگی بے لطف معلوم ہونے لگتی ہے۔ عیش کا تمام ساز و سامان موجود ہونے کے بعد انھیں کہیں دلچسپی کی متاع نہیں ملتی۔ اُن کی دنیا جہاں تک ہوتی ہے اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ اُجالے کا کہیں نام نہیں ہوتا۔ اس کمی کو اُس عورت و مرد کے دل سے پوچھئے جو اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں، اس کی تلافی کے لئے وہ مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں لیکن اُن کی نوعیت وہی ہوتی ہے جو بیساکھی کی کٹے ہوئے پیروں کے لئے، اسی طرح پرورش میں جو زحمتیں اُٹھائی جاتی ہیں اگر اختیاری نہ ہوں تو انھیں بہت آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے یا اُن میں کمی کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہ زحمتیں اس لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہ نفسیاتی تسلی کا سامان ہیں تو پھر "ایثار" کا لفظ ہی اخلاقی لغت سے نکال دینا پڑیگا کیونکہ کوئی ایثار ایسا فرض نہیں کیا جا سکتا جس میں کسی نہ کسی عنوان سے نفسیاتی تسلی کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اولاد پر والدین کے حقوق کا موجودہ عائلی نظام میں تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ اولاد کا یہ قطعی فرض ہے کہ وہ ہنسی خوشی والدین کی خدمت کرے انھیں کسی قسم کی اذیت نہ پہونچائے۔ ہمیں اسی خدمت کے مکتب میں خدمتِ خلق کا سبق ملتا ہے۔ مشرقی تہذیب کی یہ مستحسن خصوصیت ہے کہ وہ والدین کے لئے "اُف" تک کہنے کی روادار نہیں ہے۔ جس تہذیب و ثقافت میں اس سے روگردانی کا ذرا سا بھی رجحان پایا جاتا ہے وہ عائلی نظام کے لئے سم قاتل ہے۔

بیوی کو منتخب کرنے کا حق — لن یوٹنگ بیوی کے منتخب کرنے کے متعلق بھی خالص مشرقی مذاق کے تحت والدین وغیرہ ہی کو حق دیتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ کہتا ہے "ہر بزرگ خاندان بڑی احتیاط کے ساتھ اچھے

خاندان کی لڑکی منتخب کرتا ہے اُسی طرح جیسے ایک مالی کسی شاخ کی قلم باندھتے وقت مناسب جوڑ کا انتخاب کرتا ہے"۔

اس جگہ اُس نے چین کی ایک خاص رسم کا مذکرہ کیا ہے مگر اس طریقہ سے کیا ہے کہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس رسم پر صاد کھینچ رہا ہے اور یوں بھی لن یوٹنگ نے کہیں بھی چین کے کسی پُرانے دستور سے اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ اُسی گرمجوشی کے ساتھ سراہا ہے جس طرح ہمارے آجکل کے بہت سے ہندوستانی رہنما اپنی پُرانی تہذیبوں کے تمام خط وخال باقی رکھنے پر مقتضیات عصر حاضر سے قطع نظر کرتے ہوئے مصر ہیں کیونکہ ان کی نگاہوں میں اسی کہنہ و فرسودہ تہذیب و ثقافت کے منبع ہی سے آبِ حیات حاصل ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بیوی کے انتخاب کا مسئلہ نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔ اس پر مستقبل کی تمام مسرتوں کا دار و مدار ہے اسے نہایت سوچ سمجھ کر قایم کرنا چاہئے۔ اس مسئلہ پر ہمیشہ کافی غور کیا گیا ہے اس لئے اس خصوص میں کوئی نئی بات تو کہی نہیں جاسکتی۔ البتہ مختصر طور سے یہاں اتنا عرض کر دینا شاید مناسب ہو کہ زن و شو کے انتخاب میں نہ صرف والدین وغیرہ ہی کو حق حاصل ہونا چاہئے بلکہ فریقین کی رائے اور پسند کو بھی اس میں دخیل ہونا چاہئے۔

مغربی امریکہ میں ازدواج کے مقدمہ کے طور سے کورٹ شپ کا رواج ہے مگر وہ مستقل طور سے کامیاب ازدواجی زندگی کی مسرتوں کا سرچشمہ نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں نوجوان مرد و عورت کا تنہائی میں بے تکلفانہ اجتماع جنسیاتی رجحانات کی آگ کو مشتعل کر دیتا ہے اور پھر اس جذباتی ہنگامہ میں صحیح فیصلہ کی طرفین میں صلاحیت باقی نہیں رہ سکتی۔ اس شکل میں ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ مرد عورت دونوں اپنے اصلی سیرت و کردار کے خط وخال تصنع کے پردے میں چھپالیں اور اس طرح طرفین کو ایک دوسرے کی فطرت و مزاج سے واقفیت کا کوئی موقع نہ ملے اور ایک دوسرے کے متعلق رائیں غلط قایم کرلیں۔ کورٹ شپ کی اسی خرابی کا نتیجہ ہے کہ یورپ و امریکہ میں طلاقوں کی افراط ہے۔ اگر کورٹ شپ سے صحیح معنوں میں باہم موافقت رکھنے والے مزاجوں کے انتخاب کا موقع ہوتا تو ازدواجی رشتہ اس قدر جلد اور اس آسانی سے منقطع نہ ہو سکتا۔

کورٹ شپ کی اس ناکامی کو دیکھتے ہوئے وہی طریقہ اچھا معلوم ہوتا ہے جس میں ماں باپ کو شادی کے سلسلہ میں کافی اختیارات دئے جائیں، اُن کی آغوش میں لڑکی لڑکے نے پرورش پائی ہے، وہ اُن کے مزاجی رفتار اور طور طریق سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور پھر زندگی کے نشیب و فراز بھی دیکھ چکے ہیں اس لئے اُن کے انتخاب میں وہ غلطیاں نہیں ہوسکتیں جن کا امکان خود فریقین کے انتخاب کی صورت میں نظر آتا ہے، لیکن وہ بھی انسان ہیں، دوسری غلط قسم کی ترغیبوں میں پھنسکر وہ فریقین کے لئے صحیح انتخاب سے کنارہ کش ہو سکتے ہیں اس لئے لڑکے لڑکی کی آخری رضامندی واضح الفاظ میں حاصل کرنا لازمی ہونا چاہیئے۔

اُنھیں دوسرے ذریعوں سے بہت کچھ ایک دوسرے کے حالات معلوم ہوسکتے اور وہ ایک حد تک والدین

وغیرہ کے انتخاب کی لغزشوں کی روک تھام کر سکتے ہیں، اس کے بعد بھی اگر انتخاب غلط ہو جائے اور ازدواجی تعلق قائم ہونے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہ سکیں تو ازدواجی قانون میں علحدگی کی بھی ایک دفعہ ضرور ہونا چاہئے طلاق کا منشا یہی ہے - ان احتیاطوں کے بعد البتہ اس کی ضرورت شاذ و نادر ہی پیش آئے گی، اگر ازدواجی رشتہ قایم کرنے میں یہ تمام باتیں صحیح طور سے ملحوظ رکھی جائیں تو شادی کی مسرتوں کا چشمہ سوکھ نہیں سکتا۔

یہاں اس کا بھی صاف لفظوں میں اعتراف ضروری ہے کہ ہم مشرقی بھی ازدواجی معاملہ میں غلط مسلک اختیار کئے ہوئے ہیں، مغرب اگر ایک طرف انتہائی نقطہ پر ہے تو مشرق بھی دوسرے انتہائی نقطہ پر ہے، یہاں کی بعض تہذیبوں میں تو طرفین کو بالکل ہی اختیار نہیں دیا جاتا - والدین اُن کی آخری منظوری حاصل کئے بغیر اُنھیں جہاں چاہتے ہیں جھونک دیتے ہیں، اور پھر اس کے نتیجہ میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اُنکے ازالہ کے لئے اُن کے قانون میں طلاق کی اجازت بھی نہیں ہے۔

اگرچہ اب حالات کے دباؤ نے اُن کی روش میں معقول تغیر پیدا کر دیا ہے اور وہ اس کمی کی تلافی کی کوشش کر رہے ہیں، سطور بالا سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ لن یوتانگ کے خیالات میں ایک حد تک غلو ضرور ہے، اگر انھیں غیر معتدل عناصر سے الگ کر کے دیکھا جائے تو اُن سے فایدہ موجودہ حالت میں اُٹھایا جا سکتا ہے۔

سید اختر علی تلہری

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے۔

مال اور مسافروں کو بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے لکھئے :-

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ بینک اسٹریٹ بمبئی

اصغر کی شاعری

رشید صاحب نے ایک موقع پر اصغر کے متعلق لکھا ہے:

"مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آجاتا ہے اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے، مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجیے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کے الفاظ و عبارت میں تحویل کیجیے تو ان کا کلام"۔ (جامعہ ج ۳۳ - ش ۷)

اس "ریاضی کے نکتہ" میں بڑی شاعرانہ لطافتیں پوشیدہ ہیں اور ان سے اسی وقت لطف اٹھایا جا سکتا ہے، جب اصغر کی زندگی ہمارے سامنے ہو اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ زردشتیوں کے قول کے مطابق رفتار و گفتار و کردار کی ہم آہنگی شاعری کی دنیا میں کیا معنی رکھتی ہے۔ رشید صاحب لکھتے ہیں کہ "انھیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ "اصغر صاحب" ہی پایا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے۔ شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا"۔ اصغر کی زندگی بڑی صاف ستھری، پاکبازانہ اور وضعدارانہ تھی۔ وہ زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرے تھے اور ہر قسم کی صحبتیں دیکھی تھیں۔ لیکن تہذیب، خلوص اور خودداری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

سوانح نگار مذکور ناقل ہیں کہ "اصغر صاحب کی آمدنی بہت کم تھی لیکن میں نے ان کو کبھی تنگدستی کا شاکی نہیں پایا، بڑا خرچ تھا۔ بہت اچھا پہنتے تھے۔ اس سے اچھا کھاتے تھے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرتے تھے۔ ان سے دس گنی آمدنی والوں کو بھی میں نے ان جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا"۔

یہی رکھ رکھاؤ اصغر کی شاعری میں بھی ہے۔ جس طرح ان کی گفتگو، وضع، لباس، معاشرت میں ذوق اور سلیقہ کارفرما ہے۔ ایسے ہی ان کا آرٹ بھی بہت رچا ہوا اور بڑی ریاضت کا نتیجہ ہے۔ یہ بقول شخصے ڈھاکے کی ململ اور لکھنؤ کی جامدانی کی طرح بڑا شریف آرٹ ہے۔ وہ اپنے دامن پر ذرا سی گرد کا دھبہ گوارا نہیں کر سکتا۔ اصغر کی شاعری، ان کی زندگی کا آئینہ ہے اور جس طرح ان کی زندگی اعلیٰ معیار کی تھی۔ ایسے ہی ان کے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جو معیار تہذیب سے گرا ہوا ہو۔

اصغر جب دنیائے شاعری میں روشناس ہوئے تو عمر عزیز کے چھپن سال گمنامی میں بسر کر چکے تھے۔ دنیا نے ان کو ایک مشاق اور پختہ کار شاعر کی حیثیت سے دیکھا اور غالباً ان کے ذہنی ارتقا کا اندازہ اس سے کیا کہ ان کا سلسلۂ تلمذ مختلف واسطوں سے مومن تک پہونچتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں جا بجا غالب کا سا نامکمل فلسفہ اور کہیں کہیں اقبال کی سی قطعیت

کی جھلک پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ "کار زمیں" پر اعتماد نہ کرکے وہ انسانی تگ و تاز کی اس منزل پر پہونچنا چاہتے ہیں جو فلسفہ کی دسترس سے باہر ہے اور روحانیت سے قریب۔ لیکن یہ خلش تنقید نگار کے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی کہ ان کی شاعری کا وہ دور جو نہ صرف رنگ و بو کا زمانہ تھا بلکہ اثرات قبول کرنے کے اعتبار سے بہت اہم اور تنقید کے نقطۂ نظر سے بہت ضروری۔ ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ ان حالات میں اصغر کی شاعری ایک ایسا جام شراب ہے جس کو ساقی نے ہماری نظروں سے پوشیدہ، معلوم نہیں انداز تبسم کے ساتھ، یا ابرو کشیدہ، لرزہ براندام کیفیت سے یا نگاہِ بے تعلق سے، بھر کر محفل میں رکھدیا ہو۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہمارے پاس اصغر کا ابتدائی کلام موجود نہیں۔ انھوں نے ۳۵ یا ۴۰ برس کی عمر تک جو کچھ لکھا وہ شایع نہیں کیا، حالانکہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے یہی زمانہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ ۴۰ برس کی عمر میں، جب بالعموم "مے و رامش و رنگ و بو" کی دلکشی باقی نہیں رہتی، اصغر بالکل مذہبی آدمی ہوگئے۔ اس انقلاب نے ان کے کلام میں داخلی طہارت تو پیدا کردی لیکن دلسوزی و دل برشتگی نہیں۔ ان کے کلام میں جو "صفات قدسی" پیدا کی گئی ہیں وہ سوزِ عشق کی محرومی کو چھپانے کے لئے لائی گئی ہیں۔ ان کا فلسفہ، پراسرار روحانیت و ماورائیت کا فلسفہ ہے اور ایک غیر جانبدار نقاد ان کے اس اعترافِ عجز سے کسی طرح قطع نظر نہیں کرسکتا کہ: "مجھ کو دماغ صحبت روحانیاں نہیں"

اصغر ہماری گوشت و پوست کی رگوں پر زخمہ زن نہیں ہوتا۔ اس کے یہاں "دعوت کام و دہن" سے زیادہ "دعوت فکر" ہے۔ اس کی شاعری سمجھنے کی چیز ہے اگر ہم اس میں کھونا چاہیں تو کھو نہیں سکتے۔ وہ ایسا زاہد ہے جو سرگشتۂ سود و زیاں ہے اور مستیِ بے مدعا کا رازداں نہیں۔

اصغر ممکن ہے جوان رہے ہوں لیکن ان کی شاعری ہمیں پیرانہ سال ہی ملی۔ نقیب خرد کو وہ کبھی نوید جنوں نہیں دیسکے عاشق و محبوب کے تعلقات جنسی کو کبھی ان کا شعور لطیف اور رنگین نہیں بنا سکا۔ اسی لئے ان کی روحانیت بھی کچھ ویران سی ہے اور ان کی محبت بھی بے رونق۔ ان کے تخئیل میں رنگینی ہے لیکن جذبات میں گرمی نہیں۔

اس کے باوجود اصغر کی شخصیت خشک نہیں۔ اس کی طبیعت میں گداز ہے۔ بعض مواقع پر اس نے اپنے وجدانی شخصیت کو کائنات اور حقیقت میں تحلیل کردیا ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ "اس کے آرٹ میں اخلاق سے زیادہ خلق ہے"۔

انتہا کیف کی افتادگی و پستی ہے ۔۔۔ مجھ سے کہتا تھا یہی دردِ تہ جام ابھی

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں ۔۔۔ آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت ۔۔۔ میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا ۔۔۔ جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

عشق کی ناکامیابی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے، جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں،

اصغر، مومن کے سلسلۂ تلامذہ میں ہیں۔ یہ انداز بیان بالکل مومن کا ہے:

جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

یہ بلند نظری بھی ملاحظہ ہو:۔

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال، اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے،

یہ عزم و استقلال بھی غور طلب ہے:

افتادگانِ عشق نے سر اب تو رکھ دیا اُٹھیں گے بھی تو نقش کفِ پائے ہوئے

بلند مرتبہ ہستیاں جریدۂ عالم پر اپنا نقش ثبت کر دیتی ہیں:

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

یہ جور کشی بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں:

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موجِ تلاطم میں، وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

اصغر نے "شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں" کو ترک کر دیا ہے۔ اس کی شاعری میں تفاول و مسرت کا عنصر زیادہ ہے۔ اس نے اپنے کلام میں جا بجا ایسے نقوش چھوڑ دئے ہیں جس سے اس کے شاعرانہ مسلک کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

غزل کا اک شرار معنوی گردش میں ہے اصغر یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

شعر میں رنگینیِ جوشِ تخیل چاہئے مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

اصغر نشاط روح کا اک کھل گیا چمن جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

اصغر غزل میں چاہئے وہ موجِ زندگی جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر نے غزل کو محدود معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کی شاعری کا محور شگفتگی اور تبسم زیرلبی ہے۔

زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا، رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشمِ مست پر ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھئے

پھر آج بزمِ عشق میں آئے جنابِ شیخ وحشت نوائیِ غمِ فردا لئے ہوئے

اصغر کے موضوعاتِ سخن محض درد ہجر اور لذت وصال نہیں ہیں۔ بلکہ اس نے حیات و کائنات کے وسیع مسئلہ پر خامہ فرسائی کی۔ اور بیشتر متغزلیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ وہ عمل اور سخت کوشی کا موید ہے اور ہر انقلاب کو حیات نو کا

پیغام سمجھتا ہے:-

کیوں شکوہ سنج گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

ے خانۂ ازل میں، جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں،

اصغر افسانۂ ہستی پر رائے زنی کرتا ہے لیکن عمل پیہم کی اہمیت سے بے خبر ہو کر نہیں وہ مجبوریِ حیات سے مایوس نہیں ہے، وہ زنداں میں بھی روزن بنا سکتا ہے اور قفس میں بھی "موج خون دل" سے چمنستاں پیدا کر سکتا ہے۔

مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

مار ڈالے گی مجھے عافیت کنج چمن
جوشش پرواز کہاں جب کوئی صیاد نہ ہو

انسان خود اپنی قسمت کا خالق ہے، اس کی کوتاہیاں اس کے مصائب کی ذمہ دار ہیں۔

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

کسب حیات تو تری ہر ہر ادا سے ہے
مرنا پسند خاطر اربابِ جاں نہیں

آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اسکو
یہ جانِ ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

یہ درس عمل بھی ملاحظہ ہو:

یہ دین، وہ دنیا ہے، یہ کعبہ وہ بت خانہ
اک اور قدم بڑھ کر اے ہمتِ مردانہ

یہ نقاد کی رائے ہے کہ غزل گو شعراء میں صرف اصغر ہی ایسے ہیں جنھوں نے سماجی انقلابات اور زمانہ کی تبدیلی کو محسوس کر کے غزل کے ساز پر گایا ہے۔ لیکن یہ رائے اس شاعر کے متعلق صحیح نہیں ہو سکتی جو اپنے آپ کو مہ و انجم کا ہمنشیں سمجھتا ہو جو رنگ چمن کو دور سے دیکھنے کا عادی ہو ؏ "دور سے ہم راز شمع انجمن دیکھا کئے"

جس کا دل "نزاکت غم لیلیٰ" کا حامل ہو اور جو "تاب خلش ہائے روزگار" نہ رکھتا ہو جو افسانۂ ہستی کو اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھے ...... ؏ "کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرز ادا ہے" اور جو تقاضائے حسن یار دیکھ کر ساری زندگی ایک سجدۂ نیاز میں گزار دینا ثواب سمجھتا ہو۔ اصغر ہمیں یہ تو بتلاتے ہیں کہ زندگی کی راہ پر پیچ اور مشکل ہے لیکن وہ کیا دقتیں ہیں اور منزلِ مقصود کیا ہے؟ اس کی طرف وہ اشارہ بھی نہیں کرتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان کی نظر زیادہ بلند نہیں۔

اس سے مقصود اصغر کی عظمت سے انکار نہیں بلکہ اس کی عظمت کو اس جگہ ڈھونڈنا غلط ہے۔

پہلے تو غزل صرف خلوت و جلوت کی حدود میں گھری ہوئی تھی۔ اب ساری کائنات اس کی آغوش میں ہے۔ اصغر کے کلام میں کہیں کہیں اس میلان نو کے نقوش پائے جاتے ہیں وہ غالب اور اقبال کے طرز کلام سے متاثر ہے۔ اسی لئے اسکے یہاں سسرت زائی، بلند خیالی اور معنویت ہے۔ لیکن بعض جگہ متصوفیانہ فلسفہ طرازی نے شعریت کو دبا دیا ہے تصوف

کے مضامین مقرر ہیں۔ ان میں لطف صرف طرزِ بیان اور سوز و اثر سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اصغر کے یہاں ایسی نور آگیں مثالیں کم ملتی ہیں۔

تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت — میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں
فطرت ستار ہی ہے ازل سے اسی طرح — لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں،
آلام روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

عرفی کا شعر ہے:

در دلِ ما غمِ دُنیا غمِ معشوق شود — بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

اس کے باوجود — اصغر نے حُسن و عشق، مجاز و حقیقت، جبر و اختیار، کعبہ و بُت خانہ، کفر و ایمان، ہر ہر موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور اس سے انکار حقیقت ناشناسی ہوگی کہ بعض بعض جگہ خونِ دل سے گلکاریاں بھی کی ہیں۔

دعویٰ دید غلط، دعویٰ عرفاں بھی غلط — کچھ تجلّی کے سوا چشم بصیرت میں نہیں،
عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حُسن کو — پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے
یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے — قطرہ میں سمندر ہے ذرہ میں بیاباں ہے
پھر گرم نوازش ہے ضَو مہر درخشاں کی — پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے
یہ حسن تعین سے ظاہر ہو کہ باطن ہو — یہ قید نظر کی ہے وہ فکر کا زنداں ہے

مجاز و حقیقت:

پردۂ دہر کچھ نہیں ایک ادائے شوخ ہے — خاک اُٹھا کے ڈالدی دیدۂ امتیاز میں
حل کر لیا مجاز و حقیقت کے راز کو — پائی ہے میں نے خواب میں تعبیر خواب کی

کعبہ و بُت خانہ:

جلوۂ ذوقِ پرستش گرمیِ حُسنِ نیاز — ورنہ کچھ کعبہ میں رکھا ہے نہ بتخانہ میں ہے

ہمہ اوست اور ہمہ از اوست ہے

قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو — اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا،
کیا فیض بخشیاں ہیں رخ بے نقاب کی — ذرّوں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی
جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے — پردہ پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے
کس طرح حُسن دوست ہے بے پردہ آشکار — صدہا حجاب صورت و معنی لئے ہوئے
بند ہو آنکھ اُٹھے منظر فطرت کا حجاب — لاؤ اک شاہد مستور کو عریاں کر دیں

حُسن و عشق :

حُسن غیر محدود ہے اور بندشِ جہت و مقام سے قطعی آزاد۔

رُخِ حُسن تعین سے ظاہر ہو کہ باطن ہو — یہ قیدِ نظر کی ہے وہ فکر کا زنداں ہے
کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے — مجھ سے دیکھا نہ گیا حُسن کا رسوا ہونا

حُسن کا یہ اضطراب ہم آغوشی بھی ملاحظہ ہو :

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے — حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی
جبینِ شوق کی شوریدگی کو کیا کہئے — وگرنہ عشوہ طرازیٔ نقشِ پا معلوم
مستی سے ترا جلوہ خود عرضِ تماشا ہے — آشفتہ مزاجوں کا یہ کیفِ نظر دیکھا
ذرّوں کا رقص مستیِ صہبائے عشق ہے — عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے

کفر و ایمان :

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا — رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

ہر چند کہ اصغر کو شاہ عبدالغنی صاحب سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ لیکن ان کے صوفیانہ کلام کا تعلق دماغ سے زیادہ ہے، اور دل سے کم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قلب ماہیت نگاہ کے بجائے کتاب سے ہوئی تھی۔ درد اور آتش کا سوز ان کے یہاں نہیں ملتا۔ اور جس وادی ایمن کی شرربازیوں کا ذکر تقریظ نگاروں نے کیا ہے اسکی تصدیق کلام سے نہیں ہوتی اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اصغر نے تصوف کی ابتدائی منزل ہی کو مقام بنا لیا ہے اس کے بعد یہاں شجرِ طور اور شیوۂ منصور کی تکرار تو ہے لیکن زبان اور لہجہ میں وہ سوز و ساز نہیں جو واقعیت کو بھی ماورائیت کا درجہ دیدیتا ہے۔

اصغر کے تصوف سے زیادہ دلکش ان کا تغزل ہے اس کی بڑی خوبی وہ پاکیزگی اور سلیقہ ہے جو صرف ان کا حصہ ہے ان کے کلام میں شیرینی بھی ہے، ترنم بھی، شوخی بھی، سادگی بھی، متانت بھی۔ ان سب باتوں نے مل کر ان کے کلام میں ایک نئی انفرادیت پیدا کر دی ہے جس کا اندازہ اشعارِ ذیل سے ہو سکتا ہے۔ آرزوئے دید کی یہ وارفتگی ملاحظہ ہو:

تو برقِ حسن اور تجلّی سے یہ گریز، — میں خاک اور ذوقِ تماشا لئے ہوئے

محبوب کی یہ فتنہ سامانی بھی باعثِ لطف ہے :

تقدیر کس کے خرمنِ ہستی کی کھل گئی — طوفان بجلیوں کا تمھاری نظر میں ہے

حُسن کی یہ اداشناسی تعریف سے مستغنی ہے :

رُخِ رنگیں یہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے　　وہ ربط خاص رنجش بیجا کہیں جسے

اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا　　معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

مجھی سے بگڑے رہتے ہیں مجھی پر ہے عتاب ان کا　　ادائیں چھپ نہیں سکتیں نوازش ہائے پنہاں کی

تم دید کو کہتے ہو آئینہ ذرا دیکھو　　خود حسن نکھر آیا اس کیف تماشا سے

کیا کہئے جاں نوازی پیکان یار کو　　سیراب کر دیا دل منت گزار کو

یہ پاک دامانی ملاحظہ ہو :

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچۂ و گل کو　　مگر موج صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی،

یہ دل شکستگی کس بلا کی ہے :

ساز دل کیا ہوا وہ ٹوٹا سا،　　ساری ہستی ہے گوش بر آواز

عشق کی یہ طرفہ ادا بھی دیکھئے :

اب خود یہاں تغافل و بیگانگی سی ہے،　　کچھ یہ بھی طرفہ کاری سودائے عشق ہے

ہم اس نگاہ ناز کو سمجھے تھے نیشتر　　تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو　　خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے،

اسی سلسلہ میں اصغر کا ایک فارسی شعر بھی سن لیجئے :

ما بہ ہر طرزے کہ می رفتیم شایانش نہ بود　　او بہ ہر رنگے کہ می آمد ہماں مقصود بود،

یہی وہ مقام ہے جہاں اصغر کی عظمت کے تمام گوشے منور ہو جاتے ہیں۔ وہ عشق کی نفسیات سے واقف ہے اور حسن کی رنگینیوں کا ادا شناس ہے اس کے عشق کا معیار بلند ہے عریاں گوئی کی ایک مثال بھی اس کے یہاں نہیں ملسکتی۔

لیکن عاشقانہ شاعری میں بھی کہیں کہیں اس کی "مولویت" غالب آجاتی ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کوئی اس کے دل کی آواز کو بند کر دیتا ہے۔ اس کی شخصیت پر تہ بہ تہ گہرے نقاب پڑے ہوئے ہیں اور باوجود کشف حجاب کی تمام مساعی کے اس کے جملہ خط و خال نظر نہیں آتے اور کوئی اس کے اعماق روح سے خبردار نہیں ہو سکتا وہ خود معترف ہے کہ :

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا　　اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

مومن اور حسرت کی سی جرأت شاعرانہ اس کے کلام میں نہیں ملتی۔ اس کا محبوب دنیائے آب و گل سے ماورا ہے کہیں وہ بوئے گل ہے اور کہیں نغمۂ رنگیں، اس کا حسن کہیں دیدۂ مینا ہے اور کہیں فروغ بادہ۔ ہماری لب تشنگی تقریر بدستور باقی رہ جاتی ہے اور محرومیاں بے اختیار پکار اٹھتی ہیں :

دہند شوق و لے رخصت نظر نہ دہند

اس نقص سے قطع نظر اصغر کی شاعری کی نمایاں خصوصیت خیالات کی پاکیزگی اور انداز بیان کی لطافت ہے اسی دل آویز پیرایہ کی وجہ سے ان کے معمولی سے معمولی خیالات بھی دلکش بن جاتے ہیں۔ اصغر نے اپنے احساسات کو آبِ رنگ شاعری میں اس طرح سمو کر پیش کیا ہے کہ دل و نظر ان میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں اور بعض وقت سخن آرائی خود طرزِ ادا کی ندرت پر وجد کرنے لگتی ہے۔

توبرقِ حُسن اور تجلی سے یہ گریز
میں خاک اور ذوقِ تماشائے ہوئے

ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو
اب تو یہی زبان مرے مدعا کی ہے

مستی سے ترا جلوہ خود عرضِ تماشا ہے
آشفتہ مزاجوں کا یہ کیف نظر دیکھا

میری فغان درد پر اس سروِ ناز کو،
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

کیا کہئے جاں نوازیِ پیکاں یار کو،
سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

یہ صفائی اور برجستگی بھی دیکھئے:

صحن حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں،
اب کچھ نہ پوچھئے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں،

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبش نظر میں کوئی داستاں نہیں

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

فطرت سُنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

خدا جانے کہاں ہے اصغرِ دیوانہ برسوں سے
کہ اس کو ڈھونڈھتے ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

تڑپتا ہے، نہ جلتا ہے نہ جل کر خاک ہوتا ہے
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرت پروانہ برسوں سے

مری رندی، عجب رندی، مری مستی عجب مستی
کہ سب ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

اب تک ہم نے اصغر کی معنوی اور بیانی خوبیاں دیکھیں لیکن اس کے کلام کا غائر مطالعہ بتلاتا ہے کہ لفظی خوبیاں بھی اسکے یہاں کسی جدید اُردو شاعر سے کم نہیں۔

اصغر کا سلسلۂ تلمذ کئی واسطوں سے مومن تک پہونچتا ہے۔ مومن کو فارسی سے طبعی مناسبت تھی۔ مومن، فغانی، شفائی، عرفی، نظیری، کلیم اور بیدل کا خوشہ چیں ہے اور حقیقت میں اس کی اُستادی کی بنیاد دستگاہ فارسی پر قایم ہے فارسی ہی کے اثر سے اسکے یہاں ایسی لطیف ترکیبیں پائی جاتی ہیں جو شعر کی جان ہیں۔

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے
اب عذر کیا رہا نگہ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دل ناکامیاب میں

غرض آرزو ہائے دلِ رشک آشنا، چشم ستارہ بار، آہوئے نیم خواب، شکوۂ زخم ریز، عشق ستیزہ کار، ستم آموز روزگار،

التفاتِ ستم نما، بیگانہ آشنا، خموشی اثر، اجل چارہ — اور اسی قسم کی بیسیوں استوار اور خوشنما ترکیبیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی طبیعت فارسی مذاق سے بخوبی آشنا تھی اور یہ مرصع کاری اسی کا پرتو ہے۔

اصغر بھی مومن کی طرح فارسی سے متاثر نظر آتے ہیں ان کے کلام میں ایسی دلکش ترکیبوں کی کمی نہیں۔

جو مجھ پر گزرتی ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم — چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری
پھر دل میں التفات ہوا ان کے جا گزیں — اک طرزِ خاص رنجشِ بے جا لئے ہوئے
کیا کہئے جاں نوازیِ پیکانِ یار کو — سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

غرض موجِ ترنمِ سحری، آفتابِ نیم شبی، شعلۂ عریاں، سرابِ تمنا، شورشِ بے حاصل، شعلۂ گلفام اور اسی قسم کی بہت سی ترکیبوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر کو کرسی نشینیِ تراکیب کا خاص سلیقہ ہے اور اس نے الفاظ کی مینا کاری سے اشارات و کنایات کا طلسم کھول دیا ہے۔

اس اجمالی بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک تخلیقِ معانی، ایجادِ اسالیب، تزئینِ بیان، شادابیِ خیال، صفائے گفتگو، استخواں بندیِ تراکیب، تصویر کشی اور مرصع کاری کا تعلق ہے اصغر شعرائے عصرِ حاضر میں ایک ممتاز درجہ کا مالک ہے اس سے جو کچھ ہمیں شکایت ہے وہ یہ کہ:

مے خانہ میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر — مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا (ریاض)

لیکن اس کے باوجود اس کی خوبیاں، خامیوں سے زیادہ ہیں اور اس نے اپنے رنگ و آہنگ سے جدید اردو شاعری میں امتیازی جگہ حاصل کر لی ہے۔

خواجہ احمد فاروقی ایم - اے

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے۔ بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں۔ ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اس کے مداح موجود ہیں۔

دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں۔ اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں اس کو مثل آبحیات کے تصور فرمائیے اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی، اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا نئی نہیں ہے ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۲۸ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔

پتہ: حکیم ثابت علی شیخ زبان، خوش کلام
(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ۔ یو۔ پی

مودودی صاحب اور مسئلۂ امارت

مسئلۂ امارت سے متعلق نگار میں میرے جو چند مضامین شایع ہوئے ہیں، انھوں نے مودودی جماعت میں ایک کھلبلی سی مچادی ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ کچھ گھبرایا ہوا سا نظر آتا ہے اور پوری طاقت کے ساتھ مل جل کر سب اس وار کو روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں جو اب تک وہ دوسروں پر کیا کرتے تھے۔ انھیں اس کی خبر نہ تھی کہ وہ ان پر بھی بھرپور پڑ سکتا ہے "کوثر" میں ان حضرات نے جو کچھ لکھا تھا اس پر میں نے مختصر سا تبصرہ کیا تھا جو اکتوبر کے نگار میں "مودودی اسکول کے تربیت یافتہ نقاد" کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے۔ اس پر مودودی جماعت کی طرف سے نگار ہی میں ایک تحریر چھپی ہے۔ یہ سمجھنے کے کئی قرینے ہیں کہ یہ تحریر جماعت کے ذمہ دار لوگوں نے باہمی صلاح و مشورے سے لکھی ہے۔ مگر ایک غیر ذمہ دار رکن جماعت کے نام سے شایع کرائی گئی ہے۔ اس سے بھی ان حضرات کی سراسیمگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ذمہ دار لوگ پردہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ اس میں ان "اسلام پرستوں" کی یہ "جاہلی مصلحت" ہے کہ اگر بحث میں نیچا دیکھنا پڑے تو ان کی نیک نامی پر کوئی حرف نہ آئے۔ بڑا قرینہ اس بات کا کہ یہ چھوٹے بڑے سب مل جل کر "دماغی کشتی" لڑ رہے ہیں یہ ہے کہ کوثر میں جماعت کے ایک سربرآوردہ رکن مولوی نذیر الحق صاحب نے میرے مقالہ کی ابتدائی اور تمہیدی سطور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ شوکت صاحب کے دلایل کا مفصل جواب ایک اور رکن جماعت لکھ رہے ہیں جو قریب ہی کوثر میں شایع ہوگا۔ جن صاحب کے نام سے وہ جواب شایع ہوا وہ شاہجہاں پور کے رہنے والے ہیں اور شاہجہاں پور ہی میں مقیم ہیں۔ نذیر الحق صاحب پنجاب کے کسی ضلع میں ہیں۔ کوثر لاہور سے نکلتا ہے۔ اور کسی طرح اس کا امکان نہیں کہ شاہجہاں پوری صاحب نے نذیر الحق صاحب کو لکھ دیا ہوگا کہ آپ صرف ابتدائی حصہ کا جواب دیں، علمی بحث میں کر رہا ہوں۔ یہ بھی بعید نظر آتا ہے کہ "مدیر کوثر" کو شاہجہاں پوری دوست کا جواب موصول ہو چکا تھا اور انھوں نے اس کی اطلاع نذیر الحق صاحب کو کر دی۔ اب قارئین ہی بتائیں کہ مل جل کر آپس کے مشورے سے یہ تحریریں نہیں لکھی گئیں تو ایک کو دوسرے کے جواب کی خبر کیسے ہوئی۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ یہی صاحب جن کے نام سے نگار میں یہ تحریر شایع ہوئی ہے، انھیں سنایا اور مودودی صاحب کی وہ تحریر بھی جس میں انھوں نے ترجمان القرآن میں میرا مقالہ شایع نہ کرنے کے وجوہ بیان کئے تھے۔ ان صاحب نے سن کر فرمایا "میں نے ایک صاحب کی زبانی آپ کو یہ پیغام پہونچایا تھا کہ آپ مودودی صاحب کی امارت پر جو کچھ تحریر فرمائیں میرے نام سے تحریر فرمائیں۔ اس صورت میں مودودی صاحب ضرور اسے شایع کریں گے اور اس کا جواب بھی دیں گے۔" یہ انھیں کے الفاظ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صاحب اگر خود کچھ کہنے سننے اور

جواب لکھنے کی اہلیت رکھتے تھے، خواہ وہ کیسا ہی ادھورا، ناتمام اور بے تکا کیوں نہ ہو، تو وہ یہ پیغام کیوں بھجواتے کہ میں اپنے خیالات ان کے نام سے قلمبند کردں اور ترجمان کو بھیجوں۔ اس طرح مودودی صاحب کو جواب دینے کے لئے مجبور کیا جائے۔ آسان صورت یہ تھی کہ وہ کہتے میں خود جواب دینے کے لئے طیار ہوں۔ مودودی صاحب کو زحمت دینا کیا ضرور ہے۔ ایک تیسرا قرینہ بھی ہے۔ ان صاحب نے مقدمہ فتح الباری، تہذیب التہذیب وغیرہ چند کتابوں کا ذکر بھی اپنے مضمون میں کیا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ میں ان کتابوں کو دیکھوں۔ گویا انھوں نے ان کو دیکھ لیا ہے۔ حالانکہ جس مقصد کے لئے انھوں نے ان کتابوں کے مخصوص حصے دیکھنے کے لئے کہا ہے ان میں اس کا ذکر تک نہیں۔ یہ بات قارئین اگلی سطور میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود مولوی صاحب نے ان کتابوں کے وہ مقامات نہیں دیکھے۔ کسی صاحب نے ان کو لکھا کہ آپ فلاں فلاں مقامات دیکھ لیں۔ اور انھوں نے "نقل مطابق اصل" فرمادی۔ اگر واقعی انھوں نے یہ کتابیں یا ان کے وہ مقامات دیکھے ہوتے تو بہتر اور مناسب یہ تھا کہ جہاں اپنی تائید میں دوسری کتابوں سے انھوں نے مفید مطلب عبارتیں نقل فرمائی تھیں وہاں یہ عبارتیں بھی وہ درج کر دیتے۔

ہر چند جواب مشورے سے لکھا گیا ہے مگر پھر بھی ناتمام ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں مودودی تحریک کے ان تین نقاط پر بحث کی تھی جن کی طرف نذیر الحق صاحب نے مجھے توجہ دلائی تھی۔ ان کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا۔ خاص امارت کے متعلق میں نے دو اہم باتیں عرض کی تھیں۔ اول یہ کہ نبی کو چھوڑ کر تنہا کسی ایک انسان کی رہنمائی کوئی شرعی چیز نہیں۔ امام وہ ہو سکتا ہے جس کی نصر و اعانت کا خدا نے وعدہ فرمایا ہو۔ انبیاء علیہم السلام کی اعانت تو وحی سے کی جاتی تھی۔ مگر اب اس کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ وحی در اصل روح امر ہے۔ روح امر کا تو انقطاع ہو چکا مگر امر اب بھی باقی ہے اور وہ "شوریٰ" ہے۔ اس کی تائید میں قرآن کی واضح آیات پیش کر دی گئی تھیں۔ دوسرے یہ کہ جب تمام مسلمان خلیفہ ہیں تو کس نص و فرمان کی رو سے ان کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کو اپنا امام چنیں ان میں سے کسی چیز کا بھی کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں تنقید کرنے والے کو تسلیم ہیں۔ یا ان کا جواب دینے سے وہ عاجز ہیں۔ دونوں صورتوں میں یہ خیانت ہے ہے، اگر یہ باتیں تسلیم ہیں تو ایک سچے مسلمان کی طرح ان کو مان لینا چاہئے تھا۔ اور اگر ان کا جواب سمجھ میں نہیں آیا تھا تو اس کا بھی اعتراف کر لینا چاہئے تھا۔

یہی نہیں بلکہ ساری تحریر شرمناک خیانتوں سے پُر ہے، جان بوجھ کر ایسا کیا گیا ہے یا ان جانے، اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

سب سے بڑی خیانت اور غلط بیانی یہ ہے کہ مجیب صاحب فرماتے ہیں:

"پروفیسر صاحب نے ہماری پوری جماعت کو "غلط کار" اور "منافق" اور "یہود و نصاریٰ کے مشابہ" اور اس سے بڑھ کر "مشرک فی الرسالۃ" جیسے لقب سے نوازا ہے"۔ اس میں منافق، یہود و نصاریٰ کے مشابہ اور مشرک فی الرسالۃ

الفاظ کو واوین سے گھیرا گیا ہے۔ عام طور پر وہی الفاظ واوین کے درمیان دئے جاتے ہیں جو دوسرے کے ہوتے ہیں۔ عجیب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے ان کی جماعت کے متعلق یہ الفاظ لکھے اور وہ ان کو جوں کا توں نقل فرما رہے ہیں۔ جبھی تو انھوں نے ان کو واوین کے درمیان دیا ہے ——— حالانکہ یہ غلط ہے۔ میں نے یہ الفاظ استعمال ہی نہیں کئے۔ میں نے "منافق" "یہود و نصاریٰ کے مشابہ" اور "مشرک فی الرسالۃ" لکھا ہی نہیں۔ میرے قلم سے یہ الفاظ اس شکل و صورت میں نکلے ہی نہیں۔ میرا مقالہ اکتوبر کے نگار میں شایع ہوا ہے۔ میں مودودی جماعت کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ یہ الفاظ میری تحریر سے نکال کر دکھائیں۔ ...

....

....

....

....

بات یہ ہے کہ میں نے ایک امام کی مطلق اطاعت کی بابت لکھا تھا کہ یہ یہود و نصاریٰ کی طرح اتخاذ رب ہے اور ایک طرح سے شرک فی الرسالت بھی۔ گفتار و کردار کا اختلاف جہاں دکھایا گیا تھا وہاں یہ الفاظ تھے۔ "یہ ہے گفتار و کردار کا فرق جسے شاید مذہبی ادبیات میں منافقت کہا گیا ہے"۔ جو کچھ بھی کہا گیا تھا اصل مسئلہ سے متعلق تھا۔ اصول کی پرکھ کی گئی تھی اور اصول ہی کی بابت اظہار خیال کیا گیا تھا۔ ذات کے متعلق کچھ نہ تھا۔ جھوٹ کو جھوٹ سبھی کہتے ہیں۔ غلط بہر حال غلط ہی کہا جاتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر کوئی علمی بحث ہی کیوں کی جائے۔ مگر ایسا کوئی نہیں کرتا کہ جب اسکے اصول پر جرح کی جائے اور انھیں غلط بتایا جائے تو وہ روٹھ جائے۔ اور کہنے لگے بس صاحب آپ نے میرے اصول کو شرک بتایا تو میں مشرک ہوا۔ میری آپ کی بات چیت نہیں ہو سکتی۔ آپ مشرک ہوئے یا یہود و نصاریٰ کے مشابہ۔ آپ منافق ہوئے یا غلط کار، یہ تو آپ کہیں۔ میں نے تو آپ کے اصولوں پر محض جرح کی ہے۔

بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ جلیل احسن صاحب نے نجی طور پر ایک خط میں تعریض کی تھی۔ اور مجھے لکھا تھا "بری چیز یہ ہے کہ میں آپ کی "ذاتی" تحقیر کروں۔ اور آپ کو مثلاً یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دینے لگوں یا مشرک فی الرسالت کے لقب سے نوازوں"۔ اس کا جواب اسی وقت دیدیا گیا تھا کہ اصول کی بابت اظہار خیال کیا گیا ہے۔ کسی کی ذاتی تحقیر نہیں کی گئی ہے اسکے بعد ان کا ایک اور خط آیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرے اس جواب سے ان کا اطمینان ہو گیا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں "آپ کے پہلے مقالہ کا دیباچہ شرافت و متانت کی گفتگو کا آغاز تھا یا تیز و تند اشتعال انگیز فقروں کا سیلاب"۔ دیکھئے اس میں مشرک وغیرہ القاب کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہت اچھا ہم مانتے ہیں کہ آپ نے منافق وغیرہ القاب سے ہمیں نہیں نوازا مگر آپ نے سب سے پہلے مضمون میں "تیز و تند فقرے" کیوں استعمال فرمائے۔ یہ وہی شیر اور بکرے کے بچے والی کہاوت ہوئی کہ اچھا تو نے ہمارا پانی گندہ نہیں کیا لیکن سال بھر پہلے تو نے گالی کیوں دی تھی۔ جلیل صاحب بھول رہے ہیں

اول میں نے ایسے فقرے استعمال نہیں کئے جنھیں "تیز و تند" کہا جا سکے۔ اگر کئے ہیں تو وہ ان کی نشاں دہی فرمائیں دوسرے وہ فقرے بھی ذاتی نہیں بلکہ اُصولی ہی تھے۔ تحریک کی بابت میں نے اپنے اس شبہ کا اظہار کیا تھا کہ اسلام کے نام سے کوئی اور ہی کام لیا جا رہا ہے۔ اور اسے شبہ ہی کہا تھا۔ اس میں کون سی تیزی ہے۔ ایک بات یہ بھی کہ جب مودودی صاحب کو مضمون بھیجا گیا تو انھوں نے اس وقت تک کوئی جواب نہیں دیا جب تک ایک جوابی کارڈ سے یاد دہانی نہیں کرائی گئی۔ اخلاق کا یہ کچھ اچھا ثبوت نہ تھا۔ بیچارے نیاز پر لے دے کی جاتی ہے۔ اس کو بے دین بتایا جاتا ہے۔ مضمون نگار صاحب نے بھی اپنے ایک خط میں کچھ ایسی ہی بات کہی ہے۔ لیکن نیاز کے اخلاق اور اس کا عمل وہی ہے جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ زبان کا بے دین اور عمل کا مسلمان میرے نزدیک اس سے کہیں بہتر ہے جو عمل کا بے دین اور زبان کا مسلمان ہے۔ اسلام اسلام پکارنے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا جب تک اس کا عمل اسلام کے اُصولوں پر نہ ہو۔

اسلام کے اُصول آپ کے نزدیک مولوی کی عبا کی طرح ہیں۔ جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا اُتار پھینکا۔ انہی صاحب نے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا ہے: "مجھے خوشی ہوئی کہ آپ بورڈ کی امارت کو حدیث و سنت کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں اور اس سے زیادہ مسرت کی چیز یہ ہے کہ آپ نے یہ تنقیدی سلسلہ نگار میں شروع کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس محاذ سے دعوت کو کوئی خطرہ نہیں۔ جس محاذ سے دعوت کو کوئی خطرہ نہ ہو اس محاذ پر توجہ قطعاً لاحاصل ہے۔" اس کے بعد ارشاد ہوا ہے۔ "دعوت کے نقطۂ نظر سے ہمارے نزدیک جو حلقہ اہمیت رکھتا ہے وہ دینی حلقہ ہے۔ اور دینی حلقے میں بورڈ کی امارت کا بیج جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ اس کے علاوہ کسی "نامی" تحریک کو مقالہ بازی سے نہیں دبایا جا سکتا۔"

دیکھا آپ نے یہ ہیں ان حضرات کے خیالات اور یہ ہے ان کی حق دوستی۔ حضرت اکرم تو فرماتے ہیں: "حکمت ایک مسلمان کی گم شدہ چیز ہے۔ جہاں پاتا ہے اُٹھا لیتا ہے۔" اور "اسلامی جماعت" کے ارکان، یعنی مودودی صاحب اور ان کے ساتھی، سیاسی مصلحتوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ نگار بے دین پرچہ ہے اس لئے اگر اس میں کوئی دین کی بات شائع ہو تو نہ مانی جائے یا نہ مانی جائے گی۔ اور اگر دو چار مان بھی لیں تو اس سے ہماری 'نامی' تحریک کو کیا نقصان پہونچے گا۔ یہ انداز فکر سراسر جاہلانہ ہے۔ اس پر اسلامی طرز تصور کی کوئی جھلک ہی نہیں پڑی۔ اس کی بنیاد مصلحت پر ہے۔ عام طور پر بے دین جو جماعتیں بناتے ہیں سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے بناتے ہیں۔ جب ایک انبوہ ان کے ساتھ ہو جاتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ان کو بڑی طاقت حاصل ہو گئی۔ حق و ناحق اور راست و ناراست کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے۔ وہ حق کو حق پرستانہ نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ جماعتی مصلحت اور سیاسی چال کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ "اسلامی جماعت" کی حیثیت بھی یہی ہے۔ ایک حق بات اس لئے ان اصحاب کے نزدیک ناقابل التفات ہے کہ وہ ایک ایسے پرچے میں شائع ہوئی ہے جو بدنام ہے۔ اور بدنام بھی ان جیسے بندوں کا کیا ہوا ہے۔ لطف بالائے لطف یہ ہے کہ پہلے ہی سے ایک حلقہ

چُن لیا گیا ہے، جو ان حضرات کے نزدیک دینی حلقے کے نام سے موسوم ہے۔ اب یہ حضرات ہر اس چیز کو دین کہتے ہیں اور اسکی طرف توجہ فرماتے ہیں جو اس حلقے کی "دین چھاپ" ہے۔ "دینی حلقے میں یورڈ کی امارت کا بیج جڑ نہیں پکڑ سکتا"۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ "دین چھاپ" نہیں۔ اور اگر "بے دین حلقے" میں جڑ پکڑ جائے تو کیا نقصان ہے۔ اس حلقے کو تو دینی حلقے میں شامل کرنے کا آپ اور وہ ہی نہیں رکھتے۔

گر مسلمانی ہمیں ست کہ واعظ دارد
وائے گر در پس امروز بود فردائے

ایک طرف آپ فرماتے ہیں۔ "جس محاذ سے دعوت کو کوئی خطرہ نہ ہو اُس محاذ پر توجہ قطعاً لاحاصل ہے"۔ دوسری طرف آپ توجہ فرماتے ہیں اور خیانتوں کا ایک طومار باندھ کر نگار کو بھیج دیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ شاید یہی وہ طریقۂ بحث ہے جسے آپ نے "دماغی کشتی" کہا ہے۔ آپ محض اپنی دماغی صلاحیتوں کی جانچ کے لئے اس میدان میں اُترے ہیں۔ اس کے سوا آپ کے نزدیک اس کا کوئی حاصل نہیں۔ آپ نے جو تین خط مجھے لکھے کیا وہ بھی "دماغی کشتی" ہی کے داؤ پیچ تھے۔ اگر آپ اپنے خط میں اس کا اظہار فرما دیتے تو میں ان کی طرف توجہ ہی نہ دیتا۔ دراصل میں آپ سے "کشتی" لڑنا نہیں چاہتا میرے عزیز دوستوں اور شاگردوں کا بحمداللہ ایک بڑا حلقہ ہے۔ (بدقسمتی سے چند روز کے لئے آپ بھی اس میں شامل رہ چکے ہیں) وہ آپ سے نبٹنے کے لئے کافی ہے۔

دوسری خیانت اس سے بھی زیادہ پر لطف ہے۔ میں نے اپنے پہلے مقالے میں (نگار مئی ۶۲ء) لکھا تھا۔ "مسلمانوں میں سے ایک جماعت کا خیال ہے، جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے، کہ امیر کی ضرورت اور اس کا انتخاب کسی نص شرعی سے ثابت نہیں۔ اور اس حیثیت سے وہ کوئی اسلامی چیز نہیں۔ اس کی ضرورت محض امر عقلی ہے۔ امیر کا انتخاب اس لئے کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی اور اجتماع انسانی میں نظم قایم رکھا جا سکے۔ ابن خلدون نے ان حضرات کی اس عقلی دلیل پر جرح کرتے ہوئے لکھا ہے:" کہ ان کا یہ عقلی استدلال جس سے وہ امارت کی ضرورت ثابت کرنا چاہتے ہیں بہت ہی لچر اور پوچ ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ نصب امام کا وجوب عقلی نہیں بلکہ شرعی ہے۔ اور وہ ہے صحابہ کا اجماع اور انکا اتفاق" اس کے بعد میں نے ابن خلدون کے اس استدلال کے متعلق اسی مضمون میں لکھا تھا:۔ "اہل ہوش جانتے ہیں کہ ابن خلدون کے اس استدلال کی حیثیت کیا ہے۔ مسلمانوں کے اس گروہ کا مطلب جو ضرورت امامت کو عقلی بتاتے ہیں یہ ہے کہ اصحاب رسول نے جو انتخاب کیا وہ کسی شرعی نص قطعی پر مبنی نہ تھا۔ انھوں نے اپنی رائے اور قیاس سے امام کی ضرورت سمجھتے ہوئے اس کا انتخاب فرمایا۔ اب اگر ابن خلدون جیسے منطقی اور فلسفی اس عقلی ضرورت کا تار و پود بکھیرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ حضرات صحابہ نے ضرور ہی کسی شرعی حکم پر تکیہ کرتے ہوئے یہ انتخاب فرمایا تھا"

ابن خلدون کا استدلال اور اس کے متعلق پوری بحث اولین مضمون ہی میں دیدی گئی تھی۔ بحث کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو اس میں نہ آگیا ہو۔ مگر اس بد دیانتی کا بُرا ہو کر "مودودی اکھاڑے کے یہ پہلوان" فرماتے ہیں: "پروفیسر صاحب نے ابن خلدون

کی ایک طویل بحث میں سے صرف ایک عبارت اپنے مدعا کے موافق پاکر لے لی ہے ۔ باقی ساری بحث کا ذکر تک نہیں کیا"۔ پھر یہ داؤ چلتے ہیں کہ "یہ پوری عبارت مغالطہ دہی کا ایک عجیب نمونہ ہے" بتائیے میں اس حرکت کو کیا کہوں مغالطہ دہی سے کوئی اونچا لفظ ہونا چاہئیے ۔

ابن خلدون ایک مورخ ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ حضور اکرم کے بعد صحابہ کرام نے جو حضرت ابوبکر کو خلیفہ منتخب فرمایا وہ اس لئے نہ تھا کہ قرآن میں ہے یا حضرت نے اس کا امر فرمایا ہے ۔ بلکہ خود صحابہ نے اپنی عقل سے یہ سمجھ کر انتخاب کیا تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مسلمانوں میں نظم و ضبط قایم نہ رکھا جاسکے گا ۔ رہا یہ کہ ابن خلدون اس کی بابت کیا رائے رکھتے ہیں سو اس سے کوئی بحث نہ تھی ۔ اس نقل عبارت کا منشا صرف اس قدر تھا کہ تنہا میں ہی نہیں بلکہ اور اہل علم بھی ہیں جو حضرات صحابہ کے اولین انتخاب کو ایک عقلی بات بتاتے ہیں ۔ اس کے بعد اہل نظر بتائیں کہ اُس جرح و بحث کے نقل کرنے کی ضرورت کیا ہے جو ابن خلدون نے ان حضرات کی اس رائے پر کی ہے ۔ بالفرض میں اس بحث کو نقل بھی کرتا تو بھی مجھے مغالطہ دہی کا الزام نہیں دیا جاسکتا تھا ۔ اب ذرا اس خیانت کی عظمت اس روشنی میں ملاحظہ کیجئے ۔

(۱) اول اس جرح و تفصیل کی ضرورت نہ تھی جو ابن خلدون نے ان حضرات کی اس رائے پر کی ہے ۔ اس لئے کہ ابن خلدون کا مسلک نہیں بتایا گیا تھا بلکہ ان کی روایت نقل کی گئی تھی ۔

(۲) اور اگر ضرورت تھی تو وہ تفصیل بھی ابتدائی اور اولین مضمون میں دیدی گئی تھی ۔ اور ضروری نہیں کہ ہر بار اس تفصیل کو دہرایا جائے ۔

تیسری خیانت ملاحظہ ہو: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا تھا (ملاحظہ ہو نگار مئی صفحہ ۲۹ سطر ۱۳) وہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ابوبکر کا انتخاب کسی قدر عجلت میں ہوا ۔ اسی کو میں نے اکتوبر والے مقالے میں دہرایا ۔ اس پر جلیل صاحب نے کیسا نازیبا ریمارک دیا ہے ۔ "یہ واقعہ کی نہایت غلط تصویر پیش کی گئی ہے" اللہ رے بے باکی ! یہ غلط تصویر کس نے پیش کی ؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۔ ملاحظہ فرمائیے بخاری ہی کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا :۔ "خبردار ہو بے شک حضرت ابوبکر کا انتخاب ایک فوری کارروائی تھی جس میں فکر و تدبر کو دخل نہ تھا (فلتۃ) مگر اللہ نے اسکے شر سے ہمیں محفوظ رکھا" اب اسے یا تو خیانت کہئے یا بے خبری کہ حضرت عمرؓ کے قول کو پہلے میری طرف منسوب کیا گیا پھر بڑی بے شرمی کے ساتھ اس کے متعلق کہدیا گیا کہ "یہ واقعہ کی غلط تصویر ہے" ۔ "دماغی کشتی" کا ایک اور داؤ بھی چلا گیا ہے ۔ ایک روایت میں "بیعۃ عامۃ" کا لفظ آ گیا تھا ۔ جھٹ اس سے عمومی بیعت پر استدلال کر لیا گیا ۔ حالانکہ علامہ بدرالدین عینی نے اپنی شرح میں ان الفاظ کے جو معنے لئے ہیں وہ یہ ہیں کہ پہلی بیعت میں جتنے آدمی تھے اس سے کچھ زیادہ اس بیعت میں تھے ۔ وہ

۱ھ بخاری شریف مطبع احمدی میرٹھ صفحہ ۱۰۰۹ ۔۔۔ سلہ عمدۃ القاری شرح بخاری جلد ۱۱ صفحہ ۳۳۴

عمومی بیعت نہ تھی - آپ تو بہرہات شرح سے سمجھتے ہیں - یہ بات بغیر شرح کے آپ کیسے سمجھ گئے۔

چوتھی خیانت اور شرمناک خیانت یہ ہے کہ میں نے لکھا تھا یہ جو کہا جا رہا ہے کہ امیر کا انتخاب شرعاً ضروری ہے اور اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہو چکا ہے یہ غلط ہے - خوارج ' معتزلہ میں سے حاتم اصم اور دوسرے لوگ اس کو ضروری نہیں سمجھتے - یہ بھی تو بہر حال مسلمان ہیں اور اہل علم و دیانتدار بھی - مئی والے مضمون میں میرے الفاظ یہ تھے "اسکے علاوہ معتزلہ، خوارج اور بعض دوسرے فرقوں اور جماعتوں کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ نصب امام کو سرے سے واجب یا ضروری ہی نہیں سمجھتے تھے - نہ شرعاً اور نہ عقلاً (نگار - مئی صفحہ ۲۹) اس کے بعد یہی بات اکتوبر والے مضمون میں دہرائی گئی تو ان الفاظ میں - "حضرت علی کے عہد ہی میں نیک دل مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو امیر کے انتخاب کو شرعاً ضروری نہیں سمجھتی تھی" دونوں عبارتیں صاف ہیں - مطلب یہ ہے کہ خوارج اور بعض دوسرے مسلمان بھی کم سے کم یہ بات مانتے ہیں کہ کسی ایک شخص کو امیر چننا شریعت میں ضروری نہیں - اس پر جلیل احسن صاحب نے تبصرہ کیا ہے - "قارئین کو اچھی طرح معلوم ہے کہ پروفیسر صاحب بورڈ کی امارت کے قایل ہیں - لیکن کیا خوارج بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں" اس کے بعد پھر ارشاد ہوا ہے "بہر حال خوارج کے تینوں گروہوں میں سے کوئی گروہ بھی بورڈ کی امارت کا قایل نہیں ہے"

میں نے اپنے الفاظ اوپر لکھدئے ہیں - ان میں کہیں یہ نہیں کہ خوارج بورڈ کی امارت کے قایل ہیں - میں نے تو اکتوبر والے مضمون میں بھی یہی کہا ہے کہ خوارج امیر کے انتخاب کو ضروری نہیں سمجھتے - اور یہ بھی اس لئے نہیں کہا کہ میں ان کے قول سے استدلال کرنا چاہتا ہوں - بلکہ منشایہ ہے کہ مودودی جماعت کے لوگ جو کہہ رہے ہیں کہ امیر کا انتخاب تمام مسلمانوں کے نزدیک ضروری ہے اس کا رد کیا جائے - اور بتایا جائے کہ اب نہیں بلکہ اس سے پہلے حضرت علی کے عہد ہی میں مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ اس انتخاب کی ضرورت کا قایل نہ تھا - اور اُسے مودودی صاحب کی طرح اسلام کا کوئی اصول نہ سمجھتا تھا - جلیل احسن صاحب نے اس تبصرہ کی تان ان الفاظ پر توڑی ہے -

"خوارج کے پہلے گروہ کی رائے نقل کرکے یہ مغالطہ دینا کہ جب وہ امام کے تقرر کو ضروری نہیں سمجھتے تو ضرور ہے کہ وہ بورڈ کو امام بناتے ہوں گے مغالطے کی وہ عجیب قسم ہے جو مناظرہ ہی کو زیب دیتی ہے"

یہ مغالطہ کس نے دیا؟ کس نے یہ لکھا - "جب وہ امام کے تقرر کو ضروری نہیں سمجھتے تو ضرور ہے وہ بورڈ کو امام بناتے ہوں گے" یہ سب کہاں سے نقل کیا جا رہا ہے؟ یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ کیا مودودی صاحب نے آپ حضرات کو غلط بیانی ہی کی تعلیم دی ہے' دماغی کشتی کے یہ داؤ پیچ آپ نے کیا اسی تربیت گاہ میں حاصل کئے ہیں؟

اس بحث میں کچھ علمی باتیں .... بھی آگئی ہیں اور چونکہ حضرات اس میدان کے مرد نہیں اسلئے ان سے اس سلسلہ میں ایسی ایسی فاحش غلطیاں ہوئی ہیں کہ بے ساختہ ہنسی آتی ہے - مثلاً میں نے مبرد کی بابت لکھا تھا کہ انھوں نے عکرمہ کو خارجی جماعت کا ایک فرد بتایا ہے -

اس پر بلبل احسن صاحب نے کیا مزے کی بات کہی ہے۔ "مبرد نے عکرمہ کو خوارج کی جماعت کا فرد کہاں بتایا ہے مبرد نے تو صرف یہ کہا ہے کہ اس رائے کی نسبت عکرمہ کی طرف بھی کی جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک ینسبون الیہ اور ینسبون الیہم میں کوئی فرق نہیں۔ اگر مبرد کو وہ بات کہنی ہوتی جو پروفیسر نے کہی ہے تو الیہ کی بجائے الیہم وہ نہ کہ سکتے تھے"۔ اس عبارت میں کئی باتیں شاہکار ہیں جن کی توقع ان بھولے بھالے لوگوں ہی سے ہو سکتی ہے جو درحقیقت جنتی ہیں یا اپنے تئیں جنت کا استحقاق ثابت کرنے کے لئے زبردستی اس حدیث پر عمل کرتے ہیں اہل الجنۃ بلہ (جنت والے بھولے ہوتے ہیں) مبرد کی پوری عبارت یہ ہے: "روایت کیا جاتا ہے کہ منذر بن جارود خوارج کی رائے رکھتے تھے اور یزید بن مسلم جو حجاج بن یوسف کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے وہ بھی خوارج ہی کے ہم رائے تھے۔ اور صالح بن جارود بھی جو عراق کے صاحب دیوان تھے، یہی رائے رکھتے تھے۔ اور فقہاء کا ایک گروہ اس رائے کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عباس کے مولیٰ عکرمہ بھی ہیں۔ اور یہی بات مالک بن انس کے بارے میں بھی کہی جاتی تھی"۔ میں نے مبرد کی عبارت کا لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔ مبرد عربی زبان کا مشہور ادیب ہے۔ وہ اس زبان کے اسالیب بیان سے بخوبی واقف ہے۔ اس کے یہ الفاظ کہ جن فقہاء کی نسبت اس رائے (خوارج کی) کی طرف کی جا رہی ہے ان میں سے عکرمہ بھی ہیں، صاف صاف بتا رہے ہیں کہ عکرمہ کو بھی اکثر اہل علم نے خارجی کہا ہے۔ جو عربی زبان کے اسالیب بیان سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ بامحاورہ اور اچھی عربی میں یہ مفہوم ادا کرنے کے لئے کہ عکرمہ اور دوسرے فقہاء کرام کو بھی خارجی کہا گیا ہے یہ الفاظ ہیں۔ "ان حضرات کی نسبت خوارج کی رائے کی طرف کی گئی ہے"۔ "پروفیسر صاحب" کے نزدیک ینسبون الیہ اور ینسبون الیہم میں فرق ہے اور وہ یہ کہ ینسبون الیہ صحیح عربی ہے اور ینسبون الیہم غلط۔ خصوصیت کے ساتھ اس ترکیب میں جہاں یہ جملہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی جہاں دوسروں کی بابت بھی ان کی خارجیت دکھانے کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ "خوارج کی رائے رکھتے تھے"۔ اس "دماغی کشتی گیر" سے بعید نہیں کہ وہ "فلاں یری رأی الخوارج" (فلاں خوارج کی رائے رکھتا ہے) اور "فلاں خارجی او من الخوارج" (فلاں خارجی ہے یا خوارج میں سے ہے) بیان کے ان دو طریقوں میں بھی فرق کرنے لگے اور کہنے لگے "اگر مبرد کو وہ بات کہنی ہوتی جو پروفیسر صاحب نے کہی ہے تو "یری رای الخوارج" کی بجائے وہ "من الخوارج" نہ کہہ سکتے تھے"۔ مبرد نے جہاں کہیں کسی عالم کی خارجیت کا ذکر کیا ہے تو اسی اسلوب اور انہی الفاظ میں "فلاں شخص خوارج کی رائے رکھتا ہے"۔ ملاحظہ فرمائیے صفحات ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۷۲ وغیرہ۔ اس لئے بلاغت اسلوب کا تقاضا ہے کہ جب یہ بات وہ دوسروں کی طرف سے کہے تو یوں کہے "دوسرے اس شخص کو اس رائے کی طرف منسوب کرتے ہیں یا وہ اس رائے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے" (ینسب الیہ جس کی جمع ینسبون الیہ ہے)۔ مجھے زبان و بیان کے یہ اسالیب سمجھانے میں ہندی کی چندی کرنا پڑ رہی ہے۔ قارئین نگار معاف فرمائیں خطاب خصوصیت کے ساتھ مودودی جماعت سے ہے اس لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔

(باقی) شوکت سبزواری

مجنوںؔ گورکھپوری — ایک مطالعہ

(۱)

"ہر انسان اپنے اندر ایک بتکدہ رکھتا ہے جو اُس کا اپنا تعمیر کیا ہوا ہوتا ہے، اور ہر شخص کے کچھ بُت ہوتے ہیں جو اُس کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ یہ وہی بت ہیں جن کو شاعر "اصنام خیالی" کہتا ہے اور جو پتھر کی مورتوں سے بھی زیادہ سنگین ہوتے ہیں۔ کسی کو اس کی فرصت اور توفیق ہوتی ہے کہ وہ اپنے بتوں کو یکساں جوش اور انہماک سے پوجتا رہے اور کوئی زندگی کی کثافتوں میں اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ اس کو اپنے بتکدہ کا ہوش بھی باقی نہیں رہتا" —— اور ہمارے ادب میں مجنوںؔ کا شمار بھی اُن ادیبوں میں سے ہے جو ایک خیالی بتکدہ رکھتے ہیں، جو اپنے بتوں کو، جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، جوش و انہماک سے پوجتے رہے ہیں اور جن کے بطون میں زندگی کی مکروہات اور اس جذبۂ پرستش کے درمیان ہر وقت ایک پیکار اور کشاکش جاری رہی ہے۔ مجنوںؔ کو ہمارے ادب کی اُن مقدس ہستیوں میں جگہ ملی ہے جن کا شعر و ادب "اُن کی شکست کی آواز" ہے۔

افسوس ہے کہ اُن کی واقعاتی زندگی کے حالات سے ہم پوری طرح واقف نہیں ہیں تاہم اتنا ضرور اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجنوںؔ ابتدا ہی سے ایک ادبی خروش رکھتے تھے۔ اُن کے اندر اُردو اور فارسی ادبیات سے ہمیشہ سے ایک گہری دلچسپی پائی گئی اور اُنھوں نے فارسی شعراء اور اُردو غزلگویوں کا کلام شعور کی گہرائیوں کے ساتھ مطالعہ کیا۔ مشرقی ادبیات کے علاوہ اُن کو مغربی ادبیات سے بھی گہرا لگاؤ رہا ہے۔ اُنھوں نے انگلستان، فرانس اور اُس کے اکثر ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کو غور سے پڑھا ہے اور اُن سے متاثر ہوئے ہیں۔ ابتدا ہی سے چونکہ اُن کا میلان فکر و تامل کی طرف زیادہ ہے اس لئے اُنھوں نے باقاعدگی سے مشرقی فلسفہ اور تصوف کے ساتھ مغربی حکیموں اور مفکروں کو بھی غور و فکر کے ساتھ پڑھا اور سمجھا ہے۔ مطالعہ ان کی زندگی کی ساعتوں کا بہترین مشغلہ ہے اور جیسا کہ خود اُن کا اندازہ ہے بہت کم مسائل و مباحث ایسے ہوں گے جن کا اُنھوں نے کم از کم کتابی مطالعہ نہ کیا ہو، اور دُنیا کے بہت کم مصنف ایسے ہوں گے جن سے اُنھوں نے کچھ نہ کچھ بصیرت نہ حاصل کی ہو۔ شعر و ادب کی انھیں دلچسپیوں نے اُن کو "نیاز اسکول" سے ملحق کر دیا اور غالباً سب سے پہلے اُن کی تحریریں اُردو کے مشہور ادبی رسالہ "نگار" میں شایع ہو کر اپنی اصلی ہیئت میں ملک تک پہونچیں، خود ایک بار اُنھوں نے "ایوان" کی ادارت کا ذمہ اُٹھایا تھا لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اقتصادی اور اسی نوع کی دیگر دشواریوں کے سامنے آجانے سے وہ رسالہ زیادہ مدت تک زندہ نہ رہ سکا۔ غالباً اپنے ادبیاتی ذوق کی آسودگی کے پیش نظر اُنھوں نے پروفیسری کا پیشہ اختیار کیا اور ہنوز درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے

چونکہ مجنوں صاحب اپنی باطنی کیفیات میں زیادہ کھوئے رہے اس لئے اپنی صحت کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ پھر یوں بھی فطرت کا اقتضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اس قسم کا دماغ، تخئیل اور وجدان عطا ہوا ہے وہ گویا اس سزا میں جسمانی حیثیت سے ضعیف اور کمزور ہوتے ہیں غرض خود ان کی اس خود فراموشی اور بے اعتنائی اور قضا و قدر کی اس "عجیب" روش کا نتیجہ نہایت ماتم خیز ہوا — اور وہ یہ کہ ان کی صحت جو غالباً کسی وقت بھی بہت اچھی نہیں رہی، اب اس نقطے پر پہونچ گئی ہے کہ وہ خود بھی اس کی طرف سے غیر مطمئن اور فکر مند رہتے ہیں۔

مجنوں کی ادبی زندگی کی عمر اب تقریباً چھبیس سال ہوتی ہے۔ اگرچہ ابتداء میں وہ شاعری کی طرف مائل ہوئے تھے لیکن بہت جلد اُن کو اس کا شدید احساس ہوگیا کہ وہ شاعری میں اپنے افکار و میلانات، جیسا کچھ کہ وہ چاہتے ہیں پورا نہ کرسکیں گے۔ اُن کے خیالات ربط و تسلسل اور شرح و تفصیل کے محتاج تھے اور اس لئے شاعری کے روایتی تعینات میں رہ کر ان کا اظہار ناممکن حد تک دشوار ہوگیا تھا۔ میں اس کو مجنوں کی ہوش مندی خیال کروں گا کہ اُنھوں نے اپنے خیالات و جذبات کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کے ساتھ بھی عدل کا سلوک روا رکھا ورنہ دوسری حالت میں یقیناً وہ دونوں کے ساتھ ظلم کرتے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ نثر کی طرف لوگ مقابلۃً کم اعتناء کر رہے تھے، اُنھوں نے نثر نگاری کی طرف توجہ کی۔ لیکن "ایوان اُردو" میں "مجنوں گورکھپوری" ہی کے نام سے داخل ہونا چاہتے ہیں اور نثر بھی، اسی نام سے لکھتے رہے ہیں۔ اس میں ایک نفسیاتی اشارہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کا دھارا نثر کی طرف مُڑ گیا اور اب تک اُن میں وہ شرارِ آرزو پنہاں ہے جس کی تپش اُن کے ہر افسانے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم "مجنوں گورکھپوری" سے متعارف ہیں لیکن "احمد صدیق" کو کوئی نہیں جانتا۔ جیسا کہ میں پہلے ظاہر کرچکا ہوں اُن کو فکر و تامل کی طرف ایک فطری میلان تھا، اس لئے ۱۹۲۵ء سے پہلے وہ جو کچھ لکھتے رہے، اُس کا تعلق زیادہ تر فلسفیانہ مسائل و مباحث سے تھا۔ لیکن اس دور میں "افسانہ" آہستہ آہستہ ادب میں اپنا اثر اور رسوخ بڑھاتا جاتا تھا اور ملک کے چند اہلِ بصیرت ادیب اس صنف کی طرف خاص ذوق کا اظہار کر رہے تھے۔ اِدھر پریم چند اس کی نشو و ارتقاء میں مصروف تھے کہ نیاز کے ہمراہ چند دوسرے اہلِ قلم حضرات نے افسانے پر توجہ کی اور مجنوں بھی افسانے لکھنے لگے۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر تک اُنھوں نے بھی زیادہ تر افسانے لکھے۔ لیکن ۱۹۳۲ء کے بعد، جو اُن کی شاہراہِ حیات پر ایک سنگِ میل یا نشانِ راہ کا حکم رکھتا ہے، اُن کی نجی زندگی میں چند ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ اُن کو اپنے ادب کی لَے دھیمی کرنی پڑی، اس طرح اُن کی ادبی مصروفیتوں کو ذرا دم لینے کی مہلت نصیب ہوئی اور اس عبوری دور میں ایک مرتبہ پھر اُنھیں اپنی ادبی زندگی اور اُردو ادبیات کی زندگی اور اس کے حال و استقبال پر نگاہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ افسانے ہر طرف اقلیمِ سخن پر چھائے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے ایک بار پھر رفتارِ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا اور محسوس کیا کہ اب اگر ہمارے ادیبوں کے قلم مہر و وفا کی حکایتیں چھوڑ کر زیادہ سنجیدہ مضامین کی طرف توجہ کریں، تو اُردو میں سنجیدہ ذوق

کے مضامین کی کمی باقی نہ رہے گی، اس ضرورت اور احساس کی شدتوں کو محسوس کرتے ہوئے، انھوں نے اپنے قلم کی رفتار ادبی تنقید کی طرف موڑ دی اور آج تک اپنی ناقدانہ بصیرتوں سے اُردو تنقید کو وسعت اور معنویت دے رہے ہیں۔

مجموعی طور پر مجنوں کی ادبی زندگی کو دو عنوانات اور دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے — افسانہ نگاری اور تنقید لیکن یہاں تنقید کی اصطلاح کو اُس کے وسیع ترین معنوں میں سمجھنا چاہئیے ورنہ "شوپنہار" اور "تاریخ جمالیات" جیسی کتابیں اور "برگساں کا فلسفۂ حدوث"۔ "فلسفۂ یونان" اور "خواب و تعبیر خواب" جیسے مقالات کو کس عنوان کے تحت جگہ دی جائے گی؟ زیرِ نظر مقالے میں ہم مجنوں کے دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن چونکہ ہمارے ادبی رسائل عموماً زیادہ ضخیم اور بسیط مقالوں کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے اقتباسات و تشریحات کو چھوڑ کر صرف تنقیدی اشاروں پر اکتفا کرنی ہوگی۔ مجنوں پر لکھنے کا حوصلہ میرے دل میں ہے، وہ اُس مقالہ کو لکھ کر کسی طرح آسودہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس مقالے کو میں اپنی اس تفصیلی انتقادی بحث سے پہلے دیباچے یا پیش لفظ کی صورت میں پیش کر رہا ہوں جو انشاء اللہ کبھی آیندہ چل کر لکھوں گا — جبکہ فکر و وجدان زیادہ پختہ اور مہلت و فراغت زیادہ وافر ہوگی۔

مجنوں کے افسانوں پر انتقادی روشنی ڈالنے سے پہلے ہم کو اجمالی طور پر یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ مجنوں افسانے کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، اور افسانے کا مقصد اور اُس کی غایت اُن کی نظر میں کیا ہے؟ اس ذیل میں اُن کی مختصر کتاب "افسانہ" ایک ادبی نقاد کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک دوسری جگہ وہ افسانے کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میرے خیال میں فسانے کی اصل و غایت وہی ہے جو تمام فنونِ لطیفہ کی ہے یعنی حقیقت کو مجاز کے پردے میں اس طرح پیش کرنا کہ دُنیا حقیقت کو پا سکے اور اس کی متحمل ہو سکے۔ فسانہ نام ہے حقیقت کی تلاش کا اور شاعری اور تصوف کی طرح فسانہ کی اصلیت بھی وہی ہے جو بہتر فرقوں کی جنگ کی ہے یعنی:- "چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند"

..... غرضکہ فسانہ کو زندگی کے حقایق سے ازلی تعلق ہے اور وہ ان سے انحراف نہیں کر سکتا، یہ سچ ہے کہ فسانے کا کام کُھلم کُھلا تلقین و تبلیغ نہیں ہے مگر پھر بھی فسانہ نگار کا فرض ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے اندر نئی بصیرتیں پیدا کرے اور حقایق کے پوشیدہ پہلوؤں پر روشنی ڈالے".... "مجھے ہر حقیقت میں ایک افسانوی میلان یا تخئیلی امکان نظر آتا ہے اور میں افسانے کو حقیقت کی ہیئت کو بدل کر تخئیل سے قریب تر کر دیتا ہے، حقیقت ہمیشہ تلخ اور ناگوار ہوتی ہے، افسانہ اُس کو خوشگوار بنا دیتا ہے، افسانہ تخئیل کا دوسرا نام ہے"۔

ان اقتباسات سے مجنوں کے افسانوی نظریات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مجنوں کے تمام افسانوی ادب کا پس منظر رومانیت لئے ہوئے ہے اور اُن کے تمام افسانوں کو پڑھ کر اگر کوئی شخص اُن کا مرکزی خیال یا [illegible] معلوم کرنے کی کوشش کرے تو وہ کاروبارِ دلداری و دلفروشی کے علاوہ غالباً کچھ اور نہ ہوگا۔ کارگاہِ حُسن و محبت کی پیہم کشاکش اور اُس کی ناکامیاں — یہ ہے وہ محور جس کے گرد مجنوں کے اچھے افسانے گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سے میرا

مدعا یہ نہیں ہے کہ اس مہر و محبت کی حکایت کے علاوہ اُن کے یہاں اور کچھ نہیں ——— گو میرے نزدیک اگر اُنکا سرمایہ اس کے علاوہ کچھ اور نہ ہوتا، تو بھی وہ ہمارے ادب اور ہمارے افسانے کی تاریخ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے — لیکن اُن کے یہاں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے کبھی بیگانگی نہیں پائی جاتی، وہ زندگی کی تلخیوں کو اپنے افسانوں میں پوری طرح جگہ دیتے ہیں لیکن اُن کی واقعیت، اشتراکی واقعیت (Socialistic Realism) کی قسم کی کوئی چیز نہیں، بلکہ اُس کو رومانی واقعیت (Romantic Realism) کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت اور رومانیت، واقعیت اور تخئیلیت — یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ جب تک ہمارے ادیب اور شاعر ان دونوں کو نہایت مکمل حسنِ امتزاج کے ساتھ استعمال کرنے کے قابل نہ ہوں گے، ان کے تمام شعر و ادب میں ایک بدسلیقگی اور بھونڈا پن نمایاں رہے گا۔ میرے نزدیک ہر ادب کا مقصد زندگی کو اس کے اصلی خط و خال میں پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کو ——— جو اصولاً تلخ اور مکروہ ہے — زیادہ خوشگوار بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ ادب زندگی کی نقل یا mimicry نہیں کرتا ——— وہ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس وقت مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے جس کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا۔ ایک ادبی صحبت میں میرے احباب میں سے ایک صاحب نے کسی ہندوستانی فارسی شاعر کا یہ شعر پڑھا،

سیہ چوری بدست آں نگارِ نازنیں دیدم
بہ شاخِ صندلی پیچیدہ مارِ عنبریں دیدم

یہ شعر اس ہندی شاعر نے علامہ شیخ علی حزیں کے سامنے پڑھا تھا۔ میرے دوست نے یہ بھی کہا کہ یہ شعر سُنکر حزیں کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی، گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس شخص کو بحر کا انتخاب بھی نہ کرنا آتا ہو، بھلا وہ شعر کیوں کہے اور کیوں اپنی اور شاعری کی رسوائی کرے! حزیں نے کہا، شعر یوں پڑھئے،

سیہ چوری بدستِ آں نگارے
بہ شاخِ صندلی پیچیدہ مارے

جو لوگ اس محفل میں شامل تھے سب نے حزیں کی اصلاح کی بے ساختہ داد دی، کیونکہ واقعی اس اصلاح نے شعر میں زیادہ رقص اور نغمگی پیدا کر دی تھی۔ میں نے کہا "مجھے اس اصلاح میں ایک خوبی اور بھی نظر آتی ہے، اور وہ یہ کہ حزیں نے واقعے کو تخئیلیت بخشدی، اور چونکہ تخئیل، واقعہ سے زیادہ خوشگوار اور زیادہ کیفیت کا حامل ہوتا ہے اس لئے اب شعر میں تشبیہ کی شگفتگی اور دوشیزگی کے علاوہ ایک تخئیلی ابہام (Imagination vagueness) پیدا ہو گئی جس نے شعر کو زمین سے آسمان پر پہونچا دیا ——— اس واقعہ کے نقل کرنے سے میرا مقصود یہ تھا کہ واقعیت کو اگر ذرا تخئیلیت کا رنگ دیدیا جائے تو واقعہ چمک اُٹھتا ہے، مجنوں کے یہاں واقعیت اور تخئیلیت کا کافی حد تک ایک دلکش آہنگ ملتا ہے۔ مجنوں کے افسانے ہر حال میں افسانے ہوتے ہیں، اُن میں ہر جگہ "افسانویت" ہوتی ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ خواہ وہ زندگی پر تنقید ہوں

یا زندگی کی عکاسی کرتے ہوں، خواہ اُن میں ماحول کی ظالمانہ راہ و رسم سے بحث ہو، خواہ انسانی کردار کے باطنی تہوں پر سے پردے اُٹھائے گئے ہوں، ہر حالت میں اُن میں افسانے کا رنگ باقی رہتا ہے اور پڑھنے والا صاف یہ محسوس کرتا ہے کہ فسانہ نگار کو اس بات کا خیال ہے کہ وہ کوئی پمفلٹ نہیں لکھ رہا بلکہ ادب کی تخلیق کر رہا ہے۔

مجنوں کے افسانے رومانی مدرسہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تعداد ان افسانوں کی ہے جن میں محبت کی نبض کسی نہ کسی صورت سے رواں ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے افسانوں میں فکر و تامل کا جو میلان ملتا ہے وہ اُن کی تمام افسانوی فضا پر غالب اور مستولی ہوتا ہے۔ اس طرح اُن کے افسانوں میں ایک "ماورائیت" کا عنصر پیدا ہو گیا ہے جو در اصل "تخئیلیت" ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگرچہ ماورائی عنصر کے بہترین مظاہر ان کے وہ افسانے ہیں جو "سمن پوش" کے مجموعے میں شامل ہیں، لیکن ان سے قطع نظر کر لیجئے تو بھی ایک معنویت اور گہری فکر ان کے افسانوں میں ہر جگہ چھائی ہوئی ملے گی۔ مجنوں کے فلسفۂ حیات کو سمجھنے سے پہلے اُن ہستیوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جن کی صحبت میں رہ کر مجنوں کا فکر و وجدان رفتہ رفتہ جوان ہوا ہے۔ وہ فارسی غزل گو شعراء میں سعدی اور نظیری، حافظ و خیام، بیدل اور رومی اور دیگر متقدمین سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں بھی اُن کا رجحان زیادہ تر غزل کے اس دورِ اولین کی طرف زیادہ پایا جاتا ہے جب جذبات میں ایک خاص نرمی و فتادگی، اور زبان میں ایک مخصوص سادگی اور سکون پایا جاتا تھا۔ انگریزی اور مغربی ادیبوں میں وہ غالباً ہارڈی، سوئفٹ، کیٹس، موپاساں، چیخوف، ترگنیف اور آسکر وائلڈ کے علاوہ مغربی مفکروں میں شوپنہار، برگساں، مارکس، فرائڈ اور فلسفۂ یونان و فلسفۂ اشتراکیت سے اثر پذیر نظر آتے ہیں۔ لیکن جس ہستی کا اثر وسیع اور مستقل طور پر مجنوں کو متاثر کرتا ہوا نظر آتا ہے وہ ٹامس ہارڈی ہیں۔ جہاں تک میری غور و فکر نے میرا ساتھ دیا ہے، میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ مجنوں کا تعلق اپیکورس کے مدرسۂ فکر (Epicurian School of Thought) سے ہے اور اُنکے خطوطِ فکر مشہور لاطینی فلسفی لوکریشس (Lucretius) کے خطوطِ فکر سے متوازی معلوم ہوتے ہیں --- اکثر لوگ Lucretius کا نام سنکر چونکیں گے کیونکہ ان کے ذہن میں اپیکورس کا فلسفہ لذتیت اور تعیش کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اکثر خیالات کی طرح یہ خیال بھی جس قدر عام ہے اُسی قدر غلط بھی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعد میں اپیکورس کے مدرسۂ فکر کے اکثر لوگوں نے اسی قسم کی غلط اندیشیوں کو عام کیا، لیکن اپیکورس کے فلسفہ اور خالص لذتیت اور تعیش کو مترادف سمجھنا ایسا خیال ہے کہ اگر خود اپیکورس کو کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ آنے والی نسلیں اُس کے فلسفہ کے متعلق ایسا سوچیں گی تو غالباً وہ خود کشی کر لیتا۔ اپیکورس کے نزدیک مسرت نام ہے درد اور تکلیف کی عدم موجودگی کا۔ وہ لذتیت چاہتا ہے لیکن اس کا مقصود "لذتیت" سے انفرادی تعیش نہیں ہوتا بلکہ وہ کامل دماغی سکون اور روحانی طمانیت کا --- جس کو Ataraxia کہتے ہیں۔ متجسس تھا اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے سکون کے لئے حسنِ عمل کس قدر لازم اور ناگزیر چیز ہے۔ آگے چل کر لوکریشس (Lucretius) اپنی مشہور تصنیف De Rerum Natura میں بیان کرتا ہے کہ

قضا و قدر ایسی قوتیں ہیں جو بنی نوع انسان سے غافل ہیں اور اُن کی طرف کوئی اعتنا نہیں کرتیں وہ انسانی جماعت کے آلام و مصائب کی طرف نہ صرف یہ کہ کوئی التفات کرنا پسند نہیں کرتیں بلکہ بعض اوقات وہ درد و کرب میں ہنچتی ہوئی مخلوق کا نظارہ ایک طنز آمیز استہزاء اور لذت انگیز مسکراہٹ کے ساتھ کرتی ہیں۔ انگریزی کے مشہور الم نگار شاعر اور ادیب ٹامس ہارڈی کا بھی یہی خیال ہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ بیان کرتا ہے کہ ایک بار جب آدم کی اولاد زندگی کی صعوبتوں سے تنگ آ کر خدا کے پاس فریاد کرنے گئی تو دیکھا کہ خدا سویا ہوا ہے۔ انھوں نے شور مچایا جس سے وہ جاگ اُٹھا اور اُس نے پوچھا "کون بنی آدم! آدمی! آدمی کیا ہے!!" — گویا اب وہ انسانی جماعت کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا۔ ابتداء میں اس قسم کا فلسفہ رکھنے والا شخص اپنے سینہ میں آتش فشاں چھپائے پھرتا ہے، اور اپنے غم و غصہ کی آگ سے دنیا میں آگ لگا دینا چاہتا ہے تاآنکہ رفتہ رفتہ اس کی اپنی بے چارگی اُس پر ظاہر ہونے لگتی ہے اور پھر اُس کا دل درد و الم سے دُکھنے لگتا ہے اور وہ اسی دُکھتے ہوئے دل کے ساتھ عالم پر نگاہ ڈالتا ہے اور ماتم کرتا ہے — انسانی زندگی کو دیکھتا ہے اور اُس کے دل میں ٹیس اُٹھنے لگتی ہے — اور آخر میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب دل دھڑک دھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے اور وہ دردناک وجود اپنی آگ میں جلکر مر جاتا ہے۔

اسی قسم کی دردمندی، اسی نوع کی المناکی مجنوں کے تمام افسانوں میں ملتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے ادب میں "اُردو کے ٹامس ہارڈی" کہلائے جاتے ہیں۔ یہاں پھر میں ایک غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں جو بدقسمتی سے بہت عام ہے۔ اکثر لوگ "سوز و گداز" اور "افسردگی" کو ایک چیز سمجھ کر غلط رائیں قایم کر لیتے ہیں۔ ہمیں اس باب میں حضرت نیاز فتحپوری کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اُنھوں نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے سب سے پہلے توجہ فرمائی۔ آخری تاجدارِ مغلیہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر نقد کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا ہے کہ:-

"میرے نزدیک سوز و گداز، افسردگی سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔ سوز و گداز کا تعلق تاثراتِ روحانی کی اُس بلند دُنیا سے ہے جسے مادیات سے کوئی واسطہ نہیں، اور اگر ہوتا بھی ہے تو صرف اس قدر کہ اس کو ذریعہ اظہارِ تاثر سمجھا جائے سوز و گداز اور افسردگی — دونوں کے ارتقاء کا لازمی نتیجہ سکون ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اُس میں سکون استغناء ہوتا ہے اور اس میں سکون یاس۔ اُس میں روح و روحانیت کو ترقی ہوتی ہے اور یہ دماغ و اعضاء میں تعطل پیدا کر دیتی ہے۔ چونکہ سوز و گداز کا تعلق متشائم جذبات سے نہیں ہے بلکہ اس عقلی و ذہنی ارتفاع (Intellectual Sublimity) سے ہے جس کی بنیاد بالکل جمالیات اخلاقی (Ethical Aesthetics) پر قایم ہے۔ اس لئے وہ صرف وہ ایک غموضِ روحانی (Spiritual profundity) ہے جس کی تصوری منزل اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک انسان بیک وقت زبردست فلاسفر، بے مثل آرٹسٹ اور روحانی قسم کا لطیف اخلاق نہ رکھتا ہو۔"

یہ ہے سوز و گداز اور افسردگی کا وہ فرق جسے منطق مشکل سے تسلیم کر سکے گی لیکن جس کو وجدان آسانی سے محسوس کر سکتا ہے۔ غالباً میں مبالغہ نہیں کرتا کہ مجنوں کے یہاں سوز و گداز کی جھلک نمایاں ہوتی ہے، مجنوں کی المناکی میں ایک لطیف دردمندانہ طنز کے ساتھ ایک کیفیت خستگی اور گداختگی کی نمایاں ہوتی ہے۔ یہ داخلی المناک کیفیت ہم کو اُردو غزل گوئی کے اس دورِ اولین کی یاد دلاتی ہے جسکی مخصوص صفت ممتاز متغزلانہ سوز و گداز تھا۔ اُردو پڑھنے والوں کو سمجھانے کے لئے مجنوں کی المناکی کو ہم میر کی اُس "خستگی و برشتگی" سے مشابہ کہہ سکتے ہیں جو میر کی واحد اور تنہا خصوصیت ہے۔ مجنوں، میر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میر کے بیان میں ایک ٹھہراؤ ہے جیسا کہ اُس کے جذبات میں بھی ہے مگر یہ ٹھہراؤ ضبط اور پندار کا ٹھہراؤ ہے جو اگر کہیں مچل جائے تو نہ جانے کتنوں کو مٹا کر رکھدے، میر کے اضطراب میں ایک گہرائی اور سنجیدگی ہوتی ہے جو حاوی ہوتی ہے، اُن کے سوز و گداز میں ایک گہرائی ہوتی ہے جو غالب ہوتی ہے۔" یہ میر کی دردمندانہ شاعری پر نہایت سوچا سمجھا محاکمہ ہے اور اگر انھیں الفاظ کو مجنوں کی المناک افسانہ نگاری پر بحث کرتے ہوئے دہرا دیا جائے تو ہم ایسا کرنے میں غلطی نہ کریں گے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ۔ جیسا کہ اشارۃً عرض کیا گیا۔ مجنوں غزلگوئی کے دورِ اولیں سے بہت مستقل اور دور تک اثر پذیر ہوئے ہیں جیسا کہ اُن اشعار سے پتہ چلتا ہے جو گاہے گاہے وہ افسانوں کے درمیان پیش کرتے جاتے ہیں، اور اُن کے اُن تنقیدی مباحث سے بھی جو "تنقیدی حاشئے" کے نام سے شایع ہوئی ہیں۔

چونکہ مجنوں کی فطرت میں داخلیت اور تحلیلِ نفسی فطرتاً زیادہ ہے اس لئے ان کے تمام اچھے افسانوں میں انسانی کردار کے باطنی پہلوؤں کا بہت گہرا مطالعہ پایا جاتا ہے اور اکثر واقعات و سانحات سے زیادہ وہ اپنے افراد کی نفسیات کی طرف متوجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے کردار ۔ ان کے نظریۂ کردار نگاری کے پیش نظر۔ عوام سے ملتے جلتے ضرور ہیں لیکن ان میں ایک حد تک تخئیلی رنگ دے دیا جاتا ہے اور اس طرح اگرچہ وہ کسی دوسرے کرہ کے لوگ معلوم نہیں ہوتے تاہم ان میں کسی جذبے یا خیال کی زیادتی اور شدت، اُن کے کردار میں تازگی پیدا کر دیتی ہے ان کے کرداروں میں یکسانیت بہت پائی جاتی ہے اور اکثر وہ خود مصنف کے نظریات و خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر چند یہ طریقہ اب اُٹھتا جاتا ہے کہ افسانے کے درمیان زندگی، ادب، سیاست یا کسی اور خاص موضوع پر کوئی بحث چھیڑ دی جائے تاہم یہ چیز ابتداء کے تمام افسانہ نگاروں مثلاً پریم چند، نذیر احمد، شرر، نیاز فتحپوری، رشید احمد صدیقی وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے دلچسپ ادبی اور فلسفیانہ بحثیں اکثر مجنوں کے افسانوں میں بھی آجاتی ہیں، جس سے اگرچہ مکالمے فطری نہیں رہتے لیکن اس سے افسانے کی افادیت اور موضوع کی دلکشی میں جو اضافہ ہوجاتا ہے وہ یقیناً ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ مجنوں کے افسانوں میں واقعات بھی زیادہ تر نفسِ انسانی کی پوشیدہ راز داریوں کو نمایاں کرنے کے لئے ترتیب دئے جاتے ہیں اور افسانہ نگار خود اُن کی باطنی کشمکش کو واضح کرکے کرداروں کے داخلی پہلوؤں کا

تجزیہ کرتا ہے۔ مجنوں کے کرداروں میں دوگونہ کشمکش پائی جاتی ہے پہلی کشمکش اس اندرونی پیکار سے متعلق ہے جو ہر وقت انسان کے بطون میں برپا رہتی ہے اور دوسری کشمکش واقعات اور کردار کے درمیان عمل و ردِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ یہی دوگونہ کشمکش مجنوں کے افسانوں کا مخصوص موضوع ہے۔

مجنوں کی افسانہ نویسی کے متعلق دو سوال اور سامنے آتے ہیں۔ اولاً یہ کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مجنوں کے افسانے عموماً خود اُن کے طبع زاد نہیں ہوتے اور یہ کہ یا تو براہِ راست وہ انگریزی اور روسی ادب سے ماخوذ ہوتے ہیں یا اُنکا ترجمہ! یہ اعتراض بجائے خود اتنا مضحکہ خیز ہے کہ کوئی سنجیدہ آدمی اس پر زیادہ وقت ضایع نہیں کرسکتا اور اس کا جواب خود مجنوں صاحب بھی صرف ایک جملے سے زیادہ دینا نہیں چاہتے: "میں افسانوں کی بنیاد یا تو مشاہدہ پر رکھتا ہوں یا مطالعہ پر لیکن دو تین افسانوں کو چھوڑ کر میرا کوئی افسانہ نہ تو ترجمہ ہے اور نہ کہیں سے ماخوذ۔ اس کے بعد جس کا جو جی چاہے سمجھے" البتہ یہ صحیح ہے کہ چونکہ مجنوں صاحب کثرت سے مطالعہ کرتے ہیں اس لئے ان کے مطالعہ کے نقوش دار تسامات ان کی تمام تصنیفات میں منتشر طور پر ملتے ہیں۔ مثلاً اُن کے مجموعے "سمن پوش" کے تمام افسانے اُن کے اُس مطالعہ کے تاثرات ہیں جو روحانیات کے سلسلہ میں وہ اس زمانہ میں کرچکے تھے۔ اُن کے طویل مختصر افسانہ "گردش" کی بنیاد ٹامس ہارڈی کی ایک ناول پر رکھی گئی ہے، اُن کی دوسری ناولٹ "سرنوشت" جارج ایلیٹ کے ایک افسانے اور روسی افسانہ نگار ٹرگنیف (Turgenev) کے افسانے The Diary of Superfluous man سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے، ان کے ایک سے زیادہ افسانوں میں ٹامس ہارڈی اور موپاساں کے نقوش ملتے ہیں ان افسانہ نگاروں کے علاوہ اور بھی چند مغربی ادیب اور افسانہ نگاروں کے مطالعہ کے اثرات مجنوں کے افسانوں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن ان نقوش و تاثرات کے ہوتے ہوئے بھی، مجنوں کے افسانے اُن کی ذاتی تخلیق اور اُن کا انفرادی اکتساب ہیں کیونکہ بہر حال "مضامین غیب سے نہیں آتے" اور ان کا تعلق خود اپنی فکر، اپنے مطالعہ، مشاہدہ اور وجدان ہی سے ہوتا ہے۔ اقبال کا کلام، اگرچہ اس میں مشرقی متصوفین کے علاوہ مغربی حکماء اور شعراء مثلاً گیٹے، برگساں، نطشے، لائبنز، ہیگل، ورڈز ورتھ، براؤننگ اور ٹینی سن کے نقوش ملتے ہیں، کہیں سے ماخوذ یا ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔

دوسرا سوال واقعی ذرا زیادہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ــ کیا مجنوں کے افسانے خود اُن کی اپنی واردات اور سرگزشت ہوتے ہیں؟ میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ مجنوں جو کچھ لکھتے ہیں وہ اُن کی "آپ بیتی" ہوتی ہے! ــ اور واقعی مجنوں کے افسانوں میں چند خصائص ایسے ضرور ملتے ہیں جو لوگوں کو اس خیال کے قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں، پہلی چیز یہی ہے کہ اُنکے افسانوں میں حیرت ناک حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے یہ یکسانیت واقعات یا پلاٹ ہی تک محدود نہیں بلکہ اکثر و بیشتر افسانوں کی فضا اور کردار بھی ایک خاص وضع رکھتے ہیں۔ ان کا پلاٹ اس دوگونہ کشمکش کے گرد گھومتا ہے جسکی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ مجنوں کے افسانوں میں اس کا مآل کار بھی زیادہ تر ایک ہی ہوتا ہے یعنی قضا و قدر کے آگے

انسان کی ناکامی اور بے چارگی! مثال کے طور پر "نقش ناہید" کا رمزی، "سالگرہ" کا جعفری اور "سرنوشت" کا مظہر لے لیجئے اور ان کی مناسبات پر غور کیجئے۔ تینوں بیمار ہیں، اُن کو ضعفِ قلب کی شکایت ہے اور رمزی اور مظہر کو اکثر اسکے دورے بھی پڑجاتے ہیں، تینوں خواب وخیال کی دنیا کے رہنے والے ہیں، اور ہماری مادّی دُنیا اور مادّی زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں سے مجروح ہورہے ہیں۔ تینوں کے دل میں ایک آرزو ہے جو ناتمام رہی جاتی ہے، اُن کی زندگی کا تخیل ان کے ساتھ دفن ہوا جاتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اُن کی زندگی کامیاب سمجھی جارہی ہے لیکن خود اُن کا دل حسرت سے بیٹھا جارہا ہے کہ اُنکا شاہکار اُن کے جیتے جی معرضِ وجود میں نہ آسکا اور جو کچھ کہ وہ ہوسکتے تھے لیل ونہار کی گردش نے ان کو ویسا نہ ہونے دیا تینوں کو موت کو قریب آتا دیکھ کر اپنی ماضی پر ایک حسرت آلود نگاہ ڈالتے ہیں اور اپنے قلب وروح کے سانحات بیان کرکے اپنے دل کو تسکین دینا چاہتے ہیں اور آخرکار تینوں کا انجام خودکشی ہوتا ہے۔ مجنوں کے ہیرو اکثر ادبی اور فکری میلان رکھتے ہیں اور عقل کے ساتھ اُن میں جنون و دیوانگی کی رمق پائی جاتی ہے، اگر طولِ کلام کا خوف نہ ہوتا تو اس باب میں میں "نقش ناہید" کے رمزی اور "سمن پوش" والے "حسن شاہ" کی طرف اشارہ کرتا — پھر اگر افسانوں میں مجنوں نے بیاہی ہوئی عورتوں سے اپنا معاشقہ ظاہر کیا ہے اُن کی ہیروئن بھی بیشتر ایک پاکیزہ شعری اور ادبی مذاق اپنے اندر رکھتی ہے اور ہیرو اور ہیروئن دونوں عموماً معاشرت اور سوسائٹی کے ایک خاص درجے سے تعلق رکھتے ہیں۔ واقعات اور حالات کی اس حد تک یکسانیت پڑھنے والے کو اس خیال کی طرف مایل کردیتی ہے کہ کہیں لکھنے والا جس چیز کو لکھ رہا ہے وہ اس کی اپنی سرگزشت تو نہیں، واقعات اور کردار سے قطع نظر، مجنوں کے اکثر وبیشتر افسانوں میں جو اُنکی پختہ فکر کا نتیجہ ہیں ایک مخصوص فکری میلان ملتا ہے جو غالب اور حاوی ہوتا ہے۔ زندگی اور اس کی قدروں کے متعلق یہ مخصوص، انفرادی نظریہ جب پڑھنے والے کو بار بار مجنوں کے افسانوں میں نظر آتا ہے تو ایک بار پھر وہ اس خیال کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے کہ بہت ممکن ہے یہ مجنوں کی اپنی واردات رہی ہو جس کو بہ اندازِ حدیثِ دیگراں بیان کر رہا ہے — یہ دو سبب بھی عوام میں اس شبہ کو راسخ کرنے کے لئے کافی ہوسکتے ہیں لیکن مجنوں کے مخصوص اندازِ بیان نے اُن کے گمان کو اکثر مرتبہ یقین کی منزل تک پہونچا دیا ہے۔ لب ولہجہ کی صداقت وخلوص، جذبے کی فتادگی اور سپردگی اور افسانہ نگار کی عشقیہ جگرریزی و دلی بستگی انکو یقین دلادیتی ہے کہ یہ محض الف لیلہ کی کہانیاں یا امیر حمزہ کی داستانیں نہیں بلکہ ان ادب پاروں کی تخلیق آرٹسٹ کے پارہائے دل سے ہوئی ہے، اور ان کی رنگینی خود آرٹسٹ کے خونِ حیات کی رہین منت ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مجنوں اکثر اپنے افسانے صیغہ واحد متکلم (First Person Singular) میں لکھتے ہیں اور مقابلۃً اُن کے وہ افسانے جو "واحد متکلم" میں لکھے گئے ہیں زیادہ اثر انگیز اور پُر تاثیر ہوتے ہیں، بہ نسبت اُن افسانوں کے جن میں Third Person بدلا ہوا ہے۔ یہ اور اس نوع کے دوسرے اسباب پڑھنے والے کے گمان کو راسخ اور اُس کے شبہ کو یقین بنا دیتے ہیں۔

پڑھنے والے کے دل کی یہ آواز اور سرگوشیاں کسی طرح مجنوں تک بھی پہونچ جاتی ہیں اور وہ اس غلط فہمی کو دور

کرنے کے لئے ایک سے زیادہ مرتبہ کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میرے بیشتر افسانے محبت کے افسانے ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے کسی ایک کو بھی "آپ بیتی" سمجھنا پڑھنے والے کی تنگ خیالی کی دلیل ہے۔ میں اپنے ہر پڑھنے والے سے پوچھتا ہوں کہ کونسا افسانہ ایسا ہے جس کے کچھ نہ کچھ ٹکڑے خود اس کی "آپ بیتی" نہ ہوں۔ اس لئے اس ذیل میں مجھ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں"۔

بات اصل یہ ہے کہ افسانہ نگاری بھی صناعی ہی کی ایک اہم صنف ہے اور افسانہ نگار کا تخیل بھی تجربہ سے بہت بڑی حد تک بے نیاز ہے۔ Danial Defoe کی مشہور داستان Robinson Cruso کا سب سے بڑا وصف یہی بتایا جاتا ہے کہ وہ فسانہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ حقیقت معلوم ہونے لگتی ہے۔ انگلستان کے مشہور ادیب اور ناقد Passage of India کے مصنف مسٹر ای۔ ایم۔ فارسٹر نے کچھ دن پہلے آل انڈیا ریڈیو دہلی پر ایک ادبی تقریر میں کہا تھا کہ "بے غرضی" اور "جذبہ" ۔۔۔ یہی دو عناصر اور خصائص ایسے ہیں جو ایک ادیب اور پمفلٹ نگار کے درمیان خطوطِ امتیاز کھینچ دیتے ہیں۔ پمفلٹ نگار اسوقت تک جذبے کی شدت اور اثر کی قوت کے ساتھ نہیں لکھ سکتا جب تک خود اُس کو چند روپلی اور سنہری مصلحتیں یا اسی نوع کی دوسری ذاتی سود و زیاں کا خیال ستاتا رہا لیکن ادیب کا قلم بے غرض ہوتا ہے اور بے غرضی کے ساتھ اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ جذبے سے لکھتا ہے۔ مسٹر فارسٹر نے بتایا تھا کہ شیکسپیئر جس کی ادبی تخلیق پر بالعموم تمام دنیا اور بالخصوص تمام انگلستان ایک خاص پندار محسوس کرتا ہے۔ اُس کا اہم وصف بھی یہی ہے کہ اس نے بے غرضی سے لکھا ہے۔ اس لئے مجنوں کے افسانوں کو "آپ بیتی" خیال کرتے وقت ہم کو یہ ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ مجنوں ایک ادیب ہے اور ادیب کی بے غرضی اور جذبہ اس میں بھی موجود ہے۔ وہ تخیل کا بھی مالک ہے اور اس لئے ضروری نہیں کہ وہ جو کچھ بیان کرتا ہے محض اُس کا اپنا تجربہ، اپنا واقعہ ہے۔ اس کے تخیل میں وسعت اور عمق ہے اور اس کے جذبے میں شدت اور گیرائی ہے۔ وہ اپنے واقعہ کو اس طرح بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ ہر پڑھنے والا اس کو خود اپنی واردات تصور کرے۔ وہ دوسروں کے واقعہ کو اس رنگ میں پیش کرنے کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس کی اپنی سرگزشت معلوم ہونے لگیں اور یہ کہ وہ حالات و کوائف جو نہ اُس پر گزرے ہوں نہ دوسروں پر اس انداز میں بیان کرنے کی اہلیت رکھتا ہے کہ ہر شخص اُس کو زندگی کا ایک اہم واقعہ سمجھے اور دل میں حیرت کرے کہ اب تک مجھ پر یا اوروں پر یہ واردات کیوں نہیں گزری! ۔۔۔ یہ ہے ایک بلند ادیب کی شانِ امتیاز جو بہمہ وجوہ مجنوں میں جلوہ گر ہے لیکن اس ادیبانہ قدرت کے باوصف مجھ کو یہ کہنے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ مجنوں کے افسانوں میں ان کا شخصی رنگ بہت نمایاں رہتا ہے اور اُن کے اکثر کرداروں کے دلوں کی دھڑکن پر مجنوں کے دل کی دھڑکن کا شبہ ہوتا ہے۔ مجنوں کے لہجے میں جو پرخلوص المناکی ہے وہ اس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ مجنوں کے قلم کی آواز میں اُن کے دل کی آواز بھی شامل اور اُن کی تحریریں محض تخیل کی پیداوار نہیں۔

یہاں پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ سب کیفیت مجنوں کے اُن افسانوں میں ہے جن کا مرکزی خیال "محبت" ہے لیکن جن افسانوں میں اصلاحی، تبلیغی یا واقعاتی رنگ زیادہ غالب ہے مثلاً "ہنیا"۔ "لذتِ آزار" یا "تصادم" وغیرہ تو اُن میں تاثر کی وہ شدت اور طوفان کا وہ اُبھار نہیں ہے جس کو ہم مجنوں کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں۔ فی الاصل مجنوں کے وہ افسانے جن کو انھوں نے ازراہِ انکسار "ہذیانات" کہا ہے زیادہ لذت، زیادہ کیفیت اور زیادہ تاثیر کے حامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ جس ادب کے لئے پیدا ہوئے ہیں وہ اشتراکی ادب نہیں ہے بلکہ وہ ہے جس کا تعلق عقل و ہوش سے کم اور دیوانگی جنون اور آشفتہ سری سے زیادہ ہے۔ اس لئے جہاں کہیں بھی وہ "بوعلی سینا" یا "مارکس" بننے کی کوشش کرتے ہیں وہاں ۔ میرا اندازہ ہے ــــــ وہ اپنے ادب کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر بھی صریحاً ظلم کرتے ہیں۔

آخر میں مجنوں کے اُسلوب کے متعلق ایک لفظ اور کہنا چاہتا ہوں۔ آجکل کے اکثر افسانہ نگار اور ادیب اُسلوب کی طرف کوئی اعتنا نہیں کرتے جس کا نتیجہ نہایت افسوسناک ہوتا ہے۔ ہماری زبان کے اسالیبی امکانات تنگ ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی زبان کی خامکاری، اکثر ان کے شعور و وجدان کی گہرائیوں اور وسعتوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ وہ کسی جذبے کو ــــــ اگرچہ وہ اس جذبے کی شدت کو محسوس بھی کرتے ہوں ــــــ پوری طرح بیان نہیں کر پاتے اور اس طرح اکثر جذبات و خیالات اُن کے سینوں میں اُٹھتے ہیں اور لڑکھڑا کر گر جاتے ہیں۔ ان کے بیان میں وہ ابہام و اہمال پیدا ہو جاتا ہے جو بُری طرح اُن کے فن اور ادب کو مجروح کر دیتا ہے۔ ہمارے نوجوان ادیبوں کو یہ حقیقت نہ بھولنا چاہئے کہ ادب در آرٹ میں اُسلوب اور فارم (Form) کو ہمیشہ ایک ممتاز اہمیت حاصل رہی ہے ــــــ اور رہے گی۔ ان کو چاہئے کہ وہ اپنی خلوت گاہوں میں میتھو آرنلڈ (Matthew Arnold) کے یہ الفاظ آویزاں کر لیں ــــــ اور ان کو آویزاں رکھیں تا آنکہ اُن کی ادبی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آئے جب وہ خود اُسلوب کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے راز سے واقف ہو جائیں:

The mighty power of poetry & art is generally admitted But where the soul of this power, at its best, chiefly resides very many of us fail to see. It resides chiefly in the refining & elevation wrought in us by the high & rare excellence of the great style.

میں اس کو مجنوں صاحب کی خوش بختی خیال کرتا ہوں کہ اُن کی ادبی زندگی کی ابتدا اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب اُسلوب اور انداز سے لوگ اس قدر بے اعتنائی اور بے توجہی نہ برتتے تھے۔ اور یہ کہ اُن کو اُس مدرسۂ فکر و ادب کے رُکن رہنے کا شرف حاصل ہے جو ہمارے ادبِ جدید کی تاریخ میں "نیاز اسکول" کے نام سے مشہور ہے۔ خود نیاز کی ذاتِ گرامی

سے قطع نظر، جو یقیناً زبان کے ساحر ہیں، مجنوں کو بھی اپنے انداز بیان کا آپ مالک جاننا چاہیئے۔ اگرچہ مجنوں کا انداز بیان ہمارے ادب کے اسالیب میں کوئی ابداع یا اختراع نہیں کہا جا سکتا، تاہم اگر ان کے لہجے کی فنادگی اور خلوص، اُن کے جملوں کی نشست اور برجستگی اور اُن کی زبان کی سادگی اور اثر انگیزی اُن کے لئے ایک "صاحبِ طرز" کی جگہ پیدا نہیں کرتی تو یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ وہ زبان و بیان کے تمام رازوں سے واقف ہیں اور ایک باکمال آرٹسٹ کی طرح اُن کو کام میں لانے کی پوری قدرت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں نے Victor Hugo کے متعلق کہیں ایک جملہ پڑھا تھا۔

"ہیوگو کی موت صرف یورپ کے بڑے آدمی ہی کی موت نہ تھی بلکہ وہ لٹریچر کی موت تھی، کیونکہ ہیوگو اپنی زندگی کے آخر میں آدمی کم رہگیا تھا اور لٹریچر زیادہ"—— اور یہ کچھ ہیوگو ہی پر موقوف نہیں، جب کوئی بڑا ادیب یا شاعر منزل کی ان بلندیوں تک پہونچ جاتا ہے تو اُس سے گوشت و پوست والا آدمی رخصت ہو جاتا ہے اور اس کی تمام ہستی ایک شعر یا ادب ہو کر رہ جاتی ہے، ایسی حالت میں وہ جو کچھ کہتا ہے "ادب" ہوتا ہے —— اور غالباً میں غلو نہیں کرتا اگر میں یہ کہتا ہوں کہ "نیاز اسکول" میں خود نیازؔ کے بعد اگر اس وصف یا خاصہ کا تھوڑا بہت شائبہ کسی میں پایا جاتا ہے تو وہ صرف مجنوں گورکھپوری میں۔

خلش برنی

ایک انگریز کے سر کے بال اُڑنے لگتے ہیں تو وہ کافی رقم اس کوشش میں صرف کر دیتا ہے کہ بال پھر اُگ آئیں۔ لیکن اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا ایسی صورت میں اپنا برش اور کنگھا بھی فروخت کر ڈالتا ہے۔

اگر تم ہمیشہ سچ بولتے ہو، تو پھر کسی بات کے یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔

اس وقت دُنیا کو سب سے زیادہ ضرورت کنٹرول کی ہے لیکن یہ کنٹرول ایٹم کا نہیں بلکہ آدم کا ہے۔

ہر چیز کا کوئی نہ کوئی پہلو دلچسپ ہوتا ہے۔ موسم کا لطف جنّت میں ہے اور سوسائٹی کا لطف جہنم میں۔

زندگی کوئی بھرا ہوا جام نہیں جسے پینا ہے، بلکہ خالی جام ہے جسے پُر کرنا ہے۔

آپ مجھے بُرا کہیں اور میں خاموش رہوں، اس کا امکان ہے، لیکن اگر آپ نے یہ کہدیا کہ آپ کو مجھے بُرا کہنے کا حق بھی ہے تو پھر میں خاموش نہیں رہ سکتا۔

قدیم سنسکرت لٹریچر

(بہ سلسلۂ مارچ ۱۹۴۷ء)

سوم آواز میں ایسی تیزی اور وسعت پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے کوئی ملاح کشتی کو آگے بڑھا دے۔ یہ دیوتا خیالات میں بھی تحریک پیدا کر دیتا ہے اس حد تک کہ اُسکے پجاری چیخ اُٹھتے ہیں کہ :

"ہم نے سوم پی ہے۔ ہم لافانی ہو گئے ہیں۔ ہم عالم نور میں داخل ہو گئے ہیں اور ہم نے دیوتاؤں کی معرفت حاصل کر لی ہے"

سوم کی نشہ پیدا کرنے والی قوت کا بیان اِندر کی حالات کی ذیل میں آ چکا ہے۔ چونکہ نباتات میں یہ سب سے اہم شے تھی اس لئے اُس کو جنگل کا بادشاہ اور مالک (وناس پتی) کہا گیا ہے۔

رگ وید کے چند بھجنوں میں جو پچھلے زمانہ کی تصنیف ہیں، سوم کی شخصیت مبہم طریق پر وجودِ ماہتاب سے مخلوط ہوتا پائی جاتی ہے۔ یجر وید میں منازل قمر کو سوم کی بیویاں ہونا ظاہر کیا گیا ہے اور اتھروید میں صریحاً سوم بمعنی ماہتاب بیان کیا گیا ہے۔

براہمنٹروں میں تو عام طور پر سوم اور چاند ایک ہی چیز ہو گئے ہیں اور اُن میں بیان کیا گیا ہے کہ چاند اس وجہ سے گھٹ جاتا ہے کہ دیوتا اور گزشتہ آبا و اجداد اس امرت کو کھا جاتے ہیں۔ ایک اُپنشد میں لکھا ہے کہ چاند ہی شاہ سوم ہے جو دیوتاؤں کی خوراک ہے اور جس کو دیوتا پیتے ہیں۔

ویدوں کے بعد کے زمانہ کی لٹریچر میں سوم چاند کا باقاعدہ نام ہو گیا ہے۔ اس لٹریچر کے مطابق چاند اس لئے گھٹتا جاتا ہے کہ دیوتا اُس سے خوراک حاصل کرتے رہتے ہیں اور جب وہ بالکل خالی ہو جاتا ہے تو آفتاب اُس کو بھر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اخیر زمانوں میں سوم کا بمعنی ماہتاب منتقل ہو جانا رگ وید ہی کے طرز بیان پر مبنی ہے جس میں سوم کو کہیں صراحتاً کہیں کنایتہً چاند یا چاند کی روشنی، مبالغہ کے طریق پر بیان کیا گیا ہے۔

سوم بھی اگنی کی طرح ہند و ایرانی اقوام کے مشترکہ مراسم عبادت کی ایک نمودار یادگار ہے۔ رگوید اور اوستا کے بالمقابلہ مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں جگہ سوم پہاڑوں پر پیدا ہوتا ہے جہاں سے اُس کو بہ لاتے ہیں۔ دونوں میں وہ شاہ نباتات ہے اور ایسی دوا ہے جو موت کو دفع کرتی ہے اور طویل زندگی عطا کرتی ہے۔ دونوں کتابوں میں اُس کے پیسے جانے

اور اُس میں دودھ ملائے جانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ دونوں جگہ یہی بیان کیا گیا ہے کہ اُس کا اصل مقام آسمان ہے۔ دونوں جگہ اُس کو ایک طاقتور دیوتا مانا گیا ہے اور دونوں جگہ آسمانی سوم اور ارضی سوم میں تفریق کی گئی ہے یعنی ایک تو آسمانی شخصیت رکھنے والا دیوتا ہے اور دوسرا مادی شربت یا شراب پینے والا اور ان دونوں میں یکسانیت اور مطابقت اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ایک کتاب میں اس دیوتا کے جو مخصوص القاب ہیں وہی دوسری کتاب میں ہیں۔

یہاں یہ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ آگ کی پرستش اُس قدیم زمانہ سے متعلق ہے جب قومیں کسی سرد مقامات پر رہتی تھی قدیم روایات سے ظاہر ہے کہ اس دائمی اور دوامی آتش کی پہاڑوں پر جگہ جگہ حفاظت کی جاتی تھی۔ جہاں یہ قدرتی چشمے نہ ہوں آگ کو کچھ دیر تک قایم رکھنے کا ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ اُس کو روغن یا الکحل سے روشن اور بھڑکتا ہوا رکھا جائے۔

سماوی و فضائی و ارضی دیوتاؤں کے بیان کے بعد چوتھے قسم کے دیوتاؤں کا تذکرہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بیاناتِ متذکرہ صدر سے ظاہر ہوا ہوگا کہ جہاں کسی ظاہری اور مادی شے کو دیوتا مانا گیا ہے اُسی کے ساتھ ایک روحانی شخصیت رکھنے والا دیوتا بھی مانا گیا ہے۔ مثلاً اُسی طرح جس طرح قدیم ایرانیوں میں اوستا کے مطابق موکل۔ رب النوع۔ فرشتے مانے گئے ہیں دیگر الفاظ میں مادہ پرستی سے روحانیت کی طرف رفتہ رفتہ قدم بڑھتا جاتا ہے۔ پہلے ٹھوس آسمان کو دیوتا مانا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ آسمان ویسے تو متبرک رہا لیکن اُس کی ایک علٰحدہ روحانی شخصیت بھی قرار دیدی گئی۔ اُسی طرح سوریہ کی کیفیت ہے کہ جرم آفتاب ہی دیوتا تھا لیکن بعد میں اُس سے متعلق کئی روحانی شخصیتیں پیدا ہو گئیں۔ اگنی آگ کی پرستش اب بھی کی جاتی ہے لیکن روحانی دیوتا اگنی علٰحدہ شخصیت ہے۔ رگوید کے بہت پچھلے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ ترقی پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض بسیط اشیا کو دیوتا مانا گیا ہے۔ نیز بعض صفاتی القاب یعنی ایسے اسمائے صفت کہ جو پہلے کسی دیوتا کی توصیف کے لئے اُس کے نام کے ساتھ یا علٰحدہ لقب کے طور پر استعمال ہوتے تھے وہ بجائے خود مستقل طریق پر دیوتا ہو گئے۔ مثال کے طور پر اس قسم کے چند دیوتاؤں کا ذکر کیا جاتا ہے:-

۱- شردّھا - (ایمانِ مجسم) - اس کی تعریف میں رگوید میں ایک نظم ہے۔

۲- منیُو - (غصہ) دو بھجن اس کی توصیف میں ہیں۔

۳- پرجاپتی - (مخلوقات کا مالک) دراصل پہلے یہ سوم اور سوتر دیوتاؤں کا صفاتی لقب تھا، لیکن رگوید کی آخری کتاب (منڈل) کے ایک شعر میں خالق کی حیثیت سے ایک علٰحدہ مستقل دیوتا بیان کیا گیا ہے۔ یہی دیوتا بعد کے ویدی زمانہ میں یعنی اتھروید میں اکثر اور براہمنوں میں بہ تکرار خاص الخاص دیوتاؤں کا باپ ظاہر کیا گیا ہے۔ جب سوتروں کا زمانہ آیا تو اُن میں اُس کو برہما سے ملا دیا گیا۔ لیکن ویدی زمانہ کے بعد کے زمانہ میں پرجاپتی اپنی جداگانہ ہستی کے اعتبار سے اپنے جانشین برہما میں غائب ہو گیا۔

۴- برہسپتی - (خداوند یا آقائے عبادت) بعض کا خیال ہے کہ یہ دیوتا عبادت مجسم کا مترادف ہے۔ دیگر محققین یہ

کہتے ہیں کہ اگنی دیوتا پوجاری کی حیثیت میں جو نذر و نیاز عمل میں لاتا ہے، براہسپتی اُس عمل کا دیوتا ہے۔ پجاری کے روپ میں اکثر نمایاں طور پر اُس کا تذکرہ رگوید میں کیا گیا ہے۔ اندر دیوتا سے متعلق افسانوں میں بھی اُس کا ہاتھ ہے۔ مثلاً جب اندر دیوتا 'دل' عفریت کو مغلوب کرتا ہے تو براہسپتی گایوں کو ہانک لاتا ہے۔ برہم پجاری ہونے کی حیثیت سے براہسپتی آیندہ ہندو زمانہ کے برہما کا ایک گونہ ہیولیٰ ہے۔ ویدی عصر کے بعد کے زمانہ کی مائی تھولوجی (مذہبی افسانوں) میں براہسپتی دیوتاؤں کے اُستاد ایک حکیم عاقل کا نام ہوگیا اور سیارہ مشتری کا موکل بھی۔

۵ - اَدیتی - بمعنی عقدہ کشا یا بلاقید یا غیر محدود۔ رگوید کے ابتدائی حصوں میں یہ لفظ بطور اسم صفت کے اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے لیکن جیساکہ اس مضمون میں ظاہر کیا گیا ہے کہ رفتہ رفتہ اسمار صفاتی بھی علٰحدہ علٰحدہ دیوتاؤں کی شخصیت میں منتقل ہوگئے اُسی طرح یہ اسم بھی ایک دیوی کی شخصیت بن گیا۔ اس دیوی کی پیدائش ہندوستانی ہے حالانکہ اُس کا پتہ نشان اس طرح بتایا گیا ہے کہ وہ ورن اور چند دیگر دیوتاؤں کے ایک مختص اور مختصر گروہ کی ماں ہے۔ دوسری خصوصیت اُسکی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جسمانی تکالیف اور گناہوں کی بندش سے آزاد کرانے والی شخصیت ہے۔ باوجود ان خصوصیتوں کی صراحت کے سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ یہ دیوی کس شے کی نمایندگی کرتی ہے۔ لفظ ادیتی میں حرف 'الف' نفی کے معنی پیدا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مکان کے مقابلہ میں لامکان کا مفہوم اس سے پیدا ہوتا ہے، ملاحظہ ہو ترجمہ ذیل:-

"اے مترا اور اے ورن، جب تم اپنے رتھ پر سوار ہوتے ہو جس کی رنگت پو پھٹنے کے وقت سنہری ہوتی ہے اور جیسے بانس یا ڈنڈے غروب آفتاب کے وقت لوہے کے ہوتے ہیں تو تم وہاں سے وہ دیکھتے ہو جو غیر محدود (ادیتی، لامکاں یا فضائے لامحدود) ہے اور جو محدود (دیتی زمین) ہے یعنی جو اُدھر ہے اور جو یہاں ہے۔"

بعض جگہ اس لفظ سے ظرف مکانی کے بجائے ظرف زمانی کا مفہوم بمعنی ابد ہویدا ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو فقرہ ذیل:-

"مجھ کو کون اعلیٰ وارفع ادیتی کے واپس حوالہ کرے گا کہ میں اپنے ماں اور باپ کو پھر دیکھ سکوں۔ وہ دیوتاؤں میں اولین لافانی دیوتا اگنی ہے جو مجھ کو اعلیٰ وارفع ادیتی کے واپس سپرد کرے گا تاکہ میں اپنے ماں باپ کو پھر دیکھ لوں۔ (منڈل ۱ سوکت ۲۴)

ایک مقام پر اس کی تشریح یوں کی گئی ہے:-

"ادیتی آسمان ہے۔ ادیتی درمیانی ملک (انت رکشا۔ فضا) ہے۔ ادیتی باپ ہے، ماں ہے اور لڑکا ہے۔ ادیتی کل دیوتاؤں (کا مجموعہ) ہے اور پانچوں قوم ہے۔ ہر شے جو پیدا ہوئی ہے ادیتی ہے اور جو شے پیدا ہوگی ادیتی ہے (منڈل ۱ سوکت ۸۹)

اقتباسات مندرجہ بالا سے استنباط ہوسکتا ہے کہ رگوید کے شاعروں کے پیش نظر یا اُن کے دماغ میں ادیتی کا کیا مفہوم تھا۔ اُنھوں نے جس شے کو بیان کرنا چاہا ہے وہ ظاہر ہے کہ ادبی الفاظ میں کل کارخانۂ قدرت یا کائنات ہے اور بسیط شکل میں غیر محدودیت ہے یا وہ عالم مافوق الفطرت ہے، جو ماورائے عالم محسوسات ہے۔ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ ورن اور مترا وغیرہ کیونکر ادیتی کے لڑکے قرار دئے جاسکتے ہیں۔ یہ لڑکے آدیتہ کہے جاتے ہیں اور اُن کی تعداد رگوید میں

سات بیان کی گئی ہے - یعنی مترا اور ورن کے علاوہ پانچ اور ہیں جن میں سے دو کے نام آریہ من اور بھاگ ہیں - دو نام اور بھی رگوید میں پائے جاتے ہیں - لیکن ساتواں کون ہے اس کا پتہ نہیں چلتا - ایک جگہ ایک اور آٹھویں لڑکے کا بھی ذکر آیا ہے اور وہ خداوند آتش ہے:

اوستا کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں بھی سات "امیش اسپنت" (لافانی ہستیاں) ہیں اور جس طور سے رگوید میں آٹھواں ادیتہ دیوتا آگ کا دیوتا ہے اُسی طرح اوستا میں آٹھویں لافانی ہستی آتر (بہ معنی آتش) ہے پس کہا جا سکتا ہے کہ ایرانی اور ہندوستانی تخئیل کی بنیاد ایک ہی ہے - رگوید کے بعد کے زمانہ میں ادیتہ دیوتاؤں کی تعداد بارہ تک پہونچ گئی ہے۔

قطع کلام کے طور پر یہاں ایک نکتہ قابل ذکر ہے - رگوید کے بھجن گو فرداً فرداً کسی خاص دیوتا کی توصیف میں ہوں لیکن انمیں دوسرے دیوتاؤں کی ثنا و صفت بھی اکثر بیان کر دی جاتی ہے - اس کے علاوہ بالعموم دو دو دیوتاؤں کا جوڑ کر دو ناموں کا ایک مرکب نام بنا کر قایم کیا جاتا ہے، مثلاً مترا، ورن، دیؤس، پرتھوی، وغیرہم - بالفاظ دیگر دو ہستیوں کی ایک ہستی قرار دیدی جاتی ہے اور دوئی کا رنگ مٹایا جاتا ہے - تخئیل کی تسکین جب ایک دیوتا یا دو دیوتاؤں کے جوڑے سے بھی نہیں ہوتی تو اُس کا ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور وہ چند دیوتاؤں کا ایک چیدہ مجموعہ قایم کرتی ہے جیسے مترا - ورن، آریہ من، بھاگ وغیرہم مجموعی حیثیت سے اس مجموعہ کو ایک علٰحدہ ہستی کے ڈھنگ پر قابل پرستش مان کر اُس کا جداگانہ نام رکھدیا جاتا ہے اور محض اُسی نام سے پرستش منسوب کی جاتی ہے - مثلاً آدیتہ چند مخصوص دیوتاؤں کے اور (مردت) طوفانی دیوتاؤں کے مجموعے ہیں - یہاں تک پہونچ کر بھی تجسس کی کاوش قرار نہیں لیتی اور کُل دیوتاؤں کا ایک مجموعہ قایم کرکے اُس کو وشودکل) دیوتاؤں کا لقب دیتی ہے اور اس نام سے اُس مجموعہ کُل کی بحیثیت مجموعی علٰحدہ پرستش جاری کرتی ہے - چنانچہ ساٹھ بھجن وشو دیوتاؤں کے نام پر ہیں - شاعرانہ طبیعت اس سے بھی سیر نہیں ہوتی - کثرت سے گھبرا کر ایک اور رنگ اختیار کرتی ہے اور وحدت کی متلاشی ہوتی ہے - لیکن تلاش کا دایرہ اُسی طرح محدود رہتا ہے جس کے نتیجہ میں وحدانیت صرف اگنی تک پہونچکر رہ جاتی ہے - یہ جوہر لطیف فرداً فرداً ہر دیوتا کا مترادف ہو جاتا ہے اور تمام دیوتا اگنی میں مرغم ہو جاتے ہیں - اگنی کا ظہور ہی سارے جہان میں - آسمانوں میں - فضا میں پانی میں اور زمینوں میں ہے اور جو کچھ ہے وہی ہے - اس کی مزید توضیح آیندہ اوراق میں کی جائے گی - سردست یہ سمجھنا چاہئے کہ رگوید کی تخئیل اپنے اخیر زمانہ میں یہاں تک پہونچ کر ختم ہو گئی اور اُس منزل تک بھی نہ پہونچ سکی جہاں ایرانی بھائی "مزد" کی جستجو میں پہونچ گئے تھے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو بھائی بہت سی چیزوں کو ساتھ لیکر راستہ ڈھونڈنے چلے - آگے بڑھ کر ایک بھائی سوا ایک کے باقی کو چھوڑ کر اُس ایک چیز کو بجنسہ کسی منزل تک پہونچ کر واپس لے آیا - دوسرا بھائی چیزیں چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ اُس کے پاس بھی صرف وہی چیز رہ گئی جو پہلا بھائی بجنسہ واپس لے گیا تھا وہ پھر آگے بڑھا اور، گو وہ باقی ماندہ چیز کو چھوڑ تو نہ سکا لیکن اُس کا میل دور کر کے اُس کو نکھار دیکر وہ اُس حد تک پہونچ گیا جہاں وہ حالاتِ گرد و پیش کے تحت پہونچ سکتا تھا -

اب پھر دیوتا اور دیویوں کے حالات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اخیر مضمون آدیتی دیوی تک پہونچا ہے۔ اس سے قبل کئی اور دیویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے مثلاً اُشس دیوی، سرسوتی دیوی۔ رگوید میں اور بھی دیویوں کا ذکر ہے لیکن حقیقتاً کتاب مذکور کی رو سے دیویاں کوئی اہم مرتبہ دیوتاؤں کے مقابلہ میں نہیں رکھتیں۔ منجملہ دیویوں کے ایک دیوی رات کی بھی ہے جس کا نام "راتری" ہے۔ یہ آسمان کی لڑکی ہے اور اشویو (توشتر) توام دیوتاؤں کی ماں ہے۔ یَم کی بھی وہ ماں ہے اور اُس کا خاوند وِوَست ہے (بمعنی آفتاب۔ نیز چمکیلا آسمان) اسی طرح دیوتاؤں کی بی بیاں بھی ہیں۔ ان بیویوں کے نام وہی ہیں جو دیوتاؤں کے ہیں۔ ان میں صرف حرفِ تانیث اضافہ کر دیا گیا ہے، جیسے اندر سے اندرانی۔ یہ سب دیویاں دیوتاؤں کی ماتحتی میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔

دیوتا اور دیویوں کے علاوہ ایسی کئی ہستیاں ہیں جو خداوندی مرتبہ نہیں رکھتیں یعنی دیوتاؤں کے درجہ تک نہیں پہونچتیں لیکن جن کو مذہبی افسانوں کے سلسلہ میں جگہ دی گئی ہے۔ ان میں ایک قسم رِبھو کی ہے۔ رگوید کے گیارہ بھجنوں میں ان کو مخاطب کیا گیا ہے، یعنی گیارہ بھجن اُن کے نام پر ہیں۔ ان کی خصوصیت صنعتی چابکدستی ہے۔ وہ اپنی ہنرمندی سے تقریباً خداوندی مرتبہ پر پہونچ جاتے ہیں۔ اُن کی پانچ صناعیوں میں سے جن کی بدولت وہ دیوتاؤں کے زمرہ میں آسکتے ہیں سب سے بڑی صناعی یہ تھی کہ اُنھوں نے صنعت کے دیوتا توشتری کے پیالہ کو جس سے دیوتا پیتے تھے چار پیالیوں میں تقسیم کر دیا۔ غالباً پیالہ سے مُراد پورا چاند ہے اور پیالیوں سے اُس کی بالا و پست باقی ماندہ چار شکلیں ہلالی اور نصف النصفی دوسری تفسیر اس کی چار موسموں کی تقسیم سے بھی کی جاسکتی ہے۔ رِبھوں کی نسبت یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُنھوں نے اپنے والدین کی جوانی کو پھر تازہ کر دیا اور اسی قصہ سے متعلق یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ اُنھوں نے "اگھویہ" (وہ چیز جو پوشیدہ نہیں رہ سکتی) کے گھر میں بارہ روز آرام کیا۔ اس کی تاویل یوں کی جاسکتی ہے کہ والدین سے مُراد آسمان و زمین ہیں اور آفتاب کے گھر میں بارہ روز رہنے سے یہ مراد ہے کہ قمری سال ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے اُس کو شمسی ۳۶۶ دن کے سال کی برابر کرنے کے لئے بارہ روز کا اضافہ ضروری ہے۔ غرضکہ "رِبھو" ایسی فضائی یا ارضی ہستیاں ہیں جن کے گرد اُن کی صنعت کی بدولت بہت سے افسانے جمع ہو گئے ہیں۔

رگوید میں چند مقامات پر فضائی سمندر (؟) کی ایک دریائی پری کا بھی ذکر آیا ہے جس کا نام اپسرس ہے (بمعنی پانی میں حرکت کرنے والی)۔ اُس کے مقابلہ میں اسی فضائی نوعیت کی ایک اور مردانہ ہستی ہے جس کا نام گندھرو ہے۔ یہ دونوں باہم زن و شوہر کی نسبت رکھتے ہیں۔ آگے چل کر اسی رگوید میں ان دونوں کی ایک سے زیادہ تعداد بیان کی گئی ہے۔ پہلے تو اپسرس بالاترین آسمان سے اپنے عاشق کو دیکھ کر مسکراتی تھی لیکن پچھلے ویدوں میں یہ ہستیاں زمین پر اُتر آئی ہیں، جہاں وہ درختوں پر رہتی ہیں اور جھانجھ اور بانسری بجا بجا کر اپنی موسیقی سے فضا کو مترنم کرتی ہیں۔ براہمنڑوں میں ان پریوں کو بہت حسین بیان کیا گیا ہے اور ان کا کام گانا بجانا اور ناچنا ظاہر کیا گیا ہے۔ ویدی زمانہ کے بعد کے لٹریچر میں

یہ مہاراجہ اِندر کی بہشت کی رقاصہ بن جاتی ہیں - رگوید کی پریوں کے صرف گندہرو ہی دلدادہ نہیں ہیں بلکہ اُن سے انسان بھی تعشق کرتے ہیں چنانچہ ایک دریائی پری کا قصہ جس کا نام "اُروشی" ہے، رگوید کے ایک بھجن میں مختصر طور سے مکالمہ کے طور پر درج کیا گیا ہے - پری کہتی ہے :

"فانی انسانوں کے درمیان میں دوسری شکل میں پھرتی رہی - اور چار خزاں کے موسموں میں بہت سی راتیں میں نے بسر کیں"۔ (منڈل ۱۰ - سوکت ۹۵)

"اُروشی" کا عاشق "پُرُورَوس" التجا کرتا ہے کہ واپس آجائے لیکن اُس کی التجا نامنظور کی جاتی ہے - تاہم اُس کو یہ مژدہ دیا جاتا ہے کہ وہ زندگی جاوید حاصل کرے گا - یہی قصہ "شت پتھہ براہمنڑ" میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے - ایک خاص شرط پر "اُروشی" "پُرُورَوس" کے ساتھ رہنے لگی ہے لیکن گندھرو کا گروہ تاک میں رہ کر شرط قایم نہیں رہنے دیتا اور اُروشی غائب ہو جاتی ہے پرورَوس تلاش میں نکلتا ہے اور بالآخر وہ ایک ایسی جھیل کے کنارہ پر پہونچتا ہے جہاں "اُروشی" اور پریوں کے ساتھ ایک دریائی پرند کی صورت میں اُس کو نظر آتی ہے - اُروشی اُسوقت اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے اور عاشق کی التجاؤں سے اُس کا دل پسیجتا ہے اور وہ ایک سال بعد واپس آنے کا وعدہ کرتی ہے۔ ویدی لٹریچر کے بعد کے زمانہ میں یہی قصہ کالیداس کے مشہور ڈراما "وِکرم اُروشی" کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

رگوید کے بموجب "گندھرو" بھی تنہا شخصیت دریائی پری کی دلدادہ تھی - قریب قریب اسی نام کی (گندریوا) اور ایسی ہی شخصیت اَوِستا میں بھی پائی جاتی ہے - وہاں بھی وہ واحد شخصیت ہے - دونوں جگہ اس ہستی کا تعلق فضائی سمندروں سے ہے - رگوید کے مطابق وہ فضائی گہرائیوں کی عمق میں آسمانی محراب میں سیدھا کھڑا ہے - وہ آسمانی سوم کا محافظ بھی ہے - پچھلے ویدوں میں یہ ایک ہستی متعدد ہستیوں میں ایک طبقہ یا گروہ کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور گندھرو اور اپسرس ایک دوسرے سے وابستہ پیش کئے جاتے ہیں - ویدی زمانہ کے بعد یہ آسمانی گوئیے بنجاتے ہیں اور اندر کی بہشت سے ان کا بھی تعلق ہو جاتا ہے۔

رگوید میں کچھ بھجن ایسے بھی ہیں جن میں گذری ہوئی بزرگ ہستیوں کو مخاطب کیا گیا ہے یا اُن کا ذکر کیا گیا ہے منجملہ اُنکے ایک ہستی ماتر شون ہے - اس کی نوعیت صراحتاً کہیں بیان نہیں کی گئی ہے - کبھی اس سے چمکیلا آسمان مراد لیا جاسکتا ہے - کبھی مخزن آتش، کبھی بجلی - اُس کے کردار کی مخصوص صفت یہ ہے کہ وہ آسمانوں سے آگ لایا اور اُس آگ کو "برگھو" ایک افسانوی قوم کے سپردگی میں دیا - برگھو پجاریوں کا وہ فرقہ یا گروہ تھا جو آگ کی پرستش کرتا تھا اور جس نے آگ کو منوؔ کے حوالہ کیا - (باقی)

ا - ح

مالہ وما علیہ

ماہر القادری

۵ مارچ ۴۷ء کے مدینہ میں جناب ماہر القادری کی ایک غزل "فردوسِ خیال" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے:

اس طرف بھی نظر اے دیدۂ صاحب نظراں — میں نے ذرّوں سے تراشے ہیں ستاروں کے جہاں
ہوش کی کوئی خبر ہے نہ خرد کا ہے نشاں — دل کی منزل میں ہے اب قافلۂ عمر رواں
دل کی چوٹیں کہیں آواز میں ڈھل سکتی ہیں — اتنی پُر سوز ہے اس پر بھی ادھوری ہے فغاں
آہ! وہ ذرّہ نہ ہو جس پہ گمانِ خورشید — ہائے! وہ قطرہ کہ جس میں نہیں جذبِ طوفاں
ہاں! دعا دے مری اس خوش نگہی کو اے دوست — اس سے پہلے ترے جلووں کا یہ عالم تھا کہاں
حُسن تو حُسن محبت کو نہیں یہ معلوم — نفسِ غنچہ بھی ہے دل کی نزاکت پہ گراں
مجھ کو خود اپنی خموشی پہ ترس آتا ہے — کون سمجھے گا زمانہ میں محبت کی زباں
ناوک انداز! ذرا دیکھ کے ناوک فگنی — تیر کے ساتھ ہی ہاتھوں سے نہ چھوٹ جائے کماں
کتنے دل سجدہ گزاری کے لئے جاگ اُٹھے — نالۂ نیم شبی ہے کہ محبت کی اذاں
آہ شب گیری کی زد میں ہے نظامِ مہ و مہر — سینۂ زہرہ و پروں سے نکلتا ہے دھواں
تجھ کو شاید نہ ہو احساس تو میں بتلا دوں — لب رنگیں ہیں ترے جان مسیحا نفساں

اپنے ماہر پہ جفا اور جفا اور جفا
اے جفا ہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے: — "میں نے ذرّوں سے تراشے ہیں ستاروں کے جہاں" — میری رائے میں صحیح نہیں، کیونکہ تراش کر کوئی چیز بنانا اس کا مقتضی ہے کہ وہ چیز جسے ہم تراشتے ہیں، اس سے چھوٹی ہو جس سے وہ تراشی گئی ہے، لیکن اس مصرعہ میں ذرّوں سے ستارے تراشے گئے ہیں، حالانکہ ستاروں کے مقابلہ میں ذرّہ بہت چھوٹی چیز ہے۔ اسلئے تراشے ہیں کی جگہ بنائے ہیں ہونا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ کے قافیہ میں "شایگان جلی" ہے جو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔

دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے :- " دل کی منزل میں ہے اب قافلۂ عمر رواں " ۔ منزل عربی لفظ ہے جس کے معنے " جائے قیام، مکان اور مسکن " کے ہیں - اُردو میں اس لفظ کا استعمال گھر اور مسکن کے علاوہ، اُترنے کی جگہ، پڑاؤ، مرحلہ، اہم کام اور بعید مسافت کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ تمام افعال یا الفاظ انھیں معانی کی رعایت کو سامنے رکھ کر لائے جاتے ہیں، مثلاً منزل طے کرنا، منزل پر پہونچنا، منزل پر اُترنا وغیرہ وغیرہ - ماہر صاحب لکھتے ہیں: قافلۂ عمر دل کی منزل میں رواں ہے، جو صحیح نہیں - "میں" کی جگہ "طرف" ہونا چاہئے، اور اگر "میں" قایم رکھا جائے تو پھر "رواں" کی جگہ "مقیم" ہونا چاہئے -

تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں " چوٹوں کا آواز میں ڈھلنا " کہا گیا ہے - میری رائے میں یہ محل نظر ہے - اس جگہ ڈھلنے کا استعمال ایسے مفہوم میں ہوا ہے جو ہمارے خیال کو سانچہ کی طرف لیجاتا ہے اور آواز کے ساتھ سانچہ کا بعید ترین تعلق بھی نہیں - شاعر کا اصل مدعا یہ کہنا ہے کہ " دل کی چوٹ بیان نہیں کی جاسکتی " اس لئے کہنا یوں چاہئے تھا کہ " دل کی چوٹ آواز نہیں بن سکتی یا آواز میں تبدیل نہیں ہوسکتی " علاوہ اس کے شعر کے دونوں مصرعے بلحاظ مفہوم ایک دوسرے کے متضاد ہیں - پہلے مصرعہ کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل کی چوٹ آواز بن ہی نہیں سکتی، اور دوسرے مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل کی چوٹ نے فغاں (آواز) کی صورت اختیار کی ——— گو ادھوری اور ناتمام ہی سہی !

چوتھے شعر کے دوسرے مصرعہ میں بھی "نہیں" کی جگہ "نہ ہو" ہونا چاہئے تھا تاکہ دونوں مصرعوں کے انداز بیان میں تطابق ہو جاتا -

علاوہ اس کے جذب کے استعمال کا یہاں کوئی موقعہ نہیں، جذب کے معنے کھینچنے کے ہیں اور یہاں قطرہ کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے، سیل کا لفظ زیادہ موزوں ہوتا -

پانچواں شعر - مفہوم یہ ہے کہ تیرے جلوؤں کا یہ عالم (یعنی فراوانی) محض میری خوش نگاہی کی وجہ سے ہے، ورنہ تو ایسا نہ تھا اور نہ تیرے جلوے ایسے - اس مفہوم سے محبوب اور حُسنِ محبوب کی تنقیص ظاہر ہوتی ہے، جو مسلک شاعری کے منافی ہے - علاوہ اس کے خوش نگاہی کا استعمال بالکل غلط ہوا ہے -

فارسی میں خوش نگاہ محبوب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور محبوب کے چشم و مژگاں کے لئے بھی - اس لئے خوش نگاہی محبوب کی صفت ہوسکتی ہے نہ کہ عاشق کی - ماہر صاحب نے خوش نگہی کا استعمال " حُسنِ ظن " کے مفہوم میں کیا ہے جو کسی طرح درست نہیں ہوسکتا -

چھٹا شعر - مفہوم کے لحاظ سے ناقص ہے - اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے، اور یہ ظاہر کرکے کہ " نفسِ غنچہ " بھی دل کی نزاکت پر گراں ہے، شاعر کس چیز سے محبت کو باز رکھنا چاہتا ہے - ہاں اگر پہلے مصرعہ میں

آہ و فغاں یا نار و زاری سے روکا جاتا تو بیشک دونوں مصرعوں میں ربط ہو سکتا تھا۔

ساتویں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ زمانہ میں محبت کی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں اس لئے اپنی خموشی پر ترس آتا ہے، حالانکہ اس حالت میں "قوت گویائی" پر ترس آنا چاہئے جس کا حوصلہ پورا نہیں ہو سکتا۔

آٹھویں شعر میں تیر کے ساتھ کمان کا ہاتھ سے چھوٹ جانے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا کوئی سبب مصرعۂ اول میں ظاہر نہیں کیا گیا۔ مصرعۂ اول میں یا تو محبوب کی نزاکت کا ذکر ہونا چاہئے تھا یا خود اپنی کسی ایسی کیفیت کا جس سے متاثر ہو کر محبوب کے ہاتھ سے کمان چھٹ جانے کا امکان ہوتا۔

دسویں شعر میں اول تو آہِ شب گیری کی جگہ آہ شب گیر ہونا چاہئے تھا، نہ اس خیال سے کہ یائے نسبتی کی ضرورت نہیں بلکہ آہِ شب گیری بالکل غلط ہے۔ ماہر صاحب نے شب گیر کے معنے غالباً شب رو یا شب زندہ دار سمجھے ہیں، یا اس سے مراد ان کی صرف وہ آہ ہے جو رات کو کی جائے اور دونوں معنے کے لحاظ سے اس لفظ کا استعمال غلط ہوا ہے فارسی میں شب گیر کے معنی رات کے اُس پچھلے پہر کے ہیں جس کے بعد صبح ہوتی ہے اور اسی لئے نالۂ شبگیر نالۂ صباحی کو کہتے ہیں۔ محض نالۂ شب کے معنے میں نالۂ شبگیر کبھی نہیں آتا اور شبگیری تو بالکل ہی غلط ہے۔

علاوہ اس کے جب خود نظام مہ و مہر آہ کی زد میں ہے تو پھر زہرہ و پرویں کا ذکر ایک نوع کا تنزل ہے۔

گیارھواں شعر مفہوم کے لحاظ سے ناقص ہے کیونکہ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر نے لب رنگیں کو جان مسیحا نفساں" کس معنی میں ظاہر کیا ہے اگر کنایہ بوسہ لینے کی طرف ہے تو اس صورت میں ماہر صاحب خود کو مسیحا نفس قرار پائیں گے علاوہ اس کے قافیہ میں شایگان جلی ہے جو سخت عیب سمجھا جاتا ہے۔ شایگان کی دو قسمیں ہیں ایک خفی دوسرا جلی۔ شایگان خفی اس کو کہتے ہیں کہ قافیہ میں الف و نون فاعلی معنے دیں اور یا و نون نسبتی ہوں، جیسے باراں و کماں کے ساتھ گریاں و خنداں یا دیں اور زمیں کے ساتھ سمیں و آتشیں قوافی کا استعمال۔

شایگان جلی اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب قافیہ میں الف و نون جمع کے ہوں جیسے یاراں، دوستاں وغیرہ۔ ماہر صاحب کے شعر میں نفساں کا الف و نون جمع کا ہے اس لئے شایگان جلی ہے، جو بہت معیوب ہے۔

ضرورت رشتہ

ایک نوجوان سُنّی مسلمان جن کی عمر تقریباً ۲۵ سال ہے اور ۲۲۵ روپیہ ماہوار کے سرکاری ملازم ہیں یو۔پی میں مناسب رشتہ کے خواہش مند ہیں۔ مزید تفصیلات کے لئے:

"احمد" پوسٹ بکس نمبر 2763۔ کلکتہ کو لکھئے

باب الاستفسار

فراق گورکھپوری اور کماری شیلا

(سید افسر حسین صاحب۔ دہلی)

جناب من۔ تسلیم۔ آپ نے اگر رسالہ شاعر میں حکیم راغب مرادآبادی کا مضمون فراق کے متعلق نہ پڑھا ہو تو اب پڑھ لیجئے، یا مجھے اجازت دیجئے کہ اس کا خلاصہ پیش کروں۔

فراق صاحب سے دہلی کی کسی خاتون نے خواہش ظاہر کی کہ وہ انکے کلام کو بنظر اصلاح دیکھ لیا کریں اور اس سلسلہ میں ۱۵ اگست ۴۴ء سے ۱۰ اکتوبر ۴۵ء تک دونوں میں خط و کتابت جاری رہی، ہمیں نہیں معلوم کہ خاتون نے انھیں کیا لکھا لیکن فراق صاحب نے جو کچھ لکھا، وہ اب منظر عام پر آچکا ہے اور انھیں خطوط کو سامنے رکھ کر حکیم راغب صاحب مرادآبادی نے فراق کے کیرکٹر پر روشنی ڈالی ہے۔

حکیم صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں آپ ہی سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ایسے خط لکھنے والے کے متعلق کیا رائے قایم کریں گے۔

ایک طرف تو فراق صاحب یہ دعوی کرتے ہیں کہ نہ صرف شاعری بلکہ نثر کے ذریعہ سے بھی انھوں نے ہمیشہ شرافت پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے (ملاحظہ ہو نگار اکتوبر ۴۶ء) اور دوسری طرف جب وہ ایک خاتون کو خط لکھتے ہیں تو ایک اوباش سے زیادہ اور کچھ نظر نہیں آتے۔

ان خطوط کے بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں:

آپ کے خط نے میرے اندر وہ طوفان اُٹھا دئے جن سے میں بہت ڈرا ہوا ہوں، بجائے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے شکایت کرنے کو جی چاہتا ہے ——— ہدایہ، میں کتنا ہی بڑا اور مشہور شاعر اور آدمی سہی اور عشقیہ شاعری کا سب سے بڑا پیغمبر سہی، بلند ترین تعلیم و پیشہ اور کافی فارغ البال سہی، لیکن میری زندگی ایک ایسا عذاب ہے جس کا تجربہ میں اپنے دشمن سے دشمن کو بھی نہیں چاہتا کہ ہو۔ زندگی میں مجھے سب کچھ ملا، جیون ساتھی کوئی نہیں ملا۔ اگر جیون ساتھی بن کر کوئی میری صلاحیتوں سے فیض یاب ہونا چاہے تو اسے آسمان ادب کا سب سے زیادہ

درخشندہ ستارہ بنا سکتا ہوں۔ ارے، یہ میں کہ گیا، ایسا ممکن بھی ہے؟"

منقولہ بالا سطور میں فراق نے جس بدتمیزی سے اپنی تعریف کی ہے اور جس مکاری سے اس غریب لڑکی کو پھسلایا ہے، اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے:

"کبھی مجھ سے میری شاعری و شہرت کو بھلا کر بھی ملنا چاہا ہوگی، تم نے مجھے خط لکھا ہی کیوں؟ - تم میری عالمگیر شہرت کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہو۔ ہم لوگ کبھی ملیں گے بھی تو جدا ہونے کے لئے؟"

ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو:

"اچھا سنو، پہلی یا دوسری اکتوبر ۵۶ء کو اگر میں دہلی پہونچ جاؤں، تو کیا تم مجھ سے وہاں مل سکوگی۔ میں تمھارے گھر پر تم سے پہلی ملاقات نہیں کروں گا، بلکہ جہاں میں ٹھہروں وہیں یا کسی اور جگہ تمھارے گھر کے سوا ملاقات کرنے کے لئے طیار ہوں —— اپنے ساتھ اپنی شایع شدہ کتابیں لیتا آؤں گا اور اپنے ہاتھ سے تمھیں دوں گا اسکے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟"

چونکہ فراق صاحب سے آپ زیادہ واقف ہیں اور اُن کے مداح بھی ہیں، اس لئے میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کس قسم کا انسان ہے اور ان کی جنسی شاعری کو کیوں نہ انھیں ذلیل جذبات کا عکس سمجھا جائے؟

(**نگار**) رسالہ شاعر کی جس اشاعت کا آپ نے ذکر کیا ہے، اسے میں دیکھ چکا ہوں اور حکیم راغب مرادآبادی کے اس مقالہ کا بھی مطالعہ کر چکا ہوں جس کا ذکر آپ نے کیا ہے۔

اگر حکیم صاحب موصوف کا یہ مضمون شایع نہ ہوا ہوتا اور یہ خطوط پبلک میں نہ آ گئے ہوتے، تو میں خود نہ ان اطلاعات پر کبھی اعتناء کرتا اور نہ اس مقالہ کو شایع کر کے، فراق کی ذاتیات کو زیر بحث لاتا، لیکن چونکہ رسالۂ شاعر کے مدیر فراق صاحب سے خوش نہیں ہیں، اس لئے انھوں نے اس مقالہ کو شایع کر دیا اور اب پبلک میں آنے کے بعد ہر شخص کو موقعہ ملگیا کہ وہ اس پر رائے زنی کرے۔

آپ کی طرح اور بھی بعض حضرات نے اس مقالہ کو دیکھ کر مجھ سے استفسار کیا ہے کہ میں اس باب میں اظہار خیال کروں اور میں یقیناً نگار کے صفحات کو اس ذکر سے آلودہ نہ ہونے دیتا، اگر حکیم راغب صاحب اور حکیم صاحب سے زیادہ خود رسالۂ شاعر کا طرزِ عمل میرے نزدیک قابل اعتراض نہ ہوتا۔

اگر یہ صحیح ہے کہ یہ خطوط فراق صاحب ہی کے لکھے ہوئے ہیں (اور اس کی صحت پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں) تو اس سے یہ بات تو بیشک ثابت ہوتی ہے کہ فراق کسی مضبوط کیرکٹر کے انسان نہیں ہیں، اور وہ کبھی کبھی اس پندار میں بھی

مبتلا ہو جاتے ہیں جس کی توقع ایک وسیع ظرف رکھنے والے شخص کی طرف سے نہیں ہو سکتی، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کو ان کی ان ذاتی کمزوریوں کو پبلک میں لانے اور ان پر رائے زنی کرنے کا کیا حق حاصل ہے، جبکہ وہ ایک معلم اخلاق، یا مصلح و ریفارمر کی حیثیت سے پبلک میں کبھی نہیں آئے۔

اگر آج وہ سیاسی لیڈر ہوتے، یا کسی آشرم کے مہنت، کسی خانوادۂ فقر و تصوف کے سجادہ نشین ہوتے یا کسی مندر کے پوجاری تو بیشک ہم کو حق پہونچ سکتا تھا کہ اُن کی بداخلاقیوں اور مخاشیوں کو ظاہر کر کے انھیں اس مذہبی یا روحانی و اخلاقی منصب سے علحدہ کر دیتے، لیکن جب انھوں نے محض ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کیا ہے تو ہم کو ان کی شاعری کے حدود کے اندر ہی ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

جس وقت میں نے شاعر میں یہ مقالہ پڑھا، اسی وقت مجھے شبہ ہوا تھا کہ جن خطوط کا جواب فراق نے لکھا ہے وہ قطعاً کسی خاتون کے نہیں ہیں، بلکہ کسی مرد کے لکھے ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ یہ خطوط شدید ترغیبات سے لبریز ہوں گے تاکہ فراق ان کے جواب میں پوری طرح کھل کھیلیں اور انھیں بدنام کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہاتھ آئے۔ چنانچہ میں نے فراق سے دریافت کیا کہ کیا واقعہ ہے، تو انھوں نے جواب میں شیلا کماری کا ایک خط مجھے بھیج دیا اور اس کو پڑھنے کے بعد میرے تمام شبہات یقین میں تبدیل ہو گئے۔

فراق صاحب سے معلوم ہوا کہ شیلا کماری کے دس بارہ خطوط انھیں ملے جو شدید ترین ترغیبات سے معمور تھے لیکن ان میں سے صرف ایک اتفاق سے محفوظ رہ گیا۔ جو یہاں درج کیا جاتا ہے:-

شفقت فرمائے شیلا!

آداب و نیاز۔

مزاج گرامی - محبت نامہ وصول ہو گیا تھا میں اب تک بیمار، اور زندگی سے بیزار ہوں لیکن بقول کسے ؎

موت پر قابو مصیبت میں نہ امکانِ حیات
غور کرتی ہوں کہ انساں کس قدر مجبور ہے

یہ سلسلہ تو نجانے کب ختم ہو گا فی الحال تو قدرت کی ستم ظریفیوں اور نیرنگیوں کو دیدۂ عبرت نظر سے دیکھ رہی ہوں اور شعبدہ باز ازل کے کمالِ فن کی داد دے رہی ہوں۔

جہاں تک میری یادداشت ساتھ دیتی ہے میں نے یہ لکھا تھا کہ "میں ابھی زیب النساء کے اسٹیج میں ہوں اور آئندہ رہنا بھی پسند کرتی ہوں مگر مستقبل کا علم کسے ہے" لہٰذا آپ کا یہ خیال کہ "ایک تو زیب النساء کے اسٹیج میں ابتک اور آئندہ بھی بنے رہنے کی اجازت آپ کے والدین نے دے رکھی ہے اور مناسب جیون ساتھی سے وابستہ ہو جانے میں رکاوٹ بھی ان کی سنتے ہوئے ہے" صحیح نہیں۔ آپ نے میرا خط شاید بغور نہیں پڑھا ورنہ یہ خیال پیدا نہ ہوتا میری یہ خواہش محض اس وجہ سے ہے

کہ کسی نااہل کے دامن سے وابستہ ہونے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ زندگی صبر و شکر سے اسی طرح گزار دی جائے۔ لیکن میں اسے اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھوں گی اگر مجھے کسی باکمال انسان کے دامن سے وابستہ کر دیا جائے۔

اگر پرماتما کو منظور ہوا تو مجھے زود یا بدیر آپ کی قدم بوسی کا شرف ضرور حاصل ہوگا۔ میں عنقریب بشرطِ صحت و زندگی کوئی ملنے کی صورت پیدا کروں گی۔ صبر بقول سعدیؔ ؎

گرچہ تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

میں نے "آجکل" میں حضور کی چند کتابوں کا اشتہار دیکھا تھا، روحِ کائنات اور زاویئے، روحِ کائنات کے متعلق تو یہ پتہ چلا کہ ابھی اشاعت پذیر نہیں ہوئے۔ لیکن زاویئے دہلی میں نہ مل سکے۔ اگر آپ کے پاس ہوں یا آپ کسی بُک سیلر سے بھجوا سکیں تو میں گرانبار احسان ہوں گی۔ بذریعہ وی۔پی بھجوا دیجئے گا۔ میں یہ جواہر پارے حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہوں۔

حضور کے پاکیزہ اشعار کے متعلق میرا اظہارِ خیال کرنا ہرگز بے ادبی ہے لہٰذا بصد ادب و معذرت اتنا عرض کرتی ہوں کہ ایک ایک شعر ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

کا مصداق ہے، پرماتما حضور کو صد وسی سال سلامت رکھے اور جملہ مکروہات سے رفع فرمائیے۔ ضعف کی وجہ سے زیادہ لکھنے سے معذور سی ہوں لہٰذا آج اسی پر اکتفا کرتی ہوں۔ اشعار بغرضِ حک و اصلاح مرسلِ خدمت ہیں۔

آپ کی شیلاؔ

سوشیل کماری شیلاؔ۔ اشرف منزل۔ جانسن روڈ۔ قرول باغ۔ دہلی

ہر شخص بادنیٰ تامل سمجھ سکتا ہے کہ یہ خط کسی ہندو خاتون کا نہیں ہو سکتا۔ اول تو سوادِ خط بہت پختہ پیشہ ور کاتبوں کا سا ہے، جو عام طور پر مردوں کا بھی نہیں ہوتا چہ جائیکہ عورت۔ علاوہ اسکے زبان اور اندازِ تحریر دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط کسی مسلمان مرد کا لکھا ہوا ہے اور ایک آدھ جگہ پرماتما کا لفظ محض اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ اس میں "ہندویت" پیدا کی جائے، لیکن فراقؔ، جو اپنی جنسیاتی زندگی کے لحاظ سے یکسر تشنہ و ناکام رہے ہیں، جذبات سے مغلوب ہو گئے اور ان تحریروں کو واقعی ایک ہندو خاتون کے اعترافاتِ محبت سمجھ کر، عنانِ صبر و ہوش ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے اور بے اختیار ہو کر جواب میں بہت سی باتیں ایسی لکھ گئے، جو واقعی نامناسب تھیں۔ اگر فراقؔ کی جگہ کوئی دوسرا پختہ کار شخص ہوتا تو وہ ان خطوط کا جواب نہایت سنجیدگی سے دیتا اور تاوقتیکہ اس کا یقین نہ ہو جاتا کہ لکھنے والی واقعی کوئی عورت ہے اور جو کچھ لکھتی ہے اس میں تصنع و تکلف نہیں ہے کبھی اپنے جذبات کو بے پردہ نہ کرتا۔ اسلئے مجھے فراقؔ کی ان تحریروں کو دیکھ کر افسوس اس کا نہیں ہوا کہ انھوں نے کیوں ایسے خطوط لکھے بلکہ صرف یہ کہ غریب کو رندی و شاہد بازی کا کبھی تجربہ نہیں۔

یہ تو ہوا گفتگو کا وہ پہلو جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پلاٹ خاص طور سے فراقؔ کو بدنام کرنے کے لئے طیار کیا گیا، اور یہ

حرکت میرے نزدیک فراقؔ کی تحریروں سے زیادہ قابلِ ملامت ہے لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اس کو صحیح سمجھ لیں، تو بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی اخبار یا رسالہ کو اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ دنیا میں خدا معلوم اس قسم کی تحریریں کتنی لکھی جاتی ہیں اور اس سے بھی زیادہ علی فحاشیاں آگرہ و دہلی کے بازاروں میں روز ہوتی رہتی ہیں، لیکن ان کا ذکر کبھی نہیں کیا جاتا، پھر فراقؔ کے ان خطوط پر کیوں توجہ کی گئی، محض اس لئے کہ ان کی اخلاقی کمزوریوں کو سامنے لاکر پبلک کو ان کی طرف سے متنفر کیا جائے، حالانکہ اگر حکیم راغب صاحب کے نفس و حالات کا احتساب کیا جائے تو ممکن ہے اُن کی زندگی میں اس سے زیادہ مکروہ واقعات مل جائیں۔

فراقؔ کے متعلق ہم کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے گفتگو کرنا چاہئے اور اگر ان سے انکی شہرت کا انتقام لینا ہی ہے تو صرف انکے نقایص شعری کو سامنے لانا چاہئے۔ ان کے اخلاق پر حملہ کرنا یا ان کی ذاتی کمزوریوں کو سامنے لانا، نہ صرف یہ کہ دیانتِ صحافت کے منافی ہے، بلکہ خود اپنی اخلاقی پستی کی بھی نمائش کرنا ہے۔

اگر شاعر ہونے کی حیثیت سے فراقؔ واقعی قابلِ قدر ہستی ہے تو وہ ان واقعات کے بعد بھی ویسا ہی رہے گا، اور اگر اس کی شاعری جنس کاسد ہے تو آپ فنا ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ فراقؔ بھی ــــ سعدیؔ کا تقدس باوجود شاعرانہ فواحش کے بدستور قایم ہے، اور میرؔ، سوداؔ، انشاؔ، جراتؔ وغیرہ بہت سے اساتذہ اب بھی شاعرانہ حیثیت سے اُستاد ہی مانے جاتے ہیں، گو ان کے کلام میں اخلاق شکن باتوں کی کمی نہیں۔ رہے دورِ حاضر کے اساتذۂ شعر و ادب، سو ان کا ذکر ہی فضول ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر کی اخلاقی حالت اس قدر گری ہوئی ہے کہ شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فراقؔ کے کلام میں فنی و لسانی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور اگر فراقؔ کی شاعرانہ عظمت کو مجروح کرنا ہے تو ان کے اغلاط و اسقامِ شعری ہی کو پیش کرنا چاہئے، جیسا کہ میں نے ایک بار مدیر شاعر کو لکھا بھی تھا لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے یہ تو کیا نہیں بلکہ دوسرا طریقہ اختیار کیا جو یقیناً معیوب و مکروہ ہے۔

رہا میرا ذاتی خیال فراقؔ کی شاعری کے متعلق، سو اسے میں اس سے قبل بھی ظاہر کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ انکے کلام میں یقیناً بعض فنی نقائص و اسقام پائے جاتے ہیں، وہ ایک حد تک شاعرانہ پندار میں بھی مبتلا ہیں اور اپنے تفوق کے اظہار میں وہ کبھی کبھی بہت نیچی سطح پر بھی آجاتے ہیں، لیکن باوجود اس کے ان کے فطری شاعر ہونے میں کلام نہیں اور اگر انھیں واقعی کوئی رہبر مل جاتا، تو آج وہ بہت بڑا شاعر ہوتا، کیونکہ باوجود اس بے راہ روی کے بھی نزاکتِ خیال، علوئے جذبات اور ندرتِ بیان کی ایسی عجیب و غریب مثالیں، اس کے کلام میں ملتی ہیں کہ ہم اس کے تمام نقایص کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ اسوقت کے غزلگو شعرا میں فراقؔ کی انفرادیت کو کوئی دوسرا شاعر چیلنج نہیں کر سکتا ــــ شیلا کماری کے اس خط کے متعلق ہم تحقیق کر رہے ہیں اور غالباً آیندہ اشاعت میں بتا سکیں گے کہ اس ذلیل حرکت میں کس کس کا ہاتھ شامل تھا۔

ہنگامۂ لاہور پر دو آنسو

میرے عزیز دوست حکیم اقبال حسن صاحب نے جو بزمِ اخوت" لاہور کے سکریٹری بھی ہیں، اس دوران میں مجھے دو خط لکھے، جو بجنسہٖ شایع کئے جاتے ہیں۔ آپ بھی ان کو پڑھئے اور اگر جی چاہے تو کسی وقت سوچئے کہ کیا انسانیت کے بیدار کرنے کے لئے خدا کی طرف سے کسی اور سخت وعید کی ضرورت ہے۔ نیاز

لاہور۔ ۱۱ر مارچ

۲۰ر فروری کو جناب کی خدمت میں ایک عریضہ اور ایک پارسل خطبہ کی کاپی کا بھیجا تھا، امید ہے مل چکا ہوگا۔ مگر تا حال رسیدگی کی اطلاع سے محروم ہوں۔ ادھر پنجاب میں کچھ دنوں سے جو حال ہے وہ بیان کے قابل نہیں۔

پنجاب! وہی مرغزارِ شعر و نغمہ وہی وادیٔ بہار و حسن جس کے متعلق غنیمت نے کہا تھا ؂

چہ پنجاب انتخابِ ہفت کشور
قسم خوردہ بخاکش آبِ کوثر

اس کا آج یہ حال ہے کہ وہاں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ جہاں پہلے حسن و شباب کے مجسّمے محوِ خرام تھے، وہاں اب سوختہ ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آتے ہیں۔ نسوانی مسکراہٹیں آنسو بن کر آگ کے دھوؤں میں تحلیل ہو گئیں، بچوں کے معصوم قہقہے مخدوش و مہلک فضاؤں میں گم ہو کر رہ گئے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ کوئی ہندو ہے اور کوئی مسلمان۔ یہ کون ہے؟ مسلمان! ۔اس کا سر قلم کر دو۔ یہ کون ہے؟ ہندو! اس کے سینہ میں چھری پیوست کر دو۔ خدا جانے ہماری یہ مذہبیت ہمیں کہاں پہونچائے گی ؂

جس بات کا ڈر تھا ہو کے رہی منہ خون سے دھرتی دھو کے رہی
پنجاب کی جنت بالآخر ہر گام پہ کانٹے بو کے رہی
اُف رے، خونِ بشر کی ارزانی

اگر آپ تک یہ عریضہ پہونچ جائے (جس کی بظاہر کوئی توقع نہیں) تو براہِ کرم اپنے حالات سے مطلع فرمائیں، وہاں تو کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ یہاں ہر طرف خوف و ہراس چھایا ہوا ہے۔ تمام دوکانیں اور کاروبار بند ہیں۔ ہر طرف فوج اور پولیس کا پہرہ ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں، کچھ کہا نہیں جاتا۔

لاہور ۱۴؍ مارچ -

معظم و محترم - تسلیم - ایک عریضہ اس سے پہلے خدمت گرامی میں ارسال کیا تھا۔ خدا جانے وہ آپ تک پہونچ سکا ہے یا نہیں - بہر حال خط آپ تک پہونچے یا نہ پہونچے مجھے لکھنے سے کام ہے ——

کس بشنود یا نشنود من ہائے و ہوئے میکنم —— کلکتہ اور بمبئی کے واقعات سے قطع نظر اگر صرف پنجاب ہی کی صورت حالات کا جائزہ لیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ انسانیت اُلٹی زقند لگا کر وحشت کے کوئیں میں جا گری ہے، دلہنوں کے سہاگ لُٹ گئے، بد نصیب والدین کے سامنے ان کے بچے خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر خاموش ہو گئے، بہنیں اپنے پیارے بھائیوں کی جان کنی کا بھیانک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور کی گئیں - عالیشان عمارتیں دیکھتے ہی دیکھتے خاک کا ڈھیر بن کر رہ گئیں کل جو دولت مند تھا آج راکھ کے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں کے سوا کوئی سرمایہ نہیں رکھتا۔ کل جس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی آج آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ خوشی کا انجام دیکھ رہا ہے۔ سارا صوبہ ماتم کدہ بنا ہوا ہے اور ہر انسان اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کر رہا ہے۔

کیا یہ وہی پنجاب ہے جس میں کبھی نانک نے پریم کے میٹھے میٹھے گیت گائے تھے؟ کیا یہ وہی صوبہ ہے جس کی فضا علی ہجویری نے محبت کے نور سے بھر دی تھی؟ کیا یہ وہی علاقہ ہے جس میں میاں میر اور فرید کی عرفانی نوائیں گونجی تھیں؟ کیا یہ وہی جگہ ہے جس کے ذرے ذرے سے محبت کے چشمے اُبلتے تھے - پیار کی نہریں بہتی تھیں، اور صلح و آشتی کے دریا رواں تھے؟ - آہ! یہ سب باتیں اب خواب و خیال ہو گئیں - آج تو انسانیت شکست کھا کر بھاگ رہی ہے اور وحشت اپنی فتح کے پھریرے اُڑاتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے جس طرح بھیڑیا خون پیتے وقت بھیڑوں میں تمیز نہیں کرتا۔ اسی طرح انسان بھی مذہبی دیوانگی کے جوش میں گنہگار و بے گناہ کی تمیز سے آگے بڑھ چکا ہے۔ مسلمان کے گھر پیدا ہونا ہی جرم ہے، ہندو کا فرزند ہونا ہی بڑا گناہ ہے۔ اور سکھ کی صورت میں ظاہر ہونا ہی بدترین قصور ہے۔ اسی جرم، اسی گناہ، اور اسی قصور کی سزا دی جا رہی ہے۔ بربریت وحشت اور شقاوت قلبی کا یہ کتنا گھناؤنا اور بھیانک ثبوت ہے، کہ نہ تو جوانوں کی اُٹھتی جوانی پر رحم کھایا جاتا ہے۔ نہ بوڑھے کے بڑھاپے سے دل پسیجتا ہے، نہ بچے کی معصومانہ ادائیں وحشیانہ جذبات کو متاثر کر سکتی ہیں۔ نہ عورت کا تقدس درندگی پر اثر ڈال سکتا ہے۔ زمین سے آسمان تک وحشت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اس اتھاہ اندھیرے میں انسانیت اپنا منہ چھپا کر روپوش ہو چکی ہے - یاد رکھئے ان واقعات کا اعادہ اس وقت تک بند نہ ہوگا۔ جب تک لوحِ دل مذہبی جنون سے پاک و صاف نہ ہوگی۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا - کہ ہم ایک عزم صمیم لے کر اٹھیں اور ابر رحمت بن کر دنیا پر چھا جائیں؟ کیا ابھی وہ ساعت نہیں آئی کہ ہم دنیا کے کونے کونے تک محبت کا پیغام پہونچائیں؟ کیا ابھی وہ موقع نہیں آیا - کہ بنی نوع انسان کو اس بھڑکتی ہوئی آگ سے بچائیں - اور ان تک اخوت کا سندیسہ پہونچائیں؟

ملتمس
فراق

راستے میں!

(۱۲ فروری ۴۷ء کو دہلی سے بمبئی جاتے ہوئے)

گہرا سا فضا میں چھا رہا ہے
سبزے کا ہے رنگ ہلکا ہلکا
پودوں کے بدن ہیں ادھ کھلے سے
جھکی ہوئی ڈالیوں کے پتے
پیڑوں کے تلے جو چھاؤں سی ہے
پرچم سے کہیں پہ گڑ رہے ہیں
ہے کوئی درخت فیل پیکر
پھولوں سے بھی داد لے رہے ہیں
برگد کے قریب ہیں ببولیں،
باغوں کی سی یاں نہیں سجاوٹ
لوگوں کی چہل پہل نہیں ہے

انجن بھی دھوئیں اڑا رہا ہے
کچھ دھوپ ہے اور کچھ دھندلکا
ہیں شام و سحر ملے جلے سے،
کچھ بول رہے ہیں چپکے چپکے
ذروں کو بھی نیند آ گئی ہے،
خیمے سے کہیں اکھڑ رہے ہیں
پودا کوئی غیرتِ صنوبر
کانٹے بھی بہار دے رہے ہیں
جس طرح سے ہاتھیوں کی جھولیں
ترتیب میں خود ہے اک بناوٹ
دنیا کا فریب چھل نہیں ہے

اٹھے ہیں ادھر، ادھر ہے کھائی
جنگل ہیں یہ کھردری چٹانیں
ہرنوں کی وہ ڈار جا رہی ہے
شاخوں پہ طیور گا رہے ہیں
شہروں سے خوشی جو بچ رہی ہے
دیکھو! وہ جھکی ہوئی ہیں شاخیں
لگتی ہے یہ راستہ کی جھاڑی
طوفاں کی طرح نکل گئے تھے
نظارے جو رخ بدل رہے ہیں
ہے دل میں خوشی بھی اور چبھن بھی

خشکی ہے کہیں، کہیں ترائی
فطرت کی کھلی ہوئی ہیں بانہیں،
صحرا کی بہار جا رہی ہے،
پودے ہیں کہ لہلہا رہے ہیں
جنگل میں بھی دھوم مچ رہی ہے
پڑھتے ہیں درخت بھی نمازیں
گزرے تھے یہاں سے کچھ شکاری
پیروں سے مجھے کچل گئے تھے
پودے مرے ساتھ چل رہے ہیں
تنہائی بھی اور انجمن بھی،

ماہر القادری

غزل: اشعر ملیح آبادی

اب تم بھی نہ ہم کو یاد کرنا، — ہم آج سے جاؤ تم کو بھولے
انگڑائی کو اور طول دے دے — مہتاب سے آئینے کو چھو لے
یہ عشق کا آخری فسوں تھا — ہم آپ کو، آپ ہم کو بھولے
چپ چاپ ہو کیوں؟ ملول کیوں ہو؟ — آئے ہو کہاں سے بھٹکے بھولے
مطرب کوئی گیت! اور غمگیں!! — جو دکھتے دلوں کے تار چھو لے
ہر سانس تری مہکتا گلشن — اب کون پناہ رنگ و بو لے
دنیا کے طلسم کون سمجھے! — کچھ خواب ہیں جیسے بھولے بھولے
اس عشق کی جرأتیں نہ پوچھو — جو حسن کے نرم گال چھو لے

کلام عرشی بھوپالی :-

ہم سے اور ان سے ترک ملاقات ہوگئی
دُنیا جو چاہتی تھی وہی بات ہوگئی

یہ تمکنت یہ زعم، یہ بے وجہ برہمی
اب کون اُن سے پوچھے کہ کیا بات ہوگئی

دو غمزدہ نگاہیں بہم مل کے رہ گئیں،
اکثر تو یوں بھی پرسشِ حالات ہوگئی

اظہارِ غم پہ اور وہ بیگانہ ہوگئے،
کیا بات ہم نے سوچی تھی کیا بات ہوگئی،

روزِ فراقِ یار کی اللہ رہی تیرگی،
یہ بھی خبر نہیں ہے کہ کب رات ہوگئی

دِل نے بنا لیا غمِ جاناں کو زندگی،
لو آج ختم شورشِ آفات ہوگئی

عرشی کچھ اس طرح سے ہوں خوش اُن کو دیکھکر
جیسے ہر اک ستم کی مکافات ہوگئی

مری سمت اک توجہ نہ نگاہِ فاتحانہ
تری بے رُخی پہ صدقے مرا زعمِ عاشقانہ

نہ ہجومِ آہ لب پر نہ فغاں کا ہے ترانہ
کہ سکونِ درد ہے اب تری یاد کا بہانہ

یہ نوازشیں مسلسل، یہ تپاکِ مخلصانہ
کہیں ہو نہ جائے رسوا ترا حسنِ کافرانہ

رہ و رسم مدتوں سے نہیں خوشگوار لیکن
تری یاد سے ہے ابتک وہی ربط غائبانہ

کئی مسکراہٹیں تھیں کئی زندگی کے پہلو
مرے آنسوؤں کی قیمت نہ سمجھ سکا زمانہ

تجھے اپنی زندگی خود ہے بہت عزیز عرشی
مگر اس حسیں نظر کی وہ ادائے والہانہ

غزل : قہر اکبر آبادی

کسی کو ہو خبر کس طرح میرے غم اُٹھانے کی
کہ اس عالم میں بھی عادت ہے مجھکو مُسکرانے کی

دفائے حُسن کے تیور بدل جائیں تو اچھا ہے
مری جانب نگاہیں اُٹھ رہی ہیں اب زمانے کی

ابھی تو رنگ دینا ہے اسیری کی فضاؤں کا
ضرورت ہے قفس میں آشیانے کو جلانے کی

رہے وہ مجھ سے بیگانہ، مگر افسردہ افسردہ
ادا آئی نہ اُن کو آج تک دامن بچانے کی

میں اُٹھنے کو تو اُٹھ آیا ہوں تیرے آستانے سے
مگر حیران ہوں اب۔ کیا ہوئی وسعت زمانے کی

نہیں ہے یہ شکستِ عشق، گر اے دوست چھپکیا ہے
تجھی سے روٹھنا اور کوششیں تجھ کو منانے کی

وہ افسردہ اُدھر اور قہر میں اپنی جگہ نادم
یہ تصویریں ہیں دو ترکِ تمنا کے فسانے کی

غزل: نیساںؔ اکبرآبادی

خوشا کیفیتِ تغافل۔ زہے یہ اندازِ حسنِ اُلفت
نظر جھکائے ہوئے بھی ہیں وہ نظر اُٹھانا بھی چاہتے ہیں

وہ میری حالت سے ہیں پریشاں نہیں ہے کچھ انکا دل بھی خنداں
مگر تبسم کی اوٹ میں وہ اُسے چھپانا بھی چاہتے ہیں

کوئی بتائے کہ کیا کریں ہم۔ عجیب عالم ہے کشمکش کا
خیال و پاسِ خودی بھی ہے اور انھیں بلانا بھی چاہتے ہیں

ہمارے پیشِ نظر ہے کوئی۔ نہیں تصور کی سحرکاری،
ہم اپنے دل کو فریب دیکر یقیں دلانا بھی چاہتے ہیں

نہ پوچھ سوزِ دروں کا عالم۔ ہمارے جوشِ جنوں کا عالم
چراغِ ارماں جلا جلا کر اُنھیں بجھانا بھی چاہتے ہیں

اُنھیں غرورِ جمال بھی ہے۔ مگر ہمارا خیال بھی ہے
وہ آئیں نیساںؔ تو کیسے آئیں۔ مگر وہ آنا بھی چاہتے ہیں

کلام رازؔ یزدانی:

بنا کے رازؔ مجھے دردِ جاوداں کے لئے
مٹائے دیتے ہیں تکمیل داستاں کے لئے

اُٹھا کے ذرے ستارے سے کچھ بکھیر دئے
زمیں سے کچھ بھی نہ چھوٹا جب آسماں کے لئے

چراغِ شمس و قمر میں بھی روشنی نہ رہی
کہاں سے راہ ملی تیرے آستاں کے لئے

کسے نصیب ہے دیر و حرم سے آزادی
کسے بتاؤں کہ نکلا ہوں میں کہاں کے لئے

چمن میں رازؔ نشیمن بنائے ہیں لیکن
کبھی چمن بھی بنایا ہے آشیاں کے لئے

سزا کو جھیلنے والے یہ سوچنا ہے گناہ
کوئی قصور بھی تجھ سے کبھی ہوا کہ نہیں،

یہ سوچنے سے بھی پہلے رہا نہ دل باقی
کہ اُن سے دل کو بچانا بھی ہے روا کہ نہیں،

ہر ایک شے کا تماشہ گناہ تھا لیکن،
سوال یہ ہے کہ میں تجھ کو ڈھونڈتا کہ نہیں،

وفا تو خیر بڑی چیز ہے، میں سوچتا ہوں کہ وہ
جفا کی بھی کبھی زحمت اُٹھائے گا کہ نہیں

جہاں میں رازؔ تری درد کی صداؤں پر
کسی طرف سے کبھی آتی ہے کچھ صدا کہ نہیں

"زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے"

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آج کل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ۔ مشکی قوام۔ الائچی دانہ۔ تیل۔ عطر۔ عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم
کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا
مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ

ٹیلی فون: ہوڑہ ۔ ۴۵۵

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

چند معیاری کتابیں

تاریخ السلام سید میر علی کا مکمل سلیس اور با محاورہ ترجمہ از باری علیگ ۔ عہ

بانگ درا ۔۔۔ اقبال ۔۔۔ للعہ	مقالات جمال الدین افغانی ۔ سلیم ڈی ایم ۔ ۱۲	خودکشی (ناول) ۔۔ ٹالسٹائی ۔۔ ہے
بال جبریل ۔۔ " ۔۔ للعہ	پطرس کے مضامین ۔۔ پطرس ۔۔ ۱۲	افسانۂ زریں " ۔۔۔ اسماء بیگم ۔ عہ
ضرب کلیم ۔۔ " ۔۔ ہے	کچھ لیے کا انجمنا ۔۔ سندباد جہازی ۔ ۱۲	شبِ غم ۔۔ " ۔۔ ایم اسلم
زبور عجم ۔۔ " ۔۔ للعہ	جغرافیہ پنجاب مزاحیہ " ۔ عہ	نان و گل ۔۔ " ۔۔ للعہ
شعلۂ و شبنم ۔۔ جوش ۔۔ صہ	خوفناک دنیا کا حل ۔ سید محمد علیشاہ ۔ ہے	طوفان ۔۔ " ۔۔ ٹیگور ۔۔ ہے
نقش و نگار ۔۔ " ۔۔ ہے	دہلی چلو ۔۔ شورش کاشمیری ۔۔ ہے	نشان راہ ۔۔ " ۔۔ رشید اختر ندوی ۔ عہ
آیات و نغمات ۔۔ " ۔۔ صہ	اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ۔ ڈاکٹر عبداللہ ۔ ۱۲	کانٹوں کی سیج ۔۔ " ۔۔ ہے
شعرستان ۔۔ اختر شیرانی ۔۔ عہ	منٹو کے مضامین ۔۔ منٹو ۔۔ ہے	نسیم ۔۔ " ۔۔ ہے
الطاف کے گیت ۔۔ الطاف مشہدی ۔ عہ	جاہ و جلال ۔۔ تبسم ۔ عہ	محمد بن قاسم " نسیم حجازی ۔۔ عہ
تعلقہ ۔۔ حاجی لقلق ۔ عہ	دروازہ ۔۔ کرشن چندر ۔ ۱۲	حیات محمد علی جناح ۔ رئیس احمد جعفری ۔ عہ
رنگ بست ۔۔ اثر لکھنوی ۔ عہ	گنج ہائے گرانمایہ ۔ رشید احمد صدیقی ۔ ۱۲	غبار خاطر ۔۔ ابوالکلام آزاد ۔۔ للعہ
پیام شباب ۔ قاضی نذرالاسلام ۔ عہ	لیلےٰ کے خطوط ۔ قاضی عبدالغفار ۔ عہ	جرم و سزا ۔۔ باری علیگ ۔ عہ
کلیات فانی ۔۔ فانی ۔۔ ہے	مجنوں کی ڈائری " ۔ عہ	فلسفۂ عجم ۔۔ اقبال ۔ ۱۲
مثنوی شہید ہوس ۔۔ شاد ملیح آبادی ۔ ۱۲	اس نے کہا ۔۔ " ۔ عہ	مزاحیہ ڈرامے ۔ خلیل ۔ ۱۲
نقش چغتائی ۔ دیوان غالب مصور ۔ عہ	جواب ۔۔ کرنل مجید ملک ۔ عہ	گفت و شنید ۔ بشیر ہاشمی ۔ ۱۲

نوٹ: مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

منیجر اردو اکیڈمی لوہاری گیٹ لاہور

فاسد مادہ کے بغیر
جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے
خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر پیٹنکوفر پروفیسر ویانا یونی ورسٹی نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انہوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا۔ وہ کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے، جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لیے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا؟ صرف اس لیے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا۔

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ صافی اسی اصول کے پیشِ نظر تیار کی گئی ہے۔ یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوتِ مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

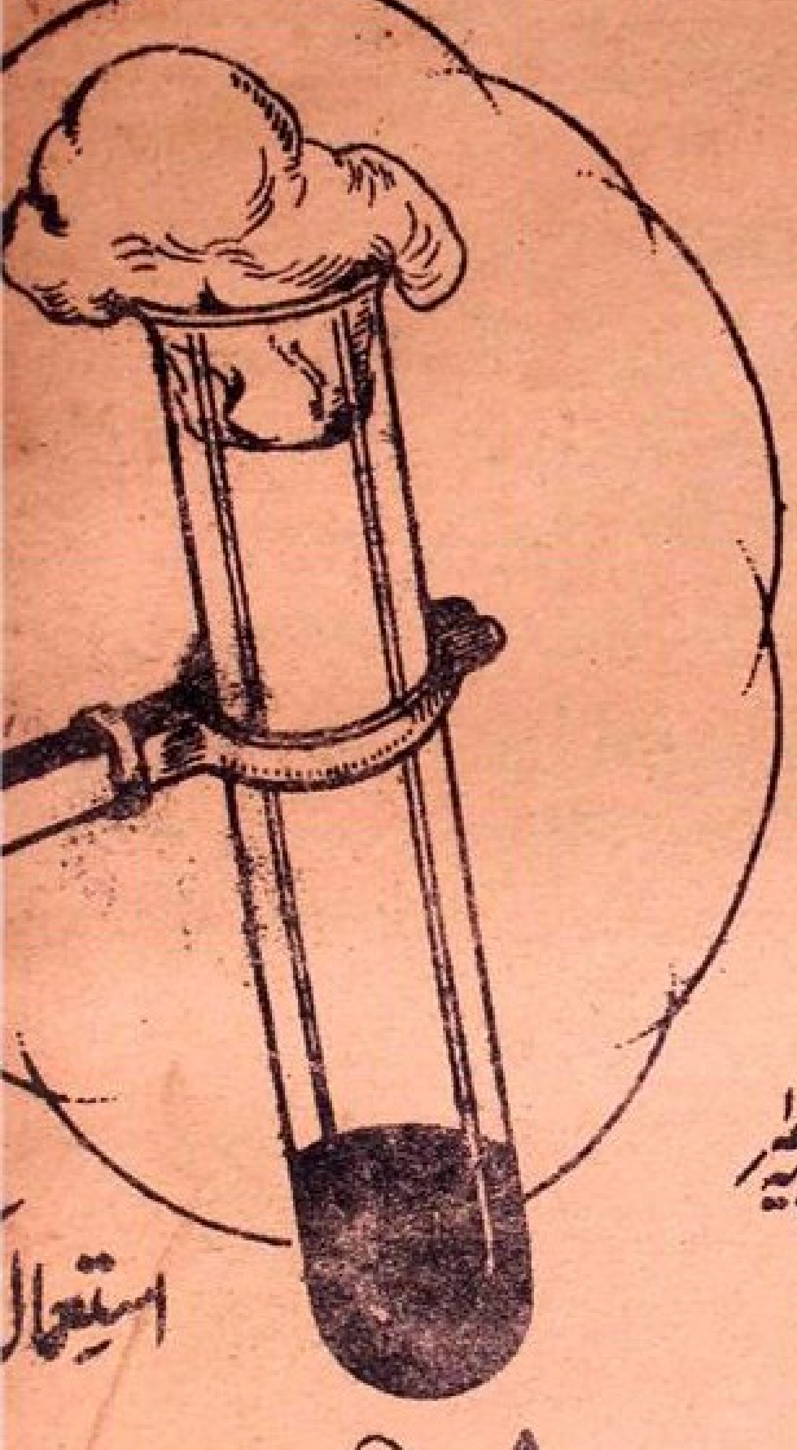

استعمال

قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ

صافی

ہمدرد دواخانہ دہلی

Hamdard

"بزم اخوت" کا دستور العمل معہ خطبہ نیاز فتحپوری اس پتہ سے مفت طلب کیجئے :-

حکیم اقبال حسن معتمد "بزم اخوت"
دربار داتا گنج بخش - لاہور

نگار

مدیر خصوصی : نیاز فتحپوری

شمارہ ۵	فہرست مضامین مئی سنہ ۴۷ء	جلد ۵۱

ملاحظات ---------- ۳
غالب کے غیر مطبوعہ خطوط ------ آفاق دہلوی --- ۵
مودودی صاحب اور مسئلۂ امارت --- شوکت سبزواری -- ۸
جشن ------ منشی ملیح آبادی -- ۲۱
مجنوں گورکھپوری - ایک مطالعہ --- خلش برنی ---- ۲۷
دنیا کیونکر آباد ہوئی ---------- ۳۵
مکتوبات نیاز ---------- ۴۱
قدیم سنسکرت لٹریچر ---- ا - ح --- ۴۴
باب الانتقاد ------ درویش میرٹھی --- ۵۰
نوائے ملت (نظم) پروفیسر شور ۵۶
حیات اور رفیق حیات (نظم) .. اسمٰعیل رفیعی --- ۵۷
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۹

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

مال اور مسافروں کو بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے لکھئے :-

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

بنک اسٹریٹ کلکتہ

اشتہار

فاسد مادّہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے

خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

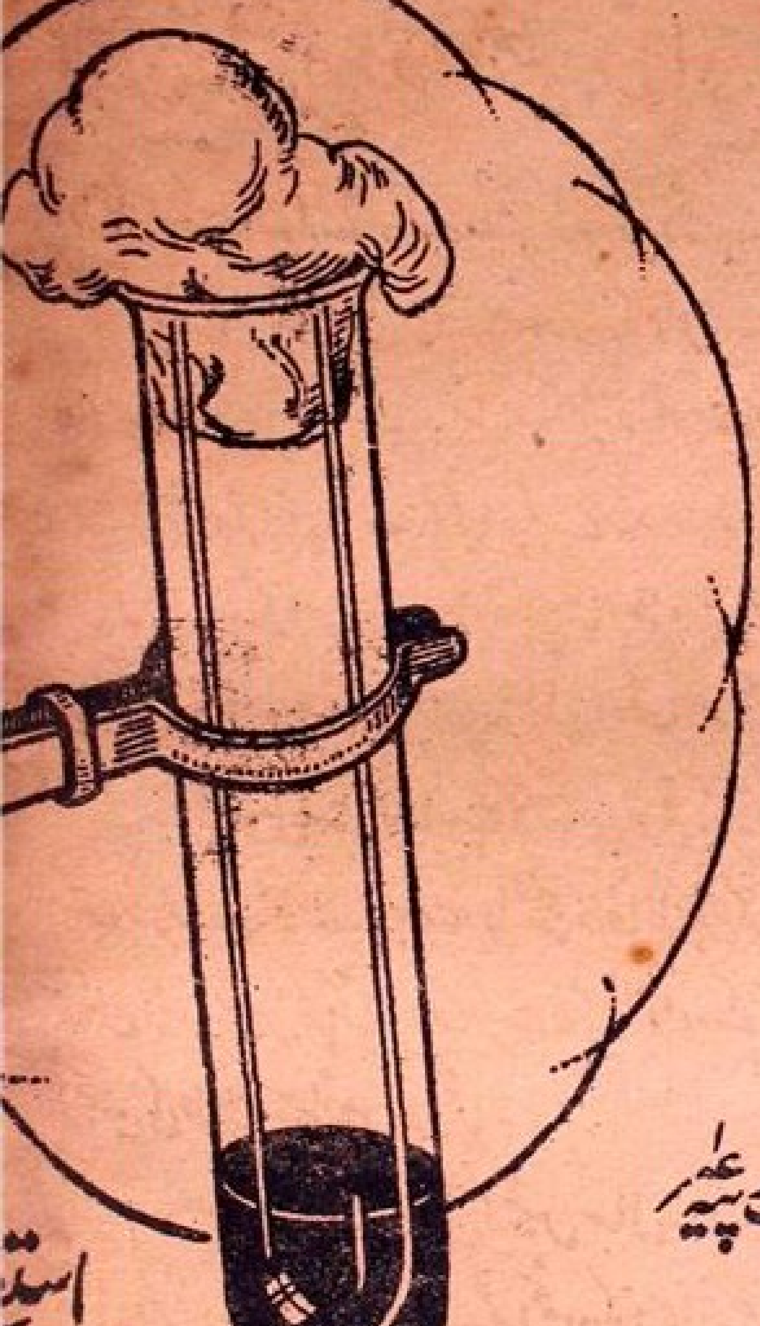

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر پٹینکوفر پروفیسر ویانا یونی ورسٹی نے فیصلہ کرلیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے تو ایک دن انہوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا۔ وہ کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے، جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا، مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائی ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ بھی نہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا؟ صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا۔

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ صافی اسی اصول کے پیش نظر تیار کی گئی ہے۔ یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوتِ مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ ۸؍

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

ملاحظات

انجمن ترقی اُردو اور حیدر آباد کچھ عرصہ سے یہ مسئلہ زیر بحث چلا آرہا ہے کہ انجمن ترقی اُردو کو جو امداد حیدر آباد سے ملتی تھی، وہ کیوں بند کی گئی اور اخبارات حکومت حیدر آباد کے اس طرز عمل پر نکتہ چینی کرتے ہوئے، اُس کو "اُردو دشمنی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

یقیناً یہ مسئلہ کافی اہم ہے اور ہم کو اس سے قبل ہی اس کے متعلق اظہار خیال کرنا چاہئے تھا، لیکن اسوقت تک ہماری خاموشی کا سبب یہ تھا کہ اصل واقعات و حالات ہمارے سامنے نہ تھے اور یہ کچھ مناسب نہ تھا کہ محض افواہ سے متاثر ہو کر اظہار رائے کیا جائے۔

پھر اب کہ اس مسئلہ سے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل ہو چکی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مختصراً بیان کر دیا جائے تاکہ ہر شخص اصل واقعات کے پیش نظر کسی نتیجہ تک پہونچ سکے۔

اول تو یہ بات غلط ہے کہ انجمن ترقی اُردو کی امداد حکومت حیدر آباد نے بند کر دی ہے، حکومت کی طرف سے متعدد بار اس کا اظہار بہت واضح الفاظ میں کیا جا چکا ہے اور اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرنا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا، دوسرے یہ کہ التواء کے جو وجوہ حکومت کی طرف سے بتائے گئے ہیں، ان کا کوئی جواب اسوقت تک انجمن کی طرف سے نہیں دیا گیا۔

اصل واقعات یہ ہیں کہ تیس سال سے زیادہ زمانہ گزرا جب حکومت حیدر آباد نے انجمن کی سرپرستی شروع کی، اول اول بارہ سو روپیہ کی رقم انجمن کو دیجاتی تھی، اس کے چند سال بعد یہ رقم پانچ ہزار ہو گئی۔ سنہ ۳۶ء میں سکریٹری انجمن نے درخواست پیش کی کہ یہ امداد ۴۰ ہزار سالانہ کر دیجائے تاکہ حسب تجاویز اُردو کانفرنس منعقدہ علیگڈھ —— (۱) دُنیا کی مختلف زبانوں کی بہترین قدیم و جدید تصانیف کے ترجمے شایع کئے جائیں —— (۲) مختلف قسم کے لغات اور انسائکلوپیڈیا تالیف کرائی جائیں —— (۳) علمی، فنی اور ادبی نیز عام معلومات اور دلچسپی کی کتابیں کثرت سے مناسب قیمت پر شایع کی جائیں —— (۴) ایک وسیع کتب خانہ قایم کیا جائے جس میں اُردو کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں فراہم کی جائیں —— (۵) زبان کی اصلاح کے لئے ملک کے سربرآوردہ اور مستند ادیبوں کی ایک مجلس قایم کی جائے —— (۶) انجمن کی شاخیں ہر صوبہ اور علاقہ میں قایم کی جائیں —— اسی کے ساتھ سکریٹری انجمن نے یہ وعدہ بھی کیا کہ اس رقم سے انجمن سال بھر میں ۲۵ کتابیں ایسی ضرور شایع کرے گی جو علمی و ادبی اعتبار سے اعلیٰ پایہ کی ہوں گی اور ان کتابوں کے سو سو نسخے جامعہ عثمانیہ میں داخل کرے گی۔

یہ رقم مجلس اعلیٰ جامعۂ عثمانیہ کی سفارش پر ۶ سال کے لئے اس شرط سے منظور کی گئی کہ انجمن ترقی اُردو مجلس اعلیٰ کی ہدایت پر عمل کرے گی اور اپنی کارگزاری کی رپورٹ امیر جامعۂ عثمانیہ کے پاس بھیجتی رہے گی اور اگر جامعہ کی رائے میں ان شرائط کی تکمیل نہ ہوئی تو اسے اس امداد کے بند کرنے یا کم کر دینے کا حق حاصل ہوگا۔

اس امداد کے اجرا کے دو سال بعد ہی، حیدرآباد کے تعلیمی حلقہ نے محسوس کرنا شروع کیا کہ انجمن ان شرائط کو پورا نہیں کر رہی ہے جو عاید کی گئی تھیں، یعنی نہ انجمن نے اتنی کتابیں شایع کیں، جتنی اسے شایع کرنا چاہئے تھیں اور نہ وہ اس بلند معیار کی تھیں جو مقرر کیا گیا تھا، اس احتجاج پر ایک کمیٹی مقرر کی گئی، لیکن چونکہ یہ کمیٹی کی رپورٹ قابل اطمینان نہ سمجھی گئی، اس لئے ایک آزاد کمیشن کے تقرر کا مطالبہ کیا گیا، لیکن یہ مطالبہ پورا نہ ہو سکا اور چھ سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی ۴۲ء میں سکریٹری انجمن نے اس امداد کو دوامی و مستقل کر دینے کی درخواست پیش کی اور اس وقت کے بعض ذی اثر ارباب حکومت کی ہمدردی و اعانت سے اس درخواست پر ۴۸ ہزار سالانہ کی مستقل گرانٹ منظور بھی ہوگئی اور یہ رقم بنک کے ذریعہ سے ہر سال پیشگی ملنے لگی، جس کا حساب سال ختم ہونے پر انجمن کی طرف سے پیش کر دیا جاتا تھا، لیکن اس گرانٹ کی منظوری کے بعد ہی محکمۂ فنانس اور محکمۂ تعلیمات کے درمیان تنقیح حساب کا مسئلہ زیر بحث آگیا اور آخر کار یہ طے پایا کہ انجمن کا خود اپنے حسابات کی تنقیح کرا کے رپورٹ پیش کرنا، منشاء شرائط کے خلاف ہے، حیدرآباد کے محکمۂ حساب کو اپنا اطمینان کر کے ذمہ دارانہ رپورٹ پیش کرنا چاہئے اور اسی کے ساتھ ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی تاکہ غیر جانبداری کے ساتھ انجمن کے کام کی تحقیقات کر کے اسکی اصلاح و ترقی کے لئے مناسب تجاویز پیش کرے — یہ ہیں اصل حالات جنکی بنا پر یہ امداد ملتوی کی گئی ہے — اب رہا یہ امر کہ حکومت نے کیوں یہ احکام جاری کئے، سو قطع نظر اس سے کہ جو حکومت لاکھوں روپیہ کی امداد دیتی ہے اسے اصولاً یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ مصارف کی بھی جانچ کرے، اس کا ایک سبب اور بھی ہے اور وہ یہ کہ حکومت انجمن کے کام کی طرف سے مطمئن نہیں ہے اور نہ اسکے دستور العمل کو قابل اطمینان سمجھتی ہے اور ہمارے نزدیک یہی اصل چیز ہے جس پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے اور جس پر ہم آیندہ اشاعت میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے، لیکن مختصراً اتنا کہنا ضروری ہے کہ التواء امداد کے سلسلہ میں سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے اس وقت تک جو بیانات دئے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ سنجیدگی کے منافی ہیں بلکہ ان کے لب و لہجہ سے خود انجمن کی پوزیشن کو کافی صدمہ پہونچا ہے۔

اگر انجمن کے حسابات صاف تھے اور مولوی عبدالحق کو انجمن کے نظم و نسق اور اسکی کارگزاری کی طرف سے اطمینان تھا تو انھیں نہایت فراخدلی سے تنقیح حسابات اور تقرری کمیشن کا خیر مقدم کرنا چاہئے تھا۔ انکا پہلے ہی سے یہ سمجھ لینا کہ یہ التواء مسدودی امداد کی تمہید ہے، ایسی کمزوری کا اظہار ہے جو مولوی عبدالحق ایسے انسان کی طرف سے ظاہر نہ ہونا چاہئے تھی۔

ماہنامہ "مینا" حیدرآباد دکن کا ایک معیاری، ادبی و علمی ماہنامہ جو جناب سید تمکین الکاظمی کی ادارت میں شایع ہو رہا ہے
چندہ سالانہ چھ روپیہ - قیمت فی پرچہ ۱۰/ — منیجر ماہنامہ مینا مغلپورہ - حیدرآباد دکن

غالب کے غیر مطبوعہ خطوط

یہ تو سب جانتے ہیں کہ مرزا غالب کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور ہر خط کا جواب دینا ان کے مسلک میں واجب تھا - اسلئے ہر چند مرزا کا بہت سا وقت خطوط کے جواب لکھنے میں صرف ہو جاتا لیکن وہ یہ وضع آخر دم تک نباہتے رہے - ۱۸۵۸ء تک جب مختلف احباب کے پاس خطوط کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا تو منشی شیو نرائن اکبر آبادی کو ان خطوط کے چھاپنے کی سوجھی - مرزا نے اس وقت تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ان کا منظرِ عام پر آنا میری شہرت کے منافی ہے، لیکن بھلا احباب اور شاگرد کب خاموش بیٹھنے والے تھے - علاوہ اس کے خود مرزا صاحب پر بھی اپنے اسلوبِ بیان کی برجستگی اور بے تکلفی کی خوبیاں ظاہر ہو گئیں - اور وہ خود بھی اپنے خطوط کی اشاعت کے خواہاں نظر آنے لگے چنانچہ عودِ ہندی ان کی حیات ہی میں شایع ہو گئی، لیکن اُردوئے معلّٰی کی اشاعت کی حسرت مرزا اپنے ساتھ ہی لے گئے -

اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی کو ایک نظر دیکھنے ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مرزا کے کل خطوط کا مجموعہ نہیں - معلوم ہوتا ہے کہ خطوط کی ایک بڑی تعداد فراہم نہ ہو سکی - میں نے جن خطوط کو زیبِ عنوان بنایا ہے وہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مرزا غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو لکھے تھے اور جسے میر مہدی مجروح اور میرن صاحب ترتیب دے رہے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ جب مولانا حالی نے یادگارِ غالب لکھی تو یہ مجموعہ ان کی نظر کے سامنے تھا - یادگارِ غالب میں مولانا نے جگہ جگہ ان خطوط کے اقتباسات درج کئے ہیں اور ایک جگہ تو ایک پورا دلچسپ اور مختصر خط نقل کر دیا ہے -

اُردوئے معلّٰی کی طباعت کا ارادہ ۱۸۶۳ء میں ہوا - منشی نبی بخش حقیر ۱۸۵۹ء میں وفات پا چکے تھے - اسلئے حقیر کے نام کے خطوط بھی اس میں شامل ہو سکتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط تمام و کمال فراہم نہیں ہوئے اور اسی لئے کہ اُردوئے معلّٰی میں منشی نبی بخش حقیر اور ان کے بیٹے منشی عبداللطیف کے نام کے صرف تین خطوط نظر آتے ہیں - میرے پاس جو غالب کے خطوط کا مجموعہ ہے اس میں ۵۰ خطوط ہیں - جو اُردوئے معلّٰی کی اشاعت کے بعد فراہم ہوئے -

مرزا غالب، منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی اور سخن سنجی کے بڑے مداح تھے اور منشی صاحب کی فرمائش پر اپنی نظم و نثر ان کو بھیجدیا کرتے تھے - خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہر نیم روز کے ہر جزو کی نقل مرزا نے منشی صاحب کے پاس بھیجی - جب کچھ عرصہ تک مرزا مہر نیم روز کے کچھ جزو منشی صاحب کے پاس نہ بھیج سکے تو منشی صاحب نے شکایت کی - مرزا صاحب جواباً

فرماتے ہیں:

"بھائی صاحب۔ کیسی تاریخ اور کیسی نقل۔ کیا فرماتے ہو۔ پہلے مجھ سے حقیقت تو پوچھ لیا کرو۔

میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جو نظم و نثر تمھاری نظر سے نہ گزرے وہ ضائع ہے ؎

وائے بر جانِ سخن گر بہ سخنداں نہ رسد"

مرزا صاحب نے منشی صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کے متعلق ایک فارسی خط مرزا تصدق کو لکھا تھا جو پنج آہنگ میں موجود ہے۔ اس دلچسپ خط کا خلاصہ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں درج کیا ہے۔

منشی نبی بخش حقیر علیگڑھ میں سررشتہ دار تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور مرزا غالب سے اصلاح لیتے تھے ان کے اشعار تذکرہ بزمِ سخن۔ نغمۂ عندلیب اور سخنِ شعراء وغیرہ میں درج ہیں۔

حقیر کے نام کے خطوط سب سے زیادہ روشنی مہرِ نیمروز پر ڈالتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس امر پر بھی کہ اردو میں غالب کی مکتوب نگاری کب سے شروع ہوتی ہے۔ مولانا حالی کا خیال ہے کہ جب مرزا مہرِ نیمروز لکھنے کی خدمت پر مامور ہوئے تو انھیں مجبوراً اُردو میں مکتوب نگاری شروع کرنی پڑی۔ اس طرح مولانا حالی کے نزدیک مرزا نے سنہ ۱۸۵۰ء سے اُردو مکتوب نگاری شروع کی۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے اس رائے سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن مہر نے ثابت کیا ہے کہ مرزا نے دسمبر سنہ ۱۸۴۸ء کے آخر میں یا جنوری سنہ ۱۸۴۹ء کے شروع میں منشی جواہر سنگھ جوہر کو بھی ایک اُردو کا خط لکھا تھا۔ لیکن میرے پاس جو مجموعۂ خطوط ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض خطوط غالب نے جون سنہ ۱۸۴۸ء میں بھی لکھے تھے۔

اتنا تو مرزا کی اُردو کی مکتوب نگاری کی تاریخ کے باب میں تھا۔ اب مہرِ نیمروز کی ترتیب و تحریر کے متعلق سنئے۔ خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ مہرِ نیمروز تین ٹکڑوں میں لکھی گئی۔

پہلا حصہ ۔ از امیر تیمور تا ہمایوں ۔ یہ حصہ ۲۸ مارچ سنہ ۱۸۵۱ء سے پہلے مکمل ہو چکا تھا۔

دوسرا حصہ ۔ از ابتدائے آفرینش تا چنگیز خاں ۔ یہ حصہ جولائی سنہ ۱۸۵۲ء تک لکھا جا چکا تھا۔

تیسرا حصہ ۔ از چنگیز خاں تا امیر تیمور ۔ یہ حصہ سب سے بعد میں لکھا گیا۔

اب آپ یہ سوال کریں گے کہ مہرِ نیمروز کا آخری حصہ یعنی از امیر تیمور تا ہمایوں سب سے پہلے کیوں لکھا گیا تو اس کا جواب بھی سنئے۔ مرزا غالب جب تاریخ تمریہ یا پرتوستان لکھنے کی خدمت پر مامور ہوئے تو صرف امیر تیمور سے لیکر بہادر شاہ تک کے حالات لکھنے کا خیال تھا۔ جب مرزا غالب، ہمایوں تک کا حال لکھ چکے تو اس کے بعد کے واقعات خود مرزا صاحب ہی کی زبانی سنئے۔ مرزا صاحب، منشی صاحب کے ایک شکایتی خط کا جواب دے رہے ہیں:

"بھائی صاحب۔ کیسی تاریخ اور کیسی نقل۔ کیا فرماتے ہو۔ پہلے مجھ سے پوچھ تو لیا کرو۔۔۔۔۔۔

اب سنئے ماجرا کیا ہے۔ جب ہمایوں کے حال تک پہونچا تو میں نے از راہ عذر و حیلہ بلکہ بسبیل اظہارِ حقیقت

واقعی حکیم صاحب کار فرماسے کہا کہ مجھ سے انتخاب حالات ممکن نہیں۔ آپ مدعا کتب سیر سے نکال کر زبان اُردو میں ایک مسودہ اس کا لکھوا کر میرے پاس بھیجدیا کیجئے۔ میں اسکو فارسی کرکے تم کو دیدیا کروں گا۔ انھوں نے اسکو قبول کرکر ابتدائے آفرینش عالم و آدم سے میرے پاس مسودہ اُردو بھیجا۔ تو اب گویا ایک اور کتاب لکھنی پڑی۔ میں نے اس کا چھوٹا سا دیباچہ لکھ کر ایک اور ہی انداز کی عبارت میں لکھنا شروع کیا۔ آدم سے لیکر چنگیز خاں تک انھوں نے میرے پاس مسودہ بھیجا۔ میں نے اپنے طور پر لکھا اور مسودہ حوالے کیا۔ رمضان کے مہینے سے کہ آج اس کو دس مہینے ہوئے وہ مسودہ آنا موقوف ہوگیا۔ بہ جہت چار جزو ہوں گے۔ دو چار بار میں نے ان سے تقاضا کیا یہی جواب سُنا کہ اب رمضان ہے پھر کہا کہ عید کا ہنگامہ ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھ کو کیا۔ میں کیوں طالب مشقت ہوں۔ تقاضا موقوف کیا۔ وہ چار جزو میرے لکھے ہوئے حکیم صاحب کے پاس ہوں گے۔ اب کہاں ان سے مانگوں اور کیوں مانگوں۔ جانے دو دور کرو۔ جو بنا اُٹھی ہی نہیں اس سے غرض کیا؟"

مذکورۂ بالا سطور سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہر نیمروز کی تکمیل میں تاخیر کا باعث حکیم احسن اللہ خاں کا تساہل تھا اور خود مرزا کی بیماری اور عیدین وغیرہ کے قصاید کی فکر نے بھی تاریخ نویسی کو التوا میں ڈال دیا تھا۔ یہ خط مرزا نے ۱۵ اپریل ۱۸۵۳ء کو لکھا تھا جس کے یہ معنے ہوئے کہ مرزا غالب جون یا مئی ۱۸۵۲ء تک ابتدائے آفرینش آدم سے لیکر چنگیز خاں تک کا حال لکھ چکے تھے لیکن تحریر کا انداز بتا رہا ہے کہ خط لکھتے وقت تک یعنی ۱۵ اپریل ۱۸۵۳ء تک مہر نیمروز غیر مکمل تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ذکر غالب کے مصنف نے فارسی مکاتیب سے یہ کیسے نتیجہ نکال لیا کہ مہر نیمروز ۱۸۵۲ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ مہر نیمروز کی صحیح تاریخ کا تعین تو نہیں کیا جاسکتا لیکن ان خطوط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرزا نے ۱۳ ستمبر ۱۸۵۴ء کی عید اضحیٰ کو کوئی قصیدہ پیش نہیں کیا۔ بلکہ اس کے بجائے مہر نیمروز کی ایک جلد پیش کی اور توقیع خوشنودی حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ مرزا نے کوشش کرکے عید سے ایک دو روز یا ایک ہفتہ پہلے مہر نیمروز مکمل کی ہوگی۔ مرزا صاحب منشی صاحب کو لکھتے ہیں:

"میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلد اس تاریخ کا تمام کرکے وہ نذر کیا اسکا حال سنئے کہ وہ صورت جو پہلے تھی وہ نہیں رہی۔ آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا اب شروع تحریر آفرینش عالم و ظہور آدم سے ہے میں نے کتاب کا نام پرتوستان رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک۔ اسکا نام مہر نیمروز رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والی عصر تک۔ اسکا نام ماہ نیم ماہ۔ سودہ ماہ نیمروز تمام ہوا اور نذر حضور کیا۔ اب اگر زیست وفا کرگئی تو ماہ نیم ماہ لکھا جائیگا۔ توقیع خوشنودی مجھکو ملگیا یعنی شقہ مشتمل تحسین و اظہار عنایت پر۔ اسی کو خلعت فاخرہ اور جاگیر تصور کرتا ہوں۔"

اس اقتباس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ ابو ظفر بہادر شاہ کو مرزا غالب کی فارسی نثر کم از کم ناپسند نہ تھی اسلئے ان خطوط کے شایع ہو جانے کے بعد غالب کا کوئی مبصر شاید اپنی کتاب سے یہ الفاظ نکال دے کہ بہادر شاہ کو مرزا غالب کی پیچیدہ ترکیبیں اور مشکل زبان پسند نہ تھی اس لئے ماہ نیم ماہ کے لکھنے کی غالب سے فرمائش نہ کی گئی۔

آفاق دہلوی

مودودی صاحب اور مسئلۂ امارت

(بہ سلسلۂ نگار اپریل ۴۷ء)

حضرت عکرمہؓ کی خارجیت کے ثبوت میں مشہور عالم اور محدث علامہ شمس الدین الذہبی کے حوالے سے یہ بھی نقل کر دیا گیا تھا کہ علمار رجال نے بھی حضرت عکرمہ کو خارجی کہا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ان کی خارجیت کچھ ثابت شدہ سی چیز ہے اس پر جلیل صاحب نے لکھا ہے:

"ایک صاحب علم آدمی جس کی نظر ذہبی کی کتاب پر ہوئی ہے یہ تو تحقیق کر لینا چاہئے کہ عکرمہ کی طرف خارجیت کی نسبت صحیح ہے بھی یا نہیں۔ کیا پروفیسر صاحب نے تہذیب التہذیب بھی ملاحظہ نہیں فرمایا۔ براہ کرم وہ اب مقدمہ فتح الباری کی الفصل السابع اور تہذیب التہذیب فصل العین ذکر عکرمہ کا مطالعہ ضرور فرمالیں۔"

اس میں دو لطیفے ہیں۔ اول یہ کہ یہ دونوں کتابیں جلیل احسن صاحب کی نظر سے نہیں گزریں اور شاید تہذیب التہذیب کا تو آج سے پہلے انھوں نے نام بھی نہیں سنا۔ وہ تہذیب التہذیب کوئی رسالہ سمجھے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے "ملاحظہ نہیں فرمایا" (مذکر) لکھا ہے۔ تہذیب التہذیب اسمار رجال کی ایک بڑی ضخیم کتاب ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقدمہ فتح الباری پر قیاس کرتے ہوئے تہذیب کو بھی انھوں نے کسی کتاب کا مقدمہ ہی سمجھا ہو۔ ایک اور غلطی بھی ہے۔ عکرمہ اور دوسرے راویوں کا ذکر علامہ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری کی نویں فصل میں کیا ہے۔ جلیل احسن صاحب نے الفصل السابع (ساتویں فصل) لکھا ہے۔ اس کا بظاہر امکان نہیں کہ یہ غلطی کتابت کی ہے۔ کاتب ہندسوں کو تو غلط لکھ سکتا ہے۔ وہ تاسع کو سابع کیسے لکھ دیتا یہ سب قرینے ہیں اس بات کے جیسا کہ میں ابتدائی سطور میں لکھ آیا ہوں، کہ جلیل صاحب نے ان کتابوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھا۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں یہ نہیں لکھا کہ عکرمہ خارجی نہ تھے بلکہ یہ کہ عکرمہ کو کچھ لوگوں نے کذاب کہا ہے اور یہ بھی کہ وہ امرار کے انعامات وصول کیا کرتے تھے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ان دونوں الزاموں کا رد علامہ ابن حجر نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ رہی ان کی خارجیت سو ابن حجر ہی نے مندرجہ ذیل علمار اور محدثین کبار کے اقوال نقل فرمائے ہیں جو عکرمہ کو خارجی بتاتے ہیں۔

محمد بن عبد الرحمن - احمد بن حنبل - علی بن المدینی - یحییٰ بن معین - مصعب زبیری - خالد بن ابی عمران المصری - یحییٰ بن بکیر

یزید نحوی ۔ ابن سیرین ۔ مالک بن انس ۔ ابو حاتم ۔ امام مسلم ۔ ابن لیسعہ ۔ عطاء بن رباح ۔ یحییٰ بن سعید الانصاری۔

جن دو چار عالموں نے ان کی براءت بھی کی ہے تو انھوں نے صرف یہ کہا ہے کہ وہ سو فیصدی خارجی نہ تھے بلکہ بعض مسایل میں ان کے ہم خیال تھے اس لئے ان کو خارجی کہدیا گیا ہے ۔ ابن ابی حاتم کے حوالے سے یہی بات ابن حجر نے نقل کی ہے اور عجلی کا یہ قول کہ عکرمہ حروری (خارجی) نہ تھے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ ہر بات میں ان کے ہمنوا نہ تھے ۔ بڑی مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تو طے شدہ ہے کہ حضرت عکرمہ کذاب نہ تھے ۔ ان کی روایات کم سے کم اس بنیاد پر رد نہیں کی جا سکتیں کہ انھوں نے جھوٹ بولا یا غلط بیانی سے کام لیا ۔ تہذیب اور میزان الاعتدال[1] میں عکرمہ کے حوالے سے ہے کہ وہ عبداللہ بن عباس کو بھی خارجی بتاتے تھے ۔ مقدمہ فتح الباری[2] میں مصعب زبیری کا قول نقل کیا ہے کہ عکرمہ کہتے تھے کہ علی بن عبداللہ بن عباس ان کے ہم خیال ہیں ۔ ان حضرات کے متعلق یہ اقوال حضرت عکرمہ کے ہیں اور عکرمہ جھوٹ نہیں بولتے ۔ اس لئے عکرمہ ہی نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عباس اور ان کے صاحبزادے علی بن عبداللہ کے متعلق بھی کہنا پڑے گا کہ وہ بھی خارجی تھے ۔ اور اگر آپ یہ نہ کہیں تو حضرت عکرمہ جھوٹے ہوئے جاتے ہیں ۔ ان فقہاء کی فہرست میں جن کی بابت میں نے لکھا ہے کہ وہ خارجی بتائے جاتے ہیں ولید بن کثیر بن یحییٰ المدنی کا اور اضافہ کر لیجیے ۔ حافظ ابن حجر نے ابوداؤد کا قول[3] نقل کیا ہے کہ وہ (اباضی خارجی) تھے ۔ یہ وہی فرقہ ہے جس کی بابت مورخین کہتے ہیں کہ وہ ضرورت امارت کے قایل نہ تھے ۔

میں نے حضرت حسن بصری کے متعلق مبرد کا یہ قول بھی نقل کیا تھا کہ وہ حکومت و امارت کے منکر تھے ۔ اس پر جلیل صاحب فرماتے ہیں کہ حکومت سے مراد تحکیم ہے ۔ آگے ارشاد ہوتا ہے ۔ "پروفیسر صاحب اس عبارت میں لفظ حکومت دیکھ کر یہ سمجھے کہ یہ اردو کے معروف معنے میں استعمال ہوا ہے ۔ اس لئے اعلان عام فرما دیا کہ دیکھو حسن بصری بھی حکومت و امارت کے منکر ہیں" اور آخر میں یہ فیصلہ دیا ہے ۔ "اوپر ہم نے حکومت کا جو مفہوم بتایا ہے بعینہٖ اسی مفہوم میں یہ لفظ اسی کتاب میں صفحہ ۱۱ پر مستعمل ہوا ہے" اس میں تین باتیں ہیں اور تینوں غلط ہیں ۔ (۱) حکومت سے مراد تحکیم ہے (۲) حکومت مبرد نے تحکیم کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔ (۳) اُردو میں حکومت امارت کے معنے میں ہے ۔ اب ذرا اس کی تفصیل سنئے ۔ تحکیم کے معنے ہیں کسی کو حکم (پنچ) بنانا یا حکومت دینا ۔ اور حکومت کہتے ہیں حکم کرنے یا فیصلہ دینے کو ۔ انگریزی میں اس کا ہم معنی ([illegible]) ہے ۔ یہ بات معمولی عربی داں بھی جانتا ہے ۔ تحکیم کے انکار کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے پر حکومت کرے اور اس کو امر فرمائے ۔ امر، حکم، اور حکومت خدا کے لئے ہے اور خدا ہی دراصل دو آدمیوں کے درمیان حکم فرما سکتا ہے ۔ خوارج نے تحکیم کا انکار اسی اصول کی بنا پر کیا تھا ۔ وہ کہتے تھے کہ ہم کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دے سکتے کہ وہ ہم پر حکم فرمائے ۔ ان کا مشہور نعرہ تھا لاحکم الا للہ (حکومت صرف خدا

---

[1] میزان الاعتدال ذکر عکرمہ ۔ [2] مقدمہ فتح الباری ذکر عکرمہ ۔ [3] ملاحظہ فرمائیے مقدمہ فتح الباری ذکر ولید

کی ہے) اور جب حکومت خدا کی ہے تو کوئی انسان حکم (پنچ) کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان حضرات کا جب یہ نعرہ سنا تو فرمایا[1] "یقولون لا امارہ" (یہ لوگ کہتے ہیں امارت کی کوئی چیز نہیں)۔ حضرت علی نے بھی حکم کے معنے امارت ہی کے لئے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان حضرات کا اختلاف صرف یہ نہیں کہ دو آدمیوں کو پنچ کیوں بنایا گیا۔ اگر یہ ہوتا تو بات کچھ بھی نہ تھی۔ خود حضرت علی بھی اس کو ناپسند فرماتے تھے۔ بلکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا اختلاف اُصولی ہے۔ وہ تحکیم کے منکر اس لئے ہیں کہ وہ حکومت ہی کو نہیں مانتے۔ اور اگر ان کو ساتھ لیا گیا تو امارت و خلافت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ تفصیل مبرد نے کئی جگہ دی ہے۔ صفحہ ۱۲۳ پر ہے کہ حضرت علی اور خوارج کے ایک گروہ کا سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ ——— مگر جب حضرت علی کو بتایا گیا کہ خوارج کہتے ہیں کہ انھوں نے (حضرت علی نے) حکومت سے رجوع فرما لیا ہے تو حضرت علی نے خطبہ دیا اور اُس میں یہ بھی کہا "جو لوگ کہتے ہیں، میں نے حکومت سے رجوع کر لیا ہے وہ جھوٹے ہیں"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحکیم اور حکومت میں فرق ہے۔ حضرت علی تحکیم کو تو ناپسند فرماتے تھے مگر حکومت کے منکر نہ تھے۔ ان کا انکار تحکیم انکار حکومت کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ اس لئے تھا کہ وہ اسکی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے۔ انکار تحکیم کی دوسری صورت یہی ہے۔ ان کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ مصلحت وقت سے ہے

یہ بھی غلط ہے کہ مبرد نے حکومت تحکیم کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود حکومت کے مفہوم میں اشتباہ رہا۔ حضرت علی اس سے پنچوں کا مخصوص فیصلہ مراد لیتے رہے اور خوارج نے اس کا حقیقی مفہوم لیا۔ مبرد نے مخصوص فیصلے کے لئے "حکومت" اور اس کے حقیقی مفہوم کے لئے "الاقامۃ علی الحکومۃ" والے جامع الفاظ استعمال کئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲۳ سطر ۱۴) اسی لئے حضرت علی اور خوارج کا سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس کے کئی قرینے ہیں کہ خوارج حکومت و تحکیم میں فرق کرتے تھے۔ انھیں اس کا خیال تھا کہ تحکیم کے انکار کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر اس کی ضرورت نہ تھی۔ مگر وہ اس لحاظ سے تحکیم کے منکر نہ تھے۔ وہ حکومت ہی کو سرے سے نہ مانتے تھے۔ خود مبرد نے ان دونوں لفظوں کا یہ فرق ملحوظ رکھتے ہوئے ایک جگہ یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ استعمال کئے ہیں۔ "قالوا فما تقول فی الحکومۃ والتحکیم" (صفحہ ۱۲۵ سطر ۳)۔ ظاہر ہے کہ اگر دونوں کا مفہوم ایک ہوتا تو دونوں الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اب ذرا اس تفصیل کے بعد اس عبارت پر غور فرمائیے۔ "حضرت حسن بصری حکومت کے منکر تھے لیکن وہ خارجی نہ تھے"۔ یعنی یہ کہ وہ خارجیوں کی یہ بات تو مانتے تھے کہ امارت نہ ہونا چاہئے مگر دوسرے مسایل میں وہ ان کے ہم خیال نہ تھے مثلاً خارجی اس زمانہ کے تمام مسلمانوں کو کافر اور واجب القتل سمجھتے تھے مگر حضرت حسن بصری اس سے متفق نہ تھے۔ یہاں لفظ حکومت پایا جاتا ہے جو تحکیم کے معنے میں لیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور اگر حکومت کی جگہ تحکیم ہوتا تو بھی یہ احتمال تھا

[1] کامل المبرد جلد ۳ صفحہ ۱۲۱

کہ تحکیم کا انکار اس لئے ہے کہ سرے سے حکومت ہی کا انکار ہے۔ آخر خوارج بھی اولاً منکرِ تحکیم ہی تھے اور اسلئے تھے، (جیسا کہ بار بار عرض کیا جا چکا ہے) کہ انھیں حکومت سے انکار تھا۔ مگر یہ انتہائی نادانی ہے کہ حکومت کو تحکیم کے معنے میں لیا جائے اور پھر تحکیم کے انکار کے وہ معنی لئے جائیں جن کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ مصلحت وقت سے ہے۔ مبرّد نے حضرت حسن کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ وہ حضرت علی کی بابت فرمایا کرتے تھے۔ "خدا کے بندے جب تم حق پر تھے تو تم نے اپنا جھگڑا پنچوں کے حوالے کیوں کیا" مبرّد کا بیان ہے کہ حضرت حسن ایک سخت کلمہ بھی (لا ابا لک) حضرت علی کے متعلق استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ ایک جداگانہ بات ہے انکارِ حکومت کی تفسیر نہیں۔ مگر جلیل احسن صاحب فرماتے ہیں: "ان کے انکار کا مطلب، جیسا کہ خود انھوں نے بیان کیا ہے۔ یہ تھا کہ حضرت علی بلا شبہ مسلمانوں کے امیر برحق تھے۔ انھیں معاویہ کی جنگی چال تحکیم پر کبھی راضی نہ ہونا چاہئے تھا"

امام مالک کی خارجیت کا ذکر بھی مبرّد نے کیا ہے۔ مبرّد تیسری صدی ہجری کا عالم ہے۔ اکثر اہل علم نے ان روایات پر اعتماد کیا ہے جو مبرّد نے خوارج اور ان کے اختلافات کے سلسلہ میں دی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے اپنے مقدمہ فتح الباری میں کئی جگہ مبرّد کے اقوال نقل کئے ہیں۔ عمران بن خطان کے متعلق مبرّد ہی کے حوالے سے ابن حجر نے کہا ہے کہ وہ خارجی تھے۔ اس لئے امام مالک کے متعلق مبرّد کا یہ کہنا کہ انھیں بھی خارجی کہا گیا ہے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جلیل احسن صاحب یہ نہ بھولیں کہ مجھے در اصل اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کون خارجی ہے اور کون نہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی بے شمار عالم، فقیہ، محدث، اور ادیب ایسے تھے جو امامت و امارت کے قایل نہ تھے امام مالک کا مسلک بھی یہی تھا اور اگر در حقیقت امام مالک خارجی عقیدے کے نہ تھے تو شاید ان کو اس لئے خارجی کہا گیا ہے کہ وہ امام اور خلیفہ کی ضرورت کو نہ مانتے تھے۔ عکرمہ کے متعلق ابن ابی حاتم کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ بعض مسائل میں خوارج کے ہمنوا تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ان مسایل میں مسئلہ امامت بھی ہو۔ میں نے اس سلسلہ میں بہت ہی احتیاطی الفاظ استعمال کئے تھے۔ میرے الفاظ یہ تھے: "کچھ عالم ایسے بھی ہیں جو خاص اس مسئلہ میں ان حضرات کے (خوارج) ہمنوا ہیں" اس عبارت میں خط کشیدہ الفاظ اسی مصلحت سے بڑھائے گئے تھے۔ امام مالک کے متعلق میں نے لکھا تھا:۔

"اور تو اور مشہور عالم، امام، اور محدث یعنی مالک بن انس کو مبرّد کے بیان کے مطابق اس جماعت میں شامل سمجھا گیا ہے"

میں اہلِ علم سے پوچھتا ہوں کہ اس سے زیادہ اور کیا احتیاطی الفاظ ہو سکتے ہیں۔ مبرّد نے لکھا ہے: "زبیریوں کا بیان ہے کہ امام مالک بن انس، المدینی حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کا ذکر فرماتے تھے اور قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں نے روٹی[1] پر جنگ کی۔" دیکھئے یہ الفاظ اور اس تاکید کے ساتھ صاف بتا رہے ہیں کہ ان کی نگاہ میں امارت و

[1] کامل المبرد جلد ۳ صفحہ ۱۲۶ - اصل عبارت میں ثرید ہے۔ ثرید، شوربے میں ملائی ہوئی روٹی کو کہتے ہیں جو اہل عرب کو بہت مرغوب تھی میں نے روٹی ترجمہ کر دیا ہے۔

خلافت کی حیثیت وہ نہ تھی جو دوسروں کے نزدیک ہے۔ وہ اسے اسلام کا کوئی اُصول نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ نرا دنیاوی کام تھا۔ جو حضرات اس پر اڑے ہوئے تھے وہ صرف اپنے ذاتی منفعت کے لئے ایسا کر رہے تھے۔ اسی لئے انھوں نے اسے "شریر" کہا ہے۔

ایک اور پر لطف بات بھی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے۔ "ان (خوارج) کا کہنا ہے کہ اسلام کی سوسائٹی کا ہر فرد جب اقامت دین اور اجرا احکام شرعیہ اپنا فرض سمجھتا ہے تو پھر امامت کی (خواہ وہ فرد واحد کی ہو یا بورڈ کی) ضرورت کیا ہے۔" اس کے بعد پھر ارشاد ہوا ہے "مبرد کی تحقیق کے مطابق ان کے ہر فرقے نے ہمیشہ اپنے میں سے کسی ایک آدمی کو اپنا امیر منتخب کیا ہے۔" ان دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟ اگر خوارج کا کہنا ہے کہ امیر کی ضرورت نہیں تو پھر "ہمیشہ اپنے میں سے کسی ایک آدمی کو اپنا امیر منتخب کرنا" کیا معنے رکھتا ہے۔ بات وہی ضعف رائے، سوء فہم اور بے خبری کی ہے۔ نجی خط میں انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: "دراصل ہم ابھی آپ کا مطلب سمجھے نہیں۔" لیکن مضمون اس طرح لکھ رہے ہیں گویا سب کچھ سمجھ گئے ہیں۔ آپ میرا ہی مطلب نہیں بلکہ خوارج کا مطلب بھی نہیں سمجھے اور ساتھ ہی مبرد کا بھی۔ مبرد کی بہت سی عبارتیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں جب بھی امام بنانا ہوتا ہے فرد واحد ہی کو بناتے ہیں۔" لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ آخر خوارج کے نزدیک "اسلام کی سوسائٹی کا ہر فرد جب اقامت دین اور اجراء احکام شرعیہ اپنا فرض سمجھتا ہے" اور ان کا عقیدہ ہے کہ "امامت خواہ فرد واحد کی ہو یا بورڈ کی غیر ضروری ہے" تو وہ امام بناتے کیوں ہیں۔ اس پر اگر ذرا غور کرتے تو سمجھ میں آجاتا کہ وہ جس کو امام بنا رہے ہیں دراصل وہ امام نہیں بلکہ سپہ سالار ہے۔ عربی میں امام سپہ سالار کو بھی کہتے ہیں۔ مبرد کی کتاب سے جتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سب میں امام یا امیر سپہ سالار ہی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا بڑا قرینہ تو یہ ہے کہ وہ برابر جنگ و جدل میں اُلجھے رہے اس لئے وہ اپنا ایک قاید منتخب کرنے پر مجبور تھے۔ اس کے علاوہ مبرد نے لکھا ہے (صفحہ ۱۲۴) کہ ایک موقع پر تقریباً دو ہزار خارجی تو حضرت علیؑ کے ساتھ جا ملے باقی چار ہزار بچے ان کو ابن کواء نماز پڑھاتا رہا اور جب تک عبداللہ بن وہب کا انتخاب نہیں ہوا انھوں نے شیث بن ربعی کو اپنا امیر جیش سمجھا۔ اس بات کو مبرد نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ "جب جنگ ہوگی تو تمھارا رئیس شیث بن ربعی ہوگا۔"

خوارج کے بارے میں نبراس اور شرح مواقف سے جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں ان سے بھی ان حضرات کی بے خبری ظاہر ہے۔ یہ کتابیں خالص عقائد کی ہیں اور بہت بعد کی تصانیف ہیں۔ ان میں جو کچھ ہے وہ بحث و استدلال ہے۔ نقل و روایت ان کے دائرۂ عمل سے خارج ہے۔ اس فن کے امام ابن حزم اور عبدالکریم الشہرستانی ہیں۔ جنھوں نے سب سے پہلے مختلف مذاہب، عقائد، اور فرقوں کا کھوج نکالا اور تاریخی حیثیت سے ان پر بحث کی۔ بعد کے تمام مصنف اور علماء انکے خوشہ چین ہیں۔

شہرستانی نے خوارج کے متعلق لکھا ہے[1]: "وجوزوا ان لایکون فی العالم امام اصلاً" (خوارج کے سارے فرقے کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کا دنیا بھر میں کوئی امام نہ ہو) خصوصیت کے ساتھ فرقہ نجدات کے متعلق، جنھیں اباضیہ اور صفریہ بھی کہا گیا ہے، ان دونوں عالموں نے لکھا ہے کہ وہ متفقہ طور پر[2] یہ کہتے تھے "لاحاجۃ للناس الی امام قط" (لوگوں کو ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کوئی امام بنائیں) اور اگر غور سے دیکھا جائے تو خوارج کا اصل اختلاف ہی یہ تھا جس کی وجہ سے وہ دوسرے مسلمانوں سے کٹ کر الگ ہوئے۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کا نعرہ تھا "لاحکم الا للّٰہ" (حاکم اور امام خدا کے سوا کوئی نہیں) یہ بھی اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے کہ حضرت علی نے ان کا یہ نعرہ[3] سنا تو فرمایا "یقولون لا امارۃ ولابد من امارۃ برۃ او فاجرۃ" جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ امارت یا امامت اسلام میں کوئی چیز نہیں، حالانکہ اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ نیک یا بد امام چننا ہی پڑتا ہے۔ دیکھئے حضرت علی نے خوارج کی اس رائے کا رد ایک عقلی دلیل سے کیا ہے اور وہ ہے عام ضرورت۔ لیکن اب مودودی جماعت کے لوگ اسی عقلی دلیل کو شرعی اور مذہبی چیز قرار دینے پر اصرار کر رہے ہیں۔ آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ حضرت عکرمہ کو اسی فرقہ نجدات کا ایک فرد بتایا گیا ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ صرف اتنی بات میں ان اصحاب کے ہم خیال ہوں کہ مسلمانوں کا کوئی امام نہ چنا جائے۔ بہرحال قارئین نگار اسے فراموش نہ فرمائیں کہ اصل نزاع جس مسئلہ میں ہے وہ کسی امیر عام اور جماعت مسلمین کا امام منتخب کرنا ہے نہ کہ فوج کا سپہ سالار اور کسی انجمن کا صدر چننا۔ جلیل احسن صاحب اور ان کے ساتھی اس میں فرق نہیں کر رہے ہیں۔

کہاں تک "غلطیہائے مضامین" دکھائی جائیں۔ مبرد نے حضرت علی اور خوارج کے ایک سمجھوتے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت علی نے ایک موقع پر مشہور واقعۂ تحکیم کو غلط مان کر فرمایا۔ "میں ہر گناہ اور غلطی سے توبہ کرتا ہوں۔" خوارج نے سمجھا کہ امامت کا مسئلہ ختم ہوا، چنانچہ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ سامان ہو جائے تو حضرت علی امیر سپاہ کی حیثیت میں امیر معاویہ سے جنگ کریں۔ حضرت علی کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے فرمایا "غلط ہے میں نے حکومت سے[4] رجوع نہیں کیا" واقعہ کی کچھ تفصیلات اوپر دی جا چکی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں غلط فہمی میں تھے۔ حضرت علی سمجھا کئے کہ وہ بدستور امیر عام ہیں۔ خوارج نے خیال کیا کہ حضرت علی نے تحکیم کی غلطی تسلیم کر لی ہے اس لئے نتیجہ کے طور پر انھوں نے گویا مان لیا ہے کہ حکومت انسان کی نہیں ہو سکتی۔ اس واقعہ کو جلیل احسن صاحب نے بھی لکھا ہے (نگار صفحہ ۵۳) اس میں یہ الفاظ بھی ہیں: "سابق کی طرح امیر المومنین مان کر آپ کی معیت میں حضرت معاویہ سے شام میں جہاد کریں گے" یہ قطعاً غلط ہے۔ اگر سابق کی طرح امیر مان لیا جاتا تو جھگڑا ہی کیا تھا۔ دراصل انھوں نے امیر سپاہ مان کر امیر معاویہ سے جنگ

---

[1] الملل والنحل علی ہامش الفصل جلد ۱ صفحہ ۱۲۵ - [2] الملل والنحل ۱۲۲ - [3] الملل والنحل صفحہ ۱۲۶ - اور کامل المبرد جلد سوم ۱۲۱ - [4] الکامل جلد ۳ صفحہ ۱۲۳

کرنا چاہی تھی۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ حضرت علی نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا "میں نے حکومت سے رجوع نہیں کیا ہے" مطلب یہ ہے کہ میں سابق کی طرح امیر ہوں۔ خوارج نے جب یہ سُنا تو مبرد کے الفاظ میں وہ یہ کہتے ہوئے "حکومت تو فقط اللہ کی ہے" نکل گئے۔ دیکھا آپ نے سوء فہم اور بد دیانتی نے ان حضرات کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

پانچویں خیانت بھی کم پر لطف نہیں۔ میں نے حضرت عمرؓ کی بابت اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ انھوں نے چھ اصحاب کا بورڈ شاید اس لئے مقرر فرمایا کہ یہ چھ امام ہیں۔ ایک امام کی طرح مل جل کر وہ مسلمانوں میں نظم وضبط قایم رکھیں گے۔ مگر سوءِ اتفاق سے انھوں نے اپنے میں سے ایک کو امام چن لیا۔ اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہنا چاہئے تھی کہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مشہور یہ ہے اور سب یہی کہتے ہیں کہ ان چھ اصحاب کا بورڈ کسی ایک خلیفہ کے انتخاب کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ عام کتابوں اور روایتوں میں بھی یہی ہے۔ سب ایک دوسرے کی نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ ظاہر ہے جو بات کسی مشہور قول یا روایت کے خلاف ہے اس کا ردیوں نہیں ہوسکتا کہ نبراس اور ابن خلدون کے اقوال نقل کر دئے جائیں۔ میں نے اس سے زیادہ کتابیں پڑھی ہیں۔ میں جانتا ہوں ان کتابوں میں کیا ہے۔ ایک اور ستم یہ ڈھایا کہ میں نے علم کلام کی مشہور کتاب شرح عقائد نسفی سے نقل کیا تھا کہ اس میں کئی جگہ لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اصل خلافت کو شوریٰ قرار دیا۔ ایک مقام پر اس کے مصنف نے خود یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے چھ آدمیوں کو خلیفہ مقرر فرما دیا، حالانکہ بیک وقت دو خلیفہ نہیں ہوسکتے۔ اس کے بعد مصنف ہی نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے اس سے بھی صاف صاف ان کا نظریہ معلوم ہوجاتا ہے۔ فرماتے ہیں دو خلیفہ اس طرح مقرر نہیں ہوسکتے کہ دونوں مستقل اور ایک دوسرے سے بے نیاز ہوں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جو چھ اصحاب کو مقرر فرمایا وہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہ تھے۔ بلکہ چھ کے چھ مل کر ایک امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے مصنف کے اصل الفاظ بھی نقل کر دئے تھے اور وہ یہ ہیں: " اما فی الشوریٰ فالکل بمنزلۃ امام واحد" (لیکن جہاں تک مشورہ کا تعلق ہے وہ سب مل جل کر ایک ہی امام کی حیثیت رکھتے ہیں)"

اس بحث میں دو کارروائیاں کی گئیں۔ ایک یہ کہ پوری دلیل کو کاٹ تراش کر الگ کر دیا گیا۔ پہلے حصّہ کے متعلق کہا گیا کہ "خلافت سے منصب خلافت مراد نہیں بلکہ استخلاف یعنی انتخاب خلیفہ ہے" مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان حضرات کے علم وخبر کا تو یہ حال ہے اور اس پر دوسروں کو طعن کرتے ہیں۔

خلافت اسم ہے اور استخلاف مصدر، لفظ خلافت کسی قاعدے سے بھی استخلاف کے معنے میں استعمال نہیں ہوسکتا اسکے علاوہ مصنف نے خلافت کی جگہ لفظ امامت بھی استعمال کیا ہے۔ وہ عبارت بھی نقل کر دی گئی تھی۔ اگر خلافت استخلاف کے معنے میں ہے تو امامت کے کیا معنے ہیں؟ رہا دوسرا حصّہ سو اس کو بالکل چھوڑ دیا گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا تھا۔ اب میں پوری جماعت کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ شارح عقاید کی اس عبارت کا مطلب بتائیں اور اس خیال سے کہ وہ عبارت کو توڑ مروڑ نہ دیں میں اس کا ذیل میں منطقی تجزیہ کئے دیتا ہوں۔

(۱) اگر چھ آدمیوں کو خلیفہ منتخب نہیں کیا گیا تھا تو پھر اس سوال کے کیا معنے کہ جب بیک وقت دو خلیفہ نہیں ہو سکتے تو پورے چھ کیسے منتخب کر لئے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان چھ اصحاب کو بطور مجلس آخری طور پر خلیفہ چن لیا گیا تھا۔

(۲) اگر یہ چھ اصحاب خلیفہ نہ تھے۔ بلکہ ان کا انتخاب کسی ایک خلیفہ چن لینے کے لئے عمل میں آیا تھا تو شارح عقاید کو یہ جواب دینا چاہئے تھا کہ یہ چھ آدمی خلیفہ نہ تھے۔ ان کو تو اس غرض کے لئے مقرر کیا گیا تھا کہ "اپنے میں سے کسی موزوں تر آدمی کو خلافت کے لئے منتخب کر لیں"۔ خیالی نے یہ جواب دیا بھی ہے۔

(۳) اگر حضرت عمرؓ کا مقصد یہ نہ تھا کہ "اصل خلافت کو ان چھ آدمیوں کے درمیان شوریٰ بنا دیں" تو پھر شارح عقاید نے یہ کیوں کہا کہ "کُل مل ملا کر ایک امام کی حیثیت رکھتے ہیں"۔

(۴) اگر کُل مل ملا کر ایک امام کی حیثیت رکھتے ہیں تو یہ سب امام ہیں اور جب یہ سب امام ہیں تو چھ آدمیوں کی پوری مجلس امام ہے۔

(۵) ان چھ آدمیوں کی پوری مجلس کو امام کس نے بنایا؟ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس لئے شارح عقاید علامہ تفتازانی کے نزدیک بھی حضرت عمرؓ نے چھ آدمیوں کی ایک مجلس کو امام منتخب فرمایا۔ ہر چند میں اپنے خیال میں منفرد ہوں۔ مشہور یہی ہے کہ اس مجلس کا انتخاب اس لئے ہوا تھا کہ یہ اپنے میں سے کسی ایک کو امام چنیں۔ مگر علامہ تفتازانی اس باب میں کم سے کم میرے ہم خیال ہیں۔ اگر تحقیق جاری رکھی جائے تو اور اہلِ علم بھی مل سکتے ہیں جو شاید یہی رائے رکھتے ہوں۔

اس عبارت پر شرحِ عقاید کے ایک محشی ابو درد[1] نے لکھا ہے "امامت کو ان اصحاب کے درمیان شوریٰ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصحاب جملہ احکام میں مشورہ کریں اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ اسلامی حدود قایم رکھیں۔ لیکن یہ اس کے خلاف ہے جو حضرت عمرؓ کے متعلق مشہور ہے"۔ عبارت کا مفہوم اس عالم نے بھی وہی لیا ہے جو میں نے بیان کیا ہے لیکن چونکہ وہ مشہور خیال سے ٹکراتا ہے اس لئے بعد میں یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ یہ مشہور خیال کے خلاف ہے۔

اب بخاری شریف کی روایت لیجئے۔ بخاری میں یہ روایت دو جگہ ہے۔ ایک کتاب الجنائز میں اور اس کے راوی ہیں:۔ قتیبہ، جریر بن عبدالحمید، حصین بن عبدالرحمان اور عمرو بن میمون الازدی۔ دوسری روایت کتاب المناقب میں ہے۔ یہ وہ روایت ہے جسے جلیل احسن نے نقل کیا ہے۔ اس روایت میں آخر کے دو راوی تو یہی ہیں، مگر پہلے دو راوی بدلے ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں:۔ موسیٰ بن اسماعیل اور ابو عوانہ۔ حصین بن عبدالرحمان۔ دونوں میں مشترک ہیں۔ ان کے متعلق میزان، تہذیب اور خود مقدمہ فتح الباری میں ہے کہ آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا۔ انسے جن عالموں نے روایت کی ہے ان میں سے شعبہ، ثوری، زائدہ، ہشیم اور خالد کے متعلق تو حافظ ابن حجر نے یقین

[1] عمدۃ القاری شرح بخاری جلد ۱۱ صفحہ ۴۲۵

کے ساتھ کہا ہے کہ انھوں نے حصین بن عبدالرحمان سے اس وقت سنا جب ان کے حافظے میں تغیر آ گیا تھا۔ اس فہرست میں ابو عوانہ اور جریر شامل نہیں ہیں جو موجودہ روایت کے راوی ہیں۔ اغلب خیال یہی ہے کہ ان کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بھی بڑا امکان ہے کہ انھوں نے کچھ فقرے اپنی طرف سے گھٹا بڑھا دئے ہوں۔ ابن حجر نے بعض فقروں پر بحث کرتے ہوئے لکھا بھی ہے۔ "ایک راوی نے یاد رکھا اور دوسرا بھول گیا" اس کے علاوہ جریر بن عبدالحمید بعض علماء اور محدثین کے نزدیک ناقابل اعتماد ہیں قتیبہ نے ان کو شیعہ بتایا ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ وہ ذکی نہ تھے۔ محدث بیہقی نے لکھا ہے کہ: عمر کے آخری حصہ میں ان کا حافظہ ناقص ہو گیا تھا۔ قریب قریب یہی حال دوسرے راویوں کا بھی ہے۔ موسیٰ بن اسماعیل ابن خراش کے بیان کے مطابق (قابل اعتراض) ہیں۔ ابو عوانہ کی بابت ابو حاتم فرماتے ہیں جب وہ اپنی یادداشت سے روایت کرتے ہیں تو اکثر غلطی کر جاتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے بھی ان کے متعلق کچھ ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے۔

بتائیے اس روایت پر کیسے اعتماد کیا جائے جس کے راویوں کا حال یہ ہے۔ امام بخاری نے کتاب الاحکام میں حضرت مسور بن مخرمہ سے بھی ایک روایت کی ہے۔ اس میں یہ نہیں جو ان روایات میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔ "ان الرہط الذین ولاہم عمر اجتمعوا فتشاوروا" (وہ گروہ جن کو حضرت عمر نے والی (حاکم) بنایا ایک جگہ جمع ہوئے اور انھوں نے مشورہ کیا) اس روایت میں ولاہم ہے جس کے معنے ہیں والی اور حاکم بنانا۔ بہت ظاہر ہے کہ اگر ان کو خلیفہ نہیں بنایا گیا تھا اور ان کا کام صرف اتنا ہی تھا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ چنیں تو کسی طرح بھی ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا تھا "وہ لوگ جن کو حضرت عمر نے والی بنایا" علامہ بدرالدین عینی[1] نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ جن کو حضرت عمر نے والی بنایا وہ یہ ہیں:۔ عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، اور عبدالرحمان بن عوف۔ حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ اگر میں انتقال کر جاؤں تو یہ چھ اصحاب اہل شوریٰ ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہیں کہ بوقت وفات حضرت اکرم ان سے خوش تھے۔" بات صرف اتنی ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ یہ چھ اہل شوریٰ ہوں گے۔ باقی راویوں کے تصرفات ہیں۔

ایک اور بات بھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمر نے ان کو خلیفہ منتخب نہیں فرمایا تو حضرت کی یہ روش کچھ عجیب سی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا حضرت عمر ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ مقرر نہیں فرما سکتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنے اوپر کوئی ذمہ داری لینا نہیں چاہتے تھے تو یہ غلط ہے۔ کیا یہ ذمہ داری نہیں کہ انھوں نے فرمایا (جیسا کہ کہا جاتا ہے) کہ امام صرف ان چھ آدمیوں میں سے منتخب کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ان چھ کے علاوہ کوئی دوسرا (مثلاً عبداللہ بن عمر) مستحق خلافت بھی ہو اور وہ حضرت عمر کے اس ارشاد کی وجہ سے محروم ہو جائے۔ جس طرح حضرت عمر نے یہ فیصلہ فرمایا

---

[1] عمدۃ القاری شرح بخاری جلد ۱۱ ص ۲۲۵

کہ یہ چھ آدمی سب سے بہتر ہیں اسی طرح وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی آسانی کے ساتھ چن سکتے تھے۔ بلکہ خود بخاری کی اس روایت میں جو جلیل احسن صاحب نے نقل کی ہے ایسے الفاظ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ سعد بن وقاص کو ان میں سب سے بہتر تصور فرماتے تھے۔ فرماتے ہیں اگر حضرت سعد منتخب ہو جائیں تو کیا ہی بات ہے ورنہ امیر کی رائے سے استفادہ کیا جائے۔ اس دشواری کا ذکر حافظ ابن حجر نے بھی کیا ہے۔ اس کے لئے فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۵۰ ملاحظہ فرمائی جائے۔ ابن سعد کے حوالے سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس کے رجال (راویوں) کی تفصیل ہونا چاہئے تھی ابن حجر نے اس روایت کے اور طرق بھی اپنی شرح میں بیان کئے ہیں۔ لیکن ان کے راویوں کی تفصیل نہیں دی ہے۔

جلیل احسن دشتر کا وہ اپنے متعلق اس مغالطہ میں بھی مبتلا ہیں کہ انھیں یورپ کی موجودہ تحریکات اور اصول سیاست کا بھی علم حاصل ہے۔ چنانچہ اپنے امیر کی سیاسی حیثیت متعین کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔ "میں قارئین نگار، اور جناب پروفیسر صاحب کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ جماعت اسلامی کا امیر امیر ہی ہے، وہ زعامت مطلقہ (ڈکٹیٹرشپ) کے طرز پر امارت کو قطعاً استعمال نہیں کرتا اس کی ایک مجلس شوریٰ ہے جس کے مشورہ اور اتفاق کے بعد ہی سارے امور انجام پاتے ہیں" واہ رے شوخی و بے باکی! اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صاحب جانتے ہی نہیں کہ ڈکٹیٹرشپ کسے کہتے ہیں۔ غریب نے مودودی صاحب کے رسالے میں جو کچھ پڑھا اُسے جوں کا توں نقل کر دیا۔ "نقل را چہ عقل" سوال یہ ہے کہ آپ کا امیر مجلس شوریٰ یا اس کی اکثریت کا فیصلہ ماننے کے لئے مجبور ہے یا نہیں۔ اگر مجبور نہیں تو یہی آمریت مطلقہ (ڈکٹیٹرشپ) ہے۔ ڈکٹیٹر وہی ہے جو اکثریت کے خلاف اپنی ذاتی رائے دوسروں پر عاید کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے آپ کی مجلس شوریٰ وائسرائے کی انتظامیہ کمیٹی کا ایک چربہ ہے مجلس کا انتخاب امیر نے کیا ہے یا جماعت کے لوگوں نے بات ایک ہی ہے۔ امیر اپنی مجلس کی رائے کے خلاف "مطلق العنان ڈکٹیٹر کی طرح اپنا حکم" چلا سکتا ہے۔ یہ آپ ہی کے نزدیک اور آپ ہی کے الفاظ میں "اسلام کی تعلیمات کے قطعاً خلاف ہے" آپ کا امیر "تمام مہمات امور میں اپنی مجلس شوریٰ سے مشورہ لینے پر اسلام کی رو سے مجبور ہے" لیکن ان کا مشورہ ماننے کے لئے مجبور نہیں۔ پھر بھی آپ قارئین نگار کو، جو یقیناً قارئین "ترجمان" نہیں، باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ڈکٹیٹر نہیں ہے۔ یہ آپ کا بھولا پن ہے اور اگر آپ گھبرا کر یہ کہیں کہ امیر مجلس کی اکثریت کا فیصلہ ماننے کے لئے مجبور ہے تو پہلے مجھے یہ بتائیے کہ اس امارت میں اور عصر حاضر کی امارتوں میں کیا فرق ہے۔ بس اپنے نظام میں اتنی ترمیم کر لیجئے کہ آپ امیر کچھ مدت کے لئے منتخب فرمائیں گے۔ اس کے بعد آپ یورپ کے "عصری سیاسی" نظاموں کی آغوش میں ہوں گے۔ دوسرے میں آپ سے یہ کہوں گا کہ گدا بنانے کی ضرورت کیا ہے۔ مجلس شوریٰ ہی رہنے دیجئے۔ وہ اپنی اکثریت سے فیصلے کرے گی اور ان کو عمل میں بھی لائے گی۔ یورپ کی تقلید میں کیا ضرور ہے کہ امیر بنے جائیں۔ ان کے بادشاہ پرانی یادگار ہیں وہ ان کو قایم رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کیوں انکا اتباع کریں۔

میں نے لکھا تھا کہ اسلام، جمہوری نظام سیاست کا حامی ہے۔ اسی لئے ترکی کے علماء و فقہاء نے جمہوری نظام ہی کو اسلام کا سیاسی نظام قرار دیا ہے۔ اس پر تبصرہ جن الفاظ میں کیا گیا ہے وہ ان حضرات کی علمی بے مائگی کے آئینہ دار ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اس قسم کی بات اور اتنی تحدی کے ساتھ وہی لوگ کہنے کی جرأت کرتے ہیں جو یا تو عصری جمہوریت کو نہیں جانتے یا اسلام کے سیاسی نظام کے اُصول و مبادی سے قطعاً بے خبر ہیں یا دونوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یا دونوں کو خوب سمجھتے ہیں لیکن کسی وجہ سے اپنے علم کے خلاف بولنے اور لکھنے پر مجبور ہیں۔" اب انھیں کون سمجھائے کہ آپ جن باتوں کو جانتے نہیں۔ ان میں دخل ہی کیوں دیں۔ اتفاق سے میری عبارت میں جمہوری نظام آگیا تھا۔ اور یہ لفظ بار بار انکے کانوں میں پڑ چکا تھا۔ بس پھر کیا تھا اس کے تعلق سے جو کچھ دماغ میں تھا سب اُنڈیل کر رکھدیا۔ خدا کے بندے اتنا تو سوچا ہوتا کہ جمہوری نظام کیا یہاں عصری جمہوریت یا اس کے کسی مخصوص ڈھانچے کے معنے میں استعمال ہوا تھا عصری جمہوریت بھی کوئی ٹھکا بندھا نظام ہے۔ جمہوریہ یہاں عوامیہ کے معنے میں تھا۔ مطلب یہ تھا کہ امارت فرد واحد کی نہ ہو۔ جمہوریہ یا عوام خود اپنا سیاسی نظام چلائیں۔ اور اپنے امور کی باگ کسی دوسرے ایک انسان کے ہاتھ میں نہ دیں۔ اتنی سی بات تھی۔ لیکن جمہوریت کا لفظ سنتے ہی آپ اُچھل پڑے اور سوچنے لگے یہ تو وہی لفظ ہے جو ہم نے اپنے امیر کے رسالے میں پڑھا ہے۔ یہ کہاں کا علم ہے کہ اگر کسی بحث میں ایک لفظ آجائے۔ سیاق و سباق سے اس کا مفہوم بھی متعین ہو مگر آپ اُسے ان تمام حدود و قیود کے ساتھ لیں جو کسی ایک قوم میں اس لفظ کے لئے مقرر ہو چکی ہیں۔ جمہوریت دراصل (Democracy) کا ترجمہ ہے۔ یہ یونانی لفظ ہے۔ عربی میں اس کا تلفظ دیموقراطیت ہے۔ اس کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ وہ نظام جس میں عوام کا ہاتھ ہو۔ اس کی ہزاروں صورتیں ہیں انگلستان کا پارلیمانی نظام اور روس کی اجتماعیت و اشتراکیت دونوں جمہوری نظام ہیں۔ تاریخ میں صدہا نظام بنے اور بگڑے۔ جن میں اقتدار عوام کے ہاتھ میں رہا وہ سب جمہوری نظام کہلائے۔ جمہوریت ان میں قدر مشترک تھی ورنہ ان کی شکلیں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھیں۔

ایک تو ہے جمہوریت اور ایک ہے اس کا ڈھانچا۔ یہ دونوں جدا جدا ہیں۔ روس کی اجتماعیت بھی جمہوریت ہے اور انگلستان کی پارلیمان بھی گو ناقص قسم ہی کی سہی۔ اعلیٰ و برتر جمہوریت وہ ہے جس میں عوام کا پورا پورا اقتدار ہو۔ ہر چند یہ جمہوریتیں ہیں مگر ان کے سیاسی دساتیر، ان کے نظامہائے حکومت، ان کے رسوم و روایات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگر کوئی جمہوریت کو بنظر استحسان دیکھتا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ اس جمہوریہ کے دستوری نظام (Constitution) کو بھی پسند کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جدید ترکی کے علماء و فقہاء نے جمہوریت کو اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ از روئے اسلام ضروری نہیں کہ اقتدا

کی باگ فردِ واحد کے ہاتھ میں دیجائے۔ یہ بات بھی میں نے اپنی طرف سے نہیں کہی تھی بلکہ علامہ اقبال مرحوم کے لکچروں سے ان کا ایک قول نقل کیا تھا۔ اس پر مولانا ندوی کو "اسلام کی غرقابی کی دردناک داستان" یاد آگئی اور وہ اپنے تصور کی آنکھوں سے "اسلام کا پورا سیاسی و معاشی نظام باسفورس" میں غرق ہوتا دیکھنے لگے۔ مجھے قارئین یہ کہہ لینے دیں کہ اگر اسلام وہی ہے جو یہ حضرات پیش کر رہے ہیں تو ان کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ یہ حضرات مسجد کے حجروں اور خانقاہوں کے گوشوں میں بیٹھ کر اسلام اور اس کے احکام کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ آسمان کی وسعتوں کو اپنے حقیر پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اسلام ان کے تنگ دماغوں میں نہ سما سکے گا۔ یہی تنگ نظر لوگ ترکی میں بھی تھے۔ مغربی طاقتوں سے رشوتیں لیتے تھے اور اسلام کے نام سے ترکی قوم کو گرا کر اسلام ہی کی بنیادوں کو ڈھا رہے تھے اس المناک داستان کو کوئی صاحب پڑھنا چاہیں تو خالدہ ادیب خانم کی تحریریں پڑھیں۔

امیر شکیب ارسلاں کے نام سے مجھے یاد آگیا کہ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں مصر کے مشہور علمی رسالے "المنار" میں ایک مضمون لکھا تھا "مسلمان کیوں پیچھے ہیں اور دوسرے کیوں آگے"۔ اس مضمون میں انھوں نے اسلامی دنیا کا ایک دردناک نقشہ کھینچ کر دکھایا تھا۔ لیکن ترکی کا ذکر آیا تو انکی زبان قلم سے[1] یہ الفاظ تراوش پا ہی گئے۔ "بے شک جب ترکوں نے قربانیاں دیں تو وہ خدا کی نعمتوں سے سرفراز ہوئے۔ اور انھوں نے آزادی حاصل کی۔ اس سے پہلے وہ پست تھے مگر اب بلند ہوگئے۔ پہلے ذلیل و خوار تھے مگر اب انھوں نے عزت حاصل کرلی"۔ بہرحال یہ تو ایک ضمنی بحث ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں نے آخر کار ترکی کے دستور حکمرانی کو کب سراہا اور یہ کہاں کہا کہ "ترکی میں اسلام کا نظام حکومت چلایا جا رہا ہے"۔ میں نے صرف اس نظام حکومت کے بنیادی اصول یعنی جمہوریت کا ذکر کیا تھا اور علامہ اقبال کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ خلع خلافت کے موقع پر جب آپ جیسے تنگ نظر ملاؤں نے بطل کبیر مصطفےٰ کمال پاشا اور انکے ساتھیوں پر کفر کا فتویٰ لگایا اور ان کی بابت کہا کہ یہ لوگ سلطان کو تخت سے اتار کر خلافت اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں تو اہل علم کی ایک جماعت کھڑی ہوئی اور انھوں نے اعلان کیا کہ خلافت کا منشا ہرگز یہ نہیں کہ ایک فرد کو خلیفہ بنایا جائے۔ اسلام میں عوام خود خلیفہ ہیں اور ان کے نمایندے دراصل ان کی طرف سے ملک میں انتظام رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔

عام علماء اسلام اور مودودی صاحب کے نظریۂ امارت میں فرق کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا۔ "ہندوستان اور مصر کے علماء نے اس وقت تک اس نقطے پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا کہ خلافت و امامت ایک منتخب جماعت کو بھی سپرد کی جاسکتی ہے یا نہیں، لیکن مودودی اور ان کی جماعت یہ اعلان کر چکی ہے کہ منتخب جماعت کی امامت سرے سے غیر اسلامی چیز ہے"۔ اس کے جواب میں جلیل صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس سہارنپور کی روداد

---

[1] کتاب الاسلام صفحہ ۵۲۵

پیش فرمائی ہے اور آخر میں لکھا ہے: "یاد رہے کہ علماء کی اس مجلس مباحثہ میں کسی شخص نے بورڈ کی امارت کا ذکر تک نہیں کیا" یہ حال ہے ان حضرات کے ذہن وفہم کا۔ خدا کے بندے میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ اب تک حضرات علماء کے سامنے بورڈ کی امارت کا مسئلہ پیش ہی نہیں ہوا۔ اس لئے جو چیز ان کے سامنے نہیں آئی اس کی بابت ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان کے نزدیک ناجائز اور "اسلام کی روح تعلیم کے قطعاً منافی ہے"۔ اس کے ساتھ ہی مظاہر العلوم سہارنپور کا ایک فتویٰ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس فتوے میں بھی یہ نہیں کہ پوری جماعت کو امام منتخب کرنا کوئی جاہلانہ فعل ہے۔ معلوم نہیں حضرات علماء سہارنپور سے کیا سوال کیا گیا تھا۔ جلیل صاحب نے سوال تو چھوڑ دیا ہے صرف جواب نقل کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جواب سوال پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ اگر بات توڑ مروڑ کر پیش کی جائے تو یقیناً منشاء کے مطابق جواب حاصل کیا جاسکتا ہے اور قارئین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ یہ حضرات کتر بیونت، کاٹ تراش اور تنسیخ میں جو در اصل دماغی کشتی کے داؤ پیچ ہیں بہت مشاق ہیں۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میرے دلایل کے متعلق استفتاء ہی کیوں کیا گیا۔ کیا دلائل بھی کوئی ایسی چیز ہیں کہ ان کے متعلق فتوے طلب کیا جائے۔ کیا مودودی صاحب نے بھی اپنی تحریک کے متعلق تمام مباحث فتوے ہی سے طے کئے ہیں۔ کیا انھوں نے اپنی دعوت پر علماء ہند سے کبھی فتوے لیا ہے۔ کیا ان کی امامت تمام علماء اسلام کے نزدیک کوئی اسلامی چیز ہے۔

عہد صحابہ کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا تھا اسے "استبداد بالرای" کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ ان کے جماعت کے ایک ذمہ دار رکن مولانا نذیر الحق نے صحابہ کے متعلق کیا لکھا ہے ملاحظہ فرمائیے: "ہم یہ نہیں کہتے کہ صحابہ انبیاء کی طرح گناہوں سے معصوم تھے۔ ان کو حصول خلافت کی تمنا نہ تھی۔ انھوں نے کوئی غلطی یا کسی پر کوئی دانستہ یا نادانستہ ظلم نہیں کیا... اور حصول خلافت کے معاملات میں بے احتیاطیاں نہیں ہوئیں۔ ہوئیں اور ضرور ہوئیں"

یہ غالباً پوری جماعت اسلامی کے مشورے اور رائے کا نتیجہ ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جلیل صاحب نے جب بار بار مجھے خطوط لکھے اور استفسارات فرمائے تو میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے خیالات قلمبند فرما کر نگار کو بھیجدیں لیکن اب وہ لکھتے ہیں۔ "اگر پروفیسر صاحب اس جرم تنقید کی پاداش میں اپنے مقالے کے دیباچے سے زیادہ اشتعال انگیز باتیں کہیں گے تو بھی ہم مسرت کے ساتھ انکا استقبال کریں گے"۔ کیوں؟ اس لئے کہ آپ نے "تنقید" کی ہے۔ اس کا تو میں نے ہی مشورہ دیا تھا اور اگر اسکی وجہ آپ کی تحریر کا لب ولہجہ ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ آپ کا "مجرم ضمیر" ہے جو آپ کو بے چین کر رہا ہے۔ تنقید تو کوئی جرم کی بات نہیں۔ ہاں انسان کا ذہن اور ضمیر ضرور مجرم ہوا کرتا ہے اور اس جرم کی پاداش میں اسے سننا اور بھگتنا بھی پڑتا ہے۔

شوکت سبزواری

جشن

"پانی - پانی" شمیا نے کراہتے ہوئے کہا۔

اُس کا جسم بخار کی شدت سے بُھنا جا رہا تھا۔ تین روز سے آنکھ نہ کھولی تھی۔ شمیا کی بوڑھی ساس اور اُسکے شوہر نوابو نے بھی یہ تین راتیں آنکھوں ہی میں کاٹ دی تھیں۔ شمیا کی زبان سے پانی کی آواز سنکر نوابو کے چہرے پر صدہا خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ وہ دالان کی طرف بھاگا۔ اندھیرا تھا۔ کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔ شاید خون بھی نکلا ہو مگر اُسے یہ دیکھنے کی کہاں فرصت تھی۔ پانی اونڈیلا اور پھر تیزی سے کوٹھری کی طرف بڑھا۔۔۔۔۔ ابھی کوٹھری میں قدم رکھا ہی تھا کہ:

"نوابو — نوابو" کہتے ہوئے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

نوابو کے پیر کانپنے لگے۔ بیکسی کے آنسو اُمنڈ آئے۔ نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی اور نہ پیچھے ہی لوٹا جاتا تھا۔ نوابو کی ماں جہاندیدہ تھی، اصل معاملہ کو بہت جلد سمجھ گئی۔ وہ اُٹھی اور نوابو کے قریب آگئی۔

"جاؤ بیٹا نواب کو کوئی ضروری کام پڑ گیا ہوگا۔ جبھی تو اتنی رات گئے تمھیں بلایا ہے۔ تمھارے بغیر تو نواب کا کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ جاؤ، کھڑے کیوں ہو۔ اب تو بہو اچھی ہے۔ ہوش بھی آگیا ہے — پانی میں پلا دوں گی۔" وہ نوابو کو سمجھا رہی تھی۔ مگر خدا معلوم اُسکی آواز بھی کیوں بھرائی جا رہی تھی۔ اُسنے سہارے سے ڈھکیلا۔ نوابو گلاس ماں کے حوالے کر کے باہر نکل گیا۔

"اتنی دیر کر دی۔ نواب صاحب غصہ ہوتے ہوں گے۔ بیگم صاحب بیمار ہو گئی ہیں۔۔۔۔" خدا جانے نواب کی یہ منہ چڑھی نوکرانی اور کیا کیا بکتی رہی۔ نوابو کو کچھ بھی نہ سنائی دے رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "خدا نے مجھے غریب کیوں بنا دیا میں تو خدا کو نواب سے کہیں زیادہ مانتا ہوں — جمعہ جمعہ کی نماز — کچھ روزے — فقیر کو گیہوں نہ سہی جو اور جوار کا آٹا تو ضرور دیتا ہوں۔ اور یہ نواب ہے کہ آج تک فقیر کو اس کے در سے بھیک تک نہیں ملی۔ روزہ کو فاقہ سمجھتا ہے۔ نماز کیسی کبھی مسجد کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مگر خدا اسے دے رہا ہے۔ میرے جیسے کئی نوکر۔ موٹر۔ کوٹھی — میں بھی تو نواب ہوں — میری ماں مجھے نواب کہکر کیسی خوش ہوتی تھی — جب سے یہاں نوکری کی میرا نام بھی بدل دیا گیا۔ نواب سے نوابو ہو گیا۔ ٹھیک ہے نواب کے یہاں نواب کیسے نوکر ہو سکتا تھا — اور بیچاری شمیا — کئی روز سے بخار میں پھُنک

رہی ہے۔ دوا کہاں سے لاؤں۔ پوری تنخواہ قرض میں نکل گئی - اس زمانے میں چودہ روپیے - تین پیٹ - وہ تو ماں کے زیور گروی ہوتے رہے — مگر اب کیا ہوگا۔ شمیا کو یونہی تڑپ تڑپ کر مر جانے دوں - پاؤ بھر دودھ بھی اُس کے منہ میں نہیں جاتا — ہاں آج نواب سے ضرور کہوں گا — مالک ہیں — اُن کے بھی تو بیوی ہے — ضرور ترس کھائیں گے...

"کہاں مر رہا تھا - ایک گھنٹہ ہو گیا - اب آیا ہے کمبخت - بیگم صاحب کی جان پر بنی ہے اور تو آرام کر رہا ہے" نواب نے نوابو کو سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھ کر آڑے ہاتھوں لیا۔

"حضور - حضور ......" نوابو گھبرا گیا - الفاظ حلق میں اٹک کے رہ گئے۔

"حضور کا بچہ - تجھے معلوم تھا کہ ٹیلیفون خراب ہے - ڈاکٹر کو بلانے کون جائے - ہم نے تجھے اپنے آرام کے لئے رکھا ہے - صبح ہوتے ہی اپنا حساب کر اور جدھر جی چاہے چلا جا ......"

"جانے بھی دیجئے - دن بھر کام کرتا ہے - آنکھ لگ گئی ہوگی — ہاں نوابو جاؤ سرجن صاحب کو بلا لاؤ - کہنا بیگم صاحب کے سر میں سخت درد ہے - نیند بالکل نہیں آتی"۔ بیگم نے بات کاٹ دی ورنہ ابھی نواب خدا معلوم اور کیا کیا بکتا - نوابو اُلٹے پاؤں واپس ہو کر ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

سرجن صبح تک بیٹھا رہا - کوٹھی میں کہرام مچا ہوا تھا - ہر ایک زبان پر بیگم صاحب کی بیماری کا تذکرہ تھا - نواب گھبرایا ہوا ادھر اُدھر آجا رہا تھا - ایسے میں کون سو سکتا تھا - نوابو اپنی کوٹھری میں واپس کیسے جاتا - بیگم صاحب بیمار تھیں اور شمیا - شمیا کا خیال آتے ہی اُس کے دل پر چوٹ پڑی - کلیجہ مسوس کر رہ گیا - اُس نے ارادہ کیا کہ آج ہی نوکری چھوڑ دے - مگر جائے کہاں ؟ — دوسری نوکری ملنا مشکل اگر ملی بھی تو نہ معلوم مالک کیسا ہو - اس سے بد دماغ ہوا تو پھر کیا ہوگا — اونہہ - میں کہیں نہیں جاؤں گا — نواب اتنا بُرا نہیں - اُس کی بیوی بیمار ہے اسی لئے دماغ چڑچڑا ہو گیا ہے — میں بھی تو شمیا کی بیماری سے پریشان ہوں ....

"ایک - دو - دس - بیس" نواب نے دس دس روپے کے پورے بیس نوٹ سرجن کی طرف بڑھائے۔ بیگم صاحب کو نیند آگئی تھی - دوا سے فایدہ ہوا تھا - نوابو نے للچائی ہوئی نظروں سے نوٹوں کو دیکھا - سرجن روانہ ہو گیا - کوٹھی میں سناٹا چھا گیا - کسی کو بات کرنے کی اجازت نہ تھی - کیونکہ - بیگم صاحب کو نیند آگئی تھی - نوابو بھی خاموش رہا - ایسی حالت میں نواب سے کیا کہتا۔

شمیا کی حالت گرتی چلی گئی - اور کیوں نہ گرتی - نہ غذا نہ دوا - ٹھیک سے دیکھ بھال نہ ہو سکی - نوابو کو کوٹھی کے کاموں سے فرصت نہ ملتی - دو گھڑی کو آجاتا تو آفت ہو جاتی - نوکرانیاں چلاتیں - نواب برہم ہو جاتا - نوابو نے کئی بار ارادہ کیا کہ شمیا کی بیماری سے نواب کو آگاہ کرے - مگر ہر مرتبہ بات کٹ جاتی اور اُسے کسی نہ کسی کام کے لئے حکم مل جاتا - نوابو کی بڈھی ماں کیا کیا کرتی - بیچاری آنکھوں سے مجبور - ٹٹول ٹٹول کر روٹی پکاتی - شمیا کو بخار تو کم ہو گیا - مگر کھانسی

اور حرارت مستقل رہنے لگی - غریب دنوں سے بھی بھی - کمزوری بڑھتی ہی گئی - اور دو ہی ہفتہ میں یہ حالت ہو گئی کہ ہڈیاں نکل آئیں - نوابو اب بھی مجبور تھا - آسمان سے تارے کیسے توڑتا - اُس کی تیمارداری شاید کچھ فایدہ پہونچاتی مگر چوبیس گھنٹہ میں صرف دو تین گھنٹوں کے لئے وہ گھر آتا تھا - شمیا کو حقیقتاً دوا سے زیادہ نوابو کی ضرورت تھی - جب ذرا حواس درست ہوتے تو نوابو کو پوچھتی - جہاندیدہ بڑھیا فوراً کہہ اُٹھتی کہ ابھی باہر گیا ہے - مگر یہ جھوٹی تسلیاں کب تک چلتیں شمیا کی نگاہیں دروازے پر لگی رہتیں - وہ ہر آواز پر چونک اُٹھتی " یوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا -

"حضور شمیا بہت بیمار ہے" آخر ایک دن نوابو نے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا -

"کب سے بیمار ہے - کیا بیمار ہے"

"مالک بہت روز سے بیمار ہے - ہلکی ہلکی حرارت رہتی ہے اور کھانسی بھی آتی ہے"

"پھر کیا چاہتے ہو"

"حضور مجھے کچھ دنوں کی چھٹی دیدیجئے - میری ماں کو آنکھوں سے نہیں دکھائی دیتا"

"نہیں نہیں نوابو تم ہمارا بہت کام کرتے ہو - تمھیں چھٹی نہیں مل سکتی" اور ایک دس کا نوٹ نواب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نوابو کے ہاتھ میں رکھ دیا -

"تمھیں چھٹی نہیں مل سکتی" نوابو بڑبڑایا - اُس نے زور سے مٹھیاں بند کیں - نوٹ اُس کی اُنگلیوں میں چُرمُرانے لگا اُس نے جلدی سے اُنگلیاں کھولدیں - نوٹ - دس کا وہ لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا اپنی کوٹھری کی طرف لپکا -

"ماں یہ دوا لایا ہوں - چار روپیہ کی ملی ہے - اور یہ پاؤ بھر انار - دو سیب - اب شمیا اچھی ہو جائے گی" نوابو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا -

"کیوں نہ ہو جائے گی" نوابو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"کیوں نہ ہو - میں نہ کہتی تھی نواب بڑا بھلا مانس ہے - بھلا کتنے روپے دئے اُسنے" نوابو کی ماں بولی -

"دس کا نوٹ"

"دس روپے، کتنا اچھا ہے نواب - ہاں بیگم صاحب کیسی ہیں"

"ابھی اچھی نہیں"

"میں آج انھیں دیکھنے جاؤں گی"

"ناماں تو وہاں جاکے کیا کرے گی - تجھے دکھائی بھی تو نہیں دیتا"

"اماں کے ساتھ میں جو جاؤں گی" شمیا نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا -

"نہیں ابھی نہیں - اگلے ہفتہ بیگم صاحب کے اچھے ہونے کی خوشی میں جشن ہوگا - اُس میں تم دونوں جانا" نوابو نے

بات ٹالتے ہوئے کہا

"کب جشن ہوگا" شمیا نے نوآبو کا منہ تکتے ہوئے کہا

"آج اتوار ہے - اگلی اتوار کو" نوآبو نے سست آواز میں جواب دیا -

"اگلی اتوار - - - - خدا جانے جب تک ہیں - - - - - " شمیا اور کچھ نہ کہہ سکی - دروازہ پر نوکرانی نوآبو نوآبو چلا رہی تھی -

اتوار کو جشن تھا - جمعہ ہی سے نوآبو پر کام لد گیا - جتنے اہم اور ضروری کام تھے سب نوآبو کے سپرد ہو گئے - نواب کو نوآبو پر بڑا اعتبار تھا - اکثر نوآبو کی ایمانداری کی تعریف کیا کرتے - ہزاروں روپیہ کا لین دین نوآبو کے ہاتھوں ہوتا - دوسرے نوکروں پر نواب کو بالکل اعتماد نہ تھا - بیگم صاحب کے نئے زیورات کے تقاضے کو بھی نوآبو ہی گیا - کپڑوں کا حساب بھی نوآبو نے بیباق کیا - پھر دعوت کا نیوتا دینے کون جاتا - دوسرے نوکر خدا معلوم پہنچ جاتے یا نہ جاتے - نوآبو کے سر یہ کام بھی منڈھا گیا - باورچی خانہ کی دیکھ بھال - فرش و روشنی کا انتظام - کوٹھی سجانا - جھنڈیاں لگوانا - کون سا ایسا کام تھا جس کے لئے نوآبو کو نہ دوڑنا پڑا ہو - پھر بیچارے کو فرصت کہاں ملتی - شمیا انتظار کرتے کرتے نیند یا کثرت ضعف سے غافل ہو جاتی - نوآبو رات کی رات آکر پڑ رہتا - اور منہ اندھیرے ہی پھر اُس کی پکار پڑ جاتی - بڑھیا بہو کی پٹی سے لگی تسلی دیا کرتی - جب شمیا غافل ہو جاتی تو خود بھی وہیں پڑ رہتی -

سرجن دونوں وقت بیگم صاحب کی مزاج پرسی کو اب بھی آتا تھا - گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھتا - ناشتہ ہوتا فیس دیجاتی اور وہ خوشی خوشی موٹر کا ہارن بجاتا ہوا چلا جاتا - نوآبو روز یہ تماشہ دیکھتا اور دل ہی دل میں کڑھتا - وہ سوچتا خدا کے کھیل بھی عجیب نرالے ہیں - بھلے چنگے کے لئے سرجن اور بیمار کو ایک چمچہ دودھ بھی نصیب نہیں - خدا کے کاموں میں کے دخل - جو وہ کرتا ہے - ایک دن جب سرجن بیگم کی مزاج پرسی سے فارغ ہو کر کار کی طرف چلا - نوآبو بھی پیچھے ہو لیا - اُسکی صورت مجسّم سوال تھی - سرجن نے پوچھا "کیا بات ہے نوآبو" سرجن کا لہجہ بالکل بنیوں جیسا تھا -

"حضور میری شمیا بہت بیمار ہے" نوآبو نے ڈرتے ڈرتے کہا

"اوہ تم نے اب تک کیوں نہیں بتایا - چلو میں ابھی دیکھ لوں" - سرجن نوآبو کے آگے آگے چلنے لگا - نوآبو دل ہی دل میں سرجن کی رحمدلی کی تعریف کر رہا تھا - سرجن لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا نوآبو کی کوٹھری میں داخل ہوا -

"نوآبو یہ تیرے ساتھ کون آیا ہے" نوآبو کی ماں نے کئی قدموں کی آوازیں سُنکر کہا

"سرجن صاحب ہیں ماں - شمیا کو دیکھنے آئے ہیں" نوآبو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک رہے تھے -

شمیا نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں - سرجن جھکا ہوا شمیا کی نبض دیکھ رہا تھا -

"نوآبو - شمیا تو اب - - - - - خیر میرے ساتھ چلو - میں دوا دیتا ہوں" - ڈاکٹر نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا -

دوا آئی - شمیا کو پلائی گئی - نوابو اور اُس کی ماں خوش تھی - اب شمیا اچھی ہو جائے گی - سرجن کا علاج ہو رہا ہے بیگم صاحب بھی ان کے علاج سے اچھی ہوئی ہیں - آج سنیچر ہے - نوابو کو صبح سے گھر جانے کی فرصت نہ ملی - وہ پھر بھی مسرور تھا - شمیا کا علاج سرجن صاحب کر رہے تھے - "کتنے اچھے ہیں سرجن صاحب - سب بڑے لوگ خراب نہیں ہوتے - غریبوں نے انھیں بلاوجہ میں بدنام کر رکھا ہے" وہ یہی سوچتا ہوا نواب کے سامنے پہونچ گیا -

"نوابو یہ شمیا کا علاج سرجن صاحب کب سے کر رہے ہیں" نواب نے نوابو کو دیکھتے ہی کہا -

"کل سے حضور" نوابو نے عجیب خوشی کے انداز میں کہا - اُس کی آنکھوں سے مسرت کی لہریں نکل رہی تھیں -

"مگر یہ ساٹھ روپیہ کا بل کون ادا کرے گا" نواب ذرا کرخت لہجہ میں بولا -

"ساٹھ کا بل - کیسا بل مالک" نوابو حیرت سے نواب کا منھ تکتے ہوئے کہا -

"شمیا کی دواؤں اور سرجن کی فیس پر ساٹھ روپیہ خرچ ہوئے ہیں - نوابو تم نے مجھ سے کیوں نہ کہا - میں کسی اور ڈاکٹر کو بلا دیتا - اتنے روپئے تم کیسے ادا کر سکو گے" نواب نے روکھے پن سے جواب دیا -

نوابو سناٹے میں آگیا - "سب بڑے لوگ بُرے نہیں ہوتے - سرجن کتنا رحم دل ہے" - اُسے اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا - - - - - - - -

"تمھاری تنخواہ چودہ روپئے ہے - اگلے مہینہ سے تمھیں دس روپئے ملا کریں گے" نواب نے نوابو کو خاموش دیکھ کر کہا -

"دس روپئے" اور تین پیٹ - نوابو کانپ اُٹھا - کیا جواب دیتا - جواب تو اُسے دے جو اُس کی حالت سے واقف نہ ہو - نواب تو جان بوجھ کر یہ ظلم کر رہا تھا پھر کیا کہے اور کس سے کہے -

آج بیگم کا غسل صحت ہے - صبح ہی سے موٹروں پر موٹریں آنا شروع ہو گئیں - نواب اور بیگم کے اعزہ دو روز قبل ہی سے مدعو تھے - اور اب یہ کلکٹر صاحب - یہ تحصیلدار - یہ صوبہ دار - یہ احمد علی شہر کے سب سے بڑے رئیس تمام ہال مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا - نقرئی قہقہے اور زوردار ٹھٹھے فضا میں گونج رہے تھے - تقریباً تمام مہمان آ چکے تھے - نواب صاحب بڑے گیٹ پر کھڑے آنے والوں کا استقبال کر رہے تھے - گیٹ سے کوٹھی تک فرش بچھا تھا - جھلملاتے اور نرم قالین جوتوں کی چوٹوں سے شرمائے جا رہے تھے - مہمان تو آ چکے تھے - مگر نواب صاحب ابھی تک گیٹ پر کھڑے ہیں - کیوں ؟ - ہاں، ایک مہمان کا اور انتظار ہے - لیجئے وہ بھی آ گئے .. کون ؟ سرجن صاحب - بیگم صاحب کے معالج - بغیر ان کے محفل کا کیا لطف - "مگر نوابو کہاں - کھانے کا وقت ہو رہا ہے" نواب بڑبڑاتا ہوا کوٹھی میں داخل ہوا - بیگم اوپر کی منزل پر بیٹھی تماشہ دیکھ رہی تھیں - نواب بیگم کے قریب پہونچتے ہی چلا دیا -

"دیکھتی ہو بیگم اِس نمک حرام کو۔ کھانے کا وقت ہو گیا اور اس کا ابھی تک پتہ نہیں۔ بس اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔ آج ہی نکال۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نواب کی نگاہ پچھلی کھڑکی پر پڑی ۔۔ چار آدمی ایک چارپائی کو اٹھائے کوٹھی کے پچھلے گیٹ سے نکل رہے تھے۔

"بیگم اِدھر آؤ۔۔ یہ دیکھو ۔۔ کون ۔ نوابو اس کی مٹی لئے جا رہا ہے۔" قریب کھڑی ہوئی ایک لونڈی نے نواب کو آگاہ کیا۔

بیگم نے بھی بڑھکر اس منظر کو دیکھا۔ شمیا کی میت ۔۔۔ صرف چار آدمی۔ پانچواں کاندھا بدلنے کو بھی موجود نہ تھا۔

"مرگئی ۔۔۔ آج ہی مرنا تھا اسے ۔۔۔ بیچاری نے جشن بھی نہ دیکھا ۔ اور نوابو۔ کتنی دیر میں واپس آئے گا یہ ۔۔۔ کھانا طیار ہے ۔ مہمان کیا کہتے ہوں گے" نواب کی نگاہیں جنازے پر تھیں۔ مگر منہ سے اب بھی بڑبڑا رہا تھا۔

منشی ملیح آبادی

(زیر طبع)

من ویزداں

یعنی

حضرت نیاز فتحپوری کے اُن تمام مذہبی مقالات کا مجموعہ جنھوں نے مذہبی خانوادوں میں ہلچل ڈالدی تھی اور جن کا نقطۂ نظر بلا قید ملت و مذہب تمام انسانوں کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کرتا ہے۔

حضرت نیاز نے اپنے ان مقالات میں بتایا ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم کیا ہے اور ہمارے علماء سو نے اسکو کس درجہ مسخ کر دیا ہے۔

اس وقت جبکہ ہندوستان میں قیام امن و سکون لئے ایک ایسی ہیئت اجتماعی کے قیام کی ضرورت ہے جو ملک کے تمام افراد کو ایک مرکز پر لا سکے، یہ مجموعہ انجیل نجات ہے اور اس کا مطالعہ ہر ہندو مسلمان پر واجب ہے۔

قیمت کا اندازہ علاوہ محصول کم از کم چھ روپیہ کیا گیا ہے اور نفیس کاغذ پر اس کی طباعت کا انتظام کیا گیا ہے لیکن پیشگی قیمت بھیجنے والوں سے معہ محصول صرف پانچ روپیہ لئے جائیں گے۔

مینیجر "نگار" لکھنؤ

مجنوں گورکھپوری — ایک مطالعہ

(۲)

فکر اور جذبہ ——— مجنوں کے تمام ادبی سرمائے میں یہ دو چیزیں آپ کو ہر جگہ نمایاں نظر آئیں گی۔ اُن کے جذبات ایک فکری میلان کا پتہ دیتے ہیں، اُن کے افکار میں جذبات کی گرمی اور تپش محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے میں اُن کی فکر کو جذباتی فکر کہتا ہوں، جب اُن کی پیشانی پر غور و فکر کی شکنیں نمایاں ہوتی ہیں، تو ان کے قلب کی حرکت بھی باندازۂ تفکر زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

——— لیکن یہ کہنا بھی غالباً صحیح ہوگا کہ یہ خصوصیت مجنوں کی تحریروں میں ابتداء میں اپنی پوری قوت و توانائی کے ساتھ ظاہر نہیں ہوئی تھی اور ایک وقت ایسا بھی تھا جبکہ مجنوں ایک شاعر و ادیب کے قلب سے کم اور ایک مفکر اور فلسفی کے دماغ سے زیادہ کائنات اور اس کے مقدر پر غور کیا کرتے تھے۔ تامل و فکر کے اس دور میں مجنوں کے قلم سے اکثر چیزیں ایسی نکلیں جو خالص علمی اور حکیمانہ موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کا سبب ان کے اُس مخصوص فکری میلان کے باوصف جو غالباً ان کی طبیعت اور مزاج کا خاصہ ہے، اُن کا وہ مطالعہ بھی تھا جو وہ اکثر مغربی اور مشرقی مفکرین کے باب میں کیا کرتے تھے۔ اگر میں تاریخی غلطی نہیں کرتا، تو میرا یہ قیاس غالباً نادرست نہیں کہ "تاریخ جمالیات" اور "شوپنہار" اسی دور کی چیزیں ہیں۔ اور پھر یہ دور بھی وہ دور تھا کہ ابھی اس طرح کے سنجیدہ اور غور و فکر کرنے والے حضرات کے قلم جنبش میں نہ آئے تھے۔ منطق و فلسفہ کی کتابوں کا سرمایہ اگرچہ عربی زبان میں بہت شاندار تھا، لیکن اول تو یہ کہ اس کا تعلق زیادہ تر عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے فلسفہ سے تھا اور پھر یہ بھی کہ جو جدید اضافے اس زبان میں ہو رہے تھے اس سے ہمارے ملک کے اکثر حضرات بے خبر تھے، ایشیائی زبانوں کی اس کوتاہ دامانی کے پیش نظر، اُردو کو ایک علمی زبان بنانے کی تحریک لوگوں میں پیدا ہو چلی تھی، دکن نے اس سلسلہ میں عظیم الشان خدمات پیش کیں اور انجمن ترقی اُردو کے ساتھ ساتھ جامعہ ملیہ دہلی نے بھی تراجم و تالیفات کا کام شروع کیا۔ فلسفۂ نفسیات، فلسفۂ مدنیت و سیاست، فلسفۂ معاشیات اور فلسفۂ جمالیات پر بعض لوگ لکھنے کی کوشش کرنے لگے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے حقیقت میں بہت اچھا کام کیا۔ اس کے علاوہ چند اور حضرات مثلاً خواجہ عبدالحکیم صاحب، ڈاکٹر یوسف حسین صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب

بھی اس طرف توجہ کرتے رہے، اسی دور میں مجنوںؔ کو بھی ایسے موضوعات پر لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی اور انھوں نے اپنے قلم کے لئے اپنے مخصوص مزاج کے موافق مخصوص چیزیں منتخب کرلیں۔

"تاریخ جمالیات" اہلِ مغرب کے فلسفۂ حُسن پر ایک مختصر تاریخی تبصرہ ہے جو ابتداءً "ایوان" ۱۹۳۱ء میں ایک مقالے کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ بعد کو اسی کو ایک مستقل کتابی صورت دی گئی اور یہ کتاب اسی کا نتیجہ ہے۔ "تاریخ جمالیات" مجنوںؔ کے قلم سے اُسوقت نکلی تھی، جب ابھی "جمالیات" کی اصطلاح اُردو زبان و ادب کے لئے بالکل نئی اور بہت بڑی حد تک نامانوس اصطلاح تھی، ہنوز چند "اگلے وقتوں کے لوگ" ایسے زندہ تھے جن کے نزدیک اس نوع کی اصطلاح محض ایک بے معنی ادبی بدعت کا حکم رکھتی تھی اور بجائے اس کے کہ جمالیات اور اس کے فلسفہ پر کوئی صاحبِ فکر غور کرے اور قلم اُٹھائے، اکثر لوگ ابھی اس بحث میں اُلجھے ہوئے تھے کہ Aesthetics کا ترجمہ "جمالیات" ہونا چاہئے یا "حسیات" "وجدانیات" ہونا چاہئے یا "کیفیات"! ہندوستان کے طول وعرض میں ایسے اُردو لکھنے والوں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی تھی جو فکر و بصیرت کے ساتھ کسی موضوع پر علمی اور فلسفیانہ انداز میں گفتگو کرسکیں — اس دور میں یہ کتاب مجنوںؔ کے قلم سے نکلی۔ ممکن ہے آج ۶۳ء میں ہم میں سے کوئی یہ سوچنے لگے کہ جمالیات پر کتاب لکھنا ہی محض نادانی تھی۔ وقت کا ضائع کرنا تھا، اگر علم و فلسفہ ہی پر گفتگو کرنا تھی تو کیوں نہ مارکس (Marx) اور انگلز (Engels) کے فلسفہ کی شرح لکھی، کیوں نہ فرائڈ (Freud) اور ینگ (Jung) کے نفسیاتِ جنسی پر قلم اُٹھایا! — تو اگرچہ اس سلسلہ میں ہماری خاموشی ہی سب سے زیادہ معنی خیز ہوگی، تاہم ہمکو یہ بتادینا چاہئے کہ یہ کتاب ادب اُردو کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب نیازؔ صاحب کے لفظوں میں دنیا باندازہ یک ربع قرن زیادہ جوان تھی۔ انفرادیت اور ذاتیت کے ساتھ ساتھ "جمالیات" ہمارے ادب کا سب سے دلچسپ اور ہمہ گیر موضوع بنا ہوا تھا اور اس لئے باوصف اسکے کہ اس کتاب میں سرمایہ و مزدور سے کوئی بحث نہیں کی گئی، اس میں وہ "روح عصر" موجود ہے، جس پر اگر ہم نظر نہ رکھیں گے تو ہم ادب کی بدلتی قدروں کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کرسکتے — اور پھر یوں بھی تاریخ ادب کے کسی دور میں علمی اور فکر انگیز کتابوں پر کبھی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، یورپ میں آپ کو ہر معمولی موضوع پر نہایت بسیط اور ضخیم کتابیں ملیں گی اور ان بسیط اور ضخیم کتابوں میں انداز علمی اور سنجیدہ ملے گا۔ تجزیہ و تحلیل، تشریح و تفسیر، یورپ والوں کی وہ خصوصیت کبریٰ ہے جس کی مدد سے اُنھوں نے زندگی کے بظاہر معمولی اور عام موضوعات کو بھی علم اور فلسفہ کا ایک مکمل اور باضابطہ نظام بناکر پیش کردیا ہے۔

اس مختصر کتاب میں جمالیات کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے، اور ہر دور کے مفکرین کے نظریات کو بھی نہایت اختصار کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ دیباچے اور مقدمہ کو چھوڑ کر کتاب کے عنوانات یہ ہیں:-

(۱) یونان اور روم میں جمالیات کا تدریجی ارتقاء — (۲) ازمنۂ وسطیٰ اور نشاۃ الثانیہ۔ (۳) دورِ جدید کروچے سے پہلے۔

(۴) دورِ حاضرہ اور جمالیات کا مستقبل ۔

کتاب میں مغربی مفکرین کے مطالعے کے نقوش جابجا ملتے ہیں اور خود مجنوں نے کتاب کے دیباچے میں ان تمام کتابوں کی ایک فہرست پیش کر دی ہے جن کے نقوش و تاثرات ان کی اس کتاب میں جابجا منتشر ہیں ۔ اس مختصر رسالے کے ہر صفحے میں تشریح و تفسیر کے بجائے اشارات سے کام لیا گیا ہے، اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ کروچے (Croce) یا ہیگل (Hegel) پر محض ان اشارات کی مدد سے کم از کم اردو پڑھنے والے پوری طرح مطلب نہیں سمجھ پاتے، تاہم زبان میں وزن اور سنجیدگی کے باوصف ایک رعنائی اور ادبیت نمایاں رہتی ہے، جس کی وجہ سے طبیعت مکدر نہیں ہوتی ۔ کتاب کا مقصد غالباً اس حقیقت کا ظاہر کرنا تھا جو آخر میں وہ کافی زور کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں

"اس تمام طویل بحث کا یہ مقصد تھا کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ جمالیات دنیا میں وہی اعتبار اور وہی حیثیت حاصل کرلے ۔ جو کبھی مذہب اور تصوف حاصل کئے ہوئے تھے، اب دُنیا کا مذہب اور دُنیا کا تصوف جمالیات ہوگا۔"

بظاہر جمالیات کے اس تاریخی مطالعے میں صرف ایک کمی کا احساس ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس میں انفرادی ذوقی اجتہاد کو بالکل جگہ نہیں دی گئی، لیکن کتاب کے حجم کو دیکھ کر اس کمی کا احساس بھی کم ہونے لگتا ہے، کیونکہ اصل میں یہ کام دوسروں کا تھا کہ وہ ان اشارات سے ایک دوسرا بسیط و ضخیم حجم طیار کرتے ۔

"تاریخ جمالیات" کے بعد دوسری کتاب جو خالص علمی اور فلسفیانہ موضوع سے تعلق رکھتی ہے، مجنوں کا شوپنہار (Schopenhauer) کا مطالعہ ہے ۔ مجھے افسوس ہے کہ باوجود سعی و جستجو کے میں اس کتاب کو نہ پاسکا، اور اس لئے ہر چند بغیر دیکھے ہوئے مجنوں کے اس مخصوص مطالعہ پر نقد نہیں کر سکتا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ شوپنہار کے متعلق جب مجنوں کو کچھ لکھتا ہوا پاتا ہوں، تو معاً میرا ذہن شوپنہار کے فلسفہ سے ہٹ کر خود مجنوں کے زاویۂ نظر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔ شوپنہار کے فلسفہ میں جہاں اور بہت سے خطوط ملتے ہیں، وہاں ایک گہری اور نمایاں قنوطیت Pessimism بھی سامنے آتی ہے، شوپنہار نے اپنے جمالیاتی تصورات میں افلاطونی مدرسۂ فکر سے بہت اکتساب کیا ہے اور اس کے اخلاقی تصورات (Ethical Doctrines) بدھ مت کے فلسفۂ نروان (Nirvana) سے ملتے جلتے ہیں، وہ انسانی آلام و مصائب سے نجات صرف اس صورت میں پاتا ہے کہ آدم کی اولاد اپنی خواہشاتِ نفسانی اور جد و جہد کو خیر باد کہکر ایک قسم کی رہبانیت اختیار کرے، یہی وہ واحد طریقہ ہے جو شوپنہار کے خیال میں انسان کو غمِ روزگار سے آزاد کر سکتا ہے ۔۔۔ یہی وہ تنہا راہ ہے کہ انسان قیدِ حیات و بندِ غم سے وارستہ ہو کر اپنے آپ کو جمالیاتی احساسات کی آغوش میں سپرد کر سکتا ہے ۔۔۔ یہاں یہ بات ہر شخص کے ذہن میں چبھتی ہے کہ مجنوں ایک ایسے مفکر پر نقد و تبصرہ کر رہے ہیں جو خود ان کے افکار و میلانات سے قریب تر ہے، "تاریخ جمالیات" اُن کے ذہن کے جمالیاتی پس منظر کو بے نقاب کرتی ہے، اور شوپنہار اُن کے اس مخصوص اندازِ فکر کو نمایاں کرتی ہے جس کو سامنے رکھکر

وہ اس کارگاہِ انسانی پر غور و فکر کرتے آئے ہیں! --- ان مستقل کتابوں کے علاوہ مجنوں کے قلم سے چند اور بھی مضامین ایسے نکلے ہیں جو غالباً اسی دور سے متعلق ہیں، مثلاً "برگساں کا فلسفہ حدوث"۔ "خواب و تعبیر خواب"۔ "فلسفہ یونان" اور "عالم آب و گل سے دور" وغیرہ۔ ان کے افسانوں کا وہ مجموعہ جو "سمن پوش" کے نام سے شائع ہوتا ہے، شاید اسی دور کے مطالعے اور فکر کا جذباتی اظہار تھا، جیساکہ وہ خود "سمن پوش" کے دیباچے میں ظاہر کرتے ہیں اور رسالہ "جن" کا اجرا بھی اسی دور کے مطالعہ کے نقوش پیش کرنا چاہتا تھا۔ ان اشارات سے غالباً یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ مجنوں نے خالص علم و فلسفہ کے موضوعات پر لکھا ضرور ہے، لیکن اس میدان میں بھی انھوں نے بھی اپنے ذوق اور اُفتادِ طبع سے تغافل نہیں برتا، اگرچہ بظاہر ان موضوعات کا اقتضا یہ تھا کہ ان کی شخصیت ان حجابات سے نمایاں نہ ہو پاتی، لیکن اس کو فی الحقیقت مجنوں کی شخصیت، کردار اور افکار کی شدت سمجھنا چاہئے کہ وہ چاہے جمالیات کی تاریخ لکھ رہے ہوں یا شوپنہار کے افکار و نظریات کی شرح، خواہ وہ افسانہ لکھ رہے ہوں، خواہ تنقید ان کا "اندازِ قدر" صاف طور پر پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کا ادب ان کی شخصیت کا مکمل تفسیر ہوتا ہے!

جیساکہ ابتدا میں ظاہر کیا جاچکا ہے ۱۹۳۲ء تک مجنوں زیادہ تر افسانے لکھتے رہے اور پورے جوش و انہماک کے ساتھ! لیکن جیساکہ وہ خود لکھتے ہیں: "اس کے بعد میری نجی زندگی میں بعض ایسے حالات رونما ہوئے کہ مجھے اپنے ادبی خروش کو کچھ دبانا پڑا۔ یہ ایک عبوری دور تھا جس میں رُک کر غور کرنے کا موقعہ ملگیا اور اب مجھے احساس ہوا کہ ہماری زبان میں بُرے بھلے افسانے تو کافی لکھے جاچکے ہیں، اور لکھے جارہے ہیں، لیکن جدید قسم کی تنقید کی بُری طرح کمی رہی جاتی ہے اس احساس کے ماتحت میں نے تنقیدی مضامین لکھنا شروع کیا"۔ ایک ادبی نقاد کے لئے جس وسعت نظر، اصابت رائے، صحت مذاق، لطافت و ژرف نگاہی اور وزن و وقار کی ضرورت ہوتی ہے، مجنوں کے فکر و احساس میں اسکی کمی نہ تھی اور اس لئے مجنوں کا یکایک افسانہ نگاری کو ترک کردینا ایک ایسا نقصان تھا جس کی تلافی ان کی تنقید نگاری ہی سے ممکن ہوسکتی تھی۔ ان کی مستقل تنقید کتابوں میں "ادب اور زندگی" اور "تنقیدی حاشئے" خاص امتیاز و خصوصیت کے مالک ہیں۔

پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے اپنی کتاب "اُردو تنقید پر ایک نظر" میں اُردو نقادوں کی ایک بڑی کمی یہ بتائی ہے کہ اُن میں سے اکثر کسی مکمل، مفصل اور باضابطہ نظامِ تنقید کے مالک نہیں، اُن کے تنقیدی خیالات اُنکی تحریروں میں جابجا منتشر ملتے ہیں اور اس لئے اُردو تنقید کا دامن فلسفۂ تنقید سے خالی نظر آتا ہے، یہ اعتراض یا گلہ ایک حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی نقاد اپنے نظریاتِ تنقید جس سے وہ متعلق نظر آتا ہے، صاف اور باضابطہ طور پر ایک نظام یا Doctrine کی شکل میں پیش کردیتا ہے تو پڑھنے والوں کو بھی صاف طور پر اُس کے تنقیدی افکار کے مطالعہ کا موقعہ ملتا ہے، اور وہ انھیں افکار کی روشنی میں اسکے انتقادی مضامین کا جائزہ لیتے ہیں۔ حالی نے اپنے

تنقیدی خیالات کو صاف و صریح انداز میں "مقدمہ" میں بیان کر دیا تھا، اس لئے جب ہم ان کو کسی شاعر یا مصنف پر تنقید کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو ان کی اس تنقید پر اپنی ذاتی رائے پیش کرنے سے پہلے ہم پھر ان کے ابتدائی افکار و خیالات پر نظر ڈال لیتے ہیں اور اُن سے بے خبری یا تغافل نہیں برتتے۔ انھیں کو سامنے رکھ کر کسی نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں، میتھو آرنلڈ (Matthew Arnold) نے اپنے تنقیدی افکار کو صاف اور سلجھا کر کتاب کی پہلی جلد میں پیش کر دیا اور پھر دوسری جلد میں اُس نے اُنھیں خیالات کی روشنی میں جن کو وہ پہلے ظاہر کر چکا تھا، انگریزی شعر و ادب کا جایزہ لیا، اُن کے حسن و قبح، ان کی قیمت اور مقام کرنے کی کوشش کی — مجنوں پر یہ الزام باقی نہیں رہ جاتا کہ اُنھوں نے اپنے پڑھنے والوں کو اپنے بنیادی تنقیدی خیالات سے بے خبر رکھا ہے۔ "ادب اور زندگی" میں اُنھوں نے اپنے فلسفۂ تنقید کی پوری طرح تشریح و تفسیر کی ہے، اپنے خیالات کو بار بار، مختلف طریقے اور مختلف الفاظ میں، ایک خاص وزن اور دلکشی کو باقی رکھتے ہوئے سلجھا کر سمجھانا چاہا ہے۔ اس کتاب میں صرف ان تین مضامین — "ہندوستانی اَنٹک"، "نظیر اکبرآبادی" اور "حالی کا مرتبہ اُردو ادب میں" — کو چھوڑ کر باقی تمام مضامین میں فلسفۂ تنقید پر روشنی ڈالی ہے۔ کافی غور و فکر کے بعد اگر ان کے فلسفۂ تنقید کو کوئی ایک نام دینے کی کوشش کی جائے تو اس کو جدلیاتی فلسفۂ تنقید (Dialectic philosophy of Criticism) کہہ سکتے ہیں۔ زندگی کی جدلیات (Dialectics) کی طرح وہ ادب میں بھی جدلیاتی عناصر کارفرما دیکھتے ہیں، اور اسی لئے اگرچہ وہ بظاہر ترقی پسند تنقید نگاروں کے گروہ میں شامل نظر آتے ہیں، اُن کی تنقید میں چند ایسے تناقضات بھی دیکھنے میں آئے ہیں، جن سے بعض اصطلاحی ترقی پسندوں کے نزدیک کبھی وہ "غیر ترقی پسند" معلوم ہونے لگتے ہیں اور کبھی "ترقی پسند"۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر حسرت نعمانی نے (جو غالباً اصطلاحی ترقی پسند نہیں ہیں) مجنوں گورکھپوری کے متعلق یہ رائے قایم کی ہے کہ مجنوں "آخری دو ادوار کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ قدیم طرز کے محقق بھی ہیں، مغربی اثر سے متاثر بھی ہیں اور ترقی پسند ادب کا بھی پرچار کرتے ہیں" — میں نے بعض حضرات کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ مجنوں کی اس لئے کم قیمت ہو جاتی ہے کہ نہ تو وہ بالکل قدیم اسکول ہی کے آدمی ہیں، اور نہ اُنھوں نے کبھی باقاعدہ طور پر اپنے متعلق "ترقی پسند نقاد" ہی کہلوانا پسند کیا!! — میں نہیں کہہ سکتا کہ مجنوں صاحب پر لوگوں کی اس تنقید یا تجدید کا کیا اثر مرتب ہو سکتا ہے، جب کہ میں خود اپنی جگہ پر اس کا جواب صرف ایک تبسم زیر لبی سے دینا کافی سمجھتا ہوں۔ مجھے "رجعت پسندی" یا "ترقی پسندی" کی اصطلاحوں میں سے نہ کسی سے کوئی محبت ہے نہ کسی سے کوئی خاص عداوت۔ بلکہ میں صرف ادب اور زندگی کے میلانات سے وابستہ رکھتا ہوں، اگر کسی زندگی میں بیک وقت ماضی کے صالح اثرات، حال کے نقوش و ارتسامات اور مستقبل کے امکانات و اشارات آپس میں شیر و شکر ہوں، تو میں صرف ایسی ہی زندگی کو زندگی کا صحیح تخیل سمجھتا ہوں — اسی طرح اگر ادب، ماضی کی میراث اور حال کے سرمائے کا مالک ہوتے ہوئے مستقبل میں اپنی وسعت اور زندگی کا ضامن ہے، تو وہی

ادب، صالح، زندہ اور پائدار ادب کہا جا سکتا ہے۔ خواہ آپ اسے "ترقی پسند ادب" کہیں یا "قدامت پسند" خواہ اسکو ترقی پسندی کا نام دیں، خواہ رجعت پسندی کا !! ۔ مجنوں، نیاز صاحب کے اُس مشورے پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں جو اُنھوں نے ایک آزاد نقاد کے لئے "انتقادیات" پیش کیا ہے نیاز صاحب کا مشورہ ہے کہ ایک آزاد نقاد کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو کسی انتقادی اسکول کا پیرو اور کسی خاص روایتی اسکول کا مقلد نہ بنائے، بلکہ خود اپنی قوتِ تمیز اور قوتِ فیصلہ سے کام لے۔

"ادب اور زندگی" کے صفحات میں جا بجا آپ کو ادب کی اسی جدلیاتی ماہیت کی طرف اشارے ملیں گے۔ ادب ایک خاص دور اور اُس دور کے چند خاص میلانات کا ترجمان ہوتا ہے، اس پر ماحول کے نقوش مرتب ہوتے ہیں، اور سماج کی ہیئت، ادب کی ہیئت پر اثر انداز ہوتی ہے، ادب، زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں، وہ زندگی ہی کے ساتھ پرورش پاتا ہے، اُسی کا دودھ پیکر جوان ہوتا ہے اور پھر اپنے شباب کی پوری توانائیوں کے ساتھ زندگی کو پہلے سے زیادہ خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہے، زندگی اور ادب کا یہی عمل و ردِ عمل، ادب اور زندگی دونوں کی حیات کا ضامن ہے۔ ہم کسی عہد میں کسی ایسے ادب کا تصور نہیں کر سکتے، جس پر اُس عہد کے خارجی حالات کسی نہ کسی طرح اپنے نقوش نہ چھوڑ گئے ہوں — اور اسی طرح غالباً ہم کسی دور میں کسی ایسی اعلیٰ زندگی کا تصور نہیں کر سکتے جس میں ادب نے زندگی کو پہلے سے زیادہ خوشگوار بنانے کی سعی جاری نہ رکھی ہو۔ ادب، اگر زندگی کو طلاق دیدیتا ہے، تو اُس کی سانس اُسی جگہ ٹوٹنے لگتی ہے، اسی طرح اگر زندگی، ادب کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتی تو اس کی ناخوشگواریاں، اُس کی صعوبتیں بڑھنے لگتی ہیں، اور اس کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لئے شاعر و ادیب کے دماغ و دل بھی پیدا کرے اگر یہ نہ ہوتا تو جیسے Plato نے اپنی Republic میں شاعروں کو کوئی جگہ نہ دی تھی، اسی طرح یہ کرۂ ارض بھی اپنے سینے پر شاعروں اور ادیبوں کے بوجھ گوارا نہ کر سکتا۔ یہی سبب ہے کہ ہر ادب اپنے اندر اپنے ماحول کے جراثیم کو پرورش دیتا ہے، ہر ادبی پیداوار اپنے بطن میں "روحِ عصر" (Zeitgeist) کی حامل ہوتی ہے، ادب ہمیشہ سے زندگی کا ساتھ دیتا رہا ہے۔ ایک خاص دور کے خیالات و نظریات کی اشاعت اس کے ذمہ ابتداء ہی سے رہی ہے جاگیردارانہ سامنتی اور سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت ادب، جاگیرداری، سامنت اور سرمایہ داری کے رجحانات کا حامل رہا ہے — لیکن اب کہ مجنوں کے خیال میں جمہوریت اور اشتراکیت کا دور ہے ادب کو بھی جمہوری اور اشتراکی خیالات کا حامل ہونا چاہئے۔ ہر چیز تاریخ اور زمانے سے مجبور ہے اور ادب بھی اپنے آپ کو اس "تاریخی جبریت" historical determinism سے آزاد نہیں کر سکتا۔ لیکن جو چیز ادب کو عام پروپیگنڈے سے ممتاز اور اولی تر بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ادب ایک مخصوص عہد کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی اس مخصوص عہد پر حاوی و غالب رہتا ہے۔ اچھے اور تخلیقی ادب میں نہ صرف "روحِ عصر" ہونا لازمی ہے، بلکہ اس میں ایک جمالیاتی ماورائیت Aesthetic transcendentalism

بھی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ نہ صرف اپنے عہد کے لئے سامانِ دلچسپی اور سامانِ بصیرت رکھتا ہے بلکہ مستقبل کے ہر دور میں لوگ اس کو الماریوں میں بند کرنے کے بجائے اپنے قلب و دماغ میں جگہ دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے جس کا تعلق "ماورائے عصر" سے ہے ـــ تخلیقی ادب میں باوصف روحِ عصر کے روحِ ادیب بھی جلوہ گر ہوتی ہے وہ اجتماعیت اور انفرادیت کو کامل امتزاج اور خوشگوار آہنگ بناکر پیش کرتا ہے۔ وہ ہم کو زندگی کی رزمگاہ میں دعوتِ جہاد بھی دیتا ہے اور ایک عمل تنویم بھی کرتا رہتا ہے۔ وہ اقتصادی اور معاشی حالات سے اثر پذیر ہوتا ہے لیکن پھر اس میں تفریحی عنصر بھی شامل ہے اور اسکی آواز "گہے طفلے شود مستانہ می رقص" اکثر ہمارے کانوں میں آتی رہتی ہے۔ ادب واقعیت (Realism) اور افادیت (Utilitarianism) کا حامل ہوتے ہوئے تخیلیت (Idealism) و رومانیت (Romanticism) کے عناصر اپنے اندر رکھتا ہے J. B. Priestly کے الفاظ میں آرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے تھوڑی سی افیون کی ضرورت ہمیشہ پڑے گی۔

یہی وہ بنیادی خیالات ہیں جن کو مجنوں نے بار بار نئے انداز اور نئے لباس میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ "ادب اور زندگی" میں انھوں نے ہر جگہ ادب کے ان جدلیاتی عناصر پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے ایک تازہ مضمون "ادب کی جدلیاتی ماہیت" میں (جو سالنامۂ نگار ۴۶ء میں شائع ہوا تھا) اپنے انھیں خیالات کو اس قدر صاف طور پر، اس درجہ سلجھا کر پیش کیا ہے کہ اگر ایک لمحہ کے لئے یہ قیاس کر لیا جائے کہ صرف یہی ایک مضمون ان کے تنقیدی سرمائے سے باقی رہ جاتا ہے، تو بھی مستقبل کے نقاد کو مجنوں کے انتقادی خیالات صاف، روشن اور مفصل طور پر معلوم کرنے میں غالباً کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ مختلف، باہم متضاد چیزوں پر انتہائی دلآویزی اور قوت کے ساتھ نقد کرتے ہوئے مجنوں نے آخر میں اپنی تمام کہی ہوئی باتوں کو سمیٹ کر اجمالی طور پر بیان کر دیا ہے۔ ان الفاظ کا یہاں نقل کرنا یقیناً بصیرت سے خالی نہ ہوگا۔

"عام زندگی کی طرح ادب کی فطرت میں بھی دوئی اور تضاد نظر آتا ہے۔ ادب ایک ماحول کی مخلوق اور دوسرے ماحول کا خالق ہوتا ہے اور وہ بیک وقت ماضی اور مستقبل دونوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ ادب میں جبر اور اختیار دونوں کی علامتیں پائی جاتی ہیں، ادب میں اجتماعی شعور اور انفرادی ارادہ دونوں یکساں کارفرما ہوتے ہیں۔ ادب جماعتی بھی ہوتا ہے اور ماورائے جماعت بھی، ادب کی پیدائش اقتصادی ہے مگر وہ بڑھ کر غیر اقتصادی ہو جاتا ہے۔ ادب میں خارجی اور داخلی، نظری اور عملی، مادی اور تصوری، افادی اور ذوقی دونوں قسم کے عناصر باہم شیر و شکر ہوتے ہیں، روایت اور انقلاب دونوں ادب کے مزاج میں داخل ہیں۔ فکر اور اسلوب اس کی ترکیب میں اس طرح محلول ہوتے ہیں کہ پھر ان کو علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو در اصل ثنویت (Dualism) ادب کا مقدر ہے مگر اس ثنویت کا رخ ہمیشہ ایک

تیسری سمت میں ہوتا ہے ۔ کل زندگی کی طرح ادب کی جدلیاتی بھی یہی ہے، اور یہی ادب کا صحیح انقلابی یا ترقی پسند نظریہ ہے ۔ ایک مرتبہ ہم ادب کی اس جامعیت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں، پھر کسی قسم کی غلط فہمی یا غلط اندیشی کا امکان باقی نہیں رہتا۔"

اس کا امکان قوی ہے کہ اگر یہی خیالات کسی ایسے نقاد کے ذہن میں ہوتے جو مجنوں کی طرح قوتِ اظہار پر پوری طرح قادر نہ ہوتا تو اول تو یہ متضاد خیالات کبھی صاف طور پر بیان ہی نہ ہو پاتے، ان کے تار و پود آپس میں اُلجھ کر رہ جاتے اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہوتا کہ ان خیالات کی تکرار پڑھنے والوں کو بے مزہ کر دیتی ---- لیکن یہاں پر ایک بار پھر مجنوں کے "لبوں کی شیرینی" پر ایمان لانا پڑتا ہے ۔ ان کے لفظوں کا صوتی آہنگ، جملوں کی تراش، اور اندازِ بیان کی قوت اور دلآویزی ان کی تحریروں میں ایک دوشیزگی، تازگی اور توانائی پیدا کر دیتی ہے اور ہم کو عجیب ادبی لذت (Literary Pleasure) محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس لئے نہیں لکھتے کہ سب ایسا ہی لکھتے ہیں، بلکہ اس لئے لکھتے ہیں کہ ان کو ایسا ہی لکھنا چاہیے ! ۔ اُن کے تجربہ، مطالعہ اور مشاہدہ نے ان کو ایسا ہی بتایا ہے، ان کے ادبی و انتقادی مقالات میں بھی اُن کا خلوص اور خلوص سے پیدا ہونے والی اثر انگیزی پائی جاتی ہے ۔ اسی لئے وہ عصرِ حاضر کے ایک غلط میلان سے آگاہ کرتے ہیں اور نئے ادیبوں پر اُسلوب کی اہمیت ایک بار اور آخری بار واضح کر دینا چاہتے ہیں ۔

"آخر میں ہم کو اپنے ادب کو ایک مہلک غلط میلان سے بچانا ہے ۔ یہ ایک ایسا خطرہ ہے، جو عصرِ حاضر کے ساتھ مخصوص ہو ہمارے ادیب اُسلوب کو کچھ غیر اہم سمجھنے لگے ہیں ۔ وہ مواد کو اُسلوب سے الگ کر کے اُس پر زور دیتے ہیں، جو ایک فعل عبث ہے ۔ بے اسلوبی جدید ادب کی ایک مستقل شان ہو گئی ہے ۔ ہمارے نئے ادیبوں کو اس راز سے آگاہ رہنا چاہئے کہ مواد اور اُسلوب لازم و ملزوم ہیں اور زندہ ادب میں اُن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ اُسلوب کوئی باہری چیز نہیں ہے بلکہ مواد کے ساتھ ادب کی اندرونی ترکیب میں داخل ہے اور ادب میں زندگی اور بالیدگی پیدا کرتا ہے ۔ اسلوب سے مواد میں، جان آتی ہے، ہر قوت اظہار کے بعد حقیقت ہوتی ہے اور اظہار کے بعد حقیقت ہوتی ہے اور اظہار کے معنی یہ ہیں کہ کوئی مخصوص موزوں صورت اختیار کی جائے ۔ پرانے اسالیب کی غلامانہ تقلید تو یقیناً ہمارے حق میں موت کا حکم رکھتی ہے لیکن نئے مواد کے لئے نئے موزوں اسالیب جو اتنی توانائی رکھتے ہوں کہ مواد کو جاندار کر سکیں، نہایت ضروری ہیں ورنہ ادیب کی کوئی کوشش ادبی کہے جانے کی مستحق نہ ہو گی ۔ فکر اور اُسلوب ایک راگ کے دو سُر ہیں جن کے ملکر ایک ہو جانے ہی سے راگ پیدا ہو سکتا ہے اور جن کے بغیر راگ کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ ادب میں ہم کو پرانے اسالیب سے بھی کام لینا ہے اور نئے فکری میلانات کے مطابق نئے اسالیب ایجاد کرنا ہے، لیکن ہر بے قرینہ بے سوچی سمجھی بے قرینہ بدعت کو ہم اُسلوب نہیں کہہ سکتے ۔ اُسلوب تو وہ ہے جس کو خود مواد متعین کر کے پیدا کرے مگر جب یہ اُسلوب وجود میں آجائے تو ایسا ہو کہ مواد کی زندگی کا ضامن ہو سکے۔" (باقی)

UNIVERSITY LIBRARY
17 NOV 1948

دُنیا کیونکر دریافت ہوئی

نقل و حرکت۔ اور آمد و رفت کے ذرائع نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس وقت یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ شروع میں ان کی کیا حالت تھی۔ اگلے زمانے میں سفر محض دقت طلب اور خطرناک ہی نہیں تھا، بلکہ سب سے بڑی مشکل یہ بھی کہ دنیا کے بہت سے حصے نامعلوم تھے۔ چنانچہ اگر ہم قدیم عہد رومہ کے نقشوں پر نظر کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ دُنیا کی وسعت ان کے نزدیک عبارت تھی صرف سواحل بحرِ روم اور یورپ کے جنوبی اور وسطی علاقوں سے، عرب مصر اور ہند کے ساحلی مقامات سے۔ اسوقت جہاز چونکہ کمزور تھے اور سمندر کے طوفانوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اس لئے سیاحوں اور ملاحوں کو اتنی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ آبنائے جبرالٹر سے باہر نکلیں اور بحر اٹلانٹک کی موجوں کا مقابلہ کریں۔ ان کی سفر کی کامیابی کا انحصار صرف ستاروں، ہواؤں اور معمولی قسم کے پرکاروں پر تھا۔ ان لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ دنیا گول نہیں بلکہ چپٹی ہے اور اگر کوئی شخص برابر ایک طرف سفر کرتا رہے تو وہ کسی وقت دنیا کے کنارے پر پہونچ جائے گا۔ اسی کے ساتھ برباد ہو جانے والے جہازوں کے واقعات بھی سنتے رہتے تھے اور خائف رہتے رہتے تھے۔

اس کے علاوہ یوں بھی سیکڑوں خطرناک قسم کی باتیں مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ وہاں کُتّے کے برابر چیونٹیاں ہوتی ہیں، آدمیوں کی طرح بولنے والے کتّے پائے جاتے ہیں، لمبی لمبی ٹانگوں والے آدمی ہیں جو اپنی لمبی ٹانگوں سے سورج کی دھوپ چھپا لیتے ہیں، ایسے انسان بھی ہیں جو کتّوں کا سا منھ رکھتے ہیں، ان کے زبان نہیں ہے اور چہرہ سینے کے درمیان ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اہل فنیشیا نے تجارتی مقاصد کی غرض سے بحر روم میں سیاحت شروع کی انھوں ہی نے سب سے پہلے تجارتی مقامات اور بحری سفر کے راستے دریافت لئے اور سب سے پہلے اوفیر (Ophir) پہونچے، جس کا ذکر سلیمان کی کتاب میں پایا جاتا ہے اور وہاں سے سونا، ہاتھی دانت، گوریلا بندر اور مور لائے۔

اہل فنیشیا کے بعد اہل یونان نے کچھ اور مقامات تلاش کئے، چنانچہ اسپین میں وادی نیل، سسلی اور فرانس اور مارسیلز وغیرہ انھیں کی تلاش کا نتیجہ ہیں، اس کے تقریباً سو سال بعد اہل قرطاجنہ نے جو اہل فنیشیا کی نسل سے متعلق تھے اور رومہ کے حریف تھے، بحر اٹلانٹک میں کچھ اور مقامات دریافت کئے۔

ہیملکوز (Hamlico) نامی ایک بحری کپتان تقریباً چار ماہ تک فرانس کے ساحلوں کے قریب گشت کرتا رہا یہاں تک کہ وہ آئرلینڈ پہونچ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے جہاز کو سیکڑوں بحری خطرات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کپتان کی ڈایری سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں وہ بحرِ سرگاسو (Sargasso Sea) سے ہوتا ہوا جزیرۂ ازومرس (Azores) تک پہونچا جہاں بڑے بڑے جہاز غرق ہو چکے تھے۔

۶۰۰ قبل مسیح اہل فنیشیا نے ایک اور مہم سر کی۔ یہ لوگ مصر کے بادشاہ کی طرف سے بحر قلزم بھیجے گئے تھے۔ ان لوگوں کی تلاش دو سال تک جاری رہی۔ ان کے سفر کا راستہ، بحرِ ہند کے جنوب اور کیپ آف گڈ ہوپ سے لیکر بحر اٹلانٹک، آبنائے جبرالٹر اور مصر تک تھا۔ اس کے بعد ۴۸۰ یا ۴۷۰ قبل مسیح میں اہل فنیشیا نے ایک اور بڑا سفر کیا۔ یہ لوگ ہانو (Hanno) کی سرکردگی میں کارتھیج سے ساحل افریقہ کے لئے روانہ ہوئے تھے اور یہاں انھوں نے نو آبادیاں قایم کیں۔

اس سلسلہ میں جہاز رانوں کا سب سے زیادہ خطرناک سفر وہ تھا جو ان کو Land of Fire میں پیش آیا۔ ہانو لکھتا ہے کہ "آگ کے شعلے سمندر تک آتے تھے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے زمین تک پہونچنا دشوار تھا آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑا تھا جس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

ایک اور بہت اہم سفر وہ تھا وہ تھا جو ایک یونانی جہاز راں Pytheas نے کیا۔ یہ زبردست نجومی تھا اور مد وجزر کے رازوں سے واقف تھا۔ وہ مارسیلز سے میسیلیا کے لئے روانہ ہوا۔ وہ پہلے کارنوال کے ساحل پر رُکا اور پھر شمالی اسکاٹلینڈ کے لئے روانہ ہوا۔ اور یہاں اس کو معلوم ہوا کہ اس جگہ سے چھ روز کے فاصلہ پر ایک ایسا مقام ہے جہاں نہ سمندر ہے اور نہ ہوا۔ ممکن ہے کہ یہ مقام وہی ہو جس کو آجکل ناروے کہتے ہیں۔

پھر یہ بحر شمالی سے ہوتا ہوا جرمنی کے کنارے کنارے بحر بالٹک تک پہونچ گیا اور اس میں شک نہیں کہ اُس زمانہ میں جب سمندر کی طرف رُخ کرنا خطرناک تھا۔ یہ سفر بڑا عظیم الشان اور قابل قدر تھا۔

۳۰۰ قبل مسیح میں سکندر اعظم یونان سے براہ خشکی روانہ ہوا۔ ایشیا ہوتا ہوا وہ ہندوستان آیا۔ یہاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس نے خود بحری راستے سے جانا پسند کیا اور تمام فوج خشکی کے راستہ سے بھیجدی سکندر کے اس سفر سے لوگوں کو مشرقی ممالک کے بارے میں بہت معلومات فراہم ہوئیں۔

دُنیا کے نامعلوم حصّوں کا پتہ لگانے میں رومن اقوام نے بڑے بڑے کام کئے ہیں، نیل ڈیلٹا کا علم پہلے سے تھا اور اسی کے ذریعہ سے ۲۵ قبل مسیح میں "رومن اقوام" حبش میں داخل ہوئے۔ فلاکس (Flaccus) نامی نے سنہ ق۔م میں صحرائے اعظم کا پتہ لگایا اور اس سے بہت پہلے رومن افواج یورپ کے شمالی حصہ کا پتہ لگا چکی تھیں ۵۴ - ۵۵ قبل مسیح میں جولیس، برطانیہ کو دریافت کر چکا تھا۔ اور عرصہ تک برطانیہ رومن اقوام کی حکومت

میں شامل رہا۔

مشرق کی طرف رومن اقوام سکندر کے قائم کئے ہوئے راستوں پر چلیں اور امریکہ اور ایشیا کے درمیانی علاقوں کے ساتھ ساتھ چین سے بھی ربط پیدا ہو گیا۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک دنیا کے بیشتر حصے معلوم ہو چکے تھے لیکن پھر بھی وہ موجودہ دنیا کے مقابلہ میں کم تھے۔ امریکہ، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، جزائر مشرقی اور جاپان وغیرہ ممالک تو اس وقت خواب میں بھی کسی کو نظر نہ آتے تھے۔ پھر بھی بادشاہ مراکش کے بھیجے ہوئے لوگوں نے جزائر کناری اور اسپینی ملاحوں نے Maderia کو ۸۰۰ قبل مسیح میں دریافت کر لیا تھا۔ اس کے بعد کئی صدی تک جہازرانوں کو یہی یقین رہا کہ وہ تمام دنیا کا پتہ لگا چکے ہیں اور انھوں نے کوئی اہم سفر نہیں کیا۔ اہل فنیشیا اور رومن اقوام زوال پذیر ہو چکی تھیں۔ اس لئے عرصہ تک لوگوں کو دریافت کا خیال نہ پیدا ہوا۔

اس کے بعد اسکینڈی نیویا کے باشندوں نے اسی جرأت اور ہمت کے ساتھ جو اہل فنیشیا اور رومن اقوام میں تھی اپنے جہاز بحر سفید کی طوفانی لہروں کے سپرد کر دئے اور آخر کار انھوں نے قسطنطنیہ، بحر اسود، والگا، بحر کیسپین، سائبیریا اور بحر بالٹک کے ساحلوں کا پتہ لگایا۔ لیکن سب سے بڑا کارنامہ ۹۸۶ء میں ہوا جب نئی دنیا کی دریافت ہوئی۔ اور اس دریافت کا سہرا بجارنی (Bjarni) کے سر تھا۔ جو دراصل گرین لینڈ کی تلاش میں نکلا تھا۔

چار سال بعد لیف ارکسن (Leif Ericsson) بھی اپنی راہ سے بھٹکتا ہوا Nova Scotia کے جنوبی حصہ پر پہونچ گیا۔ ۱۰۰۲ء میں تھارفن بھی نئے ممالک کی تلاش میں کئی جہاز لے کر چلا۔ وہ گرین لینڈ سے ہوتا ہوا لبریڈر کے ساحل اور پھر وِن لینڈ (Vinland) پہونچا۔ تھارفن نے جس جگہ اپنی نوآبادی قائم کی تھی اس کا نام Hop تھا۔ لیکن ریڈ انڈین کے حملوں کی وجہ سے ان کو بھاگ کر دوبارہ گرین لینڈ آنا پڑا۔

اس زمانہ میں ملک چین کے ہر طرف چرچے تھے جس کی بابت عجیب عجیب دلچسپ روایتیں اور کہانیاں مشہور تھیں مگر اس وقت تک کوئی بھی وہاں تک پہونچنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔۔۔ البتہ کچھ تبلیغی اداروں کے مبلغین نے وہاں تک پہونچنے کی کوشش کی مگر وہ بھی وسط ایشیا کے کچھ حصوں تک پہونچ کر رہ گئے۔ البتہ چین کا تھوڑا بہت بھید پانے میں اول اول کسی حد تک وینس کے تین باشندے (مارکوپول، اس کا باپ اور اس کا چچا) تھے۔

مارکوپول کے باپ اور چچا ۱۲۵۵ء میں تجارت کی غرض سے نکلے اور بالآخر بغیر کسی ارادہ کے پیکنگ کے قریب تاتار کے بادشاہ اعظم خان کے دربار میں پہونچ گئے۔ بادشاہ ان سے مل کر بہت خوش ہوا اور باہم دوستانہ تعلقات ہو گئے اور چودہ سال کے بعد یہ دونوں بھائی اپنے شہر وینس آئے۔ ۱۲۷۱ء میں وہ پھر مارکو کو ہمراہ لے کر روانہ ہوئے۔ مگر بجائے چین پہونچنے کے وہ امریکہ کے راستہ سے خلیج فارس میں جزیرہ ہرمز میں پہونچ گئے اور

۱۲۷۵ء میں پیکنگ پہونچے۔

چونکہ کسی اور یورپ کے آدمی کو یہ موقع نہ نصیب ہوا تھا کہ وہ چین آتا یا تاتار خاں سے ملتا اس لئے مارکوپولو پر خان کو پورا اعتماد تھا۔ مارکو نے تاتاری زبان سیکھی اور بادشاہ نے اس کو چین کے صوبہ کا گورنر بنا دیا۔ اس نے وہاں کے حالات کو من وعن بیان کیا ہے۔

صحرائے گوبی میں سفر کرنا اس زمانہ میں بہت خطرناک تھا۔ بھوت، پریت، شیطان، چڑیلوں اور بُری روحوں کے تذکرے ہوتے رہتے تھے۔ لہذا کوئی سفر کا قصد ہی نہ کرتا تھا۔

مارکو نے لکھا ہے کہ تبت میں اسے کتے گدھوں کے برابر دیکھے اور ایک قوم ایسی دیکھی جو اپنا چہرہ گہرا نیلا رنگتی تھی۔۔ اس کے علاوہ سب سے بڑھ کر عجیب چیز خود خان کا دربار تھا۔ یہ لوگ ۱۲۹۵ء میں اپنے وطن وینس واپس پہونچ گئے، وہاں ان کے دوستوں نے ان کا خیر مقدم اس طرح کیا جیسے کہ قبر سے مردہ زندہ ہو کر نکل آیا ہو۔

جنوبی مغربی یوروپ میں پرتگال ہمیشہ سے بہت مشہور تجارتی شہر رہا ہے۔ یہاں سے بھی کئی جہاز راں تجارت کے لئے نکلے اور انھوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے۔

سب سے پہلے پرنس ہنری کا نام آتا ہے۔ ہر چند کہ وہ جہاز رانوں کے ساتھ خود کبھی نہیں گیا مگر اس نے یکے بعد دیگرے جہاز رانوں کے بہت سے گروپ روانہ کئے تاکہ وہ کوئی نیا ملک تلاش کریں جہاں پرتگالیوں کا جھنڈا قایم ہوسکے اور ان کی تجارت فروغ پاسکے۔ اس کام کے لئے اس نے جہاز رانوں کو باقاعدہ تعلیم دلائی، نقشہ جات پر بحری راستوں کے نشان بنائے اور اس طرح جہاز رانی کو وسعت دی۔

اس زمانہ میں بحری راستوں کی حد (Cap Bojador) اور شمالی مغربی افریقہ تک تھی۔ اس کے آگے تمام ممالک غیر دریافت شدہ تھے۔

۱۴۴۵ء میں پرتگالی جہاز راں دریائے Senegal کے دہانے تک پہونچ گئے۔ جس کو وہ نیل کی ایک شاخ سمجھے ہوئے تھے اور انھوں نے پھر دریائے گیمبیا کا پتہ لگایا اور سال بھر کے بعد ہی جزائر کیپ ورڈ دریافت کئے گئے۔ اور افریقہ کے ساحلوں پر پرتگالیوں کا قبضہ بڑھنے لگا۔

۱۴۶۰ء میں ہنری کا انتقال ہوگیا مگر تلاش وجستجو کی وہ روح جو اس نے اپنے ہموطنوں کے دلوں میں پھونک دی تھی بدستور قایم رہی۔ ۱۴۸۵ء تک افریقہ کے تقریبًا تمام مغربی ساحلی حصے پرتگالیوں کو معلوم تھے۔ اور اس کے بعد ۱۴۸۶ء میں Bartholomew Diaz نے جنوبی افریقہ کے باقی ماندہ حصے معلوم کرلئے۔

ہندوستان کی بے انتہا دولت اور معدنیات نے واسکوڈی گاما کو بھی اس طرف متوجہ کرلیا۔ وہ ۸ جولائی ۱۴۹۷ء کو سفر کے لئے روانہ ہوا۔ مگر تین ماہ تک اسے خشکی کا نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ جنوبی افریقہ میں خلیج سینٹ ہیلینا تک

پہونچ گیا - اور اس کے بعد Natal میں قیام کیا اس کے بعد وہ بحر ہند میں بندرگاہ کالی کوٹ پر آ پہونچے - یہاں سے وہ مسالہ اور دیگر اشیا بغرض تجارت انگلستان لے گیا - واسکوڈی گاما اس کے بعد پھر ہندوستان آیا -

واسکوڈی گاما کی مہم سے چند سال پہلے امریکہ کی دریافت ہوئی تھی - جس کا سہرا کولمبس کے سر ہے جو ایک جولاہے کا لڑکا تھا - جب وہ اپنے عظیم الشان سفر پر روانہ ہوا تو پہلے جزائر کناری میں قیام کیا - اور وہاں سے جب پھر جہاز کے لنگر اُٹھے تو مدتوں تک کسی خشکی کا حصہ نظر نہ آیا اور کولمبس کے ساتھیوں میں بدامنی پھیل گئی - وہ سب اسپین واپس چلنے پر اصرار کرنے لگے - بڑی مشکل سے کولمبس نے ان کو چند روز اور انتظار کرنے پر مجبور کیا اور یہ مدت ختم ہو رہی تھی کہ خشکی کا حصہ نظر آگیا - یہ جزائر بہاما کا ایک جزیرہ سان سالویڈر تھا - ساتھیوں کے دل بڑھ گئے اور وہ چند روز اس جزیرہ میں قیام کرنے کے بعد دوبارہ سفر کو نکلے - اب کے جزیرہ کیوبا ہیٹی دریافت ہوا اور یہاں سے وہ اپنے وطن کے لئے واپس چل پڑا - کولمبس نے اٹلانٹک میں بحری سفر کا راستہ متعین کیا اور اسی سال پھر نئے ممالک کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا - اب کے اس نے ڈومی نیکا، جزائر لیوارڈ، نیوس، سینٹ کٹس، سانتا کرز، پیورٹوریکا اور جامیکا وغیرہ دریافت کیا - اسکے بعد کولمبس نے دو اور سفر کئے جس میں اس نے ٹرینی داد اور جنوبی امریکہ کا کچھ حصہ دریافت کیا قبل اسکے کہ وہ اپنی نو آبادی ہیٹی کی طرف روانہ ہوئے بدقسمتی سے کولمبس سے اور حکمران وقت سے جھگڑا ہوگیا جس نے کولمبس کو قید کرکے اسپین بھیجدیا، اس کا چوتھا اور آخری سفر وہ تھا جو اس نے وسط امریکہ تک کیا - اور پھر آگے راستہ بند پاکر واپس اسپین آگیا - برسٹل اس زمانے میں بڑا تجارتی مرکز تھا - وہاں سے اِدھر اُدھر جہاز روانہ بھیجے جارہے تھے اور جان کیبٹ نے شمالی اٹلانٹک میں پہونچ کر پہلے لیبراڈور میں قیام کیا تب مچھلیوں کی سب سے بڑی شکارگاہ بینک کی دریافت کی - اور اس کے بعد اسکے لڑکوں نے مزید دریافتیں کیں انھوں نے چین اور ہندوستان پہونچنے کے لئے شمالی مشرقی بحری راستہ دریافت کیا - نئی دنیا دریافت ہوجانے کے بعد وہاں کی آمدورفت شروع ہوگئی تھی مگر ابھی تک ساحلی خطوں کے علاوہ ملک کے وسط میں کوئی نہ پہونچ سکا تھا کیونکہ بیچ میں ہزاروں گھنے جنگل واقع تھے - مگر معدنیات کی حرص میں اسپین کے بادشاہ نے Hernando Cortez کو جنوبی امریکہ کی دریافت کے لئے روانہ کیا اور ۱۵۲۰ء میں اسپین والوں نے میکسیکو پر قبضہ کرلیا - اس کے علاوہ اور بہت سے جنوبی خطوں پر اسپین والوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا -

۱۵۴۰ء میں فرانسسکو کورناڈو نے ریاستہائے متحدہ کے جنوبی اور مغربی حصے جن میں کیلیفورنیا اور کولوریڈو وغیرہ شامل تھے دریافت کئے - دوسرے اسپینی Hernando de Soto نے دریائے الاباما کے ذریعہ سے مسی سپی Mississippi کا پتہ لگایا -

۱۵۱۳ء میں واسکوڈی بالبوا نے مع اپنے ساتھیوں کے آبنائے پناما کو عبور کیا - یہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے بحرِ پیسفک میں سفر کیا -- بیس سال بعد فرانسسکو پیزارو نے سونے کی لالچ میں پیرو میں انکا نسبر پر قبضہ کیا - اور ۱۵۴۰ء میں اس نے بڑی مصیبتیں برداشت کرکے Andes کے مشرقی حصے دریافت کئے - اسپینی باشندے اب پوری طرح جنوبی امریکہ میں آباد ہو چکے تھے -- سب سے پہلے جس آدمی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمام دریا کا سفر کیا وہ ایک پرتگالی Ferdinand Magellan تھا - جس نے تمام دُنیا گھوم کر بحرِ پیسفک میں جس کو اب تک یونہی سا استعمال کیا گیا تھا، اپنے جہاز ڈال دئے - یہاں مصیبت یہ آئی کہ ان لوگوں کا کھانا پانی ختم ہو گیا - جو کچھ ان کے ساتھ تھا وہ سڑنے لگا جسکو کھانا ناقابلِ برداشت تھا - اور اسی دوران میں دریا بھیس گئی جس نے ان سب کو زندگی سے اور مایوس کر دیا - لیکن یہ لوگ کوشش کرتے رہے اور بڑھتے ہی رہے یہاں تک کہ فلپائن میں جزیرہ کیبو پر پہونچ گئے -- میگیلن کا صرف ایک جہاز صحیح سلامت اسپین واپس جا سکا - تقریباً نصف صدی سے زائد عرصہ کے بعد ۱۵۸۰ء میں ایک انگریز نے بھی تمام دنیا کا گشت لگانے کا ارادہ کیا - جنوبی امریکہ کی طرح شمالی امریکہ نے بھی سفید قوموں کی اطاعت قبول کرنی شروع کر دی ۱۵۳۴ء میں Jacques Cartier نے نیوفاؤنڈلینڈ، لبراڈور اور جزیرہ پرنس اڈورڈ کا سفر کیا اور دوسرے سال سینٹ لارنس تک بڑھ گیا - ان دریافتوں کی وجہ سے کینیڈا میں فرانسیسی حکمراں آباد ہو گئے -

Martin Frobisher جان ڈیوس اور ہنری ہڈسن نے انتہا تک پہونچنے کے لئے شمالی مغربی راستہ کی تلاش کے سلسلہ میں کینیڈا میں قابلِ قدر دریافتیں کیں اور آخری سفر میں ہڈسن نے وہ بڑی خلیج دریافت کی جسکو خلیج ہڈسن کہتے ہیں -- مگر اسکی دریافتوں کے بارے میں اسکے بے وفا ساتھیوں کی وجہ سے زیادہ علم نہیں ہو سکا - اسکے ساتھیوں نے اسکو مع اسکے جوان لڑکے کے برفستان میں دفن کر دیا - پرانے زمانہ کے لوگوں کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ بڑے جنوبی سمندروں میں خشکی کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور ہوگا مگر ۱۶۴۲ء تک کوئی جگہ دریافت نہ ہو سکی - اسی زمانہ میں ایک ڈچ جہاز راں Abel Tasman نے خشکی کا ایک نامعلوم حصہ دریافت کیا جس کا نام تسمانیا رکھا - مگر اسکے ساتھی بھوتوں کے خوف سے اندر نہ داخل ہوئے، اسی سفر میں تسمان نے نیوزیلینڈ دریافت کیا - مگر بدقسمتی سے وہ آسٹریلیا کو دریافت نہ کر سکا - حالانکہ وہ آسٹریلیا کے چاروں طرف چکر لگا چکا تھا - پھر بھی خشکی کا وہ حصہ اسے نظر نہ آسکا -

۱۷۶۹ء میں جیمس کُک نے آسٹریلیا کی تلاش میں نکلا - اسنے آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کے صحیح خاکے طیار کئے - ایک اور سفر میں اس نے انٹارکٹک کو عبور کیا اور ۶۰۰۰۰ میل تک کا سفر کیا - اسنے جنوبی سمندروں میں تمام دنیا کا چکر لگایا اور اسکو یقین ہو گیا کہ خشکی کا کچھ حصہ قطب جنوبی کے آس پاس ضرور واقع ہے -- ۱۷۷۶ء میں وہ خلیج ہڈسن میں داخل ہونے کے راستہ کی تلاش میں نکلا - اور پھر اسے نیوزیلینڈ سے گزرنا پڑا - اور اس نے سینڈوچ کے جزیرے دریافت کئے اور شمالی امریکہ کے پیسفک ساحل پر سفر کو تار رکھا اور پھر ۱۷۷۹ء میں اسنے Hawaii Island دریافت کیا جہاں کے باشندوں نے اسکی زندگی کا چراغ گل کر دیا -

مکتوبات نیاز

بندہ نواز - مینے نغمگی کی بحث کسی رسالہ میں نہیں دیکھی اور دیکھی بھی ہو تو اب یاد نہیں - آپ نے وضاحت کے ساتھ تحریر نہیں فرمایا کہ نزاع کس بات پر ہے - غالباً اس کی صحت و عدم صحت پر لوگوں میں اختلاف ہوگا

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو غلط کہنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے - نغمہ، عربی لفظ سہی، لیکن شعراء فارسی نے اسے فارسی ترکیبوں کے ساتھ استعمال کیا ہے اور معنی و مفہوم کے لحاظ سے بھی نغمگی غلط نہیں - اُردو میں اسکو سریلاپن کہتے ہیں - عرفی کا شعر ملاحظہ ہو :-

باہمہ کج نغمگی خندند زاغانِ چمن،
عندلیبے گر زند ناگاہ دستانِ درست!

اس سے زیادہ معتبر سند اور کیا ہوسکتی ہے - اس شعر میں کج نغمگی کا مفہوم بالکل وہی ہے جو اُردو میں کنسُرے پن کا ہے یعنی سریلے پن کا ضد

مکرمی - یقیناً آپ کے دو خطوں کا جواب مجھ پر واجب ہے، لیکن اس وقت تک تعمیل ارشاد نہ کرسکنے کی شرم ہمیشہ مانع آئی - کیا عرض کروں کہ جو کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے، اس کے لئے نہ اب دل و دماغ طیار ہیں اور نہ وقت مُساعد، اور جو کرنا نہیں چاہتا، اسے جبرِ حیات کی غرض سے کرنا پڑتا ہے

ہر چند تن آسانی اور راحت طلبی کی عادت پہلے بھی تھی، لیکن دماغ برابر کام کرتا رہتا تھا، اب بدقسمتی سے اس میں بھی کمی ہوتی جارہی ہے اور جی یہ چاہتا ہے کہ ہر وقت چھوٹے چھوٹے بچے سامنے ہوں اور انکی مہمل باتیں سُنتا رہوں

آپ نے جس مسئلہ کی طرف توجہ فرمائی ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے عمرِ خضر درکار ہے اور یہاں "حباب" کی سی فرصت زیست بھی حاصل نہیں شام کو بستر پر جاتا ہوں اس یقین کے ساتھ کہ اب طلوعِ آفتاب نہ دیکھ سکونگا اور صبح کو اُٹھتا ہوں تو یہ درد لئے ہوئے :-

نہ باتو رفتم دمے بہ تو در غمت مُردم　　یکے زدست نیامد ازیں دو کار مرا

آپ کہتے ہیں اس حادثہ کو بھلا دوں، لیکن ان نشتروں کے نکل جانے کے بعد تو ایک دن جینا بھی دشوار ہے۔

پیوند دل از ہمہ بریدیم،
دیرے ست کہ خاطرم بجا نیست

خیر، اس قصّہ کو چھوڑئے، یہ بتائیے کہ آپ مجھ سے کیا خدمت لینا چاہتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اس کا اہل نہ ہوں، اور آپ کو اپنے حسنِ ظن سے شرمندہ ہونا پڑے۔

آپ نے کجا کا استعمال بالکل صحیح کیا ہے۔ یہ ہرجا اور ہر کجا کے معنے بھی دیتا ہے، معترض کی نگاہ وسیع نہیں ہے۔ خواجہ سلمان کا شعر ہے:

کجا در نو بہارے لالہ روئے ست
کجا در گلشنِ زنجیر موئے ست

اس شعر میں کجا، ہرجا (ہر جگہ) کی معنے میں مستعمل ہوا ہے۔

ہر کجا کے مفہوم میں نظامی کا یہ مصرعہ ملاحظہ ہو:

کجا او نہد پائے ما سر نہیم

معترض کو یہ سُنکر شاید اور تعجب ہوگا کہ اضافت کی حالت میں اس کے معنے چہ جا کے بھی ہو جاتے ہیں۔ محسن تاثیر کہتا ہے:

چنیں کہ با تو دلِ بے نفاقِ من صاف ست
اگر تو صاف نباشی کجائے انصاف ست

اُردو میں دیوار پر کہگل کرنا عام محاورہ ہے جو فارسی "کاہ گل" کا مخفف ہے۔ فارسی میں اسے آرزہ بھی کہتے ہیں اور اسی نسبت سے معمار کو آرزہ گر۔

جدید فارسی میں بہت سے نئے نئے مصدر آگئے ہیں اور یقیناً اب بالکل نئے آمدنامہ کی ضرورت ہے، آپ نے اس پر کافی محنت کی ہے۔ مسودہ دیکھ لوں تو غور کروں کہ اس میں کسی اور اضافہ کی گنجایش ہے یا نہیں۔

بیغاریدن (طعن و سرزنش کرنا)، بنگشتن (نکلنا)، بنشاختن (بٹھانا)، چوخیدن (پھسلنا)، چغریدن (نالہ و زاری کرنا) چخیدن (لڑنا۔ اُردو میں بھی چخ کرنا اسی معنے میں آتا ہے) وغیرہ بہت سے نئے مصدر جدید فارسی میں مستعمل ہیں۔ کیا آپ نے اپنی فرہنگ میں انھیں شامل کرلیا ہے۔

فارسی میں خیر کا لفظ نہیں کے معنے میں آتا ہے، اس سے انکار نہیں، لیکن صرف اس وقت جب یہ لفظ تنہا بغیر کسی فعل کے استعمال کیا جائے، فعل کے ساتھ اس کا استعمال فارسی میں بھی بالکل اسی طرح ہوتا ہے، جیسے اُردو میں

کہتے ہیں :۔ "خیریت تو ہے ؟"

نظامی کا وہ مشہور قطعہ ملاحظہ فرمایئے، جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

دوش رفتم بہ خرابات و مرا راہ نبود، می زدم نالہ و فریاد کس از من نہ شنود

اس کا چوتھا شعر ہے :۔

گفت خیرست دریں وقت گرامی خواہی بے محل آمدنت بر درِ ما بہر چہ بود

یہاں خیرست بالکل "خیریت تو ہے" کے معنی میں لکھا گیا ہے۔

آپ بھی عجیب چیز ہیں ۔ اے، شکر کرو کہ "کشتۂ دوست" ہو "کشتۂ دشمن" نہیں ۔ تم کیا کرتے اگر وہ تمہیں اس قابل بھی نہ سمجھتے ۔۔ غضب خدا کا اس رمز کو فاش کئے دیتے ہو، جس کی خبر "کراماً کاتبین" کو بھی نہ ہونا چاہئے !

میں ان سے ملوں گا اور تمہاری شکایت بھی کسی نہ کسی پہلو سے ان تک پہونچا دوں گا، لیکن کیا کروں گا اگر وہ سنکر صرف ہنس دئے۔

بیوقوف ہوئے ہو، نہ تمہارا روٹھنا کوئی نئی چیز نہ اُن کی نمایشِ احتراز کوئی نئی بات ۔۔ جس طرح ٹھنڈے ٹھنڈے گئے تھے، ویسے ہی ٹھنڈے ٹھنڈے لوٹ آؤ۔ یہ گرمیاں ٹھیک نہیں۔ اگر تم نہ آئے تو اُن سے زیادہ مجھے افسوس ہوگا، سوال تمہارے نیم بسمل ہونے کا نہیں، بلکہ "اعتبارِ دستِ قاتل" کا ہے جو مجھے تم سے زیادہ عزیز ہے۔

تم اس قابل تو ہو نہیں کہ تمہاری کسی بات کا جواب دیا جائے، لیکن

چہ تواں کرد کہ بوئے تو خوش ست !

ہر بار تمہارے خط کا بھی جواب دیدیتا ہوں اور جو کوئی تمہارا ذکر کرتا ہے تو اسے سُن بھی لیتا ہوں۔ میں نے یہ کب لکھا تھا کہ "وہ آئے اور بہت بُزدل گئے" اور اگر یہ لکھا بھی تھا تو اس کا یہ مطلب تم نے کیونکر سمجھ لیا کہ میرے نزدیک قصور انکا تھا۔ یہ تو اپنی کوتاہی اور بیدلی کی بات تھی، نہ کہ اُن کی ۔۔۔ عجیب چیز ہو۔

بہر حال اگر تمہاری اس ذہانت و معنی آفرینی سے انھیں کوئی شکایت پیدا ہوگئی ہے تو وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے، لیکن تم اسکی جوابدہی میں مجھے کیا لکھوگے، اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

کیا کروں، دقت و جرأت دونوں کا فقدان ہے، ورنہ خود آکر تم سے پوچھتا اور ۔۔ تم تو خیر، شرمندہ کیا ہوتے لیکن میرے دل کی بھڑاس تو نکل جاتی۔

قدیم سنسکرت لٹریچر

(بہ سلسلہ ماہ اپریل ۴۷ء)

رگوید کے مطابق "منوؔ کی وہ حیثیت ہے جو یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں آدم کی بہ حیثیت ابوالبشر ہونے کے ہے یعنی یہ وہ شخصیت ہے جس سے تمام انسان پیدا ہوئے۔ نذر و نیاز چڑھانے والا قربانی کرنے والا پہلا پوجاری منوؔ ہے۔ رگوید کے شاعر اُس کو "ہمارا باپ" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ "براہمنڑوں" میں اُس کے متعلق وہی قصہ بیان کیا گیا ہے جو کتبِ یہود میں طوفانِ نوح کا ہے۔ "وِوَسوَت" (آفتاب یا چمکیلا آسمان) کا لڑکا ہے۔ اُسکا توام بھائی یم ہے۔ براہمنڑوں کے بعد کے مذہبی افسانوں میں سات منوؔ گزرے ہیں۔ اخیر منوؔ وہ ہے جس کے نام پر "منوؔ" کا دھرم شاستر ہے۔

منوؔ کی شخصیت تنہا ہے۔ جماعت یا گروہ کی حیثیت میں بِرگھوؔ قوم کا ذکر ابھی آچکا ہے۔ اس گروہ کے علاوہ اور بھی پوجاریوں کے گروہ ہیں۔ ایک اُن میں انگیرس نام کے پوجاریوں کا افسانوی گروہ ہے۔ جب اندؔر دیوتا گایوں کے چھڑانے کے لئے جنگ کرتا ہے تو پوجاریوں کا یہ طبقہ اُس کے ساتھ ہوتا ہے اور اندر کی مدد کرتا ہے۔ دوسرا گروہ "سپت رِشی" نام کا ہے (رشی بہ معنی صاحب علم و کمال جس میں غیب دانی شامل ہے) براہمنڑوں میں ان سے مراد سات ستاروں کا وہ جھنڈ ہے جس کو عقد ثریا کہتے ہیں۔

رگوید کے مذہبی تخئیل اور مذہبی افسانوں میں چوپایوں کو بھی دخل ہے جن میں سے گھوڑا اور گائے قابل ذکر ہیں دیوتاؤں کے رتھ گھوڑے ہی کھینچتے ہیں۔ اس کے علاوہ آفتاب و آتش کی نمایندگی کا کام بھی گھوڑے سے لیا جاتا ہے رگوید کے دو بھجنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی آریوں کے ابتدائی زمانہ میں گھوڑے کی قربانی کی جاتی تھی۔ گائے کی شان گھوڑے سے بہت زیادہ نمودار ہے۔ اُس کے نمایاں مفاد کی وجہ سے شروع زمانہ ہی سے اُس کو اہم مرتبہ حاصل رہا ہے۔ درحقیقت اُس کی عظمت ہند و ایران کے زمانہ ہی سے قائم ہے۔ گایوں کی تشبیہ سے رگوید بھرا ہوا ہے۔ پانی سے بھرے ہوئے بادل (پرِشنی) ہیں تو گائیں ہیں۔ صبح کی نوی شعاعیں ہیں تو گائے۔ خود زمین بھی رگوید کے شاعروں کے نزدیک گائے ہے۔ ایک رشی تو اُس کو ادتیہ ہی قرار دیکر ہدایت کرتا ہے کہ اُسکا ذبح کرنا درست نہیں۔ اُس کا لقب "اگھنیا" (ناقابلِ ذبح) رکھدیا گیا۔ اتھروید کے زمانہ میں گائے کی پرستش پورے طور پر

پختہ ہوگئی - اور اُس کے بعد کے زمانہ میں گائے بیل کے گوشت کھانے کی خرابیاں بیان ہونے لگیں - چنانچہ آج کل گائے کا جو تقدس ہے وہ ظاہر ہے -

موذی جانوروں میں جن سے مذہبی افسانے متعلق ہیں اور جو مذہبی عقاید کا جزو ہیں سانپ قابل ذکر ہے ایک شکل تو وہی ہے جس کو انّدر کے مقابلہ میں ظاہر کیا گیا ہے اور جس کا نام وِرِتر ہے - اس کی ایک شکل اور ہے جسکو اَہی (افعی) بُدھنا کہا گیا ہے - یہ آسمانی یا فضائی سمندروں میں رہتا ہے اور انہی صفات سے متصف ہے - رگ وید کے بعد کے ویدوں میں بحیثیت مجموعی سانپ نیم دیوتا صفت ہستیاں "گندہرو" وغیرہ کی طرح مانی گئی ہیں - اور جب سُوتروں کا زمانہ آتا ہے تو اُن کتابوں میں سانپوں کو نذر و نیاز چڑھانے کا قاعدہ مقرر ہوتا پایا جاتا ہے - سوتروں کے بعد کی لٹریچر میں پہلی مرتبہ ناگوں کا ذکر آتا ہے، جو حقیقتاً انسانی شکل میں سانپ دکھلائے گئے ہیں - اسکے بھی بعد یعنی ویدی زمانے کے بعد کے زمانہ میں سانپوں کی پرستش تمام ہندوستان میں رائج پائی جاتی ہے - چونکہ رگوید میں سانپوں کی پرستش کا ذکر نہیں ہے اور ابتداً ہندوستان کی غیر آریہ قوموں میں ہی اُس کا رواج تھا اس لئے قیاس یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں آریہ اقوام نے بھی اس آئین کو قبول کرلیا اور اس طرح سانپ کی پرستش کل ہندو اقوام کے عقایدِ مذہبی میں شامل ہوگئی ہے - ناگ پنچمی کا تیوہار اسی پرستش کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے -

آسمان و زمین - پہاڑ اور ندیوں کے ساتھ ساتھ رگ وید میں درختوں اور پودوں ہی کو مخاطب کیا گیا ہے اور اُن کی ثنا و صفت بیان کی گئی ہے - اُن کو شفا عطا کرنے والی شخصیت ظاہر کیا گیا ہے - بعد کے ویدوں میں اُن کو قابل عظمت - بیان کرکے اُن پر چڑھاوا چڑھایا جانا بتلایا گیا ہے - رگوید میں درختوں کے جنگل کی ایک علیحدہ شخصیت قرار دیکر اُس کا نام "ارن یانی" رکھا گیا ہے - اس دیوی کے نام پر ایک پورا بھجن ہے جس کا کچھ حصہ تخئیلی نقطۂ نگاہ سے پیش کیا جاتا ہے - اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جنگل کی سنسان تاریکی کیا سماں پیدا کرتی ہے -

"ایسی صدائیں سُنی جا رہی ہیں جیسے کہیں گائیں چر رہی ہیں -
دور پر کوئی دھندلی سی جھونپڑی نظر آتی ہے -
اور "ارن یانی" — جنگل کی پری -
اس طرح آواز نکال رہی ہے جس طرح بیل گاڑی سے شام کے وقت آواز نکل رہی ہو -
اس طرف کوئی شخص اپنی گائے کو اپنی طرف بلا رہا ہے -
اُدھر کوئی شخص لکڑی کاٹ رہا ہے -
جب کوئی شخص جنگل میں ذرا ٹھہرتا ہے -
تو وہ خیال کرتا ہے کہ اُس نے کوئی آواز سنی -

"ارن یانی" کبھی کسی کو نہیں ستاتی -
جب تک کہ خود کوئی شخص اُس کے زیادہ قریب نہ پہونچے -
جب وہ میٹھے میٹھے پھل کھا چکتی ہے -
تو خود اپنی مرضی سے آرام کرنے چلی جاتی ہے -
عطر پاش اور خوشبوؤں سے بھری ہوئی -
بغیر جوتنے کے غذاؤں سے مالامال -
حیوانوں کی ماں - جنگل کی پری -
اُس کو سراہکر میں نے اُس کی شان و عظمت میں اضافہ کیا ہے"

رگوید میں قدرتی مناظر و مظاہر کے علاوہ مصنوعات بھی قابلِ عظمت و پرستش اور خدائی صفات رکھنے والے مانے گئے ہیں - مثلاً پوجا اور قربانی کے وقت جو آلے استعمال ہوتے تھے - قربانی کے لئے لکڑی کا جو ڈنڈا یا کھمبا گاڑا جاتا تھا - کھیت جوتنے کا ہل - سوم کی بیل پیسنے کا پتھر - لڑائیوں میں استعمال ہونے والے ہتھیار اور نقارے وغیرہ

رگوید کے مذہبی دائرے میں عفریت اور شیاطین بھی داخل ہیں - ان کی دو قسمیں ہیں - ایک تو فضائی یا ہوائی عفریت ہیں - ان کو آسور کہتے ہیں - اس لفظ کے متعلق بحث قبل ازیں آچکی ہے - فضائی عفریتوں میں ورتر کا ذکر بھی آچکا ہے جو اندر کا مدمقابل ہے - ایک عفریت وَل نام کا ہے - یہ بھی اندر کا دشمن ہے اور اُن مستحکم اور بظاہر قلعہ بند مقامات کی نمایندگی کرتا ہے جو کالے کالے بادلوں میں غاروں اور گھٹاؤں کی شکل رکھتے ہیں اور جن میں آسمانی گائیں مقید رہتی ہیں - ورتر اور وَل بھائی بھائی ہیں اور اندر کے ہاتھ سے قتل ہوئے ہیں - اندر کا تیسرا دشمن شُشن (یعنی پھنکارنے والا) ہے جس کا نام رگوید میں اکثر لیا گیا ہے - ایک اور بھی عفریت "سوربھانو" نامی ہے - جو سورج کو تاریکی سے ڈھانپ لیتا ہے - پچھلے سنسکرت کے زمانہ میں اس کا جانشین "راہو" ہوا - یہ چاند اور سورج کو نگل جاتا ہے جس کو گہن لگنا کہا جاتا ہے - ابتدا میں یہ تنہا شخصیت رکھنے والے عفریت تھے جن سے دیوتاؤں کا مقابلہ فرداً فرداً ہوتا رہتا تھا - بعد میں اسی قسم کے گروہ در گروہ مانے گئے اور دیوتاؤں اور اُن میں بحیثیت مجموعی جنگیں شروع ہو گئیں ——— منجملہ ان گروہوں کے ایک گروہ پنی نام کا ہے - یہ "اندر" کے فضائی دشمن ہیں - لغوی معنی اس لفظ کے کنجوس کے ہیں یعنی وہ لوگ جو نذر و نیاز اور قربانی کرنے میں بخل کرتے ہیں - مذہبی افسانوں میں یہ فضائی عفریت ہو گئے جو آسمانی خزانوں کو روکے بیٹھے ہیں - لفظ داس یا دسیو بھی عفریت کے معنی میں رگوید میں مستعمل ہوا ہے -

دوسری قسم وہ ہے جس کو غول کہا جا سکتا ہے - جس طرح آسور دیوتاؤں کے دشمن ہیں یہ انسانوں کے دشمن ہیں

اور زمین پر رہتے ہیں - ان کا عام نام راکشس ہے ۔ یہ جانوروں کی شکل میں بھی رہتے ہیں - اور رگوید میں اُن کا ذکر اُس ضمن میں آتا ہے جبکہ دیوتاؤں سے اُن کو برباد و ہلاک کرنے کی دعا مانگی جاتی ہے یا اُن کے ہلاک اور برباد ہونے پر دیوتاؤں کی ثنا و صفت کی جاتی ہے - اتھروید میں اُن کو بدہیئت و بدقوارہ اور نیلے پیلے ہرے رنگ کا ہونا بیان کیا گیا ہے - رگ وید کے بیان کے مطابق یہ انسانوں اور گھوڑوں کا گوشت کھا جاتے ہیں اور اسی غرض سے اُن میں حلول بھی کر جاتے ہیں - اُن کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ راتوں کو خفیہ گھومتے پھرتے ہیں اور نذر و نیاز اور قربانی کی چیزوں پر خاص طور پر حملہ آور ہوتے ہیں - ویدی زمانہ کے بعد کے زمانہ میں یہ عقیدہ رائج پایا جاتا ہے کہ قربانی یا پوجا کی رسمیات کی ادائی میں یہ شیاطین رخنہ انداز ہوتے ہیں - ان راکششوں کی ایک خاص قسم ہے جس کا نام "پشاچ" ہے - رگوید میں اس طبقہ کا بہت کم ذکر ہے لیکن دیگر ویدوں میں اس طور سے اُن کو ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ مُردوں کی لاشیں کھا جاتے ہیں اور یہ کہ وہ مُردوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں -

رگوید کے بھجنوں میں موت اور آیندہ زندگی کے متعلق اشارات شاذ ہیں - اُن کے لئے موجودہ زندگی ہی طرب انگیز تھی اور آیندہ کیا ہوگا اُس کی کوئی زیادہ فکر اُن کو نہ تھی - ان اُمور کی طرف توجہ آیندہ نسلوں کے لئے چھوڑ دی گئی تھوڑی سی واقفیت جو رگوید سے حاصل ہو سکتی ہے وہ اُس کی دسویں کتاب کے اُن بھجنوں میں ظاہر کی گئی جس میں مراسم تجہیز و تکفین کی تفصیل درج ہے - اُن سے جس اعتقاد یا عقیدہ کا اظہار ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آگ یا قبر صرف جسم کو ضایع کرتی ہے - لیکن متوفی کی اصلی شخصیت لافانی ہے - اس شخصیت کی قابلیت جسم سے علحدہ ہونے کی مانی گئی ہے نہ صرف مرنے پر بلکہ بیہوشی کی صورت میں بھی - تاہم رگوید میں یا بعد کے ویدوں میں تناسخ کے عقیدہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے - گویا اُسوقت تک اس مسئلہ کا وجود نہیں تھا - رگوید میں البتہ ایک مقام پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ روح پانی (بصیغۂ جمع) اور پودوں کی طرف چلی گئی - ممکن ہے کہ مسئلہ تناسخ کو اس جملہ سے اخذ کیا گیا ہو - واقعہ یہ ہے کہ جب بدھ مذہب چھٹی صدی قبل مسیح میں جاری ہوا تو عقیدۂ تناسخ ازدواج پختگی کے ساتھ قایم ہو چکا تھا -

رگوید کا فلسفہ دیوتاؤں اور دیوتا صفت شخصیتوں کی تفصیل مندرجۂ بالا ذرا طول طویل معلوم ہوتی ہوگی - وجہ ظاہر ہے کہ رگ وید کا تقریباً کُل حصہ سوائے چند بھجنوں کے اُنھیں سے متعلق ہے - ابتک جو بیان ہوا ہے تقریباً ساری کتاب کا خلاصہ ہے - تاہم جو کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے اُس سے بھی بہت سی ایسی واقفیت حاصل ہوتی ہے جو اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اُس سے قدیم آریوں کے مزید عقاید و رسوم و خیالات کی توضیح ہوتی ہے - مثلاً آیندہ زندگی کے متعلق خیالات - مراسم شادی و غم - آفرینشِ عالم - تصوف وغیرہ - اب انکا تذکرہ حوالۂ قلم ہوتا ہے -

متعلقہ بھجنوں کے مطالعہ سے اس عقیدہ کا ہونا پایا جاتا ہے کہ مُردے کی روح عالم آسمانی میں اپنے آبا و اجداد

کی ارواح کے پاس پہونچتی ہے - ابتداءً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مُردے کو قبر میں دفن کرنے کی اور نعش جلانے کی رسمیں بلا امتیاز جاری تھیں - کئی بھجنوں میں موت کے سلسلہ میں مٹی کے گھر میں داخل ہونے کا ذکر ہے - لیکن اُسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تھوڑے زمانہ کے بعد ہی صرف جلانے کی رسم عام طور پر قایم رہ گئی - اور رسم تدفین صرف تارک الدنیا اشخاص اور دو برس سے کم بچوں تک محدود کر دی گئی --- جلانے کی رسم کے متعلق یہ عقیدہ بھی قایم ہوگیا کہ اگنی متوفی کو اُس کی آسمانی منزل تک پہونچا دیتا ہے - اُس منزل تک پہونچنے کے دو راستے ہیں - ایک دیوتاؤں کا راستہ - دوسرے پِتروں (آباؤ اجداد) کا راستہ - اگنی اِسی راستہ سے متوفی کو لیجاتا ہے اور اس کے آباؤ اجداد کے پاس پہونچا دیتا ہے جو یَم کے ساتھ بیٹھے ہوئے خوشیاں اور رنگ رلیاں مناتے ہوتے ہیں - یَم ایک بڑے درخت کے سایہ میں دیوتاؤں کے ساتھ سوم پی رہا ہے - بانسریاں بج رہی ہیں اور گیت گائے جا رہے ہیں - یہاں وہی لوگ پہونچتے ہیں جنھوں نے بہادری کے کارنامہ دکھائے ہیں - یا پوجاریوں کو اور بھاٹوں کو بیش از بیش بخششیں کی ہیں - اغیار یا بدکاروں کی روحیں کہاں جاتی ہیں یا اُن کا حال کیا ہوتا ہے اس کا ذکر رگوید میں نہیں - زیادہ سے زیادہ اُس کے مضامین سے جو اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ارواح زمین کے نیچے تاریک گڑھے میں ڈھکیل دی جاتی ہیں - رشیوں نے اس بارہ میں اس قدر خاموشی سے کام لیا ہے کہ بعض محققین نے یہ خیال کیا ہے کہ قدیم آریوں کے عقاید کے مطابق ایسی انسانی ہستیاں مرنے کے بعد کلّی طور پر فنا ہو جاتی ہیں - اتھرووید میں البتہ دوزخ کے عقیدہ کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ عقیدہ مابعد کے زمانہ میں دوزخوں اور جہنموں کے ایک پیچیدہ سلسلہ کے قایم ہونے کا باعث ہوگیا -

رِگ وید کے مطابق یَم مُردوں کی ارواح کا سردار ہے - کمل تین بھجن اُس کے نام پر ہیں - وہ پہلی شخصیت ہے جس نے آسمانی منزل تک پہونچنے کا راستہ دریافت کیا اور وہاں پہونچ گیا - جس طرح اوستا میں یَم، وِوَن ہَنت کا لڑکا ہے اُسی طرح رگوید میں یَم، وِوَسوت کا لڑکا ہے - مُردوں کی ارواح کو وہ لاتا ہے اور اُنکے آرام کے لئے سامان مہیا کرتا ہے -

"وہ جو بلندیوں کی راہ چلا اور جس نے تلاش کر کے بہتوں کے لئے راستہ دریافت کیا - وِوَسوت کا لڑکا اور لوگوں کی ارواح کو لاتے والا - بادشاہ یَم - نذر و نیاز چڑھا کر اُس کی پرستش کرو" (منڈل دہم - سوکت ۱۴ - ۱)

رگوید کے زمانہ میں اگرچہ یَم تھوڑے بہت خوف کی چیز ضرور ہے لیکن وہ محض مُردوں کا سردار ہے - موت کا خوفناک دیوتا مقرر ہونا بعد کے زمانہ سے یعنی اتھرووید اور اُس کے بعد کے Mythology زمانہ سے متعلق ہے - چغد اور کبوتر یَم کی ایلچی گری کا بعض اوقات کام دیتے ہیں لیکن اُس کے مقررہ جاسوس اور قاصد دو کُتے ہیں جو موت کے راستہ کی محافظت کرتے ہیں - ملاحظہ ہو دو بندوں کا ترجمہ جن میں میت کو مخاطب کیا گیا ہے

"اپنے راستہ پر دونوں کتوں سے گزرتا ہوا دوڑتا چلا جا۔
وہ کتے جو سرما کے لڑکے چت کبرے اور چار آنکھوں والے ہیں۔
اُن سے گزرنے کے بعد اپنے آباؤ اجداد کے نزدیک تر پہونچ جا۔
جو یَم کے ساتھ عیش کر رہے ہیں۔
یَم کے وہ قاصد چوڑے نتھنے والے اور بھورے رنگ کے۔
زندگیاں چٹ کرنے والے آدمیوں کے درمیان گھومتے پھرتے ہیں۔
ہم اُن سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ ہم کو مبارک زندگی بسر کرنے دیں۔
یہاں جہاں ہم ہیں اور آج ہی۔ کہ ہم سورج کی روشنی دیکھ سکیں" (منڈل دہم۔ سوکت ۱۴)

بعض مقامات پر رگوید میں یَم کو توام کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے، اس عقیدہ کے لحاظ سے کہ وہ اور اُسکی بہن یمی ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ اِن عقاید کے مقابلہ میں ایرانی اَوِستا کے بیانات بھی قابل غور ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ یَم کی ہستی بھی اولین مشترکہ عقاید کا جزو تھی۔ لیکن ایران میں کچھ تھی اور ہندوستان میں کچھ اور ہو گئی۔

(باقی) ا۔ ح

"بزمِ اخوت"

آج انسانیت جس دردناک دور سے گزر رہی ہے۔ اس کا بیان انسانی طاقت سے باہر ہے۔ بنگال، بہار، بمبئی اور کلکتہ کے واقعات کیا کم زہرہ گداز تھے، کہ آتشِ فساد پنجاب میں بھی بھڑک اُٹھی، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سرکش شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ خدا جانے کتنے ہوں گے، جو خانماں برباد ہو کر نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ کتنے ہوں گے جن کا اقتصادی اور کاروباری مستقبل تباہ ہو گیا، کتنے ہوں گے جو قانونی شکنجے میں بے گُناہ کس لئے گئے، کتنی عورتیں اور بچے ہوں گے جن کے پرورش کرنے والے مر گئے۔ اور اب انھیں نہ کھانے کو روٹی اور نہ پہننے کو کپڑا اور نہ سر چھپانے کو جھونپڑا میسر ہے۔

ان المناک واقعات کو دیکھ کر ہر دردمند انسان کا دل دُکھ کر رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ کیا مذہب کی تعلیم یہی ہے، اور کیا مذہب میں شرافت و انسانیت کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں — ہمارے خیال میں اب صرف ایک ہی تدبیر ہے اور وہ یہ کہ تمام نسلی و مذہبی تعصبات ختم کر کے انسانی معاشرہ کی بنیاد نسلِ آدم کی وحدت اور اخوت پر رکھی جائے۔ اور تمام بنی نوع انسان کو ایک رشتۂ محبت میں منسلک کیا جائے۔ ان حالات کے پیشِ نہاد ہم نے بزمِ اخوت کی بنا ڈالی ہے۔ قارئینِ نگار سے ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ تمام کے تمام اس بزم میں شامل ہو کر انسانیت کبریٰ کی خدمت انجام دیں گے۔

حکیم اقبال حسن معتمد۔ ادارہ "بزمِ اخوت" روبرو دربار داتا گنج بخش۔ لاہور

باب الانتقاد

"آبشار"۔ مجموعۂ کلام فیض جھنجھانوی

حضرتِ فیض جھنجھانوی سے تعارف تو عرصہ سے ہے مگر کبھی اتنی قربت نصیب نہیں ہوئی کہ میں انکا کلام کثرت سے سن سکتا۔ آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کچھ کلام سننے کا اتفاق ضرور ہوا ہے لیکن میں فیض صاحب کی شاعری کے متعلق کوئی مستقل رائے قایم نہیں کر سکا، تاہم ایک شاعر کی حیثیت سے ان کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں اور اب بھی دیکھتا ہوں۔

میرے ایک دوست کے ذریعے سے حضرتِ فیض کا کلام موسومہ "آبشار" مجھ تک پہونچا۔ اشتیاق کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا اور فرصت نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے خواجہ محمد شفیع صاحب کا مقدمہ نظر سے گزرا۔ خواجہ صاحب نے اس مجموعہ کی جس قدر تعریف کی ہے، اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی رائے میں فیض کے سوا کوئی اور شاعر صراطِ مستقیم پر چلنے والا پایا ہی نہیں جاتا اور فیض کا کلام یکسر الہام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقدمہ کے مطالعہ کے بعد میرے شوق کو تیز تر ہونا چاہئے تھا، لیکن مجھے افسوس ہوا کہ میں نے صرف اس مقدمہ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی کیوں نہ کتاب بند کر دی تاکہ فیض صاحب کے کلام سے زیادہ مستفیض ہوئے بغیر جو احترام ان کا میرے دل میں پیدا ہوا تھا وہ بدستور قایم رہتا۔ بہر حال میں نے مجموعۂ کلام کا بھی مطالعہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیض کا کلام 'الہام ربانی' کیا فکرِ انسانی کی حیثیت سے بھی زیادہ بلند نظر نہیں آیا۔ اتنا وقت نہیں کہ میں کلام فیض کے تمام اسقام کو پیش کر سکوں، تاہم چند نمونے حاضر ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات الہام بھی کتنا غلط ہوتا ہے۔

(۱) جب فروزاں ہو جوانی کی اندھیری رات میں عشرتِ امروز کا جامِ شرابِ ارغواں (نقد و نظر ۲۰)

ارغواں ایک قسم کا پھول ہے سُرخ رنگ کا اور اسی مناسبت سے سُرخ رنگ والی چیز کو ارغوانی (یائے نسبت کے ساتھ) استعمال کرتے ہیں۔ ارغواں کا لفظ بطورِ صفت استعمال نہیں ہوتا مثلاً:

بشرم رفتہ تنِ یاسمیں از آں اندام
بخوں نشستہ دلِ ارغواں از آں عارض (حافظ شیرازی)

در چمن از طراوتِ حسنش
آب بر روئے ارغواں بستم (ظہوری)

فیض صاحب نے یہی لفظ اور اسی غلطی کے ساتھ اپنی اور نظموں میں بھی استعمال کیا ہے۔

(۲) قصہ گو ہر خامشی تفصیلِ ہر اجمال ہے، گوشِ شنوا ہو تو ہر ذرہ زبانِ حال ہے (انتقام ۶۲)

شنوا در اصل بفتحتین بمعنی شنوندہ، بکسرِ نون بالکل غلط ہے۔ اردو میں بفتح نون ہی استعمال ہوا ہے شنوا:

گوشِ شنوا ہو تو مرے رمز کو سمجھے
حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی صدا ہوں (غالبؔ اثنار)

اس قدر ناشنوا کون ہے انسانوں میں
ہر گھڑی پنبۂ غفلت ہے ترے کانوں میں، (زنجیر)

(۳) ہر نالۂ حسرت ہوتا ہے آوازِ شگفتِ غنچہ و گل (۳۱)

شگفتن دو معنی رکھتا ہے۔ اول واشدن و خندیدنِ گل و غنچہ اور دوسرا تعجب نمودن[1]۔ پہلے معنی میں حاصل مصدر شگفتگی اور دوسرے معنی میں شگفت آتا ہے۔ جہاں پھول وغیرہ کے کھلنے کے معنی مقصود ہوتے ہیں وہاں لفظ شگفتگی استعمال کرتے ہیں اور شگفت کا لفظ تعجب اور حیرت ہی کے معنی میں مستعمل ہے مثلاً:

تبسم کناں دست بر لب گرفت
کہ سعدی مدار آنچہ دیدی شگفت (سعدی)

شب از ماہ بربست پیرایۂ،
شگفتے بود نور در سایۂ، (نظامی)

بخندید و انگشت برلب گرفت
کزو ہرچہ آید نباشد شگفت (سعدی)

یہی غلطی فیض صاحب نے اور نظموں میں بھی کی ہے۔

(۴) گاہ خوننابہ فشاں ہے رخِ برہم کی طرح (لال قلعہ ۸۱)

افشاندن بمعنی ریختن و پاشیدن مستعمل ہے لہذا رخ کی صفت کسی طرح "خوننابہ فشاں" صحیح نہیں ہے جب تک کہ رخ سے خون بہتا ہوا نہ دکھایا جائے۔ اور برہم ہونے کی کسی حالت میں بھی رخ سے خون نہیں بہ سکتا۔

(۵) بلبل ہی اس چمن میں نہیں صرف سوگوار
پھولوں کے خارِ غم سے گریباں ہیں تار تار (حسین ۱۳۲)

تار تار ہو جانا اُس چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جس کی ساخت میں تار موجود ہوں اور شکستہ یا مجروح ہونے پر اُس کے تار تار الگ ہو جائیں مثلاً جامہ و ریسمان وغیرہ۔ یہاں بجائے تار تار کے چاک چاک کہنا چاہیئے تھا، غالباً یہاں لفظ گریباں سے شاعر کو دھوکا ہو گیا ہے۔ گریبان بیشک تار تار ہو سکتا ہے لیکن کپڑے کا گریبان نہ کہ پھولوں کا۔ پھولوں کے

---

[1] درویش صاحب سے مجھے اس جگہ اختلاف ہے۔ تعجب کرنے کے مفہوم میں فارسی کا مصدر شگفتن نہیں بلکہ شگفتیدن ہے شگفت (بمعنی تعجب) شگفتن کا حاصل مصدر نہیں ہو سکتا، کیونکہ دونوں کے تلفظ میں فرق ہے۔ (نیاز)

گریبان ... لئے چاک چاک کا لفظ ہی صحیح ہے - دوسرا عیب شعر میں یہ ہے کہ جس طرح پہلے مصرعہ میں "بلبل بھی" کہا ہے، اسی طرح دوسرے مصرع میں "پھولوں کے بھی" کہنا چاہئے تھا -

(۶) قہقہہ زن پھول ہیں کلیاں تبسم ریز ہیں — نزہتِ فلدبریں ہے یا چمن آرائیاں (دوشیزۂ سحر ۱۵۳)

لفظِ قہقہہ میں خندہ باوازِ بلند کا پہلو ہے - پھول کو خندہ زن یا تبسم زن تو کہہ سکتے ہیں مگر قہقہہ زن کہنا بالکل غلط ہے - پھول کی شگفتگی کو ہنسنے سے تعبیر کرتے ہیں نہ کہ قہقہے سے - کلی کو قہقہہ زن کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں کھلتے وقت کٹ کی آواز سی پیدا ہوتی ہے - پھول کو قہقہہ زن کہنا مہمل بات ہے -

(۷) دل ہے پہلو میں مگر دل میں نہیں زندہ دلی — اسپہ طرفہ یہ کہ نوکِ خارِ غم سے ہے فگار (عبد المشرقین ۱۵۵)

نغمہائے روح پرور سے سماعت بہرہ ور — منظرِ فردوس منظر سے نظر سرمایہ دار (" ")

کشتۂ ذوقِ یقیں ہے حرف سوز و ساز ہے — اب بھی ہر آواز پردہ گوش بر آواز ہے (کمال پاشا ۸۸)

ان اشعار میں "دل میں نہیں زندہ دلی" اور "منظرِ فردوس منظر" اور "آوازِ گوش بر آواز" بالکل مہمل اور غلط ترکیبیں ہیں -

(۸) ہر جبینِ ذرہ میں روشن ہے شمعِ معرفت — ہر لبِ غنچہ پہ ہے الحمد رب العالمین (اذانِ غم ۱۷۴)

اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ذرے کی بہت سی جبینیں ہیں اور ہر جبین میں شمعِ معرفت روشن ہے اسی طرح "ہر لبِ غنچہ" کی ترکیب بھی درست نہیں ہے - یہاں "جبینِ ہر ذرہ" اور "لبِ ہر غنچہ" ہونا چاہئے تھا -

(۹) فیض کیا کیا دل امیں گاہ تصور نہ ہوا — میں نے جب پہلوئے مہتاب میں تارا دیکھا (۱۹۶)

"امیں گاہ" کی ترکیب معنی سے بے نیاز ہے -

(۱۰) نسیمِ صبحِ گلستاں کا مرمریں نغمہ (جامع مسجد دہلی ۱۳۶)

نغمے کو مرمریں کہنا درست نہیں - سفید رنگ کی نسبت سے کسی چیز کو مرمریں کہنا درست ہو سکتا ہے، لیکن نغمے کو کسی طرح مرمریں نہیں کہہ سکتے - نغمہ ایک غیر مرئی شے ہے اور مرمریں صرف مرئی چیز کو کہا جا سکتا ہے، تیسرے سُرخ رنگ کی عمارت کو مرمریں نغمہ کہنا یوں بھی بے معنی ہے -

(۱۱) تجھ سے وابستہ ہے اُس قوتِ اسلام کی شان — جو مہ و مہر پہ انگشت نما آج بھی ہے (قطب منارہ ۱۶۸)

"انگشت نما" فارسی کا محاورہ ہے جس کے معنی رسوا یا مشہور کے ہیں - یہ محاورہ اردو میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے - یہاں فیض صاحب نے جس معنی میں لکھا ہے وہ بالکل غلط ہیں - اسکے صحیح استعمال کی مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

انگشت نما داغ ہوا ساری سبھا میں (داغ)

اور انگشت نما ہوتے ہو گیا کرتے ہو (سائل دہلوی)

(۱۲) خیر ہے آپ ہیں کیوں چپ، بجھیں آج کی رات | توبہ توبہ چلے جانا نہ کہیں آج کی رات (۱۶۳)

پہلے مصرعہ میں "آپ" کہا ہے اور دوسرے مصرعہ میں "چلے جانا" کہا ہے حالانکہ "چلے جایئے گا" ہونا چاہئے تھا یہ شتر گربہ ہے۔

(۱۳) مرد اے ضبط شمعِ زندگی لہرائی جاتی ہے | فغاں کے ساتھ کھنچکر جاں لبوں پر آئی جاتی ہے (۱۹۴)

کشتیٔ دل ورطۂ اندوہ میں آئی ہوئی | طاقِ مایوسی پہ شمعِ روح لہرائی ہوئی (خونابۂ دل ۹۰)

شمع کی لو لہراتی ہے نہ کہ شمع۔ شمع کا لہرانا بالکل مہمل بات ہے۔

(۱۴) کیا حریفِ صحبت بیگانہ ہو طبعِ لطیف | سینۂ شبنم پہ برگِ سبزۂ تر سنگ ہے (۱۸۸)

"سینۂ برگِ سبزۂ تر" پر شبنم کا ہونا تو کچھ معنی رکھتا ہے مگر "سینۂ شبنم" پر "برگِ سبزۂ تر" کا ہونا بالکل غلط ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ قطرۂ شبنم پتے کے نیچے کی طرف بھی پایا جاتا ہے مگر اس کو سوائے تاویل کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے اس بات کو فرض کر بھی لیا جائے تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ "برگِ سبزۂ تر" سینۂ شبنم پر سنگ کی طرح بار ہے۔ برگِ سبزۂ تر تو شبنم کے وجود کا حامل ہوتا ہے پھر اسکو سینۂ شبنم پر سنگ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔

(۱۵) اے نسیمِ صبح تو نے تو چراغاں کر دیا | یہ گلِ آتش بجاں یہ لالۂ روشن ضمیر (۱۸۷)

چراغاں شام کو یا رات کے وقت کیا جاتا ہے۔ صبح کے وقت نہ چراغاں کیا جاتا ہے نہ اس وقت چراغاں کرنا کوئی لطف یا معنی رکھتا ہے۔

(۱۶) جو گرتی ہوئی دیوار کی صورت میرے تقاضے یاد نہیں | تو اُٹھتے ہوئے طوفاں کی طرح تم اپنے بہانے یاد کرو (۱۷۸)

"بہانے" کو "اُٹھتا ہوا طوفان" کہنا غیر مناسب ہے۔ طوفان کہہ کر کسی چیز کی شدت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اور بہانے میں کسی قسم کی شدت یا طوفانی کیفیت نہیں ہوتی، بہانہ ہمیشہ نرمی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(۱۷) چپ بھی رہ واعظِ گوشہ نشیں آجکی رات | ہے دماغ اپنا سرِ عرشِ بریں آجکی رات (آجکی رات ۱۰۱)

یہ تبسم یہ مئے ہوشربا یہ ساقی | تو بھی ایسے میں ٹھہر جا نہ کہیں آجکی رات

یہاں واعظ کی صفت "گوشہ نشیں" بیان کی ہے جو درست نہیں۔ عابد اور زاہد کے ساتھ گوشہ نشیں کی صفت صحیح ہو سکتی ہے۔

(۱۸) حسرت اندوز ہے حالِ دلِ دیوانۂ غم، | عبرت آموز ہے ٹوٹا ہوا پیمانۂ غم (لالۂ صحرا ۷۹)

حالِ دلِ دیوانۂ غم کو تو حسرت اندوز کہہ سکتے ہیں مگر ٹوٹے ہوئے پیمانۂ غم کا عبرت آموز ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ پیمانۂ غم کے ٹوٹنے کے معنی سوائے مسرت یا فقدانِ غم کے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پیمانۂ شراب کا ٹوٹنا تو عبرت آموز ہو سکتا ہے مگر پیمانۂ غم کا ٹوٹنا بالکل اسکے برعکس بات ہے۔

(۱۹) فرطِ طرب سے رنج و محن جھومنے لگے — نیل و فرات و گنگ و جمن جھومنے لگے (ابرِ گہرفروش ۹...

رنج و محن کا فرطِ طرب سے جھومنا عجیب بات ہے - طرب کی حالت میں رنج و محن کا باقی رہنا اور پھر رنج و محن کا خود خوشی محسوس کرنا حد درجہ لایعنی سی بات ہے -

(۲۰) تجھ کو میرے دلِ خوننابہ فشاں ہی کی قسم — مسکرا! خمکدۂ بادۂ احمر ہے تو (لالِ قلعہ ۸۳)

خمکدے کو مسکرانے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے -

(۲۱) نسیمِ سحر کی سبک سیر آہیں — رگِ گل سے پھوٹی ہوئی شاہراہیں (سفرِ حیات...
اُبلتی ہوئی لالہ زارِ شفق سے — ہزاروں گلابی گلابی نگاہیں
رگِ جاں بنائے چلا جا رہا ہوں

اس بند میں سب سے بڑی قابلِ اعتراض چیز تو یہ ہے کہ نگاہوں کو گلابی کہا ہے، آنکھ کو گلابی کہہ سکتے ہیں لیکن نگاہوں کو گلابی کہنا مہمل بات ہے - دوسری غلطی یہ ہے کہ "رگِ گل سے پھوٹی ہوئی شاہراہیں" لکھکر گل کی ہر رگ کو شاہراہ کہدیا ہے - حالانکہ چند راہوں میں سے صرف ایک ہی راہ کو شاہراہ کہہ سکتے ہیں نہ کہ سب کو -

(۲۲) آتش بدل ہوں میں، غمِ سبطِ رسول سے — بوئے کبابِ سوختہ آتی ہے پھول سے

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں کوئی معنوی ربط نہیں ہے - آتش بدل تو آپ ہیں اور بوئے کبابِ سوختہ پھول سے آرہی ہے - اگر پھول کو آتش بدل کہا ہوتا تو بیشک اس میں سے بوئے کبابِ سوختہ آسکتی تھی -

(۲۳) کھل رہا ہے خندۂ گل میں جمالِ نوعروس، — ہنس رہی ہے جلوۂ شبنم میں روحِ انگبیں (آویزشِ معصوم ۱...

جلوۂ شبنم میں روحِ انگبیں کا ہنسنا مہمل سی بات ہے کیونکہ جلوۂ شبنم کا تعلق باصرہ سے ہے اور روحِ انگبیں کا تعلق ذائقہ سے -

(۲۴) کیا تعجب ہے نسیمِ صبح کی آغوش میں — صورتِ غنچہ چٹک جائے دلِ اندوہگیں (۱۳۷)
دامنِ نازکی جنبش سے چٹک ہی جاتا — غنچے میں رکھ نہ دیا قلبِ حزیں آنچکی رات

جب تک دل کو استعارتاً غنچہ نہ کہا جائے محض دل کا چٹکنا نہیں بول سکتے -

(۲۵) ذرہ ذرہ گلستاں کا آئینہ دارِ بہار — فرطِ حیرت سے دہانِ گل میں ہے انگشتِ خار (بہارستاں ۱۴۴)

اول تو عالمِ بہار میں مسرت اور مستی کا زور ہوتا ہے نہ کہ حیرت کا دوسرے دہانِ گل میں انگشتِ خار کا تصور دماغ کسی طرح قبول نہیں کرتا -

(۲۶) سرفروشی پر جو تُل جائے تو تیغِ بے نیام — دلربائی پر اُتر آئے بتِ طناز ہے (شاعر ۱۴۰)

"دلربائی پر اُتر آئے" کے بعد لفظ "تو" نہایت ضروری ہے

(۲۸) اشتہا ہو تو وہ حاضر ہے طعامِ خوشگوار — جسکی لذت من و سلویٰ سے کہیں بڑھکر بھی اب (نگارِ مغرب ۱۶۴)

یہاں دوسرے مصرعہ میں لفظ 'بھی' بے محل ہے اس کی صحیح جگہ 'من و سلویٰ سے' کے بعد ہے

(۲۹) کچھ بکدر رسا سر بالیں تجھے پاتا ہوں میں　　لے چراغِ صبح سے پہلے بجھا جاتا ہوں میں

شاعر نے 'انسان کا بجھ جانا' مرنے کے معنے میں استعمال کیا ہے جو کسی طرح جائز نہیں انسان کا چراغِ زندگی تو بجھ سکتا ہے لیکن خود انسان کا بجھ جانا بالکل مہمل بات ہے۔

(۳۰) خدا ناکردہ بجلی نے ادھر دیکھا تو کیا ہوگا　　شمیمِ گل سے شاخِ آشیاں تھرائی جاتی ہے (۱۹۵)

شمیم کے معنی بو کے ہیں اور اُس ہوا کو بھی کہتے ہیں جس میں خوشبو ملی ہوئی ہو مگر شمیمِ گل کے معنی تو سوائے بوئے گل کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے لہذا شاخِ آشیاں کا شمیمِ گل سے تھرانا بالکل مہمل بات ہے۔

(۳۱) اک بادِ سیمابی برسامہ و اختر سے　　نکلے جو تڑپ کر وہ چاکِ دلِ مضطر سے (۱۹۶)

اُن کا چاکِ دلِ مضطر سے تڑپ کر نکلنا عجیب و غریب تخیل ہے۔ علاوہ اس کے مضطر، مضطرب کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں۔

(۳۲) کھنچی جا رہی ہے طنابِ رگِ جاں　　بجھا جا رہا ہے چراغِ بصارت (دمِ واپسیں ۱۱۲)

طناب خیمے کی رسی کو کہتے ہیں اسلئے طناب کا کھنچنا خیمے کی درستی اور استادگی کو ظاہر کرتا ہے کے معنی میں جو مستعمل ہیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ اس شعر میں رگِ جاں کو طناب کیوں کہا گیا ہے جبکہ خیمے یا اسی قسم کی کسی چیز کا ذکر نہیں کیا۔ ظہوری کا شعر ہے:

سایبانِ محبتش چو زنند　　دل زر رگہائے جاں طناب کشد

اس شعر میں جہاں رگوں کو طناب کہا ہے وہاں محبت کا سائبان یعنی شامیانہ بھی دکھایا ہے۔ اگر اس شعر میں محبت کا سائبان نہ ہوتا تو طناب کا لفظ بے معنی سا ہو کر رہ جاتا۔ اس شعر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ طناب کا کھنچنا شامیانے یا خیمے کی درستی پر دلالت کرتا ہے۔ خرابی یہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وزن شعر کو پورا کرنے کے لئے چونکہ طناب اور رگ میں کچھ مشابہت سی ہے اسلئے طناب کا لفظ رکھ دیا جس کی وجہ سے وزن کی کمی تو جاتی رہی مگر معنی کی کمی پیدا ہو گئی۔ مرتے وقت رگوں کا کھنچنا تو ہوتے ہیں مگر رگوں کی طناب کا کھنچنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ (باقی)

نوائے ملت

جھلملاتے قہقہے، بجھتی ہنسی، تپتے شباب　　آگ میں ڈھلتے ہوئے نغمات، لو دیتے رباب
ٹوٹ فردوسِ زمیں پر اے جہنم کے عذاب!　　جاگ او روحِ بغاوت، زندہ باد اے انقلاب!!

صبح کا پرچم کچھ اس صورت سے لہراتا رہا
ہر اُجالے میں اندھیرے کا بھرم جاتا رہا

بے اُجالے رات منہ سورج کا دھو سکتی نہیں،　　رات کی ظلمت رسولِ صبح ہو سکتی نہیں،
نزع کے عالم میں روحِ عصر کھو سکتی نہیں　　زندگی ہر زخم پر ہنستی ہے رو سکتی نہیں

قہقہے بجھتے نہیں سیلِ غم و آلام سے
دیکھ وہ پھوٹی کرن پیشانیِ ایام سے

زلزلے سائے سے دب دب کر گزر جائیں گے کیا　　تند رو دھارے چٹانوں سے بھی ڈر جائیں گے کیا
آندھیوں کے سیل تنکوں سے اُتر جائیں گے کیا　　ٹوکنے سے راستوں میں ہم ٹھہر جائیں گے کیا

تیز ہے نبضِ حوادث گرم خونِ انقلاب
کتنے سورج سامنے ہیں، کتنی صبحیں ہم رکاب

یہ بہاریں، یہ جمال و رنگ کے جھوٹے رسول　　یہ دھواں دیتے شگوفے، یہ کفن بردوش پھول
آہ یہ خلدِ وطن پر برق و طوفاں کا نزول　　بھول اے ہندوستاں سب کچھ مگر اتنا نہ بھول!!

کھا چکے اسپین و یونان جن کی تلواروں کے داغ
جھلملا سکتا ہے بجھ سکتا نہیں ان کا چراغ

اے بہشتِ رنگ و بُو، اے وادیٔ گنگ و جمن　　تل رہے ہیں بجلیوں میں کب سے نسرین و سمن
دہل رہے ہیں تیرے دھاروں میں شہیدوں کے کفن　　کتنے سینوں میں دھڑکی ہیں، کتنے ماتھوں پر شکن

آفتابوں پر کمندیں ڈالتی ہو جن کی رات
وقت کی پھونکوں سے کجلاتا نہیں ان کا ثبات

جن کے ہوں افسانہ خواں ہسپانیہ کے بام و در　　ثبت ہو جبروت جن کی مصر و روم و شام پر
بابل و یونان نے دیکھے جنگی تیغوں کے شرر　　تا سوادِ چین پہونچی جن کی گردِ رہگزر

آسماں اُن کے سفینوں کو ڈبو سکتا نہیں
وقت اُنکی عظمتوں کے نقش دھو سکتا نہیں!!

پروفیسر شور (علیگ)

حیات اور رفیقِ حیات

ہنوز دل کو نہ احساسِ دردِ پنہاں تھا / ہنوز آدمِ خاکی بنا نہ انساں تھا
رہا تھا مرتبوں سے دور خاک کا ڈھانچہ / وہی تھا خاک کا پتلہ، وہی جمود زدہ
عروج پا سکے جن سے نہیں تھے وہ اسباب، / لطیف کیفیتیں، یعنے زیست کے آداب
وہ ایک کیفِ محبت لطیف تر دیدی / ہنوز حُسن کے پردوں کی سازگار نہ تھی
ابھی تھا "عشق" کا احساس آدمی سے جدا / ہنوز آدمی کو اپنے دل کا تھا نہ پتا
نہ حسن و عشق کا تھا کوئی مورد و مصدر / نہ تھی جنوں کی آوارگی بے محور
نہ تیرِ ناز تھا اور تھا نہ اس کا کوئی ہدف / "نشاط" ایک طرف تھا "الم" تھا ایک طرف

مزاجِ آدمی میں تھے دل و دماغ مگر
باینہمہ وہی حیوان، بلکہ حیواں تر
"شعورِ ذات" کا دل میں نہ کوئی خونِ جواں
دماغ میں بھی نہ کوئی "خودی" کی روحِ رواں

وہ کوئی بات ہوئی جس سے قلب قلب بنا / عمیق نقشِ سوید میں انقلاب ہوا
یکایک آ گئی جذبِ نہاں میں اک حرکت / یہیں سے پیدا تھا آغازِ کاوشِ الفت
تلاشِ عشق ہوئی ہائے وہو کی خلوتگاہ / جنوں بدامن و سودا بسر، طلب بہ نگاہ
سرور چاہتا تھا محفلِ نشید و رباب / غمِ فگار پئے نشترِ نگاہِ عتاب
"نشاط" گلکدہ و ابر و باد کا خواہاں / کنارِ نکہتِ جادو نژاد کا خواہاں
سنا رہا تھا غم اپنی طلب کا افسانہ / کہ ڈھونڈتا ہوں تب و تاب کا نہاں خانہ
الم کے واسطے اک ایسا جسم ہے درکار / جو درد و کرب کے سہنے پہ ہو سکے تیار
خودی کو چاہئے تھا مظہرِ خدا ہونا / شعورِ ذات کا آنا خدا نما ہونا

سبھی تھے تیرگیِ جستجو میں سرگرداں
ملا تمام کو انساں تو بہرِ دلِ انساں
تمام کیفیتیں جم گئیں "حیات" بنی
پھر اس کے بعد حیات آدمی کی ذات بنی
بتِ جمود زدہ جس سے تیرگی تھی طلوع
اب اسکی ذات سے اک تابِ زندگی تھی طلوع

پھر اس کے بعد ہر اک کیفیت نے یہ چاہا — کہ آدمی رہے اپنا ہی مظہر و مبدا
تھی آرزوئے محبت کہ دل خراب رہے — ہر ایک رنگ میں وارفتۂ شباب رہے
ادھر یہ عشق کا اک مدعائے اصلی تھا — کہ آدمی رہے بس سوز و ساز کا بندہ
ادھر ہوا و ہوس کی کشش کہ ہو انساں — نشاطِ نفسِ کمینہ میں محو سرگرداں،
غم و الم نے یہ چاہا کہ اشک ریز رہے — دل و جگر کی فغاں کا فسانہ خیز رہے
ہو غرقِ کبر و خودی، یہ خودی کا دعویٰ تھا — خدا ہو بندہ یہی، یہ خودی کا دعویٰ تھا

ہر ایک رنگ کے دعوے سے بیقرار ہوا — بہت ہی آدمی مجبورِ اضطرار ہوا،
ہے بہرِ کارِ جہاں زیست کا سفر مقصود — نہ صرف کبر و خودی ہے تمامتر مقصود
نہ صرف عیش و سرور نشاط ہے مقصود — یہ ہوں ضرور مگر احتیاط ہے مقصود
کوئی ابھی نہ تقاضائے عشق کو سمجھا — وہ کامیاب ہے جو محوِ ماسوا نہ ہوا

رہا تھا آدمی ناکارہ راہ ہستی کا
رہِ حیات میں حیران شش جہات ہوا
اسے نہ گو خضرِ رہنما کی حاجت تھی
رفیق منزلِ ہستی کی پھر ضرورت تھی

اداس رہتا تھا تنہائیاں تھیں وجہ بلا — "رفیق زیست" سے آخر یہ اس کا عقدہ کھلا
یہ ساری شش جہتیں دور ہو گئیں اس سے — تمام گمرہیاں دل سے کھو گئیں اس سے
اسی سے کارِ جہاں اپنا حسبِ حال ہوا — اسی سے آدمی پابندِ اعتدال ہوا

اسی کو راہنمائے نجات کہتے ہیں
"شریک زیست" "رفیق حیات" کہتے ہیں

"حیات" ہی کے لئے کائنات ہوتی ہے — رفیق ہی سے مکمل حیات ہوتی ہے

اسمٰعیل رفیعی

مطبوعات موصولہ

زندگی کے جائزے از ابو سعید بزمی صاحب - ایم - اے - مکتبۂ دانش مزنگ لاہور صفحات ۲۲۴ - قیمت ۲ ؎ یہ بزمی صاحب کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے - جس میں موجودہ سماجی مسایل پر تنقید کی گئی ہے - بزمی صاحب نے گزارش میں ان افسانوں کو واقعات ظاہر کیا ہے - انھوں نے ان افسانوں کا مقصود یہ ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اوسط اور اعلیٰ اوسط طبقے کی موجودہ معاشرت و معیشت، مغرب کی نئی اور مشرق کی پرانی تہذیب کے امتزاج سے جس عجیب و غریب کشمکش میں مبتلا ہے الفاظ کے کیمرے سے اس کا ہو بہو فوٹو ان اوراق میں پیش کیا گیا ہے - جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یہ افسانے لکھے گئے ہیں ان کی اہمیت ثابت ہے لیکن ان افسانوں میں انکا مقصد اس قدر نمایاں ہے کہ افسانوں کی جاذبیت بہت ہی گر گئی ہے - تاہم افسانے مفید اور سبق آموز ہیں -

جام نو مولفہ سید شاہ عنایت مولیٰ تاباں القادری - مکتبۂ قادریہ - کلکتہ - صفحات ۱۹۰ - قیمت ۲ ؎ - یہ موجودہ بنگال کے نوجوان شعرا کے کلام کا انتخاب ہے - ان کی مختصر سوانح حیات اور ان کی تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں - بنگال میں اردو نظم کس دور سے گزر رہی ہے اس کا اندازہ بھی اس کتاب سے ہو سکتا ہے - لیکن بنگال کے ان جواں عمر اور جواں سال شاعروں سے اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ وہ شمالی ہند کے نوجوان شاعروں کے کلام سے اور شمالی ہند کی موجودہ ادبی تحریکات سے بھی مستفید ہونے کی کوشش کریں -

باغی از رئیس احمد جعفری - کتب خانہ تاج آفس بمبئی نمبر ۳ - صفحات ۲۳۸ - قیمت درج نہیں - جعفری صاحب نے اس ناول میں سماج کی بے شمار ناانصافیوں میں سے ایک کو بے نقاب کرنا چاہا ہے اور وہ یہ کہ اگر شریف طبیعت کی کوئی عورت ہو خواہ وہ لونڈی ہی کیوں نہ ہو تو اس کے ساتھ شریفوں کی طرح کیوں نہ شادی کر لی جائے، اسی طرح اگر مرد طبیعت کا شریف ہے خواہ وہ کسی طوائف کا بھائی ہی کیوں نہ ہو ایک شریف عورت کیوں نہ اپنے دامن کو اُسکے ساتھ منسلک کر دے - اس ناول کا موضوع یہی ہے، یہ موضوع بہت پامال ہو چکا ہے لیکن جعفری صاحب نے اپنے انداز بیان سے اس میں جان ڈال دی ہے -

آوارہ گرد کے خطوط از ش - مظفر پوری - مکتبۂ ادب، اردو بازار - دہلی - صفحات ۲۲۴ - قیمت ۲ ؎ ش - مظفر پوری صاحب کے یہ چند خطوط اور نو افسانوں کا مجموعہ ہے - خطوط میں رنگین انشا پردازی ہے جس میں آج کل کے رواج کے مطابق عیش و محبت، شراب وغیرہ پر نیم عقلی نیم رومانی بحثیں ہیں افسانے

بھی رنگین اور رومانی ہیں جن کا مقصد محض حرص و بوالہوسی کی عکاسی ہی ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی ان افسانوں میں ترقی پسند ادب والی خرابیاں تو ہیں لیکن اُس کی خوبیاں نہیں۔

جام و مینا مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب۔ اڈیٹر نیرنگِ خیال۔ مکتبہ ادب۔ اُردو بازار۔ جامع مسجد دہلی صفحات ۲۴۰ قیمت ۸؍ حکیم یوسف حسن صاحب نے نیرنگ خیال کی ابتدائی دس سال کی جلدوں میں سے پہلے دور کے افسانہ نگاروں کے بارہ منتخب افسانے شایع کئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اُردو ادب کے عہد بہ عہد کے منتخب ادب پاروں کے اسی قسم کے مجموعے زیادہ سے زیادہ شایع کئے جائیں۔

اسلامی روایات کا تحفظ از سید جمیل واسطی صاحب ایم۔ اے۔ مکتبہ دانش فرنگ۔ لاہور صفحات ۱۶۳۔ قیمت ۱۲؍ بعض اسلامی مسائل پر چند مضامین کا مجموعہ ہے جو کافی مطالعہ کے بعد لکھے گئے ہیں اور بہت جامع اور بصیرت افروز ہیں۔

فلسطین اور مسئلہ یہود! از محمود بریلوی صاحب مطبوعہ مطبع انوار احمدی۔ الہ آباد۔ صفحات ۸۸۔ قیمت ۸؍۔ فلسطین اور مسئلہ یہود پر یہ بہت اچھی کتاب محمود صاحب نے ترتیب دی ہے حالانکہ اس کتاب کو اب سے بہت پہلے شایع ہونا چاہئے تھا کیونکہ یہ مسئلہ ہی بہت اہم ہے اور اُردو میں شاید ہی کوئی کتاب اس موضوع پر نکلی ہو۔ اس لئے اس کی بڑی ضرورت بہت عرصہ سے تھی۔ محمود صاحب نے فلسطین کا جغرافیہ، وہاں کی تاریخ اور یہودیوں اور انگریزوں کے تمام معاہدے، اور صیہونیت کی تمام سازشیں وغیرہ اس میں بے نقاب کی ہیں جگہ جگہ ضروری نقشے بھی دیدئے ہیں غرضکہ یہ کتاب ہر لحاظ سے لایق مطالعہ ہے۔

آخری رات از ایم اسلم۔ دار البلاغ۔ محمد نگر۔ میور روڈ لاہور۔ صفحات ۳۵۰، قیمت للعہ؍۔ اسلم صاحب پرانے ناول نویس ہیں۔ آجکل مغربی تہذیب کا جو خراب اثر ہمارے تمدن پر خصوصاً ہمارے نوجوان مردوں اور نوجوان عورتوں کے اخلاق اور زندگی پر پڑ رہا ہے اُسکی عکاسی اسلم صاحب عرصے سے کر رہے ہیں۔ شمسہ ناول کے بعد زیر نظر ناول میں بھی یہی اُن کا موضوع ہے۔ لیکن اسلم صاحب سے ایک عرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ناولوں کے موضوع کی یکسانیت ختم کریں اور کبھی کبھی کسی ایسے کردار کی تخلیق کیا کریں جو ناول پڑھنے کے بعد دل و دماغ میں کچھ عرصے تک گھومتے رہیں۔

سدرۃ المنتہیٰ از جناب سیماب اکبرآبادی۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ صفحات ۲۰۰، قیمت مجلد للعہ؍۔ یہ سیماب صاحب کا دوسرا دیوان غزلیات ہے جو سنہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ سیماب صاحب بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور تخلیق شعر میں ارزو لکھنوی کی طرح یدطولیٰ رکھتے ہیں اور اُن کے بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی آورد بھی آمد کا لطف دیتی ہے اور پرانے دبستان شاعری میں یہی صلاحیت اور اسی بات کا ملکہ ایک شاعر کو اُستاد بنا دیتا تھا۔ سیماب صاحب کے بعض اشعار اور بعض غزلیں بہت خوب ہیں، اگر غزلوں کا انتخاب شایع کیا

جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔

نفسیات جمال از مولانا ابو النظر رضوی امروہوی۔ اعلیٰ کتب خانہ، قرول باغ دہلی۔ صفحات ۱۵۱، قیمت عہ محبت کے متعلق کوئی پچیس چھوٹے بڑے مضامین اس مجموعہ میں اکٹھا کر دئے ہیں۔ انداز بیان نقطۂ نظر اور دلایل سب کے سب شاعرانہ ہیں، بہتر ہوتا اگر مولانا محبت کے متعلق انگریزی میں کسی نفسیات کی کتاب کا مطالعہ کرتے یا کم از کم جدید فارسی میں کاظم زادہ کی کتاب "رہبر نژاد نو" کا مطالعہ فرماتے تاکہ محبت کی افادیت کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہندوستان کو اب شاعری اور رومانی محبت کی ضرورت اتنی نہیں ہے جتنی عقل اور عمل کی ہے۔

نئے خاکے از قدوس صہبائی۔ مکتبہ ادب۔ اُردو بازار۔ جامع مسجد۔ دہلی۔ صفحات ۱۴۱، قیمت عہ ۱۲؍ - یہ نہایت ہی مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ ہے یعنی اتنا مختصر کہ اس چھوٹی سی کتاب میں کوئی اکتالیس افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے چند تاثرات ہیں، جن کو افسانے کی شکل دیکر مصنف نے مغرب کے بعض مشہور افسانہ نویسوں کی طرح بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ ایجاز و اختصار ان کا خاص حُسن ہے۔ اُردو میں یقیناً یہ طرز نیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہماری افسانہ نویسی پر اس کا کافی اثر پڑے گا۔

جدید نظام برائے تعلیم بالغاں مرتبہ مظہر الرحمان - انجمن ترقی اُردو ہند دریا گنج، دہلی صفحات ۴۰، قیمت ۲؍ مظہر الرحمان صاحب عرصے سے تعلیم بالغاں کا کام کر رہے ہیں اور اس کام میں کامیابی کے لئے مختلف تجربے کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو مفید اصلاحات اور تجویزیں انھوں نے سوچی اور برتی ہیں ان کو اس مضمون میں پیش کیا ہے وہ لوگ جو تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھتے ہیں اس رسالہ کو ضرور مطالعہ فرمائیں۔

معراج سخن از خبیر صاحب لکھنوی۔ ممتاز بک ایجنسی - نخاس لکھنؤ - صفحات ۴۴، ہدیہ - سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی، حضرت اوج مرحوم کے شاگرد، موجودہ لکھنؤ کے بہت ممتاز مرثیہ گویوں میں سے ہیں۔ پیش نظر مرثیے میں معراج کا حال نظم کیا گیا ہے۔ آخر میں مصائب امام حسینؑ کی طرف بہت خوبی سے گریز کی گئی ہے۔ خبیر صاحب کے کلام میں حضرت دبیر مرحوم کی طرح بڑی معنوی بلاغت ہوتی ہے۔ پہلے بند ہی میں الفاظ کی شان و شوکت ملاحظہ فرمائیے۔

نقش توحید ہے لوحِ سرِ دیوانِ سخن
سرخیِ سورۂ اخلاص ہے عنوانِ سخن

حمد خلاقِ سخن سے یہ بڑھی شانِ سخن
نوبہ نو تازہ بہ تازہ ہے گلستانِ سخن

جلوہ گر جنتِ عرفاں میں ہے رضوانِ خیال
جاودانی ہے بہارِ چمنستانِ خیال

ضرورت ہے کہ خبیر صاحب اپنے مراثی کے مجموعہ کو جلد شایع کریں۔

مشہور سیاسی رسالہ "نئی زندگی" کا خاص نمبر مئی ۴۶ء میں شایع ہو رہا ہے

جو اس بحث کے لئے وقف ہوگا کہ موجودہ صورتِ حال میں

مسلمان کیا کریں؟

تخلیۂ ہندوستان سے متعلق برطانیہ کے تازہ اعلان نے ہندوستان کی سیاست کی بنیادیں بدل دی ہیں، اور اسکے ساتھ ہی ساتھ فرقہ وار مسئلے کا بھی سارا شنگ ہی بدل رہا ہے۔ لہذا اب اس بدلی ہوئی صورتِ حال میں مسلمانوں کو یہ سوچنا ہے کہ وہ کیا کریں، کیونکہ اگر اس نازک تاریخی مرحلے پر بھی اگر مسلمانوں نے سوچ سمجھ سے کام نہ لیا تو ذراسی لغزش بھی ہندوستان میں مسلم قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتی ہے۔ لہذا ہر خیال اور جماعت کے مفکرین، رہنما اور علماءِ کرام سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس اہم مسئلہ پر قلم اٹھائیں اور سیر حاصل بحث کریں اور مسلمان قوم کی رہنمائی فرمائیں۔

ایڈیٹر: **سید انیس الرحمن**

لکھنے والے:۔ ڈاکٹر سید محمود، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سید عبد اللطیف، مسٹر سید عبد اللہ بریلوی، سید سلیمان ندوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید، سید حسن ریاض (اڈیٹر منشور) مسٹر راغب احسن (کلکتہ) مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، خان بہادر بشیر الدین (اٹاوہ) خان بہادر حافظ شیخ محمد جان، سید علی ظہیر، پروفیسر عبد المجید خاں (لاہور) مسٹر ہمایوں کبیر، قاضی عبد الغفار، سید سجاد ظہیر، چودھری خلیق الزماں، ظہیر الحسن لاری، ل، احمد اکبر آبادی، حیات اللہ انصاری نیازی، مولانا عثمان فارقلیط، آغا شورش کاشمیری، قاضی احمد حسین، سید انیس الرحمن وغیرہ وغیرہ سے مضامین کے لئے درخواست کی گئی ہے اور ان میں بعض کے مضامین آچکے ہیں اور اکثر کے مضامین کے ہم متوقع ہیں۔ ہر خیال کے مضامین شامل ہیں۔

ہندوستان ایک نئی کروٹ لینے والا ہے

ایسے مرحلے میں ہمیں جوش و خروش سے زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے اور پارٹی بندی کے تنگ گوشے سے نکلکر دس کروڑ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کو سوچنا ہے اور نئے حالات میں بالکل نئے زاویۂ نگاہ سے غور کرنا ہے۔ "نئی زندگی" سائز کے ۱۰۰ صفحات پر یہ نمبر پھیلا ہوگا جسمیں ایک صفحہ بھی اشتہار کا نہ ہوگا۔ **قیمت عہ** ہوگی محصولڈاک معہ رجسٹری فیس ۴ر علاوہ۔ وی۔پی ہرگز نہ بھیجا جائے گا۔

جلد قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیجکر اس معرکۃ الآرا نمبر کا مطالعہ فرمائیں

منیجر رسالہ "نئی زندگی" ۔ ۹۰ ہیوٹ روڈ الہ آباد

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ - مشکی قوام - الائچی دانہ - تیل - عطر - عرق کیوڑہ وگلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلیگرام "مشکی قوام" ہوڑہ

ٹیلیفون:- ہوڑہ ۵۵۰۸

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ - ہوڑہ روڈ ہوڑہ

چند معیاری کتابیں

تاریخ السلام سید امیر علی کا مکمل سلیس اور بامحاورہ ترجمہ از باری علیگ ۸/ روپے

بانگ درا ۔۔۔ اقبالؔ ۔۔۔ للعہ/
بال جبریل ۔۔۔ " ۔۔۔ للعہ/
ضرب کلیم ۔۔۔ " ۔۔۔ ے/
زبور عجم ۔۔۔ " ۔۔۔ للعہ/
شعلہ و شبنم ۔۔۔ جوشؔ ۔۔۔ صہ/
نقش و نگار ۔۔۔ " ۔۔۔ ے/
آیات و نغمات ۔۔۔ " ۔۔۔ صہ/
شعرستان ۔۔۔ اختر شیرانی ۔۔۔ عہ/
الطاف کے گیت ۔۔۔ الطاف مشہدی ۔۔۔ عہ/
تعلقہ ۔۔۔ حاجی لقلق ۔۔۔ عہ/
رنگ بست ۔۔۔ اثر لکھنوی ۔۔۔ عہ/
پیام شباب ۔۔۔ قاضی نذر الاسلام ۔۔۔ عہ/
کلیات فانی ۔۔۔ فانیؔ ۔۔۔ ے
مثنوی شہید ناموس ۔۔۔ شاد ملیح آبادی ۔۔۔ ۱۲/
نقش چغتائی ۔۔۔ دیوان غالب مصور ۔۔۔ عہ/

مقالات جمال الدین افغانی ۔۔۔ سلیم ڈی ایم اے ۔۔۔ عہ/
پطرس کے مضامین ۔۔۔ پطرس ۔۔۔ عہ/
کیلے کا چھلکا ۔۔۔ سندباد جہازی ۔۔۔ عہ/
جغرافیہ پنجاب مزاحیہ ۔۔۔ " ۔۔۔ عہ/
خوفناک دنیا کامل ۔۔۔ سید محمد علی شاہ ۔۔۔ ے/
دہلی چلو ۔۔۔ شورش کاشمیری ۔۔۔ ے/
اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ۔۔۔ ڈاکٹر عبداللہ ۔۔۔ ۱۲/
منٹو کے مضامین ۔۔۔ منٹو ۔۔۔ ے/
جاہ و جلال ۔۔۔ تبسم ۔۔۔ عہ/
دروازہ ۔۔۔ کرشن چندر ۔۔۔ عہ/
گنج ہائے گرانمایہ ۔۔۔ رشید احمد صدیقی ۔۔۔ عہ/
لیلے کے خطوط ۔۔۔ قاضی عبدالغفار ۔۔۔ عہ/
مجنوں کی ڈائری ۔۔۔ " ۔۔۔ عہ/
اس نے کہا ۔۔۔ " ۔۔۔ عہ/
جواب ۔۔۔ کرنل مجید ملک ۔۔۔ عہ

خودکشی (ناول) ۔۔۔ ٹالسٹائی ۔۔۔ ے/
افسانۂ زریں ۔۔۔ " ۔۔۔ اسما بیگم ۔۔۔ ے/
شب غم ۔۔۔ " ۔۔۔ ایم اسلم ۔۔۔ عہ/
خار و گل ۔۔۔ " ۔۔۔ " ۔۔۔ للعہ/
طوفان ۔۔۔ " ۔۔۔ ٹیگور ۔۔۔ ے/
نشان راہ ۔۔۔ " ۔۔۔ رشید اختر ندوی ۔۔۔ ے/
کانٹوں کی سیج ۔۔۔ " ۔۔۔ " ۔۔۔ ے/
نسیم ۔۔۔ " ۔۔۔ " ۔۔۔ ے/
محمد بن قاسم ۔۔۔ " ۔۔۔ نسیم حجازی ۔۔۔ صہ/
حیات محمد علی جناح ۔۔۔ رئیس احمد جعفری ۔۔۔ عہ/
غبار خاطر ۔۔۔ ابوالکلام آزاد ۔۔۔ للعہ/
جرم و سزا ۔۔۔ باری علیگ ۔۔۔ عہ/
فلسفۂ عجم ۔۔۔ اقبالؔ ۔۔۔ عہ/
مزاحیہ ڈرامے ۔۔۔ خلیق ۔۔۔ عہ/
گفت و شنید ۔۔۔ بشیر ہاشمی ۔۔۔ عہ/

نوٹ: مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

منیجر اردو اکیڈمی لوہاری گیٹ لاہور

اشتہار

فاسد مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے

خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر پٹینکوفر پروفیسر ویانا یونیورسٹی نے فیصلہ کرلیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے تو ایک دن انہوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا۔ وہ کلاس کو پڑھا رہے تھے ان کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لیے کافی تھے۔ ڈاکٹر پٹینکوفر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا، مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کرڈالا؟ صرف اس لیے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا۔

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ صافی انہی اصولوں کے پیشِ نظر تیار کی گئی ہے۔ یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوتِ مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

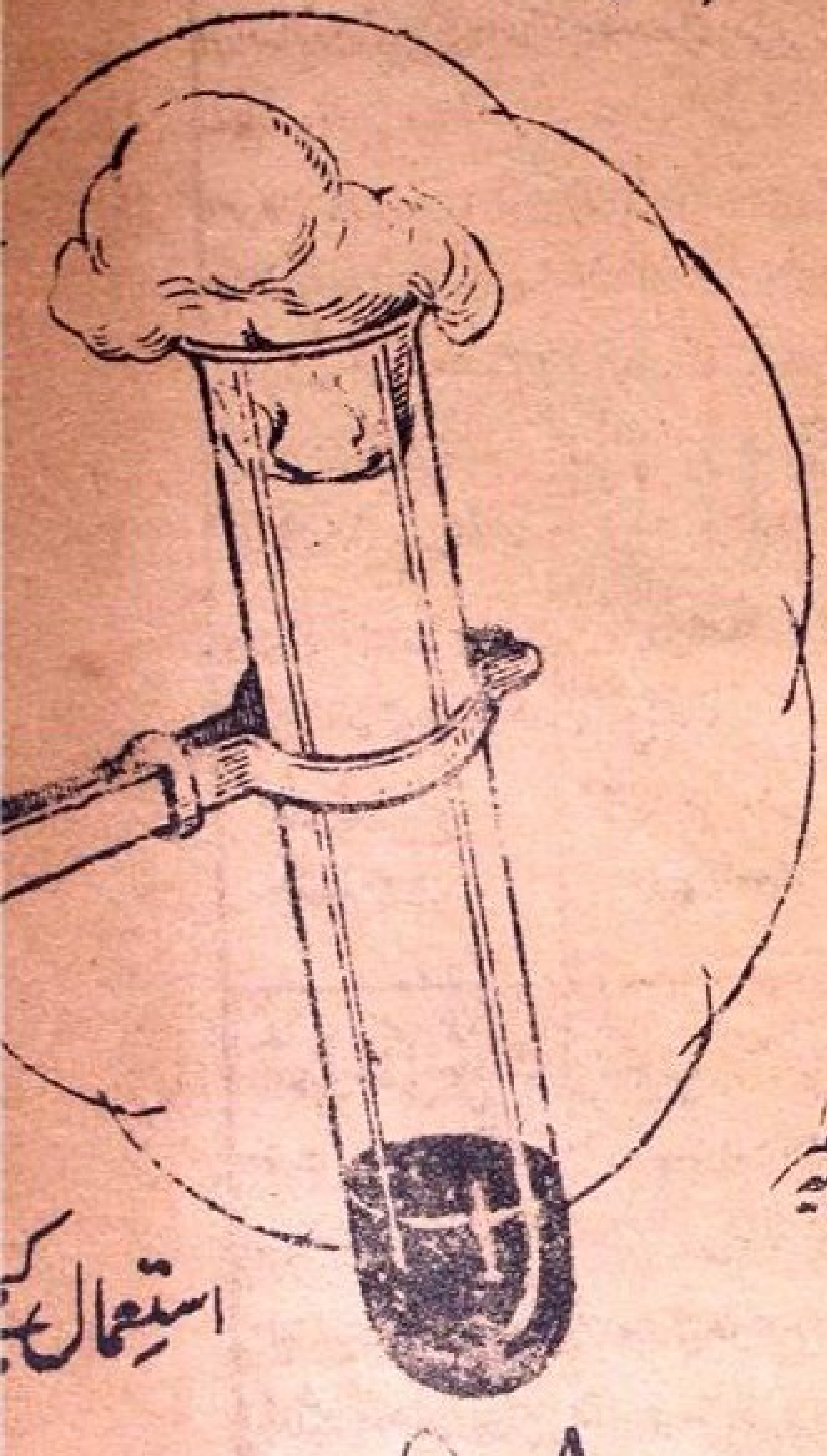

استعمالِ کیـ

قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ۔ مشکی قوام۔ الائچی دانہ۔ تیل۔ عطر۔ عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم
کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا
مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ — ٹیلی فون: ہوڑہ، ۴۵۵

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ۱۴۱۔ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

"بزمِ اخوت" کا دستور العمل معہ خطبہ نیاز فتحپوری، حکیم اقبال حسن معتمد "بزمِ اخوت" دربار داتا گنج بخش لاہور سے مفت طلب کیجئے

نگار

مدیر خصوصی: نیاز فتحپوری

جلد - ۵۲	فہرست مضامین جولائی ۱۹۴۷ء	شمارہ - ۱

ملاحظات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳
آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا ۔ ۔ ۔ اسحاق لکھنوی ۔ ۔ ۔ ۵
میر انیس کا کلام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد حسین انور ۔ ۔ ۔ ۱۸
قدیم سنسکرت لٹریچر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ا ۔ ح ۔ ۔ ۔ ۲۶
اُردو غزلگوئی میں انشاء کا اجتہاد ۔ ۔ رحمت نبی خاں ایم ۔ اے ۔ ۳۴
مذہبی عقاید اور سائنس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۰
باب الانتقاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درویش میرٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۶
باب المراسلۃ والمناظرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۳
تھپیڑے (نظم) ۔ ۔ ۔ ۔ پروفیسر شور ۔ ۔ ۵۶
مطبوعات موصولہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۷

ملاحظات

مسئلۂ تقسیم ہند میں ہمارا فرض

اب کہ ہندوستان کی وحدت اجتماعی قایم نہیں رہی اور تقسیم ہند کو طوعاً یا کرہاً سب نے تسلیم کرلیا ہے، ہمارا فرض یہ نہ ہونا چاہئے کہ جو کچھ ہونا چاہئے تھا اسکے نہ ہونے پر ماتم و واویلا کریں، بلکہ جو کچھ ہوچکا ہے، اسی کے اندر امن و سکون کی راہیں تلاش کرنا چاہئے۔ پنجاب اور بنگال دونوں دو حصوں میں تقسیم ہوچکے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ جو حدود ان کے قایم ہونے والے ہیں، وہ دونوں فریق کو پسند نہ ہوں، لیکن اب سوال پسندیدگی و ناپسندیدگی کا نہیں، بلکہ اس مقسوم کو گوارا بنانے کا ہے تاکہ ملک کی موجودہ بدامنی کسی طرح ختم ہو اور دلوں کا غُبار دور کرکے ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے کو اعتماد کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کے حصہ میں جتنے قطعات زمین آئے ہیں، وہ ہر حیثیت سے بہ مقابلہ ہندوستان کے بہت کم حیثیت ہیں، اور پاکستانی آبادی اور اسکی حکومت کو اپنی بقاء کے لئے حد درجہ محنت و فراست سے کام لینا ہے، لیکن خود مختاری یا آزادی کی دولت بجائے خود بڑی چیز ہے اور اس کے لئے ہر خطرہ و اندیشہ کو جھیلا جاسکتا ہے، بشرطیکہ آزادی کا مفہوم فرقہ وارانہ تنگ نظری نہ قرار پائے اور اُس انتقام جویانہ پالیسی کو اختیار نہ کیا جائے جو اس وقت ہندو مسلم جماعتوں میں پائی جاتی ہے۔

پھر چونکہ اس تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی اور پاکستان میں ہندوؤں کی کافی تعداد رہ جائے گی، اس لئے ہمارے نزدیک وہی آئین حکومت سب سے زیادہ مستحکم اور قابل تعریف سمجھا جائے گا جو اقلیت کے حقوق کو پامال نہ کرے اور اسکے دل میں خوف و بے اعتمادی پیدا نہ ہونے دے۔ کیونکہ آئندہ اگر ہندوستان کے ان دونوں ٹکڑوں کو وفاقی نظام میں شامل ہونا ہے (جس کی تمنا کی جاتی ہے) تو اس کی صورت یہی ہے کہ پہلے دونوں جماعتوں کے دل صاف ہوں اور یہ منحصر ہے صرف حکومتوں کی رواداری پر۔

خیال کیا جاتا تھا تقسیم ہند کے بعد موجودہ فتنہ و فساد ختم ہو جائے گا، لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال غلط نکلا اور لاہور میں ابتک شدید بدامنی جاری ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اندیشہ ہمیں صوبہ سرحد اور پشاور کی طرف سے پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہاں کی ایک جماعت جو کانگریسی خیال کی ہے بجائے پاکستان میں شامل ہونے کے بالکل خود مختار و آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے اور مسلم لیگ برخلاف اس کے یہ چاہتی ہے کہ صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہو۔ اس نزاع کے دور کرنے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ وہاں کی آبادی کی رائے حاصل کی جائے۔ یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں، لیکن چونکہ ان دونوں جماعتوں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور دونوں اپنی اپنی قوت کے مظاہرے کر رہی ہیں، اس لئے اندیشہ ہے کہ کہیں رائے شماری کے دوران میں دونوں اپنی اپنی قوت ضبط کو ہاتھ سے نہ دیدیں اور ایک دوسرے سے لڑ بیٹھیں۔ چنانچہ صوبہ سرحد کے گورنر نے صرف اسی خیال سے رخصت لے لی ہے کہ ان کو اس خونریزی کا اندیشہ تھا اور وہ اس کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لئے طیار نہ تھے۔

ہماری رائے میں اس وقت سرخ قمیص والی جماعت کو بالکل خاموشی اختیار کرنا چاہئے اور مسلم لیگ کو بھی کسی ناجائز اثر یا دباؤ سے کام نہ لینا چاہئے تاکہ وہاں کی آبادی صحیح معنے میں آزاد رائے قایم کر سکے۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا اور باہم کشت و خون شروع ہو گیا تو یہ نہ صرف پشاور بلکہ تمام صوبہ سرحد میں پھیل جائے گا اور جان لینے اور دینے والے دونوں مسلمان ہی ہوں گے۔ اسی کے ساتھ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اس بدامنی سے قبایلی علاقہ کے لوگوں کو موقعہ مل جائے گا کہ وہ لوٹ مار شروع کر دیں گے اور اس طرح رقبۂ سرحد کو اتنا جانی و مالی نقصان پہونچے گا کہ اس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔

جدید تقسیم ہند میں ریاستوں کا مسئلہ ابتک اُلجھا ہوا ہے، کیونکہ ان میں سے بعض (مثلاً حیدرآباد اور ٹراونکور) نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ ریاستیں اور ان کی تقلید کریں۔ لیکن چونکہ ریاستوں کی اکثریت اس کی مخالف ہے، اس لئے بہت ممکن ہے کہ ہنگامہ پیدا ہو جائے اور اس کو دور کرنے کے لئے ریاستوں کو ایسے ذرایع اختیار کرنا پڑیں، جو دنیا کے موجودہ سیاسی رجحانات کے منافی ہیں اور ان کو اپنی ملوکانہ حیثیت قایم رکھنے کے لئے غیر معمولی قربانیوں سے کام لینا پڑے۔ بہرحال اسوقت جبکہ ہندوستان آزاد ہو رہا ہے ضرورت ہے کہ ہمارا فکر و ضمیر بھی عصبیت و تنگ نظری سے آزاد ہو اور ہم کوئی بات ایسی نہ کریں جو ہم میں انسانی آزادی کی جگہ درندانہ آزادی پیدا کر دے۔

آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا

(بہ سلسلۂ ماہ جون ۴۷ء)

فارسی قدیم میدیوں (Medians) کو جو آٹھویں صدی ق-م تک لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے جب لکھنے پڑھنے کا احساس ہوا تو ان کو وادی فرات سے خوشہ چینی کرنا پڑی۔ جہاں چھ سات سو نشانات سے کام لیا جاتا تھا اور جن میں سے بعض چودہ چودہ پندرہ پندرہ پیکانوں سے بنتے تھے۔ ان نشانات کو گھٹا بڑھا کر میدیوں نے ۱۰۰ حروف تہجی کی بنیاد ڈالی اور اسی کو زیادہ مختصر کر کے فارس والوں نے ۳۶ حروف تہجی کی تخلیق کی۔ اس خط کا سب سے مشہور کتبہ وہ ہے جسے دارا یوش اول نے ۵۱۶ سال ق-م میں بہستون کی ۳۰۰ فٹ اونچی سپاٹ چٹان پر کندہ کرایا تھا۔ عرصے تک اسے کیڑوں کی محنت کا نتیجہ سمجھا گیا۔ لیکن جب ۱۸۴۶ء میں ہنری راولسن کے تین سال متواتر محنت اور ۵ ہزار ڈالر کے صرفے کے بعد راز کا پردہ اُٹھا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک ہزار سطر والا کتبہ تین خطوں میں ہے (فارسی، سوسانی اور بابلی) اور اسی کے پڑھنے کے بعد ہمارے لئے فرات کی تحریروں کا پڑھنا ممکن ہو سکا۔

حطی رسم خط اس قوم کی لکھائی کا ہمیں کماحقہ علم نہیں ہے اس کا کچھ کچھ اندازہ ان مٹی کی تختیوں سے ہو سکتا ہے جو Pheastes کے محل (کریٹ) میں دستیاب ہوئی ہیں ان پر بجائے سطروں کے ایک چکر سا بنایا ہے جس کے درمیان لکڑی یا ہاتھی دانت پر بنی ہوئی تصاویر کو دبا کر بہت کچھ لکھا ہو۔ تحریر دونوں رخ پر ہے ایک طرف ۱۲۲ اشکال ہیں اور دوسری طرف ۱۱۸ یہ علی الترتیب ۳۱ اور ۳۰ کے مجموعوں میں منقسم ہیں۔ اسے ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے، جس کے باعث ہنوز یہ گتھی نہیں سلجھی ہے کہ آیا یہ خط کریٹ کا ہے یا ایشیائے کوچک کا۔ زیادہ تر عالموں کا رجحان آخر الذکر کی طرف ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس میں شیر کے سر کی تصاویر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب بار بار ایشیائے کوچک کا نام دہرا رہا ہے کیونکہ اس ملک کا قدیم نام Iiana یعنی شیر کا ملک تھا۔

اگر یہ خط ایشیائے کوچک کو بھیجنے کے لئے کریٹ میں لکھا گیا ہوتا تو اسے ایشیائے کوچک میں ملنا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہے اس لئے اس کا برعکس سمجھا جائے گا، یعنی یہ خط ایشیائے کوچک سے کریٹ کو بھیجا گیا۔ اس طرح اس کا رسم الخط حطی ٹھہرتا ہے۔

اس کی تصاویر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حطی قوم نے سمیری کے بھدے خاکوں پر تصاویر بناتے وقت مصری کے

نمونے کو سامنے رکھا تھا - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض سادی تصاویر نہیں ہیں بلکہ آوازوں کی بھی حامل ہیں، پہلے میں غلطی سے انھیں تصاویر خیالی سمجھ بیٹھا تھا اور اسی طریق سے اسے پڑھنے کی کوشش کی تھی جو نتائج میں نے مرتب کئے اُن کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا اس لئے انھیں قلمبند کرتا ہوں:

"شیر کی تصویر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس خط کا بھیجنے والا ایشیائے کوچک کا رہنے والا ہے - مندر اور پستان کی تصویر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اشتر دیوی کے مندر کا پروہت ہے چھرے اور کلہاڑے سے قربانی کا مفہوم پیدا ہوتا ہے - آپیس بیل کی تصویر مصر کے لئے ستارے کی تصویر بابل کے لئے فلسطینی آدمی کا سر فلسطین کے لئے اور ہاتھی کی تصویر خود کریٹ کے لئے (ہاتھی کو مغرب میں بڑا بیل کہتے تھے اور یہی مطلب minotaur سے پیدا ہوتا ہے جس کی کریٹ والے پرستش کرتے تھے) علائم کے طور پر استعمال کی گئی ہیں - گویا اس قربانی میں قرب و جوار کے ہر ملک کے آدمی شریک ہو رہے ہیں -

متنوع اشجار کی شاخوں - بندھی ہوئی مٹھی اور جہاز میں غالباً خوشبوؤں کو جہاز پر بار کر کے لانے کی استدعا پنہاں ہے -

لڑکے اور اُس موٹی عورت کی تصویر سے جس کی بنا پر عالموں نے یہ نظریہ قایم کیا تھا کہ یہ عورت minoan خد و خال کی ہے اس لئے اس خط کو کریٹ کا سمجھا جائے گا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکتوب علیہ کو مع اہل و عیال کے مدعو کیا جا رہا ہے - اُڑتے ہوئے عقاب سے جلد آنے کا اظہار ہوتا ہے"۔

اب میں خود نہیں جانتا کہ جو نتائج میں نے مرتب کئے وہ ٹھیک ہیں کہ نہیں چونکہ میں اس پر پائے جانے والے نشانات میں سے چند کے سمیری اور مصری مماثل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں اس لئے مجھے یقین ہے کہ اگر مجھ کو ویڈل کی Sumer Aryan Dictionary مل جاتی تو یقیناً میں اس کے پڑھنے میں کامیاب ہو جاتا -

مصری رسم خط تہذیب انسانی کی چھوڑی ہوئی یادگاروں میں مصری خط نہایت ہی قدیم یادگار ہے - یہ دوازدہ بروج کے نشانات کو چھوڑ کر سب سے حتیٰ کہ اہرام سے بھی پرانا ہے کیونکہ Giza کے مشہور ہرم کا بنوانے والا خوفو چوتھے خاندان کا بادشاہ تھا حالانکہ فن تحریر کا پتہ ہمیں دوسرے خاندان تک چلتا ہے چنانچہ مصری خط کا سب سے قدیم کتبہ دوسرے خاندان کے بادشاہ Sent کا وہ کتبہ ہے جو اُس نے اپنے پوتے Shera کی یادگار میں کندہ کروایا تھا -

ابھی تک لوگ اس خط کو آرائش ہی پر محمول کرتے تھے چنانچہ Concise History of the World میں صفحہ ۴۴ پر مصریوں کے متعلق لکھا ہے :- "یہ لوگ بڑے تصاویر کے بنانے والے تھے - چاقوؤں کے دستے - برتن گھڑے غرضکہ ہر چیز جو انھیں بھاتی تھی اُس کی تصویر سے مقابر اور گھر کی دیواروں کو سجاتے تھے"۔

---

cf. The Alphabet, vol. I page 56.

یونانی انھیں منقوشات مقدسہ خیال کرتے تھے جیساکہ اس کے نام Hieroglyphic سے ظاہر ہے، رومی مصری خط کو سراسر تصاویر خیالی پر مبنی سمجھتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ اس کے متعلق اُس وقت تک کوئی صحیح رائے قایم نہ ہو سکی جب تک روسٹیا کا کتبہ (Rosetta Stone) دستیاب نہ ہوا۔ یہ بیش بہا کتبہ ۱۷۹۹ء میں اُسوقت جبکہ نپولین اپنی فوجوں کو لئے مصر میں پڑا تھا توپخانہ کے افسر بوسارڈ کو St. Julian کے قلعہ کے پاس (اسکندریہ سے چند میل جانب مشرق) فوجی اغراض سے کھدائی کراتے وقت ملا تھا۔

نیلسن (Nelson) کی فتح سے یہ قیمتی کتبہ انگریزوں کے ہاتھ لگا۔ اس پر تین خطوں میں تحریریں تھیں ایک تحریر اشکال میں تھی، دوسری خط دیموطیقی میں (یعنی مختصر میں) اور تیسری یونانی میں، یونانی تحریر کے ساتھ دوسروں کا مقابلہ کرنے سے قدیم مصری تحریر کو پڑھنا ممکن ہو گیا۔

ڈاکٹر تھامس ینگ (Dr. Thomas Young) پہلا شخص تھا جس نے اس پر سے راز کا پردہ اُٹھانے کی کوشش کی اور اپنے انکشافات ۱۸۱۹ء میں شایع کئے۔ ۱۸۲۲ء میں مشہور فرانسیسی عالم جین فرنکوئیس شیمپولین (Jean Francois Champollian) نے پرانے مصری کتبوں کو پڑھنے کے لئے ایک قاعدہ مرتب کر لیا اور یہ راز منکشف کیا کہ یہ کتبہ (Memphis) کے پادریوں نے ۱۹۵ سال ق م میں بطلیموس پنجم مسمی Epiphanes کے لئے لکھا تھا۔ Champollian نے اس خط کی کل تصاویر کی تعداد ۸۶۴ بتائی ہے۔

ان تصاویر کی تین قسمیں ہیں (۱) سادی تصاویر (Ikonograph) (۲) تصاویر خیالی (Ideograph) (۳) تصویری حروف (phonograph)[1]

سادہ تصاویر و تصاویر خیالی ایک بچہ بھی اس خط کا نمونہ دیکھ کر سمجھ جائے گا کہ اس میں تمام دیکھی بھالی چیزوں کی تصویریں کام آتی ہیں، لیکن ان تصویروں کی نوعیت بدلتی رہتی ہے مثلاً اگر سورج کی تصویر بنا کر سورج مراد لیا جائے تو یہ ایک سادہ تصویر ہوگی اور اگر دن تو تصویر خیالی۔ تصاویر خیالی کی کل تعداد ۹۲[2] ہے۔ ان میں سے کچھ مفرد ہوتی ہیں اور کچھ مرکب۔ مفرد کو اوپر والی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ رہی مرکب کی مثال تو اسے یوں سمجھئے کہ اگر مکان اور دروازے کو بنا کر سننا یا آنکھ اور پانی کو بنا کر رونا مراد لیا جائے تو یہ مرکب تصویر ہو گی اسے ایک اور واضح مثال سے سمجھا جا سکتا ہے سامی کا ایک لفظ ہے یدع جسکے معنی علم کے ہیں۔ یہ تین حروف سے مرکب ہے ی د ع جنکے معنی علی الترتیب ہاتھ (ید) دروازے (دالت) اور آنکھ (عین) کے ہیں ان تینوں کے رابطہ تصوری سے یہ معنی پیدا ہوئے کہ

۱، ۲ Article on "Hieroglyphic" in "New Popular Encyclopaedia" 1902

"دیکھنے کے لئے ہاتھ سے دروازہ کھولنا" یعنی تحقیق اور تدقیق جو ذریعہ ہے حصول علم کا اس کو مصریوں نے یوں لکھا ہوتا

تصاویر اشاری

ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں مثلاً صَوَر بہ معنی ترہی اور ثَور بہ معنی بیل۔ گو دونوں کا تلفظ ایک ہے لیکن لکھتے وقت فرق پیدا کرنے کے لئے ہجے مختلف کئے ہیں، یہی وجہ تھی کہ عربی میں ایک آواز کے لئے کئی کئی حروف ایجاد کرنا پڑے مثلاً سادہ آواز "سا" کے لئے ث، ص اور س اور "زا" کے لئے ز، ذ، ض اور ظ۔

مصر کے قدیم خط میں ایک ہی آواز کے لئے کئی کئی تصویریں نہ تھیں یہی وجہ تھی کہ ہم صوت الفاظ کے مختلف معنوں میں تمیز کرنے کے لئے[1] ۱۴۴ اشاری تصاویر ایجاد کرنا پڑیں، انھیں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ مصری[2] میں ایک لفظ ہے "اَن" جس کے چھ معنی ہیں ہونا۔ کھولنا۔ کنگھی کرنا۔ مونڈنا۔ خانقاہ اور ہلکا اسے یوں لکھتے ہیں تو اس کے معنی ہونے کے ہوتے ہیں۔ جب اس کے داہنی طرف دروازے اور ہاتھ کی تصویر بڑھا دی جاتی ہے تو کھولنے کے معنی دیتا ہے۔ جب بال کھولے عورت کی تصویر ہوتی ہے تو کنگھی کرنے کے، جب استرے اور بال کی ہوتی ہے تو مونڈنے کے اور جب مکان کی 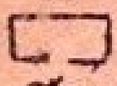 تو خانقاہ کے اور جب چڑیا کی تو ہلکے کے۔[3]

انھیں پڑھا نہیں جاتا یہ صرف معنی سمجھنے میں مدد کرتی ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) عمومی (۲) خصوصی۔

عمومی: - آپ کوئی خط اٹھا کر دیکھئے اُس کے پتے میں بابو۔ دیوی۔ محلہ اور شہر ایسے الفاظ ضرور پائیں گے اگر یہ نہ ہوں تو کیسے معلوم ہو کہ جن کا نام لیا جا رہا ہے وہ کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی قسم کی وضاحت کے لئے مصری میں ناموں کے بعد جو تصاویر بنائی جاتی ہیں انھیں عمومی کہتے ہیں، جیسے ہر لکڑی سے بنی ہوئی شے کے نام کے بعد ایک سوکھی ہوئی لکڑی فلزاتی اشیاء کے نام کے بعد تین چھلے اور چمڑے سے بنی ہوئی اشیاء کے نام کے بعد جانور کی کھال بنائی جاتی ہے۔

خصوصی: اسے یوں سمجھئے کہ مصری کا ایک لفظ ہے "سَر" جس کے معنی زرافہ (ایک جانور) کے ہیں اسے لکھ کر اگر زرافہ کی شکل بنا دی جائے تو یہ خصوصی اور انفرادی حیثیت ہوئی۔

تصویری حروف

آخر وہ زمانہ آیا جب ان تصاویر سے چند کو علٰحدہ کر کے اصوات بخشی گئیں مثلاً سانپ کی تصویر کو اُس کی پھنکار کی بنا پر "فُو" کہنے لگے اور مینڈھے کی تصویر کو "با" لیکن ایسا کرنے سے پہلے الفاظ کو قلمبند کرنے کے لئے ایسی اشیا کی تصاویر بنائی جاتی تھیں جن کے نام پورے لفظ یا اُس کے ٹکڑوں کی آواز کے مطابق ہوتے تھے گویا اس طریق کے مطابق اگر دیا سلائی لکھنا ہو تو دیئے (چراغ) اور سلائی کی تصویر بنائی جائے گی۔

---

1. Article on "Hieroglyphic" in New Popular Encyclopedia
2. The Historian's History of the World, Vol. I page 256
3. The Alphabet By. Isaac Taylor Vol. I pp. 59-60.

دوسرے[۱] خاندان کے زمانۂ حکومت تک مصری خط حروفی منزل پر پہونچ چکا تھا چنانچہ اس خاندان کے بادشاہ سینٹ (Sent) کا نام مذکورہ کتبے میں تصویری حروف میں یوں لکھا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے قدیم فرسودہ طریق کو اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے چھوڑا نہیں بلکہ دونوں کو مخلوط کردیا اور یہ مخلوطی خط رومۃ الکبریٰ کے دور تک جاری رہا۔

مصری[۲] تحریر کی اس عجیب نوعیت کو دیکھ کر مشہور عالم Canon Taylor کہا تھا کہ مصری تحریر کی مثال تو ایک ایسی عمارت کی ہے جو مکمل ہوچکی ہو لیکن پاڑیں نہ کھولی گئی ہوں۔

ان[۳] پاڑوں کو کھولنے کا فخر سامی قوم کو حاصل ہے۔ Lenormant اس کا سہرا فنیقی لوگوں کے سر باندھتا ہے جنھیں Hykos (شامی عربستان کی ایک بدوی قوم) کے حملہ سے مصر میں گھسنے کا موقع مل گیا تھا اور جنھوں نے Caphtor میں اپنی نوآبادی قایم کرلی تھی لیکن Ewald اس کی مخالفت کرتا ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ شرف Hykos کو حاصل تھا کیونکہ اُن کے ہاتھ میں حکومت تھی اور حکومت کو تجارت سے زیادہ فنِ تحریر کی ضرورت پڑا کرتی ہے۔

سادہ آوازوں کی حامل مصری تصاویر کی تعداد ۴۵ سے زاید نہ تھی ان میں سے بہت سے نشانات ہم آواز تھے جن میں سے کچھ نشانات کا بہ نسبت دوسروں کے زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ ایسے کثیر الاستعمال نشانات کی تعداد صرف ۲۵ ہے اس[۴] طرح Plutarch کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ مصری حروف تہجی ۲۵ نشانات پر مشتمل تھی۔

ہندوستان کی مروجہ تحریریں اور اُنکا ماخذ

دُنیا کی قدیم تحریروں کا ذکر کرنے کے بعد اب ہم جدید تحریروں کی طرف رجوع ہوتے ہیں، ہمارا ارادہ اُن خاص خطوں کا ذکر کرنا ہے جو ہمارے اپنے ملک میں رائج ہیں یعنی اُردو، انگریزی اور ہندی۔ ہندی کو چھوڑ کر بقیہ دونوں فنیقی سے ماخوذ ہیں لہٰذا پرانے زمانہ سے اب تک قیام تسلسل کے لئے پہلے ہمیں خود فنیقی کا ماخذ جان لینا چاہئے۔

Rouge[۵] کا کہنا ہے کہ فنیقیوں نے اپنے حروف تہجی کی بنیاد اُن ۲۵ مصری حروف کی تحریری اشکال پر رکھی تھی جن کا ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں۔ اُن[۶] ۲۵ نشانات سے ہمیں ۲۲ سامی حرفوں کا انتخاب کرنا ہے چونکہ سامی میں حروف علت نہیں ہوتے لہٰذا ہمیں مصری کے چار حروف علت کو نظرانداز کردینا چاہئے۔ اس طرح ان کی تعداد ۲۱ رہ جاتی ہے۔

---

۵ Alphabet vol. I p. 90
۶ Alphabet vol. I p. 122

۱ Historians History of the World, page 254

۲، ۳، ۴ The Alphabet, vol. I pp. 61, 150-152, 122

مصری میں کوئی حرف ع کی آواز کا قائم مقام نہیں ہے اگر اسے سامی سے ہٹا دیا جائے تو دونوں خطوں کے حروف کی تعداد مساوی ہو جاتی ہے۔

اس نظریے کو تقویت پہونچانے والی پانچویں خاندان کے شاہزادے Ptah Hotip کی تصنیف کی ایک نقل ہے جو Prisse نامی عالم کو گیارھویں خاندان کے ایک مقبرے میں ملی تھی اس کی لکھائی کتبہ موآبی (Moabite Stone)[1] کی لکھائی میں دس بارہ صدیوں کا فصل ہے۔ اور ان میں جو تھوڑا بہت فرق پایا جاتا ہے اُس کی توجیہ Isaac Taylor نے یہ کی ہے کہ: "طرزِ تحریر پر اُس شے کا بہت اثر ہوتا ہے جس پر وہ لکھی جاتی ہے۔ ہراطیقی (ہر اغلفی کی تحریری اشکال) پیپرس پر لکھی جاتی تھی، اور فنیقی پتھر پر۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی تبدیلیاں حروف کی شکلوں میں ہوئی ہوں گی مثلاً

۱- حروف کی خمیدہ اور جھاڑو دیتی ہوئی دُموں کی جو تحریر کی شان ہے پتھر پر لکھنے کے باعث سیدھا کر دیا۔

۲- حروف کے بیضاوی سرے یا تو مثلث میں بدل گئے یا مربع میں۔

۳- ہراغلفی اشکال کی غیر ضروری حصّوں کو حذف کر دیا گیا۔

۴- ٹیڑھی میڑھی لکیروں والے حروف میں کچھ باقاعدگی پیدا کی گئی۔

۵- مشابہ حروف میں امتیاز کرنے کے لئے کچھ خطوط کا اضافہ کیا گیا۔[2]

اصل یہ ہے کہ فنیقی کے مصری ماخذ کا جو نظریہ Rouge نے پیش کیا تھا وہ نہایت ہی جامع و مانع تھا جسے اُس کے معاصرین نے تسلیم کر لیا تھا جن میں Maxmuller اور Sayce ایسے بڑے بڑے عالم بھی شامل تھے۔

اُس کے نظریہ کو زبردست دھکا پہونچانے والے فنیقی سے مشابہ وہ نقوش تھے جو ایک عرصے کی پہلے کے ظروف پر پائے جاتے ہیں۔ (کالم نمبر ۷ نقشہ نمبر ۵ میں)

اب ہم ان ظروفی نقوش کے متعلق کچھ بتلائیں گے۔ اب سے قریباً نصف صدی اُدھر مشہور عالم فلنڈرس پیٹرس (Flinders Petrie) نے Abydos میں (بالائی مصر میں جسے السعید کہتے ہیں) پہلے حکمراں خاندان کے

---

[1] Alphabet vol. I p. 95 ... فنیقی خط کا مشہور کتبہ۔ یہ ۸۵۰ سال ق۔م کا ہے۔

[2] Alphabet vol I p. 126 ... ان تبدیلیوں کے سمجھنے کے لئے نقشہ نمبر ۵ ملاحظہ ہو۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہراطیقی حروف کی شکلوں میں اس نوع کی تبدیلیاں کر کے یہ فنیقی حروف وجود میں آئے۔

[3] The Alphabet By. Isaac Taylor, Vol I page 117

مقابر سے پختہ برتنوں کی ایک بڑی تعداد دستیاب کی۔ ان میں سے کچھ دور آغاز حکمرانی کے تھے اور کچھ اس سے بھی پہلے کے۔ یہ ظروفی نقوش جو کہ مصری ہیراغلفی خط سے بھی قدیم ہیں فینیقی حروف سے اس حد تک مشابہ ہیں کہ انھیں فینیقی ماخذ سمجھا جاتا ہے [۱]۔

ویڈل کے مطابق یہ سمیری سے ماخوذ تھے لیکن ان کا انتخاب کس نے، کیوں اور کب کیا۔ ان سوالات کا جواب ابھی تک نہیں دیا جا سکا۔ لیکن اس باب میں میرا نظریہ یہ ہے کہ ان نشانات کو ہم بحیرہ روم کے سواحل سے لیکر ہندوستان تک پھیلا ہوا پاتے ہیں ان کا انتشار غالباً عصر حجری کے آغاز میں ہوا تھا کیونکہ ایسے ہی نشانات اُس زمانہ کے نگار خانوں [۲]، سینگوں اور ہاتھی دانتوں پر بھی پائے جاتے ہیں۔

Aryan Origin of the Alphabet By. L. A. Waddell 1927, page 5.　　۱ل

شمالی اسپین اور جنوبی فرانس میں ایسے ۳۰ غاروں کا پتہ لگا ہے جن میں اعلیٰ درجے کی مصوری کے نمونے ہیں ان میں سب سے مشہور Altamira، Cogul، Les Combarelles، Perigord اور Pyrennes کے غار ہیں۔ ان کی تصاویر اتنی خوبصورت ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ انھیں اب سے چالیس پچاس ہزار سال اُدھر کے انسان نے بنایا ہوگا۔ ان تصاویر کو ہمیشہ غار کے منہ سے بہت دور بنایا جاتا تھا (غالباً اُس زمانہ کا انسان غار کو زمین کا رحم تصور کرتا تھا) مثلاً Pyrennes غار کی تصاویر اس کے دروازے سے قریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہیں۔ انھوں نے بناتے وقت مصنوعی روشنی کی بھی مدد لی تھی، جس کا ثبوت ایک sand stone کے بنے ہوئے چراغ سے ملتا ہے جس میں جلی ہوئی چربی کی کچھ علامات باقی ہیں۔ تصاویر کا موضوع جانور ہیں خصوصاً Les Combarelles غار میں جہاں یہ عالم ہے کہ چپہ چپہ جگہ تصاویر سے خالی نہیں ہے۔ ان کی کل تعداد ۴۰۰ سے اوپر ہے ان میں ۱۹ تصاویر ریچھوں کی ۵ ببروں کی ۴ بھیڑیوں کی، ۱ لومڑی کی، ۱ گینڈے کی، ۱۳ ہاتھیوں کی، ۱۱۲ گھوڑوں کی، ۳۷ بیسن بیلوں کی، ۹ ہرنوں کی، اور ۱۵ بارہ سنگوں کی ہیں اور باقی مچھلیوں سانپوں انگلیاں کٹے ہوئے انسانی ہاتھوں اور اعضائے تولید کی ہیں۔ آرٹ کے لحاظ سے سب سے خوبصورت تصاویر Altamira غار کی ہیں خصوصاً بیسن بیل کی اور اُس جنگلی سور کی جس کی ایک ہی تصویر کے دو رُخ پیش کئے گئے ہیں ایک ساکت اور دوسرا جھپٹتے وقت Cogul کی چٹانی نقوش کا موضوع جانور نہیں بلکہ انسان ہیں ان کی سب سے اچھی تصویر وہ ہے جس میں نو عورتوں کو سینہ کھولے ایک ننگے مرد کے گرد ناچتے دکھایا ہے۔ (ہیجان انگیز رقص کی یہ تصویر ہمیں وحشیوں کے اُن تیوہاروں کی یاد دلاتی ہے جو افزائش نسل یا فصل کے لئے منائے جاتے ہیں اور جن میں خوب داد عیاشی دی جاتی ہے) مندرجہ بالا مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی ٹوٹکے کو عملی جامہ پہنانے کے بجائے صرف اُس کا تشکل کرنا ہی کافی سمجھتے تھے۔ تصاویر میں جادو ٹونے کا تصور پایا جاتا ہے اس کا ثبوت ایک بارہ سنگے کا روپ بھرے ہوئے جادوگر کی تصویر سے ملتا ہے جو Pyrennes کے ایک چھوٹے غار میں ایک چبوترے کے پاس بنی ہے۔ حاملہ عورتوں کی تصاویر اور اعضائے تولید کی علامات سے افزائش نسل کا خیال وابستہ ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ کیجئے)

Dr. Piette پہلا[1] شخص تھا جس نے عالموں کی توجہ اس طرف مبذول کی اور Dr. Arthur Evans نے اُس کی تائید کی۔ چونکہ یہ نشانات سمیری سے ماخوذ ہیں، اور مصری ظروف پر پائے جانے والے نشانات سے مشابہ ہیں، اس لئے زمانہ کے اُس فاصلہ کو پُر کرنے کے لئے جو تہذیب مصر کے آغاز اور جدید حجری دور کے درمیان حایل ہے ان نگار خانوں کو قدامت کی حدود سے نکال کر عہد جدید میں لے آنے کی کوشش کی گئی، ماہرین کا یہ قدم مجھے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اصل میں یہ گتھی ویڈل کی پیدا کی ہوئی ہے جس نے سمیری اور مصری تمدن کی عمروں کو گھٹا دیا ہے اگر ان تمدنوں کی عمر بتانے والی گھڑی کی سوئیوں کو پیچھے نہ ہٹایا جاتا اور پہلی جگہ پر رہنے دیا جاتا تو ہرگز یہ گتھی نہ پیدا ہوتی۔

بہر حال مندرجۂ بالا سطور سے ان ظروفی نقوش کے عالمگیر استعمال اور قدامت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، ان نشانات میں سب سے زیادہ جس نے رد و بدل کیا وہ مصر ہی کے لوگ تھے اور یہاں ان کا استعمال فراعنہ کی حکمرانی سے قبل ہی شروع ہو گیا تھا اور فراعنہ کے اُنیسویں خاندان تک (گویا ویڈل کے مطابق ۲۰۰۰ سے ۱۲۰۰ سال ق۔م تک) قایم رہا اور چونکہ نشانات کو باقاعدہ بنانے کی کوشش صرف انھوں ہی نے کی اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ سمیری حروف کا انتخاب کرنے والے یہی لوگ تھے۔ چونکہ یہ حروف ہمیشہ مفرد لکھے جاتے تھے اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ کبھی لکھنے کے لئے استعمال نہیں کئے گئے اگر ان کے انتخاب کا منشا تحریری کام لینے کا تھا تو یہ کب کے تحریر کا جزو ہو گئے ہوتے، ان کا اپنا الگ تھلگ وجود رکھنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے انتخاب کا منشا کچھ اور تھا۔ اس بارے میں عالموں میں بڑا قیل و قال ہے۔

ویڈل[2] کے مطابق یہ نشانات ان ظروف کے مالکوں کے مخفف نام ہیں۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ایک ایسے کام کے لئے جس کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی ان کا سمیری ایسے پیچیدہ اور کثیر الاشکال والے رسم الخط سے انتخاب کیا گیا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے منتخب کرنے والوں نے ان کو بہتر بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی اور یہ کام سامی فنیقیوں کے لئے کیوں چھوڑ دیا، علاوہ اس کے یہ بھی قابل حیرت ہے کہ اس خط نے عالمگیر حیثیت کیوں اختیار کی۔

میری تحقیقات کے مطابق ظروف کی قید بیکار ہے کیونکہ یہ نشانات صرف برتنوں ہی پر نہیں بنائے جاتے بلکہ دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیوں پر بھی بنائے جاتے ہیں اور اگر عالموں کی نظر اس بات پر پڑی ہوتی تو ماخذ فنیقی کے متعلق

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱) تیر لگے ہوئے جانوروں کی تصاویر جادوگروں کے اس عالمگیر اصول کی تصدیق کرتی ہے کہ اگر شبیہ کو ایذا پہونچائی جائے تو صاحب شبیہ کو ایذا پہونچے گی۔ جانوروں کی افزایش کے لئے وسطی آسٹریلیا کے کچھ قبیلے اپنے خون سے گلنار کی ہوئی زمین پر انکی تصاویر بناتے ہیں اور پھر اچھل کود کر اور گا گا کر ان سے بچے جننے کی التجا کرتے ہیں۔ غالباً غار کی اس قسم کی تصاویر اسی منظر کو پیش کرتی ہیں۔

Dawn of Mediterranean Civilisation by Angelo Mosso, page 12. [1]

Aryan Origin of the Alphabet, L. A. Waddell, page 5. [2]

Rouge ایسے بے سروپا نظریے قایم نہ کرتا اور ان کو مسترد کرنے کے لئے Abydos کے ظروف کا سہارا نہ لینا پڑتا۔

مندرجہ بیان کے ثبوت کے طور پر میں اُس تصویر[۱] کو پیش کروں گا جس میں آسمان کی دیوی Nut کو اپنے چاروں ہاتھ پیروں سے اپنے بیٹے Shu کے سہارے زمین پر کھڑے دکھایا گیا ہے۔ اُس کا سارا جسم ایسے نشانات A سے ڈھکا ہوا ہے ان کی تعداد ۸۴ ہے اس سے قطع نظر زمین کے دیوتا Seb پر ایسے ᒣ نشانات پائے جاتے ہیں انکی تعداد ۳۰ ہے علاوہ ازیں ۲ ایسے ᚼ نشان بھی ہیں۔

یہ دونوں نشانات ᚼ A سامی النسل ہیں اور نشان ᒣ مصری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے نے پہلے Nut کی تصویر پر ایسے نشانات A بنائے اور پھر زمین کے دیوتا کی تصویر کو بھرنا شروع کیا اور سمیری طرز پر اُس نے ایسے ᚼ ابھی دو ہی نشانات بنائے تھے کہ اُسے یہ بات کھٹکی کہ کیوں نہ اس کا مصری مماثل بنایا جائے، اس لئے اُسنے بقیہ تصویر کو ایسے نشان ᒣ سے بھر دیا۔

ان نشانات کو ان دیوی دیوتاؤں سے منسوب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مصری دیومالا کی رو سے Nut پانی کی دیوی تھی اور Seb کھانے کا دیوتا، اور یہ نشان A پانی کی علامت ہے جیسا کہ اس کی ارتقائی اشکال (≈ ∓ Λ A) سے معلوم ہوتا ہے اور یہ ᒣ نرکل کی چوڑی پتی کی تصویر ہے گویا نباتاتی غذا کی علامت ہے۔

اس تحقیق سے میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ جب یہ نشانات علٰحدہ علٰحدہ پائے جائیں گے تو ان سے مراد دیوی دیوتا ہوں گے اور جب یہ نقوش ظروف پر ہوں گے تو اس بات کو ظاہر کریں گے کہ وہ برتن جن پر وہ نقوش پائے جاتے ہیں اُن دیوی دیوتاؤں سے منسوب ہیں جن کے وہ علایم ہیں اور اس طرح ان نقوش کی نوعیت مذہبی ٹھہرتی ہے جو آخر تک اسی لئے قایم رہی کہ مذہب نے انھیں اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ ایسی صورت میں یہ نشانات فنیقی کا ماخذ ہرگز نہیں ہو سکتے اور ویل کا نظریہ رد ہو جاتا ہے[۲]۔

Dr. Arthur Evans کے مطابق تیرھویں صدی ق۔م میں یونانیوں کا دباؤ پڑنے پر اکثر لوگوں کو اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ اس طرح یہ مہاجرین کریٹ[۳] سے چل کر کنعان کے ساحل پر آبسے انھیں سے فنیقیوں نے لکھنا سیکھا۔

---

۱ Plate LVI in "Origin & Evolution of Religion" By Albert Churchward.

۲ The Dawn of Mediterranean Civilisation By Angelo Mosso page 37

۳ سندھی کی بنیاد بھی ظروفی نقوش پر رکھی گئی تھی اور غالباً یہی سندھی خط سارگون کے بیٹے Manis Tusu کے عہد میں (۲۷۰۴ - ۲۶۹۱ سال ق۔م) مصر ہوتا ہوا کریٹ پہونچا اور سامی طرز میں لکھا جاتا رہا اور جب اس طرز میں لکھنے کی قید اٹھ گئی تو قریطی خط میں تبدیل ہو گیا۔

اس کی تصدیق اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق فنیقیوں نے بارھویں صدی ق۔م میں فنِ تحریر کو یونان میں رائج کیا تھا۔ علاوہ ازیں خود فنیقی کے وجود کا پتہ ہمیں بارھویں صدی کے اختتام اور گیارھویں صدی کے آغاز سے چلتا ہے۔ اس کے باوجود Evans کے نظریہ کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کی کوئی معقول توجیہ نہ ہو کہ یونانیوں کے زیرِ اثر علاقوں میں رائج ہونے کے باوجود کریٹ کا خط اپنے پڑوسی یونان تک براہِ راست کیوں نہ پہونچ سکا۔

ایسی حالت میں ہمیں Rouge کے اس نظریے کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فنیقی حروف ہیراطقی حروف سے ماخوذ ہیں۔ رہا ظروفی نقوش اور فنیقی حروف کی مشابہت کا سوال تو میں اسے ایک اتفاقی امر سمجھتا ہوں۔

ارامی فنیقیہ کے زوال کے بعد ساری تجارت سیریا والوں کے ہاتھ آگئی اور اُن کے طرزِ تحریر کے نقوش بھی ملنے لگے یہاں تک کہ ساتویں صدی ق۔م تک ارامی خط وجود میں آیا جو آگے چلکر مصر و اناطولیہ سے لیکر پنجاب تک رائج ہوا۔ یہ خط بنیادی طور پر فنیقی ہی تھا اور ان لوگوں نے جن کے قافلے بابل پہونچنے کے لئے اُن کے ملک سے گزرتے تھے اس خط کو فنیقیوں ہی سے سیکھا۔ ارامی اور فنیقی کا خاص فرق یہ ہے کہ فنیقی حروف کے سرے بند ہوتے ہیں اور ارامی کے کھُلے ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فنیقی پتھر پر لکھتے تھے اور ارامی عموماً مٹی کی تختیوں پر انگوٹھے کے ناخن سے لکھی جاتی تھی۔ اور اس طرح حروف کے سرے ناخن سے دب کر اُبھرنے نہ پاتے تھے۔

جب ۳۳۴ سال قبل مسیح میں سکندر، یونان سے اُٹھا اور پنجاب تک پہونچ گیا تو ارامی خط کا خاتمہ ہوگیا اور بہت **پامیری** جگہ یونانی خط رائج ہوگیا۔ ارامی خط اب کچھ تبدیلی کے ساتھ صرف شہر پامیرا میں پہلی صدی ق۔م سے تیسری صدی عیسوی تک رائج رہا اور چونکہ یہ خط مصر کی وساطت سے رائج ہوا تھا، لہذا اس میں تمام وہ خصوصیات نمایاں تھیں جو کاغذ پر لکھی جانے والی تحریروں میں ہوتی ہیں۔

نباطی ارامیوں کے بعد تجارت کی باگ نباطیوں کے ہاتھ آئی جن سے عربوں نے لکھنا سیکھا۔ نباطی بہت کچھ پامیری سے متاثر تھی۔ اس کے نقوش تمام اُن تجارتی مرکزوں میں ملتے ہیں، جہاں جہاں ان کے کارواں قیام کرتے تھے۔ اس خط کے سب سے پرانے کتبے پہلی صدی عیسوی کے ہیں۔ ان میں دو بہت مشہور ہیں۔ ایک وہ جو دمشق کے جنوب مشرق میں حوران نامی آتش فشاں علاقہ میں ملا تھا اور دوسرا وہ جو اُن کے دارالحکومت پطرا یا سِلع (Petra or Selah) میں ملا تھا۔

اس خط کا تیسرا مشہور کتبہ چوتھی صدی عیسوی کا ہے جو دجلہ اور فرات کے سنگم کے قریب ابو شدر Abu Shadr میں دستیاب ہوا تھا۔

The Alphabet, vol I, pp. 245-246, 253, 259, 263, 265, 328-329, 329 ص — ل

کوفی جزیرہ نمائے طورسینا کے چٹانی کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی تک اس خط میں کچھ تبدیلیاں ہوئی تھیں اور اس میں ساتویں صدی کی کوفی خط سے زیادہ فرق نہ تھا اس کی تصدیق[1] یروشلم میں مسجد خلیفہ عبدالملک کے کتبوں اور اسوان[2] سے دستیاب شدہ اسلامی سکوں سے ہوتی ہے۔

کوفی خط اور موجودہ تحریر نسخ میں خاص فرق یہ ہے کہ موجودہ حروف کی وہ آخری کششیں جو حروف کو ملاکر لکھتے وقت حذف کردی جاتی ہیں کوفی میں موجود ہی نہ تھیں اور ان کا نہ ہونا ہمارے لئے اچھا ہی ہوا، ورنہ عبرانی کی طرح ہمیں بھی اپنی تحریر الگ الگ حروف میں لکھنا پڑتی۔

کوفی خط کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ میکانکی دقتوں کو دور کرنے کے لئے حیدر آباد دکن نے جس "بنیادی خط" کی اسکیم پیش کی ہے اُس کی بنیاد بڑی حد تک خط کوفی پر رکھی گئی ہے۔ بایں ہمہ یہ خط نقایص سے خالی نہ تھا۔ اس خط کا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ بہت سے حروف ہم شکل تھے۔ اس تشابہ کی بنا پر پڑھنے میں بڑی دقتیں ہوتی تھیں جن کو دور کرنے کے لئے عربوں نے نقطے ایجاد کئے۔ پہلے عربوں نے اپنی مخصوص چھ آوازوں کے حروف (ث۔ خ۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ غ) نقطے لگاکر حاصل کئے اور اس کے بعد دوسرے مشابہ حروف کی اصوات میں تمیز کرنے کے لئے بھی نقطے استعمال کئے۔

پڑھنے میں مزید آسانی پیدا کرنے کے لئے انھوں نے اعراب ایجاد کئے۔ زیر زبر پیش[3] کی مخصوص شکلیں جو آج نظر آتی ہیں یہ دوسری صدی ہجری کی ایجاد ہیں، اس کے پہلے سرخ رنگ کے نقطوں سے کام چلایا جاتا تھا، زبر کے لئے حرف کے اوپر، زیر کے لئے نیچے اور پیش کے لئے کنارہ پر ایک ایک نقطہ دیا جاتا تھا اور تنوین کے لئے دو نقطے۔

نسخ - اس خط کی رواں شکل (Cursive Form) نسخ کہلاتی ہے جس وقت عربوں نے فارس فتح کیا تو یہی خط وہاں بھی رائج پایا گیا۔

فارسی چار صدی تک چولی دامن کا ساتھ رہنے کی وجہ سے دونوں کی تہذیبیں اور دونوں کے ادب ایک دوسرے سے متاثر ہوئے عربوں کے بہت سے الفاظ فارسی لغت میں اور فارسی کے بہت سے الفاظ عربی لغت میں شامل ہوگئے۔ چنانچہ فارس والوں کو دوسرے حروف کے علاوہ عربی کے ۹ حروف خاص (یعنی ث۔ ح۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ ع۔ غ اور ق) بھی لینا پڑے، اسی کے ساتھ انھوں نے ب۔ ج اور ز میں دو دو اور گ میں تین نقطوں کا اضافہ کرکے اپنی مخصوص چار آوازوں کے حروف یعنی پ۔ چ۔ ژ اور گ حاصل کرلئے اور اس طرح فارسی حروف کی تعداد ۳۲ تک پہونچ گئی۔

(عربی حروف کے ارتقا کے لئے ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۲)

---

[1], [2] The Alphabet vol. I pp. 323, 325.

[3] اردو رسم خط از محمد سجاد مرزا ایم۔ اے پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدر آباد دکن۔ صفحہ ۲

فنیقی حروف کا ماخذ، ہراطیقی یا ظروفی نقوش - نقشہ نمبر ۵

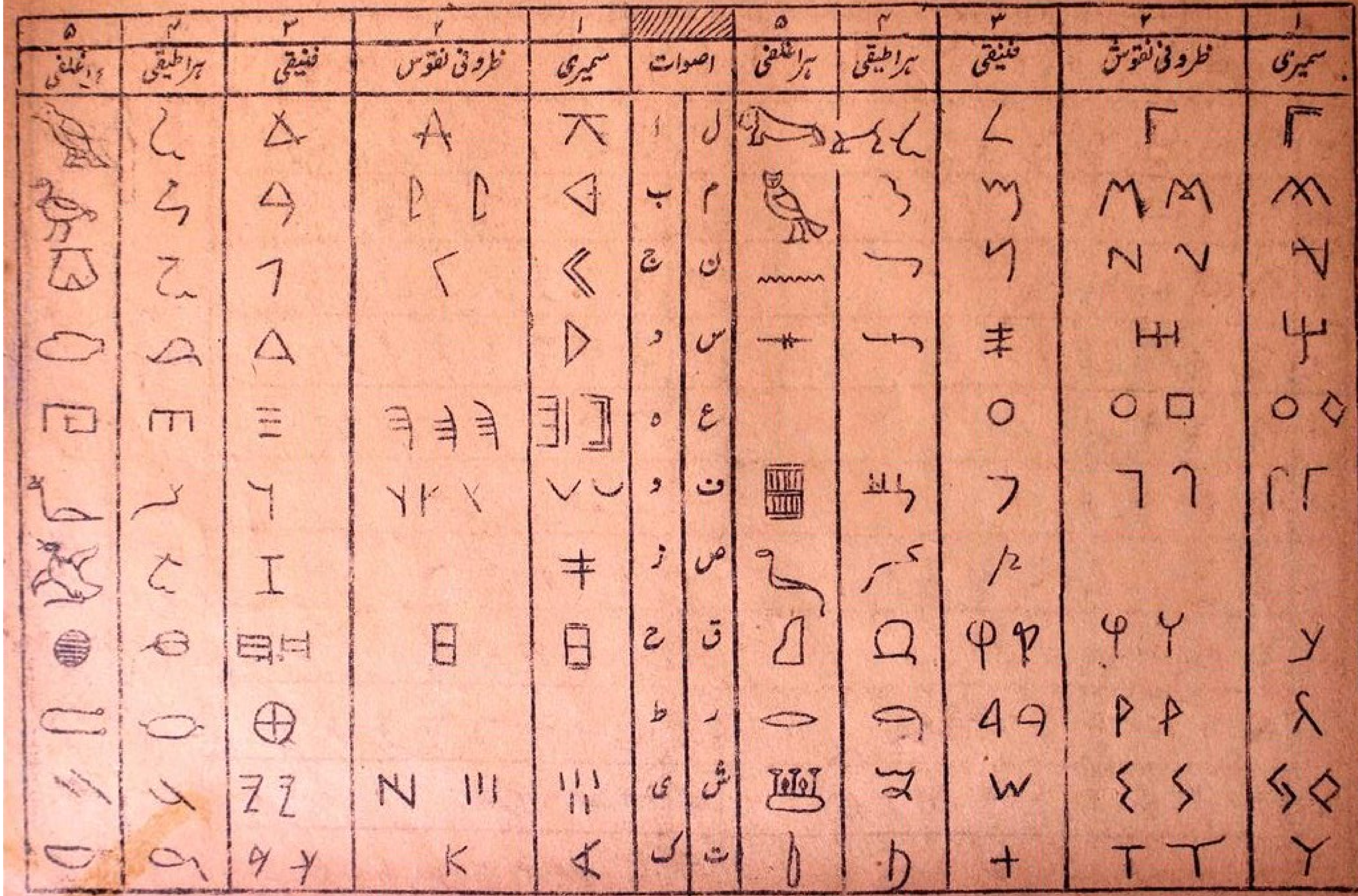

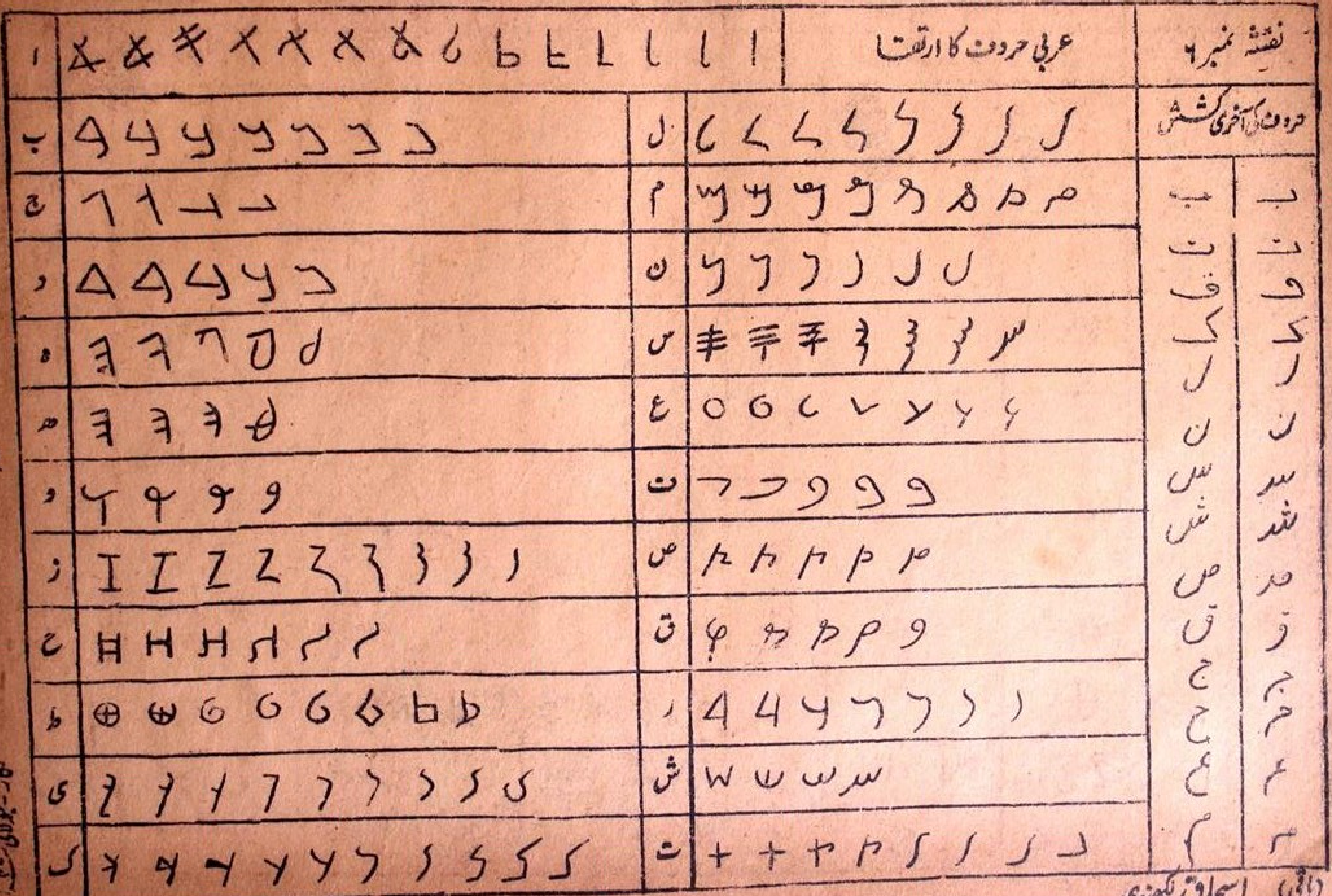

(باقی) اسحاق لکھنوی

میر انیس کے سلام

ایک ناقد کا قول ہے کہ کسی شخص کو کامل طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی زندگی۔ اس کے خیالات اور اس کی تصنیفات کو اس کے نسب، عہد اور ماحول کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ میر انیس کے کلام پر تبصرہ کرنے کے سلسلہ میں ان الفاظ کی صداقت پر رشک آنے لگتا ہے۔ میر انیس نے مرثیہ اور مرثیہ نے میر انیس کو معراج کمال تک پہونچا دیا اور ان دونوں نے ملکر لکھنؤ کی غلیظ اور گندی شاعری کا کفارہ ہی ادا نہیں کر دیا بلکہ "زمین سخن کو آسمان بنا دیا"

میر انیس نے مرثیہ بھی کہے اور سلام بھی، نوحے بھی کہے اور رباعیات بھی لیکن ان کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ اگر وہ میر خلیق کے بیٹے اور لکھنؤ کے ایک شیعہ خاندان کے فرزند ہوتے تو وہ بھی شاید اپنی تمام عمر غزل گوئی یا کسی اور صنف سخن میں صرف کر دیتے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی صورت میں وہ فردوسی ہند رہتے یا کچھ اور ہو جاتے۔ میر انیس نے مرثیہ لکھا، مرثیہ پڑھا اور مرثیہ میں شہرت حاصل کی۔ ناقدین نے ان پر مرثیہ گو شاعر ہونے کی حیثیت سے سوچنے، سمجھنے اور لکھنے کی کوشش کی۔ اور اس طرح مرثیہ کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت نے ان کی دیگر اصناف سخن پر پردہ ڈال دیا۔ مرثیہ گو شعراء ابتدا ہی سے "غم عشق" اور "غم روزگار" سے آزاد تھے۔ وہ رنج دنیا سے اپنی چشم نم رکھنا نہ چاہتے تھے" اور "غم آل عبا" کے علاوہ کسی اور غم کو شدت کے ساتھ محسوس کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان کو "خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال" کبھی پیدا نہ ہوا۔ انھوں نے دنیاوی عشق و محبت کے راگ نہیں گائے۔ اپنے دل کو "داغ محبت" کے بجائے "داغ غم حسین" سے روشن کرنے کے آرزو مند رہے تاکہ قیامت کے دن وہ یہ "ہدیہ" خدا کے سامنے" لے کر جا سکیں۔ اور اسی لئے انھوں نے غزل گوئی سے ایک بڑی حد تک کنارہ کشی اختیار کی۔ لیکن اس کے باوجود وہ محض مرثیہ گوئی پر قانع نہ رہ سکے۔ انھوں نے سلام۔ رباعی اور نوحہ ایجاد کیا۔ یہ اصناف سخن اس لئے وجود میں آئیں کہ ہمیشہ طول طویل مرثیہ لکھنا شاعر کے لئے ممکن نہ تھا۔ بعض اوقات اس کے دل میں جذبات کا طوفان امنڈ آتا اور اس کی عقیدت و محبت اس کو متفرق اشعار کہنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اسی جذبہ نے سلام اور نوحہ کو مرثیہ نما ہونے ہوئے بھی مرثیہ سے الگ صنف سخن بنا دیا۔

سلام اور مرثیہ کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ یہ کہنا تو ابھی آسان نہیں کہ سلام اردو ادب میں پہلے داخل ہوا یا مرثیہ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ کے مقابل میں سلام کو شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ مرثیہ کی عالمگیر وسعتوں نے اس کو ایسا چھپا دیا کہ آج ہم میں سے اکثر اس صنف سخن کے نام سے بھی واقف نہیں۔

سلام اُردو ادب میں بہت قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ اس کی ایک اپنی الگ تاریخ ہے۔ اس نے مختلف مقامات پر اپنی مختلف حیثیتیں قایم اور بہت سی ارتقائی صورتیں اختیار کیں ہیں۔ مرثیہ کی طرح اس نے بھی مذہب کی آغوش میں آنکھیں کھولیں اور رفتہ رفتہ اپنے دائرہ کو وسیع کرنا شروع کردیا۔ شروع میں اس کا مقصد محض محمد و آلِ محمد پر درود و سلام بھیجنا تھا لیکن رفتہ رفتہ مذہب اور عقیدت کے ساتھ۔ فلسفہ۔ اخلاق اور جملہ موضوعات از قسم واردات قلبیہ اس میں شامل ہونا شروع ہوگئے اور اس طرح سلام کا ادبی پایہ بھی بلند ہونا شروع ہوگیا۔

سلام گوئی کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ دہلی نے کسی حد تک اس کو نوازا اور لکھنؤ نے اس کو کمال تک پہونچا دیا پہلے سلام میں لفظ "سلام" بطور ردیف کے استعمال کیا جاتا تھا۔ سلام مربع بھی لکھے جاتے تھے اور منفرد بھی۔ لیکن بعد کو مربع سلام کا لکھا جانا ختم ہوگیا اور "سلام" کو بطور ردیف کے استعمال کرنا بھی متروک ہوگیا۔ سلام میں یہ تمام تبدیلیاں لکھنؤ میں ہوئیں کیونکہ مربع سلام کا رواج دہلی میں میر اور سودا کے وقت تک پایا جاتا ہے۔ میر صاحب کے کلیات میں کوئی سلام نہیں البتہ رسالہ "اردو" ۱۹۳۱ء میں ان کا ایک سلام اور چند مراثی شایع ہوئے ہیں۔ میر صاحب کا سلام مربع ہے۔ یعنی اس میں چار مصرع ہیں جن میں سے ۳ ہم قافیہ اور چوتھے میں لفظ "سلام" بطور ردیف استعمال کیا گیا ہے۔ میر صاحب کے سلام کا ایک بند یہ ہے:

درویش و بے بضاعت ہے میر دست کوتاہ　　　غیر از سلام تحفہ رکھتا نہیں ہے کچھ وہ
ہر لحظہ اور ہر دم ہرگاہ اور بے گاہ　　　اے شاہ دوسرا کے تجھ کو سلام پہونچے

سودا کی کلیات میں بارہ سلام پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے نو سلام منفرد ہیں۔ یعنی غزل اور باقی ۳ سلام مربع ہیں۔ سودا کے منفرد سلام کا نمونہ یہ ہے:

حسین تجھ کو یہ عرشِ بریں کرے ہے سلام　　　وہاں سے آن کے روح الامین کرے ہے سلام
فلک پہ جو ہے سو کرتا ہے بندگی تیری　　　ہر ایک ساکن روئے زمیں کرے ہے سلام
تیری جناب میں ہووے قبول یا شہ دیں　　　ادب سے سودا بصدق و یقیں کرے ہے سلام

ان اشعار سے مربع اور منفرد سلام کا فرق ہی نمایاں نہیں ہوتا بلکہ سلام کے موضوعات اور ان کے انداز بیان پر بھی ہلکی سی روشنی بھی پڑتی ہے۔

اس سے علامہ شبلی اور دوسرے ناقدین کی رائے کی بھی تردید ہو جاتی ہے جن کا خیال تھا کہ سلام آغوش لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ بڑھا اور پروان چڑھا کیونکہ دوسرے مقامات کی آب و ہوا اس میں نشو و نما کے لئے سازگار نہ تھی۔

اس میں شک نہیں کہ سلام کو غزل کے انداز میں نظم کرنے کا سہرا لکھنؤ کے سر ہے لکھنؤ نے صرف صوری حیثیت سے سلام میں تصرف نہیں کیا بلکہ اس کی معنوی حیثیت کو بھی ایک بڑی حد تک تبدیل کر دیا پہلے سلام محض لغوی معنی تک محدود تھا اس کا مقصد۔ محمد و آلِ محمد پر ہدیہ درود و سلام بھیجنا تھا اور یہی سبب تھا کہ متاخرین نے "سلام" کو بطور ردیف کے

استعمال کیا لیکن لکھنؤ میں "سلام" کی حیثیت ایک اصطلاح کی سی ہوگئی۔ جس میں محمد و آلِ محمد کی مدح اور منقبت کے ساتھ ساتھ ان کے مصائب اور خصوصاً واقعات کربلا کے دل شکن واقعات کو نظم کیا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ بے ثباتی دنیا ہستی ناپائیدار۔ فقر۔ توکل اور اخلاقی موضوعات اس میں شامل ہونے لگے۔ یہی سبب ہے کہ آخر میں سلام اور غزل اک دوسرے سے اتنے قریب ہوگئے کہ سلام کا شعر "غزل" میں اور غزل کا شعر "سلام" میں بہ آسانی شامل کیا جاسکتا ہے۔ جہاں سلام میں مذہبی عنصر زیادہ نمایاں ہوجاتے ہیں وہاں غزل اور سلام میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ سلام میں اس قسم کی تبدیلیاں میر ضمیر ہی کے زمانہ سے شروع ہوگئی تھیں۔ میر ضمیر نے اگر ایک طرف اپنی جدت فکر اور ندرت تخیل سے مرثیہ گوئی میں چند خاص موضوعات کا اضافہ کیا تو دوسری طرف سلام کو موجودہ طرز میں نظم کرنے کا شرف بھی انھیں کو حاصل ہے۔ میر ضمیر کے سلاموں سے ہم سلام گوئی کے متعلق کچھ خاص اصول متعین کرسکتے ہیں اور اس کو جداگانہ صنف سخن کی حیثیت سے پرکھ سکتے ہیں۔ بعد میں تمام مرثیہ گو شعرا نے میر ضمیر ہی کی روش کو اختیار کیا اور اس میں کوئی نمایاں تغیر و تبدل نہ ہوسکا۔ میر ضمیر کے زمانہ سے جو سلام گوئی کے اصول مرتب کئے گئے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- سلام غزل کی بحروں۔ ردیف و قوافی میں نظم کیا جاتا ہے۔

۲- سلام کا پہلا شعر غزل کے شعر کی طرح مطلع کہلاتا ہے۔

۳- سلام کے پہلے شعر میں لفظ "سلامی" یا "مجرائی" استعمال کیا جاتا ہے۔

۴- سلام کا آخری شعر مقطع ہوتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے۔

۵- سلام میں کم از کم ۵- اشعار اور زیادہ سے زیادہ ۱۵- اشعار نظم کئے جاتے ہیں۔

۶- مشاعرہ کی طرح سلام کی مجلس کو مسالمہ کہتے ہیں۔

۷- موضوعات - سلام کے موضوعات کا ذکر گزشتہ تحریر میں کیا جاچکا ہے۔ اس لئے اس کا دوبارہ بیان کرنا بیکار ہے۔

اس مضمون میں میرا مقصد سلام گوئی کی حقیقت یا اس کی ارتقائی تاریخ پیش کرنا نہیں کیونکہ یہ کام اپنی جگہ خود اتنا اہم ہے کہ یہ مختصر سا مضمون اس کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ انیس کی سلام گوئی کے سلسلہ میں یہ چند اشارے محض سلام کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے لکھے گئے تھے، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انیس نے کسی صنف سخن کو ایجاد نہیں کیا بلکہ اپنے پیش رو حضرات کے بنائے ہوئے نقش قدم پر چلے اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے اس کو معراج کو پہونچا دیا۔

ہر شاعر کے خیالات اور تصنیفات پر اس کے عہد اور ماحول کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن میر انیس کی شاعری پر عہد و ماحول کے ساتھ ساتھ ان کے نسب کا بھی بہت گہرا اثر پڑا۔ انیس کو مرثیہ گو شاعر بنانے کی تمام تر ذمہ داری ان کے والد میر خلیق پر ہے۔ میر خلیق خود ایک مذہبی ماحول میں رہنے والے متقی و پرہیزگار آدمی تھے۔ ان کی بیوی بھی زہد و تقویٰ میں کسی طرح ان سے کم نہ تھیں۔ دونوں کے دلوں میں خدا۔ رسول اور آلِ رسول کی محبت کے گہرے نقوش تھے۔ میر خلیق خود

مرثیہ لکھتے۔ پڑھتے اور اپنے اس فعل کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے۔ حسینؑ کے غم میں رونا۔ ان کی مجالس عزا کا برپا کرنا۔ مرثیہ پڑھنا اور سننا وہ عبادات میں داخل سمجھتے تھے۔ میر انیس نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور بچپن ہی سے یہ تمام مذہبی خیالات معتقدات اور احساسات ان کی رگ و پے میں سرایت کر گئے۔ جس کی جھلک ہم کو ان کی تمام زندگی میں نظر آتی ہے۔

میر خلیق اپنے زمانہ کے مشہور مرثیہ گو شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ مرثیہ خوانی کے میدان میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ قدرداں ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ شفیق باپ کی یہ دلی خواہش تھی کہ اپنے بیٹے کو بھی اسی راہ پر لگائے اور اس کو بھی وہی شہرت اور عزت حاصل ہو جو خود ان کو حاصل تھی۔ دوسرے اس زمانہ میں میر ضمیر کا طوطی بول رہا تھا۔ میدان مرثیہ گوئی میں وہ اپنے جوہر دکھا رہے تھے دونوں اگرچہ ایک دوسرے کے حریف تھے لیکن میر ضمیر نے مرثیہ گوئی میں نئی نئی راہیں نکال کر اپنی ایک جداگانہ حیثیت متعین کر لی تھی۔ میر خلیق چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا میدان مرثیہ گوئی میں میر ضمیر سے بڑھ چڑھ کر نام پیدا کرے اور اس طرح ان کا نام روشن ہو۔

میر خلیق کی آرزوؤں میں جان پڑ گئی جب انھوں نے سنا کہ رات مشاعرہ میں میر انیس نے ایک نہایت کامیاب غزل پڑھی۔ بیٹے کو صغر سنی میں اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں کا حامل دیکھ کر میر خلیق کو بڑی خوشی ہوئی۔ بیٹے کو بلا کر مشاعرہ کا حال پوچھا۔ غزل سنی اور سمجھ لیا کہ اب میری آرزوؤں کے پورا ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ بیٹے کی ہمت افزائی کی لیکن ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کی۔ کہ "اب اس غزل کو سلام کرو اور ایسی چیز میں اپنا زور قلم صرف کرو جس سے دین بھی ملے اور دنیا بھی۔

لکھنؤ میں رعایت لفظی کا دور دورہ تھا۔ بات میں بات پیدا کرنا زباندانی کی علامت سمجھی جاتی تھی "سلام کرو" کو محض ایک محاورہ سمجھنا ممکن نہ تھا اور خصوصاً انیس جنھوں نے سلام اور مرثیہ کی آغوش میں آنکھیں کھولیں تھیں کیونکر اپنے والد کے اس اشارے کو نہ سمجھ جاتے۔ چنانچہ سعادت مند بیٹے نے اسی غزل کی طرح پر سلام لکھا اور اس طرح اردو کے اس بے مثال شاعر نے جب غزل گوئی ترک کی تو سب سے پہلے سلام پر طبع آزمائی کی۔

بیٹے کی اس فرمانبرداری نے باپ کے دل کو موہ لیا اور انھوں نے اپنی تمام تر توجہ میر انیس کی طرف منعطف کر لی کبھی بیٹے سے سلام لکھواتے۔ کبھی لکھے ہوئے سلاموں اور مرثیوں کی اصلاح کرتے۔ کبھی آداب مجلس سکھاتے اور کبھی تحت اللفظ پڑھنے کے طریقے بتاتے۔ میر انیس کی عظمت کا راز ان کے بچپن کی اس تربیت میں ملتا ہے۔ میر خلیق نے میر انیس کی شاعرانہ قدرتوں کو نکھار دیا اور اس غنچہ کو بڑھنے۔ پھولنے، پھلنے اور سرسبز و شاداب ہونے کے مواقع بہم پہونچائے۔ میر انیس ابھی گھر کی چہار دیواری میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی مشق کرتے تھے۔ شفیق باپ جسکی تمام عمر اس فن کی تکمیل میں گزر گئی تھی اسوقت کا منتظر تھا جب اس چھپے ہوئے موتی کو اہل سخن کے دربار میں پیش کرے۔ میر خلیق نے اپنے بیٹے کی مرثیہ گوئی کا تذکرہ اپنے احباب وغیرہ سے کرنا شروع کر دیا اور اس طرح وہ میر انیس کے لئے زمین تیار کرتے رہے۔ جب انیس سے کچھ کچھ لوگ واقف ہو گئے تو میر خلیق نے ان کو خاص خاص مجالس میں لے جانا شروع کیا۔ میر انیس سے لوگوں کو دلچسپی پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔

آخر کار ایک بڑی مجلس میں میر خلیق نے ایک نہایت کامیاب مرثیہ پڑھا اور مرثیہ ختم کرنے کے بعد میر انیس کا تعارف اہل مجلس سے کرایا اور کہا کہ "اب لوگوں نے اکثر میر انیس کو سننے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ آج سن لیں" یہ کہکر میر انیس کو اشارہ کیا جو نہایت وقار سے اپنی جگہ سے اُٹھے اور ممبر پہ جاکر پہلے ایک رباعی پڑھی۔ پھر ایک سلام پڑھ کر تمام مجلس کو اپنا گرویدہ بنالیا مرثیہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور میں ختم ہوا۔ سیکڑوں قدر شناس اپنی جگہ سے اُٹھکر میر انیس سے مصافحہ کرنے اور ہاتھ چومنے کو آ گئے اور تمام شہر میں میر انیس کی دھوم مچ گئی۔

میر انیس کی ابتدائی مشق۔ ان کے والد کی غیر معمولی توجہ اور میر انیس کی پہلی مجلس کا تفسیر سے بیان محض قصہ کے طور پر نہ تھا۔ بلکہ میر انیس کی ذہنی۔ مذہبی۔ اعتقادی اور ادبی نشوونما کا راز ان ہی واقعات میں چھپا ہوا ہے۔ پہلی مجلس کی اس شاندار کامیابی نے جہاں نوجوان شاعر کو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی سے قریب تر کر دیا۔ وہاں اہل مجلس کی محبت اور خلوص کا سکہ بھی اس کے دل میں بٹھا دیا۔ بعد میں اسی مجلسی ماحول اور قدر دانیوں نے میر انیس کی شاعری کو مرثیہ کی حدود سے بڑھنے سے روک دیا۔

ان واقعات سے سلام کے متعلق بھی ہم کو بہت سی مفید باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ لکھنؤ میں میر انیس کے زمانہ میں سلام کافی ترقی کر چکا تھا۔ سلام کے لفظ سے ہر ایک کے کان آشنا ہو چکے تھے اور مرثیہ گو شعراء جب دنیا سے ہٹ کر دین کے دائرہ میں داخل ہوتے تھے تو وہ پہلے سلام ہی پر طبع آزمائی کرتے تھے جو مرثیہ سے نسبتاً نظم کرنا سہل تھا۔ دوسرے ہم کو اس زمانہ کے مجلسی اُصولوں کا پتہ چلتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ گو شعراء کے لئے سلام لکھنا ضروری سا تھا۔ آبحیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے میر ضمیر کے سلسلہ میں لکھا ہے:

> "سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر تھے۔ اس سے پہلے مرثیہ سوز میں پڑھے جاتے تھے۔ اب تحت اللفظ کا رواج ہوا۔ غالباً پہلا شخص جس نے ممبر پر بیٹھ کر تحت اللفظ پڑھا وہ میر ضمیر تھے۔"

اگر آبحیات کی اس عبارت کو درست مان لیا جائے تو اس بات کو ماننے میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی۔ کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے آداب اور اُصول مرثیہ خوانی بنائے ہوں گے۔ مرثیہ گو شاعر کا ممبر پہ جاکر پہلے رباعی پڑھنا۔ پھر سلام پڑھنا یہ وہ اُصول ہیں جو آج تک مرثیہ خوانی کے سلسلہ میں برتے جاتے ہیں۔ میر ضمیر کے مجموعۂ مراثی میں متعدد سلام اور رباعیاں ملتی ہیں جو اس دعوٰی کی اچھی دلیل کہی جا سکتی ہیں۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں رباعی اور سلام کی ایجاد کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ لوگوں کو طول طویل مرثیہ سُنانے کے لئے آمادہ کیا جائے۔ مجلس کو مخاطب کرنے اور اس کا رجحان طبع معلوم کرنے کے لئے یہ دونوں چیزیں مرثیہ گو شعراء کے لئے نہایت مفید تھیں۔

کیونکہ سلام مرثیہ سے پہلے پڑھا جاتا تھا۔ اس لئے مرثیہ گو شعراء اس میں ان خیالات۔ جذبات۔ حسیات اور معتقدات کو نظم

کرنے کی فکر کرتے تھے جن کو سن کر سامعین کی ہمدردیاں مرثیہ گو شاعر سے پیدا ہو جائیں۔ اور وہ شاعر کے کلام کو غور سے سنیں۔ اسکی تعریف کریں اور اس کے مرثیہ کو کامیاب بنائیں۔

میر انیس کے نسب اور ماحول پر تبصرہ کرنے کے بعد ہم ان کے عہد کا جائزہ لیتے ہیں۔ میر انیس کا لکھنؤ آج کل سا لکھنؤ نہ تھا تاریخی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نواب شجاع الدولہ سے لیکر جانعالم واجد علی شاہ اختر کا زمانہ نہایت رنگین اور عیش کوش گزرا۔ یوں تو برہان الملک نواب سعادت علی خاں ہی کے زمانہ سے صوبہ اودھ پر دہلی کا کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن شجاع الدولہ نے تو کھلم کھلا اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ شجاع الدولہ کا عہد بدامنی اور بے چینی کا زمانہ تھا۔ اس کو فرصت اور اطمینان سے عیش کرنے کا موقع نہ تھا۔ لیکن پھر بھی وہ چوکا نہیں جو وقت مل گیا اس کو غنیمت سمجھا اور خوب داد عیش دی اور اپنے متاخرین کے لئے راہیں کھول گیا۔ اس عیش و نشاط کی معراج اور اختتام واجد علی شاہ اختر پر ہوا۔

بادشاہوں کی رنگینی اور عیش کوشی نے رعایا کو رنگین تر بنا دیا۔ جاگیر دارانہ نظام تھا۔ ہر امیر اپنی جگہ بادشاہ بنا ہوا تھا۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم تھیں۔ حسن و عشق کی رعنائیاں بکھری ہوئی تھیں "غم عشق" اور "غم روزگار" سے آزاد لوگ بوالہوسی کا شکار تھے۔

ناسخ اور آتش نے شاعری کے دو اسکول بنا دئے تھے۔ دہلی اسکول کی معنی آفرینی اور لطافت شعری لکھنؤ والوں کے لئے روکھی پھیکی چیزیں تھیں۔ یہاں زبان کی قدر تھی۔ زبان بھی سیدھی۔ سادی صاف و شستہ نہیں بلکہ جسمیں پیچیدگیاں ہوں جسمیں رعایت لفظی ہو۔ صنائع و بدائع ہوں۔ دور از کار تشبیہیں اور استعارے ہوں۔ اس طرح لکھنؤ میں شاعرانہ بدمزاقیاں عام ہو چکی تھیں۔ نقالی نے شاعری اور شاعری نے نقالی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لکھنؤ کے ہر شخص پر "عورت سوار تھی" لیکن وہ عورت نہیں جس سے ہمارے حسیات لطیف بیدار ہو جائیں جس سے کشف روحانی حاصل ہو۔ اور جس سے حسن و عشق کے لطیف جذبات ہم میں پیدا ہوں۔ بلکہ وہ عورت جو عریاں تھی۔ جس کا عضو عضو ہمارے سامنے تھا اور جو اپنی عریانی سے لوگوں کے شہوانی جذبات برانگیختہ کر دیتی تھی۔

لیکن لکھنؤ کو اسی قسم کی شاعری میں گھرا ہوا سمجھنا غلطی ہے۔ لکھنؤ میں شعراء کے دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو شراب حسن سے مدہوش۔ دنیا و عقبیٰ سے بےخبر حسن و عشق کے راگ گا رہا تھا۔ دوسرا وہ جس نے اپنا سب کچھ حصول عاقبت کی نذر کر دیا تھا۔ انھوں نے دنیا کو دین پر قربان کر دیا تھا اور محمدؐ و آل محمدؐ کے دامن کو جس کو وہ اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ "شراب ناب کی جگہ" انھوں نے عشقیہ شاعری سے توبہ کر لی تھی اور اپنے "ہر غم" کو "غم جاناں" بنانے کے بجائے "غم حسین" میں تبدیل کر دیا تھا۔

اس مقام پر پہونچکر ہمارے دل میں ایک عجیب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ لکھنؤ کے ماحول میں بہ یک وقت مرثیہ کی عظمت اور غزل کی کثافت کیونکر معراج کمال کو پہونچ گئی۔ ناسخ اور آتش کی زمزمہ پردازیوں کے ساتھ ہم کو میر ضمیر اور

میر خلیق کی مرثیہ گوئی کا شور سنائی دیتا ہے۔ وزیر۔ رند۔ صبا جیسے متبذل گو شعرا غزل کے ساتھ میدان سخن میں انیس و دبیر کی مرثیہ گوئی کے پرچم لہراتے نظر آتے ہیں۔ ایک ہی آدمی مشاعروں میں جاکر متبذل غزلوں پر بھی سر دھنتا ہے اور اہلبیت علیہ السلام کے اعلیٰ کردار اور مرثیہ گو شعرا کے انداز بیان کو بھی سن کر جھومنے لگتا ہے ایک ہی وقت میں انسان انتہائی بااخلاق بھی ہے اور بداخلاق بھی۔ تعیش پسند بھی ہے اور مذہبی بھی۔ عریانی پسند بھی ہے اور اہلبیت علیہ السلام کی بے ردائی پر نوحہ خواں۔ بلکہ غزل گو بھی ہے اور مرثیہ گو اور مرثیہ خوان بھی۔ جب غزل کہتا ہے تو متبذل گوئی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور جب مرثیہ لکھتا ہے۔ تو سیرت حسین۔ سیرت علی اور اخلاقیات کے بیان میں صفحہ کے صفحہ سیاہ کر دیتا ہے۔ منیر شکوہ آبادی وغیرہ شاعر اسکی اچھی مثال کہے جا سکتے ہیں۔ یہ دو متضاد چیزیں ہم کو لکھنؤ کی شاعری میں بہ یک وقت نظر آتی ہیں۔ ناقدین نے اس سلسلہ میں بڑی دلچسپ حرکتیں کیں ہیں۔ انھوں نے اس تضاد کو ظاہر ہی نہ ہونے دیا۔ جب غزل گوئی میں ناسخ یا آتش یا ان کے اور شاگردوں کا ذکر کیا تو لکھنؤ کی تعیش پسندی کو سامنے لاکر ان لوگوں کو متبذل گوئی کے الزام سے ایک حد تک بچا لیا۔ لیکن جب مرثیہ گوئی کا ذکر کیا تو تمام امرا اور آدھے لکھنؤ کو شیعہ اور باقی لکھنؤ کو سخن سنج اور سخن نواز بنا کر مرثیہ کی غیر معمولی شہرت کا ضامن بنا دیا۔

اگر ایک طرف بادشاہ اور امرا کی تعیش پسندی نے غزل کو اس کے مرتبہ سے گرا دیا تو دوسری طرف انھیں بادشاہ اور امرا کی مذہب نوازی نے مرثیہ کو چار چاند لگا دئے۔ گو بظاہر یہ دونوں چیزیں متضاد معلوم ہوتی ہیں لیکن ان میں باہمی اتفاق اور اتحاد موجود ہے۔ بادشاہوں کا کوئی مذہب نہ تھا لیکن وہ ایک بڑی حد تک شیعہ مذہب سے متاثر تھے۔

مذہب ان کے یہاں چند رسومات کی انجام دہی کا نام تھا۔ ان رسومات کی ادائگی میں بھی مذہبی اعتقادات و رجحانات سے زیادہ اپنی نام و نمود کا خیال رکھا جاتا تھا گو محرم و چہلم کے مہینے روح شہادت حسین کو کھو چکے تھے لیکن پھر بھی ان کو ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ سال بھر عیش و عشرت اور متبذل گوئی میں پڑے ہوئے لوگ ان دو ماہ میں کچھ بیدار سے ہو جاتے تھے۔ وہ ان دونوں مہینوں میں مجالس سید الشہدا برپا کرنا اور رونا۔ اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے یہی سبب ہے کہ لکھنؤ کے اس غلیظ اور گندہ ماحول پر دو مہینے کے لئے یہ تصنع پاکیزگی چھا جاتی تھی۔ بادشاہوں اور امرا کے امام باڑوں میں، حالانکہ عیش کوشی کا پورا پورا مظاہرہ کیا جاتا تھا اس کی سجاوٹ اور زیبائش میں اگرچہ امارت کو پوری طرح بے نقاب کیا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود "دربار حسینی" کی مناسبت سے یہ چیزیں ان دنیا پرست لوگوں کی نگاہوں میں ایک خاص حسینی وقار پیدا کر دیتی تھیں۔ ان ہی دو مہینوں میں مرثیہ گو شعرا کی خاطر خواہ عزت کی جاتی تھی ان کو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا معقول معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ان دو مہینوں کے لیے سال سال بھر مرثیہ گو شعرا کو وظائف دئے جاتے تھے اور اس طرح مرثیہ گو شعرا کے دل میں ان دو مہینوں میں نئے مراثی لکھنے اور نئے نئے انداز پیدا کرنے کا ایک خاص جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اس میں ان کی شہرت، عزت اور نام آوری ہی نہ ہوتی تھی بلکہ ان کی مالی اعانت بھی کی جاتی تھی۔ دوسرے

لکھنؤ میں ایک ایسا گروہ بھی تھا جو مرثیہ سننا اور سنانا عبادت سمجھا جاتا تھا وہ مرثیہ اور مرثیہ گو شعرا کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ تیسرے مرثیہ کے موضوعات خود اتنے پاکیزہ اور ارفع تھے کہ اس میں کسی قسم کی فحاشی یا ابتذال گوئی کا کھپانا ممکن نہ تھا۔ ان تمام چیزوں نے مرثیہ کی جداگانہ حیثیت کو قائم ہی نہ رکھا بلکہ اس کو معراج کمال تک پہونچا دیا۔ لکھنؤ میں شعر و شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ ہر شخص شاعرانہ لطافتوں کو محسوس کرنے اور اس کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ مرثیہ گو شعرا اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ یہی سبب تھا کہ مرثیہ کسی خاص جماعت سے مخصوص نہ رہ سکا بلکہ ہر با مذاق انسان ان مجالس میں شرکت کرنے لگا جس میں مرثیہ خوانی کی جاتی تھی۔ اس سے مرثیہ گو شعرا کی ہمت افزائی ہوئی اور انھوں نے مرثیہ میں اپنے کمالات دکھانا شروع کر دئے اور ان کو طلب جاہ و مال کے لئے غزل یا قصیدے کے دامن میں پناہ لینے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی، اور اس طرح مرثیہ گو شعرا کا گروہ اس کثافت و گندگی سے بچ گیا جس میں غزل گو شعرا پھنسے ہوئے تھے!

میر انیس کے مرثیہ اور سلام میں وہی فرق ہے جو کسی مصنف کی تصنیف اور اس کے خطوط میں نظر آتا ہے۔ میر انیس فطری شاعر تھے وہ دنیاوی چیزوں سے متاثر ہوتے تھے۔ لیکن وہ اپنے تاثرات کو پوری طرح سے ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ مرثیہ کیونکہ رزمیہ ( ) شاعری تھی اس میں شاعر واقعات کربلا کو تسلسل اور ترتیب سے پیش کرنے پر مجبور تھا اور وہ اس میں اپنے دلی جذبات اور احساسات کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے مرثیہ کے اصول۔ اس کا چہرہ۔ سراپا۔ رخصت۔ رزم وغیرہ شاعر کے ذہن کو دوسری طرف ہونے نہیں دیتے۔ یہی سبب ہے کہ مرثیہ سے ہم انیس کی شاعرانہ صلاحیتوں کے علاوہ کسی چیز سے مشکل سے واقف ہوتے ہیں۔ مرثیہ کی ابتدا آخر میں شاعر کبھی اپنی نجات اخروی کا طالب نظر آتا ہے یا "چمن نظم کے گلزار ارم" ہونے کی دعائیں مانگتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ اپنے جذبات اور خیالات کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ سلام نے اس مشکل کو حل کر دیا۔ اول تو سلام غزل کی طرز میں لکھے جاتے تھے جس میں ہر قسم کے واردات قلبیہ کا بیان حسن و خوبی سے ممکن تھا۔ دوسرے اس میں مرثیہ کی طرح پابندیاں نہ تھیں۔ اس کا ہر شعر دوسرے شعر سے معنی میں مختلف ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں شاعر کو اپنے واردات قلبیہ بیان کرنے میں آسانی تھی۔ چنانچہ میر انیس نے اپنے متقدمین میر ضمیر، میاں دلگیر، میر فصیح، کی طرح سلام میں قافیہ پیمائی نہیں کی کہ اس میں نئی نئی راہیں نکالنا شروع کر دیں اور جس طرح مرثیہ میں ان کی طبع کی روانی نے جدتیں پیدا کیں اسی طرح سلام میں بھی میر انیس نے اپنی انفرادیت کو جانے نہ دیا۔ میر انیس کی زندگی کے سارے خد و خال ہم کو ان کے سلاموں میں نظر آتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر میر انیس کے مختلف سلاموں کے اشعار کو سلیقہ سے ایک جا جمع کر دیا جائے تو انیس کی سیرت ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

محمد حسین انور بریلوی

قیمت ۸ر		لقشہا ـــ رنگ رنگ ہم ر		مذہب		اور فلسفۂ مذہب
ریاض نمبر بجائے ایک روپیہ صرف ۸ر کے ٹکٹ بھیجکر حاصل کیجئے		دونوں معہ محصول دو روپیہ میں

قدیم سنسکرت لٹریچر

(بہ سلسلۂ ماہ جون سنہ ۴۷ء)

چار نظمیں خالص طور پر پند و نصیحت کی طرز پر ہیں۔ ان میں سے ایک جواری کی فریاد ہے۔ اس میں قمار باز کے دل کی کیفیت کا اظہار خود اُس کی زبانی کیا گیا ہے جو اُس کو جوا کھیلنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب وہ ہارتا ہے اور دوسروں کی خوش حالی پر نظر ڈالتا ہے تو اُس کا دل کیسا کڑھتا ہے اور جلتا ہے۔ نصیحت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

"مہربان سوِتری مجھ کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ۔

اے جواری پانسوں سے نہ کھیل — اپنا کھیت جوت۔

جو کچھ تیرے پاس ہے اُس سے خوش رہ اور اُسی کو بہت سمجھ۔

وہ تیری بیوی اور وہ تیری گائیں ہیں! جا۔ اُن کے پاس رہ۔"

دوسری نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں کس طرح ہر شخص دولت کمانے کی فکر میں جدا جدا پیشہ اختیار کرتا ہے۔ ایک بند کا ترجمہ پیش ہے:

"میں شاعر ہوں۔ میرا باپ علاج معالجہ کرتا ہے۔

میری ماں چکّی پیستی ہے۔

مختلف خیالات رکھ کر ہم دولت جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور ہمیشہ گایوں کے حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔"

تیسری نظم ایسی کہاوتوں کا مجموعہ ہے جو بھلائی سے رہنے سہنے اور دان پُن کرتے رہنے کی ترغیبوں کی حامل ہیں چند مصرعوں کے ترجمے پیش ہیں:۔

۱۔ "جو دے سکتا ہے اُس کو چاہیئے کہ ضرورتمند کی ضرورت کو پورا کرے۔"

۲۔ "دولت رتھ کے دو پہیوں کی طرح گھومتی رہتی ہے اور کبھی ایک شخص کے قریب ہو جاتی ہے اور کبھی دوسرے کے نزدیک!"

۳۔ "جو شخص اپنے پیروں کو حرکت میں رکھتا ہے وہی اپنے سفر کو پورا کرتا ہے۔"

۴۔ "جو پوجا کرنے والا بولتا رہتا ہے وہ اُس پوجا کرانے والے سے زیادہ کماتا ہے جو خاموش رہتا ہے"

۵۔ "وہ دوست جو دیتا رہتا ہے کنجوس سے بہتر ہے"

چوتھی نظم سخنوری و سخنگوئی کی تائید و توصیف میں ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو (منڈل ۱۰ سوکت ۷۱)

"جب برہمن احباب فوری جذبات کے تحت بھجن تصنیف کر کے پوجا کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں تو بہت سے عقل و ذہانت میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور دیگر روشن ضمیر برہمنوں کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں"

"جو شخص اپنے ہم نوا دوستوں کو چھوڑ دیتا ہے اُس کی سخن گوئی میں کوئی مبارک نہیں ہوتی کیونکہ جو چیز وہ سنتا ہے وہ فایدہ مند نہیں ہوتی اور اُس کو نیکی کے راستہ کا کوئی علم نہیں ہوتا"

"اشعار کا شگفتہ گلدستہ پیش کر رہا ہے ـــ دوسرا کوئی ترنم خیز گیت گا رہا ہے۔ تیسرا مدرس ہے اور ہستی کے قوانین کی تشریح کر رہا ہے ـــ چوتھا رسوم قربانی کی صراحت کر رہا ہے"

پند و نصائح کے طریق پر رگوید کی دیگر نظموں میں بھی جا بجا متفرق خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کے نمونے بھی پیش نظر لائے جاتے ہیں:۔

"بہت سی ایسی کنواریاں ہوں گی جن سے محض اُن کی دولت کی وجہ سے عشاق محبت کا اظہار کرتے ہیں" (منڈل دہم سوکت ۲۷ بند ۱۲)

"اے گایوں ـــ تم دُبلے آدمی کو موٹا اور بدصورت کو خوبصورت بنا دیتی ہو" (منڈل ۶ سوکت ۲۸ بند ۶)

ایک شاعر کہتا ہے کہ خود اندر کا قول ہے کہ:۔

"عورت میں عقل بہت تھوڑی ہوتی ہے اُسکو سمجھانا بہت دشوار ہے" (منڈل ۸ سوکت ۳۳ بند ۱۷)

"عورتوں سے دوستی نہیں ہو سکتی ـ اُن کے دل بگھیروں کے دل کی طرح ہیں" (منڈل ۱۰ سوکت ۹۵ بند ۱۵)

دو نظمیں شاعرانہ معموں اور پہیلیوں کا مجموعہ ہیں ـ ایک میں دس بند ہیں (منڈل ۸ سوکت ۲۹) اُس کے ہر بند میں ایک دیوتا کا ذکر اُس کی مخصوص صفات کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن اُس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے ـ گویا پڑھنے والے کو یہ معما خود حل کرنا چاہیئے کہ یہ کس دیوتا سے متعلق ہے ـ مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل بند وشنو دیوتا سے متعلق ملاحظہ ہو:۔

"دوسرے نے تیز رفتاری سے تین قدم اُس طرف بڑھائے ہیں جہاں دیوتا سرشار مسرت مقیم ہیں"

دوسری نظم میں ۵۲ بند ہیں ـ (منڈل اول ـ سوکت ۱۶۴) ـ پہلی نظم کے معمے سادہ اور آسان ہیں لیکن اس نظم کے

معموں کا مجموعہ مشکل ترین ہے۔ مضمون کے علاوہ اُن کی زبان بھی اکثر و بیشتر محض اشارات اور غیر معروف مفروضات پر مشتمل ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کئی معموں کی صورت میں مفروضات اور تلمیحات ناقابل فہم ہو گئی ہیں۔ بعض معمے سوال کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں اور ایک آدھ سوال کا جواب بھی اُسی کے ساتھ موجود ہے۔ بعض پہیلیوں کے طرز اور مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود معمہ لکھنے والے شاعر کو بھی اُن کے جواب معلوم نہیں۔ ان معموں کا تقریباً ½ حصّہ آفتاب سے متعلق ہے۔ چھ یا سات معمے برق و باراں و اَبر سے تعلق رکھتے ہیں۔ تین چار معمے اگنی کی توصیف میں ہیں۔ سال و ماہ کی بھی چند معموں کی شکل میں تعریف کی گئی ہے۔ اسی طرح دو۔ دو ا۔ ایک معمے صبح۔ آسمان۔ زمین۔ عروض۔ نطق وغیرہ غرض کہ ہر قسم کے مضامین پر جو ذہن میں سما سکتے ہیں مشتمل ہیں۔

ان معموں کی تقلید میں ویدی زمانہ کے پچھلے حصّہ میں یہ طریقہ رواج پا گیا کہ جب برہمنوں کا کوئی اجتماع یا جلسہ کسی ایسے موقعہ پر ہوتا تھا جہاں قابلیت کا امتحان یا اظہار مقصود ہو تو فقہی یا مذہبی مسایل معمائی شکل میں بیان کئے جاتے تھے اور اُن کی توضیح و تشریح مناظرہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اِس قسم کے معموں کو براہمودیہ کہا جاتا ہے۔

جس قسم کی نظموں کی صراحت اب تک کی گئی ہے اُس کی ذیل میں اب صرف چھ سات نظمیں اور باقی رہتی ہیں۔ انھیں کچھ تو فلسفیانہ رنگ ڈھنگ کی ہیں اور بقیہ عقاید سے متعلق افسانوی طرز کی ہیں۔ مگر ان سب کا موضوع آفرینش عالم کا مسئلہ ہے۔ عبارت اور مفہوم کے اعتبار سے یہ نظمیں معمائی نظموں کے ہم رنگ اور اُن سے وابستہ پائی جاتی ہیں مجموعی حیثیت سے ان پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اُن سے متضاد خیالات و عقاید کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیندہ زمانے میں خیال آفرینی نے جدا جدا راستہ اختیار کئے۔ افسانوی رنگ کی نظمیں قدیم تر پائی جاتی ہیں اور انھیں سے ابتدائی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ قدیم ترین رشیوں کے اقوال کے مطابق بالعموم تمام دیوتاؤں نے مجموعی حیثیت سے یا فرداً فرداً بعض مخصوص دیوتاؤں نے کارخانۂ عالم کو پیدا کیا۔ اسی کے ساتھ اس عقیدے کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین دیوتاؤں کے والدین ہیں۔ رگ ویدی شاعر اس طرز کے یعنی متضاد اظہار خیال کے بہت دلدادہ پائے جاتے ہیں۔ دو مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔ دسویں منڈل کے چوتھے سوکت کے تیسرے بند میں بیان کیا گیا ہے کہ اندر نے اپنے جسم سے اپنے ماں باپ کو پیدا کیا۔ اُسی منڈل کے بہترویں سوکت کے چوتھے بند میں دکشا کی پیدایش اَدیتی سے اور ادیتی کی پیدایش دکشا سے بیان کی گئی ہے۔

ان متناقض بیانات میں جو بات بالکل صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات اُسی طرح خلق ہوئی ہے جس طرح کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن آیندہ ویدی زمانہ میں اس قسم کے نظریے تاویل و تشریح کے سلسلہ میں پڑ کر دوسری شکل اختیار کر لیتے ہیں، اور بجائے اس خیال کے کہ مجموعی طور پر یا فرداً فرداً دیوتاؤں نے کوئی چیز پیدا کی اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے کہ کوئی مواد پہلے سے موجود تھا جس نے یا تو از خود کوئی دوسری شکل اختیار کر لی یا کسی نے اُس مواد سے کوئی

دوسری چیز تیار کردی۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار بھی ایسے مخلوط طریق پر کیا گیا ہے جو تناقض سے پاک نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ عبارت اور نفس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان نظموں کے مصنفین مستقل طریق پر کسی نتیجہ پر نہیں پہونچے ہیں البتہ اُن کے دماغ متجسس اور کسی مستقل راستہ پر پہونچنے کے کوشاں نظر آتے ہیں لیکن الفاظ کے ہیر پھیر میں پڑ کر کسی صاف آخری منزل تک پہونچنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ خیالات و عقاید مذکور کسی ایک ہی وقت یا ایک ہی زمانہ سے متعلق ہیں۔ ابتدائی خیالات تو یہی تھے کہ دیوتاؤں نے کارخانۂ عالم کو پیدا کیا۔ بعد میں کسی ایک خالق کے ہونے کا خیال پیدا۔ ساتھ ہی ساتھ دیوتاؤں کا وجود بھی قایم رہتا ہے۔ مایۂ تولید یا وجہ تخلیق کسی نظم میں پُرُوش ہے کسی میں وشوکرمان۔ ایک میں ہیرن۔ یہ گربھ ہرنیہ گربھ ہے۔ دوسرے میں پرجاپتی ہے۔ یہ نام سب با معنی ہیں۔ "پرُوش" بہ معنی انسان۔ وشوکرمان بہ معنی خالق کل۔ یا فاعل کل۔ ہیرن یہ گربھ بمعنی طلائی رحم۔ پرجاپتی بہ معنی اولاد کا یا مخلوق کا مالک۔ تخلیق کا مفہوم مبہم ہے۔ کبھی نیست و ہست اور عدم و وجود کے مسایل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی اس طور پر ظاہر ہوتا ہے جیسے کوئی کاریگر لکڑی۔ دھات یا مٹی سے کوئی چیز بنائے۔ خلاصہ یہ کہ ایک طرف تو خالق کے اسماءِ صفاتی کے استعمال سے یقینی طور پر پتہ نہیں چلتا کہ یہ نام کسی ایک ہی ہستی کے ہیں یا ایسی ہستی کے ہیں جو خدا کا مترادف ہو۔ اور دوسری طرف تخلیق کا مفہوم بھی اس معنی میں صاف نہیں ہے کہ اگر کوئی صاحب اختیار خالق ہے تو ارتقائی اصول کس حد تک کارفرما ہے یا اگر کائنات کارخانہ ارتقا ہے تو خالق کس صورت میں صاحب اختیار ہے۔

اب تھوڑی دیر کے لئے اس بحث کو چھوڑ کر ایک نظم کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ دسویں منڈل کا سوکت ۹۰ موسوم بہ "پرُوش سوکت" ہے۔ یعنی بھجن متعلق بہ انسان۔ اس میں ایک اولین دیو صفت انسان کی تصویر پیش کی گئی ہے جس کے ہزار سر اور ہزار پاؤں ہیں اور جس کی جسامت ساری زمین پر حاوی ہے۔ اس ابتدائی انسان کو دیوتا قربان گاہ پر چڑھاتے ہیں اور اُس کے جسم کے ٹکڑوں سے کارخانۂ عالم مرتب کرتے ہیں۔ مثلاً اُس کے سر سے آسمان۔ سانس سے ہوا۔ پیروں سے زمین۔ دماغ سے چاند۔ آنکھ سے سورج پیدا کیے گئے۔ پُرُوش کی مزید تعریف یوں کی گئی ہے کہ "پرُوش" ہی یہ تمام دُنیا ہے اور جو کچھ ہو چکا ہے یا آیندہ ہوگا وہی پُرُوش ہے۔ اُسی سے ایک دیگر شخصیت بھی وجود میں آئی جس کا نام "ویراج" یہ ہے رگویدی "پرُوش"۔ براہمنوں میں بجائے دیوتاؤں کے وشنو کارفرما ہوتا ہے، اور پرُوش پرجاپتی بنجاتا ہے۔ اس کے بھی بعد اُپ نشد کی کتابوں میں یہی پرُوش کائنات کا مفہوم پیدا کر لیتا ہے لیکن آیندہ زمانہ میں جب ویدانت فلسفہ رواج پاتا ہے تو اُس میں "ویراج" کو برہما (یعنی روح) کے مقابلہ میں ایک شخصیت رکھنے والے خالق کی حیثیت دیجاتی ہے۔

خلاصہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ویدانت فلسفہ کا یہی سوکت ماخذ ہے۔ لیکن اس کے دیگر مضامین سے ظاہر

ہوتا ہے کہ یہ سوکت قدیم نہیں ہے بلکہ رگوید کے مرتب ہو جانے کے بعد اُس میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اُس میں تینوں ویدوں کا مع اُن کے ناموں کے حوالہ دیا گیا ہے اور چار ذاتوں کا بھی اس طور سے ذکر کیا گیا ہے کہ پُرُوش کا منھ برہمن بن گیا۔ اُسکے بازو راجینا (چھتری) یا مردِ سپاہی بنے۔ اُس کی رانیں ویش (اہلِ زراعت) ہوگئیں اور اُس کے پاؤں شُدر (غلام یا خادم) ہوئے۔ پُرُوش والی نظم میں کارخانۂ عالم کو دیوتاؤں کی صنعت گری کے نتیجہ کے طور پر ظاہر کیا گیا لیکن اس ذیل کی بقیہ نظموں میں تخلیق صرف ایک کارساز سے متعلق بیان کی گئی ہے۔ یہ صانع ہر نظم میں منجملہ اُن تین صفاتی القاب کے جو اس سے قبل مذکور ہوئے ہیں ایک جداگانہ صفاتی لقب سے یاد کیا گیا ہے اور یہ امر معما بن کر رہ گیا ہے اس لقب سے کونسی ہستی مراد ہے۔ بعض القاب تو بعض دیوتاؤں کے ذکر میں اُن سے منسوب پائے جاتے ہیں۔ بنابریں القابِ مذکور کے معنی کے متعلق تاویل کی بہت گنجایش پیدا ہو گئی ہے۔ محققین فرنگ نے رگوید کی دیگر متفرق نظموں کے مضامین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان نظموں کے صفاتی خالق کی تعبیر اس طرح پر کی ہے کہ یہ القاب آفتاب اور اگنی سے متعلق ہیں۔ سرِ دست دو مصنفین کے نظریے پیش کئے جاتے ہیں۔

مسٹر میکڈونل کا قول ہے کہ رگوید کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رگوید کے رشیوں کے نزدیک تولید کا محرک یا موجب یا اُس کو وجود میں لانے والا آفتاب ہے جس کی ثنا و صفت میں کہا گیا ہے کہ آفتاب "ہر متحرک و ساکن شے کی روح ہے" (منڈل ۱ سوکت ۱۱۵ - بند ۱)۔ یا یہ کہ "اگرچہ وہ ایک ہے لیکن اُس کو بہت سے ناموں کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے" (منڈل ۱ - سوکت ۱۶۴ - بند ۴۶)۔ مسٹر میکڈونل کے نزدیک یہی خیال یا عقیدہ "وشوکرمان" وغیرہ القاب کا جامہ پہن کر نظموں میں نمودار ہوا ہے۔

ایک دوسرے محقق مسٹر ریگوزن کا نظریہ یہ ہے کہ رگ ویدی اقوام درحقیقت آتش پرست تھیں۔ صاحب موصوف قدیم رشیوں کی متجسسانہ اور شاعرانہ تخئیل کی بلند پروازی اور نظموں کی خوبیوں کا اظہار کرتے ہوئے دیگر محققین کی اس رائے سے متفق ہیں کہ ان شاعروں کا آئینۂ خیال خدائی معنوں میں خالق کی کوئی ایک مکمل اور صاف تصویر نہیں پیش کرتا۔ نظموں میں تخئیل یہاں تک تو پہونچی ہے کہ کارخانۂ عالم کا کوئی ایک کارساز تو ہونا چاہئے یا ہے لیکن بجائے اس کے کہ توحید خالص کی منزل کی طرف قدم بڑھایا جائے ذہنی کشمکش اور دماغی کاوش خیالی اُلجھنوں میں پڑ کر سابقہ عقیدوں کی طرف رجعت کر جاتی ہے یا یوں سمجھا جائے کہ سابقہ عقیدوں کا ہی ان چند نظموں میں جو بہت بعد کے زمانہ کی ہیں، دوسری شکل میں معمے کی طرز پر اظہار کیا گیا ہے کہ رگویدی نظمیں عام محسوسات و جذبات سے متعلق ہیں اور جب سرمایۂ جذبات اختتام کو پہونچا تو جذباتی اور فطری شاعری کی جگہ نازک خیالی اور باریک بینی نے اپنا رنگ جمایا۔ جذباتی شاعری سرِ بحا قدرت پرستی کے عقیدوں سے متعلق تھی اور بین طور پر اُس وقت کی اقوام مظاہر و مناظر پرست تھیں۔ اس شاعری کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب کوئی شاعر کسی دیوتا کی ثنا و صفت کرنے بیٹھتا تھا تو اُس وقت اُس کے پیشِ نظر صرف وہی دیوتا ہوتا تھا اور وہی اُس کے لئے

سب کچھ ہوتا تھا۔ باقی سب ہیچ۔ اُردو فارسی شاعری میں بھی یہی بات پائی جائے گی کہ شاعرِ مدحت نگار کے خیال و نگاہ میں اُس کے وقتی ممدوح کی ذات کائنات کی ساری خوبیوں کا مخزن و معدن قایم ہوجاتی ہے اس طور سے شاعر کے دل و دماغ میں ایک قسم کی وحدانیت کا وقتی خیال جاگزیں ہوجاتا ہے۔ جب وہی خوبیاں دیگر ممدوحوں میں یا اُن سے متعلق پائی جاتی ہیں تو وحدانیت کا خیال ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور متجسس دماغ اور شاعرانہ تخیل ایک ممدوح کی ذات کو دوسرے ممدوح کی ذات کو دوسرے ممدوح کی ذات میں مدغم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی ہزاروں مثالیں اُردو فارسی شاعری میں ملیں گی بالفعل ایک شعر یاد آگیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جو پوچھا میں نے اُس کا مرتبہ پیرِ طریقت سے بتایا کان میں مجھ کو علی ہے نام یزداں کا

جب ذہن اس مقام تک پہونچتا ہے تو یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ ممدوحوں میں سے ایسا ممدوح جو زیادہ از زیادہ اوصاف کا جامع ہو اور سب سے زیادہ کارفرما ہو اکیلا صاحب اختیار ہونا چاہئے۔ رگ وید کے بھجنوں سے صاف طور پر عیاں ہے کہ رگویدی فرقے آگ کی پوجا کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوتے تھے اور یہی پوجا صرف رگویدی زبان میں ہی نہیں بلکہ آج تک جاری اور قایم چلی آجاتی ہے۔ اس آگ کا نمایندہ اگنی دیوتا تھا جس کے تین مقام آسمان۔ فضا اور زمین تھے اور اگرچہ وہ ہر شے میں اور ہزاروں شکلوں میں پنہا تھا اُس کی تین صورتیں آفتاب، بجلی اور آتش فروزندہ سے خاص طور پر ہویدا تھیں۔ سب سے زیادہ بھجن رگ وید میں اُسی کی توصیف میں ہیں اور اُس کے اوصاف اور کارفرمائیاں بھی سب سے زیادہ ہیں۔ دوسرے منڈل کے پہلے سوکت میں اگنی کی مختلف اور متعدد پیدایشوں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح پانی سے۔ بادلوں سے۔ درختوں سے اور جڑی بوٹیوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے بعد تشریح کی گئی ہے کہ اگنی ہی ہر دیوتا ہے۔ یعنی اگنی ہی وَرُن ہے۔ مِترا ہے اور اَدیت ہے۔ وہی اِندر اور تُوشٹر ہے اور وہی رُودرَ۔ مَرُوت۔ پُشَن۔ سوِتر وغیرہم۔ پھر اسی منڈل کے دیگر سوکت میں یہ عبارت پائی جاتی ہے:-

"وہ اُس کو اِندر۔ مِترا۔ وَرُن۔ اگنی کہتے ہیں۔ پھر وہ خوبصورت پروں والا بہشتی پرند ہے۔ وہ جو ایک ہے اہلِ خرد اُس کو کئی ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اُس کو اگنی۔ یَم۔ ماترِشون کہتے ہیں۔"

ایک فقرہ اسی طرز کا اور ملاحظہ ہو:-

"شاعرانِ ذی ہوش خوبصورت پروں والے کو اگرچہ وہ ایک ہے الفاظ سے تعداد میں بڑھا دیتے ہیں۔"

دایرہ اور تنگ ہوتا ہے اور شاعر کہتا ہے:-

"اے اگنی۔ اے دیوتا۔ اے غیر فانی حاکم۔ تیرے بہت سے نام رکھے گئے ہیں

شاعر کے جذبات نہیں رکھتے اور وہ عالم وجد میں اعتراف کرتا ہے کہ:-

"اگنی ہی کُل دیوتا (سب دیوتاؤں کا مجموعہ) ہے"

مسٹر رگوزِن کے خیال کے مطابق اگر آفتاب اور اگنی کو فلسفہ کا جامہ پہنایا جائے تو یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ رگوید کے پچھلے زمانے کے مصنفین روشنی اور حرارت کو مایۂ تخلیق یا محرک آفرینش تصور کرنے لگے تھے۔

بہرحال یہ رگویدی عالم محسوسات وجذبات کی وحدانیت کا رنگ ہے اور اسی عقیدہ سے وابستہ آگ کی پوجا اور مُردوں کو جلانے کا رواج آج تک چلا آتا ہے۔ اس کے بعد کے زمانہ میں تصوف اور فلسفہ اپنا رنگ جماتے ہیں جن کا ماخذ رگوید کے مضامین ہی ہیں۔ تصوف تھوڑا بہت جذباتی عقاید کو لئے ہوئے دنیا کو ایک ایسا کارخانہ رمز سمجھتا ہے جو شخصی خدا کی ذات سے متعلق ہے۔ لیکن فلسفہ فطری اور جذباتی رنگ چھوڑ کر قدیم رگویدی عبارت اور مضمون کو دماغ سے متعلق کر دیتا ہے اور اُس کی تشریح اور تاویل کو منطق کے حوالہ کر دیتا ہے جس کے نتیجہ میں شخصی خدائی غائب ہو جاتی ہے۔ جو چند نظمیں اسوقت زیر بحث ہیں اور جن کا ترجمہ آیندہ صفحات پر درج کیا گیا ہے رمز و کنایہ کا پہلو لئے ہوئے ہیں اور تمام قرائن کے اعتبار سے اگنی اور آفتاب سے ہی متعلق پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ نظمیں اُس زمانہ سے متعلق نہیں سمجھی جاتیں جب رگوید کی دیگر نظمیں، دیوتاؤں کی ثنا وصفت میں تصنیف یا مرتب کی گئیں بلکہ اُس زمانہ کی خیال کی جاتی ہیں جب فاتح اقوام گنگا کے میدانوں میں آکر آباد ہو چکی تھیں اور ویدی جذباتی شاعری ختم ہو چکی تھی تاہم اگنی اور سُوریہ کے متعلق سابق کے عقیدے برنگ وحدانیت بدستور قایم اور جاری تھے جن کو اُسوقت کی مرغوب شکل معمائی میں بیان کیا گیا۔ حال کے زمانہ میں ایک فرقہ نے فلسفہ کا پہلو اختیار کیا ہے اور انھیں چند نظموں کی بنیاد پر مادہ کو قدیم مانکر اور خالق کی ذات کو اسی میں مشتمل قرار دیکر خالق کی تعریف یوں کی ہے کہ جس طرح پر کوئی کاریگر کسی کچے سامان سے کوئی چیز تیار کرتا ہے اُسی طور پر وہ جس کو خالق کہا جاتا ہے مادہ سے کائنات کی پیدایش کرتا ہے۔ گویا کوئی شخصی صاحب اختیار خدا نہیں (ملاحظہ ہو کتاب The Fountain Head of Religion) باوجود ایں ہمہ اُن کے یہاں آگ کی پرستش آفتاب کی عظمت کے ساتھ عملاً اُسی قدیم طریقہ پر اب بھی جاری ہے گویا اُس کی تاویل دیگر طریق پر کی جاتی ہے۔

اس تاویل کا بھی ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے۔ اولین نظریہ سب سے مقدم اور پہلا اصول یہ قرار دیا گیا ہے کہ رگوید کے الفاظ۔ عبارت اور مضمون کے معنی سمجھنے کے لئے قدیم روایت ورواج۔ تاریخ (History)۔ غیر ہندی ہم عصر آریہ فرقوں کے مثلاً ایرانیوں کی لٹریچر اور زبانوں کو قطعی طور پر نظر انداز کر دینا چاہئے۔ (ملاحظہ ہو کتاب Terminology of Vedas مصنفہ پنڈت گرودت) دوسرا نظریہ یہ قایم کیا گیا ہے کہ رگوید کے الفاظ خواہ وہ کسی کا نام ہوں یا نہ ہوں معنی دار ہیں۔ یعنی الفاظ مذکور کے معنی اُن کی اصل یا مادے سے وابستہ ہیں اور اُسی اعتبار سے اُن کے معنی سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً لفظ دیوتا کے معنی اُس اصل کے معنی کے لحاظ سے سمجھنا چاہئے

جس سے وہ مشتق ہے۔ اس طور سے اُس کے معنی کبھی خدا کے ہوں گے، کبھی کسی روشن چیز کے ہوں گے۔ کہیں وہ روشن ضمیر کے معنی دے گا اور کہیں نیک اور بھلے آدمی کا مترادف ہوگا۔ عملاً اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر دیوتا کا نام یا لقب جس کا ذکر رگوید میں کیا گیا ہے حسب ضرورت خدا کا یا کسی شخص کا نام ہو سکتا ہے یا متعدد معنی رکھنے والا معمولی لفظ رہ جاتا ہے۔ اسی طرح دیگر معمولی الفاظ کے معنی بدلے جا سکتے ہیں۔ اس نظریے کے تحت وہ ساری کتب ہائے لغت و تفاسیر و روایات و عقاید مسترد ہو جاتی ہیں جن پر سناتن دھرم یا ہندو مذہب کی دوسری شاخیں مبنی ہیں۔ گائے بیل۔ گھوڑے اور بکری کی قربانیاں۔ سوم کی شراب۔ گوشت خوری وغیرہ یہ سب کالعدم ہو جاتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو کتاب Terminology of the Vedas مصنفہ پنڈت گرودت اور ستیہ پرکاش مصنفہ پنڈت دیانند سرسوتی)۔ تیسرا نظریہ اس مفہوم کے ساتھ قایم کیا گیا ہے کہ رگوید کے تخیل کو اس طور سے نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ارتقائی سلسلہ یا ترقی کی کوئی ابتدائی منزل ہے بلکہ یوں خیال کرنا چاہیے کہ رگوید کے بھجنوں کے مصنفین کا دماغ انتہائے کمال کو پہونچا ہوا تھا اور حکمت نظری اور سائنٹفک معلومات پر اُس حد تک حاوی تھا جہاں تک ابھی دنیا نہیں پہونچی ہے۔ چنانچہ Terminology of the Vedas میں بعض منتروں کے متعلق جو بحث کی گئی ہے اُس میں تشریح اس طور پر کی گئی ہے گویا آجکل کا کوئی سائنس داں آنسٹین کے نظریۂ اضافیت (Theory of Relativity) یا ایٹومک انرجی (Atomic Energy) پر تقریر کر رہا ہے۔ چوتھا اُصول یہ قایم کیا گیا ہے کہ کارخانۂ عالم کو علم اور منطق کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ دل کا احساس۔ تصوف (occultism) اور روحانیت (spirituality) کوئی چیز نہیں یعنی سچا مذہب وہی ہے جس طرف علم اور منطق لیجائے اور مولانا رومی کا یہ قول کہ "پائے استدلالیاں چوبیں بود" محض غلط ہے۔

بیرونی مسائلِ توحید اور مغربی خیالات سے متاثر ہو کر رگ وید کے بھجنوں کی اور بھی تاویلیں کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ قدرت کے مظاہر کے پردے میں قدیم آریہ قومیں در اصل اُس قوت کی پرستش کرتی تھیں جو کارخانۂ قدرت میں پنہاں طور پر کار فرما ہے (ملاحظہ ہو رگوید مترجمہ من مہتہ ناتھ دت) یا یہ کہ اندر۔ اگنی۔ برہما وغیرہ اشخاص کے نام تھے جن کو رگوید وغیرہ میں قومی بزرگوں کی حیثیت سے سراہا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ہندو ہسٹری مصنفہ مزدار)۔

(باقی)

ا - ح

زیر طبع

من و یزداں
حضرت نیاز کے مذہبی مقالات

مطالعاتِ نیاز
تاریخی وعلمی مقالات کا مجموعہ

اُردو غزل گوئی میں انشاؔ کا اجتہاد

اور

اس کا مخصوص رنگ

کیا انشاؔ کا کوئی خاص رنگ بھی ہے ؟ اُردو غزل گوئی میں انھوں نے کوئی نیا طرز ایجاد کیا ہے ؟ ان سوالات کی جتنی اہمیت ہے اتنا ہی ان کا جواب مشکل ہے مگر کلیات انشاؔ کے شروع ہی میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے :-

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا　　کہ پڑا ہے آج خم میں قدحِ شراب اُلٹا

انشاؔ سے پہلے یہ رنگ اُردو غزل گوئی میں مفقود تھا، بعضوں کا خیال ہے کہ انشاؔ کا یہ رنگ تغزل کے منافی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بڑی حد تک صحیح ہے کہ بڑے شاعر کا اسلوب بجائے خود ایک اصول ہوتا ہے اگر غزلگوئی رعنائی خیال، طرفگیِ بیان اور موضوع کی جدت و لطافت پر منحصر ہے تو انشاؔ کی یہ غزل یا اس قسم کی دیگر غزلیات کسی طرح نظرانداز نہیں کی جاسکتیں، زیرِ نظر غزل یہ ہے :-

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا　　کہ پڑا ہے آج خم میں قدحِ شراب اُلٹا
عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے　　کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا
چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے ایک صنم کے عاشق　　نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب اُلٹا
یہ شبِ گزشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا　　کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب اُلٹا
ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بھر کے نعرے　　جو زمیں پہ پھینک مارے قدحِ شراب اُلٹا
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں　　وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا
جھوٹے وعدہ پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور　　اے لو اور بھی تماشا یہ سنو جواب اُلٹا
کھڑے چپ ہو دیکھتے کیا مرے دل اُجڑ گئے کو　　وہ گنہ تو کہہ دو جس سے یہ وہ خراب اُلٹا

غزل اور قافیوں میں نہ کہی سو کیونکر انشاؔ،
کہ ہوا نے خود بخود آ ورق کتاب اُلٹا

مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام اُلٹا
تو کیا بہک کے میں نے اسے اک سلام اُلٹا

سحر ایک ماش پینے کا مجھے جو دکھایا کے اُن نے
تو اشارا میں نے تاڑا کہ ہے لفظ شام اُلٹا

یہ بلا دھواں نشہ ہے مجھے اس گھڑی تو ساقی
کہ نظر پڑے ہے سارا در و صحن و بام اُلٹا

بڑھوں اس گلے سے کیونکر کہ وہاں تو میرے دل کو
کوئی کھینچتا ہے ایسا کہ پڑے ہے گام اُلٹا

در میکدہ سے آئے جھک ایسے ہی مزے کی
کہ پچھاڑ کھا گرا وہاں دل تشنہ کام اُلٹا

نہیں اب جو دیتے بوسہ تو سلام کیوں لیا تھا
مجھے آپ پھیر دیجے وہ میرا سلام اُلٹا

لگے کہنے آپ تابع تجھے ہم کریں گے
کہیں ان کے گھر سے بڑھ کر جو پھرا غلام اُلٹا

مجھے کیوں نہ مار ڈالے تری زلف اُلٹ کے کافر
کہ سکھا رکھا ہے تو نے اسے لفظ رام اُلٹا

نرے سیدھے سادے ہم تو بھلے آدمی ہیں یارو
ہمیں کج جو سمجھے سو خود ولدالحرام اُلٹا

تو جو باتوں میں رکے گا تو یہ جانوں گا کہ سمجھا
مری جان و دل کے مالک نے مرا کلام اُلٹا

فقط اس لفافے پر ہی کہ خط آشنا کو پہونچے
تو لکھا ہے اس نے انشاؔ یہ ترا ہی نام اُلٹا

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ آگے بڑھ کر انشاء کا یہ خوشگوار رنگ خود انھیں کے ہاتھوں بگڑ گیا اس لئے کہ انھوں نے اس کو جزئیات کا شکار کر دیا اس کے علاوہ مزید بے اعتدالی یہ کی کہ خارجی اشیاء مثلاً "چوڑی" "ازار بند" وغیرہ کو شاعری میں جگہ دیکر لکھنویت کی بے اعتدالیوں کا شکار ہو گئے اور یہی وہ مقام ہے جہاں میاں بیتاب کا فقرہ "انشاء کی شاعری کو دربار کی مصاحبت نے ڈبو دیا" بار بار یاد آجاتا ہے، کاش انشاء کی غزل گوئی اس حادثہ کا شکار نہ ہوئی ہوتی اور انھوں نے اپنے اس مخصوص رنگ کو ذرا سلیقہ سے نبایا ہوتا تو آج وہ ایک بڑے پایہ کے صاحب طرز مانے جاتے کیونکہ نئی راہ پیدا کرنے میں وہ ضرور کامیاب ہوئے افسوس یہ ہے کہ منزل تک پہونچتے پہونچتے گمراہ ہو گئے۔

اس کے علاوہ انشاءؔ کی ایک اور اُپج بھی قابل غور ہے غزل جیسی نازک صنف سخن میں ہجو کو نباہنا انشاءؔ ہی کا حصہ تھا اور اس کا یہ وہ کمال تھا جو دوسرے کسی شاعر کے بس کی بات نہ تھی چنانچہ یہ فن اسی نے آغاز کیا اور اسی پر ختم بھی ہو گیا۔

مسلسل غزل لکھنے میں بھی انشاءؔ کو کمال کا درجہ حاصل تھا اگرچہ جرأتؔ بھی اس ضمن میں انشاءؔ سے پیچھے نہیں معلوم ہوتے لیکن انشاءؔ کی مسلسل غزلوں میں جو تسلسل اور روانی پائی جاتی ہے اس کی مثال مشکل ہی سے جرأتؔ کے ہاں مل سکے گی۔

غزل گوئی میں انشاءؔ کا مصحفی سے موازنہ

یہ دونوں ہمعصر تھے اور ایک ہی دربار میں آکر شریک ہو گئے تھے دونوں کے مقامات شاعری مختلف ہیں انشاءؔ میں تخیل کچھ بہت

زیادہ بلند نہیں معلوم ہوتی۔ نہ اس میں کوئی گہرائی یا غیر معمولی وزن ہے لیکن ان کی تخئیل حد درجہ متنوع اور اس کی پرواز ہمہ جہت ہے ان کی علامات شاعری (Symbolism) قدیم اسکول کی ہیں اور اُس زمانہ میں ان سے مفر بھی نہ تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ان کے استعمال میں جدت سے کام لیا ہے اور بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انشاء نے ان میں ایک نئی روح پیدا کر دی ہے جس سے سامع کے ذہن و دماغ میں ایک طرح کی بشاشت اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ بشاشت اور تازگی دیرپا نہیں رہتی۔ انشاء کا کمال پیچ اور نئی راہ پیدا کر کے اس پر چلنے میں ہے اور مصحفی کا کمال ان کی رفتار کی روانی و ہمواری میں ہے انشاء کے کلام میں آمد ہے یہ آمد خوشگوار ہے لیکن سطحی مصحفی کے کلام میں آورد ہے لیکن اس میں قدما کا وزن اور ٹھہراؤ ہے وہ کسی رنگ اور کسی زمین میں بند نہیں۔ انشاء کے کلام میں ایک نئی اسلوب کی غزل گوئی کا اگر امکان پایا جاتا ہے تو مصحفی بقول آزاد، میر اور سودا کا آخری ہمزبان ہے۔ آزاد کی تنقید مصحفی کے بارے میں بالکل صحیح ہے کہ ان کا کوئی خاص رنگ نہیں تھا، غزلوں میں سب طرح کے شعر ہوتے تھے۔" اسی طرح مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے بھی ان کے متعلق کہا ہے:- "مصحفی ہیں تو مشہور لیکن ان کے کلام میں کوئی انفرادیت نہیں ہے" دراصل مصحفی کو ہر شاعر کے رنگ میں شعر کہنے میں کمال حاصل تھا چنانچہ ان کی بعض غزلوں پر سودا کی غزلوں کا گمان ہوتا ہے تو بعض پر میر کی کچھ پر درد کی غزلوں کا دھوکا ہوتا ہے تو کچھ پر سوز کی، کہیں جرأت سے جا ملتے ہیں تو کہیں انشاء سے دست و گریباں۔ اس سلسلہ میں کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ میر کا شعر ہے:

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں،
کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

مصحفی فرماتے ہیں:

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

میر کا ایک اور شعر ہے:

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

مصحفی نے اسی مضمون کو چار مصرعوں میں ادا کیا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ وہ بات نہ پیدا ہو سکی جو میر کے دو مصرعوں میں ہے۔ مصحفی کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

حادثے ہوتے ہیں زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا

مصحفی آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

میر کا ایک اور شعر ہے:

ابھی ہوں منتظر جاتی ہے چشم شوق ہر جانب
بلند اس تیغ کو ہونے تو دو سر بھی جھکا دوں گا،

مصحفی کہتے ہیں :

کھینچ کر تیغ یار آیا ہے، / اس گھڑی سر جھکا دئے ہی بنی

سودا کے رنگ میں مصحفی کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

اے مصحفی بہار کے دن ہیں یہ بے نصیب / چل تو بھی باغ میں گل و شبنم کی سیر کر
شمع شب فراق بنے ہم تو مصحفی، / ہم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر
بھلا تمیز تو کر بوئے تنک و گیسو میں، / رہی ہے باد صبا تو بھی تو ختن میں دیر
کب کا اک عمر سے جھگڑا ہے دل و جان کے بیچ / کام دونوں کا کیا یار نے اک آن کے بیچ
نہ تنہا مصحفی ہی اسکے ہاتھوں سے ہو آوارہ / کوئی بھی چین سے یارو نہ زیر آسماں بیٹھا

جرأت فرماتے ہیں :-

دیکھا تو یوں وہ کہہ کے لگے منہ کو ڈھانپنے / کمبخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے

اس واردات کو مصحفی اس طرح بیان کرتے ہیں ؛

میں اس انداز کے صدقے کہ جو کی مجھ پہ نظر / دیکھتے ہی مجھے ان نے نظر انداز کیا

جرأت کا شعر ہے :

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے / کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

مصحفی اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں :

ہمسائگی پہ یار کی کیا دل کو خوش کروں، / مجھ سے تو ہے کھنچا وہ حیادار بے طرح

جرأت معشوق سے کہتے ہیں ؛

اس ڈھب سے کیا کیجئے ملاقات کہیں اور / دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور

مصحفی کی شکایت بھی ملاحظہ فرمایئے :

غیروں سے میاں تیری ملاقات نہیں خوب / کچھ عقل کے نزدیک تو یہ بات نہیں خوب
یوں آنکھیں ملا جس سے کہ چاہے تو و لیکن / آگے مرے ہر ایک سے اشارات نہیں خوب

انشاء اور مصحفی کے موازنہ کے سلسلہ میں میں نے جو مصحفی کے کلام کا دیگر شعراء کے کلام سے مقابلہ کیا ہے وہ بیکار نہیں ہے در اصل ایسا کرنے کی غایت یہ تھی کہ میں آپ کو مصحفی کی طبعی اُفتاد اور اس کے نتیجہ سے آگاہ کر سکوں اور غالباً یہ ثابت ہو گیا کہ مصحفی کا کوئی انفرادی رنگ نہیں اس لئے مصحفی کے پاس کوئی ایسا طرز نہیں تھا جس میں چھپنے کے لئے انشاء ان کی تقلید کی کوشش کرتے البتہ انشاء کا اپنا مخصوص رنگ تھا اُس زمانہ میں اپنے زور اور بانکپن

کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا چنانچہ مصحفی نے اس رنگ میں بھی کہنے کی کوشش کی لیکن یہاں بھی وہ کچھ زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے۔ انشاء اور مصحفی کی ہم طرح و ہم زمین غزلیات کے چیدہ چیدہ اشعار پیش ہیں:

انشاء کہتے ہیں:

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا ۔۔۔ کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب اُلٹا

مصحفی کہتے ہیں:-

جو پھرا کے اس نے منہ کو بھنا نقاب اُلٹا ۔۔۔ ادھر آسمان اُلٹا ادھر آفتاب اُلٹا

مصحفی کا شعر اچھا ہے اور برجستہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس قافیہ کو انشاء اپنے شعر میں جیسا باندھ گئے وہ بے مثل ہے اسی غزل میں انشاء کہتے ہیں اور کیا ہی برجستہ کہتے ہیں:

عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے ۔۔۔ کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا

مصحفی نے اس مضمون کو چار مصرعوں میں ادا کیا ہے لیکن پھر بھی وہ بات پیدا نہیں ہو سکی جو انشاء کے شعر میں ہے۔

بہ سوال بوسہ اُس نے مجھے رک کے دی جو گالی ۔۔۔ میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب اُلٹا

میں لکھا ہے خط تو قاصد یہ یہ ہو گا مجھ یہ احساں ۔۔۔ انھیں پاؤں پھر کے آ تو جو ملے جواب اُلٹا

انشاء کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے:

ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بھر کے نعرہ ۔۔۔ جو زمیں یہ پھینک مارے قدح شراب اُلٹا

یہ شعر بھی انشاء کے شعر کو نہیں پہونچتا۔

ایک دوسری ہم طرح غزل میں دونوں کے اشعار دیکھئے۔

مصحفی فرماتے ہیں:

پیری سے ہو گیا یوں اس دل کا داغ ٹھنڈا ۔۔۔ جس طرح صبح ہوتے کر دیں چراغ ٹھنڈا

انشاء کا ارشاد ہے:

شفقت سے ہاتھ تو دھر تک دل یہ میرے تا ہو ۔۔۔ یہ آگ سا دہکتا سینہ کا داغ ٹھنڈا

مصحفی کا شعر ہے:

سرگرم سیر گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا ۔۔۔ نزلہ سے ہو رہا ہے آپ ہی دماغ ٹھنڈا

اس کے مقابلہ میں انشاء کا شعر ہے:

۔۔ کی صراحی ایسی لا برف میں لگا کر ۔۔۔ جس کے دھوئیں سے ہووے ساقی دماغ ٹھنڈا

مندرجۂ بالا اشعار میں انشاء کا پلہ مصحفی سے بھاری ہے۔ اس کے علاوہ مصحفی کے کلام میں وہ البیلی چال او

تیکھا پن بھی مفقود ہے جو انشاؔء کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

تاہم مصحفیؔ کو ایک ماہر فن ماننے میں کوئی شبہ نہیں اپنے عہد کی شاعری کے لوازم کی تہذیب میں وہ اُردو شاعری کے مسلم اساتذہ میں سے ہیں اور اس اعتبار سے انشاؔء سے یقیناً برتر ہیں۔

مصحفیؔ کے کلام میں کہیں کوئی چیز ہمیں ایسی نہیں ملے گی جو اس وقت کی زبان محاورہ یا اُصول شاعری کے خلاف ہو۔ برخلاف اس کے انشاؔء کے کلام میں اس قسم کی لغزشیں اکثر ملیں گی۔

انشاؔء پیدائشی شاعر تھا اس کی جودت طبع اُصول و قواعد کی پابند نہ تھی۔ اُصول و قواعد ہی نہیں بلکہ رسوم و روایات شاعر اور شاعری دونوں کو متوازی سطح پر رکھتی ہیں اور فکر و قلم کو منہ زور یا بدلگام ہونے سے روکتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ فطرت کو صناعت کا پابند رکھا گیا ہے۔ آرٹ یا صناعت وہ ملکہ یا وسیلہ ہے جس سے انسان فطرت کی تعبیر ہی نہیں کرتا بلکہ اس کو گوارا بناتا ہے۔ برخلاف اس کے مصحفیؔ طبعاً شاعر نہیں پیدا ہوئے تھے وہ شخص پہلے تھے شاعر بعد میں انھوں نے شاعری کا اکتساب کیا اور اسے ایک ہنر کی طرح برتا اور سنوارا۔ انھوں نے اپنے قیام دہلی کے زمانہ میں زبان میں کامل مہارت حاصل کی اور ادب و شاعری کے تمام نکات کو سمجھنے کے بعد انھوں نے اس طرف توجہ کی یہی سبب ہے کہ باعتبار فن ان کی شاعری میں کوئی خامی نہیں ہے۔

نتیجہ کے اعتبار سے یہ بات شاعری کے لئے کچھ بہت زیادہ مفید ثابت نہ ہوئی چنانچہ مصحفیؔ کے زمانہ ہی میں اور پھر ان کے بعد کے زمانہ میں مضمون کے مقابلہ میں الفاظ پر زور دیا جانے لگا۔ اور شاعری کی ظاہری در و بست پر ساری قوت صرف ہونے لگی چنانچہ مصحفیؔ کا کلام چونکہ فنی و لسانی حیثیت سے اعلیٰ پایہ کا تھا۔ اس لئے مصحفیؔ کی اُستادی کا سکّہ اس زمانہ کے تذکرہ نگاروں اور دوسرے لوگوں کی نظر میں بیٹھ گیا۔ برخلاف اس کے انشاؔء کے کلام میں چونکہ ایک طرح کا فطری نکھار اور اُبھار تھا اس لئے مزا تو سب نے اُٹھایا مگر ان کو اُستاد کسی نے نہیں مانا۔ اس لئے کہ باعتبار زبان اور فن ان کا کلام مصحفیؔ کے پایہ کا نہیں تھا۔

لیکن اب زمانہ مختلف ہے چونکہ موجودہ نسل شاعری کے فنی اور لسانی حد بندیوں کی قایل نہیں ہے اور تخیل اور جذبے کی ہر طرح کی کارفرمائی کو پسند کرتی ہے۔ اس لئے انشاؔء کا انداز روز بروز ہر دلعزیز ہوتا جائے گا اور مصحفیؔ کی شاعری کی وقعت و اہمیت نسبتاً کم ہوتی جائے گی۔

رحمت نبی خاں ایم۔ اے (علیگ)

نیاز فتحپوری کے قلم سے

تین جدید مطبوعات

مختارات نیاز افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے

جھانسی کی رانی (ڈرامہ) ۶/۸

اصحاب کہف (ڈرامہ) ۱۲/

مذہبی عقاید اور سائنس

جب سے ڈاروِن نے اپنا "نظریۂ ارتقاء" پیش کیا ہے، مذاہب کے اُصولی عقاید کی طرف سے لوگوں کا یقین اُٹھتا جاتا ہے کیونکہ اب عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان از خود وجود میں نہیں آیا بلکہ نتیجہ ہے جرثومۂ حیات کی تدریجی ترقی کا اسی کے ساتھ روح کے وجود سے بھی انکار کیا جاتا ہے اور اس بات سے بھی کہ وہ نیک و بد کے اختیار کرنے میں آزاد نہیں ہے۔ الغرض مشککین اور علماءِ سائنس نے مذہب پر جو کاری ضرب لگائی ہے اس سے انکار ممکن نہیں، لیکن اب انھیں علمائے سائنس کے ایک فرد نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مذہب کے تمام قدیم عقاید حرف بحرف صحیح ہیں۔ عصر حاضر کے اس پیغمبر کا نام (Dr, Lecomte du Noüy) ہے۔ یہ عالم حیاتیات کا ماہر ہے اور راکفلر انسٹیٹیوٹ اور پاسچر انسٹیٹیوٹ سے وابستہ رہا ہے۔ اُس نے اپنی اہم کتاب "تقدیر انسانی" میں ارتقاء کا ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے اور عقل و علم دونوں سے خدا، اور اس کی ابدیت، انسان اور اسکی مابعد الطبیعاتی اہمیت کو بالکل قدیم مذہبی عقاید کی طرح ثابت کرنا چاہتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ سائنس ناقص چیز ہے اور ہم آنکھ بند کر کے اس پہ بھروسہ نہیں کر سکتے، کیونکہ ہمیں موجوداتِ عالم کی کسی شئے کا پورا علم حاصل نہیں ہو سکتا اور ہمارے ذرایع احساس و ادراک اور علمی آلات بالکل ناقص ہیں۔

مثلاً آٹے اور کاجل کو ملا کر جب ہم دیکھتے ہیں تو سرمئی رنگ کا سفوف نظر آتا ہے لیکن اُسی سفوف میں جو متحرک خوردبینی کیڑے پائے جاتے ہیں ان کو سیاہ و سفید ذرات علٰحدہ علٰحدہ نظر آتے ہیں اور ان کے ادراک کے لحاظ سے سرمئی رنگ کے سفوف کا کوئی وجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی بے پایانی میں ہمارا معیار حقیقت شناس محض نسبتی چیز ہے نہ کہ واقعی اور اس لئے ہمارا یہ سمجھنا کہ ہم اس کی حقیقت تک پہونچ سکے ہیں بالکل بے معنی سی بات ہے۔

ہم ایک ایسے کرہ پر آباد ہیں جو دو ارب سال پُرانا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے اسٹیج پر اتنے طویل زمانہ میں ارتقاء کا ڈرامہ کھیلا گیا لیکن اب تک ہم اس اسٹیج کے بے شمار پردوں میں سے دو چار سے زیادہ نہیں اُٹھا سکے ہیں یہاں تک کہ ابھی یہ سوال حل نہیں ہوا کہ زندگی کا آغاز کیسے ہوا اور ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے جانداروں کا وجود کیونکر عمل میں آیا جن میں ہم آپ سب شامل ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ارتقاء کی تاریخ سلسلہ ہے بہت سے نہ سمجھ میں آنے والا رازوں کا - اُسنے ہر قدم سائنس کے قایم کئے ہوئے ٹھوس قوانین کے خلاف اُٹھایا اور اس کا ہر اقدام نیچی سطح سے بلند تر سطح کی طرف ہوا۔

مثلاً ایک زمانہ وہ آیا جب زندگی نے اپنے فعل و انفعال کا رُخ بدلا، یعنی پروٹو پلازم کے خلایا ایکدوسرے سے جُڑتے، پھٹنے اور ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہنے کے بعد دفعتاً ایک عجیب و غریب طریقے سے انھوں نے اپنے بقاء کے طریقہ کو بدل دیا اور جنسی طریقہ سے عمل تخلیق جاری ہوگیا۔

اس ماہر حیاتیات نے بار بار اشارہ کیا ہے کہ انجیل کے "باب پیدائش" میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اُصول ارتقاء سے بڑی مطابقت رکھتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کا لکھنے والا وجدانی طور پر اس سے باخبر تھا کہ خدا نے حیات کا عظیم الشان لائحۂ عمل کس نہج پر مرتب کیا تھا۔

ارتقاء کے پانچ بنیادی اُصول ناقابل انکار ہیں (۱) نہایت سادہ طور پر زندگی کا آغاز ہونا (۲) آہستہ آہستہ زیادہ پیچیدہ صورتوں میں زندگی کا نمودار ہونا (۳) ایک طویل مدت کے بعد مادۂ حیات کے فعل و انفعال سے انسان کا وجود میں آنا (۴) انسان کے دل میں مجرد "خیال" کی اہلیت پیدا ہونا (۵) دنیا کے مختلف حصّوں میں اخلاقی اور روحانی خیالات و تصورات کا پیدا ہونا - ان پانچوں اُصولوں میں سے کسی ایک کی بھی توضیح سائنس کے نقطۂ نظر سے نہیں کی جاسکتی اور ایسی حالت میں اس ذہنی خلا کو پُر کرنے کے لئے ایک اُصول متعین کرنا ضروری ہوگا Einstein نے اپنا "نظریۂ اضافیت" ثابت کرنے کے لئے متعدد ناقابل ثبوت مفروضات سے کام لیا تھا لیکن انھیں کی بدولت آج ہم "جوہر فردہ" کی قوت سے کام لے رہے ہیں۔ اسی طرح De Nouy نے بھی ایک مفروضہ قایم کرلیا ہے کہ زندگی کا آغاز اور پھر اس کا رفتہ رفتہ ترقی کرکے وجود انسان کی منزل تک پہونچ جانا اتفاقی امر نہیں ہوسکتا، یقیناً اس کے پس پشت کوئی اخلاقی مقصود کام کر رہا تھا - عرصہ سے مادیین ہمیں یہ بتاتے چلے آئے ہیں کہ تمام فانی اشیاء پر محض "اتفاق" کی حکومت ہے، لیکن De Nouy اس کی تردید اس دلیل سے کرتا ہے کہ "آدمی کو اس بات کا پورا اختیار ہے کہ یا وہ جبلتِ حیوانی کی پیروی کرے جس سے اُسے جسمانی لطف حاصل ہوتا ہے یا کوئی دوسری راہ ڈھونڈھ نکالے اور آخر الذکر طریق سے منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے اُسے اپنے بہیمی جذبات سے لڑنا ہوتا ہے اور گو اس سے تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن باوجود اس کے کچھ لوگ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں اور یہ قوت انتخاب صرف انسان کے لئے مخصوص ہے۔

لوگ عموماً اول الذکر طریقہ اختیار کرتے ہیں - دوسری راہ اختیار کرنے والے چند ہی نفوس ہوتے ہیں، لیکن انہی چند نفوس نے ارتقاء میں بڑا حصّہ لیا ہے اور اسی اقلیت نے "علت غائی" کے وجود کو تسلیم کرکے دُنیا کی رہنمائی کی ہے اور اُس کو آگے بڑھایا ہے۔

پہاڑ کی چوٹیوں کی برف پگھل کر چشمہ کی شکل میں نکلتی ہے اور پھر یہی چشمے بڑے بڑے دریاؤں کی شکل میں بہتے ہوئے سمندر میں مل جاتے ہیں۔ وہ قانون کشش کی بنا پر نشیب کی طرف بہتے ہیں لیکن چشمۂ حیات راہ ارتقاء میں کبھی نیچے نہیں بہتا بلکہ اوپر کی طرف جاتا ہے ابتداء آفرینش سے تا ایں دم زندگی کا یہ دریا اوپر ہی چڑھ رہا ہے جس کی ابتدا بے شکل مادہ سے ہوئی اور انتہا غور و فکر کرنے والے اور "ضمیر" سے متصف انسان پر۔

کیا مروجہ سائنس، ارتقاء کے ان رازوں سے بے بہرہ رہی ہے؟ کبھی نہیں! زندگی کے صعود مسلسل میں "اتفاقات و توارث" کے ٹھوس قوانین کی وقتاً فوقتاً تضحیک کی گئی ہے اور آخر کار مادیین کو بھی کسی نامعلوم سبب کا وجود تسلیم کرنا پڑا ہے۔ لیکن اس "سبب نامعلوم" سے بحث کرنے کے لئے مادیین کو اس کا نام رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے تو تصور خدا سے نفرت کرنے کی بنا پر وہ اسے "سبب شکن" کے نام سے پکارتے ہیں۔ حالانکہ بات ایک ہی ہے خواہ اسکا نام خدا رکھو یا "سبب شکن"۔ انسان میں غور و فکر کا مادہ پیدا ہونے سے قبل لاکھوں سال تک یہی سمجھا گیا کہ زندگی صرف ایک قانون کی پابند تھی جس کا منشا بقائے حیات تھا، لیکن اس کے بعد چند ایسی ہستیاں بھی ظہور میں آئیں جن کا منشا کچھ اور تھا۔ وہ بھلے اور برے میں تمیز کر سکتے تھے اور بسا اوقات اس کے لئے انھیں جان کی بازی لگانے میں بھی دریغ نہ ہوتا تھا۔ پھر ایسا کیوں ہوا؟ محض اس لئے کہ کسی اور قوت کی آواز نے روح انسانی کو یہ کہہ کر جگا دیا:۔

"اب تک تمہارا کام صرف کھانا پینا اور بقائے نسل تھا۔ تم رزق مار کر بھی حاصل کر سکتے تھے اور چوری کر کے بھی۔ تم کسی کو اپنا شریک حیات بنانے کے لئے بھی چوری کر سکتے تھے اور اطمینان کی نیند سو سکتے تھے، اس طرح تم اپنے بہیمی جذبات کو آسودہ کر سکتے تھے لیکن آج سے تم کو انھیں بہیمی جذبات سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ تم کسی کو جان سے نہیں مارو گے تم کو چوری سے احتراز کرنا ہوگا اور طمع کو چھوڑ دینا پڑے گا۔ تم اطمینان کی نیند اسی وقت سو سکو گے جب تم اپنے نفس کو اپنا تابع کر لو گے۔ اپنے نصب العین کی حمایت کے لئے تم کو تکلیفیں برداشت کرنے اور جان دیدینے کے لئے طیار ہو جانا چاہئے۔ اب تمہاری زندگی کا یہ مقصود نہ ہونا چاہئے کہ کھاؤ پیو اور زندہ رہو۔ نیک کاموں کے لئے تم بھوک کی برداشت کرو گے اور جان پر کھیل جاؤ گے۔ شریف بنو کیونکہ اُس جذبۂ نو کا یہی تقاضہ ہے جو تم میں پیدا ہو گیا ہے۔ تمھیں اس جذبہ کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ تمہارے بہیمی جذبات کو کچلتا ہے"۔

انسان ارتقا کی آخری کڑی نہیں ہے بلکہ جذبات حیوانی سے مملو ماضی اور روحانیت سے پُر مستقبل کی ایک درمیانی منزل ہے اور اب ہماری ترقیاں مادی نہیں ہوں گی بلکہ روحانی۔ مستقبل کا انسان تباہ کن خواہشات نفسانی خود غرضی، حرص و طمع وغیرہ سے پاک ہو جائے گا اور اُس میں حصول قوت کی خواہش مٹ جائے گی۔ گو وہ جسمانی لطف اٹھائے گا لیکن جسم کا غلام نہ ہوگا۔ وہ گوشت پوست کے جسم کی قیود سے آزاد ہو جائے گا۔ اس میں شک نہیں مستقبل کے ارتقاء کا ساتھ دینے والے دنیا کے نیک ہی بندے ہوں گے لیکن نیکی اور بدی کیا ہے۔ گو مادیین ان کا وجود تسلیم

نہیں کرتے لیکن De Nuoy ان کی صحیح تعریف متعین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "دورِ ارتقاء میں دو قسم کے جاندار رہے ہیں جن کو ہم بُرا یا بھلا کہہ سکتے ہیں یعنی ایک وہ جو دنیا کو آگے لے گئے اور دوسرا وہ جس نے اپنے "ابن الوقت" ہونے کا ثبوت دیا لیکن اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ نہ نکلا کہ وہ ٹھہر کر رہ گئے اور انھیں متضاد اغراض کی جنگ میں De Nuoy حق و باطل کا فرق ڈھونڈ نکالتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ "ارتقاء بے ثبات حالات سے جاری ہے اور اُس وقت تک جاری رہیگا جب تک حالات کی بے ثباتی قایم رہے گی۔ اگر حالات ٹھہر کر رہ جائیں تو وہ اُن سے سر ٹکرا کر ختم ہو جائے"

اصل چیز جس کی ضرورت تھی وہ وقوع میں آچکی ہے۔ انسان اپنا اُصول بدل چکا ہے۔ ایک وقت تھا جب وہ قوانینِ فطرت کا پابند تھا۔ اب وہ خود غور کر سکتا ہے۔ اس کے پیشرو غیر ذمہ دار اداکار تھے ایک ایسے کھیل کے جسے وہ نہیں سمجھتے تھے اب انسان اُسی کھیل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اپنی تکمیل کی صلاحیت اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ جمالِ مطلق کا احساس اُسے ہو چلا ہے اور جمالیات پر اس کی نگاہیں پڑنے لگی ہیں۔ آئے دن کی اختراعات سے گو وہ سبق حاصل کر رہا ہے، لیکن بے اطمینانی اور بے چینی کی لہر بھی اُس میں دوڑتی جاتی ہے۔

نوزائیدہ ضمیر کی آواز بیدہ پُرانے احکام کی جگہ نئے احکام کو دے رہا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں گو وہ گھوڑے کی طرح اپنے راستے پر دوڑا چلا جا رہا ہے لیکن پھر بھی وہ اُس سے اس بات میں مختلف ہے کہ باگیں خود اُس کے ہاتھ میں ہیں کیونکہ وہ بُری اور بھلی جو راہ چاہے اپنی مرضی سے اختیار کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ خود پر حکومت کرنا سیکھ رہا ہے اور اس کی تکمیل کے بعد وہ منزلِ مقصود پر پہونچ سکے گا اور یہیں پہونچکر ارتقاء بھی ٹھہر جائے گا۔

جب یہ بات ہماری سمجھ میں آجاتی ہے تو حق و باطل کا مسئلہ بھی طے ہو جاتا ہے کہ نیکی ذاتِ انسانی کی عزت ہے اور بُرائی اس کی توہین۔ — ارتقاء کا یہ ایک نہایت اہم نکتہ ہے کہ ترقی کرنے کے لئے انسان اپنی فطرت کی مخالفت کرے اسمیں قابلِ لحاظ چیز انسان کی انفرادی حیثیت ہے، نہ کہ اس کی نوعی یا جنسی حیثیت۔ — ہم کو اس بات کے لئے فکرمند نہ ہونا چاہئے کہ بھلے لوگ بہت کم ہیں، کیونکہ جس طرح ماضی میں، تھی گنتی کے نفوس نے ارتقاء میں مدد کی تھی اسی طرح اب بھی کریں گے۔ یہی گنتی کے لوگ آنے والی نسلوں کے پیشرو ہوں گے جو روحانی طور پر مکمل ہوں گی۔

کیا اس منزل تک پہونچنے کے لئے مزید دو ارب سال درکار ہوں گے؟ —— وہ کہتا ہے "اگر انسان اپنے دماغ سے کام لے تو یہ منزل بڑی جلد طے ہو سکتی ہے۔ جانور کے پر پیدا کرنے میں قدرت کو قرنہا قرن صرف کرنے پڑے لیکن انسان نے صرف تین نسلوں میں ہوا کو اپنے قابو میں کر لیا۔ ہم کو اپنے دماغ کا ممنون ہونا چاہئے جسکی بدولت ہمارے قوائے حاسّہ اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ اب ہم چھوٹی سی چھوٹی چیز کو بھی دیکھ سکتے ہیں اور ان چیزوں کو بھی جو

بعد ابعد پر واقع ہیں زمان و مکان ہمارے قابو میں آ گئے ہیں حتیٰ کہ نہ بُعد ہمارے لئے کوئی اہمیت رکھتا ہے اور نہ وقت جس کو ہم نے پابہ زنجیر کر لیا ہے۔

ان حالات میں ہماری ذمہ داریوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور ہم ایک ایسے دوراہے پر آنکلے ہیں جس کی ایک راہ ہم کو اسفل السافلین تک پہونچانے والی ہے اور دوسری ترقی کے بام عروج پر۔ بہت سے لوگ ہماری اختراعات کو تمدن و ثقافت اور تہذیب و حضارت کا ثمرہ سمجھتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا مطمح نظر تن آسانی کے ذرایع پیدا کرنا نہیں بلکہ تصفیۂ روح ہونا چاہیئے، جس کے بعد ہی ہم انسانیت کے لئے باعث فخر بن سکتے ہیں۔ جب تک ہماری عقل ضمیر کے تابع نہ ہوگی اُسوقت تک ہم بُرائی اور بھلائی میں صحیح صحیح امتیاز نہ کر سکیں گے۔ اور ضمیر کی طرف سے کان بہرے کرنے سے راہ ترقی میں ہمارے قدم بھاری پڑ جائیں گے، محض عقل مضرت رساں ہے جس کا ثبوت ہم کو اٹم بم کی ایجاد سے مل چکا ہے۔

بد قسمتی سے اب بھی بہت سے لوگوں کا یہی اعتقاد ہے کہ انسان محض ایک حیوان ہے جو بہ نسبت دوسرے حیوانوں کے زیادہ عقل رکھتا ہے اور میدان سیاست میں بھی وہ انسانوں کو کیڑے مکوڑوں ہی طرح ترتیب دینا جانتے ہیں۔ انھوں نے رائے عامّہ کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن خدا یعنی "سبب شکن" اس اُصول کو توڑنے پر آمادہ ہے اب وہ چاہتا ہے کہ انسان آزاد رہ کر میدان ترقی میں گامزن ہو۔

شخصیت انسانی کی عزت کرنا ہم پر فرض ہے کیونکہ وہی ارتقا کا کرتا دھرتا اور اس طرح خدا کا شریک کار ہے ایسے موقع پر بہت سے لوگ سوال کر بیٹھتے ہیں کہ اگر خدا ہے تو وہ بُرائیوں کو وقوع میں آنے ہی کیوں دیتا ہے۔ اُن کے اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نظریۂ ارتقا کو غلط سمجھا ہے۔ ارتقا کی ابتدائی ساری ترقیوں کا انحصار خدا کی ذات پر تھا لیکن جب سے اُس نے انسان کو ضمیر اور عقل سلیم عطا کی تب سے یہ بار ہمارے کاندھوں پر ڈالدیا گیا اور ہم کو اس باب میں پورا اختیار دیدیا ہے۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ قادر مطلق نے خود ہی قوانین حیات کو وضع کیا ہے تو پھر قوت خلاقی کا اپنے ہی قوانین کا رد کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، قوانین فطرت میں پوری ہم آہنگی ہے یہ انسان کی لاعلمی ہے کہ وہ اُن میں انتشار و پراگندگی پاتا ہے اس لئے اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی لاعلمی کا علاج کرے۔

خدا پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کرنے کی وجہ سے عقلمند سے عقلمند انسان اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور پیچیدہ مسایل کا کوئی حل نہیں نکال پاتا۔ خدا کیا ہے؟ کیا اس سوال کا جواب سائنس کے اس دور میں نہیں ملسکتا غور کرو!

کیا کوئی برقپاروں کو دیکھ سکتا ہے، نہیں۔ اسی طرح خدا بھی غیر مرئی ہے، پھر جس طرح برقپاروں کے غیر مرئی وجود سے انکار نہیں ہو سکتا، اسی طرح خدا کے غیر مرئی وجود کو بھی ماننا پڑے گا۔

اسی سلسلہ میں مندرجۂ بالا شعر کہا ہے اگر اس شعر میں شاعر نے خود کو یوسف سے اور معشوق کو زلیخا سے استعارہ کیا ہے تو بالکل لغویات ہے کیونکہ یوسف معشوق تھے اور زلیخا عاشق اور اگر تلمیح ہے یوسف اور زلیخا کے قصے کی طرف تو اس سے بھی زیادہ لغویات ہے کیونکہ جو بات شاعر نے بیان کی ہے اس کو یوسف اور زلیخا کے قصے سے کوئی تعلق نہیں شاعر کہتا ہے کہ یوسف زلیخا کے ہجر کا رنج اٹھاتے اٹھاتے کام آ گئے تھے اور اسکے بعد "اہتمام قربِ زلیخا" ہوا تو وہ یوسف کے لئے بعد از وقت تھا - حالانکہ یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے اول تو یوسف کو زلیخا کے ہجر کا رنج اٹھانے سے کیا واسطہ دوسرے یوسف کے ساتھ زلیخا کے عشق کا انجام تو اس قدر کامیاب ہوا ہے کہ جس کی مثال دنیا کے مشہور عشقیہ واقعات میں کہیں نہیں ملتی۔

۱۳- اے اخترِ خوش جمال واے ماہِ جمیل — اے تو کہ ترا نظیر کوئی نہ عدیل - عرش و فرش ص۵۲

لفظِ جمال میں خود خوبصورتی کا مفہوم ہے لہذا "خوش جمال" کی ترکیب لغو ہے۔

۱۴- اس تازہ رصد گاہِ جہاں بیں سے گزر کر — تسکین کے اس گوشۂ تمکیں سے گزر کر - عرش و فرش ص۹۲

"رصد گاہ" اس مخصوص ساخت کی عمارت کو کہتے ہیں جہاں سے منجم اور علمِ ہیئت کے ماہر ستاروں وغیرہ کی گردش کا معائنہ کرتے ہیں - رصد گاہ کو جہاں بیں کہنا بالکل لغویات ہے البتہ جہاں نما کہہ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ "خردبین" اور "دوربین" کے الفاظ کس طرح رائج ہو گئے جبکہ ان کو "خرد نما" اور "دور نما" بھی کہا جا سکتا تھا جیسے کہ "قطب نما" یا "جامِ جہاں نما" چونکہ آلے کا کام دیکھنے کا نہیں ہوتا بلکہ دکھانے کا ہوتا ہے اس لئے کسی آلے کو بجائے "نما" کے "بیں" کے ساتھ ترکیب دینا درست نہیں ہے - اس لئے یہاں "رصد گاہ جہاں بیں" کہنا بھی عیب سے خالی نہیں ہے۔

۱۵- بیٹھا ہوں سرِ جلوہ گہِ عالمِ تفکر — رگ رگ میں لئے بادۂ گلفامِ تفکر

شاعر کہتا ہے کہ میں رگ رگ میں "بادۂ گلفامِ تفکر" لئے بیٹھا ہوں مطلب یہ ہے کہ میں تفکر میں غرق ہوں اور اسی خیال کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ میں رگ رگ میں تفکر کی سرخ شراب لئے بیٹھا ہوں - یہاں شاعر نے تفکر کی شراب کہا ہے بالکل درست کیونکہ عالمِ تفکر میں انسان پر ایک بیخودی سی طاری ہو جاتی ہے اور شراب میں بھی اسی قسم کی سی کیفیت ہوتی ہے لہذا تفکر کی شراب تو بنا سکتے ہیں مگر اس شراب کو سرخ رنگ نہیں دے سکتے کیونکہ تفکر کی شراب کو رنگ سے کوئی واسطہ نہیں - لہذا بادۂ تفکر کو "گلفام" کہنا بے حد لغویات ہے۔

۱۶- سرِ دیر ایک طرفہ غوغا ہے لیکن — حرم میں بھی اک شور برپا ہے لیکن
کلیسا بھی خنجر دکھاتا ہے لیکن — فریبِ مے و نغمہ رسوا ہے لیکن
فریبِ مے و نغمہ کھاتا گزر جا

اس بند میں ہر مصرعہ کے بعد لفظ "لیکن" استعمال کیا گیا ہے جو حرفِ استدراک ہے اور حرفِ استدراک کے بعد وہ چیز بیان کی جاتی ہے جو اس سے پہلے بیان کرنے سے رہ گئی ہو۔ اس بند سے چار جملۂ استدراکیہ بنتے ہیں لہذا چار جملے بنا کر دیکھنا چاہیئے کہ یہ جملے معنوی اعتبار سے کہاں تک صحیح ہیں۔ پہلا جملہ یوں بنا کہ:۔ "سر دیر ایک طرفہ غوغا ہے لیکن فریبِ مئے و نغمہ کھا تا گزر جا"۔ جملے کے اعتبار سے تو یہ مکمل ہے مگر معنوی اعتبار سے بالکل ناقص۔ اب دوسرا جملہ بنایئے تو یوں کہیں گے کہ: "حرم میں بھی اک شور برپا ہے لیکن فریبِ مے و نغمہ کھاتا گزر جا" یہ بھی معنوی اعتبار سے بالکل ناقص ہے۔ اب تیسرے جملہ کو لیجئے یعنی:۔ "کلیسا بھی خنجر دکھاتا ہے لیکن فریبِ مئے و نغمہ کھاتا گزر جا" اس جملہ کی لغویت بھی ظاہر ہے اب رہ گیا چوتھا جملہ سو وہ بالکل درست ہے اور معنوی اعتبار سے بھی مکمل ہے یعنی "فریبِ مئے و نغمہ رسوا ہے لیکن فریبِ مئے و نغمہ کھاتا گزر جا" شاعر نے چوتھے جملے کے ربط سے دھوکا کھا کر اوپر کے تینوں جملے غیر مربوط کہدئے ہیں۔ چونکہ اس بند کا پانچواں مصرعہ "مستدرک" ہے اسلئے پانچویں مصرعہ کے ساتھ اُوپر کے چاروں جملوں میں سے ہر جملے کا معنوی رابطہ ہونا ضروری ہے مگر ایسا نہیں ہے۔

۱۷۔ ہر سانس ہے نوید عذابِ عظیم کی — گھبرا کے دو دُہائی خدائے رحیم کی۔ آیات و نغمات ص ۹۹

نوید خبرِ خوش کے معنی میں آتا ہے عذاب کے ساتھ نوید کا استعمال نادرست ہے۔

۱۸۔ ضدوں کا مجموعہ ہے یہ دنیا عجیب یہاں کا معاملہ ہے — نگاہِ غائر سے دیکھئے تو فنا بقا ہے بقا فنا ہے
کبھی ہیں نیکی میں شر کے پہلو کبھی بدی میں ہے خیر و خوبی — کوئی بگڑ کر سنور رہا ہے کوئی سنور کر بگڑ گیا ہے
کہیں شعاعیں ہیں اتنی مدھم نگاہ گم ہو کے رہ گئی ہے — کہیں چکاچوند کا یہ عالم نظر کا رشتہ سلگ رہا ہے
(آیات و نغمات ص [illegible])

مندرجۂ بالا اشعار میں شاعر نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اگرچہ ضدوں کا جمع ہونا محال ہے مگر اس دنیا کا عجیب معاملہ ہے کہ یہاں ضدیں جمع ہو گئی ہیں۔ پہلے مصرعہ میں شاعر نے ایک محال بات کا دعویٰ کیا ہے یعنی یہ کہ دنیا ضدوں کا مجموعہ ہے اور اگلے تمام مصرعوں میں بزعم خود اپنے دعوے کی دلیلیں پیش کی ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جن باتوں کو "اجتماعِ ضدین" کہا گیا ہے وہ اجتماعِ ضدین کی تعریف میں آتی بھی ہیں یا نہیں۔ اگر اجتماعِ ضدین کی شرائط پوری نہیں ہوتیں تو دعویٰ اور دلیلیں سب غلط۔ اجتماعِ ضدین کے واسطے چند "وحدتوں" کا ہونا ضروری ہے مثلاً وحدتِ مبتدا، وحدتِ زمان و وحدتِ مکان وغیرہ۔ اب دوسرے شعر کو لیجے:

کبھی ہیں نیکی میں شر کے پہلو کبھی بدی میں ہے خیر و خوبی
کوئی بگڑ کر سنور رہا ہے کوئی سنور کر بگڑ رہا ہے

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں دو جگہ لفظ "کبھی" اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ "وحدتِ زمان" نہیں ہے لہذا ان دونوں حالتوں کو یعنی نیکی میں شر کا پہلو ہونا اور بدی میں خیر و خوبی کا ہونا کسی طرح اجتماعِ ضدین نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان

دونوں حالتوں کا تعلق ایک زمانہ سے نہیں ہے۔ اسی طرح اسی شعر کے دوسرے مصرع میں دو جگہ لفظ "کوئی" یہ ظاہر کرتا ہے کہ "بگڑ کر سنورتے ہیں اور سنور کر بگڑتے ہیں" "وحدتِ مبتدا" نہیں ہے یعنی یہ دونوں حالتیں ایک شخص سے متعلق نہیں ہیں۔ اسی طرح تیسرا شعر لیجئے:۔

کہیں شعاعیں ہیں اتنی مدہم نگاہ گم ہو کے رہ گئی ہے
کہیں چکا چوند کا یہ عالم نظر کا رشتہ سلگ رہا ہے

اس شعر میں بھی دو جگہ لفظ "کہیں" یہ ظاہر کرتا ہے کہ وحدتِ مکان نہیں ہے یعنی یہ دونوں باتیں جو بیان کی گئی ہیں وہ ایک جگہ سے متعلق نہیں ہیں لہذا ان کو بھی اجتماعِ ضدین کی شکل نہیں دے سکتے۔ اجتماعِ ضدین چونکہ محال ہے اس لئے اس کے ثابت کرنے کی کوشش کرنا بھی حماقت سے کم نہیں ہے۔

۱۹- کاکلیں رہ رہ کے یوں لہرا رہی ہیں دوش پہ
تو کہے لیلائے شب آمادۂ پرواز ہے - آیاتِ نغمات ۲۶

کاکلوں کو لیلائے شب کہہ دینا تو خیر کچھ معنی رکھ سکتا ہے لیکن لیلائے شب کا آمادۂ پرواز ہونا بالکل مہمل بات ہے جوش صاحب کے یہاں اکثر تشبیہیں معنوی اعتبار سے ناقص ہیں۔

۲۰- قسم اُس کھڑکھڑاہٹ کی رہ سے جو نکلتی ہے
قسم اُن زمزموں کی جنکی ادھر پر فوج چلتی ہے - شعلہ و شبنم ۹

"زمزمہ" اُس نغمے کو کہتے ہیں جو آہستگی کے ساتھ گایا جائے۔ اسی اعتبار سے جب آتش پرست اپنی عبادت کے وقت آہستہ آہستہ گنگناتے ہیں تو اُس کو بھی زمزمہ کہتے ہیں۔ زمزمے میں لغوی اعتبار سے بھی آہستگی کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ان معنوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ذرا اُن نغموں کا تصور کیجئے جن کی آواز پر فوج کی حرکت میں تیزی اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ جوش صاحب کا اشارہ خواہ پہلے زمانہ کی "رجز خوانی" سے ہو یا آجکل کی "بینڈ نوی" سے بہرحال جنگی ترانوں کو زمزمہ کہنا صد درجہ غیر مناسب ہے۔

۲۱- جسکی جانکاہی سے ٹپکاتی ہو امرت نبضِ خاک
جسکے دم سے لالہ و گل بنکے اتراتی ہے خاک - شعلہ و شبنم ۲۹

"نبض" کے معنی "جنبیدنِ رگ" کے ہیں اور مجازاً اس رگ کو بھی کہتے ہیں جو حرکت کرتی رہتی ہے اسی لئے جسم کی ہر اُس متحرک رگ کو نبض کہتے ہیں جو اپنی حرکت سے مزاج کے حال کو ظاہر کرتی ہے۔ جہاں حرکت یا بیقراری کا اظہار مقصود ہو وہاں "نبض" کا لفظ اور جہاں خون کے ٹپکنے وغیرہ کا اظہار مقصود ہو وہاں "رگ" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ذوق نے لکھا ہے:

مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا (ذوق)

یہاں موج کو نبض سے تشبیہ دی ہے کیونکہ موج بھی متحرک ہوتی ہے اور نبض بھی۔

اسی طرح جہاں خون کے ٹپکنے کا اظہار مقصود ہے وہاں غالب نے رگ ہی استعمال کیا ہے:۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا (غالب)

۲۲- پھر مسندِ خیال پہ ہے گرم رستخیز شمع و شراب و شعر و شبستاں کی آرزو عرش و فرش ۱۰۸

رستخیز کے معنی قیامت کے ہیں- سمجھ میں نہیں آتا کہ مسند اور قیامت میں کیا مناسبت ہے- اگر ذرا سوچ کر شعر کہا ہوتا تو اس صورت میں اعتراض رفع ہو سکتا تھا مثلاً یوں کہدیتے کہ:

پھر عرصۂ خیال میں ہے گرم رستخیز

۲۳- شور اُٹھتا ہے محض اک ہم ہے دار و رسن یا تو اب ہم تاج ہی پہنیں گے یا خونیں کفن شعلہ و شبنم ۳۶

لفظ "محض" بسکونِ ہائے حطی ہے متحرک صورت میں بالکل غلط ہے-

۲۴- رو کشِ دشت و جبل قصرِ سلاطیں ہونگے ہمسرِ بامِ فلک کلبۂ دہقاں ہوگا شعلہ و شبنم ۵۶

اس نظم کا عنوان ہے "مستقبل" اس نظم میں اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ آنے والے زمانہ میں شاہی اور امارت کا خاتمہ ہو جائے گا اور "دہقان" اور "مزدور" کا دور ہوگا اسی سلسلہ میں مندرجۂ بالا شعر کہا ہے- شاعر کا مقصد یہ ہے کہ سلاطین کے قصر ویران ہو جائیں گے اور دہقان کا جھونپڑا ہمسرِ بامِ فلک ہو جائے گا- افسوس ہے کہ حضرت جوش اس خیال کو پوری خوبی اور صحت کے ساتھ ادا نہ کر سکے- قصرِ سلطان کو رو کشِ دشت کہکر ویرانی کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں مگر "رو کشِ جبل" کہنے سے کسی طرح یہ معنی پیدا نہیں ہوتے- انسانی ذہن ہمیشہ "وصفِ مشہور" ہی کی طرف جاتا ہے دشت کا وصفِ مشہور بے شک ویرانی ہے مگر جبل، کا وصفِ مشہور سوائے بلندی اور استحکام کے کیا ہو سکتا ہے- لہذا کسی چیز کی ویرانی کو ظاہر کرنے کے لئے "رو کشِ جبل" بالکل غلط ہے- برعکس اس کے "رو کشِ جبل" کہنا تو کسی چیز کی بلندی اور استحکام کو ظاہر کرتا ہے-

۲۵- اے متاعِ بردۂ ہندوستان و ایشیا اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار- شعلہ و شبنم ۲۰۲

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ تیرے ناخن پر حق کی عقدہ کشائی کا مدار تھا مگر شعر کے الفاظ سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تیرے ناخن پر عقدۂ حق کے وجود کا مدار تھا- یہاں جب تک "عقدہ کشائی" کا لفظ استعمال نہیں کیا جائے گا، شعر مفہوم سے تشنہ رہے گا صرف "عقدۂ حق" کہدینے سے "عقدہ کشائی حق" کے معنی پیدا نہیں ہو سکتے-

۲۶- آج اے جوش ترے رنگِ غزل گوئی سے قندِ پارس کا مزا ہے بزبانِ اُردو شعلہ و شبنم ۲۸۷

یہ لفظ پارس بسکونِ را ہے اور شعر میں "پارس" تلفظ کرنا بھی جایز ہے، سعدی نے گلستاں میں لکھا ہے کہ:-

یارب زخاکِ فتنہ نگہدار خاکِ پارس

درویش میرٹھی

اطلاع: رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے اور اس کی اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا- جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے- اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے- منیجر

باب المراسلۃ والمناظرہ

انجمن ترقی اُردو اور حیدرآباد

(مولوی محمد امین صاحب زبیری - بھوپال)

مکرمی ——— تسلیم

مئی اور جون کی اشاعتوں میں انجمن ترقی اُردو کے متعلق مضامین پڑھ کر آپ جیسے ذمہ دار اڈیٹر کی نسبت مجھے حیرت ہوگئی، اگر آپ انجمن سے رودادیں طلب کرکے لکھتے تو بہت اچھا ہوتا۔

مجھے انجمن سے قدیم تعلق ہے اور عبدالحق کے ساتھ پورے ۵۰ سال سے میرے تعلقات ہیں، اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مضامین حقیقت سے بعید ہیں۔

سرمرزا نے جو کچھ کیا ذاتی عداوت سے، قاضی عبدالغفار ان کے آلۂ کار بنے، میں اس زمانہ میں حیدرآباد میں ہی تھا جون کے نگار میں تو آپ نے غضب ہی کر دیا یعنی یہاں تک لکھ دیا کہ عبدالحق کی سیاسی اور فرقہ دارسرگرمیاں تشویشناک ہو رہی ہیں اور یہ کہ وہ ان سرگرمیوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں جو برطانوی ہند کے بعض سیاسی حلقوں کی طرف سے حکومت حیدرآباد کے خلاف کی جا رہی ہیں، آپ نے یہ سخت الزام موصولہ اطلاعات کی بنا پر لگایا ہے کاش اسی قدر اضافہ کر دیتے کہ ذرائع اطلاعات یہ ہیں۔ تو ذمہ داری ہلکی ہو جاتی۔ مجھے امید ہے کہ آپ انجمن کی سابقہ سہ سالہ رودادیں وغیرہ طلب کرکے اور دیکھ کر پھر ایک ریویو کریں گے اور ان الزامات کے متعلق ذرائع اطلاعات بھی شائع کر دیں گے۔

اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر جو آپ سے، اور مولوی صاحب سے نگار اور انجمن سے ہیں میں نے یہ عریضہ لکھا ہے۔

(نگار) آپ نے اگر میرے اس نوٹ کو بغور پڑھا ہوتا جو مضمون کے اخیر میں درج ہے تو شاید آپ کو یہ خط لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

اس نوٹ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو اطلاعات مجھے حاصل ہوئی ہیں، اُن کے غلط یا صحیح ہونے کا علم مجھے نہیں ہے، اور ان کو میری ذاتی رائے سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے آپ کا یہ فرمانا کہ میں نے انجمن پر یہ اعتراض کئے ہیں

درست نہیں۔

جون کے نگار میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نقل ہے ایک پمفلٹ کے بعض حصّوں کی جو مجھے بمبئی سے موصول ہوا تھا اور ایک ایسے شخص کا تھا جو حیدرآباد سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

اس کے پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ الزامات غلط ہیں تو ان کا جواب انجمن کی طرف سے شایع ہونا ضروری ہے، چنانچہ میں نے انجمن کو اس طرف متوجہ بھی کیا۔ اور غنیمت ہے کہ انجمن نہ سہی آپ ہی نے اس طرف توجہ کی۔ لیکن آپ کی یہ توجہ بھی بے نتیجہ ہے، کیونکہ الزامات بدستور اپنی جگہ قایم ہیں۔ ہاں اگر آپ انجمن کی "روئداد یں" مطالعہ کرنے کے بعد ان الزامات کا جواب بھی ضبط تحریر میں لے آتے تو زیادہ مفید ہوتا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ میں نے خود انجمن سے کیوں روئیدادیں طلب نہیں کیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرا نوٹ دراصل اسی خواہش کا اظہار تھا اور انجمن کو چاہئے تھا کہ وہ مجھے ضروری اطلاعات اس باب میں فراہم کرتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور مجھے اس وقت تک ان الزامات کی تردید کا موقعہ نہ مل سکا۔

یہ تو ہوئی گفتگو ان اعتراضات کے متعلق جو پمفلٹ میں کئے گئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان کا جواب بھی انجمن کے پاس ہو، لیکن مجھے تو ان تمام باتوں سے علحدہ سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انجمن کیوں اب تک اس قابل نہیں ہو سکی کہ وہ حیدرآباد یا کسی اور ریاست کی مدد کے بغیر اپنا کام چلا سکے۔

اس وقت تک لاکھوں روپیہ کی امداد حیدرآباد سے مل چکی ہے اور اگر ابتدا ہی سے کاروباری اُصول پر انجمن کو چلایا جاتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس وقت حیدرآباد کی امداد بند ہو جانے کو محسوس کرتی۔

ہندوستان میں کتابوں کا کام کرنے والے اور بھی بہت سے ادارے ہیں جن میں سے بعض بہت کامیاب ہیں اور لاکھوں کا کاروبار کر رہے ہیں۔ درانحالیکہ اُن میں سے کسی کو نہ حیدرآباد سے مدد ملی، نہ کسی دوسری ریاست سے اور نہ وہ کسی اتنے بڑے سرمایہ سے شروع کئے گئے جو انجمن کو حاصل تھا۔

انجمن ترقی اُردو ایک پبلک ادارہ ہے اور اس کی زندگی کا انحصار صرف پبلک ہی کی دلچسپی پر ہونا چاہئے، لیکن انجمن نے محض حیدرآباد کی امداد کی وجہ سے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی یہاں تک کہ اس کے ممبران کی تعداد صفر کا درجہ رکھتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ انجمن نے کوئی کام نہیں کیا، لیکن یہ کام بالکل رئیسوں اور ریاستوں کا سا تھا اور کاروباری اُصول کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ انجمن، حیدرآباد کی امداد کو جاگیر سمجھتی رہی اور جاگیردارانہ حیثیت ہی سے اس نے اب تک سارے کام کئے ہیں۔ اگر وہ صحیح تجارتی نقطۂ نظر سے کام لیتی تو آج اس کے پاس لیتھو، ٹائپ اور بلاک وغیرہ کی متعدد مشینیں ہوتیں، درجنوں رسایل و اخبارات ہوتے ہزاروں مفید کتابیں شایع ہو چکی ہوتیں اور اُردو اشاعت کا

ایک بین الاقوامی حیثیت رکھنے والا مرکز ہوتا

انجمن کا سارا کام اس وقت تک صرف ایک شخص سے متعلق رہا ہے اور اسی کو سیاہ و سپید کے اختیارات حاصل ہیں، گویا یہ سب کچھ اس کی ذاتی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں انجمن کاروباری حیثیت سے کوئی ترقی نہیں کر سکتی۔ یہ ہے میرا اعتراض انجمن پر، اور اگر اس کا کوئی جواب آپ دے سکتے ہیں تو ضرور مرحمت فرمائیے۔

رہا حیدر آباد کی امداد کا مسئلہ، سو اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، تاہم خیال یہی ہے کہ یہ امداد پھر بحال ہوگی لیکن انجمن کو اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور آئندہ کے لئے ایسا انتظام کرنا چاہئے کہ اس امداد سے بے نیاز ہو جائے اور اسکی صورت صرف یہی ہے کہ اس ادارہ کو باقاعدہ لمیٹیڈ کمپنی میں تبدیل کر دیا جائے اور اسکی نگرانی ایک بورڈ کے سپرد ہو۔

اب دنیا میں کوئی ادارہ مستبدانہ اصول پر کاربند ہو کر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پبلک کی چیز پبلک ہی کے سپرد ہونا چاہئے اور انجمن بھی غالباً پبلک ہی کی چیز ہے۔

رہا سوال سر مرزا اسماعیل کی عداوت یا اردو دشمنی کا، سو اس کے متعلق میں اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انجمن نے کیوں اس کا موقعہ دیا کہ کوئی اس کے کام پر نکتہ چینی کر سکتا ۔۔ علاوہ اس کے انجمن کے کام کا محاسبہ اس سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا کہ حیدر آباد سے اس کو کوئی امداد مل رہی ہے یا نہیں ہے۔

اب تو یہ اصولی گفتگو سامنے ہے (حیدر آباد کی امداد جاری ہو یا نہ ہو) کہ انجمن کا موجودہ نظام باقی رہنا چاہئے یا نہیں اور اس کی آئندہ ترقی کے لئے کسی شخص واحد کو اس کا تنہا ذمہ دار بنائے رکھنا مناسب ہے، یا تجارتی اصول پر اس کو کسی ٹرسٹ کے سپرد کر دینا یا لمیٹیڈ کمپنی میں تبدیل کرنا بہتر ہے۔

تصحیح

(۱) پچھلے مہینے پروفیسر شور کی نظم کے گیارھویں شعر میں "فاران و نیل" کی جگہ غلطی سے "فاران و نسل" لکھا گیا ہے، اسکی تصحیح فرما لیجئے۔

(۲) جون کے نگار میں بہ سلسلۂ مضمون "آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا" حسب ذیل غلطیوں کی اصلاح فرما لیجئے:۔

صفحہ ۱۹۔ پہلا پیراگراف، تیسری سطر: اختلاف کی جگہ اختلافات ۔۔ دوسرا پیراگراف چوتھی پانچویں سطر: کسی کی جگہ کس۔ صفحہ ۲۰ تیسری سطر: اسی کی جگہ اس ۔۔ صفحہ ۲۱۔ آخری دو سطریں: بولوں کی جگہ بولیوں ۔ اشارہ کرنا تھا کی جگہ ہوتا تھا۔ صفحہ ۲۲ تیرھویں سطر: لکھی جاتی تھی کی جگہ لکھے جاتے تھے۔ صفحہ ۲۴: جواب کی جگہ صواب۔ صفحات ۲۳-۲۴: چین کی جگہ چینی۔

چھیڑے

دھواں دیتے رہے ہیں کتنے ساز و چنگ و عود اب تک
پگھل کر رہ گئے ہیں کتنے سینوں کے جمود اب تک

حجاب ساز میں نغمات کتنے ناشنیدہ ہیں
کسے معلوم اب بھی کتنی آہیں ناکشیدہ ہیں،

ضرورت تھی تری بربادیوں پر ہنسنے والوں کی،
سیاہی نے بڑھا دی اور بھی کچھ لو اُجالوں کی،

صدائیں دی ہیں کیا کیا منزلوں نے کارروانوں کو
غبارِ راہ نے ڈھا ہے کتنے آسمانوں کو

جہاں بجلی چراغِ خوشہ و خرمن جلاتی ہے،
وہاں کشتی کو اکثر موج آئینہ دکھاتی ہے

جہاں کہرام میں میری و شاہی مسکراتی ہے
وہاں "جنتا" ہی خود تابوتِ سلطانی اُٹھاتی ہے

جہاں ملاح طوفانوں کے پردہ دار ہوتے ہیں
وہاں ہر ناؤ کو برق و شرر درکار ہوتے ہیں،

جہاں بکتی ہوئی "عصمت" کی خنکی جھوک کھاتی ہے
وہاں ناسور کی بو عطر و عنبر سے بھی آتی ہے،

کہیں سونے کی لو سے آہنی زنجیر گلتی ہے
ضمیروں کی سیاہی تاجِ گوہر سے بدلتی ہے

فروزاں خون سے ہوتے ہیں جب قشقے جبینوں پر
چٹانیں ٹوٹ کر گرتی ہیں نازک آبگینوں پر،

جہاں جمہور کھو دیتے ہیں بل اپنی کلائی کا
شکستہ ہڈیاں کھاتی ہیں دھوکا مومیائی کا

مگر جب ٹوٹ جاتا ہے طلسمِ ظلِ سبحانی
تو پھر تاجوں کے ہیرے توڑنے اٹھتی ہے عریانی

ابھی دریا میں تند و تیز موجیں آنے والی ہیں
چٹانوں سے برابر کشتیاں ٹکرانے والی ہیں

نئے سورج نئی صبحوں کے طوفاں لیکے آئیں گے
اُجالوں کے تھپیڑوں میں اندھیرے ڈوب جائیں گے

پروفیسر شور

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں۔ اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو دو سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں۔ اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود آپ کے سامنے آ جاتی ہیں۔ مثل آبحیات کے تصور فرمایئے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی۔ اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دیتی ہے۔ یہ دوا نئی نہیں ہے ہزارہا مایوس العلاج اسکے استعمال سے بامراد بلکہ مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگایئے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۲۸ سالہ شہرت پر غور فرمایئے

پتہ:۔ حکیم ثابت علی نیچ زبان، خوش کلام
(مترجم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ۔ یو۔ پی

مطبوعات موصولہ

ستاروں سے آگے تصنیف قرۃ العین حیدر۔ ناشر اُردو نشر گاہ دہلی، کتابت و طباعت اور کاغذ نفیس۔ مجلد معہ رنگین گرد پوش کے۔ قیمت چار روپیہ، حجم ۲۱۶ صفحات۔ اس مجموعہ میں چودہ افسانے ہیں، جن میں اعلیٰ طبقہ کی تعلیم یافتہ اور کالجوں میں تعلیم پاتے والی لڑکیوں کی موجودہ آزاد ذہنیت کو پیش کیا گیا ہے جو مشرقی خصوصیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ان افسانوں کی لکھنے والی جو غالباً خود بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتی ہیں، کوئی ایسا رُخ پیش نہیں کرتیں، جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ ان باتوں سے متنفر ہیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سے بہت لطف اُٹھاتی ہیں اور خود بھی اس رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔

انداز تحریر بھی بالکل انگریزی کا سا ہے اور اسی لئے عبارت میں تسلسل و روانی بھی نہیں پائی جاتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والی بہت اترا اترا کر لکھ رہی ہے۔

اے عشق کہیں لے چل مترجم: صادق الخیری۔ ناشر: اُردو نشر گاہ دہلی۔ کتابت، طباعت اور کاغذ نفیس۔ مجلد، معہ رنگین گرد پوش کے، قیمت دو روپیہ، حجم ۱۵۶ صفحات۔

"جان کون کومسٹ" مشہور انگریزی انشا پرداز ہیں اور طامس مور کی طرح مشرقی تصورات کی بڑی دلدادہ۔ اس ناول کا پلاٹ سرزمین جاپان سے تعلق رکھتا ہے اور فاضل ادیبہ نے ٹوکیو میں رہ کر اس ناول کو ختم کیا ہے تاکہ فسانے کے پس منظر میں اجنبیت نہ پیدا ہو۔

فاضل مترجم نے ترجمہ نہایت خوبی سے کیا ہے اور اصل کتاب کی کسی ادبی خوبی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ صادق الخیری اس نوع کی ادبی کتابوں کے ترجمہ کرنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔

ادب کے مادی نظریے مصنف، ظہیر کاشمیری۔ ناشر، کمال پبلشرز، ۲۶ مال روڈ لاہور۔ کتابت و طباعت معمولی کاغذ نفیس، مجلد معہ رنگین گرد پوش کے۔ حجم ۱۲۶ صفحات، قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

اس مجموعہ میں دیباچہ کے علاوہ پانچ مقالے شامل ہیں: ادب اور معاشرہ، اُردو شاعری کا سماجی پس منظر، لینن اور لٹریچر، اُردو نثر کا سماجی پس منظر، تاریخ کی ادبی روایتیں۔۔۔ اور ان سب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب ظہیر کاشمیری نے جو کچھ لکھا ہے اتنا سوچ سمجھ کر لکھا ہے کہ دوسروں کو بھی ان مسائل پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ان کے بعض نظریوں سے ہمیں اختلاف ہو۔ لیکن اس سے قطعاً اختلاف نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے

جو خیال ظاہر کیا ہے وہ یکسر نیک نیتی پر مبنی ہے - انداز تحریر بہت سنجیدہ و فلسفیانہ اور لکھنے والے کی قوت فکر کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔

مسلمان اور غیر مسلم حکومت

مصنف پروفیسر محمد سرور - ناشر ادارۂ ادبیات نو لاہور، کتابت و طباعت صاف - کاغذ نفیس، مجلد معہ رنگین گرد پوش کے۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات،

قیمت ڈھائی روپیہ - ہندوستان کی تاریخ آزادی میں کراچی کا وہ مقدمہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے جس میں مولانا محمد علی مرحوم اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف بغاوت کا الزام قایم کیا گیا تھا - جس زمانہ میں اس مقدمہ کی کارروائی جاری تھی، تمام اخبارات میں اسی کا چرچا تھا اور لوگ بڑی دلچسپی سے اس کا مطالعہ کرتے تھے، لیکن اب کہ اس واقعہ پر چوتھائی صدی کا زمانہ گزر چکا ہے، لوگوں کے ذہن میں بھی نہ ہوگا اور ہمارے نوجوان اس سے واقف ہی نہیں، ضرورت تھی کہ اس کو قلمبند کر دیا جاتا، کیونکہ اس کارروائی میں مولانا محمد علی کا بیان جو بجائے خود ایک زبردست علمی و تاریخی مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے، واقعی محفوظ کر لینے کی چیز تھی - یہ کتاب صرف اسی مقدمہ کی کارروائی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اس میں بعض ایسے ابواب بھی شامل کر دئے گئے ہیں جن سے چوتھائی صدی قبل کی سیاسی جدوجہد پر روشنی پڑتی ہے -

ترقی کی برکتیں

مصنف و ناشر: نجم آفندی، طباعت و کتابت واضح، کاغذ نفیس، مجلد معہ گرد پوش کے، ضخامت ۱۰۰ صفحات، قیمت ڈیڑھ روپیہ، ملنے کا پتہ: سلطان حسین بک سیلر بھنڈی بازار بمبئی

نجم آفندی شاعر ہیں اور ہمیشہ انھوں نے شعر ہی کہے، لیکن اب انھوں نے نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے، اور چونکہ یہ اُن کی پہلی کوشش ہے، اس لئے ہر لحاظ سے بہت سطحی ہے۔

اس کتاب میں انھوں نے ماضی کی برکتوں اور حال کی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے، لیکن بالکل اسی طرح جیسے بچوں یا عورتوں سے باتیں کی جائیں - انھوں نے خود ان باتوں کو "پریشاں خیالات" ظاہر کیا ہے لیکن اگر اسی کے ساتھ وہ عامیانہ بھی کہدیتے تو اس کتاب پر بالکل صحیح تنقید ہو جاتی -

عرفان عزیز

دیوان شاہ عزیز اللہ عزیز صفی پوری مرحوم - ناشر: نظامی پریس، بدایوں - کاغذ نفیس، طباعت و کتابت صاف، ضخامت ۱۴۴ صفحات - قیمت ایک روپیہ چار آنہ -

مرحوم صفی پور کے مشہور بزرگ تھے اور اہل دل میں ان کا شمار ہوتا تھا - آپ بڑی اچھی استعداد رکھتے تھے اور فارسی اُردو دونوں میں فکر کرتے تھے - اُردو میں آپ کے پانچ دیوان اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں اور انھیں میں سے ۱۶۴ غزلوں کا انتخاب اس مجموعہ میں پیش کیا گیا ہے - آپ کا کلام متصوفانہ رنگ کا ہے اور چونکہ آپ جو کچھ کہتے تھے جذبات کے زیر اثر کہتے تھے، اس لئے اس میں کافی دلکشی پائی جاتی ہے -

جلترنگ

تصنیف: زینت ساجدہ - ناشر: نیو پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد دکن - کاغذ نفیس، طباعت و کتابت گوارا، ضخامت ۱۶۰ صفحات - قیمت دو روپیہ - مجموعہ ہے زینت ساجدہ کے دس افسانوں کا

جن میں زیادہ اونچے گھرانوں کی معاشرت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ دیباچہ میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ یہ تمام افسانے سچے ہیں اور ان کے مطالعہ سے پڑھنے والے پر یہی اثر پڑتا ہے۔ زبان اور انداز بیان میں کافی سادگی پائی جاتی ہے، لیکن جس معاشرت کے پس منظر میں یہ افسانے لکھے گئے ہیں، وہ مشرقیت سے ذرا ہٹی ہوئی ہے اور اس لئے افسانے تکلف و تصنع سے خالی نہیں۔

اپنا اور ماحول کا کارٹون مصنف: شیخ اکبر علی ایڈوکیٹ لاہور۔ ناشر: کمال پبلشرز ۲۶ مال روڈ لاہور طباعت وکتابت صاف، کاغذ نفیس، مجلد مع رنگین گرد پوش کے، ضخامت ۱۴۴ صفحات قیمت ۴؎۔ اس کتاب میں مصنف نے ملک کے ادبی، سیاسی، تمدنی و تعلیمی مسایل پر مزاحیہ رنگ میں تبصرہ کیا ہے، لیکن نہایت ہی طفلانہ و عامیانہ انداز میں۔ اس کتاب کو مزاحیہ رنگ کی کتاب کہنا، مزاح کی توہین ہے اور اسکے مطالعہ سے طبیعت منغص ہو جاتی ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ مصنف کو کس نے یقین دلایا کہ وہ مزاحیہ نگار بھی بن سکتے ہیں۔

خونی ترانے مرتب: عبد الوہاب غازی، ناشر: اُردو اشاعت گھر ۴۲ فیرس لین کلکتہ۔ کاغذ عمدہ، طباعت وکتابت صاف، غیر مجلد۔ حجم ۲۳ صفحات، قیمت ۸؍

مجموعہ ہے مختلف شعراء کی نظموں کا جو ہندوستان کے موجودہ فسادات پر لکھی گئی ہیں۔ اس مجموعہ میں پہلی نظم جناب کیفی اعظمی کی خوب ہے۔

نشاط خاطر مرتب و ناشر: خواجہ حمید لکھنوی، کاغذ نفیس، طباعت وکتابت نفیس، ضخامت ۵۲ صفحے قیمت ۸؍۔ ملنے کا پتہ: حمیدیہ دواخانہ کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ۔

انتخاب ہے مرزا ثاقب مرحوم کے کلام کا جو خواجہ حمید نے کیا ہے اور خواجہ حمید کے کلام کا جو مرزا ثاقب مرحوم نے کیا تھا۔ انتخاب بُرا نہیں ہے۔

فکر جمیل مصنف: جمیل واسطی، ناشر: بشیر احمد اینڈ سنز جونا مارکیٹ کراچی، کاغذ نفیس، طباعت وکتابت صاف، مجلد، ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت ۲؎۔

مجموعہ ہے جناب واسطی (پروفیسر سندھ مسلم کالج کراچی) کے کلام کا۔ پہلے حصہ میں نظمیں ہیں اور دوسرے حصہ میں غزلیں۔ کلام کے مطالعہ سے شاعر کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے اور انداز بیان کی ندرت بھی ظاہر ہوتی ہے، لیکن نظم کے حصہ میں یہ اپج بعض جگہ بہت نامانوس و غریب ہو گئی ہے۔ غزلیں نسبتاً بہتر ہیں۔

۱۹۴۶ء کی بہترین نظمیں مرتب: حلقۂ ارباب ذوق لاہور۔ ناشر: مکتبۂ اُردو لاہور، کاغذ نفیس، طباعت وکتابت پاکیزہ۔ غیر مجلد، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

انتخاب ہے اُن نظموں کا جو ۱۹۴۶ء کے دوران میں ملک کے مختلف اخبارات و رسایل میں شایع ہوئیں۔

یہ نظمیں عہد جدید کے ترقی پسند شعراء کی ہیں اور شاعری کے ٹکنک کے متعلق جدید رجحانات کو ظاہر کرتی ہیں، چونکہ یہ نظمیں "ادب برائے زندگی" کے اُصول کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں، اس لئے خالص ادبی یا فنی حیثیت سے ان پر تبصرہ کوئی معنی نہیں رکھتا، رہ گیا مفہوم و مقصود، سو اس کے متعلق بھی ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے، کیونکہ ہم نے ہمیشہ اس قسم کی نظموں سے "زندگی" کے سمجھنے کی کوشش کی اور ہم ہمیشہ ناکام رہے۔ بہر حال چونکہ ان کو نظموں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اس دعوے کے ساتھ کہ وہ سنہ ۴۶ء کی بہترین نظمیں ہیں، اس لئے بغیر اُس وقت کا انتظار کئے جب ہم میں بھی ان کی خوبیوں کے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو، فی الحال اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ "ہاں ایسی ہی ہوں گی"!

سنہ ۱۹۴۶ء کی منتخب نظمیں

مرتب: ظہیر کاشمیری، ناشر: نیا ادارہ لاہور - کاغذ نفیس، طباعت و کتابت پسندیدہ - غیر مجلد حجم ۱۲۸ صفحات - قیمت ۱۲/ -

یہ سنہ ۴۶ء کی بہترین نظموں کا دوسرا انتخاب ہے اور غالباً متذکرہ بالا انتخاب سے ہمارے لئے زیادہ قریب بفہم ہے کیونکہ اس میں بعض نظمیں مثلاً جاں نثار اختر اور جذبی کی ایسی بھی ہیں جن کی ٹکنک سے ہم اجنبی نہیں ہیں۔

رباعیات باباطاہر

ترجمہ ہے باباطاہر کی رباعیات کا جسے ڈی، سی، دتا، پروفیسر مہاراج کالج جے پور نے انگریزی نظم میں کیا ہے۔

باباطاہر اور عمر خیام ایک ہی صدی کے دو مشہور رباعی گو شاعر تھے، لیکن باباطاہر کو لوگوں نے کم جانا اور خیام کو مستشرقین یورپ نے مشہور کر دیا کیونکہ اس کا فلسفہ مغربی ذوق کو زیادہ اپیل کرتا تھا۔

باباطاہر کا شمار صوفی شعراء میں سے تھا اور اپنے عہد میں ان کا کلام بہت مقبول ہوا۔ فاضل مترجم نے ترجمہ کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے اور اصل رباعیات کی معنوی خصوصیات کو بہت کچھ نباہا ہے۔ قیمت ۸ / ہے۔

مچلتے آنسو

مترجم: صادق الخیری، ناشر: اُردو نشر گاہ، دہلی - طباعت و کتابت صاف، کاغذ عمدہ، مجلد و معہ رنگین گرد پوش کے - ضخامت ۸۴ صفحات، قیمت ۱۲/ -

ترجمہ ہے کلوڈ فریئر کے ناول کا جو جاپان کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے اور بہت دلکش داستان حسن و محبت پر مشتمل ہے۔ صادق الخیری صاحب کے اس ترجمہ میں بھی وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ان کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں۔

تنقید کیا ہے

مصنف: - پروفیسر آل احمد سرور - ناشر: کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی، کاغذ نفیس، طباعت و کتابت پسندیدہ - مجلد - معہ رنگین گرد پوش کے - ضخامت ۱۹۶ صفحات - قیمت دو روپیہ -

مجموعہ ہے جناب سرور کے سات انتقادی مقالات کا جو ملک کے مختلف رسایل میں شایع ہو کر بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ سرور صاحب عہد حاضر کے نہایت باخبر نقادوں میں سے ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کی بنیاد گہرے مطالعہ اور عمیق غور و فکر پر ہوتی ہے۔ اس مجموعہ کا ہر مضمون اپنی جگہ قابل قدر ہے۔

رباعیات محروم

مصنف: تلوک چند محروم، ناشر: مکتبۂ دانش مزنگ لاہور۔ کاغذ نفیس، طباعت و کتابت پسندیدہ۔ مجلد۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔

مجموعہ ہے جناب محروم کی رباعیوں کا۔ محروم قدیم دبستان شاعری کے بہت کہنہ مشق شاعر ہیں اور ملک اُن کی شاعرانہ خصوصیات سے ناواقف نہیں۔ محروم کو رباعیاں لکھنے کا خاص سلیقہ حاصل ہے، جن میں رنگینی تو نہیں لیکن افادیت بہت زیادہ ہے۔ ان کا کلام بہت منجا ہوا ہوتا ہے جو ایک پختہ کار ذہن و دماغ ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

مشعل

مصنف: فراق گورکھپوری۔ ناشر: مکتبۂ نژادِ نو، جھوائی ٹولہ، لکھنؤ۔ کتابت و طباعت صاف، کاغذ نفیس، مجلد معہ رنگین گردپوش کے۔ حجم ۲۰۸ صفحات۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنے۔

انتخاب ہے فراق کی نظموں کا جو خود فراق ہی نے کیا ہے۔ اس میں غزلیں، رباعیاں، نظمیں اور متفرق اشعار بھی کچھ ہے۔ شروع میں فراق کا لکھا ہوا دیباچہ بھی ہے، جس میں انھوں نے حقیقی شاعری کی حقیقت پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

متفرق اشعار کے سلسلہ میں بہت سے اشعار وہی ہیں جنھوں نے فراق کو صفِ اول کے شعراء میں جگہ دلوائی، اور نظموں میں بعض ایسے اشعار بھی ہیں جن کو دیکھ کر لوگوں کو اعتراض کرنے کا موقعہ ملا۔

بہرحال یہ مجموعہ اس لحاظ سے کہ یہ فراق ہی کا انتخاب ہے، ان کے دوسرے مجموعوں کے مقابلہ میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔

طورِ درخشاں

مرتب: طرفہ قریشی۔ ناشر: مکتبۂ رحیمیہ مومن پورہ، ناگپور، کاغذ نفیس، طباعت و کتابت معمولی مجلد۔ ضخامت ۱۷۲ صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔

مجموعہ ہے، سی، پی و برار کے شعراء کا جو نظموں، غزلوں، قطعات اور ابیات پر مشتمل ہے اور جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وسط ہند میں بھی اُردو کا چرچا کم نہیں ہے اور وہاں بھی بہت سے خوشگو اور خوش فکر شعراء پائے جاتے ہیں۔ اکثر شعراء کی تصویریں بھی اس مجموعہ میں شامل کر دی گئی ہیں، جس نے اس کتاب کو زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

گنجہائے گرانمایہ

مصنف: پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ ناشر: کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی۔ کاغذ اور طباعت و کتابت نفیس، مجلد معہ گردپوش کے۔ ضخامت ۲۶۴ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

یہ قلمی تصویر ہے ان (مرحوم) اکابر کی جن سے رشید صاحب متاثر ہوئے اور اُن جذبات کی جو ان حضرات سے ملنے کے بعد رشید صاحب کے دل میں پیدا ہوئے۔ ان میں پہلا نام مولانا محمد علی مرحوم کا ہے اور آخری (تیرھواں) نام شیخ حسن عبداللہ کا ہے۔ باقی ناموں میں ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان اشرف، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر اقبال،

سید سجاد حیدر اور سرسلیمان خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اس کتاب میں مزاحیہ عنصر بہت کم ہے اور رشید صاحب زیادہ سنجیدہ نظر آتے ہیں، لیکن یہ سنجیدگی اس قسم کی سنجیدگی ہے جو ایک صحیح مزاحیہ نگار کے قلب میں تلخ حقایق۔ کے احساس کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جو زبان سے ادا ہونے کے بعد دنیا کے نہایت دلدوز ٹریجڈی بنجاتی ہے۔

کتاب، اس قدر دلچسپ ہے کہ ایکبار اُٹھا لینے کے بعد اسے بغیر ختم کئے ہوئے رکھا نہیں جا سکتا۔

ذکر شبلی

مصنف: مولوی محمد امین زبیری۔ ناشر: دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ کاغذ نفیس، طباعت و کتابت صاف، مجلد، ضخامت ۲۴۶ صفحات۔ قیمت سیہ

یہ کتاب تبصرہ ہے سید سلیمان ندوی کی کتاب حیات شبلی پر، جس میں بتایا گیا ہے کہ سید صاحب نے اس کتاب میں کس قدر مسخ حقیقت اور التباس سے کام لیا ہے۔

بچوں کا لٹریچر

اس سلسلہ کی پانچ چھوٹی چھوٹی کتابیں کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی کی طرف سے موصول ہوئی ہیں، جن کا نام بھولا بچہ، بہادر سندر، انوکھی ملاقات، کیسا چکمہ دیا اور چیلا بلا ہے۔ یہ سارے مشہور اہل قلم کے لکھے ہوئے ہیں اور نہایت نفیس کاغذ پر معہ رنگین و سادہ تصاویر کے بہت دیدہ زیب طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کئے ہیں۔

ہمارے یہاں بچوں کے لٹریچر کی بہت کمی ہے۔ اس لئے کتابی دنیا کی یہ کوشش قابل مبارکباد ہے۔ ان کی قیمت ۶ر سے ۱۲ر تک ہے۔

شہناز

مترجم: حبیب اشعر دہلوی۔ ناشر: رایل ایجوکیشنل بک ڈپو، اُردو بازار دہلی، طباعت، کتابت، کاغذ نفیس، مجلد معہ رنگین گردپوش کے۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت چار روپے۔

یہ وہی چیز ہے جو واجد ولیمن کے نام سے نگار میں شایع ہو چکی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ مترجم دونوں کے مختلف ہیں۔ حبیب اشعر صاحب کو عربی سے ترجمہ کرنے کا خاص سلیقہ حاصل ہے۔ ہماری رائے میں اصل کتاب کے ناموں کو بدلنا مناسب نہ تھا۔

نگار

تصنیف: ہم شفیق بریلوی۔ ناشر لندن بک ڈپو بریلی۔ کاغذ سفید، طباعت و کتابت گوارا۔ مجلد معہ رنگین گردپوش کے۔ ضخامت ۲۷۵ صفحات، قیمت پانچ روپیہ۔ یہ کتاب ایک قسم کی فلم ڈائرکٹری ہے جس میں ہندوستانی فلمی اداروں کے ڈائرکٹروں اور مشہور اداکاروں کے حالات (جن میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں) معہ تصاویر کے درج کئے گئے ہیں۔ دیباچہ میں مصنف نے ہندوستان کی فلمی صنعت پر تاریخی روشنی ڈالی ہے اور بعض مشہور فنکاروں نے بھی اس صنعت کے حال و مستقبل پر اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب فی الجملہ مفید ہے اور اہل نظر اور تماشائی دونوں اس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

ادارۂ "نئی زندگی" کا معرکہ آرا اقدام

سیاسی ادب میں قابل قدر اضافہ

اردو زبان کا واحد بین الاقوامی مصور ماہنامہ

جہاں نما

اُفق صحافت پر پہلی جولائی سے جلوہ آرا ہوگا

اب کہ ہندوستان آزادی کی نئی وسعتوں میں قدم رکھنے والا اور بین الاقوامی سیاسیات میں آزاد حکومت کی حیثیت سے حصہ لینے والا ہے یہ انتہائی ضروری ہوگیا ہے کہ ہر ہندوستانی اب اپنی محدود دنیا سے نظر آگے بڑھائے اور اپنے پڑوسی اور دوسرے ممالک میں ہمارے سفارت خانے کھل چکے ہیں اور دوسرے ممالک میں کھلنے والے ہیں، تیسری جنگ عظیم کی گھٹائیں چھا رہی ہیں جس میں ہمیں تماشائی بن کے رہنا نہیں اس لئے ہندوستان کو ایک خارجہ پالیسی متعین کرنے کی ضرورت ہے اور دنیا کی قوتوں میں بڑی دانشمندی سے اپنے دوستوں کا انتخاب کرنا ہے۔ ایسی صورت میں ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کو دوسرے ممالک کے حالات سے دلچسپی لینے اور اُن کی سیاسی پیچیدگیوں سے باخبر رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

سیاسیات عالم پر اہم مقالات بین الاقوامی مسایل پر بصیرت افروز تبصرے

انجمن اقوام متحدہ کی کارروائیوں پر بے لاگ تنقید، بین الاقوامی شخصیتوں کے حالات ممالک اسلامی، مشرق بعید، بحیرۂ روم، افریقہ، یورپ، روس، امریکہ کے متعلق معلومات افزا مضامین، اس کے اہم اجزا ہوں گے۔

اڈیٹر:- سید انیس الرحمن

سائز ۲۲ × ۱۸/۸ ڈیمی ۴۸ صفحات

سالانہ: چار روپے فی پرچہ: چھ آنے

منیجر رسالہ "جہاں نما" ۹۰ میوسٹل روڈ - الہ آباد

اردو کو مفید اور زندہ لٹریچر سے مالا مال کرنے کے لیے "جہاں نما" کی سرپرستی فرمائیے

مشہور سیاسی رسالہ "نئی زندگی" کا

سالانہ نمبر جولائی ۱۹۴۷ء

دستور نمبر

ہوگا، جسکے سارے مضامین ہندوستان کے دستوری مسئلے سے متعلق ہوں گے۔

ہندوستان کے لئے کس قسم کا دستور مناسب ہو؟ - جمہوریت ہو، سوشلزم ہو یا ڈکٹیٹر شپ؟ - ملک کا نظام حکومت کس ڈھنگ کا ہو؟ ووٹ کا حق کن لوگوں کو ملنا چاہئے؟ مجالس مقننہ کس نوع کی ہونی چاہئے؟ صوبوں کے اختیارات کیا ہوں؟ اور مرکز کو کون کون سے صیغے سونپنے چاہئیں؟ اقلیتوں کے مسئلے کا کیا حل ہو؟ - ریاستوں کا معاملہ کس طرح سلجھایا جائے؟ پاکستان کا دستور کس وضع کا ہونا چاہئے؟ - ہندوستان اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلیوں کے کیا فرائض ہوں؟ - بنیادی حقوق کیا ہوں؟

ان معاملات کو دنیا کے دوسرے ملکوں نے کس طرح حل کیا ہے؟ - دوسرے ملکوں میں کس قسم کے دستور رائج ہیں؟ - ان تمام سوالوں کا جواب آپ کو دستور نمبر میں مل جائے گا جس میں ملک کے مشہور ماہرین آئین دستور پر سیر حاصل بحث کریں گے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی دستوری تاریخ اعداد و شمار اور حکومت کے اعلانات اور دوسرے ضروری و سیاسی دستاویز بھی شامل ہوں گے۔

اڈیٹر: سید عطیق الرحمن ضخامت ۲۰۰ صفحات

قیمت مجلد ہے، علاوہ محصول ڈاک، سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ صرف ۶ روپے

قیمت بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں، وی پی نہ بھیجا جائے گا۔

مشتہرین موقع سے فائدہ اٹھائیں

منیجر رسالہ "نئی زندگی" - الہ آباد

مستقل خریدار بنکر تعمیری لٹریچر پیدا کرنے میں مدد دیں

حاجیوں کے لئے اعلیٰ قسم کا جہاز

مغل لائن کا نیا کارنامہ

مغل لائن (بمبئی) نے ایک بالکل نیا جہاز تعمیر کروایا ہے، جسے حال ہی میں بندرگاہ گلاسگو میں اُتارا گیا۔ بعض اخباروں نے اس خبر کو شایع کرتے ہوئے جہاز کے نام میں خفیف سی غلطی کی ہے۔ جس کی وجہ سے عوام میں غلط فہمی پھیل جانے کا احتمال ہے۔ اس جہاز کا صحیح نام "**محمدی**" ہے۔ اسی مبارک نام کا ایک اور جہاز مغل لائن کے پاس پہلے بھی تھا۔

"محمدی" جہاز حاجیوں کو ہندوستان اور حجاز کے درمیان لانے لیجانے کے لئے خاص طور پر تعمیر کروایا گیا ہے۔ اس کا مجموعی وزن چھ ہزار تین سو ٹن ہے اس کے دو ٹوئن ڈیکسوں میں چودہ سو پچاس حاجیوں کی گنجایش رکھی گئی ہے، تمام مسافروں کے سونے کے لئے الگ الگ تختے (BUNK) بنے ہوئے ہیں، جہاز کی لمبائی چار سو ستاون فیٹ، چوڑائی ساٹھ فیٹ اور گہرائی چھتیس فیٹ چھ انچ ("اے" ڈیک) ہے۔ ٹوئن ڈیکوں کے علاوہ اس کے بالائی اور زیریں پرامینڈ ڈیکوں پر باسٹھ حاجیوں کے لئے سنگل اور ڈبل برتھ کیبن ہیں۔

"محمدی" حاجیوں کے تمام جہازوں میں بالکل جدید وضع کا ہے اس کی رفتار ان سارے جہازوں سے تیز تر ہوگی جو ہندوستان اور حجاز کے درمیان اب تک چلتے رہے ہیں۔ اس میں حاجیوں کو جو آسائشیں اور سہولتیں ملیں گی وہ اس سے قبل کسی بھی جہاز میں میسر نہ تھیں۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

بنک اسٹریٹ کلکتہ

"نگار" کا جوبلی نمبر

پاکستان نمبر ہوگا

۱۔ لیکن اس میں نہ حصول پاکستان کی تاریخ ہوگی، نہ مسلم لیگ کے جدوجہد کی داستان، کیونکہ اس سے ہر شخص واقف ہے۔ بلکہ پاکستان اور ہندوستان کی تمام مسلم آبادی کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا جائے گا تاکہ مسلمانوں کی یہ جدید آزاد حکومت اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی — گویا بہ لحاظ موضوع یہ

تمدن اسلامی نمبر بھی ہوگا

۲۔ اس نمبر کی ضخامت ۵۰۰ صفحات سے زیادہ ہوگی اور اس کی طیاری میں ہم کو تین ہزار روپیہ زاید صرف کرنا پڑیں گے اس لئے خریداران نگار سے امید ہے کہ وہ اس مخصوص نمبر کے لئے جو کتابی صورت میں ۶۰۰ صفحات کو محیط ہوتا۔ سوا روپیہ زیادہ دینا گوارا فرمائیں گے اور یہ سمجھ کر کہ ایسے قیمتی نمبر کو آپ کبھی ہاتھ سے دینا پسند نہ کریں گے۔ ہم ان حضرات کے نام جن کا چندہ دسمبر ۴۷ء یا جنوری ۴۸ء میں ختم ہوتا ہے، جنوری ۴۸ء کا نگار (پاکستان نمبر) ذریعہ وی، پی چھ روپیہ آٹھ آنے میں (معہ محصول) روانہ کریں گے اور جن کا چندہ ختم نہیں ہوتا ان کے نام اس کا وی، پی ڈیڑھ روپیہ بھیجا جائے گا۔

تمام مقالات اڈیٹر نگار کے قلم کے ہونگے

مختصر فہرست ملاحظہ ہو:— تاریخ سندھ کے اہم واقعات ۱۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۵ اگست ۴۷ء تک — سندھ کی اولین مسلم حکومت۔ سندھ کے مسلم فرمانرواؤں کا حسن انتظام اور ان کی رواداریاں — غزنوی عہد کی برکات — ہندوستان کے مسلم بادشاہوں کی قابل ذکر خصوصیات — علوم اسلامی پر مورخانہ نظر — عجم کے کارنامے اسلام کے عہد زریں میں — حکومت اسلام اور سنسکرت — قدیم تمدن اسلام کی بلندی — اندلس کے آثار علمیہ — عہد عباسیہ کا دور زریں — فن رقص اور تاریخ اسلام۔ فنون لطیفہ اور اسلام — تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل — عہد اسلام میں کنیزوں کا اقتدار — یوروپ کی موسیقی پر عربوں کا اثر — موسیقی عہد نبوی و خلفاء راشدین میں — عہد وسطی کے فنون لطیفہ اور اسلام — خواتین عرب کی فیشن طرازیاں وغیرہ وغیرہ — اس نمبر میں حضرت نیاز کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہوگا اور مختصر سوانح حیات بھی، اگر ضخامت بڑھانا ناممکن نہ ہوا۔

جو حضرات سوا روپیہ زاید دینا پسند نہ فرمائیں، وہ ازراہ کرم مطلع فرمادیں تاکہ انکے نام جوبلی نمبر نہ بھیجا جائے۔

غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت معہ محصول سوا تین روپیہ ہوگی۔

منیجر نگار

تصوف اور اُردو شاعری

از پروفیسر سید صفی حیدر دانش ایم اے

اُردو شاعری فارسی کی گود میں پلی اور گود میں پلی اور گو فارسی کے تمام شاعر صوفی نہ تھے لیکن ان میں آپ کو ایک بھی ایسا نہ ملے گا جس نے اپنی شاعری میں سوز و گداز، رفعتِ تخیل اور پاکیزگی خیالات پیدا کرنے کے لئے تصوف سے مدد نہ لی ہو، اُردو شعراء کو تصوف کی یہ چاٹ ورثہ میں ملی - چنانچہ تصوف کے واردات و حقایق اور اس کی اصطلاحات اُردو شاعری میں کچھ اس طرح رچ گئی ہیں کہ جب تک تصوف کا علمی پس منظر اور اس کے باطنی احوال و کوائف کا خاکہ ہمارے سامنے نہ ہو، اُردو شاعری کے فن پاروں سے صحیح معنوں میں محظوظ ہونا قریب قریب ناممکن ہے --- اس موضوع پر اُردو میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ مصنف نے شروع میں تصوف کی تاریخ بیان کی ہے۔ اسکے بعد تصوف کے وہ مسایل جن کا اُردو شاعری میں بار بار ذکر آتا ہے، اُن کی وضاحت کی ہے اور ساتھ ساتھ نمونے کے اشعار بھی دئے ہیں اس کتاب میں تصوف کے دقیق حقایق کو مصنف نے ایک حقایق عالم کی طرح سلجھایا ہے اور اُردو شاعری کے محاسن کو ایک صاحب ذوق ادیب کی طرح پیش فرمایا ہے - قیمت دو روپے بارہ آنے -

نئی کتابیں

ضرورۃ القرآن	قاضی زاہد الحسینی	للعہ ۸ر
حلیۃ النبی	آپ کی شمایل کی احادیث کا مجموعہ	عہ ر
کاروانِ خیال	مولانا ابوالکلام کے خطوط کا دوسرا مجموعہ	ہے ۸ر
ردِ نیچریت	علامہ جمال الدین افغانی	عا ر
تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ تاریخ		عا ۱۲ر
مشاہدات و معارف (تصوف)		للعہ ر
تصوف کے آداب و اشغال اور ان کا فلسفہ		عا ۱۲ر
مسلمان اور غیر مسلم حکومت	سیاست حاضرہ پر ایک تبصرہ	عا ۸ر
خاتونِ اسلام کا دستورِ حیات		عہ ۱۲ر
صحیفہ سلطان ٹیپو	محمود مورخ اول	للعہ ر
ارشادات جمال الدین افغانی		عا ۸ر
روس انقلاب کے بعد	م م جوہر	ہے ر
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	عا ۸ر
شبلی نامہ	اکرام، مولانا کا ایک شخصی تجزیہ	ہے
خطوط مشاہیر	مرتبہ مولانا عبد الماجد دریابادی	ہے ر
نئے پُرانے چراغ	(تنقید) آل احمد سرور	للعہ ۴ر
افادی ادب	اختر انصاری	عہ ۴ر
یورپ کے سفر	مولانا محمد علی	عا ۸ر
ہندوستانی تعلیم اور اس کے مسایل		ہے ۴ر
رموز اقبال	ڈاکٹر میر ولی الدین	عا ۴
ننگا پاؤں	افسانے شیر محمد اختر	عہ ۱۲
ہوائی	ناول - سلطان حیدر جوش	عا ۸ر
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	ہے ۸ر
لینن سوانح	محمد مسعود جوہر	عہ ۴ر

سندھ ساگر اکاڈیمی - ۵۸ ٹمپل روڈ - لاہور

جوبلی نمبر کا اشتہار صفحہ ۱ پر دیکھ کر جلد سے جلد اطلاع دیجئے کہ آپ اسکو حاصل کرنا چاہتے ہیں یا نہیں

نگار

مدیر خصوصی: نیاز فتحپوری

جلد ۵۲ | فہرست مضامین ستمبر ۴۷ء | شمارہ ۳

ملاحظات ---------- ۳
آزادی اور تقسیم ---------- ۵
افشار کے اطوار و اخلاق ... رحمت نبی خاں ام۔ اے (علیگ) ---- ۱۶
ہندسوں کی ایجاد و ترقی پر ایک تحقیقی تبصرہ ---- ح۔ا ---- ۲۰
فارسی کے ساقی نامے ---- نذیر احمد ام۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی ۲۸
باب الاستفسار و المناظرہ ---------- ۳۸
مالہ و ما علیہ ---------- ۴۴
مسولینی کے قتل کی داستان ---------- ۴۶
دلچسپ معلومات ---------- ۵۱
گرد منزل (نظم) --- پروفیسر شور ---------- ۵۶
منظومات ... لطیفی رضوانی، سلیمان اریب۔ ادیب۔ قمر۔ حرمت الاکرام --- ۵۷
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۹

ملاحظات

وقت کا اہم ترین سوال

ہندوستان آزاد ہوگیا اور اس میں شک نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ غاصب حکومت سے جنگ کئے بغیر کسی ملک نے آزادی حاصل کی ہو، لیکن شاید اس کی بھی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی کہ حصول آزادی کے زمانہ میں ایک ہی ملک کی مختلف قوموں نے اس قدر خونریزی کی ہو، جتنی ہندوستان میں ہوئی اور ہو رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بظاہر دیکھنے میں تو آزادی کا پرچم ہر جگہ لہرا رہا ہے، لیکن لوگوں کے دل غمگین ہیں، روحیں افسردہ ہیں اور بجائے مسرت کے سینہ غموں سے لبریز ہے۔

وہ خاندان یا افراد جو براہ راست اس ہنگامہ سے متاثر نہیں ہیں، وہ ان مصائب کا اندازہ نہیں کر سکتے جن میں اسوقت لاکھوں انسان ملک کے مختلف حصوں میں مبتلا ہیں، اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب تک پانی خود اس کے سر سے نہ گزر جائے، وہ دوسرے ڈوبنے والوں کی پروا کم کرتا ہے، لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو ان لوگوں کی جگہ رکھ دیں، جن کی اولادیں ان کے سامنے ذبح کی گئیں۔ جن کی عورتوں کو انکے سامنے بےحرمت کیا گیا اور جن کے گھروں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا تو تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس ملک کے لاکھوں افراد اس ننگ انسانیت وحشت و درندگی کا شکار ہو رہے ہیں، وہاں شیون و واویلا کا کیا عالم ہوگا اور وہاں کونسا دل ایسا ہو سکتا ہے جو ملک کی اس خونیں آزادی پر

اظہار مسرت کرے گا۔

پھر سوال اس وقت نہ ہندو مسلمان کا ہے، نہ پاکستان و ہندوستان کا اور نہ اس بحث کا کہ ابتدا کس کی طرف سے ہوئی اور کون اس اختلاف و خونریزی کا باعث ہوا، بلکہ صرف اس امر پر غور کرنے کا کہ آیا اس کا سدّ باب ممکن ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کے لئے کیا تدبیر اختیار کرنا چاہئے۔

اس وقت مشرقی اور مغربی پنجاب کے لاکھوں ہندو مسلمان ہجرت کرکے لکھنؤ، دہلی، کراچی اور لاہور پہونچ رہے ہیں اور فضا اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ بعض جگہ ریلوں کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی ہے، ڈاک کا انتظام بھی درہم برہم ہو گیا ہے، یہاں تک کہ تار و ٹیلی فون کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا ہے لیکن اس کی اصلاح کے لئے سوا چند مشاورتی کانفرنسوں اور جلسوں کے اس وقت تک کوئی عملی قدم کسی حکومت کی طرف سے نہیں اٹھایا گیا، کسی علاقہ کو صرف "ہنگامہ زدہ" قرار دیدینا، یا فوج کے ہاتھ میں اس کا انتظام دیدینا، کبھی مفید نہیں ہو سکتا، کیونکہ فوج یا پولیس نہ ہر جگہ پہونچ سکتی ہے اور نہ اس تعصب سے خالی ہو سکتی ہے جو اصل سبب اس نزاع و اختلاف کا ہے۔ بلکہ اس کی صرف وہی ایک تدبیر ہے جو مہاتما گاندھی نے اختیار کی ہے، جس کی تعریف تو سب کرتے ہیں، لیکن اس پر عمل کرنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سامنے بڑے بڑے اہم مسایل ہیں، لیکن امن و سکون کا مسئلہ یقیناً سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ جب تک یہ طے نہ ہو، نہ آیندہ کے لئے کوئی اسلوب کار متعین ہو سکتا ہے اور نہ دفتری انتظام درست ہو سکتا ہے اس کا واحد حل صرف یہ ہے کہ ہندو مسلم جماعتوں کے بڑے بڑے مقتدر لوگ ایک ساتھ ایک تمام علاقہ کا دورہ کریں، ہندو مسلم آبادی کے سر برآوردہ لوگوں کو فراہم کرکے ان کی بے اطمینانی و بے اعتمادی کو دور کرکے ایک دوسرے کے گلے ملوائیں اور اس وقت تک واپس نہ آئیں، جب تک قیام امن و سکون کا پورا اطمینان نہ ہو جائے۔ اس کی ایک روشن مثال ہمارے سامنے موجود ہے اور وہ یہ کہ کلکتہ جہاں مہینوں سے روز کشت و خون کی واردات ہوتی رہتی ہیں، محض مہاتما گاندھی کے خلوص اور عوام کے ساتھ ان کے قیام و اختلاط نے فضا بالکل بدل دی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ وہ روز بروز صاف ہوتی جائے گی۔ لیکن اگر قاید اعظم یا پنڈت نہرو خود اتنی تکلیف نہیں اٹھا سکتے (حالانکہ ان کا فرض اولین اس وقت یہی ہے کہ وہ خود جاکر اپنی آنکھوں سے اس کشت و خون کو جاکر دیکھیں) تو پاکستان اور ہندوستان دونوں حکومتوں کو مہاتما گاندھی سے التجا کرنا چاہئے کہ وہ فی الحال نواکھالی کا خیال ترک کر دیں اور پنجاب آکر اس آگ اور خون کے کھیل کو ختم کر دینے کی کوشش کریں۔

مذاہب کی قدامت پرست دنیا میں ہلچل ڈال دینے والا
درس انسانیت و اخوت عامہ کا پہلا اور آخری صحیفہ

من و یزداں

(اڈیٹر نگار کے قلم سے)

جس میں مذاہب کی تاریخ، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، کتب آسمانی کی حقیقت اور عقاید دینی کی اصلیت پر نہایت بلند انشا اور خطیبانہ انداز میں علمی، تاریخی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ کاغذ، طباعت و کتابت بہت نفیس، حجم ۶۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد سات روپے آٹھ آنے علاوہ محصول، ۳۰ ستمبر سے اس کی روانگی شروع ہو جائے گی۔

منیجر نگار - لکھنؤ

آزادی اور تقسیم

یقیناً یہ مژدہ ہر ہندوستانی کے لئے مسرت بخش ہے کہ اب وطن عزیز غلامی کے بندھنوں سے آزاد ہو رہا ہے۔ لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ اس تاریخی موقعہ پر ہم ملک میں خوشی کی وہ لہر نہیں پاتے جو قدرتی طور پر ہونی چاہئے تھی۔ آزادی اور تقسیم کچھ اس طرح ساتھ ساتھ آئی ہے کہ ہماری خوشی آدھی رہ گئی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تقسیم کا رنج آزادی کی مسرتوں پر غالب آگیا ہے اور اس نے ہمیں سوگوار بنا دیا ہے۔

آج ہر محب وطن پر شکست خوردگی کے آثار نمایاں ہیں، کیونکہ ہمیں یہ احساس چین نہیں لینے دیتا کہ ہم نے سیاست کے میدان میں برطانیہ سے شکست کھائی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم برطانی سیاست کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، جس پر وہ جس قدر فخر کریں کم ہے۔ جس متحدہ ہندوستان کے لئے کانگریس سے اس لئے قربانیاں کرائی گئیں کہ ایک کمزور سے کمزور مرکز کو بھی قایم رکھا جا سکے۔ اسی مرکز کو برطانی مزدور حکومت نے ایک سال بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہمیں بھی اسے مان لینا پڑا، کیونکہ "حالات" سے ہم بھی مجبور تھے لیکن یہ حالات کس کے پیدا کردہ تھے؟ انگریز جب کوئی قدم اٹھانا چاہتا ہے تو اس کے لئے موافق حالات اور سازگار فضا پیدا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک کو تقسیم کرنے کے لئے موجودہ فرقہ وارانہ فضا سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا۔

کانگریس کی کمزوریاں

لیکن آج ہم جس دلدل میں آکے پھنس گئے ہیں اس کے لئے محض برطانیہ ہی کو مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ خود ہماری چند بنیادی غلطیاں بھی ہیں جو یقیناً ملک کو اسی سمت لے جانے والی تھیں، جہاں وہ آج ہے۔

مسلمانوں کے معاملہ میں کانگریس نے اپنا یہ اصول رکھا کہ مسلم عوام الناس کو کانگریس میں لانے کی کوئی کوشش نہ کی جائے، اور ان کا جو شخص بھی لیڈر بن جائے، اس سے مفاہمت کر کے آزادی کی جد و جہد کو آگے بڑھایا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۲۰ء کے بعد کانگریس نے مسلمانوں کو قطعاً چھوڑ دیا اور اس کا دائرۂ عمل محض ہندوؤں تک محدود رہا۔ جو مسلمان اپنی حب وطنی کے سبب کانگریس سے چمٹے رہے، وہ چمٹے رہے، بقیہ کے لئے کانگریس نے کوئی فکر نہ کی اور دوسری قوموں کو اپنے ساتھ لینے کی کبھی کوئی سنجیدہ جد و جہد نہ کی۔ لہذا جب مسلمانوں کو کانگریس نے چھوڑ دیا، تو پھر اس آزاد گھوڑے پر جو بھی سوار بیٹھ گیا، وہ اس کے اشاروں پر چلنے لگا اور جس کسی نے بھی مذہب کا نام لیکر اسے بلایا، وہ اسی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ قصور نہ مسٹر جناح کا ہے نہ مسلم لیگ کا۔ اگر مسٹر جناح نہ ہوتے تو کوئی اور مسٹر یا مولانا اٹھ کھڑے ہوتے اور اگر مسلم لیگ نہ ہوتی تو کوئی اور لیگ یا انجمن بن جاتی۔

غرضیکہ کانگریس نے آج تک مسلم عوام میں کام کرنے کی کبھی کوئی بڑی اور سنجیدہ کوشش نہ کی، اور محض ایک مد فضول کی طرح اس کے پروگرام میں "ہندو مسلم" اتحاد شامل رہا اور کانگریس ارگنائزیشن میں کام کرنے کے تجربات کے لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کبھی اس "مد فضول" پر کوئی عمل نہ کیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے جس قدر زور ہریجن کے مسئلے پر دیا ہے اگر اتحاد کے مسئلہ پر دیتے تو یقیناً آج مسلمان کانگریس میں ہوتے۔ اس صورت میں کہ مسلم قوم کا دماغ کانگریس کے ساتھ ہے، مسلمانوں کے تمام مفکرین، مدبر، علماء کرام، مقرر، محرر، شعراء اور ادیب کانگریس کے ساتھ ہیں، پھر بھی کانگریس کے اندر خود اس قدر

جھگڑے رہے کہ اس طرف توجہ کرنے کی نہ کسی کو فرصت رہی اور نہ پروا۔ ۱۹۳۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر ہوئے تو انھوں نے نہایت خلوص اور تندہی کے ساتھ مسلم رابطۂ عوام کے کام کو چلانا چاہا، لیکن خود کانگریس والوں نے اس تحریک کو ناکامیاب بنایا، اور یہ تحریک اگر کچھ چلی تو جواہر لال کی وجہ سے صرف صوبہ متحدہ میں چلی، جس کا تھوڑے ہی عرصے میں خاطر خواہ اثر ہوا۔ لیکن مسلم لیگ کی تحریک جوابی کارروائی کے طور پر اور زیادہ زور پکڑ گئی تو ماس کنٹیکٹ پروگرام کو بند کر دیا گیا۔ اس تحریک کی ایک بنیادی کمزوری یہ بھی تھی کہ کانگریس نے نہایت غلط طور پر یہ سمجھا کہ کانگریس میں مسلمانوں کو لانے کا کام مسلمان کانگریسیوں اور نیشنلسٹوں ہی کا ہے۔ حالانکہ نیشلسٹ آرگنائزیشن ہونے کی حیثیت سے یہ کام کانگریس کے ہندوؤں کا بھی تھا۔

مہاتما گاندھی نے مسلمانوں میں کام کرنے کے بدلے جناح کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کو زیادہ مناسب سمجھا، جس کا نتیجہ آج ملک کی تقسیم میں ہمارے سامنے ہے۔ گاندھی جی کی موجودہ مایوسی کا راز یہ ہے کہ انھیں پکی امید تھی کہ جب چاہیں گے جناح کو راضی کر لیں گے۔ کانگریس کے لیڈر اکثر کہا کرتے تھے کہ "اگر آج چلے جائیں تو دو گھنٹوں کے اندر ہندو مسلم سوال حل ہو جائے گا۔ کیونکہ مسلم لیگ اور جناح کی حب الوطنی پر انھیں تکیہ تھا، لیکن ہمارے ان بزرگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ فرقہ پروری کس حد تک جا سکتی ہے۔ ہمارے لیڈروں نے فرقہ پروری کو مٹانے کی کوشش نہ کی، بلکہ ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کا شارٹ کٹ (راستہ) ڈھونڈھا، یعنی جناح سے مفاہمت۔ لیکن آزادی کا کوئی شارٹ کٹ راستہ نہیں ہے۔ عوام کو ساتھ لینے کے بدلے لیڈروں کے پیچھے پیچھے بھاگنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ بنیادی چیز تو یہ تھی کہ ہمیں رجعت پسندی کی کبھی ہمت افزائی نہ کرنی تھی، اور نہ کبھی کسی فرقہ پرور انجمن یا اس کے قائد کی حیثیت کو تسلیم کرنا تھا اور جس طرح کانگریس نے ہندو مہا سبھا کو کبھی منھ نہ لگایا، اور اس کی کوئی پوزیشن نہ بن سکی، اسی طرح مسلم لیگ کو بھی تسلیم نہ کرنا تھا۔ ہمیں رجعت پسندی اور آزادی دشمن طاقتوں سے لڑنا ہے نہ کہ اُسے اور زیادہ طاقتور بنانا۔

لیکن کانگریس کو "مجبوراً" ایسا کرنا پڑا۔ وہ مجبوری کیا تھی؟ وہ کانگریس کی ایک دوسری کمزوری ہے۔ یعنی اس کی بیک وقت انقلابی اور پارلیمنٹری حیثیت۔ کانگریس انقلابی جماعت بھی ہے، اور پارلیمنٹری جماعت بھی۔ کبھی تو وہ انقلابی تحریک اُٹھا کر حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرتی ہے، اور کبھی اسی بیرونی حکومت سے تصفیہ کر کے الکشن لڑتی ہے۔ اگر کانگریس محض انقلابی جماعت ہوتی تو اسے کسی سے تصفیہ کی ضرورت نہ تھی، ہم ایک مکمل انقلاب کر کے اور بیرونی طاقت کو منہدم کر کے، فرقہ پروری سے نپٹ لیتے۔ لیکن کانگریس کی یہ بھی پالیسی ہے کہ جو کچھ ملتا جائے لیتے جاؤ اور جس حد تک بھی حکومت کر سکتے ہو کرو۔ مسلم لیگ سے بات چیت کرنے کی ضرورت اسی لئے پیش آئی کہ ہمیں حکومت کرنے کی بھی جلدی ہے، خواہ وہ کیسی ہی ہو، اور چونکہ انگریز کہتا ہے کہ اس کام کے لئے دونوں قوموں میں تصفیہ ہونا ضروری ہے، اس لئے مسلم لیگ سے گفت و شنید کی ضرورت بھی آجاتی ہے۔ کانگریس معقولیت کی بنا پر مسلمانوں کو جو کچھ دے سکتی ہے اس سے زیادہ برطانیہ اُسے دیدیتا ہے اور گفت و شنید بھی بڑھتی جاتی ہے اور مطالبات بھی۔ یہاں تک کہ مساوات (Parity) تک کی نوبت آجاتی ہے۔ لیکن گفت و شنید کی حکمت عملی کا انجام دیکھئے کہ ہم مساوات دیکر بھی مسلم لیگ کو راضی نہ کر سکے۔

مسلم لیگ سے گفت و شنید پر ہم کیوں مجبور رہیں۔ اس کا سبب ایک اور "مجبوری" ہے۔ یعنی جداگانہ انتخاب آج چھوٹے سے بڑے تمام کانگریسی اور غیر کانگریسی لیڈروں کی زبان پر فیشن کے طور پر یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے کہ "ہماری ساری پریشانیوں کا سبب جداگانہ انتخاب ہے"۔ لیکن یہی وہ لیڈر ہیں جنھوں نے جداگانہ انتخاب کو ۱۹۱۶ء میں تسلیم کیا تھا۔ اور یہ جانتے ہوئے تسلیم کیا کہ یہ غلط چیز ہے اس کے بعد ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے وقت ایک اور موقع آیا تھا کہ ہم اس زہر ہلاہل کو اپنی سیاست سے نکال پھینکتے۔ لیکن اُس وقت پھر کوئی "مجبوری" آگئی کہ ہمیں کمیونل اوارڈ کو تسلیم کرنا پڑا۔

وہ مجبوری کیا تھی - وزارتیں بنانا - اُسی وقت کسی سربرآوردہ لیڈر نے کانگریس میں برسر اجلاس کہا تھا "ایسی صورت میں کہ اختیارات مکمل نہیں ملے ہیں، اور انگریز اس ملک کے اندر موجود ہے، ہمیں وزارتیں نہیں بنانی چاہئیں، ورنہ ملک برباد ہو جائے گا"۔ اور وہی ہوا - ہم ۱۹۳۶ء کے الیکشن میں حصہ نہ لیتے، ہماری وزارتیں چولھے بھاڑ میں جاتیں، لیکن ہمیں کبھی اس غلط چیز یعنی جداگانہ انتخاب کو نہ ماننا تھا - ابھی حال میں یو-پی اسمبلی میں گاؤں حکومت بل پیش کرتے ہوئے مسلم لیگ کے جواب میں ڈاکٹر کاٹجو نے کیا اچھی بات کہی تھی کہ - "ہم گاؤں میں پنچایتی حکومت کے خیال کو ترک کر دیں گے، گاؤں حکومت بل کو واپس لے لیں گے - لیکن جداگانہ انتخاب کو نہ مانیں گے"۔ غرضیکہ ہم نے جداگانہ انتخاب کو اس لئے مان لیا کہ "مجبور تھے" - کمیونل اوارڈ کو اس لئے مان لیا کہ "مجبور تھے" - مسلم لیگ کو اس لئے مانا کہ مجبور تھے - عارضی حکومت کو اس لئے مانا کہ مجبور تھے - اور بالآخر ہندوستان کی تقسیم کو اس لئے مان لیا کہ "مجبوری تھی" - غرضیکہ ہم ایک مجبوری سے دوسری مجبوری میں پھنستے ہی چلے جا رہے ہیں -

آج مجبور ہو کر ہندوستان کی تقسیم مان لی گئی اس لئے کہ ملک میں بد امنی اور خونریزی ہو رہی تھی - لیکن اگر ہمیں دنیا میں ایک آزاد اور بہادر قوم بن کر رہنا ہے تو ہمیں کوئی غلط چیز خونریزی کے ڈر سے نہیں ماننی چاہئے - مارشل پیتاں نے پیرس کی خوبصورت عمارتوں اور عورتوں اور بچوں کو بچانے کے لئے فرانس کو ہٹلر کے حوالے کر دیا تھا - چنانچہ فرانس ذلیل و خوار ہوا - اسٹالن نے آدھا روس برباد کر دینا گوارا کیا، لیکن ہٹلر کے غلط مطالبے کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کیا - ہم آزاد ہونے جا رہے ہیں، اگر کوئی بڑی طاقت آج ہم پر حملہ آور ہو اور وہ ہمارے شہروں کو اس طرح تباہ کرنا شروع کر دے، جس طرح اسٹالن گراڈ کو جرمنوں نے برباد کیا تھا تو شاید ہمارے لیڈر اس "مجبوری" میں ملک کو اس کے حوالے کر دیں، اور اس کی غلامی قبول کر لیں کیونکہ مجبوری ہے -

فتح کس کی ہے؟

ہم تقسیم ہند کے اس لئے بھی مخالف ہیں کہ اس سے مسلمانوں کو مجموعی طور پر سب سے زیادہ نقصان پہونچا ہے، لیکن مسلمان اپنا نفع نقصان سوچے بغیر زہر ہلاہل کے اس پیالے کو خوشی خوشی نوش جاں کر رہے ہیں -

اصل چیز یہ ہے کہ ہم دنیا کے حالات پر نظر نہیں رکھتے، حالانکہ انگریزوں کی پالیسی کی بدولت دنیا میں متعدد پاکستان قایم ہو چکے ہیں جس ملک میں بھی انکا منحوس قدم پہونچا ہے، انھوں نے وہاں ایک نہ ایک پاکستان ضرور قایم کیا ہے -

امریکہ میں جب جنگ آزادی چھڑی اور امریکہ نے آزادی کا مطالبہ کیا تو انگریزوں نے امریکہ کے ایک حصے یعنی کناڈا کو اپنی طرف کر لیا اور وہاں بڑے زوروں کی خانہ جنگی کرائی - کناڈا سے علٰحدگی کا مطالبہ کرایا، چنانچہ امریکہ تو آزاد ہو گیا لیکن کناڈا انگریزوں کے پنجے سے نہ نکل سکا، اور وہ آج تک ان کے پنجے میں ہے - برطانی فوج امریکہ سے تو چلی گئی - لیکن کناڈا میں رکھی گئی - یہ پاکستان آج بھی موجود ہے، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ممالک متحدہ امریکہ نے کس قدر ترقی کی اور کناڈا کس طرح اپنی غداریوں اور ناعاقبت اندیشیوں کے سبب پیچھے رہ گیا - اسی صدی کی بات ہے کہ آئرلینڈ نے برطانیہ سے گلو خلاصی چاہی، آئرلینڈ کی قومی تحریک کو مات دینا بڑا مشکل تھا، لہذا برطانیہ نے وہاں مذہبی سوال پیدا کیا، یعنی کیتھولک و پروٹسٹنٹ کا سوال السٹر کے صوبہ کو، جو آئرلینڈ ہی کا ایک جزو تھا، خود ارادیت کے مطالبے کے لئے اُبھارا - چنانچہ السٹر آئرلینڈ سے علٰحدہ کر دیا گیا، اور پاکستان بنا دیا گیا - آئرلینڈ آزاد ہے، لیکن السٹر انگریزوں کا غلام ہے - جب آئرلینڈ والوں نے برطانیہ سے فوجیں ہٹانے کا مطالبہ کیا تو وہ ڈبلن سے کوچ کر کے السٹر میں آکر مقیم ہو گئیں، یہ ہے برطانوی سیاست کا کمال - آئرلینڈ سے نکل بھی گئے اور آئرلینڈ میں موجود بھی ہیں، بالکل جادوگری ہے، یہی ادا

نہیں بھی — حال ہی میں بیچارے مصر نے آزادی کی جدوجہد چھیڑی - انگریزوں کو انکا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا، لیکن مصر چھوڑتے ہوئے دل دکھتا تھا، اسلئے انھوں نے سوڈان کو طیار کیا، کہ تم حقِ خود ارادیت کا مطالبہ کرو - خود مصری قوم کے ایک حصے نے مصر سے دغا کی، اور مصر کی تقسیم کا مطالبہ کیا، سوڈان مصر سے علٰحدہ کر دیا گیا، اور جب مصری نوجوانوں نے کوئٹ (Quit Egypt) کا نعرہ لگایا تو برطانی فوجوں نے اپنا ڈیرہ خیمہ قاہرہ سے اٹھایا اور سوڈان میں لاکر رکھ دیا - پاکستان بن گیا، اور مصر کے دروازے پر انگریزی افواج کی موجودگی نے مصر کی آزادی کو بالکل بے معنی بنا دیا — چنانچہ اس وقت انگریز مصر میں ہیں بھی اور نہیں بھی - یعنی وہ اب سوڈان میں ہیں، لیکن سوڈان میں ان کا وجود اتنا ہی مفید ہے، جتنا کہ وہ مصر میں ہوتے - اسی ایشیا میں ابھی ایک اور پاکستان بننے والا ہے - یعنی سرزمین فلسطین میں -

یہی نقشہ ہندوستان میں ہے - ہندوستان میں قدم رکھتے ہی انگریزوں نے یہ تلاش شروع کی کہ ہندوستان میں ایسے عناصر موجود ہیں یا نہیں، جنھیں آپس میں لڑایا جا سکے - انھیں بڑی مایوسی ہوئی - ہندو اور مسلمان شیر و شکر کی طرح ملے ہوئے تھے - استغنی ملے جلے تھے کہ انھیں لڑانے میں انگریزوں کو دو سو سال لگ گئے - چنانچہ انھوں نے مسلمانوں سے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرایا - جداگانہ انتخاب کے بعد جداگانہ ہندوستان کا مطالبہ ہوا - اب پاکستان بن جانے کے بعد کوئٹ انڈیا وعدے کے مطابق ہندوستان سے تو انگریزی فوجیں چلی جائیں گی، لیکن وہ دہلی سے بستر اٹھائیں گی اور راولپنڈی میں جاکر رکھ دیں گی، ہندوستان سے نکل بھی گئے اور ہندوستان میں موجود بھی ہیں - یہ ہے برطانوی سیاست کی عظیم الشان چالیں، جس کے مسٹر جناح کٹ پتلی بنے ہوئے ہیں،

قیام پاکستان کو مسلم لیگ کی کامیابی سمجھنے والا مسلمان بڑا ہی سادہ لوح اور بھولا بھالا ہے - اس بیچارے کو یہ نہیں معلوم کہ آج دنیا میں کس طرح سیاست چل رہی ہے، تمام فیصلے یورپ میں ہوتے ہیں، جن کی ایک لہر ہندوستان میں آجاتی ہے، اور ہمیں ان کے فیصلوں پر صدائے لبیک کہنے کی اس طرح ٹریننگ دیجاتی ہے کہ ہم اسے اپنا ہی فیصلہ اور اپنی ہی جیت کہہ کر پکارتے ہیں - آج کانگریس نے جس طرح تقسیم ہند کو مانا ہے، وہ اس کی بیّن دلیل ہے - کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم پر تمام جماعتیں متفق ہیں، لیکن دراصل یہ فیصلہ برطانی مدبرین کا ہے کہ ہندوستان تقسیم کر دیا جائے اور اب ہمارے اردگرد ایسے حالات پیدا کر دئے گئے کہ ہمارے سامنے تقسیم کو ماننے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں اور ہم اب اس برطانی فیصلے کو خود اپنا فیصلہ سمجھنے لگے ہیں -

ہندوستان کی تقسیم پر آج امریکہ حیرت انگیز طور پر خاموش ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ امریکہ کی اس وقت دلی خواہش ہے کہ پاکستان بن جائے تاکہ وہ آیندہ جنگ میں روس کے خلاف صوبہ سرحد کو اپنا زبردست فوجی اڈہ اور مورچہ بنا سکے - اسی ہفتے برطانی فوج کے سپہ سالار اعظم فیلڈ مارشل مانٹگومری پاکستان بننے کی خبر سنتے ہی ہندوستان آگئے ہیں، اور مسٹر جناح سے ان کی بات چیت ہو رہی ہے یہ سوچنے کی بات ہے -

مسلمانوں کو کیا ملا

اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے تو پاکستان کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے طرح طرح کی دلیلیں پیش کی جا رہی ہیں مثلاً — سارے ہندوستان میں ہندوؤں کا غلام بنکر رہنے سے بہتر ہے کہ بعض مقامات پر مسلمانوں کی آزاد حکومت ہو — آزادی کی جھونپڑی غلامی کے محل سے بہتر ہے — پاکستان اور ہندوستان دونوں میں اقلیتیں ہوں گی، اور اگر ہندوستان کے مسلمانوں پر مظالم ہوئے تو اس کا بدلہ پاکستان کے ہندوؤں سے لیا جائے گا — پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے گا، اس لئے ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک ہوگا - پاکستان بن جانے کے بعد اقلیتوں کی حفاظت زیادہ موثر طور پر ہو سکے گی - اگر کلکتہ کا بندرگاہ چھن گیا تو کیا ہوا، ہم چاٹگام کو کلکتہ سے بہتر بندرگاہ بنا لیں گے -

پاکستان کے باس چاول، جوٹ، گیہوں اور روئی ہوگی۔ پاکستان خود اپنے کل کارخانے قایم کرے گا، اور ایک صنعتی ملک بن جائے گا۔
پاکستان کی آبادی سات کروڑ کی ہوگی، اور وہ دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہوگا۔ پنجاب کی تقسیم سے سکھوں کے مسئلے سے نجات مل گئی۔
پاکستان میں اسلامی حکومت قایم کی جائے گی اور پھر مسلمان منظم ہو کر سارے ہندوستان کو فتح کریں گے۔ بلوچستان اور مغربی پنجاب میں کوئلہ وغیرہ کا پتہ لگا ہے، اس لئے یہ دقتیں بھی دور ہو جائیں گی۔ پاکستان کے پاس مشرقی اور مغربی ہندوستان میں لنگر کی جگہیں ہوں گی جس کے لئے ساری دنیا پاکستان کی خوشامد کرے گی وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال یہ باتیں دل تو بہت خوش کر دیتی ہیں، اور بظاہر صحیح بھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن دو منٹ غور کرنے کے بعد ان کی حقیقت کھل جاتی ہے۔
یہ کہنا کہ تقسیم نہ ہوتی تو سارے ہندوستان میں مسلمان غلام رہتے ـــ بالکل لغو سی بات ہے۔ وزارتی مشن اسکیم نے مسلمانوں کو بالکل برابر کی پوزیشن دیدی تھی۔ جہاں تک صوبوں کا سوال ہے، چھ صوبے ہندوؤں کو دئے گئے یعنی یو۔ پی، بہار، اڑیسہ، سی۔ پی، بمبئی اور مدراس اور چھ ہی صوبے مسلمانوں کو دئے گئے تھے، یعنی بنگال، آسام، پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان۔ پھر جہاں تک مرکز کا سوال ہے، اس میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوات (Parity) مان لی گئی تھی۔ غرضکہ کیا بلحاظ صوبہ اور کیا بلحاظ مرکز، دونوں حیثیت سے مسلمان برابر کی پوزیشن کے مالک تھے۔ غلامی کا سوال ہی نہیں۔ صوبوں کی مکمل خود مختاری تسلیم کر لی گئی تھی، ان کے گروہ بنا دئے گئے تھے، اور مرکز کو صرف تین صیغے (امور خارجہ، دفاع، اور رسل و رسائل) تفویض کئے گئے تھے، ان امور کے علاوہ تمام امور میں صوبے آزاد تھے اور غیر مصرحہ امور بھی صوبوں ہی کے سپرد تھے۔ غرضیکہ اس صورت میں غلامی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اگر غلامی ہی ہے تو کیا نوابزادہ لیاقت علی خاں، مسٹر چندریگر، مسٹر غضنفر علی اور عبدالرب نشتر عارضی حکومت میں ہندوؤں کی غلامی کر رہے ہیں، یا مسٹر سہروردی یا غلام حسین ہدایت اللہ، ہندو عارضی حکومت کے غلام ہیں۔ جب موجودہ دستور کے تحت یہ لوگ اسقدر آزاد ہیں، تو وزارتی اسکیم کے تحت کس قدر آزاد ہوتے؟

وزارتی اسکیم اور ۳ ر جون کے پلان کا مقابلہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ (۱) وزارتی اسکیم میں مسلمان چھ صوبوں کے مالک ہوتے، اور موجودہ صورت میں صرف تین صوبوں کے مالک ہیں، ایک صوبہ (آسام) قطعاً کھو بیٹھے ہیں، اور دو صوبوں کے صرف نصف نصف حصے لے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوؤں کو تین نئے صوبے مل گئے۔ یعنی آسام اور مشرقی پنجاب و مغربی بنگال۔ (۲) وزارتی اسکیم کی رو سے مسلمان چھ ہندو صوبوں میں بھی جملہ قسم کے توازن اور ملازمتوں میں اضافی حقوق کے علی حالہٖ حقدار رہتے، اور مرکز میں ۵۰ فیصدی ہونے کے سبب ان کا موثر استحفاظ کر سکتے تھے، لیکن موجودہ صورت میں ساڑھے چار کروڑ مسلم اقلیتوں کو بالکل ہندوؤں کے رحم و کرم پر قطعتاً ہندو راج میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ (۳) مرکز میں ۵۰ فیصدی ہونے کے سبب مسلمان انڈین یونین کو ہندو بننے سے روک سکتے تھے، اور زبان کلچر وغیرہ کے معاملہ میں ہندوستان بالکل ہندویت کی طرف نہ جا سکتا تھا۔ لیکن اب ہندوستان پر بالکل ہندو کلچر چھا جائے گا اور مسلم تہذیب و تمدن کے تمام آثار مٹ جائیں گے ـــ (۴) وزارتی اسکیم کے مطابق مسلمان سارے پنجاب پر حکومت کر سکتے تھے، جس طرح اب تک کرتے رہے، لیکن اب صرف نصف بنگال اور نصف پنجاب ہی پر کر سکیں گے۔ (۵) وزارتی اسکیم کے تحت کلکتہ کا عظیم الشان شہر اور بندرگاہ، جو خود ایک ملک کے برابر ہے، مسلمانوں کے تحت رہتا، لیکن اب یہ پاکستان سے نکل کر ہندوستان میں چلا گیا۔ (۶) ۳ ر جون کے پلان کے مطابق ۷۲ لاکھ مسلمان بنگال سے، ۲۹ لاکھ پنجاب سے، اور ۱۸ لاکھ آسام سے یعنی ایک کروڑ ۱۹ لاکھ مسلمان نکل کر ہندوستان میں چلے گئے، جو

وزارتی اسکیم کے تحت بی، اور سی گروپ میں رہتے۔

غرضکہ مولانا آزاد نے جو فارمولا پیش کیا تھا، اس میں بالکل یہ بجا فرمایا تھا کہ پاکستان سے مسلمانوں کو جو کچھ فوائد پہونچ سکتے ہیں، وہ سب موجود ہیں۔ لیکن جو نقصانات پہونچ سکتے تھے، وہ تمام چیزیں اس سے نکال دی گئی ہیں چنانچہ اسی فارمولے کے مطابق وزارتی مشن کی اسکیم ترتیب پائی — اس میں مسلمان چھ صوبوں میں اکثریت میں بھی ہوتے ہیں اور مرکز میں بھی پچاس فیصدی کے حقدار ہوتے ہیں یعنی پاکستان تو اپنا بنتا ہی، ہندوستان پر بھی ہم چھائے رہتے۔ لیکن اب سارے ہندوستان سے دست بردار ہو کر، ملک کے دو کونوں میں سمٹ گئے ہیں۔ اور اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں۔

بہر حال پچھلے سمجھوتے (یعنی وزارتی اسکیم) کو غلامی سے تعبیر کرنا محض فریب ہے، اور اگر یہ غلامی ہی تھی تو مسلم لیگ نے ہندوؤں کی اس غلامی کو پہلے کس طرح منظور کر لیا تھا؟

یہ بالکل صحیح ہے کہ غلامی کے محل سے آزادی کی جھونپڑی بہتر ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ آزادی واقعی آزادی ہو اور ظاہر ہے کہ آج دنیا میں چھوٹے ملکوں کی آزادی کے کوئی معنی نہیں۔ آج کی دنیا میں آزادی برقرار رکھنے کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے، وہ غریب چھوٹے ممالک مہیا نہیں کر سکتے اس وقت برطانیہ، امریکہ اور روس کی طاقت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ تمام چھوٹی طاقتوں نے ان تین طاقتوں میں سے کسی نہ کسی کا دامن تھام رکھا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے بھی یہ طاقتیں بڑی طاقتوں کی محتاج ہیں، اور مشینری اور ہر قسم کے سامان کے لئے بڑے بڑے صنعتی ممالک کے دست نگر ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے ممالک کی اندرونی اصلاح و ترقی کا کام بھی اکثر انھیں بڑے ممالک سے قرض لیکر انجام دیا کرتی ہیں اسلامی ممالک میں ایک ٹرکی ہی تھا جسے مکمل طور پر آزاد کہا جا سکتا تھا، لیکن اس نے بھی روس کے خطرہ سے گھبرا کر امریکہ سے اربوں روپیہ قرض لیکر اس کی اقتصادی غلامی قبول کر لی ہے۔

دفاع کا معاملہ بھی اس قدر پیچیدہ اور قیمتی ہو گیا ہے کہ چھوٹے ممالک اپنی بے بضاعتی کے سبب اس کا معقول انتظام کرنے سے قاصر ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بڑی طاقتوں کے سامنے کس طرح چھوٹے ممالک ایک ہفتہ بھی نہ ٹھہر سکے، اور فرانس جیسی طاقت نے پندرہ دنوں میں دم توڑ دیا — ہم ہندوستان کی آزادی کا تصور اسی صورت میں کرتے ہیں کہ ہندوستان آزاد ہو کر کوئی چھوٹا ملک نہ ہوگا، بلکہ اپنے قدرتی وسایل کی بدولت بہت جلد وہ امریکہ اور برطانیہ کی ٹکر میں آجائے گا۔ اس وقت غلام ہونے پر بھی ہندوستان، دنیا کے سینکڑوں آزاد ممالک، مثلاً اسپین، ترکی، یونان ایران، افغانستان، عرب، مصر، انڈونیشیا، چین وغیرہ سے زیادہ طاقتور ہے۔

جہاں تک اقلیتوں کی محافظت کے سلسلے میں بدلہ لینے کا سوال ہے، اس کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ بدلہ لینے کی طاقت کس میں ہوگی غریب اور مفلس اور دو حصوں میں بٹے ہوئے پاکستان میں، یا ہندوستان میں؟ پاکستان کی مالی حالت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کی مجموعی آمدنی نصف پنجاب نکل جانے کے بعد صرف ۲۵ کروڑ رہ جائے گی جس میں مرکز کی آمدنی بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی قلیل رقم مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان، یعنی چار صوبوں کے نظم و نسق ہی کے لئے کافی نہیں، اس میں فوج کا خرچ کہاں سے آئے گا۔ جنگ سے قبل صوبہ سرحد میں حکومت ہند ۶۰ ہزار فوج رکھا کرتی تھی، جس پر ارزانی کے زمانہ میں ۳۵ کروڑ روپیہ سالانہ صرف ہوا کرتے تھے۔ لہذا اگر پاکستان کے لئے صرف ۶۰ ہزار پیدل سپاہیو

کی فوج بھی رکھی جائے گی تو ۳۵ کروڑ روپے صرف اسی ایک مد کے لئے درکار ہوں گے۔ موجودہ آلات و ساز و سامان اس کے علاوہ ہے۔

ہاں اگر بدلے سے ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہندو صوبوں میں مسلمانوں پر ظلم ہوا تو پاکستان میں ہندوؤں سے بدلا لیا جائے گا، یہ چیز صرف غیر مہذب اور غیر اسلامی ہے، بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ ہمارے خیال میں اب مسلمانوں کو کافی سبق مل گیا ہے کہ وہ بدلے کی باتیں کرنی چھوڑ دیں۔ لیکن اگر بدلہ لیا بھی گیا تو مسلم اقلیتوں کو اس سے کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے؟ بہار اور گڑھ مکتیسر کے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچا؟ پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان میں صرف دو کروڑ ہندو ہوں گے، لیکن ہندوستان میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہوں گے۔ لہذا اس بدلے والی پالیسی میں بھی مسلمان ہی سراسر گھاٹے میں رہیں گے۔

مسٹر جناح نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا ہے کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ روادارانہ اور فیاضانہ سلوک کریں گے۔ لیکن یہ چیز بالکل غلط ہے۔ مسٹر جناح ہندو اور سکھ اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہندوؤں کو مسٹر جناح کی فیاضی کی ضرورت بھی نہیں۔ پاکستان کے ہندو محض اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ان کی موجودہ پوزیشن برقرار رہے۔ یعنی جس طرح بنگال، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے بینکوں، انشورنس کمپنیوں، کارخانوں اور تجارتی منڈیوں پر اس وقت ان کا قبضہ ہے وہ علیٰ حالہٖ قایم رہے۔ کیا مسٹر جناح ہندو بینکوں، انشورنس کمپنیوں، ملوں اور بزنس کی حفاظت کریں گے؟ اور اگر وہ ایسا کریں گے تو پھر انھیں پاکستان بنانے سے کیا فایدہ ہوگا؟ مسلمان تو ویسے ہی قلاش کے قلاش رہ جائینگے لہذا لامحالہ پاکستان میں قانون کے ذریعہ ہندو بزنس کو روکنے اور چھیننے کی کوشش کی جائے گی، اور گرچہ یہ حرکت مہذب دنیا کو ناگوار گزرے گی لیکن پاکستان کو اپنی بقا کے لئے یہ کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ اگر پاکستان کے اندر صنعت و تجارت کا دروازہ ہر قوم کے لئے برابر کھول دیا گیا، تو مسلمان کبھی، اس معاملہ میں ہندو سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہندو کوئی مراعات نہیں چاہتا، وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ حکومت اس پر کوئی پابندی نہ لگائے، اور جہاں تک ملازمتوں کا سوال ہے، ہندو یہ کہتا ہے کہ یہ نعمت مسلمانوں ہی کو مبارک ہو، پاکستان میں ملازمت کے لئے ہندو پریشان نہیں۔

غرضیکہ پاکستان کے اندر ہندوؤں کے ساتھ لامحالہ اس قسم کی حرکتیں کی جائیں گی، جس کا لازمی طور پر ہندوستان پر اثر پڑے گا۔ یہ چیز تو ابھی سے شروع ہو گئی جبکہ پاکستان بنا بھی نہیں ہے۔ کراچی کی تمام بڑی بڑی عمارتوں پر حکومت نے قبضہ کر لیا ہے، تاکہ دارالسلطنت پاکستان کا عملہ اور دستور ساز اسمبلی کے ارکین کو ان میں ٹھہرایا جاسکے۔ یہ تمام عمارتیں ہندوؤں کی ہیں۔ جب ہندوؤں نے یہ کہا کہ ہم یہ تمام عمارتیں ہندوؤں کی ہیں

اور ہم یہ تمام عمارتیں بیچنے کو طیار ہیں، حکومت خرید لے، تو حکومت نے جواب دیا کہ حکومت کے پاس پیسے نہیں۔

اخبار "ڈان" بار بار یہ لکھ رہا ہے کہ چاٹگام، کلکتہ سے اچھی بندرگاہ بن سکتا ہے، اور چاٹگام کے پورٹ بن جانے کے بعد کلکتہ کی اہمیت جاتی رہے گی انگلستان سے چند ماہرین آئے تھے، جنھوں نے اپنی رپورٹ میں یہ لکھا تھا کہ اگر ۳۵ لاکھ روپئے صرف کئے جائیں تو چاٹگام بھی اچھا پورٹ بن سکتا ہے اور یہ کلکتہ سے بہتر بندرگاہ ہو جائے۔ چنانچہ ڈان انگریزان ماہرین کا حوالہ دیتا رہتا ہے، لیکن ان ماہرین نے جن بنیادوں پر یہ رائے دی تھی، اسے ڈان نظر انداز کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھی یا بُری بندرگاہ خود کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اس بندرگاہ کے پیچھے کتنے صوبے ہیں، اور یہ ملک کے کتنے حصے کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ کلکتہ کی اہمیت محض اسی سبب سے ہے کہ آسام، بنگال، اڑیسہ، بہار، اور یوپی کے صوبے اور ریاستیں غرضیکہ آدھا ہندوستان اپنا مال کلکتہ ہی سے منگواتا ہے۔ یعنی امبھال سے کانپور اور غازی آباد تک کلکتہ ہی سے مال منگایا جاتا ہے۔ پاکستان بن جانے کے سبب کلکتہ کی

اہمیت میں صرف مشرقی بنگال کی کمی ہو جائے گی۔ جس سے کوئی خاص اثر نہ پڑے گا۔ بقیہ علاقے اسی طرح کلکتہ سے اپنا مال منگاتے رہیں گے لیکن چاٹگام پر ۲۵ لاکھ کیا ۲۵ کروڑ روپئے بھی صرف کر دئے جائیں تو وہ کلکتہ جیسی اہمیت حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ محض ایک صوبہ یعنی مشرقی بنگال کا پورٹ اور تجارتی مرکز بن سکتا ہے۔

پاکستان کے اندر چند زرعی پیداوار کو نہایت اہمیت دی جا رہی ہے، جیسے چاول، گیہوں، روئی، جوٹ وغیرہ۔ لیکن آج کی دُنیا میں زراعتی ملکوں کی کوئی پوزیشن نہیں ہے۔ دُنیا میں جتنی بڑی طاقتیں ہیں یا ترقی یافتہ ممالک ہیں، وہ اپنی زراعت یا زراعتی پیداوار کے سبب طاقتور نہیں بلکہ اپنی صنعتوں کے سبب طاقتور ہیں اور جو ملک جتنا زیادہ صنعتی ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ طاقتور شمار کیا جاتا ہے، جیسے امریکہ، جرمنی، برطانیہ، فرانس، روس وغیرہ۔ زراعتی ملکوں کا کام محض یہ ہوتا ہے کہ وہ ان ممالک کے لئے کچا مال مہیا کرے۔ چین، آسٹریلیا، افریقہ، برازیل، کناڈا اور اسلامی ممالک حالانکہ بڑے بڑے ممالک ہیں لیکن ان کی اس لئے کوئی پوزیشن نہیں کہ وہ محض زراعتی ہیں اور صنعتی نہیں۔ زراعتی ممالک کو اپنی پیداوار صنعتی ممالک کے ہاتھوں بیچنا پڑتی ہے اور اس کے عوض انہی ممالک سے طیار شدہ مال خریدنا پڑتا ہے، لہذا ملک کی دولت کھنچ کھنچ کر باہر جاتی رہتی ہے اور نہ ان کے پاس سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے اور نہ وہ صنعتی بن سکتے ہیں۔ غرضکہ یہ چکر چلتا رہتا ہے، اور ان کا افلاس اور غلامی قایم رہتی ہے۔

ہمارے بھائیوں کا خیال ہے کہ ہم سیاسی طاقت حاصل ہونے کے بعد صنعتی اور دولتمند ملک بن سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ خیال قطعاً غلط ہے سیاسی اقتدار سے کوئی ملک امیر نہیں بن جاتا۔ حکومت کے پیچھے سرمایہ داروں کی طاقت ہوتی ہے، جو اصل میں ہر حکومت کا ستون ہے۔ ہٹلر کی طاقت کا راز یہ تھا کہ صناع اور تاجر اس کی پشت پر تھے اسی طرح امریکہ کی طاقت کا بھی یہی راز ہے کہ امریکن سرمایہ دار، جسے ہم ہندوستان میں بنیا کہتے ہیں اُسکی پشت پر ہیں۔ حکومت امریکہ کی آمدنی کا ¾ حصہ انڈسٹری کے ٹیکس ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دُنیا کی بڑی بڑی حکومتیں یہودیوں کے سرمائے سے چل رہی ہیں، اور برطانیہ اور امریکہ بھی یہودی سرمایہ داروں کا مقروض ہے۔ عرب، ایران، عراق، افغانستان، مصر وغیرہ کو تو سیاسی آزادی حاصل تھی اور ہے، لیکن وہ صنعتی اور طاقتور نہ بن سکے اس لئے کہ ان کی پشت پر سرمایہ نہیں۔ ہندوستان میں مغلوں کی طاقت کا راز یہ تھا کہ اس کی پشت پر ہندو بنیوں کا سرمایہ تھا، اور جس وقت وہ طاقت اس کی پشت پر سے ہٹی، مغلیہ حکومت کی ساری عمارت زمین پر آ رہی۔

لہذا غور کرنے کی بات ہے کہ آج دنیا کے کسی حصہ کے بھی مسلمان، صنعت و حرفت میں کیوں آگے نہیں — اس کا سبب وہی قومی خصوصیت ہے۔ سیاسی طاقت حاصل ہو جانے کے بعد یہ قومی خصوصیت نہ بدلے گی۔ مسلمان کی فطرت میں نہیں کہ وہ کوڑی کوڑی جوڑ کر اکٹھا کرے۔ لہذا پاکستان میں صنعت و حرفت قایم ہونے اور اس کے طاقتور ملک بننے کا کوئی امکان نہیں، آج مسلمانوں کو جن ملکوں میں سیاسی اقتدار حاصل ہے، وہاں بھی یہی گجراتی، مارواڑی اور سکھ چھائے ہوئے ہیں۔ کابل، طہران، عراق اور ریاست حیدر آباد میں جتنے بینک، انشورنس کمپنیاں کل کارخانے اور بڑی بڑی تجارتیں ہیں، وہ سب انہی ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ میں ہیں۔

پاکستان میں ضروری معدنیات مثلاً کوئلہ، لوہا وغیرہ کی عدم موجودگی کے سبب اس کے صنعتی بننے کا امکان اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ اسوقت

اگر ہندوستان، کوئلہ بند کردے تو پاکستان کی ریلیں ایک منٹ میں بند ہو سکتی ہیں۔ پھر اس حالت میں انڈسٹری کس طرح چل سکتی ہے۔ حال میں ڈان، میں یہ خبر چھپی ہے کہ سندھ اور بلوچستان میں کوئلے کا پتہ چلا ہے۔ اگر بفرض محال اسے مان لیا جائے کہ ان مقامات پر بیشمار کوئلہ اور لوہا دبا پڑا ہے، تو بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ کوئلہ اور لوہا نکالنے کے لئے بھی سرمائے کی ضرورت ہے۔ عرصہ ہوا، افغانستان میں کوئلہ دریافت ہو چکا ہے، لیکن افغانستان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ زمین سے کوئلہ نکال سکے۔ عراق اور ایران کے پاس روپیہ موجود تھا، لیکن وہ تیل انکے کام نہ آسکا، بلکہ اینگلو پرشین آئل کمپنی نے اربوں کا سرمایہ لگا کر اسے نکالا۔ ابھی حال میں ابن سعود نے سوا لاکھ روپے روزانہ رائلٹی پر عربستان سے امریکی عرب آئل کمپنی کو تیل نکالنے کی اجازت دیدی ہے۔ غرضکہ اس سلسلہ میں پاکستان کے سامنے ہر قسم کی مشکلات ہیں، جن پر بغیر کسی بیرونی سرمائے کے پاکستان قابو نہیں پا سکتا۔ اور بیرونی سرمائے یا امداد کو دوسرے معنوں میں غلامی بھی کہتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان کے پاس چند نکڑ کی جگہیں ہوں گی، خاصکر درۂ خیبر کا راستہ اور کراچی کی بندرگاہ لیکن صرف نکڑ کی جگہیں ہونا کوئی چیز نہیں، جب تک اس نکڑ کی جگہ کو سنبھالنے کی طاقت بھی موجود نہ ہو۔ مصر کے پاس سوئز جیسی نکڑ کی جگہ ہے۔ ترکی کے پاس درۂ دانیال ہے۔ فلسطین خود نکڑ کی جگہ پر واقع ہے۔ لیکن ان مقامات پر ان بیچاروں کا اپنا قبضہ نہیں ہے۔ بلکہ ان نکڑ کی جگہوں کے سبب خواہ مخواہ ان کی جان مصیبت میں پڑ گئی ہے، بلکہ اگر یہ جگہیں ان کے پاس نہ ہوتیں تو وہ زیادہ آرام سے رہتے۔ صرف ترکی اب تک درۂ دانیال کا مالک بنا ہوا ہے لیکن درۂ دانیال کے سبب ترکی پر ہر قسم کی یورش ہے۔ روس اس پر دانت لگائے بیٹھا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ الگ اس کی فکر میں ہیں اور قرینہ ایسا ہے کہ سال دو سال کے اندر ترکی، درۂ دانیال سے محروم ہو جائے گا، یا تو روس اس پر قبضہ کرلیگا یا پھر امریکہ و برطانیہ کی تولیت میں لے دیدیا جائیگا اور اب بھی درۂ دانیال تقریباً بین الاقوامی مقام قرار پا چکا ہے، جسے ترکی نے بھی منظور کر لیا ہے۔

اسی طرح کراچی اور درۂ خیبر کی بڑی بڑی طاقتوں کو ضرورت ہے۔ روس جنوبی ایشیا میں بحیرۂ عرب اور بحیرۂ ہند میں زمانے سے ایک بندرگاہ کا متمنی ہے تاکہ دُنیا کے اس حصے سے اس کا تعلق پیدا ہو جائے اور کراچی پر زمانہ سے اس کی نظر ہے۔ لہذا اسی لئے تحریک پاکستان کی روس کی طرف سے، اور مقامی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے حمایت کی جا رہی تھی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان بہت جلد کمیونزم قبول کر لیں گے اور یہ بندرگاہ، روس کو مفت ہاتھ آجائے گی۔ لیکن اب نقشہ پلٹ چکا ہے اور پاکستان برطانوی سامراج کے تحت درجۂ نوآبادیات قبول کر چکا ہے، لہذا یہ کراچی کی بندرگاہ اور درۂ خیبر روس کے رقیب امریکہ کو مل جائے گی، تاکہ وہ روس کے خلاف جنگ کے لئے کراچی کے بندرگاہ سے سامان لاسکے، اور صوبۂ سرحد کو اپنا فوجی اڈا بنا سکے۔ چنانچہ جب روس نے دیکھا کہ پاکستان انگریزوں کے پنجے میں چلا گیا، تو اب روس اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی دونوں کی طرف سے پاکستان کی پرزور مخالفت ہونے لگی ہے۔

پاکستان کے متعلق غلط فہمی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نہایت ہوشیاری سے مغربی اور مشرقی پاکستان کو ایک مُلک بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور انکا رقبہ، آبادی، آمدنی وغیرہ سب کے اعداد و شمار اکٹھا طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ قطعاً سیاسی لحاظ سے، یہ دو الگ الگ ملک ہیں، جن کے درمیان کوئی تعلق نہیں اور ان کے مابین ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے، اور جو کسی معاملہ میں بھی، ایک دوسرے کو کسی قسم کی سہولت نہیں پہونچا سکتے، یا معاون و مددگار نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک کہ مدافعت کے لئے بھی دونوں کو دو فوجیں رکھنی پڑیں گی۔ چونکہ یہ دونوں ممالک مسلمان ہیں۔ اس لئے انھیں

ایک ہی تصور کرنا سراسر حماقت ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو سارے دنیائے اسلام کا رقبہ پاکستان میں شامل کر کے اسے دُنیا کا سب سے بڑا ملک بتلایا جا سکتا ہے۔ بنگال اور پنجاب کا جو نازک رشتہ ہے، وہ کب تک قایم رہ سکتا ہے، اور بنگال، پنجاب کے ساتھ، اور پنجاب، بنگال کے ساتھ خواہ مخواہ کب تک بندھا رہیگا؟ یہ آنے والا زمانہ ہمیں بتا دیگا۔

ساڑھے چار کروڑ مسلمان کیا کریں؟

مسلمانوں کو پاکستان کی جنت مل گئی اور اب بہت جلد تمام چیزیں عملی طور میں سامنے آجائینگی لیکن جہاں تک مسلم اقلیتوں کا معاملہ ہے، یہ بھی آخری طور پر طے ہو گیا کہ وہ اس جنت الفردوس میں داخل نہیں ہو سکتے انھیں اسی ہندوستان کے دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ حالانکہ ان ہی مسلم اقلیتوں کی مظلومیت کا رونا رو کر، پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن پاکستان بنایا گیا اُن علاقوں کا جو پہلے ہی سے مضبوط تھے یعنی مسلم اکثریتوں کے علاقے۔ لیکن جو کمزور تھے اور جنھیں محافظت کی ضرورت تھی، انھیں، علی حالہٖ ظالم سفاک ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

حالانکہ اگر ہندوستان مشترک ہوتا، تو مرکز میں مشترکہ حکومت قایم ہوتی، جس میں مسلمان اراکین مساوی تعداد (Parity) میں موجود ہوتے اور سارے ہندوستان میں مسلمان دس کروڑ کی تعداد میں ہوتے اور اپنے مطالبات کو منوا سکتے تھے، لیکن اب ہندوستان میں مسلمانوں کی طاقت آدھی رہ گئی ہے۔ اور وہ کمزور ہو چکے ہیں۔ اڈیٹر منشور صاحب فرماتے ہیں کہ اگر پونے تین کروڑ مسلمان اپنے وجود کی حفاظت کا تہیہ کریں گے تو وہ اپنے مقصد میں ناکام نہ رہیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر دس کروڑ مسلمان ہندو اکثریت سے اپنی محافظت کے لئے کافی نہ سمجھے گئے اور ان کے لئے پاکستان کے قلعے کی ضرورت پڑی تو پونے تین کروڑ مسلمان اگر اپنے وجود کی حفاظت کا تہیہ کریں گے تو اپنی محافظت میں کس طرح کامیاب ہو جائیں گے؟

اللہ اکبر! شاید ہی دنیا کی تاریخ میں اتنی بڑی قوم کو اس طرح بیوقوف بنایا گیا ہو۔

لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ اگر چار کروڑ مسلمانوں کو بالآخر ظالم ہندوؤں ہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا تھا تو پھر ہندوؤں سے ان کے تعلقات اس درجہ کیوں خراب کروائے گئے، جن کے ساتھ انھیں ہمیشہ ہمیشہ زندگی بسر کرنا ہے۔ ہندوؤں سے اس قدر کشیدگی بڑھا دینے کے بعد اب ارشاد ہوتا ہے کہ انہی کے ساتھ رہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ظالم ہندو اب کس طرح اچھے بن جائیں گے۔

بہرحال یہ تو اب ظاہر ہو گیا کہ مسلم اقلیتوں کے مسئلے کا حل پاکستان نہیں۔ ہم جب پہلے کہا کرتے تھے تو لوگ یقین نہ کرتے تھے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے بھائیوں کی سمجھ میں پالٹیکس اُس وقت آتی ہے، جب اصل حالات ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ وہ خطرے سے آگاہ کرنے پر چونکتا نہیں ہے۔ کہا جاتا تھا کہ پاکستان ہندو مسلم سوال کا واحد حل ہے۔ لیکن پاکستان بن گیا اور نہ مسجد کے آگے باجے کا مسئلہ حل ہوا، نہ قربانی کا جھگڑا طے ہوا، نہ ہندی اُردو کا سوال حل ہوا۔ غرضیکہ ہندو مسلمانوں کے تمام جھگڑے جوں کا توں ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ موجود ہیں۔ یہاں تک کہ ہندو مسلم فسادات بھی اب تک نہ رک سکے۔

اگر تعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اکیلے یو۔پی کے ۵۵ لاکھ مسلمان صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان ان تینوں مسلم صوبوں کی مجموعی آبادی (۴۰ لاکھ) سے بھی زیادہ ہے۔ مغربی پنجاب جس کا اس قدر شہرہ ہے، اور جو پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی سمجھا جاتا ہے، اس کی آبادی یو۔پی کی مسلم آبادی سے کچھ ہی زیادہ ہے اکیلے مدراس کی مسلم آبادی (۳۸ لاکھ) سندھ اور صوبۂ سرحد دونوں سے بڑی ہے۔ اکیلے بہار کی مسلم اقلیت

(۲۴ لاکھ) صوبۂ سندھ اور بلوچستان کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ پھر اگر تعلیم، تہذیب اور تمدن کو لیجئے تو پنجاب، سندھ، یا بنگال کے مسلمانوں کو کسی طرح یوپی کے مسلمانوں پر فوقیت نہیں دیجا سکتی۔ یوپی اور بہار ہی نے ہندوستان میں اسلامی تعلیم پھیلائی اور آج بھی یہی صوبے اسلامی تہذیب کے بہترین مرکز ہیں، یہیں مسلم حکمرانی کے تمام آثار پائے جاتے ہیں، بڑے بڑے بزرگوں کے مزار ہیں، اور یہی خطّہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ جد وجہد کی یادگار یعنی اُردو زبان کا مرکز ہے

لیکن اسلامی تہذیب و تمدن اور اُردو زبان کی محافظت کا دعویٰ کرنے والی جماعت نے، اسی خطّے کو تمام ہندو راج کے سپرد کر دیا۔ بہر حال اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا، پاکستان اچھا ہے یا بُرا، اب ہمیں اس سے بحث نہیں، وہ جانیں اور ان کا کام، لیکن ہندوستانی مسلمانوں سے سوال ہے کہ کیا وہ اسی طرح آئندہ بھی پاکستان کا بگل بجاتے رہیں گے یا خود اپنے لئے بھی جئیں گے؟ کیا آئندہ مسلمانوں کا سرمایۂ حیات محض یہ ہوگا کہ پاکستان کے متعلق اخباروں میں خبریں پڑھ کر اپنا دل خوش کر لیا کریں، شاید ہمارے بھائیوں کو اندازہ نہیں کہ آج وہ ایک جوالا مکھی پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب یہ دہانہ پھٹ پڑے۔ اگر ان مسلمانوں نے اب بھی صحیح راستہ اختیار نہ کیا تو شاید ہندوستان سے مسلمان اسی طرح مٹ جائیں گے، جس طرح اسپین سے انکا خاتمہ ہو گیا۔

راستہ کیا ہے

سوال یہ ہے کہ راستہ کیا ہے؟ راستہ صرف ایک ہی ہے، یعنی اس ملک کو اپنا ملک سمجھنا، اور اس ملک کی اکثریت سے اشتراکِ عمل۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو ہجرت کر کے پاکستان نہیں جانا ہے اور اسی ملک کے اندر رہنا ہے تو آپ کو یہ پالیسی اختیار کرنی ہی پڑے گی۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ ہندوستان کے اندر مسلم لیگ کی پالیٹکس ختم ہو چکی۔ اب تو وہ دونوں صورت میں گئے۔ یعنی اگر وہ اپنے کو پاکستانی قوم کا ایک جزو کہتے ہیں تو ہندوستان کے تمام شہری حقوق سے محروم کر دئے جائیں گے، اور اگر وہ اپنے ہندوستانی ہونے کا اعلان کریں گے تو پھر پاکستان کی حکومت کو ہندوستانی مسلمانوں کے معاملے میں دخل دینے کا حق نہ رہے گا اور انجمن اقوام کے سامنے یہ معاملہ ہندوستان کا گھریلو معاملہ قرار پائے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ اب مسلمانوں کا یہ عمل ہونا چاہئے کہ وہ پاکستان کو بھول جائیں دو قومی نظریہ کو ترک کر دیں۔ ہر قسم کی فرقہ پرور انجمن بازی سے باز آجائیں، مشترکہ انجمن بنائیں، مخلوط انتخاب کے لئے جد وجہد کریں، اور ہندو فرقہ پروری سے لڑنے میں ہندو نیشنلسٹوں کی مدد کریں اور ہندوستان میں سوشلسٹ اسٹیٹ کے قیام کی کوشش کریں۔

(اقتباس از نئی زندگی)

نیاز فتحپوری کے قلم سے

تین جدید مطبوعات

مختارات نیاز۔ افسانوں کا چوتھا مجموعہ ۸ر

جھانسی کی رانی (ڈرامہ) ۸ر

اصحاب کہف (ڈرامہ) ۱۲ر

انشاؔ کے اطوار و اخلاق

حُلیہ انشاؔ کی جو تصویر میری نظر سے گزری ہے اس میں وہ وجیہ نظر آتے ہیں۔ کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ۔ ستواں ناک۔ موٹی اور لانبی مونچھیں جن کی نوکیں اوپر اُٹھی ہوئی ہیں، جسم نہ لاغر نہ فربہ۔ سینہ فراخ۔ کمر پتلی۔ بھرے بھرے بازو۔

میر علاء الدولہ اشرف علی خاں نے انشاؔ کو "جوان وجیہ بدل نزدیک"[1] لکھا ہے۔ نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی نے ان کے متعلق :- "از زیور ظواہر و بواطن آراستہ"[2]۔ تحریر کیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے جس طرح انشاؔ کے کلام میں رنگا رنگی ہے اسی طرح وضع قطع میں بھی یکرنگ نہیں تھے چنانچہ مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری ان کے حلیہ کے بارہ میں رقمطراز ہیں کہ :- "باصفائی چہار ابرو می ماند"[3]۔

مولوی محمد حسین آزاد نے اُن کی چال ڈھال اور سج دھج کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ لکھتے ہیں :

> "دیوان دیکھنے سے ان کے حالات و عادات کی تصویر سامنے کھنچ جاتی ہے جبکہ وہ مشاعرہ میں آتے تھے یا دربار کو جاتے تھے۔ ایک طرف آداب معقولیت سے سلام کیا۔ ایک طرف مسکرا دیا ایک طرف منہ چڑھا دیا۔ کبھی مقطع مرد معقول کبھی دلی کے بانکے کبھی آدھی داڑھی اُڑا دی کبھی چار ابرو کی صفائی بنا دی"[4]

لباس انشاؔ کا لباس عام طور پر وہی تھا جو اس زمانہ کے دلی لکھنؤ کے شرفا کا ہوتا تھا لیکن ایک خصوصیت یہ تھی کہ اکثر گلے میں دوپٹہ ڈالے رہتے تھے جس کا ایک سرا آگے اور دوسرا پیچھے پڑا رہتا تھا[5]۔

آواز و لہجہ خوش لہجہ تھے۔ اشعار پڑھنے کا انداز بھی بہت دلکش تھا۔ چنانچہ اکثر اشخاص مشاعروں میں اپنی غزلیں انھیں سے پڑھواتے تھے[6]۔

---

[1] تذکرۃ الشعراء قلمی از میر علاء الدولہ اشرف علی خاں ورق ۳۶۲ الف تصنیف ۱۱۹۷ھ ——— [2] مدائح الشعراء قلمی (ورق ۸ ب) از نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی تصنیف ۱۲۶۱ھ کتب خانہ ریاست رامپور

[3] تکملۃ الشعراء قلمی (ورق ۴۴ الف و ب) کتب خانہ سرکاری رامپور۔

[4] آب حیات مطبوعہ لاہور صفحہ ۲۸۳ ——— [5] آب حیات صفحہ ۳۲۲ ——— [6] آب حیات صفحہ ۲۸۴۔

ہمعصر تذکرہ نویسوں نے بھی ان کے لب و لہجہ کو بہت سراہا ہے۔ مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری نے لکھا ہے :۔

" خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نمی آید"[۱]

مولوی عبدالقادر رامپوری جو لکھنؤ میں سید انشاء سے ملے تھے ان کے متعلق اپنے روزنامچہ میں تحریر فرماتے ہیں :

" بزبان اُردو و فارسی و عربی و بنگالہ و پوربی و مرہٹی و کشمیری و ترکی و افغانی بہ لہجۂ آں قوم سخن گفتی"[۲]

فن سپہ گری ۔ " تیراندازی و شمشیربازی و سواری اسپ نیکو میدانست" ۔۔۔۔۔۔۔[۳]

علم مجلس ۔ فن ہم نشینی شدن بجائے رسانیدہ بود کہ یکتائے زمانہ اش دریں کار او را تواں گفت ۔۔۔۔۔[۴]

" مردیست ظریف الطبع بزلہ گو لطیفہ سنج کشادہ رو ہوشیار باش محبت دار خوش معاش ۔۔۔۔۔۔"[۵]

" جوانیست خوش ظاہر و خوش طبع"[۶]

علم و فضل ۔ انشاء کے علم و فضل کی تعریف سبھی کی ہے، مخالفین نے بھی دبی زبان سے اعتراف کیا ہے، مثلاً قدرت اللہ قاسم نے انشاء کے بارہ میں لکھا ہے :۔

" ولے بقدر کفایت از علوم متعارفہ بہرہ اندوز است ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"[۷]

اسی طرح مصحفی نے بھی لکھا ہے :

" تحصیل کتب عربیہ و فارسیہ و طب بقدر حال ہمہ دارد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"[۸]

مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری نے ان کی علمیت کو بہت سراہا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

" جوانیست قابل صاحب استعداد کامل در فنون عربی و فارسی و ہندی مہارتے تمام دارد ۔۔۔۔"[۹]

نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی نے مندرجۂ ذیل الفاظ انشاء کی علمیت کے بارہ میں استعمال کئے ہیں :۔

" از زیور ظواہر و بواطن آراستہ و بجواہر زواہر علم و ہنر پیراستہ ۔۔۔"[۱۰]

فی البدیہہ کلام ۔۔ فی البدیہہ کلام کی بہت سی مثالیں صاحب " آب حیات " نے بیان کی ہیں مثلاً ایک مرتبہ رات کے وقت نواب سعادت علی خاں نے انشاء کو طلب کیا جس وقت انشاء خدمت میں حاضر ہوئے اسوقت نواب ایک بہیہ دار چھپرکھٹ میں بیٹھے تھے۔ پھولوں کا گہنا سامنے رکھا تھا اور ایک گجرا نواب کے ہاتھ میں تھا جسے اُچھالتے تھے اور پاؤں کے اشارے سے

۱؎ تکملۃ الشعراء قلمی ۔ کتاب خانہ سرکاری رامپور ۔۔۔ ۲؎ روزنامچہ مولوی عبدالقادر رامپوری، قلمی کتب خانہ سرکاری رامپور۔۔

۳؎ روزنامچہ (ورق ۲۹ ب و ۳۰ الف) ۔۔۔ ۴؎ روزنامچہ مولوی عبدالقادر رامپوری قلمی کتب خانہ سرکاری رامپور ۔۔۔ ۵؎ مجموعہ نغز از حکیم قدرت اللہ قاسم، جلد اول مطبوعہ لاہور ۔۔۔ ۶؎ تذکرہ میر حسن صفحہ ۵۵ ۔ مطبوعہ لاہور ۔۔۔ ۷؎ مجموعہ نغز مطبوعہ لاہور ۔۔۔ ۸؎ تذکرہ ہندی گویاں مطبوعہ انجمن ۔۔۔ ۹؎ تکملۃ الشعراء قلمی تصنیف ۱۱۹۳ھ کتب خانہ سرکاری رامپور ۔ ۱۰؎ مدائح الشعراء قلمی تصنیف ۱۲۳۶ھ کتب خانہ سرکاری رامپور

چھپرکھٹ کو آگے بڑھاتے تھے۔ اسی حالت میں انشاء سے شعر گوئی کی فرمایش ہوئی، انشاء نے فوراً ہی یہ شعر موزوں کر کے پڑھا:۔ لگا چھپرکھٹ میں چار پہئے اچھالا تو نے جو لیکے بجرا ۔ تو موجِ دریائے چاندنی میں وہ ایسا چلتا تھا جیسے بجرا

اسی طرح ایک اور لطیفہ بیان کیا ہے جو قابل ذکر ہے۔ ایک روز نواب موصوف نواڑی میں لیٹے ہوئے دریا کی سیر کر رہے تھے۔ دریا کے کنارے ایک مکان پر یہ عبارت لکھی دیکھی۔ "حویلی علی نقی بہادر کی" انشاء سے مخاطب ہو کر فرمایا کسی نے تاریخ کہی مگر نظم نہ کر سکا تم اسے نظم کر دو۔ اسی وقت میر موصوف نے رباعی عرض کی:۔

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی، ۔ نہ سم کی نہ تال کی نہ سر کی

یہ تاریخ کہی ہے کس لُرکی ۔ حویلی علی نقی بہادر کی،

ظرافت ۔ یہ انشاء کی وہ افتاد طبیعت ہے جس نے ان کے نام کو اور لفظ ظرافت کو مترادف بنا دیا ہے انکی کوئی چیز خواہ شاعری ہو یا محض ایک معمولی بات، ظرافت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن انشاء ننگے سر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے نواب سعادت علی خاں کو مذاق سوجھا۔ انھوں نے پیچھے سے آکر ان کے سر پر ایک دھول رسید کی۔ انشاء نے چپ چاپ بغیر پیچھے دیکھے پگڑی سر پر رکھ لی اور بولے کہ بچپن میں بزرگوں سے سچ سنا تھا کہ ننگے سر کھانا کھانے سے شیطان دھولیں مارتا ہے۔ اسی طرح ایک اور لطیفہ سننے کے قابل ہے۔

نواب موصوف کا ایک روز مزاج برہم تھا۔ طرہ اس پر یہ کہ اُس دن نواب کا روزہ بھی تھا، چنانچہ تمام پہرہ داروں کو حکم دیدیا گیا کہ آج حضور میں کوئی آنے نہ پائے۔ اتفاقاً انشاء کو اسی روز ایک ایسی ضرورت لاحق ہوئی جو بغیر نواب کی مدد کے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ پہونچے۔ پہرہ دار جانتے تھے کہ میر کو نواب کے مزاج میں کس قدر درخور ہے۔ اس لئے باوجود نواب کے حکم کے ان کو سختی کے ساتھ روکنا مناسب نہ جانا محض واقعہ سے آگاہ کر دیا۔ یہ بھی باوجود نواب پر حاوی ہونے کے نواب کی کیفیت مزاج سے خائف رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تامل کیا لیکن اس کے بعد قبا اُتار ڈالی اور عورتوں کی طرح دوپٹہ اوڑھکر ناز و غمزہ کے ساتھ نواب کے سامنے جا پہونچے اور جونہی نواب کی نظر پڑی فوراً ناک پر اُنگلی رکھکر بولے:۔

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ ۔ بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہو کر ہنسنے لگے اور انشاء کو جو منظور تھا اس کی کار برآری نواب سے ہو گئی۔ لطایف و ظرایف کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ایسی ہیں جن سے انشاء کی کیفیت مزاج اور رجحان طبع کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً علی نقی بہادر جو ریذیڈنسی لکھنؤ کے میر منشی تھے، جب رخصت ہونے لگتے تو انشاء کہا کرتے کہ "منشی صاحب کا اللہ بیلی" اس جملہ میں رعایت یہ ہے کہ اس زمانہ کے ریذیڈنٹ کا نام جان بیلی تھا۔ لکھنؤ کا "بیلی گارڈ" آج بھی ان کے نام کی یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح جب انشاء دہلی میں تھے تو سرکار شاہی میں جو حافظانِ قرآن ملازم تھے اس میں سے ایک صاحب سے ان کی بھی بے تکلفی تھی۔ حافظ موصوف کا نام "احمد یار" تھا۔ جب وہ انشاء سے ملکر رخصت ہوتے تو یہ کہا کرتے تھے۔ مصرع:۔ "اللہ حافظ احمد یار"[1]

[1] مزید لطایف کے لئے دیکھئے "آبِ حیات" محمد حسین آزاد حالاتِ انشاء

بات بے سوچے بھی کہہ جاتے تھے۔ انشاء کے مزاج میں یہ چیز بہت اہم ہے۔ ان کی شخصیت اور آگے چلکر ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس بات کا مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ان کی طبیعت کی یہی اُفتاد دربار اودھ میں رسائی کا باعث ہوئی۔ اور یہی دربار سے نکلوانے کا بھی سبب ہوئی " آبِ حیات " میں مذکور ہے کہ دربار میں رسائی سے قبل انشاء علامہ تفضل حسین خاں[1] سے ملنے جایا کرتے تھے علامہ چونکہ خود بھی علم و فضل میں پایہ رکھتے تھے اس لئے دیگر اہل علم و فضل کی بھی قدر و منزلت فرماتے تھے۔ انشاء سے انھیں خاص دلچسپی تھی اور اس فکر میں تھے کہ کسی طرح انھیں سعادت علی خاں کے دربار تک پہونچا دیں۔ اتفاقاً ایک روز علامہ کی مجلس میں سید انشاء ایک ایسا لفظ بول گئے جو مہذب صحبت میں بولنے کے قابل نہیں تھا کہنے کو تو کہہ گئے مگر بعد میں علامہ کی نظر تاڑکر بولے کہ مارواڑی زبان میں اس لفظ کے معنے " بیوقوف " کے ہیں۔ علامہ نے جواب دیا " خیر خانصاحب انداز معلوم ہوگیا۔ انشاء اللہ جلد کوئی صورت ہو جائے گی۔ " دوسرے ہی دن نواب اودھ سے ان کی شرافت خاندان اور ذاتی کمالات کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ کی صحبت ان کا ہونا شغل صغریٰ و کبریٰ سے بہتر ہوگا نواب سنکر مشتاق ہوئے۔ ایک دن بعد علامہ موصوف انشاء کو اپنے ساتھ دربار لے گئے۔ وہاں پہونچکر یہ نواب سے ایسا شیر و شکر ہوئے کہ نواب کو بغیر ان کے ایک لمحہ گزارنا بھی دشوار ہوتا تھا۔

مگر جب تقدیر نے پلٹا کھایا تو وہی چیز جو دربار میں لانے کا سبب ہوئی تھی دربار سے نکلوانے کی بھی وجہ ثابت ہوئی۔ صاحب " آبِ حیات " نے بیان کیا ہے کہ ایک روز نواب کے دربار میں مختلف لوگوں کی نجابت و شرافت کا ذکر ہو رہا تھا۔ انشاء کے گفتگو میں نواب بولے کہ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں۔ انشاء یکدم بول اُٹھے بلکہ انجب۔ انھوں نے اپنے خیال میں اسم تفضیل کا صیغہ لگاکر نواب کی شرافت کو اور بھی چمکانا چاہا تھا۔ لیکن جلدی میں یہ خیال نہیں کیا کہ عربی زبان میں لفظ " انجب " باندی بچہ کے لئے مخصوص ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ " ولد الجاریۃ انجب " اور مثل مشہور ہے کہ سچا مذاق سب کو برا لگتا ہے۔ نواب دراصل حرم کے بطن سے تھے اس لئے انشاء کی بات سارے حاضرین دربار پر مع نواب کے بجلی کی طرح گری اور سب سناٹے میں آگئے۔ اس کے بعد انشاء نے ہزار ہزار باتیں بنائیں لیکن جو کچھ جلد بازی میں زبان سے نکل گیا تھا اسے نہیں بنا سکے۔ یہیں سے نواب کی انشاء سے شکر رنجی ہوتی ہے اور آخر میں یہی واقعہ ان کے زوال اور نظربندی کا سبب ہوا۔ یہ وہ قید تھی جس سے انشاء کو قیدِ حیات کے ساتھ ہی چھٹکارا ملا۔

مذہب۔ انشاء آبائی مذہب کے اعتبار سے شیعہ مسلمان تھے لیکن درحقیقت بذات خود ان کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ایک تذکرہ نویس کے الفاظ ان کے بارہ میں قابل توجہ ہیں :-

" مرد ست آزاد مشرب از قید مذہب وارستہ و طور آزادانہ باعدفانی جہارا بری ماند "[2]

رحمت نبی خاں ایم۔ اے (علیگ)

---

[1] تفضل حسین خاں علامہ۔ فاضل اجل ہونے کے علاوہ حکومت اودھ اور حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کی نظر دل میں بہت معزز تھا اور ان دونوں ایوانان حکومت میں اسکا بڑا اثر تھا۔ [2] تکملۃ الشعراء قلمی از مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری ۱۱۹۲ھ کتب خانہ سرکاری ریاست رامپور۔

ہندسوں کی ایجاد و ترقی پر ایک تحقیقی تبصرہ

اپریل سنہ ۴۶ء کے نگار میں مستفسرانہ طریق پر یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ موجودہ ہندسوں کا (جن کو عربی ہندسے کہتے ہیں) ماخذ سامی ہو سکتا ہے۔

اڈیٹر صاحب کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے نتیجہ کے طور پر یہ تحریر فرمایا کہ:۔ "عرب کے مصنفین ہندوستانی ہندسوں کی تقدیم کے قایل تھے"۔ اور یہ کہ "عربوں نے علاماتِ شمار ہندوں سے حاصل کئے"۔

اِن دونوں نتیجوں سے سرِدست اختلاف کرنے کی کوئی وجہ یا ضرورت میرے پیشِ نظر نہیں۔ میں اُن کو اس معنی میں لیتا ہوں کہ اہلِ ہند نے علامات شمار قایم کرنے کا نیا طریقہ ایجاد کیا اور یہ کہ اہلِ عرب نے اُسی طریقہ کو اختیار کیا۔

میرا استفسار علاماتِ شمار کی اشکال سے متعلق تھا۔ یہ دونوں باتیں یعنی علاماتِ شمار کے قایم ہونے کا نیا طریقہ اور علاماتِ شمار کی اشکال بہت وضاحت چاہتی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ پہلے حروف و اعداد کی پیدائش اور نشو و نما کی عام تاریخ پر ایک نظر ڈال لی جائے اور پھر مسئلہ پر غور کیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے انسان نے نام سیکھے۔ ناموں کی ذیل میں ایک ۔ دو ۔ تین وغیرہ گنتی کے الفاظ بھی آتے ہیں جن کو سب سے پہلے انسان نے اپنے جانوروں اور خاندان کے آدمیوں کو شمار کرنے کے لئے ضرورتاً ایجاد کیا ہوگا۔ یہ امر بھی قیاس میں آسکتا ہے کہ دیگر تصورات کے طریقۂ یادداشت سے پہلے انسان نے شمار کی یادداشت کے طریقے ایجاد کئے۔ یعنی حروف کی ایجاد سے پہلے الفاظِ شمار کی علامتیں ایجاد ہوئی ہوں گی جن کو ہم اعداد کہتے ہیں۔

تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ اعداد کی یادداشت کے جو ابتدائی طریقے رائج تھے وہ کھڑی یا سیدھی لکیروں یا بھرے ہوئے اور خالی گول نقطوں کی صورت میں تھے۔ لیکن یادداشت کے طریقے جاری ہونے سے پہلے ضروری تھا کہ گننے کا کوئی آسان طریقہ مقرر ہو جاتا۔ اور یہ آسان طریقہ خود انسان کے ہاتھ پاؤں اور خصوصاً ہاتھوں کی اُنگلیاں تھیں۔ چنانچہ ایک قدیم قوم میں پانچ کے مفہوم کا لفظ "ایک ہاتھ" تھا۔ دس کو "دو ہاتھ" سے ظاہر کرتے تھے اور پندرہ کو "دو ہاتھ اور ایک پیر" کہتے تھے۔ آج بھی گونگے اشخاص پر ہاتھ پاؤں کی اُنگلیوں سے تعداد ظاہر کی جاتی ہے۔ اسی طرح پیمائش میں بھی یہی ہاتھ پاؤں کام میں لائے جاتے تھے، اب بھی لائے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں

کہ ہاتھ کی انگلیوں کی تعداد نے گنتی کے طریقہ پر بڑا اثر کیا - وہ اس طرح کہ جب کوئی چیز گنی جاتی تھی تو دس انگلیوں تک پہونچکر پھر نئے سر سے انگلیاں شمار کرنا ہوتی تھیں - مثلاً پندرہ کی تعداد پر اس طرح پہونچتے تھے کہ پہلے دس گنے اور پھر دس کے اوپر پانچ انگلیاں شمار کی گئیں - اس طور پر فی الحقیقت آیندہ کے لئے دس کا عدد ایک منزل قرار پا گیا جس کے آگے کی منزلیں اُسی قدر اور اُسی طرح فاصلہ طے کرنے کے بعد حاصل ہو سکتی تھیں - پس ابتدائی علامتیں دس تک محدود ہو گئیں - جب کاروبار کی ضرورتوں نے علامتوں کو وسعت دینا چاہی تو ایک سو کی منزل پر پہونچکر اُس کی ایک خاص علحدہ علامت مقرر کرنا پڑی اور اُسی طرح ہزار کی - ممکن ہے کہ اگر انسان کے ہاتھوں میں کم یا زیادہ انگلیاں ہوتیں تو آج حساب کا طریقہ بھی کچھ اور ہوتا -

یہ سب باتیں تاریخی زمانہ سے پہلے کی ہیں - قدیم زمانہ میں اعداد سے متعلق جو کیفیت مختلف ملکوں میں پائی جاتی تھی حسب ذیل ہے :-

مصر میں مسیح سے ساڑھے تین ہزار برس قبل حسب ذیل علامتیں تھیں :-

ایک = ۸ - دس = ∩ - سو = - ہزار =

عراق میں ساڑھے تین ہزار برس قبل مسیح یہ علامتیں تھیں :-

ایک = (Y) - دس = (<) - ساٹھ = (Y—) - چھ سو ساٹھ = (Y<—)

چونکہ ہمارا مضمون زیادہ تر عراقی علم الاعداد سے متعلق ہے اس لئے عراقی طریقۂ حساب کی مزید وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے - طریقۂ مذکور یہ تھا کہ ایک کے ہندسہ کو دوہرا کر کے نو تک کے اعداد بنائے جاتے تھے - دس کی ایک علحدہ علامت مقرر تھی - دس سے آگے کے ہندسے ایک اور دس کی علامت کو مکرر سہ کر جوڑ کر بنائے جاتے تھے - مثلاً تیئیس (۲۳) کا عدد لکھنا ہوتا تو یوں بنایا جاتا تھا (YY<<) - جب اس طرح شمار کی نوبت ساٹھ تک پہونچتی تو ساٹھ کا ہندسہ ایک کے ہندسہ پر لکیر بڑھا کر قایم کیا جاتا - اور آیندہ اعداد کی تعمیر کے لئے یہی ساٹھ کا ہندسہ بنیاد قایم ہوتا جس طرح آج کل کے طریقۂ حساب میں دس کا عدد بنیادی عنصر ہے اور طریقۂ مذکور اعشاریہ کہلاتا ہے اُسی طرح عراقی طریقہ شصتیہ (۶۰ والا) کہلاتا ہے -

دونوں طریقوں میں جو فرق ہے اُس کو چھ سو ساٹھ کے عدد کی ترتیب و ترکیب ساخت سے سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً اگر دس کے عدد کو عنصر قرار دیا جائے تو اُس کی تشریح اس طرح یہ ہوگی - پہلا خانہ خالی یعنی صفر - دوسرا خانہ دہائی کا چھ کے عدد کو دس کے عدد سے ضرب دیا جائے گا تو حاصل ضرب (۶۰) ہوگا - تیسرا خانہ سیکڑہ کا ہے - چھ کے عدد کو (۱۰ × ۱۰) سے ضرب دیگر (۶۰۰) کا عدد حاصل ہوگا - ان تینوں (یعنی صفر + ۶۰ + ۶۰۰) کو جوڑنے پر (۶۶۰) کا عدد ہو جائے گا - عراقی ہندسہ (۶۶۰) کا اس طرح (Y<—) لکھا جاتا تھا - اس میں پہلے ساٹھ کے ہندسہ کی شکل ہے

اور پھر دس کے ہندسہ کی - ساٹھ کے ہندسہ کی ترکیب ساخت اُسی طرز کی تھی جیسی اب دس کے عدد کی ہے یعنی جس طرح دس کے عدد کی ساخت یہ ہے کہ پہلے صفر اور پھر دہائی کے ایک کو دس گنا کر کے دونوں کو جوڑ لیا جاتا ہے اُسی طرح ساٹھ کے ہندسہ کی ترکیب ساخت یہ تھی کہ پہلے صفر اور پھر ایک کو ساٹھ سے ضرب دیکر دونوں کو جوڑ لیا جاتا تھا جیسے {صفر + (۶۰)۱ = ۶۰} - اسی ڈھنگ پر (- ۶،۷) کی تشریح اس طرح ہوگی {صفر + (۶۰)۱ + (۶۰)۱۰ = ۶۶۰} - ساٹھ کے عدد میں جو لکیر ہے وہ صفر کا کام دیتی تھی -

صفر کے معنی خلا، خلا کی علامت اور محض علامت کے ہیں جس طرح اب Zero یا نقطہ، صفر کی علامت ہے اُسی طرح عراق میں لکیر سے کام لیا جاتا تھا - اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستان میں شُنیہ (علامت خلا کی) ایجاد سے پہلے صفر کی علامت ایجاد نہیں ہوئی تھی یا اعداد میں صفر (خلا) کا احساس نہیں ہوا تھا غلط ہے - خلا کا احساس ہونا لابدی امر تھا کیونکہ اُس قدیم زمانہ ہی میں یعنی کئی ہزار برس قبل مسیح جوڑ - باقی - ضرب وغیرہ کرنے کا ایک آلہ طیار ہو چکا تھا جس کی مدد سے فوری معلومات حاصل کرنے کے لئے جدولیں اور نقشے مرتب رکھے جاتے تھے - یہ آلہ اب بھی بچوں کو گنتی سکھانے کے لئے مدرسوں میں رائج ہے - یہ آلہ مستقل طور پر کام دینے کے لئے لکڑی کے چوکھٹے میں تیلیاں یا ڈوریاں ڈالکر طیار کیا جاتا تھا یا عارضی طور پر لکڑی کے تختہ پر مٹی - ریت وغیرہ بچھا کر یا کھریا سے نقشہ طیار کر کے کام لیا جاتا تھا - ملاحظہ ہو شکل ذیل :-

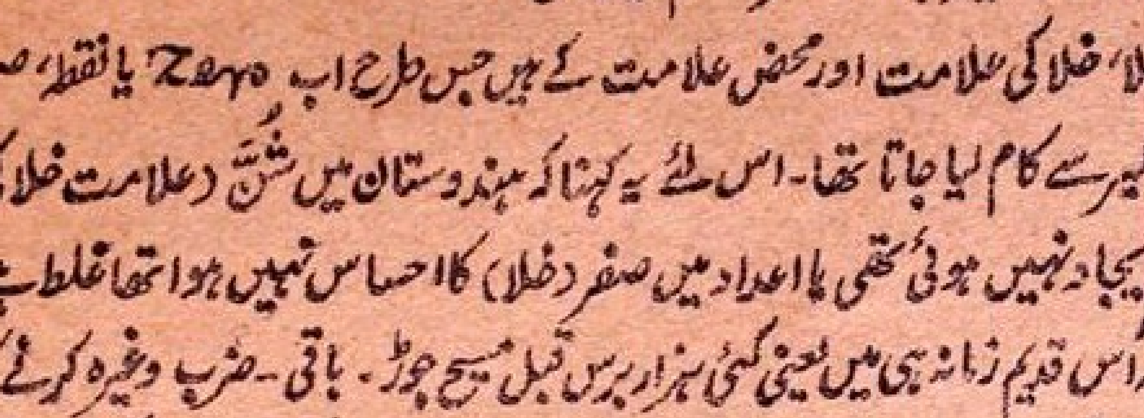

اس آلہ کی نمبر وار تیلیوں سے کام اس طرح لیا جاتا تھا کہ گنتی کی ضرورت کے لحاظ سے اُن میں تسبیح کی طرح دانے یا کوڑیاں پرو دیجاتی تھیں - ہر تیلی میں کئی دانوں کی گنجائش ہوتی تھی - مثلاً نو تک کی گنتی کی صورت میں تیلی ۱ یعنی اکائی کی تیلی میں نو تک دانے پروئے جاسکتے تھے - دس کے عدد تک نوبت پہونچنے پر ۲ (دہائی کی) تیلی میں ایک دانہ ڈالدیا جاتا تھا اور اُس سے زیادہ کے لئے پھر دس، کے پیچھے نوے کے عدد تک مزید دانے پرو دئے جاتے تھے - غرضکہ ہزار در ہزار تک کی گنتی اس طرح کر لی جاتی تھی - شمار کرنے میں یہ بھی ممکن تھا کہ کبھی کسی تیلی میں کوئی دانہ ڈالنے کی ضرورت نہ پڑتی تو اُس وقت وہ تیلی خالی رہتی تھی - زبانی حساب کتاب میں تو خلا کا احساس نہیں ہو سکتا تھا لیکن آلہ شمار کے استعمال کے وقت اس کا احساس ضروری تھا ---- قدیم اہل عراق نے اس احساس کو لکیر کی شکل میں ظاہر کیا اور اُس سے صفر کا کام لیا

لیکن ایک خامی رہ گئی یعنی وہ اس صفر کو اعداد کے درمیان میں تو کام میں لاتے تھے لیکن اخیر میں یعنی اکائی کی جگہ شاذ و نادر ہی استعمال میں لاتے تھے اسلئے جو کام اب صفر سے لیا جاتا ہے وہ پورے طور پر اُس لکیر سے نہ لے سکے اور باوجودیکہ وہ اپنے ہندسوں سے ضرب۔ تقسیم وغیرہ کر لیتے تھے وہ کی قدر و قیمت کی تعیین نہ کر سکے۔ ایک سے نو تک کے اعداد کو بھی وہ علٰحدہ علٰحدہ شکل نہ دے سکے اور یوں وہ علم الحساب کے کوئی خاص قواعد و ضوابط مقرر نہ کر سکے۔

یہ باتیں علم حساب کی آیندہ ترقی کے مدارج سے متعلق ہیں۔ سردست یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ قدیم اہلِ عراق مسیح سے تین چار ہزار سال پہلے ہندسے اور صفر ایجاد کر چکے تھے اور آلۂ شمار کی مدد سے جو تعداد اکائی سے شروع کرکے دہائی اور سیکڑوں کی جانب قایم کرتے تھے اُسی طرح بولتے بھی تھے۔ مثلاً احد ثلاثین مائیتین والف (اکتیس، دو سو اور ہزار) جس کو ہم آج ہزار کی طرف یعنی اُلٹی طرف سے شروع کرکے ایکہزار دو سو اکتیس پڑھتے ہیں۔ ہندی طریقہ بھی پہلے سیدھی طرف سے پڑھنے کا تھا جس کی یادگار چھوٹے اعداد مثل پچیس۔ اٹھتیس وغیرہ ہیں جو اب بھی پہلے اکائی اور پھر دہائی کے لحاظ سے بولے جاتے ہیں لیکن جب اُلٹی طرف سے لکھنا شروع ہوا اور حساب کتاب میں ترقی ہوئی تو ہندسے بھی بائیں جانب سے پڑھے جانے لگے۔

حال میں ہندوستان کے اندر ہنجو دارو اور ہرپّا میں قدیم زمانہ کے کچھ برتن۔ مہریں اور تعویذ برآمد ہوئے ہیں اور ان پر ایسے نقش و نگار پائے گئے ہیں جن کو از قسم تحریر ہونا قرار دیا گیا ہے۔ انھیں میں کچھ اعداد کی علامتیں بھی بتائی جاتی ہیں۔ ان آثار کا زمانہ مسیح سے ڈھائی تین ہزار برس قبل کا اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ عراق کے قدیم مقامات میں بھی ایسی ہی مہریں برآمد ہوئی ہیں۔ کتابت پڑھنے کی کوشش کی گئی، لیکن ابھی تک یہ معمّہ حل نہیں ہوا، یہی کیفیت اعداد سے بھی متعلق ہے لیکن قیاسِ غالب یہی ہے کہ نقش و نگار میں جو لکیریں حسب ذیل شکل کی پائی جاتی ہیں وہ اعداد سے متعلق ہیں:۔ ا — اا — ااا — اااا — اااا — ||||||||

ہنجو دارو کی کتابت دو قسم کے نقوش پر مشتمل خیال کی گئی ہے۔ ایک تو مصر و عراق کی طرح جانوروں وغیرہ کی تصویریں اور دوسری ایسی مفروضہ شکلیں جو کسی ذہنی تصور یا لفظ کی علامت ہوں ــــــــ

اس تحریر کی کتابت سیدھی طرف سے اُلٹی طرف ظاہر کی جاتی ہے لیکن بعض اوقات جب سیدھی طرف سے لکھتے ہوئے سطر ختم ہو جاتی ہے تو دوسری سطر وہیں سے اُلٹی جانب لکھی ہوئی پائی جاتی ہے۔ اُلٹی جانب سے لکھتے وقت علامات یا تو ویسی ہی لکھی ہوئی پائی جاتی ہیں جس طرح سیدھی طرف سے لکھی جاتی تھیں لیکن بعض دفعہ وہ منعکس شکل میں نقش کی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ ان نقوش کی صوتی اور معنوی کیفیت کیا ہے۔ اس امر کے متعلق بھی کوئی معلومات نہیں کہ ہنجو دارو کب ویران اور برباد ہوا۔

جس زمانہ کا حال اوپر درج کیا گیا ہے اگر اُس کو دورِ اول قرار دیا جائے تو دوسرا دور وہ آتا ہے جب تجارت پیشہ

سامی فینقی قوم نے عراق اور مصر کی کتابتوں سے حروف اخذ و ایجاد کر کے اطرافِ عالم میں پھیلائے اور اپنے وسیع کاروبارِ تجارت کے سلسلہ میں اجنبی قوموں کو علم حساب سے بھی روشناس کرایا۔ فینیشیا ملک شام کا وہ جنوبی علاقہ ہے جو کوہ لبنان اور بحرِ روم کے درمیان واقع ہے۔ عراق کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ ملک شام معہ اس علاقہ کے عراق کی ماتحتی میں عیسےٰ سے تقریباً چار ہزار برس پیشتر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل فینیشیا تجارت کے سلسلہ میں ہسپانیہ اور انگلستان تک پہونچ چکے تھے۔ بحرِ روم کے کنارے انھوں نے متعدد نو آبادیاں قایم کر لی تھیں اور یونان اور اُس کے آس پاس کے جزائر مدتوں اُن کے زیر اثر رہے۔

حروف کی ایجاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار برس قبل مسیح قیاس کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ حروف تقریباً ایکہزار سال قبل مسیح پہلے یونان پہونچے اور اُس کے بعد ایطالیہ میں۔ (ملاحظہ ہوں الفاظ الفا۔ بیٹا۔ تھیٹا حروف یونانی اور رومی حروف A B C D - K. L. M. N اور Q. R. S. T - بمقابلہ ابجد۔ کلمن اور قرشت کے)۔

حروف کے ساتھ ساتھ علم الحساب بھی جتنی کہ ترقی کر چکا تھا یونان پہونچا۔ حال کی ایک گرانمایہ جدید تصنیف Mathematics for the million مصنفہ L. Hogben میں سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب اقوام آریہ سنہ ۱۰۰۰ ق۔م کے قریب یونان میں داخل ہوئیں تو اُن کی اصل زبان وہی تھی جو مختلف ممالک میں داخل ہونے والے دیگر اقوام آریہ کی تھی لیکن اُس وقت تک وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور نہ اعداد سے واقف تھے اور نہ وہ ناپ تول جانتے تھے۔ یہ سب باتیں اُنھوں نے اہلِ فینیشیا سے حاصل کیں"۔

یہی حال ملک ایطالیہ کا ہے۔ کہتے ہیں کہ شہر روم سنہ ۷۵۳ ق۔م آباد ہوا تھا جس کے معنی یہ ہوئے کہ اُس ملک میں بھی اقوام آریہ ہزار آٹھ سو سال قبل مسیح داخل ہوئی تھیں۔ اُن سے پہلے جو نسل وہاں آباد تھی اولاً اُس نے اہل فینیشیا سے سیکھا اور پھر اُن کی معلومات سے رومیوں نے فایدہ اُٹھایا اور یونان کے فضل و کمال اور چھٹی صدی قبل مسیح سے ارسطو کے عہد تک کا زمانہ تیسرا دور ہے۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے شروع ہونے سے قبل اہل فینشیا اور دیگر سامی اقوام مثلاً بنی اسرائیل میں ایک جدید طریقۂ حساب جاری ہو چکا تھا۔ وہ یہ کہ حروفِ ابجد کی قیمت قایم کر دی گئی تھی یعنی ایک کی علامت کسی حرف سے مقرر کر کے اُسی کو دوہرانے سے نو تک کے ہندسے بنائے جاتے تھے۔ اور دس کی علامت کا پھر کوئی حرف مقرر کر کے اُس کی تکرار سے بیس تیس وغیرہ نوے تک اعداد بنائے جاتے تھے۔ غرضکہ اس طرح پر سو اور ہزار وغیرہ کی علامات حروفی قایم کر کے آگے کے اعداد مہیا کئے جاتے تھے۔ یہی طریقہ یونانیوں اور اہل ایطالیہ نے اختیار کیا۔ ملاحظہ ہوں یونانیوں کے اعداد جمل:- ρξθ - ξθ - κα - θ - α

۱۶۹ - ۶۹ - ۲۱ - ۹ - ۱

اہلِ اطالیہ نے اس طریقے میں کچھ ترمیم کردی - طریقۂ مذکور دونوں ہاتھوں کی دس انگلیوں پر مبنی تھا - اہلِ اطالیہ نے صرف ایک ہاتھ کی پانچ انگلیوں کو اساس قرار دیکر اکائی کے ہندسے یوں تجویز کئے :-

I - II - III - $\frac{IIII}{IV}$ - V - VI - VII - وغیرہ - پانچ کی علامت انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی ملی ہوئی شکل ہے - اکائیوں کے آگے کے ہندسے دس - پچاس - سو - ہزار وغیرہ حروف میں قایم کئے گئے اور چونکہ سکندر کے بعد رومی تمام یورپ پر حاوی ہو گئے تھے اس لئے تمام یورپ میں انھیں کے حروف اور ہندسے جاری ہوگئے - حروف تو اب تک جاری ہیں لیکن ہندسے بھی سیکڑوں برس تک جاری رہے اور جب مسلمان اہلِ عرب نے نئے ہندسے رائج کئے تو عیسائیت نے مدتِ مدید تک اُن کا استعمال ناجایز قرار دیکر ترقی کا دروازہ بند رکھا - لہذا ہم پھر یونانی دور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں - ظاہر ہے کہ جو طریقہ یونانیوں نے اختیار کیا تھا وہ کسی ترقی کا حامل نہ تھا کیونکہ حروفی اعداد سے حساب لگانے کے درجات طے کرنا (جس کو انگریزی میں calculate کرنا کہتے ہیں) محال تھا - اس لئے فیثاغورس وغیرہ کے ہاتھوں علم الاعداد ایک مقدس راز بنکر رہ گیا اور مسایل نے معموں کی صورت اختیار کرلی - فیثاغورس، فنیشیا کے صدر مقام شہر صور کا رہنے والا تھا - اسی طرح طالیس بھی ایشیائے کوچک کے ایک ساحلی شہر کا باشندہ تھا اہلِ یونان نے اُن کو بلاکر اپنے یہاں رکھا تھا - مگر یہ لوگ علم حساب میں کچھ نمایاں ترقی نہ کرسکے اور اس دور میں بھی صفر اور اعداد کا وہ استعمال جو آجکل جاری ہے دریافت نہ ہوسکا باوجود اس کے کہ ہندسوں میں تبدیلیاں ضرور ہوتی رہیں جیسا کہ شامی ہندسے ظاہر کرتے ہیں - یہ ہندسے دوسرے دور کے آخر اور تیسرے دور کے شروع میں یعنی عیسےٰ سے ہزار آٹھ سو سال قبل ملک شام میں رائج ہونا پائے جاتے ہیں - نمونہ ملاحظہ ہو :-

ایک = ا - دو = ۲ - تین = ۲ا - چار = ۲۲ -

تیسرے دور کا بیان ختم کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پھر عراقی سلسلہ کی طرف متوجہ ہوں اور آریہ اقوام کی تیسری شاخ کا ذکر کریں جو عیسےٰ سے بارہ پندرہ سو سال پہلے ایران میں داخل ہوئی تھی - یوں تو عراق کی قدیم ترین قوم سُمیری اور موہنجو دارو کی رہنے والی قوم میں کچھ نسلی اتحاد خیال کیا جاتا ہے اور عراق کی بعد کی سامی قوموں اور پنجاب کے اُس علاقہ کے درمیان جہاں بلوچستان اور ہندوستان کی سرحد پر موہنجو دارو واقع ہے تجارت کا سلسلہ رائج ہونا تسلیم کیا جاتا ہے لیکن جب ایرانی آریوں نے چھٹی اور پانچویں صدی قبل عیسیٰ میں عراق پر غلبہ حاصل کیا اور اُس کے بعد پنجاب کو بھی اپنے تصرف میں لائے تو صورت اور بھی بدل گئی —— ایرانی آریوں کی کتاب اوستا اور ہندوستانی آریوں کی کتاب رگوید کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں شاخوں کی زبان تقریباً ایک تھی - کہا جاتا ہے کہ کتاب اوستا زیادہ سے زیادہ ۵۰۰ق - م کے آس پاس کی تصنیف ہے اور اُس کا ایک نسخہ بیلوں کے چمڑوں پر لکھا ہوا سکندر کے حملہ کے وقت موجود تھا اور اُنھیں ایام میں ضایع ہوگیا - (نوٹ : پروفیسر براؤن اور بعض دیگر مصنفین اوستا کی تصنیف کو چھٹی یا ساتویں

صدی قبل عیسیٰ سے منسوب کرتے ہیں) ساسانی حکومت کے آغاز میں کتاب مذکور کا حفاظ کی مدد سے از سرِ نو قدیم کتابت میں مرتب ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ کتابت دائیں جانب سے بائیں سمت ہے اور اُس کے جو حروف ہیں وہ عراقی کتابت سے ماخوذ ہونا تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح فارسی کی اُس شاخ کی کتابت ہے جو کیخسرو اور دارا کی زبان تھی وہ بھی عراقی کتابت سے رند کی گئی تھی اور سیدھی طرف سے لکھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک تیسری کتابت تھی جس کو پہلوی کہتے ہیں۔ اِس کے حروف بھی عراقی کتابت سے حاصل کئے گئے تھے اور سیدھی طرف سے لکھے جاتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ ایران میں داخل ہونے والے آریہ فرقے بھی فن تحریر سے نابلد تھے اور اُنھوں نے بھی اُس وقت عراقی کتابت سے حروف حاصل کئے جب اُن کا تصادم اور اتصال عراقی اقوام سے ہوا۔ اس زمانہ کی بھی تعیین ساتویں آٹھویں صدی قبل عیسیٰ یا اُس کے تھوڑے عرصہ بعد ہی کی جاسکتی ہے۔ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ پہلوی کتابت نے یہاں تک سامی زبان سے استفادہ کیا کہ سامی الفاظ اپنی کتابت میں لیکر اُن کو اپنی زبان میں پڑھتے تھے۔ ملاحظہ ہو پہلوی کتابت کا فقرۂ ذیل :-

"پتکاری - زنا - مزدیسن - بگی - ارتخشتر - ملکان ملک - ایران - منوچتری - زمن - نیرتان - بارہ - پاپکی - ملکا -" اس فقرہ میں سامی الفاظ 'ملکان ملک'، 'زمن'، اور 'ملکا' ملاحظہ طلب ہیں۔

علوم ریاضی کی ترقی کا ایک اور یونانی دور ہے جس کا مرکز مصر کا شہر اسکندریہ ہے۔ یہ دور سکندر کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور رومیوں کے زمانہ تک قایم رہکر ختم ہوجاتا ہے۔ اس زمانہ میں بھی مشہور مہندس اور ریاضی داں مثل بطلیموس اور ارشمیدس نمودار ہوئے اور انھوں نے بڑی ترقیاں دکھائیں لیکن جہاں تک علم اعداد کا تعلق ہو وہ عراقی دور کی ترقی سے آگے نہ بڑھ سکے اور صفر اور ایک سے نو تک کے اعداد کی آسان تشکیل و استعمال سے قاصر رہے۔

بالجملہ روئداد مندرجۂ بالا کی چند باتیں ذہن میں رکھنے کے قابل ہیں :-

(۱) عراق و مصر کا وہ زمانہ جب وہ تصویری کتابت کے دور میں اعداد سے کام لینے لگے تھے یہاں تک کہ عراق میں صفر بھی ایجاد ہوچکا تھا۔ یہ بات کہنے سے رہ گئی کہ روتھس چائلڈ کے کارخانوں کی طرح قدیم عراق میں ساہوکاری کوٹھیاں قایم تھیں جو لین دین کا کام وسیع پیمانے پر کرتی تھیں۔

(۲) تاریخی زمانہ سے پہلے ہی وہ آلۂ شمار رائج ہوگیا تھا جس سے اعداد میں خلا کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

(۳) فنیشیا کی سامی اقوام کا وہ زمانہ جب وہ تجارت کے سلسلہ میں دور دور پہونچکر حروف و اعداد کا علم پھیلا رہے تھے۔

(۴) آریہ فرقوں کے یونان - روم و ایران میں داخل ہونے کا زمانہ۔

(۵) فرقہ ہائے مذکور کا فن تحریر و اعداد سے داخلہ کے وقت تک ناواقف ہونا۔ اور سامی اقوام سے کتابت اور علم الاعداد حاصل کرنا۔

(نوٹ:۔ نمبر ۴ اور نمبر ۵ کی واقفیت اس بحث سے متعلق ہے کہ آریہ فرقے وسط ایشیا سے اطراف عالم میں پہلے یا ہندوستان سے۔ کوئی بھی صورت ہو سوال یہ ہوگا کہ عیسٰی سے ہزار دو ہزار برس پیشتر صرف ایک حصہ قوم مذکور کا پڑھا لکھا ہوتا اور باقی تمام حصے جاہل اور ان پڑھ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

(۶) جس طرح باپ کی دولت اولاد کو ورثہ میں ملتی ہے۔ جس طرح ایک قوم کے زوال کے بعد دوسری قوم ترقی کرتی ہے۔ اسی طرح علوم و فنون بھی دور بدور منتقل ہوتے اور بڑھتے جاتے ہیں۔ عراق و مصر کے بعد یونان۔ اس کے بعد اسکندریہ۔ اس کے بعد قرطبہ و بغداد۔ پھر یورپ اور اب امریکہ۔ (باقی) ح - ا

جنوری ۴۸ء کا "نگار" جوبلی نمبر

پاکستان نمبر بھی ہوگا

جس میں سندھ، پنجاب اور سرحد کی تمام گزشتہ اسلامی تاریخ کو پیش کرکے بتایا جائے گا کہ:۔

(۱) ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد کب اور کیونکر پڑی۔

(۲) سلاطین اسلامیہ ہند نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ کس غیر معمولی انصاف و رواداری سے کام لیا۔

(۳) علوم و فنون کی انھوں نے کتنی عظیم الشان خدمت انجام دی۔

(۴) تہذیب و تمدن کی ترقی میں انھوں نے کس قدر نمایاں حصہ لیا۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد مقالات ہوں گے، جن میں عمومی طور پر اسلام کے عہد زریں اور مسلمانوں کی ذہنی و ثقافتی خوبیوں سے بحث کی جائے گی۔

تمام مقالات حضرت نیاز فتحپوری کے قلم سے ہونگے

یہ نمبر "نگار" کے تقریباً ۳۰۰ صفحات پر محیط ہوگا۔

قیمت فی کاپی تین روپیہ۔ لیکن خریداران نگار سے صرف سوا روپیہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

فارسی کے ساقی نامے

(بطرز ترجیع بند)

ساقی نامہ اس نظم کو کہتے ہیں جو مثنوی کی صورت میں ہو اور بحر متقارب میں لکھی گئی ہو، چنانچہ عبدالنبی فخرالزمانی مولف "میخانہ"[1] نے پہلا ساقی نامہ شیخ نظامی گنجوی (متوفی ۵۹۹ ہجری) کے سکندر نامے سے مرتب کیا ہے، اس کے بعد مولف مذکور نے خسرو (۷۲۵ ہجری) جامی (۸۹۸ ہجری) اور ہاتفی (۹۲۷) کی مثنویوں سے اشعار منتخب کر کے ساقی نامے طیار کر لئے ہیں، بظاہر پہلا باقاعدہ ساقی نامہ خواجہ کرمانی (متوفی ۷۵۳) نے مثنوی "ہمائے ہمایوں" میں شامل کیا، اسکے بعد ہی حافظ شیرازی (متوفی ۷۹۳) نے اپنا ساقی نامہ ایک مستقل نظم کی صورت میں مرتب کیا، میخانہ کی صراحت کے بموجب دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں امیدی (متوفی ۹۲۵ یا ۹۳۰ھ) پرتوی (۹۲۸ھ)۔ شرف جہاں (۹۲۸ھ) اور قاسمی (۹۸۲ھ) کے ساقی نامے بہت مشہور ہوئے۔ دسویں صدی کے آخر سے ساقی نامے عام طور پر لکھے جانے لگے۔ مولف میخانہ نے لکھا ہے[2] کہ عہد جہانگیری کے ہنرمندوں کی طبیعت ساقی ناموں کی طرف بہت راغب ہے، اسی فطری میل کا نتیجہ ہے کہ اس زمانہ میں بڑے طویل ساقی نامے طیار ہونے لگے، چنانچہ ظہوری نے ساڑھے چار ہزار بیت کا ساقی نامہ مرتب کیا اور اس میں طرح طرح کے مضامین شامل کئے۔

ان ساقی ناموں کے علاوہ جو مثنوی کی شکل میں ہیں، متعدد ساقی نامے، ترجیع بند، ترکیب بند، رباعیات اور غزلیات کے طرز میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ مولف میخانہ نے بہت سے ترجیع اور ترکیب بند اور چند غزلیں بھی درج کی ہیں، پہلا ترجیع بند فخرالدین عراقی (متوفی ۶۸۷) کا ہے جو خالص ساقی نامہ کے انداز میں لکھا گیا ہے، صاحب میخانہ لکھتا ہے:-

"ترجیع کہ آں مستِ مے خانۂ الٰہی بروش ساقی نامہ منظوم ساختہ، دریں اوراق پریشاں بر بیاض برد"[3]

مولف میخانہ کی نظر میں جو ساقی نامے ترجیع بند کے طرز میں لکھے گئے تھے، کم اہم نہ تھے، وہ ان کو وہی درجہ دیتا ہے جو مثنویوں کو حاصل ہے، چنانچہ وحشی یزدی (متوفی ۹۹۱ھ) کے ترجیع کا عنوان ہی ساقی نامہ ہے،[4] مزید براں اس طرز نظم کے متعلق اس کے بیانات اس حقیقت کو پوری طرح روشن کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ[5] لکھتا ہے:-

---

[1] ابتداء سے گیارھویں صدی ہجری تک کے ساقی نامے اس میں جمع کئے گئے ہیں [2] صفحہ ۵۰ [3] صفحہ ۴۷-۴۸ [4] [5] صفحہ ۱۵۴

"ترجیع کہ بروش ساقی نامہ گفتہ دریں میخانہ بعوض مثنوی بربیاض برد امید کہ در نظر اہل ہنر خارج نماید"۔

دوسری جگہ تحریر کرتا ہے :۔ "ساقی نامہ را بروش ترجیع گفتہ الحق خوب گفتہ است"۔

میخانہ کے ذیل کے بیان[1] کے مطابق یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حافظ شیرازی سے پہلے کسی نے مثنوی کا مخصوص نام ساقی نامہ نہیں قرار دیا تھا، "ایں لب تشنۂ وادیِ مطالعہ اکثر دواوینِ قدما از ابتداء تا انتہا گشت (کذا)، اریچ دیوانے ساقی نامہ بہ سامانے بہ نظر در نیامد مگر از خواجہ حافظ"۔ چونکہ عراقی، حافظ سے تقریباً ۱۰۵ سال قبل ہی باقاعدہ ساقی نامہ ترجیع بند کی شکل میں پیش کر چکے تھے، اس لئے اولیت کا شرف ترجیع بند ہی کو حاصل ہے، عراقی کے ساقی نامہ میں ۱۵ بند ہیں جن میں ایک بند میخانہ میں حذف کر دیا گیا ہے، پہلے سات بندوں میں سات سات بیت ہیں، آٹھویں اور آخری بند میں نو نو، باقی میں دس دس، یہ ترجیع بند، ساقی نامہ کا مکمل نمونہ ہے۔ ہر بند میں ساقی سے خطاب کیا گیا ہے اور شراب کے خصوصیات بیان ہوئے ہیں، اس نظم کے چند مطلعے درج ذیل ہیں :۔

ساقی بدہ آب زندگانی — اکسیر حیات جاودانی،
وقت طرب ست ساقیا خیز — در دہ قدحِ نشاط انگیز،
ساقی چہ کنم بہ ساغرِ جام — مستم کن ازاں مئے غم انجام
ساقی مئے مہر ریز در جام — بنما بہ شب آفتاب از بام،
ساقی بنما رُخ نکو بیت، — تا جام طرب کشم برویت
ساقی ز شراب خانۂ نوشش — یک جام بیاور و ببر ہوشش
ساقی بدہ آب آتش افروز — چو سوختہ ام تمام ترسوز

بیت ترجیع بھی بہت معنی خیز ہے :

در میکدہ می کشم سبوئے — باشد کہ بیابم از تو بوئے

اس ترجیع میں ساقی سے مراد خدا ہے، پوری نظم توحید کے مضامین سے پر ہے، ذیل میں آخری بند کے چند بیت درج ہیں :

ساقی قدحے کہ نیم مستیم، — مخمور صبوحی الستیم،،
از جورِ تو خرقہا دریدم — وز دست تو توبہا شکستیم،
جز جان گرو دگر نہ داریم، — بپذیر کہ نیک تنگ دستیم
با ہر چہ کہ داشتیم پیوند — از بہر تو زاں ہمہ گسستیم
بر درگہِ لطف تو فتادیم، — در رحمت تو امید بستیم

---

[1] صفحہ ۳۲۴ — [2] صفحہ ۴۴

یہ جذبات سے بھرا ہوا ترجیع بند عراقی جیسے کاشفِ اسرارِ سبحانی کے طراوشِ خامہ کا نتیجہ ہے، اس کا ہر شعر پُر اثر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔

اس کے بعد میخانہ کے مولف نے وحشی یزدی (متوفی ۹۹۱ ہجری) کا ترجیع بند ساقی نامہ نقل کیا ہے جو عراقی کے ترجیع کے تین سو سال بعد مرتب ہوا ہے، اس سے یہ بات پایۂ یقین کو پہونچ جاتی ہے کہ ساقی نامے کے لئے شعرا نے اس صنفِ سخن کو زیادہ پسند نہیں کیا۔ وحشی نے یہ ترجیع عراقی سے الگ بحر میں لکھا، اس کی تجدید اس قدر مقبول ہوئی کہ دسویں اور گیارھویں صدی میں متعدد شعرا نے اپنے اپنے ساقی نامے اسی بحر میں مرتب کئے، بندوں کی ترتیب، ردیف و قوافی کی پابندی بھی کم و بیش وہی قایم رکھی گئی۔

وحشی کے ساقی نامہ میں کل ۱۶ بند ہیں جن میں بجز نویں، دسویں اور آخری بندوں کے جن میں صرف چھ چھ بیت ہیں ہر بند سات سات شعر پر مشتمل ہے، اس میں ساقی نامے کے جزئی لوازم موجود ہیں، شراب کی تعریف، اس کے لوازم، مطرب ساقی اور نغمہ کی مدح اور اس کا اثر میخانہ کی تعریف، اہل زمانہ کی شکایت (چونکہ اس سے قبل یہ عنصر مثنوی کے طرز کے ساقی ناموں میں داخل ہو چکا تھا، اس لئے اس کا شامل کرنا ضروری تھا) اور اس طرح کے بہت سے مضامین اس ترجیع بند میں شامل ہیں۔ ایک خاص خوبی اس ساقی نامہ کی یہ ہے کہ اس میں تسلسلِ کلام بہت بڑی حد تک قایم رکھا گیا ہے مثلاً تیسرے بند میں صرف شراب کی تعریف اور اس کی کیفیت بیان ہوئی ہے اور التزام یہ کیا ہے کہ ہر بیت کی ابتدا "آں مے" سے ہو، چوتھے بند میں نغمہ کا اثر مذکور ہوا ہے اور ہر بیت "آں نغمہ" سے شروع ہوتی ہے، گیارھویں بند میں مدرسہ اور خانقاہ کی ظاہر تعلیم پر تعریض کی ہے، بارھواں بند اپنے فقر کی تعریف اور امرا کی ذم پر مشتمل ہے، تیرھویں میں اہل زمانہ کی شکایت اور چودھویں میں شکایت کے بعد شراب کی خواہش کا بیان ہے، پندرھویں بند میں میخانہ کی مسلسل تعریف ہے، بظاہر وحشی کی مراد ساقی سے ساقیِ روزِ ازل ہے، گو اس کا صاف طور سے اظہار نہیں ہوتا مگر آخری بند کے چند اشعار اس امر پر کسی قدر روشنی ڈالتے ہیں:۔

وحشی مگر آں زمزمہ از چنگ بہ در آید   کز عہدۂ شکرِ مے و ساقی بدر آید
آں ساقیِ باقی کہ پئے جرعہ کشِ او   خورشید قدح سازد و فلک شیشہ گر آید
آں دُرد کہ در میکدۂ او بہ صفائیست   لطفے ست کہ گر دانستہ چو در جام زر آید
خواہد ز سبوے مے او تاجِ سرِ خویش   آں کس کہ شدش بندۂ زریں کمر آید
در کوچۂ میخانۂ او گر فگنی راہ ،،   بس خضر سبو کش کہ ترا در نظر آید
گر در بزنی صد قدمت پیش دو اشد   آں وقت کہ آوازِ خروسِ سحر آید

بیت ترجیع یہ ہے:۔ ما گوشہ نشینانِ خراباتِ الستیم   تا بوئے مے ہست دریں میکدہ ہستیم

خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ ترجیع بند بے حد بلند ہے، استعارات بدیع و تشبیہات عجیب اس کے خاص جوہر ہیں

ساقی نامے کی تاریخ میں نورالدین محمد ظہوری (متوفی ۱۰۱۵ھ) کا نام بے حد روشن ہے، ظہوری نے ساڑھے چار ہزار ابیات پر مشتمل ایک مثنوی ساقی نامہ کے عنوان سے لکھی اور اس کو برہان نظام شاہ ثانی (۹۹۹-۱۰۰۳ ہجری) کے نام سے معنون کی، مولف میخانہ نے اس میں سے صرف ۲۴۸ اشعار درج کئے ہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولف مذکور نے صرف ابتدائی اشعار جن میں ساقی نامے کے تمام ضروری عنصر پائے جاتے ہیں، منتخب کرلئے تھے اور آخری بیت کا (جو بظاہر بے ربط ہے اور موجودہ ساقی ناموں میں موجود نہیں ہے) اضافہ کرکے ایک مکمل ساقی نامہ طیار کرلیا۔

ظہوری نے ابتداء میں کچھ اشعار منظوم کئے اور بعد میں جب اس نے برہان نظام شاہ کو اپنا ممدوح ٹھہرایا تو بقیہ اشعار لکھ کر اس کو ایک طویل ساقی نامہ کی شکل میں پیش کیا، ذیل کے چند اشعار جو خاتمہ کتاب میں درج ہیں اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں:-

به چندے ازیں پیش کانور قلم　　شد آخر ز ساقی و ساغر رقم
نگاہے ز حاسد گرفتم بہ دام　　سراپائے ایں نسخہ دیدم تمام
زدم قرعہ کایں گوہر شاہوار　　بہ دست ثنا بر کسازم نثار
بگوش سخن شد دو داں آشنا　　بہ نام کسے بر نیامد صدا
زدہ سال افزوں بریں سرگذشت　　گزشت و دل از نیت خود بگشت
علم شد بہ نورے دگر آفتاب　　زرگہائے جاں باز شد پیچ و تاب
زبس نغمۂ بلبل تہنیت　　جہاں شد پر از غلغل تہنیت
دراں ہائے و ہو مستمع گشت ہوش　　ہمہ نام برہاں شہ آمد بہ گوش
کشیدم ورقہائے پیشینہ پیش　　شدم طوطی و چیدم آئینہ پیش
دم از سینۂ صبح پرتو زدم　　برآں کہنہ زر سکۂ نو زدم
چو آں کہنہ با تازہ پیوند شد　　زبانہا بہ تحسیں برومند شد

اس ساقی نامہ کے علاوہ ظہوری نے ایک ترجیع بند ساقی نامہ شاہ نواز خاں شیرازی وزیر ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸-۱۰۳۷ ہجری) کی مدح میں لکھا ہے اور ضمناً بادشاہ مذکور کی بھی تعریف آگئی ہے، مگر بدقسمتی سے یہ ترجیع صاحب تذکرہ میخانہ کو دستیاب نہ ہوسکا تھا۔ یہ وحشی کے ترجیع کی ہو بہو نقل ہے، اگرچہ ظہوری اور وحشی معاصر ہیں اور دونوں ایک عرصہ تک میر میراں یزدی سے متعلق رہے ہیں لیکن وحشی کا ترجیع ظہوری سے مقدم ہے کیونکہ

آخرالذکر وحشی کی وفات کے تقریباً ۱۴ سال بعد دربار بیجاپور سے متعلق ہوا ہے اور اس ترجیع کو یقیناً اس کے بعد کا سمجھنا چاہئے۔

ظہوری کا ترجیع بند صرف اس کے کلیات (مملوکہ امیر الدولہ لائبریری لکھنؤ) میں محفوظ ہے، رام پور کے سرکاری کتاب خانہ اور بانکی پور کے کتاب خانہ میں ظہوری کے کلیات کے جو نسخے موجود ہیں ان میں یہ ترجیع نہیں پایا جاتا۔ اس ترجیع کی ملکیت مجہول یا مشتبہ بھی قرار نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس میں ظہوری کا تخلص صراحتاً موجود ہے، مزید براں ملک قمی نے بھی ایک ترجیع بند ساقی نامہ کے عنوان سے مذکورہ بالا دونوں ممدوحین کی تعریف میں سپرد قلم کیا ہے اور چونکہ ظہوری اور ملک قمی نے بیشتر نظمیں ایک ہی بحر، ردیف و قافیہ اور ایک ہی عنوان سے لکھی ہیں اس لئے ظہوری کے ترجیع کی نسبت اور بھی پختہ اور قابل یقین ہو جاتی ہے، بخلاف ملک قمی کے ظہوری کے ترجیع کا کوئی خاص عنوان نہیں ہے، لیکن چونکہ کلیات مذکور میں کسی نظم کا کوئی عنوان نہیں ملتا اس لئے اس خاص نظم کا عنوان نہ ہونا حیرت انگیز نہیں۔

اس ترجیع میں ۱۷ بند ہیں جن میں ۱۳ بندوں میں نو نو بیت ہیں، تیسرے آٹھویں اور سولھویں میں آٹھ آٹھ بیت اور تیرھویں میں صرف سات بیت ہیں ابتدائی ۱۱ بندوں اور پندرھویں بند کے ردیف و قوافی وہی ہیں جو وحشی کی ہیں۔ ذیل میں دونوں ترجیع کے مطلع درج ہیں جن سے یہ بات صاف طور سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ ظہوری نے وحشی سے کسقدر استفادہ کیا ہے

ظہوری		وحشی	
(کذا) در مجلس ساقی نہ فغانہ نہ سرود است	در آتش اگر ہست کسے عنبر وجود است	ساقی بدہ آں بادہ کہ اکسیر وجود است	شوئندۂ آلائش ہر بود و نبود است
(کذا) مطرب کہ می چنگ تو کو چنگ برل زن	پا کوبی ما گر نہی راہ سراں زن	مطرب بنوائی تو رہ بے خبراں زن	ما جامہ درانیم رہ جامہ دراں زن
جامے کہ زد لبا شجر طور بر آورد	در فتح سویدا علم نور برآورد	ساقی بدہ آں مے کہ زجاں شور برآرد	بر دار انا الحق سر منصور برآرد
(کذا) زاہد کشش آں مے کہ من مست ز تنگ آید	گر تخم کسی قطرہ اش اکسیر بر آید	گو مطرب خوش نغمہ کہ آتش اثر آید	کاں نغمہ بر آرد کہ زجاں شور بر آید
ساقی بکہ گوئیم کہ از غم بجانیم	بر تاب زما ایں گلہ بے تاب و توانیم	دیر یست کہ ما معتکف دیر مغانیم	رندیم و خرابا تی و فارغ ز جہانیم
مستان تو ساقی بکس دیگر نہ شناسند	جز جام و سبو زمزم و کوثر نہ شناسند	رندان خرابات سر و زر نہ شناسند	چیزے بجز از بادہ و ساغر نہ شناسند
زردی نہ دمید ہیچ نہ جبیں برگ رزاں را	می بود اگر رنگے ازیں باد خزاں را	تا راہ نمودند بما دیر مغاں را	خوش می گذرانیم جہان گذراں را
بر ہیچ گلے بستر من لیتہ خار سے ست	خشت سر کوئے تو کہ در زیر سرم نیست	ترسا بچہ گر مے و جامش خبرم نیست	خواہم بروش نام ولے ایں جگرم نیست
خود دانہ رگ و پیے ہمہ بر تار بہ بندیم	حیف ست نگہ چشم زاغیار بہ بندیم	گر عشق کند امر کہ زنار ببندیم	زنار مغاں بر سر بازار ببندیم
در گلشن مستی گل صد غم کدہ چیدیم	پے حصۂ ارباب ورع دیر کشیدیم	رفتیم بہ در مدرسہ دو گوش کشیدیم	حرفے کہ بہ انجام برم پے نہ شنیدیم
ساقی بہ بیضا بنما مست کلیمے	گرداب تو اند بدر آورد کلیمے	الحمد اللہ کہ نہ دارم زر و سیمے	کز بخل خسیسے شوم از حرص لئیمے
بزمے کہ پساغر نرود بادۂ دیدار	بر دیدہ حرام ست بہ حلم شہ دیں را	خواہم کہ شب جمعہ از خانۂ خمار	آیم بدر صومعۂ زاہد دیندار

لے افسوس ہے کہ ظہوری کے ترجیع کے بیشتر مطلعے پڑھے نہ جا سکے ۔ سے اس کا مطلع محذوف ہے۔

ظہوری کی بیت ترجیع بھی وحشی کی بیت سے بہت قریب تر ہے،

کردیم اگر توبہ در ستانہ شکستیم، زاہد! نہ کنی عربدہ ہشیار کہ مستیم

ظہوری کے یہاں ساقی سے کوئی خاص ذات مراد نہیں۔ شاہ نواز خاں کی تعریف کے لئے ۵ بند مخصوص ہیں۔ پندرھویں بند میں بادشاہ کا بھی ذکر ہے، تیرھویں بند میں گریز کی شان پائی جاتی ہے، شاعر ساقی سے شراب کی خواہش کرتا ہے تاکہ شاہ نواز خاں کی تعریف سے عہدہ برآ ہوسکے، ملک قمی (متوفی ۱۰۲۴ھ) کا بھی ترجیع بند میخانہ میں نقل نہیں ہے، اس کے بجائے اس کی ایک مثنوی جو ساقی نامہ کے طرز میں ہے، مندرج ہے، ظہوری کی طرح ملک قمی نے بھی یہ ترجیع وحشی کی اتباع میں لکھا تھا۔ میخانہ کی صراحت[1] کے بموجب ملک وحشی سے ۴ سال عمر میں بڑا تھا۔ لیکن یہ متحقق ہے کہ ملک کا ترجیع وحشی سے بہت بعد کا ہے کیونکہ وہ وحشی کی وفات کے تقریباً ۱۴ سال بعد بیجاپور جاکر ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دامن دولت سے وابستہ ہوا ہے۔ اور چونکہ اس ترجیع میں سلطان مذکور کی تعریف موجود ہے اس سے یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ یہ بیجاپور کے قیام کے دوران میں لکھا گیا۔

ملک کا ترجیع ۱۷ بندوں پر مشتمل ہے، بندوں کے ابیات ۶ سے ۱۰ تک ہیں۔ ان میں سے کم و بیش ۱۱ بند وحشی ہی کی ردیف و قوافی میں ہیں۔ ذیل میں چند مطلعے جو وحشی سے مستفاد ہیں مندرج ہیں:-

اے حرف حریف تو بہر طور کلیمے، فرعون زباں آور و موسیٰ ست ندیمے

کو عشق کہ خورشید در و بام وجود است عکس دو جہاں آئینہ بود و نبود است

چوں بوئے مے از خاکِ خرابات بر آید مے گل شود و از رخ ساقی بدر آید

از کف نہ گزارند سبک رطل گراں را شاید بگذاریم غم ما گزراں را

وقت ست کہ صوت و دو سہ برکار ببندم نقشے کہ ببندد در گفتار ببندم

ساقی بہ قدح زمزمۂ بے خبراں زن مطرب نفسے بر نفس صبحہ گراں زن

شد داغ جبیں چشم و در و سرمہ کشیدیم دیدیم ہماں راز کہ در پردہ شنیدیم

جائے نگرانیم کہ از دیدہ ورانیم، نذر نظرے خواہ کہ صاحب نظرانیم

زاہد کہ گراں بود بر و جامہ و دستار گرداند بہ گرد مئے و بخشید بہ خمار

با مے لب ساقی لب ساغر نہ شناسیم مستیم چناں کاب رز از زر نہ شناسیم

ذیل میں وحشی اور ملک کے دو مشترک اور مشابہ مطلع مندرج ہیں۔

(ملک)	(وحشی)
آئینہ زدود دل ما در تب و تاب ست بے روئے تو سرچشمۂ خورشید سراب ست	گر شکوہ آمد بہ زبان بزم شراب ست باید کہ بشوئید ز دل عالم آب ست

[1] صفحہ ۱۵۲ وحشی کا سال پیدائش ۹۳۸ ہجری اور ملک کا ۹۳۴ ہجری

ملک کی بیت ترجیع بہ نسبت ظہوری کی، وحشی کی بیت سے زیادہ مشابہ ہے:

با عہد ازل چوں گل و مل دست بہ دستیم   ما مست صفیران گلستان الستیم

ظہوری اور ملک کے ایک بند مشابہ ہیں، ان کے مطلعے درج ذیل ہیں:-

(ملک)   ظہوری

خورشید دکن تخت اگر تاج براز است   او سایۂ حق سایۂ او شاہ نوا ناست | دریائے نوازش کہ بہ روئے ہمہ باز است   از مکرمت خاں جہاں شاد نوا ناست

ظہوری اور ملک کے ترجیعات بہت سی باتوں میں یکساں ہیں، دونوں ایک ہی وقت میں لکھے گئے ہیں، دونوں میں ابراہیم عادل اور اس کے وکیل السلطنت شاہ نواز خاں کی مدح ہے، دونوں میں سترہ سترہ بند ہیں، دونوں کے ۱۱ بند ایک ہی زمین میں ہیں۔ دونوں نے وحشی سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن چند باتوں میں مختلف ہیں۔ ملک کے ترجیع بند کا عنوان رام پور کے نسخہ میں یہ ہے:- "ترجیع بند ساقی نامہ در توحید" اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں توحید کے مضامین ہیں، برخلاف اس کے ظہوری کا ترجیع محض عاشقانہ ہے۔ ملک کی نظم میں بادشاہ اور وزیر کی مدح ضمنی ہے لیکن ظہوری کا ترجیع انھیں کی تعریف کے لئے مخصوص ہے۔ ظہوری نے بندوں کی ترتیب میں بھی وحشی کی پیروی کی لیکن ملک نے اس لحاظ سے وحشی کی مطلق تقلید نہیں کی۔

اسی دور کا ایک شاعر ابو تراب بیگ فرقتی ہے۔ سلطان محمد خدابندہ اور شاہ عباس صفوی کے عہد حکومت میں اس کی شاعری کی شہرت ہوئی۔ مراۃ العالم کے مولف کے قول کے مطابق اس نے کسی بادشاہ کی ملازمت اختیار نہیں کی اور ۱۰۲۷ ہجری میں صفاہان میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مگر نشتر عشق نے اس کا سال وفات ۱۰۲۶ ہجری ٹھہرایا ہے، فرقتی نے ایک ترجیع بند ساقی نامہ وحشی کے ترجیع کی زمین میں لکھا ہے، لیکن اس پر ظہوری کے ترجیع کا بھی کافی اثر معلوم ہوتا ہے بظاہر کوئی ایسا قوی قرینہ نہیں پایا جاتا جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ ظہوری اور فرقتی میں کس کا ترجیع مقدم ہے۔ البتہ تتمہ حواشی میخانہ سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ فرقتی، ملا وحشی کا مصاحب تھا۔ اس سے یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس نے وحشی کی تقلید میں یہ ساقی نامہ لکھا ہوگا۔ اور اسی اعتبار سے اس کا وحشی کے ایام حیات میں لکھا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس صورت میں ساقی نامہ کو ظہوری کے ترجیع سے بہت قبل کا ماننا پڑے گا۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ فرقتی کا ہندوستان آنا ثابت نہیں ہے اور چونکہ ظہوری کا ساقی نامہ ہندوستان ہی میں لکھا گیا اس لئے فرقتی کو وحشی کی اتباع کرنا زیادہ آسان تھی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب وحشی کو اس طرح کے ترجیع بند لکھنے کا شرف اولیت حاصل تھا تو فرقتی کے لئے وحشی کے ترجیع کی نقل کرنا زیادہ مناسب تھا۔ پھر بھی چونکہ ظہوری اور فرقتی کے پانچ بند ایک زمین میں ہیں یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہو۔

اس ترجیع میں کل ۱۵ بند ہیں، ہر بند میں سات سات بیت ہیں۔ وحشی کے بھی بیشتر بند سات ہی ابیات پر مشتمل ہیں

مگر صرف دو بند ایسے ہیں جن کی ردیف و قوافی وحشی کے مشابہ ہیں جب کہ ظہوری کے پانچ بند فرقتی سے ملتے جلتے ہیں۔ وحشی کے چند مطلعے "ساقی بدہ آں بادہ کہ" سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کی اتباع میں فرقتی نے چند بندوں کی ابتدا انھیں الفاظ سے کی ہے۔ ظہوری اور فرقتی کے مشترک مطلعے درج ذیل ہیں:

فرقتی		ظہوری	
ساقی بدہ آں بادہ کہ ماہ شب تار است	آں بادہ کہ گل گونۂ رخسار بہار است	گل بو شدہ مے چوں نشود فصل بہار است	مستیش بہ رنگینی رخسار نگار است
ساقی بدہ آں شمع سراپردۂ جاں را	آں شعلہ کہ از عکس کند شعلہ فشاں را	ساقی ز شرابے کہ سخن تازہ بآں است	جامے بہ ظہوری کہ ثنا گستر خان است
ساقی بدہ آں بادہ کہ خونِ دل کاہ است	آں مے کہ چوں جاں در بدن شیشہ نہاں است	آرزدی نہ دمیدی ز جبیں برگ زراں را	می بود اگر رنگے ازیں باد خزاں را
مادل شدگاں را چمن عیش مقام است	آں روضہ کہ سرو و گلش از شیشہ و جام است	در میکدہ گفتیم مقیم ایں چہ مقام است	بر عکس حرم توبہ دریں کعبہ حرام است
بیہودہ چہ دل در غم اغیار ببندیم	آں بہ کہ لب از شکوۂ بسیار ببندیم	خود را بہ رگ و پے ہمہ بر تار ببندیم	حیف است نگہ چشم ز اغیار ببندیم

فرقتی کی بیت ترجیع بھی وحشی سے زیادہ مشابہ ہے:-

ما خشک لباں تشنۂ دیدار شرابیم
چوں کاسۂ ماگشت تہی خانہ خرابیم

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجیع بند کسی بادشاہ کی فرمایش سے نہیں لکھا گیا ہے، ساقی سے ساقی کوثر مراد ہے آخری بند میں اپنی غفلت، آشفتہ حالی اور سیاہ بختی کا ذکر کیا ہے، چند بیت درج ہیں:-

من کیستم؟ آشفتہ دلی، خانہ خرابی
در بحر غم افتادہ چو ماہی بہ سرابی

در دہر بود خانۂ ویرانۂ چشمم
چوں در دم طوفاں بہ سر بحر حبابی

بر چرخ بود کوکب سیارہ بختم
چوں نقطۂ بیہودۂ کاتب بہ کتابی

پیوستہ بود بر سر سیلاب سر شکم
ایں چرخ نگوں ہم چو پلے بر سر آبی

یک لحظہ نہ کردم ز گرفتاری غفلت
کارے کہ بہ محشر بودم چشم ثوابی

آہم کہ بہ صحرائے قیامت چو در آیم
افتند بہ دنبالِ سرم خیل خرابی

با ایں ہمہ چوں شعلہ نیابم ضرر از نار
گر ساقی کوثر دہدم جام شرابی

مولف "مے خانہ" نے "ترجیع بند" مذکور کو بے حد پسند کیا ہے، "مراۃ العالم" کے مولف نے اس ترجیع سے چند بیت منتخب کئے ہیں۔

اسی عہد کے ایک اور مشہور شاعر فغفور گیلانی (متوفی ۱۰۲۸ھ) نے ۱۱ بند کا ایک ترجیع وحشی کے طرز میں لکھا۔ اگرچہ قطعی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترجیع خاص کر کس کی نقل ہے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس کے پیش نظر ظہوری اور ملک کے بھی ترجیعات رہے ہیں جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ ۱۰۱۲ ہجری کے قریب وہ ہندوستان آیا تھا۔

لہ حواشی میخانہ صفحہ ۸۴ — سلہ میخانہ (حاشیہ) صفحہ ۳۲۳

اس کا ہر بند سوائے بند دہم کے جس میں ۸ بیت ہیں، ۱۹ اشعار پر مشتمل ہے، ان میں صرف ۴ بند وحشی، ظہوری اور فرقتی کی زمین میں ہیں۔ پہلا بند فرقتی کے پہلے بند کے مشابہ ہے، چند مشترک مطلعے درج ہیں:۔

ساقی بدہ آں بادہ کہ خورشید شرار است　　چوں آتش گل ریز بہ دامان بہار است
رفتیم بہ یکبار رہ دیر و حرم را　　یکدست گرفتیم صمد را و صنم را
مطرب رہ بلبل زدہ، ساقی رہ گلزار　　گل می شگفد بلبلہ را از سر منقار
زاہد اگرت میل سبکساری جان است　　بر دوش سبو گیر کہ سجادہ گراں است

بیت ترجیع کا قافیہ تمام بیتوں سے مختلف ہے:

ما دجلہ کشی یاد گرفتیم ز استاد　　ما را خط بغداد بہ از خطۂ بغداد

اس میں تصوف کا عنصر زیادہ ہے، ساقی سے کوئی خاص ممدوح مراد نہیں ہے اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کس کے حکم سے اور کس کی تعریف میں لکھا گیا۔

اس عہد کے ایک شاعر کامل جہرمی نے وحشی کے طرز میں ایک ترجیع بند ساقی نامہ لکھا، اس کا ہر بند وحشی کے ہر بند کے مشابہ ہے، ترتیب بھی بعینہ وہی قایم رکھی گئی ہے۔ کل ۱۶ بند ہیں۔ بجز پانچویں بند کے ہر بند میں سات سات بیت ہیں۔ تعداد ابیات کے اعتبار سے بھی یہ ترجیع بالکل وحشی کے ترجیع کا جواب ہے۔ ہر بند کے مطلعے درج ذیل ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ کامل نے وحشی سے کس قدر استفادہ کیا ہے، اگرچہ پروفیسر شفیع[1] نے ساتویں اور نویں بند سے جو فرقتی کے دوسرے اور تیرھویں بند کے متوازی ہیں یہ قیاس کیا ہے کہ فرقتی کا ساقی نامہ کامل کے پیش نظر تھا۔

ساقی بدہ آں مے کہ زیانش ہمہ سود است　　چوں دست و دل پیر مغاں مایۂ جود است
اے مطرب مستاں رہ خونیں جگراں زن　　وز زمزمہ ناخن بہ دل بے خبراں زن
خمار عصیرے کہ ز انگور بر آرد　　آبے ست کہ ریزد بہ خم و نور بر آرد
اے مطرب موزوں چو لبت نغمہ سراید　　از رشک نوا ساز فلک نوحہ گر آید
نے دشمن دوزخ نہ ہوا خواہ جنانیم　　دیرے ست کہ مستغنی ازیں سود و زیانیم
مستان سخن واعظ و منبر نہ شناسند　　غیر از سر خم منبر دیگر نہ شناسند
خواہم کہ ز خود دور کنم نام و نشاں را　　تا خدمت شائستہ کنم پیر مغاں را
عمرے ست کہ از نیک و بد خود خبرم نیست　　از نغمہ گزیرے وز ساغر گزرم نیست
چوں پیر مغاں گفت کہ زنار ببندیم　　از طرۂ سہر شنجہ یک تار ببندیم،
از خرقۂ پشمینہ زہاد زیاں کار　　کردیم بہ یک حیلہ بروں صدبت پندار

در مدرسہ و صومعہ بسیار دویدیم　　از علم و عمل چاشنی عشق نہ دیدیم
از مال جہاں گرچہ نہ دارم زر و سیمے　　دارم ز دل و دیدۂ خود ناز و نعیمے

وحشی کے متوازی مطلع ظہوری کے ترجیع کے سلسلہ میں درج ہو چکے ہیں بقیہ چار مطلعے بالمقابل درج ہیں۔

کامل		وحشی	
از حرص و امل ہست جہاں زاہل زمانہ	پر ولولہ و شور چو حمام زنانہ	دارم بہ زباں شکوۂ از اہل زمانہ	کو مطرب سازندے کہ بگوئیم ترانہ
مے نوش کہ بنیاد جہاں بر سر آب است	چیزے کہ ز خویشت برہاند مے ناب است	گر شکوہ آمد بہ زباں بزم شراب است	باید کہ بشوئید ز دل، عالم آب است
رفتہ بہ خرابات و تماشائے خم او	کز غم بگریزیم بہ تہ پائے خم او	میخانہ کہ پروردہ ام از لائے خم او	بادا سر من خاک کف پائے خم او
کامل سرت از بادہ مبادا کہ بر آید	ہشدار کہ چوں بادہ رود در سر آید	وحشی مگر آں زمزمہ از چنگ بر آید	کز عہدۂ شکر مئے و ساقی بدر آید

بیت ترجیع بھی وحشی سے بہت قریب تر ہے:

با صاف دلاں در دکش بزم الستیم　　با نغمہ و مے لب بہ لب و دست بہ دستیم

وحشی کی طرح کامل نے ساقی سے ساقی کوثر مراد لیا ہے، آخری بند میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے:

ایں بادۂ عشق ست نہ خمر ست کہ مستیش،　　گر عربدہ جو گردد و گر فتنہ گر آید
بر اہل کرامات شود کشف مقامات　　از شیشہ چو برجوشد و در جام در آید
عارف رہ صد سال بہ یک جرعہ کند طے　　با دوست بہ پیوند دو از خویش بر آید
از ساقی باقی طلب آں مے کہ ز عارف　　ہر راز کہ پوشیدہ بود در نظر آید
در میکدہ از آلودگی نفس شدم پاک　　از بادہ بشوئیدم اگر عمر سر آید

وحشی کی تقلید میں اس ترجیع میں تسلسل کلام کی چاشنی موجود ہے۔ معنوی حیثیت سے بھی یہ ترجیع وحشی کی ہو بہو نقل ہے، ساقی کی مدح، شراب کی تعریف، اسکے اثرات و کیفیات، میخانہ اور مطرب کی تعریف، بے ثباتی دنیا کا نقشہ، شکایت روزگار، واعظ پر طنز، زاہد پر پھبتی، تعلیم ظاہری کی تعریض و تنقیص وغیرہ اس کے مضامین ہیں۔ تفصیل بالا سے وحشی کے ترجیع بند کی غیر معمولی مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، خود اس کے معاصرین اس کی اُستادی کے قائل تھے۔ وحشی سے مشہور تر شعرائے اسکی تقلید کی یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اور بھی شعرا ہوں گے جنھوں نے وحشی کے ترجیع کی پیروی کی ہوگی لیکن اب تک کسی صاحب کی نظر وہاں نہیں پہنچ سکی ہے۔ معاصرین کی تقلید سے یہ صریحی نتیجہ نکلتا ہے کہ متاخرین کے دور آخر میں بہتوں نے اس ترجیع کے جواب میں نظمیں لکھی ہوں گی، لیکن چونکہ اس دور کے ساقی نامے یکجا جمع نہیں ہوئے (اور اگر ہوئے بھی ہوں تو ناپید و نایاب ہیں) اس لئے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ اگر کوئی صاحب ذوق شعرائے متاخرین کے کلیات سے ساقی نامے جمع کریں تو یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی۔

ڈاکٹر نذیر احمد ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

باب الاسئلہ والمناظرہ

فرائڈ کا جنسیاتی نظریہ

(از جناب محشر ام - اے - ملتان)

غالباً آپ نے مارچ کے نگار میں "باب الاستفسار" کے تحت اُردو ادب میں موجودہ فحش نگاری کے متعلق کچھ لکھا تھا اور توقع کی تھی کہ اس مسئلہ پر کوئی ترقی پسند ادیب روشنی ڈال سکے گا، مگر میری نظر سے ایسا کوئی جواب ابتک نہیں گزرا، اس لئے اس مضمون کے آخر میں تھوڑا سا اشارہ اس طرف بھی کردیا ہے شاید اس سے کسی ترقی پسند کو کچھ لکھنے کا خیال پیدا ہو۔ بہرکیف فرائڈ کے نظریہ کے پیش نظر ان کی فحش نگاری ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یا تو انھوں نے فرائڈ کے نظریہ کو نہیں سمجھا یا پھر اس کا کوئی اور سبب ہے۔

فرائڈ کا استدلال اکثر "جنس" کے گرد گھومتا ہے گو اس سے پہلے اور غالباً یورپ میں سب سے پہلے دھیلر نے اپنا جنسی نظریہ دنیا کے سامنے رکھا تھا جس کا ردِ عمل استثنائی تھا مگر فرائڈ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ "جنس" کو شعور اور دل و دماغ کے مرکز میں کھینچ لایا یہ ایک ایسا گہرا نفسیاتی اقدام تھا کہ دشمن تک اس کی افادیت سے انکار نہ کر سکے۔ مگر افسوس کہ اس نے اس مسئلہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدی جس سے اسکی تحریریں فلسفہ و نفسیات سے زیادہ شہوانی جذبات کا مطالعہ نظر آتی ہیں۔

سب سے پہلے اس واقعہ کا ذکر جس نے اس کی زندگی کا رُخ بدل دیا، دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جنگِ عظیم سے چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ فرائڈ، ڈاکٹر شرکوٹ کے یہاں ہپناٹزم سیکھنے گیا۔ ایک دن ڈاکٹر موصوف نے ہسٹریا کی ایک مریضہ کو دیکھ کر کہا "ہسٹریا کی علتِ غائی جنسی ہوا کرتی ہے" یہ فقرہ سن کر اس کا شاگرد (فرائڈ) چونک پڑا، پوچھا "کیا ہمیشہ" اس نے جواب دیا "ہاں ہمیشہ" بس یہاں سے فرائڈ کو اعصابی امراض میں جنسی علت ڈھونڈھنے کا خیال پیدا ہوا۔ پھر اس نے بہیم تجربات اور خوابوں کی تعبیرات سے نظریئے قایم کئے اور جنسی مضمرات کو روشنی میں لایا جس کی اولیت کا سہرا اسی کے سر ہے۔

فرائڈ نے انسانی زندگی کو مختلف مرحلوں میں تقسیم کیا ہے، سب سے پہلا مرحلہ بچے کا پستان چوسنا ہے، فرائڈ کے نزدیک بچے کا یہ عمل جنسی نوعیت رکھتا ہے جس کو وہ خود اشتی استلذاذ (Suckling) کہتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ عمل اکتساب لذت سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یوں بھی بچہ انگوٹھا چوستا رہتا ہے۔ دوسرا مرحلہ "تعشق بالنفس" (Autoerotic Phase) کا ہے اس عہد میں بچہ حوائج ضروریہ کے رفع کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے اور بڑے ہوکر اس کی یہ دلچسپی جنسی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ تیسرا مرحلہ Metheroticism کا ہے اس عہد میں بچے کے اندر بعض اعضا سے اکتساب لذت کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اس

احساسِ لذت کشی کو فرائڈ نے "خود پسندی" سے تعبیر کیا ہے جو تھا مرحلہ "انفعالی عشق" objective love کا ہے اس عہد میں بچہ دوسروں سے اکتسابِ لذت کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں فرائڈ نے ایک حیرت انگیز خیال ظاہر کیا ہے کہ اس عہد میں بچے کی خواہشِ استلذاذ والدین کا رخ کرتی ہے اور بچہ ماں سے عشق کرنے لگ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں باپ کو رقیب پاکر حسد اور رشک کے جذبات دل کے اندر پیدا کر لیتا ہے، مگر وہ اس کے اظہار سے خود کو روکتا ہے جس سے پہلی ذہنی گرہ oedipus complex پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ان ذہنی گرہوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ یہ "ذہنی گرہیں" کیا چیز ہیں؟ ------ مثال کے طور پر بچے کو لیجئے اس کے دل میں طرح طرح کی خواہشات جنم لیتی ہیں، جن میں سے بعض کمزور ہوتی ہیں اور بعض طاقتور۔ پہلے پہل جو خواہش اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ اکثر کمزور ہوتی ہے مگر آہستہ آہستہ تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے اور دماغ و دل پر مستولی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ دفعۃً اس خواہش کی تکمیل میں ناکامی بچے کے دماغ کے لئے ایک حادثہ ثابت ہوتا ہے اور اس سے دو صورتیں ظہور میں آتی ہیں یا تو اس کا ذہن حادثے کی تاب نہ لاکر توازن کھو بیٹھتا ہے یا پھر اس کے دل پر اس ذہنی حادثہ کی ایک "چوٹ" باقی رہ جاتی ہے اور اس چوٹ کا نام "ذہنی اُلجھن" Trauma ہے مگر وہ خواہش بذاتِ خود مٹ نہیں جاتی بلکہ لاشعور میں چلی جاتی ہے۔

یہاں سے لاشعور کی اہمیت پیدا ہو جاتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ لاشعور کیا چیز ہے ------- مثال کے طور پر ایک طالبعلم کو لیجئے پروفیسر لکچر دے رہا ہے اور طالبعلم کی نظریں کبھی اس کے چہرے پر۔ کبھی تختۂ سیاہ پر۔ کبھی اپنے ماحول کی اشیاء پر پڑتی رہتی ہیں، مگر کیا طالبعلم کا ذہن فقط انھیں چیزوں کا علم رکھتا ہے؟ ------ بلکہ وہ اپنے رشتہ داروں کا علم رکھتا ہوا اپنے تعلقات کی نوعیت کا اُسے علم ہے اسے اپنی کتابوں کے اندر خیالات اور آرا کا علم ہے اور اس طرح کی بہت سے اشیا سے اسکا ذہن واقف ہے مگر وہ خیالات اب کہاں ہیں؟ ظاہر ہے کہ دماغ کے کسی کونے میں مرکوز ہیں اور ارادہ کرنے پر فوراً سامنے آجاتے ہیں ان دو حالتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلی حالت کا نام "شعور" Conscious mind ہے اور دوسری حالت کا نام "تحت الشعور" ہے جس پر فرائڈ نے بہت زور دیا ہے۔ اس کے نزدیک لاشعور ہماری زندگی میں نہایت اہم پارٹ ادا کرتا ہے اس کی اہمیت کی ایک مثال ملاحظہ ہو ----- ایک دفعہ فرائڈ نے ہپناٹزم سے "معمول" کو مدہوش کیا جس سے اسکا لاشعور اُبھر آیا، عامل نے اس کو حکم دیا کہ فلاں تاریخ فلاں وقت تمھیں اپنے بوٹ سر پر رکھ کر چلنا ہوگا، اس کے بعد حالتِ مدہوشی توڑ دی گئی اُسے بالکل کچھ یاد نہ تھا کہ عامل اور اس کے درمیان کیا گفتگو ہوئی مگر مقررہ تاریخ اور مقررہ وقت پر وہ لاشعوری طور پر بوٹ سر پر اُٹھائے پھرتا تھا۔ اس طرح اور بہت سے حیرت انگیز واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کا جمالیاتی ذوق بھی عموماً لاشعور کا مرہونِ احسان ہوتا ہے، چنانچہ فرائڈ کے نزدیک ہمارا جمالیاتی مسرت جنسی جذبہ کی ایک ارفع اور منطقی "شعور" کی بلند صورت ہے۔ مثلاً بعض بچے مٹی اور پتھروں سے دلچسپی رکھتے ہیں، بڑے ہو کر ان کی یہ دلچسپی مصوری اور سنگتراشی کی اعلیٰ صورت اختیار کر لیتی ہے اسی طرح وہ اشخاص جنھیں علم جنسیات سے شغف ہوتا ہے اکثر ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرتے ہیں

عشق بالنفس والے عموماً شاعر بنتے ہیں۔ کیونکہ خواہشات دبانے سے مٹ نہیں جاتیں بلکہ لاشعور میں چلی جاتی ہیں اور بعد میں وہ باہر نکلنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتی ہیں، مگر شعور انھیں اُبھرنے نہیں دیتا۔ اول الذکر حیوانی خواہشات کو فرائڈ نے "جبلی حرکتِ ارادی" کا نام دیا ہے اور شعور کے چوکیدار کا نام Super - ego یعنی "منطقی شعور" رکھا ہے۔ ان دو میں دائمی جنگ جاری رہتی ہے "جبلی حرکتِ ارادی" دبی خواہشات کو شعور میں دھکیل دیتی ہے مگر شعور انھیں پھر دبا دیتا ہے۔ اس جنگ کا ایک منظری پہلو خواب ہے۔ نیند میں شعور کا محافظ ہو جاتا ہے، جس سے جبلی حرکتِ ارادی دبی خواہشات کا لشکر لیکر میدانِ شعور میں آ دھمکتی ہے مگر شعور کے جاگنے سے پھر بھاگ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم سوتے سوتے چونک اُٹھتے ہیں یا عموماً خواب کے بعد فوراً جاگ پڑتے ہیں۔ اسی طرح لاشعور سے دبی خواہشات اور جذبات بھیس بدل بدل کر آتے رہتے ہیں اور نکاس کا راستہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ لاشعور اپنے اشارات سے شعور کی توجہ ان دبی خواہشات کی طرف مبذول کراتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواب کی تعبیر میں اشارات واقعات پر دلالت کرتے ہیں اور یہی جبلی حرکتِ ارادی انسانی اعمال و افعال کا منبع ہے جس کو حد سے زیادہ دبانا نظامِ زندگی کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہے۔ مگر صورتِ حالات ہمیشہ یہی نہیں رہتی۔ بلکہ دبی خواہشات ہمیشہ نکاس کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیتی ہیں ایک طریقہ over compensation کا ہے جس کی مثال یہ ہے کہ عاشق اپنے جذبۂ عشق کے اظہار کو عموماً اس طرح تسکین بہم پہونچاتا ہے کہ محفل اور دوستوں میں محبوب کا ذکر کسی برائی کے سلسلہ میں خوب مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات دبی خواہشات ضد کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، جس کو فرائڈ نے 'ایذا رسانی' سے 'ایذا طلبی' کی طرف انتقال سے تعبیر کیا ہے اور جو اس کے نزدیک بہر نوع جنسی ہوا کرتی ہے۔ مگر بعض اوقات حالت دگرگوں ہو جاتی ہے یعنی دبی کچلی خواہشات گاہے گاہے اعصابی امراض باعث ہوتی ہیں، فرائڈ کے نزدیک ان اعصابی امراض مالیخولیا، دیوانگی۔ اختناق الرحم۔ جنون، مرگی کی وجہ سے ننانوے فیصدی جنسی ہوتی ہے اور اس کے خیال میں اگر مریض کے ذہن کو کریدا جائے اور اس ذہنی اُلجھن کا پتہ لگا کر تسکین کا سامان کر دیا جائے تو مریض شفایاب ہو سکتا ہے چنانچہ اس کا یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا گو اس سلسلہ کے بعض دیوانگی زدہ مریض طریقِ مذکور سے تندرست نہ ہو سکے۔ لیکن اکثر اس کی افادیت کامیاب رہی لاہور میں فرائڈین طریقۂ علاج کے ماہر ڈاکٹر اشرف مشہور ہیں۔

اب ان مذکورہ بالا "ذہنی گرہوں" اور "جمالیاتی ذوق" کو مدِ نظر رکھ کر بعض لکھنے والوں کے خیالات کی تحلیلِ نفسی کی جائے تو یقیناً کچھ اس قسم کی جنسی "ذہنی گرہ" کا سراغ مل جائے گا 'جنس' کا اس طرح آزادانہ تذکرہ کرنے والے ترقی پسند ادیبوں کو ہم متہم قرار نہیں دے سکتے گویا اس سلسلہ میں لاشعوری طور پر 'جمالیاتی ذوق' ان کی رہنمائی کر رہا ہے اور وہ بغیر محسوس کئے ایسا کچھ لکھ جاتے ہیں یا پھر کسی دبی ہوئی خواہش نے نکاسی کا اس طرح راستہ ڈھونڈھ نکالا ہے۔

(نگار) آپ کی اس تحریر سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ جو حضرات اپنے افسانوں یا مضامین میں فحاشانہ بیباکیوں سے کام

لیتے ہیں، وہ آپ کے نزدیک اعصابی امراض کے مریض ہیں اور فرائیڈ کے نظریہ سے آپ اس کا استناد کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ اس نوع کا لٹریچر اعصابی مریضوں کے دماغ کا نتیجہ ہے یا نہیں، بلکہ صرف یہ کہ وہ ادب صحیح (Sound Literature) کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں اور لکھنے والوں کی طرف سے جو دلایل اسکے جواز میں پیش کئے جاتے ہیں وہ کس حد تک لایق اعتنا رہیں۔

اگر آپ کے قول کے مطابق یہ لٹریچر مریض کے فکر ونظر کا نتیجہ ہے تو ظاہر ہے کہ اسے بھی سقیم ہونا چاہئے، لیکن لطف یہ ہے کہ اس قسم کا لٹریچر پیش کرنے والے اس کو ادب صحیح سمجھتے ہیں اور اس کے جواز میں اقوال فرائیڈ سے استناد کرکے جنسی عقدہ کشائیوں کا واحد ذریعہ اسی قسم کے لٹریچر کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ Realism (حقیقت نگاری) کا تقضا بھی یہی ہے کہ جو کچھ ذہن میں ہو بے کم وکاست ظاہر کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں دو باتیں میری سمجھ میں کبھی نہیں آئیں، ایک یہ کہ اگر اس قسم کا ادب اضطراری نتیجۂ فکر ہے تو اس سے قبل کیوں نہیں پایا گیا اور دوسرے یہ کہ اگر وہ واقعی کسی اعصابی مرض کا علاج ہے تو اس سے لوگوں کو شفا کیوں نہیں ہوتی اور یہ طریق علاج کیوں خود مرض بن کر رہ جاتا ہے۔

اساتذۂ قدیم کے کلام میں بھی فحش نگاری کی مثالیں ہم کو ملتی ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ یہ نتیجہ رہا ہو انکی کسی جنسی گرہ کے کھلنے کا، لیکن نہ انھوں نے اس پر کبھی فخر کیا اور نہ دنیا نے ان کی ادبیت کا معیار قایم کرنے میں اس چیز کو سامنے رکھا۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ اس کو معیاری چیز کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے یعنی سوال گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونے کا نہیں، بلکہ اس سے لطف اٹھانے اور اس کو سراہنے کا ہے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، قصور نہ فرائیڈ کا ہے اور نہ اسکے نظریوں کا، بلکہ آزادی کی غلط تعبیر کا ہے۔ مغرب نے ہم کو جہاں اور درس دئے ہیں، وہیں ایک درس یہ بھی دیا ہے کہ انسان اپنی رائے وفکر میں بالکل آزاد ہے اور ہمارے ملک کے نوجوان اس "حریت فکر ورائے" کے استعمال میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ یقیناً ذہنی آزادی انسان کا فطری حق ہے، لیکن اگر یہ آزادی سماج کے اخلاقی قانون توڑنے کے لئے استعمال کی جائے تو یہ ذہنی آزادی نہ کہلائیگی بلکہ اس کو "ذہنی انارکی" کہیں گے، جو آجکل کے بعض ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے یہاں پائی جاتی ہے اور جسے ہم نہ "ادب صحیح" کہہ سکتے ہیں اور نہ ہیئت اجتماعی کے لئے مفید۔

جب اول اول یہ رو چلی ہے، تو میں زیادہ مشوش نہ تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ چیز زیادہ چلنے والی نہیں ہے اور اس کا رخ جلد یا بدیر یقیناً بدلے گا، چنانچہ میرا یہ خیال صحیح نکلا کیونکہ اب آزادہ روی وترقی پسندی کی دیوانگی کا وہ رنگ نہیں ہے اور ہمارے نوجوانوں کا جوش وولولہ جو پہلے صرف فرائیڈ کی تائید میں صرف ہوتا تھا، اس میں اب ٹھیراؤ پیدا ہو گیا ہے اور "ادب کاسد" پیش کرنے کی جگہ زیادہ تر "ادب صالح" پیش کیا جا رہا ہے۔

ہر چیز کا ایک دور ہوا کرتا ہے اور جب اس کی ضرورت نہیں ہوتی تو دوسری چیز اس کی جگہ لے لیتی ہے، اس سے قبل ہمارے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں نے جو کچھ پیش کیا، وہ اپنی جگہ یقیناً قابل قدر ہے لیکن اب زمانہ کا مطالبہ کچھ اور ہے اور ہمارے ترقی پسند ادیب اسی مطالبہ کو پورا کر رہے ہیں، اور نظم ہو یا نثر اس میں "ادب برائے حیات" کا پہلو زیادہ نمایاں ہے، اور آہستہ آہستہ غیر ضروری یا مضرت رساں پیداوار از خود کم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اک کمی بھی ہے اور وہ یہ کہ لکھنے والے زیادہ کاوش سے کام نہیں لیتے، بلکہ میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ وہ شاید اپنی تحریر پر نظر ثانی بھی نہیں کرتے اور اس لئے اس کی صورت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی کاریگر پرزہ تو ٹھیک ڈھالے لیکن اس پر صیقل نہ کرے۔

آپ بیشک نظم و نثر دونوں کی ٹکنک کو بدل سکتے ہیں، لیکن جو ٹکنک آپ اختیار کرتے ہیں اُسے تو بے عیب ہونا چاہئے۔ جس طرح دنیا میں ہر پُرانی چیز بُری نہیں ہے اسی طرح ہر نئی چیز اچھی بھی نہیں ہو سکتی۔ حسن و قبح کا ایک معیار ہر زمانہ میں پایا جاتا ہے جس کو سماج قایم کرتی ہے اور جس سے ہٹ کر کوئی انفرادی تحریک ترقی نہیں کر سکتی۔

دی مغل لائن لمیٹیڈ

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :۔

عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

مال اور مسافروں کو بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے لکھئے :۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

بنک اسٹریٹ کلکتہ

مالہٗ و ماعلیہ

جگر۔ سیماب اور ماہر القادری

آجکل کے سالنامہ (۴۷ء) میں جناب جگر کی ایک غزل شایع ہوئی ہے:۔

ہر وہ حلقہ، جو تری کاکل شبگیر میں ہے　　گوشۂ امن، بلاخانۂ زنجیر میں ہے
شاہد روح کہاں۔ جلوہ گہِ ناز کہاں　　خاک، مصروف ابھی خاک کی تعمیر میں ہے
کون قاصد یہ سمجھتا ہے دمِ رخصتِ شوق　　ربط محکم، اسی بے ربطیِ تحریر میں ہے
دل بھی ہے جلوہ گہِ دوست مگر اے واعظ　　عیدِ نظارہ، ہلالِ خمِ شمشیر میں ہے
دیکھنا جبرِ مشیت، کہ بہ قیدِ زنداں،　　پاؤں زنجیر سے باہر ہے نہ زنجیر میں ہے،
اپنے سر آپ نہ لیں دلشکنی کا الزام،　　مجھ کو معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے
خود کھچے آتے ہیں زنداں کی طرف دیوانے　　کوئی تو وجہ کششِ نالۂ زنجیر میں ہے

چھپ کے پیروں اسے او دیکھنے والے یہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں، جو مری تصویر میں ہے

پہلے شعر میں "کاکل شبگیر" کی ترکیب غلط ہے۔ شب گیر دو معنی میں آتا ہے، ایک بہ معنی سحر اور دوسرے بہ معنی "کوچ آخر شب"۔ مظہر کاشی کا شعر ہے:

ساقیا شبگیر شد شمع شبستانی بیار　　بزم روحانی بپا کن جام ریحانی بیار،

اس شعر میں "شبگیر شد" بہ معنی "سحر شد" استعمال ہوا ہے اور "نالۂ شبگیر" نالۂ صبحگاہی کو کہتے ہیں۔ تنہا کا شعر ہے:

بمن تا داشت لطفش گوشۂ چشمے براہ او　　زگرد سرمہ از خود نالۂ شبگیر میکردم،

کوچ کے مفہوم میں فردوسی کا شعر ملاحظہ ہو:

بہ شمشیر شبگیر ہا برکشیم،　　ہمہ دامن کوہ لشکر کشیم

جگر صاحب شب گیر کے معنے شبگوں سمجھتے ہیں، جو بالکل غلط ہے۔

علاوہ اس کے شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بھی ناقص ہے، شاعر نے کاکل کے دو حصّے کئے ہیں ایک وہ جس میں حلقے ہیں اور دوسرا وہ جس میں حلقے نہیں ہیں ۔ دوسرے حصّہ کو وہ بلاخانۂ زنجیر کہتے ہیں اور پہلے حصّے کو گوشۂ امن ۔ لیکن یہ تفریق و امتیاز کیوں ہے ۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ اگر کاکل بلاخانۂ زنجیر ہے تو حلقے ہوں یا نہ ہوں بلاخانہ ہے ۔ حلقہ میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسے گوشۂ امن قرار دیا گیا ۔

دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ بے معنی ہے ۔ خاک کا خاک کی تعمیر میں مصروف رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا اگر دوسری جگہ بجائے خاک کے حُسن ہوتا تو بھی غنیمت تھا اور تاویل کر کے کوئی مفہوم پیدا کیا جا سکتا تھا ۔

تیسرا شعر بھی کوئی مفہوم نہیں رکھتا ۔ اگر "یہ" کا اشارہ دوسرے مصرعہ کی عبارت کی طرف ہے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ شاعر قاصد سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ "دمِ رخصتِ شوق کون یہ بات سمجھتا ہے کہ بے ربطی تحریر ہی ربط محکم ہے" اور اس کا اہمال ظاہر ہے، قاصد اور تحریر دو چیزوں کے اظہار سے یہ بات ظاہر ہے کہ عاشق کوئی تحریر قاصد کو دیکر محبوب کے پاس روانہ کر رہا ہے اور قاصد اس تحریر کو دیکھ کر اعتراض کرتا ہے کہ تحریر بہت بے ربط ہے جس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ تحریر کی بے ربطی ہی ربط محکم ہے ۔ اگر جگر صاحب نے یہ شعر اسی مفہوم میں لکھا ہے تو "دمِ رخصتِ شوق" کا ٹکڑا بالکل بیکار ہے اور "کون سمجھتا ہے" کے استعمال کا بھی کوئی موقعہ نہیں ۔ علاوہ اسکے "رخصتِ شوق" کی ترکیب بھی صحیح نہیں ۔ رخصت کے معنے اجازت کے ہیں اور شوق کے معنے آرزو یا تمنا کے ہیں، اس لئے جب تک رخصت اور شوق کے درمیان لفظ اظہار نہ آئے، کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا ۔ اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :

نامۂ شوق ہے قاصد یہ، تجھے کیا، لے جا

چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ غزل کا ہے اور دوسرا نظم کا، کیونکہ اس کا تعلق قومیات سے ہے علاوہ اسکے ہلال کو تو عید نظارہ کہہ سکتے ہیں، لیکن ہلال میں عید نظارہ کا ہونا بے معنی سی بات ہے ۔ اسے واعظ کا ٹکڑا بھی یہاں بالکل بے محل ہے ۔ کیا واعظ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ عید نظارہ کا تعلق ہلالِ خمِ شمشیر سے ہے ۔ اگر واعظ سیاسی ہے تو وہ بھی یہی کہے گا اور اگر سیاسی نہیں ہے تو اس سے خطاب کر کے ایسی بات کہنا جس سے اُسے کوئی تعلق ہی نہیں، بیکار ہے ۔

پانچویں شعر میں جبر مشیت کا استعمال اگر صحیح مانا جائے تو دوسرا مصرعہ بہ لحاظ مفہوم نادرست ہے ۔ کیونکہ جبر کے مفہوم کو سامنے رکھ کر یوں کہنا چاہئے تھا کہ پاؤں زنجیر سے باہر ہے مگر پھر بھی زنجیر میں ہے ۔ پاؤں کا نہ زنجیر سے باہر ہونا نہ زنجیر سے اندر ہونا ۔ یہ تو مشیت کا سحر و افسوں ہے نہ کہ جبر ۔

باقی تین شعر گو معمولی ہیں لیکن بے عیب ہیں ۔ آخری شعر کا پہلا مصرعہ اُلجھا ہوا ہے اور "اُسے او" کا تلفظ زبان و گوش دونوں کے لئے بار ہے ۔

سیماب

آجکل کی اسی اشاعت میں جناب سیماب کی بھی ایک نظم "علم و خبر" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے۔ جسکے اکثر اشعار میں تغزل پایا جاتا ہے۔ نظم بے عیب ہے، لیکن پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں "سبزہ نکھر گیا" کی جگہ "سبزہ نکھر آیا" لکھا گیا ہے۔
(مصرعہ یہ ہے:۔ پھولوں سے حجاب اُٹھے سبزہ بھی نکھر آیا)

اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

ہر قطرۂ خوں میرا تحلیل ہوا لیکن، تصویر محبت میں اک رنگ تو بھر آیا

یہاں لفظ تحلیل کا صرف غلط ہے۔ تحلیل کہتے ہیں کسی چیز کو پگھلا کر فنا کر دینا اور اسی لئے تحلیل ان اشیاء کے لئے استعمال ہوتا ہے جو جامد و سخت ہیں۔ اور خون چونکہ رقیق چیز ہے اس لئے اس کے لئے تحلیل کا لفظ استعمال کرنا درست نہیں یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا:۔ ہر قطرۂ خوں میرا گو صرف ہوا لیکن

ماہر القادری

اسی اشاعت میں فکر و پیام کے عنوان سے جناب ماہر القادری کی بھی ایک نظم شایع ہوئی ہے جس کے ایک شعر میں انھوں نے عجیب قسم کی غلطی کی ہے۔ شعر یہ ہے:۔

گھٹائیں چشم عنایت ادھر نہ فرمائیں، نہیں ہیں باغ یہ انگور کے، یہ ہے فالیز

فالیز جسے فارسی میں جالیز بھی کہتے، خربزہ وغیرہ کی کاشت کو کہتے ہیں جسے بارش کی ضرورت بہت کم ہوتی ہے، لیکن ماہر صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ فالیز کی طرح تاکستان (باغ انگور) کو بھی بارش موافق نہیں آتی۔ علاوہ اس کے پہلے مصرع میں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ محاورہ عنایت فرمانا ہے، نہ کہ "چشم عنایت فرمانا" اسی نظم کا ایک مصرعہ ہے:۔

قدم بڑھائے چلا جا ابھی کچھ اور بھی تیز

اس میں کچھ اور بھی تیز کا فقرہ بیکار ہے۔ قدم بڑھائے چلا میں یہ مفہوم شامل ہے۔

فراق

اسی اشاعت میں فراق کی بھی دو غزلیں نظر آتی ہیں جس کے بعض مصرعے تقطیع سے خارج ہیں۔ مثلاً:۔

کتنے پانی میں ہے حسن، عشق ہے کتنے پانی میں

مسولینی کے قتل کی داستان

(کرنل ولیریو کی زبان سے)

میں نے مسولینی کو ادائے فرض کے سلسلہ میں گولیوں کا نشانہ بنایا اور جب جانکنی کے وقت اس کا جسم کانپ رہا تھا تو نہ کوئی جذبۂ نفرت و افتخار میرے اندر پایا جاتا تھا، نہ جذبۂ غرور و ہمدردی۔ جب اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا تو اطمینان و سکون کا احساس ضرور مجھے تھا کیونکہ میں نے قومی عدالت کے حکم کی تعمیل کی تھی اور مسولینی کی موت کے بعد میں اپنے فرض سے ادا ہو گیا تھا۔ لیکن تھوڑی سی حیرت ضرور تھی کہ مسولینی صورت تو شیر کی سی رکھتا تھا، لیکن دل ویسا نہ تھا اور اس نے بہادر کی طرح جان نہیں دی۔

۲۷ اپریل ۴۵ء ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شب کو ٹریزی گارڈ کے افسر نے فون پر ہم کو اطلاع دی کہ مسولینی گرفتار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد رات کو ساڑھے گیارہ بجے اور ایک بجکر بیس منٹ پر اور اطلاعات بھی ہم کو ملیں جس سے مسولینی کی گرفتاری کی پوری تفصیل معلوم ہوئی۔

۲۷ اپریل کی صبح کو ۸ بجے نازیوں اور فاسسٹیوں کا ایک دستہ بمقام ڈونگو گرفتار ہوا اور اس میں مسولینی بھی تھا جو ایک جرمن ٹینک میں چھپا ہوا تھا، جس کا علم اسوقت کسی کو نہ تھا۔ جب آزاد فوج کے سپاہی اپنے قیدیوں کی تلاشی لینے لگے تو مسولینی چپکے سے ٹینک چھوڑ کر ایک جرمن لاری میں جا کر کمبلوں کے ڈھیر میں چھپ گیا۔ لیکن جب لاری کی تلاشی ہوئی اور اس کا پتہ چلا تو اس نے کہا کہ "نازی سپاہی مجھے پریشان کرنے کے لئے کمبلوں کے نیچے دبا کر چلے گئے"۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اسے پہچانتے نہیں اور نازیوں کی شکایت کرنے سے اسے دوست سمجھ کر رہا کر دیں گے، لیکن اسکی یہ ترکیب کارگر نہ ہوئی اور سپاہی اس کو معہ اس کی محبوبہ کلارا اور پچاس دوسرے فاسسٹیوں کے پکڑ کر ایک کسان کے مکان میں لے گئے جو قریب ہی واقع تھا۔

اس کے بعد ساری رات قومی عدالت اپنا کام کرتی رہی اور ٹھیک ایک بجکر ۲۰ منٹ پر مجھ کو یہ حکم ہوا کہ فوراً ڈونگو جا کر حکم نمبر ۵[1] کی تعمیل کروں۔ لیکن مجھے کوئی ہدایت نہیں کی گئی کہ ۵۱ قیدیوں میں سے کس کس کو قتل کیا جائے۔ یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

---

[1] حکم نمبر ۵ سے مراد قتل و قصاص یا حبس دوام کا حکم ہے۔

چونکہ مجھ کو صرف ۲۴ گھنٹے کی مہلت تعمیل حکم کے لئے دی گئی تھی، اس لئے میں نے فوراً تیرہ قابل اعتماد سپاہی انتخاب کئے اور ایک سیاہ رنگ کی نئی فیاٹ موٹر کار اور ایک لاری میں گیس پوری طرح بھر کر جانے کے لئے طیار ہوگیا۔ میں نے بندوق و ریوالور کی بھی اچھی طرح جانچ کر لی کہ وہ ٹھیک ہیں یا نہیں اور صبح بہت سویرے میلان سے شمال کی طرف روانہ ہوا۔ میرے تیرہ ساتھی بالکل لاعلم تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور انھیں کیا کرنا ہے۔ لیکن روانگی سے قبل میں نے خفیہ طور پر ان کے افسر کو ضرور بتا دیا تھا کہ اس سفر کا کیا مقصد ہے۔ دوسرے لوگوں سے میں نے صرف اتنا کہہ دیا تھا کہ تم کسی کا مقابلہ کرنے نہیں جا رہے ہو، لیکن ممکن ہے اس کی بھی ضرورت ہو اس لئے تمھیں اسکے لئے بھی طیار رہنا چاہئے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وقت جبکہ میں صبح کو سنسان سڑک پر چلا جا رہا تھا، میرے دل و دماغ کن خیالات سے معمور تھے۔ میں نے مسولینی کو کبھی نہ دیکھا تھا اور اس کے عہد میں کامل ۵ سال تک سیاسی قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کر چکا تھا، اس لئے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس صورت کا انسان ہوگا، وہ کیا کہے گا اور اپنی موت کی پذیرائی کیونکر کرے گا، لیکن سب سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ وقت نہ خراب ہو اور میں متعینہ وقت کے اندر اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔ کیونکہ خوف یہ بھی تھا کہ ممکن ہے ہماری جماعت کے جاسوسوں کو ہمارے اس سفر کا مقصد معلوم ہو جائے اور نازی سپاہی ہم کو آگے نہ بڑھنے دیں۔

میں ۸ بجے صبح کومو پہونچا، شہر میں اس وقت ہنگامہ مچا ہوا تھا، میں سیدھا پولیس کے دفتر میں پہونچا اور میں نے کہا کہ ہم لوگ اُن فاسسٹ لیڈروں کے مسئلہ کے سلسلہ میں سفر کر رہے ہیں، جو ڈونگو میں گرفتار ہوئے ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ "وہ کل یہیں کومو لائے جائیں گے"۔ میں نے کہا کہ "ان کے متعلق مجھے قومی عدالت عظمیٰ کی ہدایات موصول ہوئی ہیں اور میں ان پر عمل کروں گا، اس لئے فوراً ایک بند ٹرک کا انتظام کر دیا جائے تاکہ میں اپنے سپاہیوں کو لے جا سکوں"۔ میرے اس اصرار پر افسران پولیس میں کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ان کے چہروں سے وحشت و پریشانی سی ٹپکنے لگی، کیونکہ فاسسٹی زمانہ کی ہیبت ان کے دلوں سے پوری طرح دور نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک بند کمرہ کے اندر چلے گئے تاکہ اس مسئلہ پر غور کریں۔ میں نے فوراً میلان کو فون کیا اور وہاں سے جواب آیا کہ مقامی افسران کا فیصلہ کوئی چیز نہیں ہے، سابق حکم کی فوراً تعمیل کی جائے۔

مجھے یہاں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا اور ٹھیک ۱۱ بجکر ۲۰ منٹ پر مجھے ایک شکستہ ٹرک دیا گیا۔ میں نے دوسرا ٹرک طلب کیا اور پھر کافی انتظار کے بعد ایک امبولنس کار فراہم کی گئی۔ میں غصہ سے بیتاب تھا اور دیر ہو جانے کی وجہ سے ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مقررہ وقت ختم ہو جائے اور مجھ سے بازپرس کی جائے، میں وہاں کے کمانڈر اور پریسیڈنٹ سے ملا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس لئے میں نے دو مسافر لے جانے والی لاریاں پکڑیں اور میرے سپاہی کسی نہ کسی طرح ان میں گھس پل کر بیٹھ گئے، میں نے یہاں کے کمانڈر اور پریسیڈنٹ کو بھی ساتھ لیا تاکہ راستہ روک ٹوک کے بغیر طے ہو سکے

جونہی ہم کومو سے روانہ ہوئے، وہاں سب سے پہلی اتحادی فوج داخل ہوئی اور لوگوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ مینے اپنے شوفر سے کہا کہ پوری رفتار سے چلو کیونکہ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت ایک بڑا ٹرک ہمارے پاس سے گزرا۔ مینے فوراً اسے پکڑا اور اس میں سب کو بٹھا کر چل پڑا۔

۴ بجکر دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ ہم ڈانگو پہونچے اور قومی فوج کے سپاہیوں نے ہمیں دشمن سمجھ کر اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں، لیکن جب انھیں ہمارا مقصد معلوم ہوا تو ان کے افسر نے ہمیں ۱۵ قیدیوں کی فہرست دیدی اور اس طرح مجھے موقعہ ملا کہ میں حکم نمبر ۵ کی تعمیل کر سکوں۔

اس حکم کے الفاظ یہ تھے۔

"چونکہ فاسسٹ حکومت کے لیڈروں نے قوم کی آزادی چھین کر ملک کا مستقبل تباہ کرنے کی کوشش کی تھی اس لئے ان کو سزائے موت دیجاتی ہے، لیکن وہ لوگ جنھوں نے کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا انھیں حبس دوام کی سزا دیجائے۔ اس حکم کی تعمیل کو قومی عدالت کے ذریعہ سے کی جائے"

مینے یہاں کے کمانڈر سے کہکر فوجی عدالت طلب کی اور ۱۵ قیدیوں میں سے سترہ مینے سزائے موت کے لئے منتخب کر لئے جن میں مسولینی تو شامل تھا، لیکن اس کی محبوبہ کلارا نہ تھی۔ تمام قیدی اس وقت ایک مقام جنر میگو میں تھے۔ میں ۵ بجکر ۱ منٹ پر وہاں روانہ ہوا اور جاتے ہوئے راستہ ہی میں ایک جگہ قتل و قصاص کے لئے منتخب کر لی۔ سڑک کے موڑ پر ایک سنسان باغ تھا اور اس میں ایک غیر آباد مکان تھا اسی جگہ کو میں نے مناسب سمجھا، لیکن اس کا اظہار میں نے کسی سے نہیں کیا۔ میں نے چند گز آگے چل کر پھر اپنی بندوق اور ریوالور کی جانچ کی اور ان کو بالکل درست حالت میں پایا۔

ہم خاموش سڑک پر چلے جا رہے تھے کہ میں نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا کہ "تمھیں معلوم ہے ہم وہاں جا کر مسولینی سے کیا کہیں گے؟" اس نے کہا "مجھے معلوم نہیں"۔ میں نے کہا کہ "میں کہونگا کہ ہم لوگ تمھیں آزاد کرنے آئے ہیں"۔ میرے ساتھی نے کہا "وہ ایسا بیوقوف نہیں ہے کہ اس کا یقین کر لے"۔ مینے کہا کہ "دیکھنا وہ ضرور یقین کر لیگا"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیوں یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا، شاید اس لئے کہ مسولینی آسانی سے میرے ساتھ آجائے اور غالباً یہ دیکھنے کے لئے بھی کہ مسولینی ایسا بڑا انسان بیوقوف بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔

وہ مکان جس میں قیدی بند تھے ایک پہاڑی کی ڈھال پر واقع تھا۔ میں نے سنتریوں سے گفتگو کی اور تنہا اندر گیا اور مسولینی کو سب سے پہلی مرتبہ دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دیکھئے مسولینی کیا کہتا ہے اور اپنے انجام پر ہنستا ہے یا روتا ہے۔

جب وہ گرفتار ہوا تھا تو سپاہیوں نے اس سے کہا تھا کہ اپنی گرفتاری کی پوری تفصیل خود اپنے قلم سے لکھدو۔

چنانچہ اس نے قلم لیکر لکھا کہ "آج ۲۷؍اپریل کو ڈانگو کے سنٹرل اسکویر میں ۵۲ نمبر کی گریبالڈی بریگیڈ نے مجھے گرفتار کیا" سپاہیوں کے افسر نے طنزیہ لہجہ میں کہا کہ "یہ بھی لکھدو کہ گرفتاری کے بعد مجھ سے برا سلوک کیا گیا اور مجھے بھوکا رکھا گیا۔" مسولینی نے قلم اُٹھایا اور لکھا کہ "گرفتاری کے وقت اور اس کے بعد مجھ سے مناسب سلوک کیا گیا" اور یہ لکھ کر اپنے دستخط کردئے۔

چونکہ یہ حال مجھے معلوم تھا اس لئے میں سمجھتا تھا کہ مسولینی اپنے وقار کو اب بھی قایم رکھے گا، لیکن میں نے خلاف توقع اسے نہایت دہشت زدہ حالت میں پایا۔ میں اس وقت قومی فوج کی خاکی وردی پہنے ہوئے تھا اور سہ رنگی فیتا میرے بازو پر تھا اور کرنل کے درجہ کا تین ستارہ والا نشان میرے سینہ پر۔ بندوق میرے ہاتھ میں تھی اور ریوالور کمر میں۔

مسولینی فاسسٹی وردی میں اپنے بستر کے پاس کھڑا ہوا تھا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے ایک پھنسے ہوئے جانور کی طرح دیکھ رہا تھا اور اس کا نیچے کا ہونٹ کانپ رہا تھا۔ وہ بمشکل تمام پوچھ سکا کہ: "کیا بات ہے؟"

مینے کہا: "میں تمھیں آزاد کرنے آیا ہوں" اس کو اس کا بالکل یقین آگیا اور فوراً ہی پھر شہنشاہ معلوم ہونے لگا۔ میں خیال کر رہا تھا کہ میں کسی بڑے انسان کو اپنی گولی کا نشانہ بناؤں گا لیکن مسولینی کے انداز دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کیونکہ اپنی عقل و ذہنیت کے لحاظ سے وہ بہت معمولی انسان نکلا۔

اس نے شاہانہ انداز سے سوال کیا: "ہم کہاں چلیں گے"۔ مینے پوچھا "کیا آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے؟" اس نے کہا: "نہیں" اور دروازہ کی طرف بڑھ کر خود ہی کہا کہ "آؤ چلیں"

جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی اس کی محبوبہ کلارا اپنے بستر پر چادر اوڑھے ہوئے لیٹی تھی، لیکن مسولینی نے ایک بار بھی اس طرف نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کے وجود کی اُسے خبر ہی نہیں ہے۔ میں نے کلارا سے کہا کہ "پہلے تم چلو"۔ وہ مسکرا کر کپڑے ٹٹولنے لگی اور بولی کہ "میرے پاس underwear نہیں ہے" وہ اس وقت سیاہ ریشمی سایہ پہنے ہوئے تھی اور اس کے نیچے کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا۔ میں نے کہا کہ "چلو، تم اب جوان نہیں ہو کہ اس کی فکر کرو۔"

مسولینی دروازہ کی طرف بڑھا اور دہلیز پر پہونچکر میری طرف مڑ کر پورے شاہانہ انداز کے ساتھ بولا کہ:۔

"میں تمھیں سلطنت دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

جب یہ دونوں موٹر میں بیٹھ چکے تو میں بھی بندوق لئے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ سوچ کر بولا کہ: "اپنی ٹوپی اُتار دوں ورنہ لوگ پہچان جائیں گے"۔ یہ کہکر اس نے اپنی ٹوپی اُتار لی۔ لیکن پھر خود ہی بولا کہ "میرے گنجے سر کو

بھی دیکھ کر پہچان جائیں گے"۔ میں نے کہا کر "ٹوپی پہن لیجئے، مناسب یہی ہے" چنانچہ اس نے ٹوپی پھر پہن لی۔

کار آہستہ آہستہ پہاڑی سے نیچے اُتر رہی تھی، جب وہ اس جگہ پہونچی جسے میں نے قتل کے لئے منتخب کیا تھا تو میں نے دیکھا کوئی آس پاس موجود تو نہیں ہے اور سناٹا دیکھ کر میں نے شوفر کو کار ٹھہرانے کا حکم دیا اور مسولینی سے کہا کہ "اُتر کر سامنے کی دیوار کی طرف چلئے" وہ چلا لیکن کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ جب دیوار تک پہونچکر اس نے مڑکر مجھے دیکھا تو میں نے اس کو قومی عدالت کا حکم سنایا۔

اس وقت یہاں صرف چند آدمی تھے۔ مسولینی، اس کی محبوبہ، ایک سولیین افسر اور میں۔ ۴ بجے شام کا وقت تھا، ہوا میں سکون تھا اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جب میں نے حکم پڑھ کر سنایا تو کلارا چیخ اُٹھی "نہیں نہیں مسولینی کبھی قتل نہیں ہو سکتا"۔

مسولینی کا سارا جسم اس وقت کانپ رہا تھا اور وہ بمشکل تمام یہ چند الفاظ کہہ سکا۔ "لیکن ۔ لیکن ۔ کرنل ۔ لیکن ۔ لیکن ۔ کرنل"۔

مینے اپنی بندوق اُٹھائی اور کلارا سے کہا کہ "الگ ہٹ جاؤ ورنہ تم بھی ماری جاؤ گی" وہ ایک طرف کو ہٹ گئی اور میں نے بندوق کی لبلبی دبائی، لیکن فیر نہ ہوا۔ کلارا پھر چیختی ہوئی مسولینی کی طرف بڑھی اور اسکے گلے میں باہیں ڈال دیں، لیکن خود مسولینی کا یہ عالم تھا گویا اسے کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ وہ رو رہی تھی، چیخ رہی تھی، لیکن مسولینی دیوانہ وار ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، نہ اس نے کلارا سے بات کی، نہ اپنی ماں، بیوی اور بچوں کے متعلق کچھ کہا۔ مینے کلارا سے چیخکر کہا کہ "ہٹ جاؤ" اور بندوق پھینک کر ریوالور سر کرنا چاہا، لیکن وہ بھی فیر نہ ہوا۔ مینے فوراً اپنے ساتھی کی رائفل لی اور پے در پے پانچ گولیاں اس کے جسم کے اندر پہونچائیں۔ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا، لیکن مرا نہیں، میں نے ایک گولی سے کلارا کو ٹھنڈا کیا اور پھر مسولینی کے قریب جاکر اسکے دل کی جگہ گولی لگائی اور آخر کار وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

توقیت ۸ر ۔ نقشہائے رنگ رنگ ۴ر

ریاض نمبر ۔ بجائے ایک روپیہ صرف ۸ر کے ٹکٹ بھیجکر حاصل کیجئے

مذہب　اور　فلسفۂ مذہب

دونوں معہ محصول دو روپیہ میں

(زیر طبع)

"من ویزداں"

حضرت نیاز کے مذہبی مقالات

"مطالعات نیاز"

تاریخی و علمی مقالات کا مجموعہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

دلچسپ معلومات

قحطِ بنگال کا ایک دردناک منظر

اس وقت ساری دنیا قحط کی گرفت میں ہے اور یہ گرفت روز بروز سخت ہوتی جارہی ہے۔ خود ہمارے ملک کے بعض حصے اس دورِ ابتلا سے گزر رہے ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی شاید نہ بچ سکیں۔ لیکن وہ لوگ جن کو کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے قحط کے حقیقی مفہوم اور اس کے جانگداز منظر سے بے خبر رہتے ہیں۔

پچھلے قحطِ بنگال میں انسانیت جس درد و کرب کے دور سے گزر چکی ہے اس کی صحیح تاریخ تو شاید کبھی مرتب ہو سکیگی لیکن بعض لوگوں کے چشم دید بیانات سے تھوڑا سا اندازہ اس بات کا ضرور ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے بندوں سے کتنے عرصہ تک بنگال میں روٹھا رہا اور اس کی بے نیازی کیسے کیسے دل ہلا دینے والے مناظر کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرتی رہی۔

حال ہی میں امریکہ کے فوجی ڈاکٹر جان فریڈرک میوہل نے اپنا ایک نہایت ہی سرسری مطالعہ پیش کیا ہے جو انھوں نے قحطِ بنگال کے دوران میں کیا، اور جس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں دولت کی تقسیم کس درجہ غیر متوازن ہے۔ اور ایک غریب انسان کی جان ایک دولتمند انسان کے مقابلہ میں کتنی ارزاں، بیکار اور ذلیل خیال کی جاتی ہے۔

وہ لکھتا ہے:۔ "میں کلکتہ پہونچا تو یہ دیکھ کر حیران رہگیا، ایک جانب سامانِ عیش فراہم تھا، شاندار ہوٹلوں اور عالیشان قہوہ خانوں میں لذیذ کھانوں کی افراط تھی اور دوسری جانب بھوکوں کی چیخ دپکار۔ تنگ و تاریک گلیوں میں رہنے والے رینگتے اور تڑپتے ہوئے بھکاریوں اور اچھوتوں کو چاول اور باجرہ کا ایک دانہ تک نصیب نہ تھا اور وہ اپنے ننگے اور خالی پیٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوشحال لوگوں کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے اور جب وہ شانِ استغنا سے گزر جاتے تو فاقہ زدہ مخلوق بے جان اور مردہ ہو کر کسی نالی کے کنارے گر پڑتی اور لاش اُٹھا لیجانے والی گاڑی کا انتظار کرتی رہتی۔

"صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس قحط میں کتنی جانیں ضایع ہوئیں۔ زندگی ارزاں تھی مگر چاول گراں۔ بے شمار جسم جلا دئے گئے پھر بھی سینکڑوں جہاں پڑے تھے وہیں پڑے رہے۔ انسانی گوشت کتوں کا ماحضر بنا ہوا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ادھر فاقہ کش نے آخری سانس اور ادھر کتے اس پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک شخص کی نیم جاں لاش کو کتے نوچ رہے تھے اور اسکی بیوی جو خود بھی فاقوں کی وجہ سے مر رہی تھی اپنے شوہر کی لاش کو ان کتوں سے چھیننے کے لئے

جنگ کر رہی تھی۔

"ہر جانب سے کراہنے اور آہیں بھرنے کی دردناک صدائیں آرہی تھیں اور فاقہ زدوں کی جماعت لوگوں کی ٹانگوں سے لپٹ کر "صاحب! صاحب!" کی آوازیں لگاتی۔ لیکن وہ کوئی توجہ نہ کرتے۔ ہوٹلوں کے آگے ہر وقت سیکڑوں سسکتی ہوئی جانیں پڑی رہتیں۔ اسی کے ساتھ اندھیروں اور دھندلکوں میں بھوکی نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ جو اخلاق سوز سلوک کئے گئے ان کا بیان غالباً مناسب نہیں۔

"میں نے دیکھا ایک جگہ انگریزی عورتیں بات چیت کر رہی تھیں۔ ایک نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "قحط کی وجہ سے ہم کو ناقابلِ بیان صعوبتیں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ سڑکوں پر چلنا دشوار ہے۔ ننگی بھوکی مخلوق ہم کو نوچنے دوڑتی ہے۔ ہمارے کھانے کے برتن ہفتہ میں دو دو بار غائب ہو جاتے ہیں۔

دوسرے روز میں مردہ جلانے کا میدان دیکھنے گیا۔ دروازے ہی سے تڑپا دینے والی بدبو نے دماغ پریشان کر دیا مردہ جسموں کو لکڑیوں کے بستر پر لٹا کر ان پر تیل چھڑک کر آگ لگائی جا رہی تھی ــــ اس کے بعد ہی اطلاع ملی کہ اور لاشیں اُٹھانے کی جلد ضرورت ہے۔

"ہم لوگ انتظام قحط کے ایک دفتر میں پہونچے۔ دیکھا کہ ایک بورا چاول کا ہزاروں بھوکے لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے اور دوسری جانب میدان میں مردہ جسم اکٹھا کئے جا رہے ہیں۔

شام کو ایک میجر سے ان انتظامی مرکزوں کے بارے میں بات چیت کی۔ اس نے کہا کہ قحط کا انسداد چاولوں کے چند بوروں سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس تقسیم غلہ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ مٹھی بھر چاولوں کے لالچ میں وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اگر ہم ان کا پیٹ بھرنے میں نہیں تو کم از کم ان کے مردہ جسموں کو جمع کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اب بھی بنگال میں صدہا علامات اور نشانات اس قحطِ عظیم کی غمازی کر رہے ہیں۔ اب بھی آدھی آبادی بے دست و پا اور مفلوک الحال نظر آتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں خوشحال لوگوں کی بے رحمی اور حیوانیت اس قحط کا سب سے بڑا سبب ہے۔

چوروں کا باضابطہ ادارہ

جارج ڈگبی نے اپنی سیاحت چین کے سلسلہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک دن شنگھائی کے ضلع ننگ پو میں بہ سلسلۂ ٹینس ٹورنامنٹ کچھ انگریز مدعو تھے اور جیتنے والوں کو چاندی کی کچھ چیزیں انعام میں دی جانے والی تھیں۔ شام کو جب تقسیم انعام کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ وہ چیزیں سب کی سب غائب ہیں اور باوجود تلاش کے کہیں نہ ملیں ــــ میزبان نے اپنے ملازم سے پوچھا کہ ــــ "تم نے امسال چوروں کا ٹیکس ادا کر دیا ہے یا نہیں"۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ یہ ٹیکس ایک ایک پائی ادا ہو چکا ہے، تو اس نے کہا کہ چوروں کے پریسیڈنٹ کو بلایا جائے۔

ایک گھنٹہ کے بعد پریسیڈنٹ آیا۔ یہ اچھی خاصی شریفانہ صورت کا ایک معمر انسان تھا جو سفید ریشمی عبا اور ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور اس کو دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ چور یا چوروں کا سردار ہو سکتا ہے۔ میزبان نے اس سے سارا واقعہ بیان کیا اور اس نے چُرائی ہوئی چیزوں کی فہرست معلوم کر کے وعدہ کیا کہ کل شام تک یہ چیزیں آپ کو واپس ملجائیں گی"۔

میں یہ سنکر حیران رہگیا اور اپنے میزبان سے دریافت کیا کہ یہ کیا قصہ ہے اور یہ شخص کیونکر چور کو گرفتار کر سکے گا۔ اس نے کہا کہ یہ شخص چوری کے معاملہ میں "اسکاٹ لینڈ یارڈ" سے زیادہ مفید و کار آمد ہے کیونکہ چین میں جس طرح اور تمام پیشہ وروں کے جتھے ہیں، اسی طرح گداگروں اور چوروں کے بھی ہیں اور ان کا ایک سردار ہوتا ہے جو ان پر حکومت کرتا ہے۔ چونکہ چین میں سماجی نظام بہت پیچیدہ ہے اور وہاں اشیاء کی طلب و فراہمی بالکل متوازن ہے اس لئے وہاں چوری کو برداشت نہیں کیا جا سکتا اور اس کے انسداد کی یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ وہ افراد جو چور ہیں یا بیکاری کی وجہ سے چور بن سکتے ہیں، ان سب کی سوسائٹی بنا دی گئی اور ایک پریسیڈنٹ مقرر کر کے اُسے ذمہ دار بنا دیا گیا کہ سوسائٹی کا فرد چوری نہ کرے اور پبلک نے اس بات کی ذمہ داری لی کہ وہ سوسائٹی کے تمام افراد کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک فنڈ قایم کر دے، چنانچہ چین کے ہر شہر میں چوروں کی یہ سوسائٹیاں قایم ہیں اور شہر کا ہر باشندہ ایک مقررہ رقم بطور ٹیکس کے ادا کرتا ہے، چنانچہ میں بھی سالانہ ۸ شلنگ (چھ روپیہ) ادا کرتا ہوں اور اس تھوڑی سی رقم ادا کرنے کے بعد مجھے چوری کی طرف سے اطمینان حاصل ہے۔ جس گھر کا ٹیکس ادا ہو جاتا ہے اسکے دروازہ پر چوروں کی سوسائٹی کی طرف سے ایک خاص نشان بنا دیا جاتا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ اب ایکسال تک اس گھر میں چوری کا امکان نہیں ہے"۔

دوسرے دن شام کو میں اپنے میزبان کے ساتھ چاء پی رہا تھا کہ چوروں کا سردار آیا، اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے، جو ایک نوجوان شخص کے گلے میں رسّی ڈالے ہوئے گھسیٹتے چلے آ رہے تھے، سردار نے تمام مسروقہ چیزیں واپس کیں اور کہا کہ "اب اس شخص کو سزا دیجائے گی آپ لوگ بھی دیکھئے"، یہ سنتے ہی سب نے مخالفت کی، لیکن میرے میزبان نے کہا کہ آپ لوگ اس معاملہ میں دخل نہ دیں اور جو اصول ان کے مقرر ہیں انھیں برتنے دیجئے، آپ لوگ اگر دیکھنا پسند نہ کریں تو چلے جائیے، مگر مجھے تو یہاں زندگی بسر کرنا ہے اور ان کے کہنے پر چلنا پڑے گا۔

یہ سنکر اکثر وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے اور سردار نے چور کو ایک بنچ سے باندھ کر اس کے کپڑے اُتارے اور دو مضبوط آدمیوں نے دونوں طرف سے بانس کی مضبوط چھڑیاں پنڈلیوں سے لیکر شانے تک اتنی زور زور سے مارنا شروع کیں کہ کھال اُدھڑ گئی اور خون کے فوارے بہنے لگے، اس سزا کو چور بغیر کسی فریاد کے خاموشی سے برداشت کرتا رہا یہانتک کہ وہ بیہوش ہو گیا اور اس طرح یہ دردناک سین ختم ہوا۔

جھوٹ کا انسداد

انصاف و قانون کی دنیا میں، ہمیشہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جھوٹ بولنے والے کا جھوٹ کسی نہ کسی طرح معلوم ہو جائے، چنانچہ چین میں کسی وقت یہ دستور تھا کہ جن لوگوں پر جرم کا شبہ ہوتا تھا ان کو چاول چبانے کے لئے دئے جاتے تھے اور جس وقت وہ چاول چباتے تھے ان سے سوالات کئے جاتے تھے۔

اس کے بعد ان سے کہا جاتا تھا کہ چاول تھوک دو، اور جس کے چاول خشک نکلتے تھے اس کو جرم سمجھا جاتا تھا۔

ہندوستان میں خیال کیا جاتا تھا کہ اگر تفتیش حال کے وقت کوئی مشتبہ شخص اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو حرکت دے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

ایک ہندو راجا کا قصہ مشہور ہے کہ وہ جھوٹ پکڑنے کی یہ ترکیب کرتا تھا کہ تمام مشتبہ آدمیوں کو گرفتار کر کے ایک کمرے میں دیوار کی طرف منہ کر کے برابر برابر کھڑا کر دیتا تھا اور ان سے کہا جاتا تھا کہ پاس کے کمرے میں ایک مقدس گدھا ہے اور اگر مجرم اس کی دُم کھینچتا ہے تو وہ فوراً بولنے لگتا ہے اس کے بعد ہر شخص سے کہا جاتا تھا کہ وہ کمرے میں جا کر گدھے کی دُم کھینچے اور پھر اپنے ہاتھ پیٹھ کی طرف کر کے جہاں کھڑا تھا وہیں آکر کھڑا ہو جائے اس ترکیب سے پتہ چل جاتا تھا کہ مُجرم کون ہے، کیونکہ گدھے کی دُم میں کاجل لگا ہوتا تھا اور مُجرم چونکہ ڈر کے مارے اسے نہ چھوتا تھا اس لئے اس کا ہاتھ صاف رہتا تھا۔

لڑائی سے پہلے پروفیسر ولیم مارسٹن (ہارورڈ یونیورسٹی) نے تجربات سے ثابت کیا کہ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو ایک خاص قسم کا دباؤ قلب کے شریانوں میں پیدا ہوتا ہے اور سانس میں بھی ہلکی سی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں لیونارڈ کیلر نے ایک آلہ جھوٹ پکڑنے کا ایجاد کیا جس کا نام Keeler Polygraph تھا، جو جھوٹ بولتے وقت خون کے دباؤ، سانس کی حالت اور دوسرے نفسیاتی تغیرات کو فوراً بتا دیتا ہے۔

جس شخص سے سوال کیا جاتا ہے اس کی نگاہ سے یہ آلہ غائب ہوتا ہے اور ہر آدھ منٹ کے بعد مشتبہ شخص سے سوال کیا جاتا ہے جس کا جواب اسے ہاں یا نہیں میں دینا پڑتا ہے اور اسی وقت یہ آلہ تمام دموی و نفسیاتی تغیرات کو ریکارڈ کر لیتا ہے۔

یہ آلہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ اس کا نام سنتے ہی بہت سے مُجرم اقبال جُرم کر لیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا جھوٹ چھپ نہیں سکتا۔

دنیا کا قدیم ترین معاہدہ وہ ہے جو ۱۳۰۰ برس قبل مسیح رامسیس ثانی (فرعون مصر) اور کیتھار سار، ہٹی (Hittite) قوم کے بادشاہ کے درمیان ہوا تھا۔ یہ معاہدہ ایک نقرئی تختی پر نقش کیا گیا تھا اور اس کے شرائط یہ تھے کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کریں گے اور اگر کوئی اور حکومت ان میں سے کسی پر حملہ کرے گی تو دوسرا اپنے حلیف کی مدد کرے گا۔

موجودہ معاہدوں میں بھی یہی شرط ہوتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اس قدیم ترین معاہدہ کی حرف بہ حرف پابندی کی گئی اور اب جدید معاہدے اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

البانیا کی ایک عجیب رسم البانیا کی کوہستانی قوموں میں یہ رسم پائی جاتی ہے کہ جب قبایلی جنگ میں کسی خاندان کا آخری مرد قتل ہو جاتا ہے تو اس خاندان کی سب سے بڑی لڑکی اپنے شوہر کو چھوڑ کر مردانہ لباس پہن لیتی ہے اور خاندان کی سردار شمار کی جاتی ہے۔

ایک عجیب کتاب ولایت میں قاعدہ ہے کہ ہر گھر میں ایک کتاب ہوتی ہے جس میں ملاقاتی اپنے دستخط کر دیتے ہیں اور اس قسم کی سب سے بڑی کتاب غالباً وہ ہے جو کنٹکی کے ایک اصطبل میں پائی جاتی ہے۔ یہ اصطبل ایک مشہور گھوڑے (مین آف وار) کا ہے، جسکے دیکھنے کے لئے اس وقت تک ۲۰ لاکھ آدمی آچکے ہیں۔

"نگار" کے پُرانے پرچے

سنہ ۲۶ء جنوری = ۱۲/ر — سنہ ۳۰ء مئی عہ/ر — سنہ ۳۱ء جولائی، اگست فی پرچہ ۸/ر — اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸/ر سنہ ۳۲ء فروری، مارچ فی پرچہ ۱۲/ر — مئی، جون، جولائی فی پرچہ ۸/ر، ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸ — سنہ ۳۴ء فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر فی پرچہ عہ/ر — سنہ ۳۶ء دسمبر عہ/ر — سنہ ۳۷ء فروری تا اگست فی پرچہ ۸/ر اکتوبر عہ/ر — سنہ ۳۸ء فروری، اپریل = ۱۲/ر فی پرچہ - مئی تا دسمبر ۸/ر فی پرچہ — سنہ ۳۹ء فروری تا جولائی فی پرچہ ۸/ر - اکتوبر، نومبر فی پرچہ ۱۲/ر — سنہ ۴۰ء فروری تا دسمبر (جون، جولائی، اگست نہیں ہے) فی پرچہ ۸/ر سنہ ۴۱ء مارچ تا دسمبر (ستمبر نہیں ہے) = للعہ/ر — سنہ ۴۲ء مارچ تا مئی فی پرچہ ۸/ر - اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر ۸/ر — سنہ ۴۳ء مئی = ۱۲/ر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲/ر — سنہ ۴۴ء مئی تا دسمبر مسلسل ۱۲/ر فی پرچہ — سنہ ۴۵ء اپریل = ۸/ر - مئی = عہ/ر - جون، جولائی = ۱۲/ر فی پرچہ - اگست تا دسمبر ۸/ر فی پرچہ — سنہ ۴۶ء اپریل تا اگست فی پرچہ ۸/ر - ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲/ر - (مکمل فایل سنہ ۴۶ء = عہ/ر)

منیجر نگار لکھنؤ

گردِ منزل

ابر و باد کی زد پر کتنے آفتاب آئے کتنے ماہتابوں سے جھانکتے رہے سائے!
بربطوں کے تاروں نے کتنے گیت برسائے ہر سیاہ بادل نے کتنے جام کھنکائے!
مستی و جوانی نے کتنے قہقہے ڈھائے توبہ توڑنے آئے ابر کسقدر کالے!
پھول کتنے مسکرائے، دیکھ کس قدر لائے ٹوٹتے رہے کانٹے، پھوٹتے رہے چھالے!
دعوتِ چمن دی ہے کیسے کیسے پھولوں نے میرا نام پوچھا ہے آہ کن رسولوں نے!
ہر نفس کو نغموں میں تولتے رہے بادل مستیاں ہواؤں میں گھولتے رہے بادل!
کتنی نم ہوا ؤں نے بارہا کہا مجھ سے اُٹھ! کہ اِن گھٹاؤں کو دشمنی نہیں تجھ سے!!
رنگ و بو کا ہنگامہ سوگوار ہے تیرا اب بھی اُن نگاہوں کو انتظار ہے تیرا!!
حسرتیں بھی اک تہمت، آرزو بھی اک الزام میری گفتگو رسوا، میری خامشی بدنام!!
یاد کر وہ دن جس دن نم فشاں تھی چشمِ ناز ہر نگاہ اک "نالہ"، ہر سکوت اک "آواز"!
نیچی نیچی آنکھوں میں اک غمِ فسانہ ساز بہکی بہکی نظروں میں ایک شوخیٔ غماز!
بھیگی بھیگی پلکوں پر سُرخ سُرخ سا آنچل پھوٹتے ہوئے آنسو، پھیلتا ہوا کاجل!
کچھ خیال بھٹکا سا، کچھ نگاہ بیگانہ، ایک رنگ کا آنا، ایک رنگ کا جانا!!
وہ جُھکی جُھکی نظریں، وہ رُکی رُکی آواز ناتمام سا اِک گیت، ٹوٹتا ہوا اک ساز!!
تو نے خود مرا دامن کتنی بار کھینچا ہے، میں نے ہر جراحت کو قہقہے سے سینچا ہے!
میں ابھی نہیں بھولا تیرے جام، تیرے ساز! ایک بار پھر دے لوں دور سے تجھے آواز!

کھو گئیں مری صبحیں میری گردِ منزل میں،
ایک رات پھر ہوتی کاش تیری محفل میں!!

پروفیسر شورؔ

غزل : لطفی رضوانی

کبھی خیال کبھی بنکے برق طور آئے
جب ان کو یاد کیا سامنے ضرور آئے

یہ کیا کہ صبح کو نالے ہیں شام کو آہیں
کبھی تو صبر تجھے قلب ناصبور آئے

نگاہِ شوق نہ ہونی تھی مطمئن نہ ہوئی
اگرچہ راہِ طلب میں ہزار طور آئے

عجیب حال ہے کچھ تم پہ مٹنے والوں کا
کہ جتنا سوز بڑھے اتنا منہ پہ نور آئے

نظر کسی کی ندامت سے کیا جھکی لطفی
کہ یاد مجھ کو خود اپنے ہی سب قصور آئے

غزل : سلیمان آریب

اے سروِ رواں اے جانِ جہاں آہستہ گزر آہستہ گزر
جی بھر کے میں تجھ کو دیکھ تو لوں بس اتنا ٹھہر بس اتنا ٹھہر

کچھ لوگ ابھی تک ایسے ہیں جو تابِ نظارہ رکھتے ہیں!
اے حسنِ دل آرا اور نکھر اے کاکلِ پُرخم اور سنور

وہ ماہ نہیں خورشید نہیں کہنے کو اک انساں ہے پھر بھی!
تاریک نظر آتا ہے جہاں ہٹتی ہے جب اس کے رُخ سے نظر

پہلے تو یہ اپنا حال نہ تھا بے چین نہ تھے بیتاب نہ تھے۔!
کیا عشق میں یوں ہی ہوتا ہے اک آگ سی ہے دل تا بہ جگر؟

یہ کانٹے کیا یہ چھالے کیا خود پھول کھلیں گے راہوں میں
اے اہلِ طلب ہے شرطِ سفر اُٹھو تو سہی باندھو تو کمر

ادیب سہارنپوری:

عتاب و جور کے مارے بہت ملیں گے مگر
ہمیں تباہ کیا مسکرانے والوں نے

بُھلا سکے نہ ہم ان کو اگرچہ سنتے ہیں،
بھلا دیا ہے خدا کو بھلانے والوں نے،

سکوں تو لے ہی گئے تھے وہ چھین کر لیکن
تڑپنے بھی نہ دیا دل بڑھانے والوں نے

قفس میں رہ کے بھی ہم تو اُنھیں نہ بھول سکے
ہمیں بھی یاد کیا آشیانے والوں نے؟

علاجِ درد سے کچھ اور درد بڑھ ہی گیا
اُنھیں کا ذکر کیا آنے جانے والوں نے

قمر بھساولی:

یہ تصورات کی محفلیں یہ تخیلات کے مشغلے،
کبھی آگئے تیرے پاس ہم کبھی اور دور نکل گئے

وہ اُمیدِ حاصلِ زیست ہے جو ہلاکِ عذرِ دوست ہے
وہی پھول جانِ بہار ہے جو نسیمِ صبح سے جل گئے

دیکھ کے کس سے سنبھلا جائے
دیکھ رہا ہوں تجھ کو سنبھل کے

کلام حرمت الاکرام:

مقام ایسا بھی اک آتا ہے راہ زندگانی میں
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

کبھی اک آگ ایسی بھی بھڑک اُٹھتی ہے سینے میں
کہ ہر کیفیتِ دل کو جلن کہنا ہی پڑتا ہے،

زمانہ لاکھ ہو برہم مخالف لاکھ ہو دنیا
مگر افسانۂ دار و رسن کہنا ہی پڑتا ہے،

اس ترکِ محبت پر بھی کبھی، حرمت جو وہ یاد آجاتے ہیں
اس وقت عجب کچھ ہوتا ہے جذبات کا عالم کیا کہیے

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے، ولایت تک اس کے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں۔ اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آبحیات کے تصور فرمائیے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی، اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا معجزہ نہیں ہے ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے، القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مُفت منگائیے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے، میری ۲۸ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔

پتہ:۔ حکیم ثابت علی پنج زبان، خوش کلام
(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ۔ یو۔ پی

مطبوعات موصولہ

روپ پروفیسر فراق گورکھپوری کی ۲۵۱ رباعیوں کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل مختلف رسایل میں شایع ہو چکی ہیں۔ رباعی بہت مشکل صنفِ سخن ہے، کیونکہ اس کا وزن بھی محدود، اور مصرعے بھی محدود۔ اور اس لئے شعراء اس وقت تک رباعیاں نہ کہتے تھے جب تک کافی مشق نہ ہو جائے۔ اس سے قبل رباعی صرف پند و نصائح یا معارف و حقایق کے لئے مخصوص تھی، یہاں تک کہ جو رباعیاں رندانہ رنگ کی ہوتی تھیں، تاویل کرکے ان کو بھی حقیقت کا رنگ دیدیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ تخصیص باقی نہیں ہے اور ہر ایک شاعر آزاد ہے کہ وہ رباعی میں جو چاہے بیان کرے، چنانچہ موجودہ شعراء میں متداول رنگ سے ہٹکر سب سے پہلے جوش نے رباعیاں لکھنا شروع کیں اور اب ان کے اتباع میں فراق نے بھی اس طرف توجہ کی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ جوش کے یہاں رندی و آزادی پائی جاتی ہے اور فراق کے یہاں رعنائی و برنائی۔ جوش کی رباعیوں کا حسن خیال و بیان کی بیباکی ہے اور فراق کی رباعیاں ہندی کا سنگھار اسی اور غالباً اسی لئے انھوں نے کہیں کہیں رباعی کے فارسی وزن سے ہٹ کر ہندی پنگل (عروض) کا اتباع کیا ہے جس کا مقصود الفاظ کو کھینچ تان کر موسیقی کی تال میں لے آنا ہے۔

کتابت و طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ بُرا نہیں ہے۔ قیمت ۸ہ ہے جو ۲۰۰ صفحات کی کتابت کے لئے یقیناً زاید ہے۔ ملنے کا پتہ: سنگم پبلشنگ ہاؤس۔ بنیک روڈ۔ الہ آباد۔

اسلام اور سود ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ کی تصنیف ہے۔ یہ دوسرا اڈیشن ہے اور نظرثانی کے بعد اس کو زیادہ قریب الفہم بنایا گیا ہے۔ جس حد تک اصطلاحات کے ترجمہ کا تعلق ہے، اس کے مشکلات البتہ بدستور قایم ہیں، ضرورت تھی کہ ہر اصطلاح کی تشریح بھی سہل الفاظ میں کر دیجاتی اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی اصطلاح بھی درج کر دیجاتی تاکہ انگریزی داں طبقہ اور عوام بھی اس کو سمجھ سکتے۔ پہلے اڈیشن پر ہم اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ کتاب بہر نوع بہت مفید ہے اور سود کے متعلق اسلام کا نظریہ سمجھنے میں اس کا مطالعہ استفادہ سے خالی نہیں۔

ضخامت ۲۸۶ صفحات، کاغذ چکنا، طباعت و کتابت پسندیدہ، قیمت ۸ر، ملنے کا پتہ:۔
نفیس اکاڈیمی، عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

سہیل کی سرگزشت عرصہ ہوا پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ سہیل کے نام سے جاری ہوا تھا جو زیادہ نہ چل سکا۔ لیکن اس تھوڑی سی مدت میں رشید صاحب نے جو کچھ سہیل میں لکھا، وہ بھی کم دلچسپ نہ تھا، چنانچہ اب اسی رسالہ کے مختلف مضامین اس نام سے شایع کئے گئے ہیں جن میں زیادہ تر وقتی و مقامی مدیرانہ نوٹ ہیں۔ ایک طویل مضمون پیام اقبال کے عنوان سے بھی ہے جو بڑے کام کی چیز ہے۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات طباعت و کتابت وغیرہ بہت صاف، قیمت ہے۔ ملنے کا پتہ: نفیس اکاڈیمی حیدر آباد دکن۔

عشق جہانگیر خواجہ محمد شفیع صاحب، دہلوی کی تصنیف ہے جس میں جہانگیر کے ایک فرضی افسانۂ محبت کو رنگین عبارت میں پیش کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کو دلی کی زبان پر خاص عبور حاصل ہے اور اگر ہم اسکی تکلف و تصنع کو نظر انداز کردیں جو محض زباندانی کے اظہار کے لئے برتا گیا ہے، تو کتاب طرز تحریر کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہے۔

خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ اس ناول میں انھوں نے فرانس کے مشہور ناول نگار ڈوما کا تتبع کیا ہے، لیکن ہماری رائے میں یہ تتبع ناقص و ناکامیاب ہے، اور اس کوشش نے قصہ میں زیادہ اُلجھاؤ پیدا کردیا ہے۔

فسانہ چونکہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اس لئے تاریخی حیثیت سے اس کا مطالعہ بیکار ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ عہد مغلیہ کے معیشت و معاشرت پر اس سے کچھ روشنی پڑتی ہے۔ دلچسپی سے خالی نہیں ضخامت ۱۸۴ صفحات، طباعت وکتابت پسندیدہ۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ ادب، لال کنواں، دہلی۔

شرح میر درد یہ تصنیف بھی خواجہ محمد شفیع صاحب کی ہے، جس میں میر درد کے کلام کی شرح کی گئی ہے، خواجہ صاحب نے اس شرح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خواجہ میر درد کا کوئی شعر تصوف سے خالی نہ ہوتا تھا اور اس کوشش میں انھوں نے درد کے بہت سے اشعار کو بے لطف بنادیا ہے اول تو اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ درد کے کلام کی شرح کیجاتی اور اگر بر بنائے عقیدت خواجہ صاحب نے اس کو ضروری سمجھا تھا تو صرف ان اشعار کی درویشانہ شرح کر دیتے جو واقعی تصوف کے رنگ کے ہیں اور باقی کو صرف اہل ذوق کے لئے چھوڑ دیتے۔ کتاب کا نام بھی بے معنی ہے۔ "شرح درد" زیادہ موزوں نام ہوتا۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ ادب لال کنواں۔ دہلی۔

بیگمات اودھ کے خطوط مجموعہ ہے واجد علی شاہ کی بعض بیگموں کے خطوط کا جو انھوں نے جانعالم کے نام مٹیا برج بھیجے تھے۔ ان خطوط سے اس وقت کے تاریخی حالات پر تو کوئی

روشنی نہیں پڑتی، لیکن اس وقت کا طرزِ تحریر ضرور سامنے آجاتا ہے جو اپنی جگہ کافی دلچسپ ہے۔

یہ مجموعہ انتظام اللہ صاحب شہابی نے مختلف ذرایع سے فراہم کرکے مرتب کیا ہے۔ اگر ان خطوط کے ساتھ مختصراً بیگموں کے حالات بھی درج ہوتے تو یہ مجموعہ زیادہ مفید و دلکش ہو جاتا۔ ضخامت ۱۴۸ اصفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ ادب اُردو بازار۔ دہلی۔

ڈھونگ ناول ہے جناب شوکت تھانوی کا جس میں انھوں نے ایک افسانہ محبت اپنے مخصوص انداز میں قلمبند کیا ہے۔ جناب شوکت نے زیادہ تر مختصر افسانے لکھے ہیں اور مزاحیہ رنگ انھیں میں زیادہ کھلتا ہے، لیکن ناول اور وہ بھی "رومانِ محبت" اس سے ہٹ کر بالکل مختلف انداز بیان چاہتا ہے، جو شوکت صاحب کا رنگ نہیں۔ بہرحال ناول دلچسپ ہے۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپیہ آنے۔ ملنے کا پتہ: ہندوستانی پبلشرز دہلی۔

زیدی کا حشر مجنوں گورکھپوری کا سب سے پہلا افسانہ ہے جو سب سے پہلے نگار میں شایع ہوا تھا (۱۹۲۵ء) اور جو ان کی شہرت افسانہ نگاری کا سنگ بنیاد ہے، یہ فسانہ مجنوں کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے، جب ان کا دل تازہ چوٹ کھایا ہوا تھا اور ان کی محبت ناکام کا زخم ابھی ناسور نہ بنا تھا۔ اس لئے اس میں ہم کو بہت سی وہ باتیں اپنے رومانی رنگ میں نظر آتی ہیں، جو بعد کو اُن کے افسانوں میں فلسفہ و نفسیات بنکر رہ گئیں۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ: سی پی اُردو اکاڈمی ناگپور۔

مریم مجدلانی ترجمہ ہے جناب مجنوں گورکھپوری کے قلم سے مارس مترلنک کی ایک مشہور تمثیل کا جو سب سے پہلے رسالۂ ایوان گورکھپور میں شایع ہوا تھا (۱۹۳۲ء)

مترلنک، بلجیم کا مشہور تمثیل نگار تھا جس کو اس کی بعض خصوصیات ادب پر نوبیل پرائز بھی ملا۔ مترلنک پہلا شخص ہے جس نے تمثیل نگاری میں "وجدانیات" کو شامل کیا اور حرکات سے زیادہ بلیغ و موثر ثابت کر دکھایا۔ مریم مجدلانی اس خصوصیت کے لحاظ سے مترلنک کا شاہکار ہے، جس کا ترجمہ کرنا بہت مشکل تھا۔

واقعہ عہد مسیح سے تعلق رکھتا ہے، جب لوگ جوق در جوق اُن کے معجزے دیکھ دیکھ کر ان پر ایمان لا رہے تھے۔ مریم مجدلانی ایک بازاری قسم کی عورت تھی جو مسیح کے مواعظ سے متاثر ہوکر اپنے معاصی سے تائب ہوئی اور بلندی اخلاق کی اس حد تک پہونچ گئی کہ اس نے مسیح کی قربانی تو گوارا کرلی، لیکن اپنے اخلاق کی قربانی گوارا نہ کی۔

اس کتاب کا ترجمہ آسان نہ تھا، لیکن جناب مجنوں اس میں بہت کامیاب ہوئے ہیں اور مترلنک کے انداز بیان کی ان تمام خصوصیات کو ترجمہ میں قایم رکھا ہے جنھوں نے اس تمثیل کو مترلنک کا شاہکار بنایا۔ ضخامت ۱۰۷ اصفحات قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ: ایوان اشاعت گورکھپور۔

تصریحات

مجموعہ ہے جناب محمد مظہر الدین صدیقی بی۔ اے کے بعض مذہبی و ادبی مقالات کا۔ جو مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کو جسے مکتبۂ نشاۃ ثانیہ چنچل گوڑہ حیدرآباد نے شایع کیا ہے۔ مقالات سے پتہ چلتا ہے کہ صدیقی صاحب بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ اور ان کا مطالعہ افادہ و استفادہ سے خالی نہیں۔۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ۸؍

خونی ہے ہندوستان

مجموعہ ہے بھوپال کے ترقی پسند ادیبوں کے اُن افسانوں اور نظموں کا جو فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلہ میں لکھے گئے۔ اس کتاب کا مقصد ہندو مسلمانوں کا باہم اتحادِ عمل ہے اور سیاسی نقطۂ نظر سے ان کو ایک مرکز پر لے آنا۔ چونکہ بلند مقصد کو سامنے رکھ کر افسانے اور نظمیں لکھی گئی ہیں، اس لئے اُصولاً انھیں بھی بلند ہونا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ موجودہ ہنگامہ و فساد کے زمانہ میں اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور عوام کو بھی ان کے مطالب سے آگاہ کیا جائے۔ اس مجموعہ کو جناب یکتا امروہوی نے مرتب کرکے ملک کی برمحل خدمت انجام دی ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: گہوارۂ ادب فیاض گنج بہادر گڑھ روڈ۔ دہلی۔

آخر شب

جناب کیفی اعظمی کی قومی، سیاسی و ادبی نظموں کا مجموعہ ہے۔ کیفی صاحب کا شمار ترقی پسند شاعروں کی صف اول میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی ذہانت و طباعی ان کے اکثر اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کا رنگ جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ طباعت و کتابت بغایت پسندیدہ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی۔

اسلامی معاشیات

تصنیف ہے مولوی سید مناظر احسن صاحب گیلانی کی، جس میں انھوں نے قرآن و حدیث کی مدد سے اسلام کے معاشی مسایل کو پیش کیا ہے۔ اسمیں شک نہیں انھوں نے بڑی محنت و کاوش سے یہ کتاب مرتب کی ہے جابجا اطناب بیجا اور غیر ضروری انشاپردازی سے اگر کام نہ لیا جاتا تو بہتر تھا۔ کیا اچھا ہوتا اگر اسکی جگہ وہ یا کوئی صاحب اور اسلامی سیاسیات پر روشنی ڈالتے جو اس سے زیادہ ضروری ہے۔ کتاب بڑے سایز کے ۴۵۰ صفحات کو محیط ہے اور نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے قیمت ۱۲؍ ہے اور ملنے کا پتہ: ادارۂ اشاعت اُردو عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

فلسفۂ کلام غالب

پروفیسر شوکت سبزواری کی تصنیف ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے۔ غالب پر اسوقت تک بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کتاب میں غالب کے فلسفۂ کلام پر بالکل نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ تصنیف اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل پہلی چیز ہے۔ پروفیسر سبزواری علوم مشرقیہ و مغربیہ دونوں کے فاضل ہیں، اسلئے ان کی تمام تحریروں میں بڑی جامعیت پائی جاتی ہے۔ کتابت و طباعت بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت مجلد ہے۔ ملنے کا پتہ: قومی کتب خانہ بریلی۔

کشمکش

مجموعہ ہے محترمہ شفیق بانو کے سولہ افسانوں کا۔ شفیق بانو افسانہ نگار کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتی ہیں اور ان کو یہ شہرت بے وجہ حاصل نہیں ہوئی۔ ان کے افسانوں میں علاوہ سلاست بیان، تجزیہ کردار اور پلاٹ کی خوبی کے جذباتی روح بھی پنہاں ہوتی ہے وہ جو کچھ لکھتی ہیں دُکھے ہوئے دل سے لکھتی ہیں اس لئے دوسروں کا بھی دل دُکھا دیتی ہیں، طباعت و کتابت پاکیزہ۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ: قومی کتب خانہ۔ بریلی

"زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے"

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں

چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی۔ تیل، عطر، عرق کیوڑہ وگلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ تیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام
"مشکی قوام ہوڑہ"

ٹیلی فون
"ہوڑہ ۸۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ۱۴۱ ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ

فاسد مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے

خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

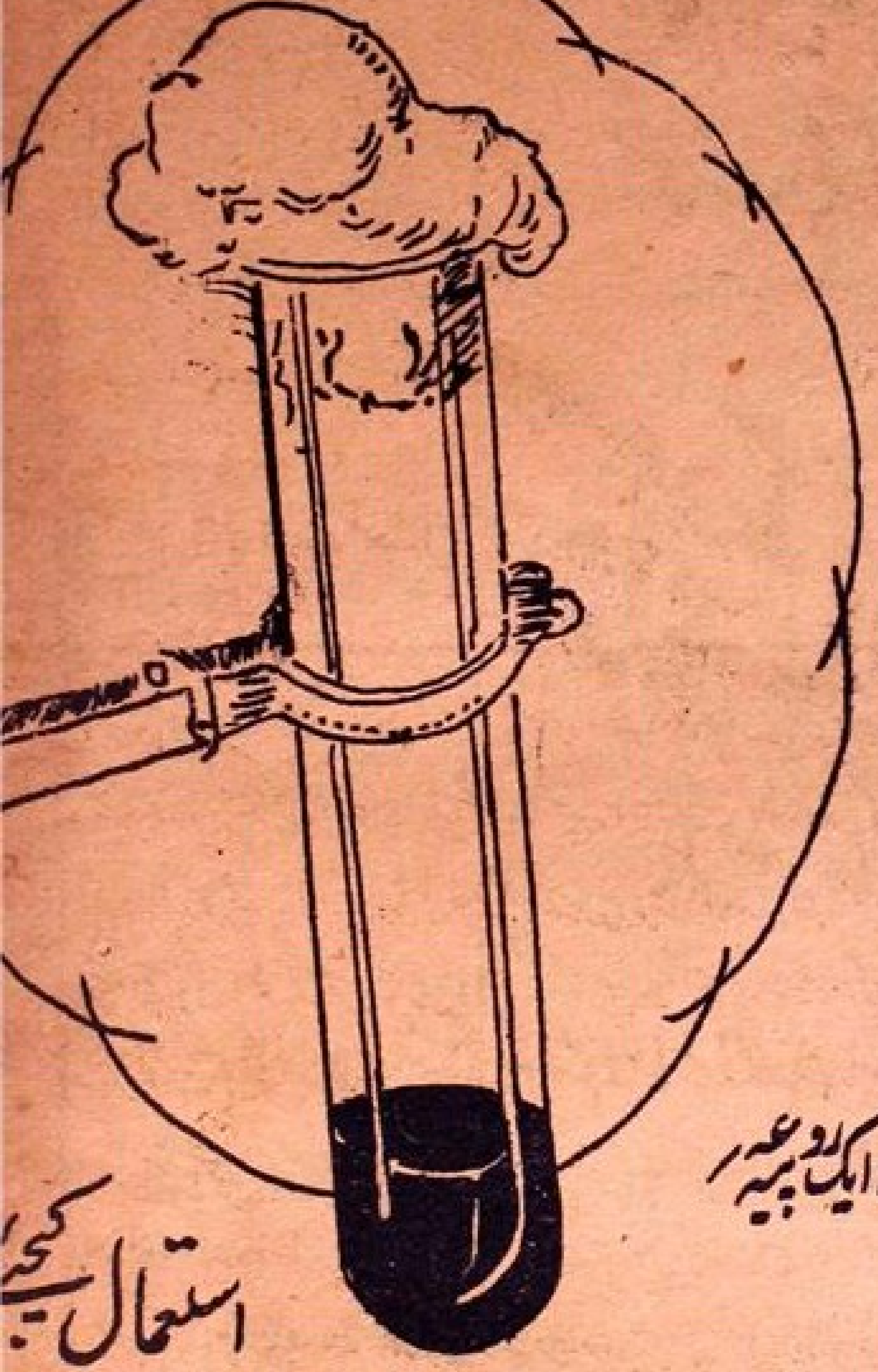

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر پیٹنکوفر پروفیسر دیانا یونی ورسٹی نے فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا وہ کلاس کو پڑھا رہے تھے، اُن کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے، جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا، مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ بھی نہ ہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا! صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور

یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے صافی اسی اصول کے پیش نظر تیار کی گئی ہے یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوتِ مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ/

استعمال کیجیے

صافی

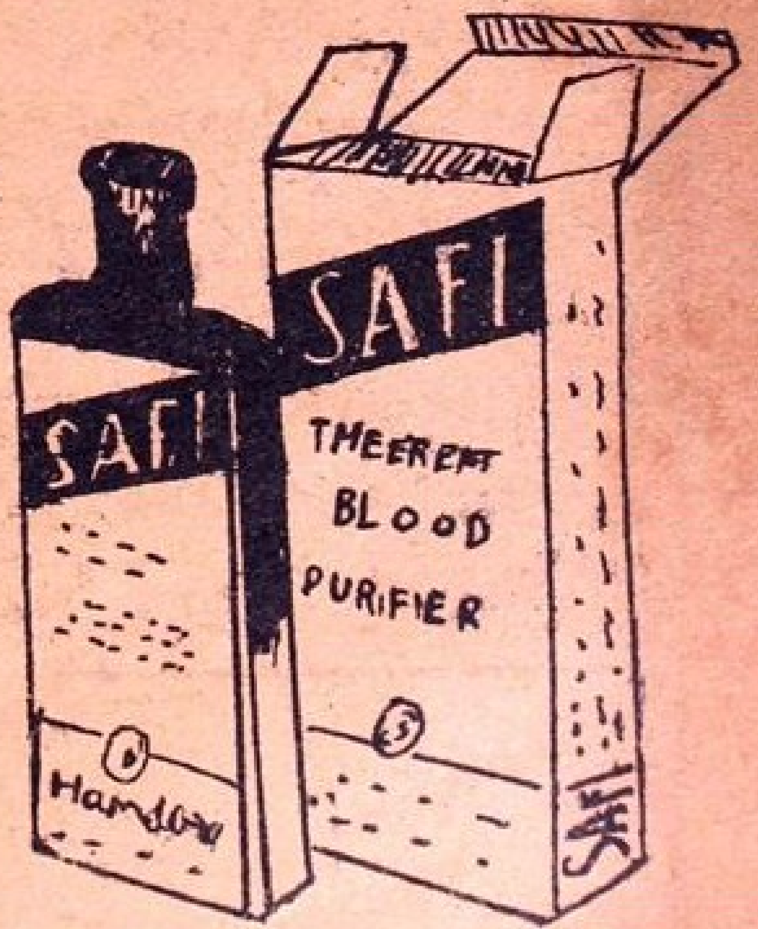

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

جوبلی نمبر ہر شخص کے نام ذریعہ رجسٹری بھیجا جائیگا اور وی پی میں رجسٹری کے مصارف شامل ہونگے اسلئے اگر آپ چندہ پیشگی بھیجیں تو چھ روپیہ آٹھ آنہ روانہ فرمائیں۔

"نگار" کا جوبلی نمبر

پاکستان نمبر ہوگا

اگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو آپ کے سکوت کو رضامندی سمجھ کر وی، پی بھیجا جائے گا

۱- لیکن اس میں نہ حصول پاکستان کی تاریخ ہوگی، نہ مسلم لیگ کے جدوجہد کی داستان، کیونکہ اس سے ہر شخص واقف ہے۔ بلکہ پاکستان اور ہندوستان کی تمام مسلم آبادی کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا جائے گا" تاکہ مسلمانوں کی یہ جدید آزاد حکومت اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور ان کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - گویا بہ لحاظ موضوع یہ

تمدن اسلامی نمبر بھی ہوگا

۲- اس نمبر کی ضخامت ۲۵۰ صفحات سے زیادہ ہوگی اور اسکی تیاری میں ہم کو تین ہزار روپیہ زاید صرف کرنا پڑیں گے اس لئے خریداران نگار سے امید ہے کہ وہ اس مخصوص نمبر کے لئے جو کتابی صورت میں ۴۰۰ صفحات کو محیط ہوتا۔ سوا روپیہ دینا گوارا فرمائیں گے اور یہ سمجھ کر کہ ایسے قیمتی نمبر کو آپ کبھی ہاتھ سے دینا پسند نہ کریں گے۔ ہم ان حضرات کے نام جن کا چندہ دسمبر ۴۷ء یا جنوری ۴۸ء میں ختم ہوتا ہے، جنوری ۴۸ء کا نگار (پاکستان نمبر) ذریعہ وی، پی چھ روپیہ آٹھ آنے میں (معہ مصارف رجسٹری) روانہ کرینگے اور جن کا چندہ ختم نہیں ہوتا ان کے نام اس کا وی، پی ڈیڑھ روپیہ میں (معہ مصارف رجسٹری) بھیجا جائے گا۔

تمام مقالات اڈیٹر نگار کے قلم کے ہونگے

مختصر فہرست ملاحظہ ہو:- تاریخ سندھ کے اہم واقعات ۳۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۵ اگست ۴۷ء تک — سندھ کی اولین مسلم حکومت۔ سندھ کے مسلم فرمانرواؤں کا حسن انتظام اور انکی رواداریاں - غزنوی عہد کی برکات - مسلمانوں کی سب سے پہلی جمہوری حکومت - ہندوستان کے مسلم بادشاہوں کی قابل ذکر خصوصیات - علوم اسلامی پر مورخانہ نظر - عجم کے کارنامے اسلام کے عہد زریں میں - حکومت اسلام اور سنسکرت - قدیم تمدن اسلام کی بلندی - اندلس کے آثار علمیہ - عہد عباسیہ کا دور زریں - فن رقص اور تاریخ اسلام - فنون لطیفہ اور اسلام - تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل - عہد اسلام میں کنیزوں کا اقتدار - یورپ کی موسیقی پر عربوں کا اثر - موسیقی عہد نبوی و خلفاء راشدین میں - عہد وسطی کے فنون لطیفہ اور اسلام - خواتین عرب کی فیشن طرازیاں وغیرہ وغیرہ -

اس نمبر میں حضرت نیاز کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہوگا اور مختصر سوانح حیات بھی' اگر ضخامت بڑھانا ناممکن نہ ہوا۔

جو حضرات ڈیڑھ روپیہ (معہ مصارف رجسٹری) زاید دینا پسند نہ فرمائیں وہ ازراہ کرم مطلع فرمادیں تاکہ انکے نام جوبلی نمبر نہ بھیجا جائے - غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت معہ محصول سوا تین روپیہ ہوگی -

منیجر نگار - لکھنؤ

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

"من ویزداں"

جو اپنی انشاءِ عالیہ اور پُرزور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اسے صحیح معنے میں

انجیل انسانیت

کہہ سکتے ہیں۔

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر بسیط تاریخی، علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب ادبی حیثیت سے بھی اڈیٹر نگار کا وہ کارنامہ ہے جسے ادب و انشاء میں "حرف آخر" کہا جا سکتا ہے۔

حجم ۶۰۲ صفحات - کاغذ سفید و دبیز، جلد خوشنما - قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے - منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اس کے مداح موجود ہیں۔ کمزوری دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں۔ اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں، اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آبجیات کے تصور فرمائیے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی، اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا نئی نہیں ہے ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان ہو گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے، القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے، میری ۲۸ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔

پتہ:- حکیم ثابت علی نیچ زبان، خوش کلام

(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)

محمود نگر ۳ لکھنؤ - یو پی

نگار

مدیر خصوصی : نیاز فتحپوری

جلد ۵۲	فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۴۷ء	شمارہ ۴

ملاحظات ---------- ۳

ہندسوں کی ایجاد و ترقی پر ایک تحقیقی تبصرہ --- ح - ا --- ۵

مجنوں گورکھپوری --- ایک مطالعہ ---- خلش برنی -- ۱۶

انشاء کی حیات - تصانیف اور کلام پر ایک نظر -- رحمت نبی خاں ایم اے ۲۴

فارسی ادب پر ایک تاریخی نظر ---------- ۳۲

مکتوبات نیاز ---------- ۴۲

فارسی کے طنزیہ لطایف ---------- ۴۴

آریہ اقوام کی قدامت اور انکی نقل و حرکت --- ح - ا ---- ۴۹

باب المراسلۃ والمناظرہ ---------- ۵۷

خواب حسن (نظم) ---- پروفیسر شور ---- ۶۱

مطبوعات موصولہ ---------- ۶۲

ملاحظات

موجودہ دردناک حالات میں حکومت و پبلک کے فرایض

اس وقت زندگی کے تمام مشاغل، اور معیشت و سیاست کے جملہ مسایل سے زیادہ ضروری و اہم مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں امن و سکون قایم کرنے پر غور کیا جائے اور خالص عملی حیثیت سے ان تدابیر پر غور کیا جائے جو ملک سے اس لعنت کو دور کر سکتی ہیں۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ ہنگامہ محض جذبات کی بنا پر شروع ہوا اور جذبات ہی کے اشتعال کی وجہ سے ابتک ہنگامہ جاری ہے اس لئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے اس کو فرو کیا جائے ------ اور اس کے لئے وہ تدبیر غالباً سب سے بہتر ہے جو مولانا آزاد کے پیش نظر ہے۔ مولانا آزاد کی تحریک کا خلاصہ یہ ہے کہ ملک کے تمام ان علاقوں میں جہاں بے چینی و بے اعتمادی پائی جاتی ہے، بلا قید ملت و مذہب ہر طبقہ، ہر جماعت اور ہر مذہب کے ذی اثر اور پُر خلوص حضرات متحدہ طور پر دورہ کریں، اور لوگوں کو سمجھائیں کہ قتل و غارت کا علاج قتل و غارت نہیں ہوا کرتا۔ کیونکہ جو تباہیاں ہو چکی ہیں وہی کیا کم ہیں کہ ان میں آیندہ اور اضافہ کیا جائے۔ جو جانیں تلف ہو چکیں وہ اب واپس نہیں آسکتیں، اس لئے اب ہمارا فرض صرف یہ ہونا چاہئے کہ جو باقی ہیں وہی محفوظ رکھی جائیں اور ماضی کی غلطیوں کو دُہرا کر مستقبل کو تباہ و برباد ہونے سے بچالیں۔ اس سلسلہ میں حکومت و پبلک دونوں پر یکساں فرائض عاید ہوتے ہیں اور جب تک وہ دونوں اتحاد عمل سے کام نہ لیں، خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی اس وقت سب سے

زیادہ پیچیدگی جس چیز نے پیدا کردی ہے وہ لوگوں کا ترک وطن ہے اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ لوگ ہجرت ہی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ خود زیادہ نقصان اُٹھا چکے ہیں بلکہ دوسروں کے نقصان کا بھی باعث ہوئے ہیں۔ اس ذہنیت نے حکومتوں کو اس قدر پریشان کر دیا ہے کہ پناہ گزینوں کی نقل وحرکت اور قیام وطعام کے علاوہ وہ کسی اور بات کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتیں۔ اس لئے جیسا کہ مہاتما گاندھی نے بار بار کہا ہے کہ سب سے پہلے ہجرت و ترک وطن کا خیال لوگوں کے دلوں سے محو کرنا ہے اور اس کی بہتر صورت وہی ہے جو مولانا آزاد نے تجویز کی ہے۔ ہندوستان کے ہندوؤں کو چاہئے کہ پاکستان جاکر تارک وطن مسلمانوں کو واپس لائیں اور پاکستان کے مسلمانوں کو چاہئے کہ ہندوستان آکر روٹھے ہوئے ہندوؤں کو ان کے گھر لوٹا لے جائیں۔ غلطی کا بہترین علاج غلطی کا اعتراف اور اس پر اظہار ندامت ہی ہے اور اگر اسی اسپرٹ کے ساتھ ہندو مسلمان وفود نے کام کیا تو ناکامی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس وقت تک کہ اس میں کامیابی نہ ہو، حفظ امن کے لئے حکومت و پبلک دونوں کو تقسیم عمل کے اصول پر کچھ کام بانٹ لینا چاہئے، حکومتوں کے فرائض یہ ہیں کہ:-

۱- آبادی سے کافی فاصلہ پر پناہ گزینوں کے قیام کا انتظام کرے، اور ان کو آبادی میں آنے جانے کی عام اجازت نہ دے۔

۲- پناہ گزینوں کو پناہ دینے سے قبل پوری طرح اطمینان کرلے کہ ان کے پاس اسلحہ تو نہیں ہیں۔

۳- پناہ گزینوں کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کرکے ہر جماعت سے چند سمجھدار آدمی چُن کر ان کو حفظ امن کا ذمہ دار بنائے اور انکو یقین دلادے کہ اگر ان کی وجہ سے امن میں خلل پڑا تو پھر حکومت اپنی میزبانی کی ذمہ داری سے آزاد ہو جائے گی۔

۴- پناہ گزینوں کی ہر جماعت کی نگرانی کے لئے کافی فوج اور پولیس کا انتظام کرے اور ان میں جو افراد اچھی شہری ہونے کا ثبوت دیں۔ انکے لئے ملازمت یا کاروبار کی صورتیں پیدا کرے — ہندوستان کے شہروں میں پبلک کے فرائض اس سلسلہ میں یہ ہیں:

۱- ہر ہر محلہ کے لوگوں کو جمع ہو کر پناہ گزینوں کی امداد کے لئے چندہ کرنا چاہئے اور ان کی تمام ضرورتوں کو اپنی ضرورت سمجھنا چاہئے۔

۲- اگر پناہ گزیں ہندو یا سکھ ہیں تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان کے پاس جائیں، انکے لئے تحایف لےجائیں، انکے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں اور اگر اُنکے مکان میں گنجایش ہے تو خود اپنے ساتھ انھیں ٹھہرائیں اور ہر طرح ان کے درد دکھ میں شریک ہوں۔

۳- گائے کی قربانی بالکل ترک کردیں اور ہندوؤں کی تمام تقریبات میں کھلے ہوئے دل اور محبت وخلوص سے شریک ہوں۔

۴- مسلمان علماء اور سربرآوردہ لیگی و نیشنل افراد کو چاہئے کہ ہفتہ میں کسی خاص دن شہر کے مختلف محلوں میں جلسہ کرکے مسلمانوں کو بتائیں کہ اسلام نے ہمیشہ مظلوم کی امداد کی ہے اور اس وقت ہندو یا سکھ پناہ گزینوں کی امداد کرنا انکا مذہبی فریضہ ہے، پھر اختتام جلسہ کے بعد پناہ گزینوں کے پاس بڑے بڑے جتھوں کی صورت میں جائیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رکھیں، یہاں تک کہ ان کا پورا اعتماد حاصل نہ ہو جائے۔

ہندو مسلمان ایک ہی سرزمین کے باشندے ہیں، ایک ہی ارض کے فرزند ہیں اور آج نہیں تو کل انھیں مل کر زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لئے اس سے زیادہ حماقت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم وقتی جذبات سے مشتعل ہو کر امن وسکون کو تباہ کردیں، جو مذہب، اخلاق اور انسانیت ہر لحاظ سے ہندو مسلمان دونوں کے نزدیک قابل نفرت ہے۔

ہندسوں کی ایجاد و ترقی پر ایک تحقیقی تبصرہ

(بہ سلسلۂ ماہ ستمبر ۴۶ء)

ہم نے اس روداد میں ہندوستانی تحریر اور اعداد کے رواج کے متعلق ابھی تک کوئی ذکر نہیں کیا ہے کیونکہ وہ بجائے خود ایک مستقل بحث چاہتا ہے۔ محققین فرنگ نے تقریباً متفقہ طور پر جو نظریئے اس وقت تک قایم کئے ہیں یہ ہیں :-

(۱) آریہ فرقے ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ پندرہ سو سال قبل مسیح کے ارد گرد داخل ہوئے۔

(۲) ہندوستان کی خروشتی اور براہمی کتابتیں عراقی کتابتوں سے ماخوذ ہیں۔

(۳) موجودہ اعدادِ شمار ہندو قوم کی ایجاد ہیں۔

نتائجِ مذکورہ سے متعلق ہمارے پیشِ نظر ایک ایسی کتاب ہے جو ہندو نقطۂ خیال پیش کرتی ہے۔ یہ کتاب دو صاحبان (ببھوتی بھوشن دت اور اودھیش نراین سنگھ) کی مشترکہ تصنیف ہے اور حال کی لکھی ہوئی ہے۔ اُس کا نام ہی Hindu Mathematics ہے۔ ۱۹۳۵ء کی مطبوعہ ہے اور کالجوں میں رائج ہوتا پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلے اس کتاب میں ہندو قوم کی اور ہندو کلچر کی قدامت کا اظہار کیا گیا ہے اور بالاجمال یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ قدامت ہی سے حروف و اعداد اُن کے خود ساختہ ہیں۔ قدامت کا دعویٰ الفاظِ ذیل میں کیا گیا ہے :-

"درحقیقت ہندو قوم اُس زمانہ کی (سنہ ۳۰۰۰ ق ـ م کے زمانہ سے مراد ہے) ہر قوم سے بہت ترقی یافتہ تھی۔"

اس دعوے کی تائید میں مندرجۂ ذیل اُمور بیان کئے گئے ہیں :-

"(۱) موہنجودارو کے آثار سنہ ۳۰۰۰ ق ـ م کے زمانہ کا حال اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ سندھ کی زمین کے باشندے ـ یعنی ہندو آراستہ و پیراستہ شہر اور اینٹوں کے مکانوں میں رہتے تھے اور سونا چاندی وغیرہ کئی قسم کی دھاتیں استعمال کرتے تھے اور اعلیٰ درجہ کی منظم زندگی بسر کرتے تھے۔"

(۲) ویدوں کی کتابیں جو سنہ ۳۰۰۰ ق ـ م یا غالباً اُس سے پہلے کی تصنیف ہیں اعلیٰ درجہ کی تہذیب سے روشناس کراتی ہیں۔

اِن دعاوی میں اگر لفظ ہندو سے کوئی قدیم ہندوستانی قوم مراد ہے تو موہنجودارو کے آثار کی بنا پر اس قدر تسلیم کرنا واجبات سے ہوگا کہ اُس مقام کے رہنے والے بہت ترقی یافتہ تھے ـ گو مصر و عراق کے مقابلہ میں اُن کو کوئی ترجیح نہ دی جاسکتی

اگر اس لفظ سے مراد اقوام آریہ ہیں تو تقریباً جملہ محققین کے نزدیک جن کی تحقیقات کا سلسلہ موہنجو دارو کے آثار کی برآمدگی کے قبل تک بھی مانا جائے اقوام مذکور کا ہندوستان میں داخلہ سنہ ۱۵۰۰ ق م سے آگے قرار نہیں پاتا۔ محققین قوم آریہ اور قوم ہندو کے مفہوم کے متعلق بھی امتیاز برتتے ہیں اور قوم ہندو سے وہ قوم مراد لیتے ہیں جو اقوام آریہ اور ہندوستان کی قدیم ترین مقامی قوموں کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوئی۔ خود لفظ ہندو فارسی لفظ ہے اور اس زمانہ کی ایجاد ہے جب ساسانیوں یا مسلمانوں کے عہد میں اہل ایران نے پنجاب پر قبضہ کیا۔ بہر حال اگر محققین مذکور کے اقوال اور Comparative History کے واقعات کو جیسا کہ روئداد میں بیان ہے تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز بھی کر دیا جائے اور اس نئے دعوے کو کہ "موہنجو دارو اقوام آریہ کی بستی تھی" اور وہاں کے آثار انھیں کے ہیں تو جدید تحقیقات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی   سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل آثار قدیم گورنمنٹ ہند نے جن کی خاص نگرانی اور اہتمام میں موہنجو دارو اور ہڑپا کا کام ہوا تھا ایک بسوط کتاب دو جلدوں میں مقامات مذکور کے آثار و حالات پر لکھی ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۳۱ء کی مطبوعہ ہے اور اس کا نام ہے

Mohenjodaro and the Indus civilization

اس میں لکھا ہے کہ:-

"(۱) تمدن سندھ کے زمانہ سے ہٹکر اب ہم اس کے مصنفوں کے سوال پر متوجہ ہوتے ہیں۔ بعض اہل قلم نے بعجلت یہ رائے قائم کرلی ہے کہ وہ ویدی ہندوستانی تھے اور ہندوستان پر آریائی تسلط کی انتہائی قدامت ثابت کرنے کے لئے انھوں نے ہندوستانی تمدن کو انتہائی ترقی یافتہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ ایسے نتائج کی تائید میں کوئی نسلی یا غیر نسلی شہادت ہنوز فراہم نہیں ہوئی ہے۔" (باب ۸، صفحہ ۱۰۷)

(۲) "ہندی آریوں نے سندھ اور زیریں سندھ کے علاقہ پر کبھی تسلط نہیں کیا۔" (صفحہ ۱۱۲)

(نوٹ: ہم نے موہنجو دارو کے محققین کے وہ اقوال نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جن میں انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس شہر کے لوگ کون تھے یا ہو سکتے تھے)

اقتباسات مذکور سے ناظرین اندازہ فرما سکتے ہیں کہ موہنجو دارو کی آبادی اور اس کی کلچر (تہذیب) کا اقوام آریہ یا ہندو قوم اور ویدوں سے کیا ربط و تعلق ہے۔ "ویدوں" کا لفظ دعوے میں بصیغہ جمع استعمال کیا گیا ہے اور ان کے زمانہ کو سنہ ۳۰۰۰ ق م سے منسوب کر کے ان کی کلچر کو موہنجو دارو کی کلچر سے متعلق کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ چار کتابیں ہیں جن میں قدیم ترین رگ وید ہے اور سب سے آخر کی اتھروید ہے جس کی تصنیف کا سلسلہ سنہ ۲۰۰ ق م تک جاری رہنا محققین بیان کرتے ہیں۔ رگوید کی نظموں کی تصنیف کا زمانہ وہ قرار دیا گیا ہے، جب آریہ اقوام پنجاب میں داخل ہو کر ابھی تک قابض ہو چکی ہیں یعنی سنہ ۱۳۰۰ ق م یا سنہ ۱۲۰۰ ق م سے سنہ ۹۰۰ ق م یا سنہ ۸۰۰ ق م تک۔ جمہور محققین کا

اس پر اتفاق ہے۔ بقیہ ویدوں کا زمانہ اس کے بعد کا ہے۔ تعیّن زمانہ قدیم لٹریچر کی اندرونی شہادت اور Comparative History کے واقعات کی بنا پر کی گئی ہے۔ خود رگوید کی نظمیں بھی ایک زمانہ کی لکھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اُن کا پھیلاؤ صدیوں پر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں لفظ 'ویدوں' کا بصیغۂ جمع استعمال اور اُن کی کسی ایک خاص زمانہ سے نسبت مغالطہ پیدا کرنے کا احتمال رکھتی ہے۔ بالفرض جمہور محققین کی رائے کو سردست پس پشت ڈال دیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ اَوِستا اور رگ وید کی زبان ایک ہوتے ہوئے اُن کا ہم عصر ہونا لازمی نہیں ہے تو ۲۰۰۰ ق۔م کے ویدوں کی کلچر اور موہنجوداڑو کی ۳۰۰۰ ق۔م کی کلچر کا موازنہ سر جان مارشل کی متذکرہ صدر کتاب کے مزید اقتباسات مندرجۂ ذیل سے کر لیا جائے:

۱۔ ہندی اور ویدی تمدنوں کے مقابلہ سے بلاشبہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے غیر متعلق تھے (صفحہ ۱۱۰)

۲۔ ہندی۔ آریائی سماج کی جو تصویر ویدوں میں ہے وہ ایک نیم شبانی اور نیم زرعی قوم کی ہے۔ جو ابھی تک دیہی حالت سے باہر نہیں نکلی ہے اور جسے نہ شہری زندگی کا علم ہے نہ زندگی کے پیچیدہ معاشی نظام کا ان کے مکانات زیادہ تر بانس کے بنے ہیں، اس کے برعکس ہمیں موہنجوداڑو اور ہڑپا میں گنجان آباد شہر ملتے ہیں جن میں اینٹوں کے پختہ وسیع مکانات ہیں اور جو کافی روشندانوں، حماموں اور کنوؤں سے مزین ہیں۔

۳۔ ویدی مذہب عموماً غیر اصنامی ہے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا میں صورتی مت ہر جگہ ظاہر ہے ویدی مندر میں عنصر تانیث کم جنس تذکیر کے تابع ہے اور ماتا دیوی اور شیو کیلئے (جو بعد کو ویدیں رُدر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے) کوئی جگہ نہیں پائی جاتی۔ سندھی تمدنوں میں ماتا دیوی اور شیو نمایاں ہیں اور عناصر اناث اگرچہ غالب نہیں ہیں تاہم ذکور کے دوش بدوش ہیں۔ آگ (اگنی) وید کے ممتاز دیوتاؤں میں ہے ہے اور خانگی آتشدان ہر مکان کا جزو خاص ہے۔ موہنجوداڑو کے گھروں میں آتشدان یکسر غائب ہے۔ ہندی آریا کیلئے لنگ پوجا مکروہ تھی۔ سندھیوں میں اس کے وجود کے شواہد بکثرت ہیں۔

۴۔ ہم اس کی توضیح کرنے سے بالکل قاصر ہیں کہ ہندی آریہ شہر سے گاؤں میں کیونکر پہونچ گئے یا کس طرح ایک بار پختہ بہترین مکانات بنانے کے بعد انھوں نے بانس کے ڈھانچوں پر قناعت کر لی، یا ایک مرتبہ سندھ پر قابض ہو کر وہ زیریں سندھ کو کس طرح بالکل بھول گئے۔ (صفحہ ۱۱۲)

علاوہ ازیں موہنجوداڑو کے ایک اور محقق ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب The Script of Mohenjodaro مطبوعہ ۱۹۳۴ء کے بھی ایک دو اقتباس ملاحظہ فرمائے جائیں:۔

"یہ قرین قیاس نہیں ہے کہ رسم الخط (زیر بحث) کے بانی آریہ تھے۔ غالب یہ ہے کہ وادیِ سندھ آریوں کی آمد سے پہلے دراوڑوں سے آباد تھی، نیز یہ کہ براہوی اسی انبوہ کی یادگار ہیں۔"

"اس لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اس رسم الخط کے سلسلہ میں ایک ایسی زبان سے بحث کر رہے ہیں جو کہ یقیناً یک لفظی ہے اور

نتیجتاً یہ کہ زبان مذکور نہ تو سنسکرت ہی ہے اور نہ سامی۔"

ان اقتباسات کے بعد قدامت کے مندرجۂ بالا دعاوی کو ہم ناظرین کی رائے کے حوالے کرتے ہیں۔ اسی قسم کے اور دعاوی بھی کتاب Hindu mathematics میں رگوید کے بعد کی تصنیف شدہ کتابوں سے متعلق کئے گئے ہیں مثلاً براہمنڑوں کی تصنیف کا زمانہ ۲۰۰۰۰ ق-م اور رامائین کی تصنیف کا زمانہ ۱۰۰۰۰ ق-م یا پانِنی بانیِ قواعدِ صرف و نحو کا زمانہ ۷۰۰۰ ق-م بنایا گیا ہے جس کو محققینِ فرنگ بوجوہ و دلائل تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ خود کتاب مذکور سے ایک فٹ نوٹ کی نقل پیش کی جاتی ہے جس سے مندرجۂ بالا تاریخوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ناظرین کر سکتے ہیں:-

We have given those dates that appear most plausible

لفظ plausible کا استعمال داد طلب ہے۔ کیونکہ اگر درج کی ہوئی تاریخیں صحیح بھی نہ ہوں تو لکھنے والوں پر کوئی الزام عاید نہیں ہو سکتا ورنہ لکھنے کو تو یہ تاریخیں لکھدی ہی گئی ہیں۔

ہمارے مضمون کی اغراض کے لئے قدامت کی بحث بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ تعیین زمانہ سے اہم نتائج متعلق ہو جاتے ہیں۔ آسانی کی غرض سے ذیل میں ایک نقشہ درج کیا جاتا ہے۔ جس سے آیندہ بیانات واضح تر ہو جانے کی امید ہے:-

نام کتاب	زمانہ مطابق مصنفین	زمانہ مطابق محققین فرنگ	کیفیت
۱- رگوید	۳۰۰۰۰ ق-م	۱۲۰۰ ق-م سے ۹۰۰-۸۰۰ ق-م تک	محققین فرنگ کے نزدیک رگ وید کا
۲- براہمنڑ	۲۰۰۰۰ ق-م	۸۰۰ ق-م سے ۵۰۰ ق-م تک	
۳- رامائین	۱۰۰۰۰ ق-م	۵۰۰ ق-م سے سن عیسوی کے شروع تک (یعنی اس کتاب کی تصنیف مسلسل جاری رہی ہے)	زمانۂ تدوین ۸۰۰ ق-م کے بعد کا ہے۔
۴- تصانیف پانِنی	۷۰۰۰ ق-م	پانچویں صدی قبل مسیح	

قومی تفوق کے اظہار کے لئے ہندوستان میں اہل تادیل کے درمیان دو نظرئے قایم کئے جانے کی کوشش کی جارہی ہے ایک قدامت اور دوسرا یہ کہ کسی وقت کہیں سے کوئی چیز حاصل نہیں کی گئی ہے۔ قدامت کے بھی دو پہلو قایم کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اقوام آریہ ہندوستان کی ہی پیداوار ہیں اور یہیں سے اطراف عالم میں پھیلی ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہندوستان میں جو قدیم آثار مہنجو دارو کے آثار کی طرح برآمد ہوئے ہیں وہ ہندی اقوام آریہ کے ہیں۔

--- مہنجو دارو کے آثار کے متعلق مہنجو دارو کے محققین کی تحقیقات کے کچھ نتیجے اوپر درج ہو چکے ہیں۔ قدامت سے متعلق دو اور بھی اقتباس سر جان مارشل کی کتاب مذکور سے ملاحظہ فرمائے جائیں کیونکہ یہ کتاب تازہ ترین ہے اور اس وقت تک کی تحقیقات کے کُل نتائج پر بطریق تبصرہ حادی ہے:

"ہم نے وہ تاریخیں پیش کی ہیں جو نہایت ہی معقول معلوم ہوتی ہیں۔"

(۱) "سندھی تہذیب ماقبل آریائی تھی و نیز سندھی زبان یا زبانیں بھی ماقبل آریائی ہیں۔" (صفحہ ۹۴)

(۲) ایک ہندوستانی صاحب قلم نے اس تہذیب میں اپنے اس نظریئے کا جواز تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ آریا ہندوستان ہی سے اُٹھے اور ابھی وادیِ سندھ دریا بُرد ہی تھی کہ وہ عہدِ آہن پر پہونچ چکے تھے۔ ایسے جذباتی نظریئے خود اپنی ہی تردید کرتے ہیں اور خاص توجہ طلب نہیں ہیں" (صفحہ ۱۰۷)

قدامت کی بحث سے آگے چل کر مصنفین H. M. نے رگوید اور اُس کی مابعد کی کتابوں میں تحریر اور اعداد کے حوالے پائے جانا ظاہر کیئے ہیں حوالجات اس قسم کے ہیں کہ فلاں کتاب میں لکھنے پڑھنے کا ذکر ہے یا رگوید میں ایسا ذکر آیا ہے کہ انعام میں دی ہوئی گایوں کے کانوں پر داغ کیا ہوا تھا۔ یا یہ کہ یجروید اور دیگر مابعد کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ کروڑ۔ سنکھ۔ پدم وغیرہ تک کے اعداد کے نام جانتے تھے۔ ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ کی تعیین کے لحاظ سے ناظرین اپنے طور پر نتیجے نکال سکتے ہیں کہ حوالجات مذکور کی کیا قدر و قیمت ہونا چاہیئے۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ حوالجات کے ذکر میں ابہام اور تاویل کا بھی بہت ہاتھ ہے مثلاً گائے کے کان پر داغ کو یا کعبتین کے دانوں کے نشانات کو اعداد کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے حالانکہ وہ ایسی علامات تھیں جیسی اہل چین نے نقطوں کی شکل میں ایجاد کی تھیں۔

ھنجو دارو کے آثار کو چھوڑ کر بعد کے زمانہ کے متعلق کتاب مذکور میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ قدیم ہند میں براہمی اور خروشتی اقسام کی جو کتابتیں جاری تھیں اُن کا سب سے پہلے شہنشاہ اشوک کے کتبوں پر لکھا جانا پایا جاتا ہے اور یہ کہ اس سے پہلے کے کوئی نمونے دستیاب نہیں ہوئے۔ اسی طرح یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ دونوں قسم کے چند اعداد بھی اول مرتبہ انھیں کتبوں میں پائے جاتے ہیں نیز یہ کہ خروشتی کتابت سامی کتابت سے ماخوذ ہے جس کی ایک خاص وجہ یہ ظاہر کی گئی ہے کہ وہ سیدھی طرف سے ہوتی تھی۔

براہمی کتابت کے متعلق کتاب مذکور کی بحث مصنفین کے الفاظ ہی میں درج ذیل کیجاتی ہے:-

"پانینی کی قواعد (سنہ ۳۵۰ ق۔م) میں اصطلاحات 'یوانانی' (سامی تحریر) اور مرکبات 'لپی کارا'، اور 'لبی کارا' کے وجود سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کے عہد میں تحریر کا علم تھا...... نوشتوں کے ان مخصوص حوالجات اور ویدی تہذیب کی ترقی یافتہ حالت پر ساتھ ہی ساتھ غور کیا جاتا ہے تو بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں تحریر کے استعمال کا زمانہ بہت عرصہ پہلے تھا حال ہی کے انکشافات نے ان تمام نظریوں کو ختم کر دیا ہے جو ہندوستانی رسم الخط کو غیر ملکی ذرائع کی تخلیق بتاتے تھے۔ قدیم و جدید حجری دور کے ظروف پر تحریریں پائی گئی ہیں اور بقول جنڈار کر ان میں سے پانچ نشانات عہد اشوک کے برہمی طرز سے ملتے جلتے ہیں علاوہ اسکے موہنجو داڑو اور ہڑپا میں سنہ ۳۰۰۰ ق۔م سے بھی قبل کی تحریری دستاویزات، مہریں اور کتبات برآمد ہو چکے ہیں ـــــ لہٰذا اب برہمی کے ڈانڈے آٹھویں یا نویں صدی ق۔م کے کسی سامی طرز ہجی سے ملانا فضول ہوگا۔"

اسی سلسلہ میں مصنفین نے مسٹر جان مارشل کی کتاب کی طرف توجہ دلا کر بیان کیا ہے کہ اُس میں یہ فقرہ درج ہے:

"مجھے یقین ہے کہ برہمی ہجی کا ماخذ سامی ہجی کو قرار دینا صحیح نہیں ہے۔"

اقتباسات بالا سے متعلق حسب ذیل امور قابل غور ہیں :۔

(۱) رگوید کا زمانہ اور اس کی مبینہ اعلیٰ تہذیب و شائستگی کا مقابلہ اُن حالات سے جو سر جان مارشل نے بیان کئے ہیں اور جیسے ظاہر ہوتا ہے کہ موہنجو داڑو کے رہنے والے پختہ مکانوں میں شہری زندگی بسر کرنے والے لوگ تھے اور رگوید آریہ اقوام بانسوں کی جھونپڑیاں بنا کر دیہات میں مویشی چرانے کا اور زراعت کا کام کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

(۲) پانینی کا زمانہ اگر پانچویں صدی کے بجائے ساتویں صدی قبل عیسیٰ بھی مان لیا جائے تو وہ محققین کے اس قول کے منافی نہیں کہ تحریر کا رواج ہندوستان میں آٹھویں صدی ق۔م کے آس پاس سے جاری ہوا ہے اور سامی کتابت سے تعلق رکھتا ہے۔ نیز اگر پانینی سامی کتابت سے واقف تھا تو محققین کے قول کی اور بھی تائید ہوتی ہے۔

(۳) براہمی کتابت اور موہنجو داڑو وغیرہ کی قدیم کتابت کا بیان اور لفظ Indian script اور Hindu کا استعمال ایسے مبہم طریق پر کیا گیا ہے گویا آریہ اور منڈا اور دراوڑ اقوام اور قدیم و جدید کتابتیں سب ایک ہی چیز ہیں اور باہم مترادف ہیں۔

(۴) یہ منطقی دلیل کہاں تک تسلیم کی جا سکتی ہے کہ موہنجو داڑو وغیرہ میں ایک قدیم کتابت رائج تھی اس لئے برہمی کتابت کا سامی خط سے ماخوذ سمجھنے کا خیال بیہودہ ہے۔

(۵) قدیم ہند کے ہزاروں سال قبل کے سیکڑوں ہزاروں نقش و نگار میں سے دو چار براہمی علامتوں کا بغیر کسی تسلسل کے ملتا جلتا ہونا اور سامی کتابت سے مربوط مشابہت کا ذکر حذف کرنا۔

(۶) سر جان مارشل کی کتاب سے ایک فقرہ ایسے مبہم طریق پر نقل کیا گیا ہے کہ بظاہر مصنف مذکور ہی سے منسوب ہونا معلوم ہوتا ہے واقعہ یہ ہے کہ سر جان نے کسی دوسرے شخص کی رائے اُسی کے الفاظ میں نقل کی ہے۔ صورتِ احوال یہ ہے کہ موہنجو داڑو کے آثار کی بنا پر دو صاحبان پروفیسر Langdon اور ڈاکٹر Hunter نے یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ براہمی کتابت موہنجو داڑو کی کتابت سے ماخوذ ہے۔ یہ قیاس بھنڈارکر کے قیاس کے خلاف ہے جنہے بقول مصنفین H.M. براہمی کتابت کا دیگر مختلف اور قدیم تر نقش و نگار سے متعلق ہونا ظاہر کیا ہے۔ اس بحث کے سلسلہ میں ہم پھر سر جان کی کتاب سے چند اقتباسات نقل کرنے پر مجبور ہیں جن سے خود اُس کی رائے ظاہر ہوگی :۔

(۱) "دیکھنا یہ ہے کہ آیا ہندوستانی ماہرین کتابات کے لئے اس کا (پروفیسر لینگڈن کا) مفروضہ قابل قبول ہوگا (صفحہ ۴۱)

(۲) ہمیں محتاط رہنا چاہئے کہ ان شباہتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد نہ کریں کہ جو کسی حد تک اتفاقی مماثلت کا نتیجہ ہوں" (صفحہ ۱۴)

(۳) مجھے کہنا پڑتا ہے کہ پروفیسر لینگڈن کے اس خیال سے کہ ہندوستان میں آریوں کا داخلہ اور برہمی رسم الخط کا ارتقاء ۳۵۰۰ ق۔م سے پہلے کی چیز ہے مجھے اتفاق نہیں۔

اب ہم تحریر کے سلسلہ کی بحث ختم کرکے اعداد سے متعلق ذکر کرتے ہیں۔ مصنفین تسلیم کرتے ہیں کہ براہمی اور خروشتی اعداد کے اولین نمونے اشوک کے کتبوں میں پائے جاتے ہیں جس کا زمانہ سکندر کے بعد یعنی تیسری صدی قبل عیسیٰ کا ہے۔ خروشتی کا رواج پانچویں صدی قبل عیسیٰ سے تیسری صدی عیسوی تک بیان کیا گیا ہے۔ اشوک کے کتبوں میں صرف چار خروشتی اعداد حسب ذیل درج ہونا ظاہر کئے گئے ہیں :- ا - اا - ااا - اااا --- بعد کے زمانہ میں چار اور پانچ کے ہندسوں کی شکل (X — X۱) ظاہر کی گئی ہے۔ دس اور بیس اور سو کے اعداد کی شکلیں بھی قایم ہو پائی جاتی ہیں۔ یہ اعداد سیدھی طرف سے لکھے جاتے تھے۔ مصنفین مذکور نے اُن کو خروشتی سے متعلق ہونا تسلیم کیا ہے اور مخصوص وجہ یہ ظاہر کی ہے کہ وہ سیدھی طرف سے لکھے جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو اقتباس ذیل :-

۱۹ " اعداد مندرجۂ بالا واقعی اس (خروشتی) رسم الخط سے متعلق ہیں کیونکہ ان کا رخ دائیں سے بائیں طرف ہے "

براہمی اعداد کے متعلق مصنفین موصوف کا یہ خیال ہے کہ چونکہ براہمی قومی کتابت کی تکمیل ۱۰۰۰ ق۔م سے پہلے ہو چکی تھی اس لئے اعداد کی ایجاد بھی بہت قدیم ہے لیکن چونکہ اشوک سے پہلے کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوا ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابتدا میں براہمی اعداد کی شکلیں کیا تھیں۔ اشوک کے کتبوں میں حسب ذیل چار اعداد موجود ہونا بیان کئے گئے ہیں :-

اس کے بعد کے زمانہ کی شکلیں حسب ذیل بیان کی گئی ہیں لیکن ان علامات کی قیمتیں ایک صاحب اندرجیت کی تاویل (Interpretation) پر مبنی ہیں (صفحہ ۲۶) :-

۱	۲	۴	۶	۷	۹	۱۰	۲۰	۸۰

سن عیسوی کے بعد دوسری اور تیسری صدی کی شکلیں ذیل کے طریق پر بیان کی گئی ہیں :

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰

وغیرہ وغیرہ مختلف اشکال۔

ان شکلوں کے بیان کے بعد مصنفین موصوف نے اُن کا مقابلہ خروشتی اعداد سے کیا ہے اور اس امر کے متعلق بحث کرکے کہ شکلہائے مذکورہ براہمی حروف یا الفاظ کے ٹکڑوں (Syllables) سے کہاں تک ماخوذ ہیں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے :-

(۱) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کشتیں برہمی میں تحتانی اور خروشتی وسامی تحریروں میں عمودی لکیریں تھیں۔ بعینہ جس طرح

یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ برہمی میں تحریر بائیں سے دائیں جانب اور خروشتی و سامی تحریروں میں دائیں سے بائیں طرف کیوں چلتی تھیں۔ ـــ ہمارا خیال ہے کہ برہمی اور خروشتی ہندسے سدا دوش بدوش رہے اور صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے قدیم تر کون ہے علامات ۱ اور ۱۰ کے لکھنے میں جو فرق ہے اس کا سبب ہر دو طرز ہائے تحریر کا اختلاف ہے ـــ ان دونوں طریقوں میں جن اُصول پر علامات اعداد بنائی گئی ہیں وہ بالکل مختلف ہیں۔ (صفحہ ۲)

(۳) جتنے بھی نظریئے وقتاً فوقتاً پیش کئے گئے ہیں ان میں پنڈت اندرجی کا نظریہ ہم کو وقیع تر معلوم ہوتا ہے کہ ہندو ۴۰۰۰ ق۔م میں فن تحریر سے واقف تھے۔ وہ تقریباً ۲۰۰۰ ق۔م میں (۱۰) جیسے بڑے بڑے عدد استعمال کرتے تھے اور اسوقت سے انکے مذہب و علوم نے بڑے اعداد کے استعمال کو ضروری قرار دیا ہے کہا جاتا ہے کہ ۱۰۰۰ ق۔م میں بدھ نے ۱۰۵۳ جیسے بڑے عدد کے نام لئے ہیں اور بعد ازاں یہ سلسلہ اور بڑھایا گیا۔ ان تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ صورت ناممکن ہوتی اگر علم الحساب نے خاصی ترقی نہ کرلی ہوتی۔ یہ امر یقینی ہے کہ ہندوؤں نے بہت عرصہ پہلے ہی ان اعداد کو لکھنے کے لئے کسی طریقہ کی ضرورت ضرور محسوس کی ہوگی۔ پس یہ نتیجہ نکلتا کہ برہمی طریق اعداد ہندوؤں نے ایجاد کیا تاریخی شہادت کے خلاف نہ ہوگا۔ اس نتیجہ کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ تحریر میں 'مترکا' 'اُونا' 'سیدکا' اور 'اپدھ منیا' جیسی علامات کا استعمال ہوا ہے کہ جو سوا سنسکرت رسم الخط کے کسی اور قدیم یا جدید فن تحریر میں نہیں ملتی ہیں اسکی مزید تائید ہندو' جین اور بودھ مذہب کی روایات بھی ہوتی ہے جو برہمی اور دیگر علامات اعداد کی ایجاد خالق برہما سے منسوب کرتی ہیں صفحہ ۳" ـــ ۳" طریق ہزائی ایجاد کا زمانہ ۸۰۰ ق م سے ۲۰۰ ق م تک کہا جا سکتا ہے جیسا کہ اقصیٰ کی اعداد سے واضح ہوتا ہے کہ یہ طریقہ بھی ہندوستان میں عام تھا نیز اسکی تاریخ بہت طویل ہے کمتر حد ۲۰۰ ق م یقیناً یہ بہت جلد نہیں متعین کی گئی ہے"

ہم کو خیالات مندرجہ ۲ و ۳ کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے کیونکہ بدیہی طور پر وہ مبالغہ پر مبنی ہونا پائے جاتے ہیں۔ چار ہزار برس قبل عیسیٰ نہ تو قوم ہندو کا ہی وجود تھا اور نہ قوم آریہ کا پتہ تھا۔ اور نہ چار ہزار تین ہزار دو ہزار سال پہلے کی ان اقوام کی کوئی کتاب یا کتبہ وغیرہ موجود ہے گوتم بدھ یقیناً چھٹی صدی قبل عیسیٰ کی ہستی ہے لیکن اگر اُس کے اقوال مدت مدید کے بعد نقل کئے جائیں تو وہ اقوال کسی خاص حد تک ہی بلا دلیل قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ بالفرض اگر گوتم بدھ نے پدم یا سنکھ کا لفظ بولا بھی تو اُس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ وہ تعداد آجکل کے ہندسوں کی طرز پر لکھی بھی جاتی تھی خاصکر ایسی صورت میں جبکہ الفاظ مذکور کا مفہوم ایک بہت بڑے عدد کا ہو اور کسی ایک عدد خاص سے وابستہ نہ ہو۔ بیرونی کے زمانہ تک یہ مفہوم متعین نہ تھا۔ آج بھی شاید کوئی اہل فن وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پدم مقدم ہے یا سنکھ۔ اسی طرح اشوک کے تیسری صدی کے ہندسوں پر سے یہ مان لینا کہ اُن کی تاریخ بہت پُرانی ہے محض قیاس آرائی ہی کہا جا سکتا ہے ـــ استدلال کا نمونہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہ روایت چلی آرہی ہے کہ اعداد خالق کل برہم نے ایجاد کئے ہیں اس لئے براہمی اعداد کی ایجاد قدیم ترین ایجاد ہے۔ ایسے دلایل کی بنیاد پر اعداد کی ایجاد کو کم از کم ۸۰۰ ق۔م سے منسوب کرنے کی غایت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ محققین فرنگ کی تحقیقات کے اس نتیجے سے گریز کیا جائے کہ ہندوستانی آریوں نے آٹھویں صدی قبل عیسیٰ کے آس پاس

لکھنا پڑھنا سیکھا - غرضکہ خیالات مندرجۂ ۲ و ۳ اتنے قابل توجہ نہیں جتنا کہ خیال مندرجۂ ۱ ہے -

مصنفین نے تعجب ظاہر کیا ہے کہ سامی اور خروشتی اعداد میں کھڑی لکیریں اور براہمی میں سیدھی کیوں ہیں - یا اُلٹی اور سیدھی طرز کتابت کا کیا باعث ہے وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ سامی اور براہمی طریقوں میں سے کونسا قدیم تر ہے - اُن کا قیاس ہے کہ لکیروں میں فرق کی وجہ اُلٹی اور سیدھی طرز کتابت ہے - نیز اُن کے خیال کے مطابق باقی ہندسوں کا اُصول ساخت دونوں طریقوں میں جداگانہ ہے - ہم کو اس سے اتفاق ہے کہ پہلے تین چار ہندسوں کو چھوڑ کر باقی ہندسوں کی ساخت و ترکیب میں فرق ہے یعنی ایک طریقے میں تو صرف ایک کے ہندسہ سے باقی آٹھ ہندسے بنائے گئے ہیں اور دوسرے طریقہ میں چار سے نو تک کے ہندسے جدا جدا متفرق شکلوں کے ہیں - مگر اس فرق کا اس سوال پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ یہ متفرق ہندسے کہاں سے حاصل کئے گئے یا کیونکر بنے - دونوں طریقوں کی قدامت کا سوال بھی پیچیدہ نہیں ہے - جو مواد ہم نے پیش کیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ سامی کتابت اور سامی طریق کتابت بہ مقابلۂ براہمی کتابت کے قدیم تر ہے - رہا سوال اُلٹی اور سیدھی طرف سے لکھنے کا تو اُس کی داستان بہت کچھ دلچسپ ہے - ہم کو مصنفین کی اسی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے کہ کھڑی اور سیدھی لکیروں کا فرق محض طریق کتابت کی وجہ سے ہے - صرف اسی قدر نہیں بلکہ ہماری رائے میں باقی ماندہ ہندسوں کی ساخت میں بھی یہی چیز کارفرما ہے -

انسان کے جسم کی ساخت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ بالعموم اُس کا سیدھا ہاتھ بائیں ہاتھ سے قوی تر ہے اور اُسی سے زیادہ کام لیا جاتا ہے - یہ بھی ظاہر ہے کہ سیدھا ہاتھ سیدھی طرف سے ہی زیادہ چلنے کا عادی ہے - اس لئے جتنے قدیم رسم الخط ہیں وہ سیدھی ہی طرف سے بائیں جانب کو جاتے ہیں - جیسے قدیم سُمیری - قدیم سامی - مصر اور موہنجو دارو کی کتابتیں - یا اوپر سے نیچے کی طرف جیسی چین کی کتابت - لیکن باوجود اس کے کہ سیدھے ہاتھ کو سیدھی چال چلنے میں آسانی تھی اور یہ طریق کتابت میں ایک دقت پیش آنا لازمی تھی - وہ یہ کہ ابتداءً کتابت اشیاء پر نقش کرکے باریک نوک سے کی جاتی تھی - قلم بعد کی ایجاد ہے - مٹی - پتھر یا دھات پر نقش کرنے کے لئے ضروری تھا کہ نوک گاڑ کر کام کیا جائے - یوں بھی جب سیدھے ہاتھ سے نوک خواہ وہ قلم کی ہی کیوں نہ ہو سیدھی طرف سے چلیگی تو ہاتھ کے دباؤ کی وجہ سے کسی سطح پر بھی ذرا رُکتی ہوئی چلے گی جب تک کہ سطح کانچ کی طرح ہموار اور چکنی نہ ہو - اُلٹی طرف سے چلنے میں نوک گڑاتی ہوئی نہیں جائے گی بلکہ سطح کے کھردرے پن کے اوپر سے پھسلتی ہوئی چلے گی - خلاصہ یہ کہ اُلٹی طرف سے لکھنا نسبتاً زیادہ آسان معلوم ہوا خصوصاً جبکہ نقش کرنیکی ضرورت باقی نہ رہی اور سیاہی کی مدد سے ہموار اور صاف سطح پر قلم چلانا شروع ہوا - یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جو کتابتیں پہلے سیدھی جانب ہوتی تھیں وہ کچھ عرصہ کے بعد اُلٹی طرف سے لکھی جانے لگیں - کوئی کتابت ایسی نہیں پائی جاتی جو شروع ہی سے اُلٹی جانب سے لکھی جاتی ہو - مصنفین H. M. کا یہ خیال غلط ہے کہ براہمی رسم الخط ابتدا سے ہی اُلٹی جانب سے لکھا جاتا تھا - اسبات کی شہادت موجود ہے کہ اشوک کے زمانہ سے پہلے براہمی کتابت بھی سیدھی طرف سے ہوتی تھی - مصنفین

مذکور نے اگر اس شہادت کا سہواً یا عمداً یا ناواقفیت کی وجہ سے ذکر نہیں کیا ہے تو اس سے وہ شہادتِ مادی جو محققین فرنگ نے برآمد کی ہے کالعدم قرار نہیں دیجا سکتی - ملاحظہ ہو اقتباس ذیل :

> یہ دبرہمی رسم الخط) باقاعدہ بائیں طرف سے داہنی جانب لکھا جاتا تھا - لیکن ۴۰۰ ق - م کے ایک سکہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ابتدائی رخ یہ نہ تھا - اس دسکہ) پر تحریر داہنے سے بائیں طرف ہے (سنسکرت لٹریچر از مکڈنل)

قلم کی روانی تجربہ سے متعلق ہے لیکن اس تجربہ کے اسباب اولین کا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں - مہنجو دارو کی کتابت کے ذکر میں یہ بات آچکی ہے کہ جب ایک سطر ختم ہو جاتی تھی تو قلم یا وہ چیز جس سے کتابت کی جاتی تھی وہیں سے دوسری سطر اُلٹی جانب سے شروع کر دیتی تھی - یہ روش غالباً تسلسلِ عبارت قایم کرنے کے لئے اختیار کی جاتی تھی - یہی طریقہ یونانیوں میں بھی رائج تھا یعنی جب یونانیوں نے سامی کتابت قبول کی تو ابتداءً یونانی کتابت بھی سیدھی طرف سے ہوتی تھی اور جب ایک سطر ختم ہوتی تھی تو دوسری سطر اُلٹی جانب سے شروع کر دیجاتی تھی لیکن ساتویں صدی میں یہ طریقہ بند کر دیا گیا اور عبارت بائیں جانب سے لکھی جانے لگی - اس سے ظاہر ہوگا کہ ہم صرف براہمی خط کے متعلق ہی کسی خاص غرض سے یہ عرض نہیں کر رہے ہیں کہ وہ پہلے سیدھی طرف سے لکھا جاتا تھا بلکہ اور کتابتیں بھی شروع میں سیدھی طرف سے ہی لکھی جاتی تھیں اور اُلٹی جانب سے لکھنے کا رواج اولاً تسلسلِ عبارت کے خیال سے اور بعدش روانی قلم کے باعث سے قایم ہوا - سیدھی سطر ختم ہونے پر جب دوسری سطر اُلٹی جانب سے شروع کی جاتی تھی تو کتابت دو طرز اختیار کرتی تھی - یا تو حروف یا علاماتِ صوتی ونشانہائے تصوراتِ ذہنی اُسی طرح لکھے جاتے تھے جیسے سیدھی طرف سے لکھے جاتے تھے - یا اُن کی شکل منعکس کر دیجاتی تھی - مثلاً شیر کی تصویر سیدھی سطر میں اس طرح نقش کی جاتی تھی کہ اُس کی دُم سیدھے ہاتھ کی طرف اور اُسکا منھ اُلٹے ہاتھ کی طرف ہوتا تھا - لیکن دوسری سطر میں جو بائیں طرف سے لکھی جاتی تھی وہی تصویر یا تو اُسی طرز پر ہوتی تھی جیسی پہلی سطر میں یا اُس کا رُخ پھیر دیا جاتا تھا - یعنی شیر کا منھ سیدھے ہاتھ کی طرف ہوتا تھا اور اُس کی دُم اُلٹے ہاتھ کی طرف - آسانی سے سمجھنے کے لئے ہم ایک شعر پیش کرتے ہیں - اگر اُس کو دو سطروں میں لکھنا ہو تو قدیم یونانی طرز پر اُس کی جو کتابت ہوگی وہ حسب ذیل ہوگی :

(۱) بنے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا
اُلٹا یار اُلٹی بات اُلٹے ہم

(۲) بنے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا -
ہم اُلٹے بات اُلٹی یار اُلٹا

ظاہر ہے کہ کتابت ۲ کی صورت میں بعض اوقات یہ دقت پیش آتی ہوگی کہ دوسری سطر کے منفرد الفاظ کا پڑھنا کہاں سے شروع کیا جائے - اُس کے مقابلہ میں ۲ سہل طریقہ تھا اور قلم کی روانی کی آسانی لئے ہوئے تھا بشرطیکہ سیدھی علامات کو اُن کی منعکس شکلوں میں بھی صوتی یا ذہنی نشان مان لیا جائے - اس طریقے کے قبول کر لینے سے دو سطروں کی متخالف تحریر کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی - اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ سیدھی جانب کے بجائے

بائیں جانب کی تحریر رائج ہوئی۔ اور نہ یہ امر مسئلۂ لاینحل کی صورت رکھتا ہے کہ علامات تحریر منعکس کیونکر ہو سکتی تھیں۔ علامات تحریر کی منعکس شکل میں ظاہر ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے جو بعض حضرات بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں منقش اور کندہ مہروں سے استعمال کا عام رواج تھا۔ ان سے دستخط ثبت کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ اب بھی انگوٹھیوں پر نام کندہ کرائے جاتے ہیں اور سرکاری دفاتر میں مہریں بنائی جاتی ہیں۔ ان سب پر الفاظ و حروف منعکس شکل میں کندہ یا نقش کئے جاتے ہیں تاکہ جب وہ کسی شے پر ثبت کی جائیں تو عبارت اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہو۔ فرض کیجئے کہ کسی مہر پر حرف 'ع' کندہ ہے۔ اگر ہم اُس نقش کو جو مہر زدہ ہے اُسی منعکس شکل میں صوتی علامت کے طور پر قبول کرلیں تو ہمارے حروف کی 'ﻋ' ہوگی اور یہ حرف وہی آواز دے گا جو عین کی ہے۔ صورت ایسی بدل جائے گی کہ آیندہ مشکل سے پہچان میں آسکے گی۔ ان حالات پر سے یہ قیاس قایم کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح برہمنوں نے اپنا اقتدار اور اپنی عظمت قایم کرنے کے لئے ہندوستانی تاریخ کے صفحات ملیامیٹ کردئے اُسی طرح منعکس شکلیں اور بائیں طرز تحریر اختیار کرکے پچھلے سب آثار مٹا دئے ورنہ اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اشوک سے پہلے کی سب خط و کتابت غائب ہوجائے۔ (باقی) ح ۔ ا

"نگار" کے پُرانے پرچے

سنہ ۲۶ء جنوری = ۱۲ر ــــ سنہ ۳۰ء مئی عہ ر ــــ سنہ ۳۱ء جولائی، اگست فی پرچہ ۸ر۔ اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸ر۔ سنہ ۳۲ء فروری، مارچ فی پرچہ ۱۲ر ــ مئی، جون، جولائی فی پرچہ ۸ر۔ ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸ر ــــ سنہ ۳۴ء فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر فی پرچہ عہ ر ــــ سنہ ۳۶ء دسمبر عہ ر ــــ سنہ ۳۷ء فروری تا جولائی فی پرچہ ۸ر۔ اکتوبر، نومبر فی پرچہ ۱۲ر ــــ سنہ ۴۰ء فروری تا دسمبر (جون، جولائی، اگست نہیں ہے) فی پرچہ ۸ر ــــ سنہ ۴۱ء مارچ تا دسمبر (ستمبر نہیں ہے) = للعہ ــــ سنہ ۴۲ء مارچ تا مئی فی پرچہ ۸ر۔ اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۸ر ــــ سنہ ۴۳ء مئی ۱۲ر ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ر ــــ سنہ ۴۴ء مئی تا دسمبر مسلسل ۱۲ر فی پرچہ ــــ سنہ ۴۵ء اپریل ۸ر۔ مئی عہ ر۔ جون، جولائی ۱۲ر فی پرچہ۔ اگست تا دسمبر ۸ر فی پرچہ ــــ سنہ ۴۶ء اپریل تا اگست فی پرچہ ۸ر۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر فی پرچہ ۱۲ر
(مکمل فایل سنہ ۴۶ء = عـ۱۰ر)

منیجر نگار لکھنؤ

مجنوں گورکھپوری - ایک مطالعہ

(بہ سلسلۂ ماہ مئی ۱۹۷۶ء)

مجنوں ادب اور پروپگنڈے میں صاف طور پر فرق محسوس کرتے ہیں اور نئی نسل کے بعض ان نوجوانوں کو جن کے ہاتھوں میں ادب محض ایک آلۂ نشر و اشاعت بنا ہوا ہے، اس حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ادبی پیداوار کسی نہ کسی خیال یا نقطۂ نظر کی اشاعت ہے یہاں تک کہ ناول و افسانہ میں ـــ جس کا اولین مقصد سامان تفریح مہیا کرنا ہے ـــ ایک خاص نقطۂ خیال کا پایا جانا ضروری ہے، لیکن ادب اس معنی میں پروپگنڈہ ہے جس معنی میں پمفلٹ یا اخبار پروپگنڈہ ہوتا ہے۔ "ادب جماعتی اور طبقاتی خصوصیات کا حامل ہوتے ہوئے محض ڈھنڈورا نہیں ہوتا۔ ادب اپنے عہد اور اپنے اجتماعی نظام کی پیداوار بھی ہوتا ہے اور دونوں سے ماوراء بھی، ورنہ وہ انقلاب و ترقی میں معاون نہیں ہو سکتا"۔ اگرچہ ادب کے میلانات کی تعیین میں اقتصادی حالات نمایاں طور پر حصہ لیتے ہیں، لیکن بعض جوشیلے ترقی پسند نوجوانوں کا یہ خیال کہ اقتصادی عنصر ہی تنہا محرک یا موثر عنصر ہے، ان کی غلط اندیشی ہے۔ "اقتصادیات ادب کی اندرونی ترکیب میں داخل ہیں، لیکن ادب، اقتصادیات کا غلام نہیں ہے۔ خود مارکس اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ کسی تاریخی عہد کی تہذیب یا فنکاری، اجتماعی ارتقاء کی کسی مخصوص ہیئت کی آئینہ داری کرتے ہوئے بھی ایسا جمالیاتی اثر پیدا کر سکتی ہے، جو اس تاریخی ماحول سے بلند و برتر ہو" ـــ اور اس لئے اجتماعیت اور انفرادیت کی وہ دیرینہ بحث بھی صاف ہو جاتی ہے" ادب میں "میں" کا عنصر یقیناً لازمی ہے لیکن "ہم" کے شعور کو ایک لمحے کے لئے بھی محو نہیں کیا جا سکتا"

نئی نسل کے بعض جوشیلے نوجوانوں کی طرح مجنوں ماضی کو یکسر حرفِ غلط سمجھ کر اُس سے اپنا رشتہ توڑ لینا مناسب نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک انسانی تاریخ کے مختلف ادوار اپنے اندر ایک تاریخی تسلسل رکھتے ہیں، اور اس لئے ہم افکار و خیالات نظریات و تصورات کے اس عظیم الشان ترکہ کو ٹھکرا کر یہ نعرہ نہیں لگا سکتے کہ: "جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو"

مجنوں کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ:

"ماضی کو اپنے سر کا بھوت بنا لینا تو یقیناً آسیب کے قسم کی بیماری ہے، لیکن ماضی سے یکسر انکار کر دینا بھی وہ دماغی عارضہ ہے جس کو اصطلاح میں نسیان کہتے ہیں ـــ ہم کو کبھی بھی اس حقیقت کو نظر انداز کرنا نہ چاہئے کہ زندگی کے دوسرے اکتسابات کی طرح ادب بھی بیک وقت وارث اور مورث دونوں ہوتا ہے، اگرچہ ہم ماضی کو بہر حال ماضی سمجھتے اور کسی طرح

یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ وہ حال و مستقبل کے مائل بہ ترقی حرکات میں خلل انداز رہے"۔

اور یہ محض مجنوں کا خیال ہی نہیں بلکہ ان کی تمام ادبی زندگی ان کے اُس انہماک کو پوری طرح ہماری نگاہ کے سامنے لاتی ہے جو اُن کو مشرق و مغرب کے ادبیاتِ عالیہ سے ہمیشہ سے رہا ہے۔ ان کے انتقادی مضامین کے اُس مجموعہ کو دیکھ کر جو "تنقیدی حاشئے" کے نام سے حال ہی میں شایع ہوا ہے، سب سے پہلے جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ ان صفحات کا لکھنے والا اُردو شاعری کے ادبیات عالیہ سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے، اور اس نے فکر و احساس کی پوری قوت اور شدت کے ساتھ اپنے قدیم شعر و ادب کا مطالعہ کیا ہے۔

اس کتاب کے تمام مقالات پر فرداً فرداً رائے پیش کرنا تقریباً ناممکن ہے، تاہم اس خیال سے کہ جو بنیادی باتیں اس باب میں ذہن میں آرہی ہیں، ان کو ظاہر کئے بغیر آگے بڑھ جانا مناسب نہیں، چند چیزوں کی طرف اشارے کرنا ضروری ہیں، پہلی چیز جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں یہ ہے کہ مجنوں ہماری شاعری کے ابتدائی دور کے ساتھ غیر معمولی طور پر شیفتگی رکھتے ہیں پھر یہ کہ ان کو غزل یا عشقیہ شاعری سے خاص طور پر تعلقِ خاطر ہے۔ وہ تغزل کی روح کو پا گئے ہیں اور ہر چند تصوف سے بظاہر کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کرتے، لیکن ان کو شاعری میں ان موضوعات سے بھی بہت لگاؤ ہے، جن کو آفاقی موضوعات (cosmic issues) کہتے ہیں اور جن کے تحت انسانی نفس و کردار کی پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ انسانی حیات کے مقدر اور قضا و قدر کی افتادیوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ انسانی زندگی کے المیہ پر غور کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ زندگی کی سب سے تلخ حقیقت محبت ہے۔ ان کو اپنے نظریۂ محبت کے بہت سے نقوش جن کو روحِ تغزل کہنا چاہئے میر اور ان کے عصر کے دوسرے غزل گو شعراء میں ملتے ہیں۔ اس روحِ تغزل کو اگر مختصر سے مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو "خستگی و برشتگی" کہنا غالباً کافی ہوگا۔ جو لوگ اس عصر کی روح سے واقف ہیں، ان پر اس حقیقت کا اعادہ ضروری نہیں کہ اس دور کی غزل میں جو کیفیت ربودگی و سپردگی، شکستگی و گداختگی، جگر ریزی و دل برشتگی کی پائی جاتی ہے، وہ اُردو غزل کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری چیز ہے۔ اس کے ساتھ زبان میں جو نرمی اور گھلاوٹ، جو سادگی و معصومیت ہے اس کی مثال اُردو غزل کے موجودہ اسالیب میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب کا معرکۃ الآرا مضمون "میر اور ان کی شاعری" ہے، جو میر کی شاعری، ان کی زبان اور اسلوب کی بہترین تفسیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اور خاص موضوع کی طرف دعوتِ فکر دیتا ہے۔ یادش بخیر، میر کی شاعری پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو لوگوں نے اتنا کچھ سمجھا اور سمجھایا ہے کہ آج ہم میر پر کوئی مضمون پڑھنے کے لئے مشکل ہی سے آمادہ ہوتے ہیں، کیونکہ ایک ہی قسم کی رائے ایک ہی انداز کے جملوں میں سنتے سنتے ہم لوگ اب تھک چکے ہیں، لیکن جب ہم مجنوں کو میر کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سنتے ہیں، تو ہم بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اکابرِ شعر و ادب کے علاوہ بھی، شاید ہی کوئی کافر ایسا ملے جو میر کے کلام کی اثر انگیزی اور سوز و گداز پر ایمان نہ رکھتا ہو، لیکن جس طرح عام طور پر شاعری

اپنے راز کو کبھی پوری طرح افشا نہیں ہونے دیتی اسی طرح میر کے متعلق بھی آجتک کوئی یہ نہ سمجھا سکا کہ اس میں یہ اثر اور یہ سوز و گداز کہاں سے آیا ؟ — اس کی وجہ یہ ہے کہ میر کی خارجی زندگی کے واقعات بھی مفصل دستیاب نہیں ہوتے، چہ جائیکہ ان کی زندگی کا داخلی رُخ، جو کسی شخص اور بالخصوص ایک شاعر کی اصلی زندگی ہوتا ہے، مجنوں نے میر کے چند خارجی حالات سے ان کی داخلی زندگی کے تار و پود کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور انکی شاعری کو ان کی اسی داخلی اور خارجی زندگی کا آئینہ بتایا ہے۔ مجنوں نے میر کے کلام سے بہت سی مثالیں ایسی پیش کی ہیں جو صاف طور پر ان کی زندگی کے واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اس سے ان کا مقصود یہ نہیں کہ اگر میر ان آلامِ عشق اور آلامِ حیات سے دوچار نہ ہوتے تو وہ اس قسم کا ایک شعر بھی نہ کہہ سکتے۔ یہ کہنا تو میر کی شاعرانہ قوتِ تخیل کی توہین ہوگی -! لیکن مجنوں کی رائے کے مطابق یہ نہ ماننا بھی ہٹ دھرمی ہے کہ اگر عشق اور زندگی کے ہاتھوں میر کا یہ حال نہ ہو چکا ہوتا تو شاید میر وہ میر نہ ہوتے جو آج ہیں۔ ان کا ایک ایک شعر ایک ایک افسانہ ہے لیکن ہم اس کو اس قدر خود اپنے حسبِ حال پاتے ہیں کہ بھولے سے بھی کبھی اس طرف خیال نہیں جاتا کہ ممکن ہے کہ یہ سب میر کی اپنی زندگی بھی رہی ہو —— ہر چند میرے خیال میں یہ صرف قیاسی تجزیہ ہے، تاہم یہ اس نے مستحسن ہے کہ اس سے شاعر کی شخصیت اور اسکی شاعری کے درمیان جو ربط و تسلسل ہے وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر جارج برینڈس نے شیکسپیر کے کلام کی مدد سے اس کی شخصیت اسکی زندگی اور نفس و کردار کے تمام اہم خصائص کو پوری طرح پیش کر دیا ہے، حالانکہ شیکسپیر کے متعلق یہ خیال آجتک عام ہے کہ ہم اس کی زندگی کے متعلق تقریباً کچھ نہیں جانتے۔

مجنوں نے اس خیال کو ایک سے زاید بار ظاہر کیا ہے کہ "اُردو غزل گوئی میں میر اور درد کچھ اس طرح چھائے اور لوگ ان میں اس طرح محو ہوئے کہ اکثر ایسے متغزلین جو اس قابل تھے کہ اُن کا غائر مطالعہ کیا جاتا، نظر انداز ہو کر رہ گئے۔ ان میں تین چار تو ایسے ہیں کہ جن کا شمار متغزلین میں ہونا چاہئے - اور جن کا نام میر کے ساتھ نہیں تو درد کے ساتھ ضرور لیا جا سکتا ہے، جس طرح میر نے غمِ ہستی کی ٹیسوں کو راحت آفریں بنا دیا، جس طرح درد نے غمِ عشق کو ایک نیا جلال بخشا، اسی طرح ان لوگوں نے بھی عشق میں ایک نئی شان پیدا کی اور اس کو ایک جداگانہ مسلک بنا کر پیش کیا - میر مراد خواجہ حسن اللہ بیان قایم چاندپوری، خواجہ میر درد کے بھائی خواجہ میر اثر، تاباں اور یقین سے ہے - میں نے تینوں کو غور سے پڑھا ہے اور اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ بغیر ان کو پڑھے ہوئے ہمارا اُردو غزل کا مطالعہ نامکمل ہو جاتا ہے۔" یہ صحیح ہے کہ اس دور کے غزل گو شعرا میں میر و درد کی منزل تک کوئی دوسرا نہ پہونچ سکا اور یہی دو شاعر ایسے تھے جن کی غزل ارتقائی منازل سے گزرتی ہوئی اپنے آخری نقطہ (climax) پر پہونچی اور ملک و ادب نے اُسے قبولِ عام بخشا - لیکن یہاں یہ استثناء بھی عجیب ہے کہ بعض دوسرے غزل گو شعراء جن کا دل یقیناً عشق سے زندہ ہو چکا تھا، بعض اسباب و عوارض کے مانع ہو جانے سے جریدۂ عالم پر مہرِ دوام ثبت نہ کر سکے۔ چونکہ خود اُن کے دور میں، اُن سے زیادہ قوی اور دلنشیں آوازیں سننے میں آرہی

تھیں، اُن کے دور میں بھی اُن کی آواز کم لوگ ہی سُن سکے اور بعد کے زمانوں میں تو لوگ ان کو بالکل ہی بھول گئے تھے۔ تا آنکہ ہمارے عہد میں چند پرستار پھر ایسے اُٹھے جنھوں نے دیکھا کہ ان غریبوں کی خاکستر میں ہنوز زندگی کی چنگاریاں پوشیدہ ہیں! قائم، میراثر، میرسوز، بیاں، یقین، تاباں، افسوس ــــ یہ سب ایسے شاعر تھے جن کا تغزل بھلانے کی چیز نہ تھی اور جس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے یقیناً مجنوں یا نیاز کے قلم کو جنبش میں آنا چاہئے تھا! مجنوں کا یہ خیال بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ: "قائم کا دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے جن کو پڑھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کو محبت کے جذبات پر میر اور درد سے کم عبور حاصل نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ ان کو فلسفہ و تصوف سے کوئی سروکار نہیں ہے، لیکن جہاں تک دُکھے ہوئے دل کا تعلق ہے قائم کسی سے کم نہیں ہیں۔" اس دور کی غزل گوئی میں سچ پوچھئے تو نہ منطق ہے نہ مابعد الطبیعات، نہ تصوف ہے نہ فلسفہ نہ مضمون آفرینی ہے اور نہ فکر و خیال کی بلند پروازی ــــ لیکن یہ سب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ سب کچھ ہے جو غزل میں ہونا چاہئے ــــ یعنی ــــ جذبات کی شدت اور انفعال، خیال کی معصومیت اور بے ساختگی زبان کی روانی، سادگی اور بے تکلفی ــــ اور ــــ سب سے زیادہ، عشق کی شوریدہ سری!

گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں!

حالانکہ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کا عشق اس منزل تک نہ پہونچ سکا کہ غمِ جاناں اُن کے لئے عیش جاوداں بن جاتا اور غمِ دوراں بھی ان کے لئے لذت کا ایک مستقل سامان ہوتا۔ وہ غمِ عیش اور غمِ ہستی پر چھا نہ سکے، اسی لئے ان کا دائرۂ عشق بھی محدود ہو کر رہ گیا اور زبان میں تلخی اور شورش کے بجائے وہ گداختگی اور شکستگی پیدا نہ ہو سکی جس کو ہم میر کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں

اس مجموعے میں "غزلیاتِ حالی" بھی فکر کے لئے ایک نیا میدان پیش کرتا ہے اور اس حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے کہ مجنوں کو فطرتاً غمِ روزگار سے زیادہ غمِ عشق عزیز ہے، قوم و ملک کا ماتم اُن کے لئے اتنا ذوق انگیز نہیں جتنا کسی عاشق کی چاک دامانی یا اس کی حرماں نصیبی! اُن کا مضمون "ریاض کی شاعری" نسبتاً ضعیف ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ مجنوں، ریاض کی شاعری کا یہ پیغام

خوش باش دمے کہ زندگانی اینست

ذرا مشکل ہی سے قبول کر سکتے ہیں۔ ریاض پر لکھنے کی تحریک خود مجنوں میں پیدا نہ ہوئی تھی بلکہ تحریک دلانے والے غالباً نیاز صاحب تھے۔

ان دو اہم تنقیدی مجموعوں کے علاوہ مجنوں کے قلم سے دو مختصر کتابیں اور بھی نکلی ہیں ــــ "افسانہ" اور "اقبال" "افسانہ" میں دو مقالات شامل ہیں، پہلا مقالہ، افسانہ اور اُس کی غایت پر ہے جو بہ سلسلہ "اُردو ہفتہ" اگست ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا، دوسرا مقالہ "اُردو افسانہ" ہے جو جنوری ۱۹۳۶ء میں اُردو لٹریری کانفرنس کے جلسے میں بمقام کلکتہ پڑھا گیا تھا۔ افسانہ کی تنقید مجنوں کے علاوہ چند دوسرے نقادوں نے بھی کی ہے جن میں اسوقت میرے ذہن

میں عبدالقادر سروری، اختر انصاری، وقار عظیم اور خواجہ احمد فاروقی کے نام آتے ہیں، لیکن مجنوں کے ان مقالات کی تاریخ اشاعت اور ان کے حجم کو دیکھ کر یہ کہنا غلطی نہیں ہے کہ مجنوں نے اس دور میں جب افسانے کی تنقید ہنوز جنم لے رہی تھی، اس اختصار اور حسن اسلوب کے ساتھ تمام چیزوں کو ہمارے پیشِ نظر کر دیا ہے کہ ہم غالباً اس سے بہتر کی امید نہ کر سکتے تھے۔

مقالۂ اول میں مجنوں نے افسانے کے معنی اور اس کی غایت تلاش کرنا چاہی ہے، پھر افسانے کے مختلف عناصرِ ترکیبی پلاٹ، افراد اور کردار نگاری، افسانہ نگار کے نقطۂ خیال اور اسلوب — سے بحث کی ہے۔ اس میں ہر جگہ مغربی اور مشرقی افسانہ نگاروں کی مثالیں اور اُن کی طرف بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ افسانہ کی غایت کا اصل راز، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں مجنوں کے نزدیک انسان کی تخئیل پرستی ہے۔ انسان کے اندر تخئیل اور واقعہ کی جنگ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ انسانی زندگی خارجی حالات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور دوسری طرف انسان کی تخئیل کا یہ عالم ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود توڑ کر ان پر غالب آ جانا چاہتی ہے — اس زمین و آسمان مستعار کو پھونک کر اس کی خاکستر سے ایک دوسرا جہان پیدا کرنے کی آرزومند رہتی ہے! انسان واقعیت کی سنگینی سے گھبرا کر تخئیل اور خواب میں پناہ لینا چاہتا ہے اور یہی افسانہ پورا کر دیتا ہے!

یہی جملے اگر ہم کسی دوسرے نقاد کی زبان سے سنتے تو اس میں زیادہ دلچسپی نہ پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جملوں کا کہنے والا خود بھی متعدد افسانے لکھ چکا ہے۔ افسانہ نگار اپنے افسانوں میں کہاں تک ایک خاص نقطۂ خیال کی اشاعت کر سکتا ہے، اُس کی تخلیق میں کہاں تک اُس کا غایتی میلان پوشیدہ ہوتا ہے اور افسانہ نگار میں آرٹسٹ کا خلوص (جس کو (Hudson) کے الفاظ میں The doctrine of fidelity کہنا چاہئے) کتنا اہم اور لازمی عنصر ہے — مجنوں ان سوالات کو اُٹھاتے ہیں اور ان کے متعلق اپنی رائے انتہائی سکون کے ساتھ ان الفاظ میں دیدیتے ہیں کہ:-

"ایک صناع کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی غایت اور اپنے نقطۂ خیال کو پردے میں رکھے اور اس کو محسوس نہ ہونے دے۔ بہ الفاظ دیگر اس غایت کو افسانے کے اجزاء کے ساتھ اس طرح گھلا ملا دے کہ وہ الگ سے کوئی چیز نہ معلوم ہو — ڈاسٹفسکی کے ہر افسانے کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ ہم کو ہر موقع پر ہمارے نفس اور ہماری روح کا کوئی نہ کوئی راز بتاتا رہتا ہے، اس کا ہر افسانہ ایک روحانی تحقیق ہے لیکن وہ شروع سے آخر تک افسانہ کو افسانہ رکھتا ہے۔ ٹولسٹائے میں یہ بات نہیں، اس کی کردار نگاری اور واقعیت مسلّم، لیکن اول تو وہ ان گہرائیوں میں نہیں جاتا جن کو ڈاسٹفسکی کی قلمرو کہنا چاہئے، دوسرے وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ وہ تہذیب و تمدن کا علمبردار ہے اور اس کا کام اخلاق و معاشرت کو سنبھالنا ہے۔ اس کا پیغام اس کے افسانوں کی افسانوی خصوصیات پر چھایا ہوا ہے۔ اُس نے اُس کے افسانوں کو گراں بنا دیا ہے۔"

اس میں شک نہیں افسانے کے عناصر ترکیبی پر مجنوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ وہی خیالات ہیں جو مغرب کے نقاد بار بار بیان کر چکے ہیں، مجھ کو اس کے اظہار میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ اگر صرف Hudson کی کتاب "مقدمۂ مطالعۂ ادبیات

کا وہ باب The Study of Fiction — An Introduction to the Study of Lit

جس میں اُس نے افسانے سے بحث کی ہے، دیکھ لیا جائے تو غالباً مجنوں کا مقالہ اس سے زیادہ کچھ اور نہ بتا سکے گا، لیکن مجنوں کے اس مقالے میں اتنی تازگی اور دلچسپی ہے کہ یہ افکار و خیالات مستعار ہوتے ہوئے بھی مستعار نہیں معلوم ہوتے، کیونکہ خیالات خود اُن کے فکر و احساس کا بھی نتیجہ ہیں، اور اس لئے جب وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو اس میں خود انکی شخصیت کی گرمی اور تازگی ملی ہوئی پائی جاتی ہے۔

دوسرا مقالہ "اُردو افسانہ" ہے اور اس میں اُردو کے افسانوی ادب کی قیمت کا اندازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہو مقالے کے پہلے حصے میں فسانہ منظوم سے بحث کی ہے اور دوسرے حصے میں فسانہ منثور سے۔ یہاں مجنوں نے صرف تنقیدی اشارے کئے ہیں۔ میں نے "تنقیدی اشارے" کی اصطلاح محض پروفیسر آل احمد سرور کی سُنّت پورا کرنے کے لئے استعمال نہیں کی ہے بلکہ حقیقت یہی ہے کہ جو کچھ بحث اس مقالے میں کی گئی ہے، اس کو تنقید کے بجائے تنقیدی اشارے کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔ سب سے پہلی بات جو اردو مثنویوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مجنوں نے مخصوص طور پر ملحوظ رکھی ہے، یہ ہے کہ اُنھوں نے ان مثنویوں کو انھیں قدروں پر پرکھنے کی کوشش کی ہے جو "افسانے" کی قدریں ہیں۔ اس لئے ہم کو یہاں مجنوں کی تنقید میں بعض باتیں نئی نظر آئیں گی۔ مثلاً میر و مومن کی مثنویوں پر ہر شاعر، ادیب اور نقاد کا بہترین رائے رکھنا تقریباً مسلم ہے، لیکن مجنوں کو میر و مومن کی مثنویوں میں داخلیت اور خارجیت کا صحیح توازن نہیں ملتا، اس لئے وہ ان کی افسانوی قیمت کے متعلق زیادہ غلو کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ نثری افسانوں کے متعلق بھی مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُن کی رائیں اکثر نپی تُلی ہیں۔

آخر میں، مجھ کو محض بر سبیل تذکرہ ان کی مختصر کتاب "اقبال" کا ذکر کرنا ہے جو بعض حیثیات سے چند "سخن گسترانہ" موضوعات کی طرف دعوت دیتی ہے۔ چونکہ ابھی حال ہی میں پروفیسر باقی اپنے مضمون "اقبال اور مجنوں" میں قارئین "نگار" کے سامنے اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں، اور نتیجہ کے اعتبار سے غالباً میں بھی کوئی نئی بات نہ کہہ سکوں گا، اس لئے فی الحال اس کتاب سے مفصل طور پر بحث نہیں کرتا۔ تاہم مختصراً اس قدر لکھنا ضروری ہے کہ اقبال کے شاعرانہ وزن و وقار اور پیامبرانہ شوکت و عظمت کے معترف ہوتے ہوئے بھی مجنوں، اقبال کے پیغام اور اس کے شعور و وجدان کی گہرائیوں تک پوری طرح نہ پہونچ سکے اور بجائے اس کے کہ وہ اقبال کو خود سمجھتے اور اپنے طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کرتے، اُنھوں نے اقبال کے افکار و خیالات میں خود اپنے میلانات و نظریات ڈھونڈنے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چند غلط فہمیوں کا شکار ہو کر رہ گئے۔

اس تنقیدی جائزے سے یہ بات دن کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ مجنوں ادیبانہ فکر و بصیرت اور ناقدانہ بالغ نظری کے پوری طرح حامل ہیں، ان کی تنقیدوں میں توازن اور آہنگ اور ادب کی جدلیاتی ماہیت کا شعور پوری طرح نمایاں رہتا ہے۔

ان کے مخصوص اندازِ فکر اور مخصوص اسلوبِ نگارش کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ایک خاص وزن، وقار، دلکشی اور اثرانگیزی ہوتی ہے۔ مجنوں کا نام ادب کی ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ہے جنھوں نے اُردو کی تہذیب و تحسین میں پوری طرح سعی و کاوش کی ہے اور اس دور میں بھی جب کہ ہم باہم متضاد نظریات سنتے سنتے بعض اوقات گھبرا سے جاتے ہیں، مجنوں نے ادب کی صحیح تخئیل پیش کی ہے، جس کو وہ اصطلاح میں ترقی پسند ادب کہتے ہیں۔

یہاں پہونچکر ایک اور سوال میرے ذہن میں آتا ہے اور وہ یہ کہ مجنوں افسانہ نگاری میں زیادہ کامیاب ہیں یا تنقید نگاری میں؟ — آئندہ زمانہ میں اُردو ادب کی تاریخ لکھنے والا اُن کو افسانہ نگار کہکر پکارے گا یا نقاد کہکر؟ — مجنوں کا اصل ادبی اکتساب کیا ہے؟ — اس باب میں رائے دینے والوں کے دو گروہ نظر آتے ہیں۔ پروفیسر فراق گورکھپوری اور پروفیسر اعجاز حسین کے علاوہ بھی بعض ادیبوں کے نام اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو مجنوں کی تنقید اُن کا "غیر فانی ادبی کارنامہ" خیال کرتے ہیں — لیکن ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے جو مجنوں کو افسانہ نگار پہلے مانتا ہے اور تنقید نگار بعد کو، جس کا اصرار ہے کہ مجنوں افسانہ لکھیں اور لکھتے رہیں، اس لئے کہ وہ اسی میدان کے لئے پیدا ہوئے ہیں اس سے پہلے کہ ہم خود اپنی کچھ رائے پیش کریں، مجنوں صاحب کا خیال سُن لیجئے، وہ پروفیسر فراق کی رائے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بحث یہ تھی کہ میرا اصل ادبی اکتساب کیا ہے؟ اس سے پہلے ایسوں کی تعداد بھی بہت کافی تھی، جو مجھ سے رہ رہ کر یہ فرمایش کرتے رہے تھے کہ میں سوا افسانوں کے کچھ نہ لکھوں، میرے متعلق رائے دینے والوں کے یہ دو گروہ ہوگئے ہیں، اُن کے درمیان تصفیہ کرنا میرا کام نہیں ہے۔ مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اگرچہ افسانہ لکھنا میری زندگی کا اولین مقصد نہیں تھا، تاہم مجھے اس قدر تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ جب میں تنقیدیں لکھتا ہوں تو ان کی تمامتر بنیاد مطالعے اور فکر و تخئیل پر ہوتی ہے برخلاف اس کے جب افسانے لکھتا ہوں تو اُن میں میرے مطالعے اور مشاہدے دونوں آجاتے ہیں، اور تجربات و تخیلات مل کر ایک تخئیلی کل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یعنی میرے افسانوں میں ادب اور زندگی دونوں عناصر شامل ہوتے ہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرے افسانے میری زیادہ مکمل نمایندگی کرتے ہیں۔" جیسا کہ اشارۃً مقالے کے ابتدائی حصے میں، میں کہہ آیا ہوں، مجنوں نے تنقید کی طرف اس لئے توجہ کی تھی کہ ادب میں جدید قسم کی تنقید کی کمی تھی گویا ادب کی ایک کمی کا احساس مجنوں کی تنقید نگاری کا محرک ہوا تھا، لیکن ان کے افسانے ان کی شخصیت، ان کے فکر و احساس، ان کے تجربات و مشاہدات کی پکار ہیں، ان کے افسانوں میں خود ان کی نبض رواں ہے، ان کا دل دھڑک رہا ہے، انکی شخصیت کی گرمی اور اُن کے خون کی تپش اگر محسوس کرنا ہے تو اُن کے افسانوں کا مطالعہ کیجئے۔

مجنوں کے یہ جملے یقیناً حوصلہ افزا ہیں کہ اُردو میں "جدید قسم کی تنقید کی بُری طرح کمی رہ جاتی ہے۔ اس احساس کے ماتحت میں نے اپنے تنقیدی مضامین لکھنا شروع کئے، خیال تھا کہ جب میں جی بھر کر تنقیدیں لکھ چکوں گا، تو تازہ دم ہو کر افسانہ نگاری کی طرف پھر متوجہ ہوں گا اور کچھ دوسرے عنوان کے افسانے لکھوں گا۔ مگر اب تک اسکی نوبت نہیں آسکی ہے۔

اور ابھی نہ جانے کب تک نہ آئے، ممکن ہے کبھی نہ آئے، پھر بھی ارادہ اور ہمہمہ ابھی باقی ہے، اگرچہ اب اس میں بھی زیادہ دم نہیں ہے" حالانکہ بقول فانی:

دعا گدائے اثر ہے گدا پہ تکیہ نہ کر　　کہ اعتبار اثر کیا ہوا ہوا نہ ہوا

پھر بھی دعا و آرزو کوئی گناہ نہیں ہے، اس لئے وہ لوگ جن کو مجنوں کی شخصیت اور شعور و وجدان سے دلچسپی ہے۔ ان کو چاہئے کہ وہ اس کی دعا اور آرزو کریں کہ مجنوں کے اس ارادہ اور ولولہ میں قوت و توانائی پیدا ہو ۔۔۔!

ہر چند خود اپنے لئے افسانہ نگار کی حیثیت سے آنے کو مجنوں "ناچار مسلمان شو" کے عنوان کی چیز سمجھتے ہیں، لیکن انکے اس اعتذار میں شاید ان کا شاعرانہ انداز بیان شامل ہے ۔۔۔ کیونکہ اس کا فیصلہ تو یقیناً مستقبل ہی کر سکے گا کہ ان کے اس "انداز مسلمانی" میں بھی کتنے "شیوہ ہائے کافری" پنہاں تھے ۔۔۔!

بہر حال میرا پیغام مجنوں صاحب کے نام صرف یہ ہے کہ:

اول از میخانہ بودی آخر از میخانہ باش!

خلش برنی

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے:۔

عدن، پورٹ سوڈان، جدّہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے۔

مال اور مسافروں کو بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے لکھئے:۔

ٹرنر مارلیسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

بنک اسٹریٹ کلکتہ

انشاء کی حیات۔ تصانیف اور کلام پر ایک نظر

مولد و منشاء حکیم میر انشاء اللہ خاں کے آباو اجداد قوم کے سید اور ان کا وطن نجف اشرف تھا۔ کسی تاریخ یا تذکرہ سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کے کونسے بزرگ کس زمانہ اور سلسلہ میں ہندوستان آئے تھے۔

صاحب "آب حیات" کے بیان کے مطابق انشاء کے والد حکیم میر ماشاء اللہ خاں مصدر تخلص دربار شاہی دہلی میں بموجب پیشۂ خاندانی شاہی طبیب تھے۔ جب دہلی کے دربار کی حالت دگرگوں ہوئی وہ مرشد آباد (بنگال) چلے گئے اور وہاں کے فرمارواؤں نے ان کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں کی۔[1]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میر ماشاء اللہ مختلف اوقات میں ہندوستان کے مختلف درباروں میں بہ سلسلۂ ملازمت موجود رہے ہیں۔ مولف گلشن سخن مردان علی خاں مبتلا، میر محمد جعفر کے عہد (۱۷۵۷ء-۱۷۶۱ء) میں غالباً مرشد آباد میں ان سے ملے تھے، خود مردان علی خاں کے الفاظ یہ ہیں:

"راقم حروف وی (انشاء) را در صغر سن ہنگام دولت نواب میر محمد جعفر خاں بہادر دیدہ بود و باوالد ایشاں آشنا بودم"[2]

ظاہر ہے اگر مرشد آباد میں ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو میر محمد جعفر کے عہد کا حوالہ نہ دیا جاتا۔

ایک تذکرہ نویس نے میر ماشاء اللہ خاں کو نواب شجاع الدولہ کا ملازم بھی تحریر کیا ہے۔

"میر ماشاء اللہ در طبابت دستگاہ وافی و طالبعلم منقح و خوش طبیعت اند و نوکر معتبر نواب شجاع الدولہ وزیر الممالک ہستند"[3]

جس تذکرہ کی یہ عبارت ہے اس کا سنہ تالیف ۱۱۷۸ھ ہے اس لئے ثابت ہے کہ اس زمانہ میں میر ماشاء اللہ فیض آباد میں موجود تھے۔

انشاء اللہ خاں کی تاریخ و مقام پیدائش مقام پیدائش کے متعلق تمام تذکرہ نویس متفق اللفظ ہو کر مرشد آباد بتاتے ہیں۔ لیکن کسی ہمعصر یا بعد کے تذکرہ نویس نے آج تک انشاء کی تاریخ پیدائش کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لئے صحیح سنہ پیدائش معلوم ہوتا نظر نہیں آتا۔ لیکن بعض قیاسات کی بنا پر ان کی پیدائش کے قریب کے زمانہ کا

---

[1] آب حیات صفحہ ۲۵۹ (ورق ۱۰۱ب)۔ [2] تذکرۂ گلشن سخن، قلمی تالیف ۱۱۹۴ھ از مردان علی خاں مبتلا کتاب خانہ سرکاری ریاست رامپور۔

[3] تذکرۃ الشعراء، از میر علاء الدولہ اشرف علی خاں (ورق ۳۶۲ الف) نسخہ قلمی کتاب خانہ سرکاری ریاست رامپور تصنیف ۱۱۷۸ھ

یقین ہوسکتا ہے۔ صاحبِ مجموعۂ نغز نے لکھا ہے :۔

"در ایام حکومت سراج الدولہ وغیرہ حکام بنگالہ ہیزدہ زنجیر فیل بہ فیل خانۂ میر ماشاء اللہ بود تولد میر انشاء اللہ خاں سلمہ الرحمٰن در ہماں آوان بہ مرشد آباد اتفاقی افتادہ"[1]

سراج الدولہ کا زمانہ ۱۷۵۶ء سے یکم ۱۷۵۷ء تک ہے۔ اس لئے انھیں سنین سے قبل یا بعد انشاء کی پیدائش ممکن ہوسکتی ہے۔

مردان علی خاں کے یہ الفاظ کہ :

"راقم حروف وی (انشاء) را در صغر سن ہنگام دولت نواب میر محمد جعفر خاں بہادر دیدہ بود"

اس امر پر دلیل ہے کہ میر جعفر ۱۷۵۷ء-۱۷۶۱ء کے عہد حکومت میں انشاء شیر خوار نہیں تھے۔ کیونکہ شیر خواری کے زمانہ میں اس عہد کے طریقۂ معاشرت کے مطابق شیر خوار بچوں کا مردانہ میں آنا جانا خلاف دستور تھا۔ اس کے علاوہ مردان علی الفاظ "صغر سن" کے بجائے الفاظ "شیر خوار" استعمال کرتے۔ عام طور پر شیر خواری کا زمانہ گزرنے کے بعد اور عہد بلوغت سے قبل بچوں کو صغر سن کہا جاتا ہے۔ اس لئے ان تمام باتوں پر غور کر کے خیال کیا جاتا ہے کہ انشاء کا سن اسوقت چار یا پانچ سال کا ہوگا اور اغلب خیال ہے کہ اُن کی ولادت ۱۷۵۶ء یا ۱۷۵۷ء میں واقع ہوئی ہوگی۔

تعلیم و تربیت تمام تذکرات اس پر متفق ہیں کہ انشاء کو مختلف علوم و فنون خاصکر آبائی پیشہ طبابت کی تعلیم بہت اچھی طرح دی گئی شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔

انشاء کا دہلی میں ورود امیر الامراء ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے عہد امارت (۱۱۸۵ھ تا ۱۱۹۶ھ) میں انشاء کے والد نے جب دہلی کو مراجعت کی تو انشاء بھی ان کے ہمراہ آئے۔[2]

اس وقت شاہ عالم ثانی المتخلص بہ آفتاب کا دور حکومت تھا چونکہ خود بھی شاعر اور شاعروں کے قدرداں تھے اس لئے انشاء دربار میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے اور اپنے لطایف و ظرائف کی وجہ سے شاہ عالم کے مزاج میں اس قدر در خور حاصل کیا کہ انھیں بغیر ان کے ایک پل گوارا نہیں ہوتا تھا۔

انشاء پر شعرائے دہلی کی یورش پرانا مقولہ ہے "شود ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن" لیکن شعراء اس ضمن میں سب سے آگے ہیں۔ ایک دوسرے پر طعن و تشنیع طنز کرنے سے یہ ہرگز باز نہیں آتے اور رشک و رقابت کی آگ اس وقت اور بھی تیز ہوجاتی ہے جب یہ کسی نوجوان شاعر کو آگے بڑھتے دیکھتے ہیں۔ انشاء نے صرف شاہ وقت کے دل پر اپنی شاعری اور قابلیت کا سکہ نہیں بٹھایا بلکہ مشاعروں میں متواتر شرکت اور مسلسل کامیابی کی وجہ سے خواص و عوام دونوں میں

---

[1] مجموعۂ نغز ص۸۰ — [2] مجموعۂ نغز مطبوعہ جلد اول ص۸۰

مقبول ہو رہے تھے۔ یہ چیز کہنہ مشق شاعروں کو سخت ناگوار ہوئی۔ دہلی میں اس وقت حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ اور حکیم قدرت اللہ قاسمؔ شاگردان سوداؔ جیسے اساتذہ موجود تھے۔ ان میں عظیم بیگ بذات خود کچھ نہ تھے لیکن سوداؔ کا شاگرد ہونے کی وجہ سے اپنے کو بہت کچھ سمجھتے تھے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے گہرے دوست قدرت اللہ قاسمؔ نے انکے بارے میں لکھا ہے:

"خیالِ شاعری در کاخِ دماغش چناں پیچیدہ کہ خود را صاحب ہندی زباں می پنداشت و شعر ہیچ متنفسے در میزان طبعش از خودسری وزنے نہ داشت"[1]

مرزا عظیم بیگ سے انشاء کا معرکہ اور مرزا کی شکست

لکھنؤ کے ایک نواب زادہ امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ عرف مرزا مینڈھو المتخلص بہ آمیرؔ خلف نواب شجاع الدولہ اس وقت دہلی میں رہتے تھے اور اپنے یہاں مشاعرے منعقد کرایا کرتے تھے۔ دہلی کے بیشتر شعراء اس میں شرکت کرتے تھے۔ کچھ ہی عرصہ میں یہاں بھی انشاءؔ کا طوطی بولنے لگا۔ اس لئے تمام شعراء اپنی جو غزلیں مشاعرے میں پڑھنے لاتے اس میں درپردہ انشاءؔ پر چوٹ اور اپنے متعلق تعلّی سے کام لیتے تھے۔ مرزا عظیم بیگ اس خصوص میں سب سے پیش پیش تھے اور انشاءؔ کے کسی شعر پر سر تک نہیں ہلاتے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق ایسا ہوا کہ مرزا عظیم بیگ ایک روز انشاءؔ کے والد میر ماشاء اللہ سے ملاقات کرنے گئے۔ وہاں ایک غزل سنائی جو بحرِ رجز میں تھی مگر ناواقفیت یا بے پروائی کی وجہ سے چند اشعار بحرِ رمل میں جا پڑے تھے انشاءؔ بھی موجود تھے، فوراً تاڑ گئے۔ لیکن خاموش رہے بلکہ غزل کی حد سے زیادہ تعریف کی اور مرزا سے اصرار کیا کہ وہ اس کو مشاعرے میں ضرور پڑھیں۔ مرزا عظیم خوشی سے پھولے نہ سمائے اور مرزا مینڈھو کے ہاں مشاعرہ میں جاکر حسب عادت غزل سنائی انشاءؔ نے فوراً برسرِ مشاعرہ تقطیع کی فرمایش کردی۔ اس وقت عظیم پر اور ان کے جملہ رفیقوں یعنی سارے اساتذۂ شعرائے دہلی پر جو کچھ گزری ہوگی اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ انشاءؔ نے موقع غنیمت سمجھا اور اپنا وہ مخمس پڑھا جو خاص اسی موقع کے لئے پہلے سے لکھ کر لائے تھے پہلا بند یہ ہے:

گر تو مشاعرہ میں صبا آج کل چلے، کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

غرض اس روز کا میدان انشاءؔ کے ہاتھ رہا۔ مگر عظیم بھی چپ بیٹھنے والے نہیں تھے۔ اگلے مشاعرہ میں اسی طرح میں اپنی لیاقت کے مطابق ایک مخمس لکھ کر لائے اور مشاعرہ میں پڑھا لیکن "مشتے بعد از جنگ" والا مضمون صادق آیا۔ عظیم کے اس مخمس کا ایک شعر ہمارے ہاں ضرب المثل ہوگیا ہے اس لئے وہ بند لکھے دیتا ہوں جس میں یہ شعر آیا ہے:

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق تبدیل بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق شہ زور اپنی زور ہی میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

---

[1] مجموعۂ نغز جلد دوم ص۲

اس معرکے کے بعد بزم مشاعرہ کھلم کھلا انشاء اور عظیم بیگ اور ان کے دوستوں کے درمیان میدانِ جنگ ہوگیا تھا۔ ایک بار انشاء ایک فخریہ غزل لکھکر لائے جس میں اپنے کو "بحرِ بیکراں" اور دوسروں کو "سیلِ بیاباں" قرار دیا اور اپنے عربی اشعار کو "الم ترکیف" سے اور دشمنوں کے اشعار کو مسلیمہ کذاب کے "الفیل ما الفیل" سے تشبیہ دی۔ دوران غزل میں میر مشاعرہ نواب مرزا مینڈھو اور دیگر حضرات بار بار انشاء کو اس غزل کے پڑھنے سے اشاروں کے ذریعہ روکتے تھے لیکن "بحر بیکراں" کو قید و بند سے کیا سروکار۔ غزل تمام کرنے کے بعد انشاء بولے کہ یہ فخر شاعرانہ ہے روئے سخن کسی جانب نہ تھا۔ قصہ مختصر جب شمع گھومتے گھامتے عظیم بیگ کے دلی دوست سید قدرت اللہ قاسم کے سامنے آئی تو انھوں نے انشاء سے کہا۔ سید صاحب! آپ نے اپنے بھائی بندوں کو مسلیمہ کذاب بنایا ہے بہت خوب اب ذرا ہمارا "الفیل ما الفیل" بھی کان دھر کر سنئے۔

میر مشاعرہ مرزا مینڈھو کو خیال ہوا کہ انشاء کی رکیک ہجو کہی گئی ہوگی مبادا فساد بڑھے اس لئے فوراً اُٹھے اور دوسرے معقول حضرات کو ساتھ لیکر انشاء اور قاسم کو گلے لگا دیا اور کہا آیندہ کے لئے یہ جھگڑے ختم کیجئے۔ انشاء بھی سید حکیم قدرت اللہ قاسم سے لپٹ گئے اور کہا حکیم صاحب آپ میرے بنی عم ہونے کے علاوہ صاحب علم و فضل ہیں۔ میں بھلا آپ پر طنز کروں گا، البتہ مرزا عظیم بیگ سے ضرور شکایت ہے کہ یہ بے وجہ بد دماغی کرتے ہیں اور میری ساری بدعنوانیوں کے بانی مرزا موصوف ہی ہیں۔ القصہ سب کی صلح صفائی ہوگئی۔ البتہ مرزا عظیم بیگ خو سے مجبور تھے، اس لئے صلح صفائی ہوجانے کے باوجود ارشاد فرمایا کہ بابا میں نے اپنے بارہ میں ابھی اُستاد کے ایک شعر کو تظمین کیا ہے اور وہ یہ ہے:

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا
طرف ہر اک سے ہو بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا
کئی سخن باز گھنڈ گویوں میں ہو نہ ہو اعتبار اپنا
جنھوں کی نظروں میں ہم سبک تھے دیا انھیں کو وقار اپنا
عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالے سے بار اپنا[1]

انشاء دہلی کو خیرباد کہتے ہیں

اگرچہ اس واقعہ کے بعد قدرتاً انشاء کو مخالفین کی جانب سے جو تکلیف پہونچتی رہتی تھی اس کا سدباب ہوگیا بلکہ ایک حد تک ان کی شاعری اور تبحر علمی کا بھی سکہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا لیکن اب ان کا دل دلی سے اُچاٹ ہوچکا تھا۔ وجہ اس کی بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ دلی کا لٹا پٹا دربار اور خالی خزانہ انشاء جیسے باکمال کی قدردانی سیم و زر سے نہیں کرسکا اس لئے انشاء کی نظریں لکھنؤ پر جمیں جہاں اس وقت دولت کی گنگا بہہ رہی تھی اور نواب آصف الدولہ کی دریا دلی اور اہل کمال کی قدردانی کا شہرہ دور دور پہونچ چکا تھا۔

انشاء کا لکھنؤ میں ورود

عجیب اتفاق ہے جس طرح لکھنؤ کے ایک نواب زادہ جن کا ذکر اوپر ہوچکا) کی بارگاہ دلی میں شعراء اور اہل کمال کے لئے ملجیٰ و ماویٰ بنی ہوئی تھی۔ اسی طرح اس وقت دلی کا ایک

---

[1] مذکورہ واقعات کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ "مجموعۂ نغز" مطبوعہ لاہور صفحات ۸۲ لغایۃ ۸۶ جلد اول۔

شاہزادہ لکھنؤ میں شاعروں اور اہل کمال کی امیدوں کا قبلہ بنا ہوا تھا۔ یعنی مرزا سلیمان شکوہ المتخلص بہ سلیمان جو غلام قادر کے قبضۂ قلعۂ دہلی کے بعد دہلی کو خیرباد کہکر ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ پہونچے اور آصف الدولہ کے فدویانہ اور نازبردارانہ سلوک کی وجہ سے لکھنؤ ہی کے ہو رہے۔[1]

چنانچہ انشاؔء نے لکھنؤ آتے ہی شہزادہ موصوف ہی کی بارگاہ کا رُخ کیا۔ شہزادہ نے نکوار قدیم شاعر اور باکمال ہونے کی وجہ سے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ کچھ عرصہ بعد غلام ہمدانی مصحفی اور شیخ قلندر بخش جرأت بھی شاہزادہ کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہوئے۔[2]

انشاؔء اور مصحفی کا معرکہ

مصحفی کے دربار میں آتے ہی ان کی کبر سنی اور شہرت کی وجہ سے مرزا سلیمان شکوہ نے ان کو اپنا اُستاد بنالیا۔ ممکن ہے یہ چیز بھی انشاؔء کو ناگوار خاطر ہوئی ہو۔ لیکن اس کے علاوہ مصحفی میں دیگر شعراء سے زیادہ تعلّی اور خودستائی کا مادہ تھا اور درپردہ ہمعصر شعراء پر چوٹیں بھی کر جاتے تھے۔

ادھر مصحفی کی یہ کیفیت اُدھر انشاؔء دہلی میں اچھے اچھے اُستادوں کو زک دے کر آئے تھے، اس لئے ان دونوں میں مقابلہ ناگزیر ہوگیا چنانچہ دونوں کے دواوین میں بہت سی ایسی غزلیں ملتی ہیں جو ایک دوسرے کے جواب میں کہی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

غرض یہ ہے کہ آپس میں چوٹیں ہوتی رہیں۔ انشاؔء، مصحفی کے کلام پر اعتراض کرتے رہے اور مصحفی، انشاؔء کے۔ اس جنگ کا نتیجہ مصحفی کے حق میں مالی اعتبار سے نقصان رساں ثابت ہوا کیونکہ انشاؔء جو اعتراضات مصحفی پر وارد کرتے تھے غالبًا صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ بھی ان اعتراضات کو صحیح اور درست سمجھتے تھے اس لئے مصحفی کی قابلیت کا جو سکّہ ان پر جما ہوا تھا وہ جاتا رہا۔ اور بیچارہ مصحفی کی تنخواہ پچیس سے گھٹا کر پانچ کر دی جس کا شکوہ مصحفی نے مندرجۂ ذیل اشعار میں کیا ہے:

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے — ہم بھی کبھی روزوں میں تھے پچیس کے لایق
اُستاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر — ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لایق

---

[1] مرزا سلیمان شکوہ خود بھی شاعر اور بقدر استطاعت شعراء کے قدرداں بھی تھے۔ ہر مہینے اپنے ہاں لکھنؤ میں مجلس مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ جب تک دلی میں رہے شاہ حاتم کو اپنا کلام دکھلاتے رہے۔ لکھنؤ آکر ولی اللہ المتخلص بہ محب سے کلام پر اس وقت تک اصلاح لیتے رہے جب تک محب زندہ رہے ۱۲۰۷ھ میں محب کے انتقال کے بعد مصحفی کو شرف اُستادی حاصل ہوا اور مصحفی سے تعلقات خراب ہوجانے کے بعد انشاؔء کی شاگردی اختیار فرمائی۔

[2] اس جگہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے وہ یہ کہ صاحب "آب حیات" کا یہ بیان کہ مصحفی مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں انشاؔء سے پہلے پہونچے خلافِ واقعہ ہے۔ برخلاف اس کے انشاؔء دربار میں مصحفی سے پہلے موجود تھے اور انشاؔء نے خود مصحفی کو شہزادہ کے دربار میں پیش کیا تھا جیساکہ خود مصحفی نے اپنے تذکرہ "ہندی گویاں" میں لکھا ہے:۔ "ایں فقیر حقیر ہم چوں نسبت دیگراں باوصف گوشہ نشینی دریں کار زیادہ رسوائی داشت بگفتۂ میر انشاء اللہ خاں حسب الطلب حضور باوصف کم و شکستہ حالی شریک مجلس یاراں شدہ بود" تذکرہ "ہندی گویاں" مطبوعہ انجمن ص ۱۲۱

[3] تذکرہ ہندی گویاں ص ۱۲۱ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو۔

اس شکست کے بعد مصحفی ان کے ہوا خواہوں کو انشاء سے جو رنج تھا وہ اور بھی بڑھ گیا۔ مصحفی کے شاگردوں نے انشاء کی بڑی رکیک ہجویں کہیں اور ایک مثنوی "گرم طمانچہ" نامی لکھی۔ اس کے علاوہ ایک فریق دوسرے فریق کی ہجویں کہتا اور جلوس کی شکل میں بازاروں میں گشت کرتا۔ غرضکہ لکھنؤ کا امن و سکون ان دنوں شعراء کی آویزش سے درہم برہم ہو گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کوتوال شہر نے مصحفی اور ان کے ہوا خواہوں کا جلوس جو انشاء کے ہجویات برسر بازار پڑھتے نکلا تھا، روکدیا۔ صاحب "آب حیات" کے بیان کے مطابق اس ممانعت میں مرزا سلیمان شکوہ اور دیگر امرائے لکھنؤ کا ہاتھ تھا، جن کو انشاء بہت عزیز تھے۔ چنانچہ اس کا مصحفی کو بہت قلق ہوا اور خفا ہو کر شہزادہ کا دربار چھوڑ دیا، جیساکہ مندرجۂ ذیل شعر سے ظاہر ہے:

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں، کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں

دربار چھوڑنے سے پہلے مصحفی نے شہزادہ کی خدمت میں ایک قصیدہ "درمعذرتِ اتہام انشاء" بھی پیش کیا جس میں معذرت سے زیادہ دھمکیوں سے ڈرایا گیا ہے۔

چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قصہ — گیا ہو از پئے تنبیہ شاعرانِ شریر
تو کوتوال ہی اب ان سے بس سمجھ لے گا — یہ دمبدم کی شکایت کی ہے عبث تحریر
کیا میں فرض کہ میں آپ اس سے درگزرا — پھر یگا مجھ سے کوئی گرم و منتظر[1] کا ضمیر
ہزار شہدوں میں بیٹھیں ہزار جا پہ ملیں — پھریں ہمیشہ لئے جمع ساتھ اپنے کثیر
نہ مانیں تیغِ سیاست نہ قہرِ سلطانی، — نہ سمجھیں قتل کا وعدہ نہ ضربتِ شمشیر
مزاج شاہ ہو یوں منحرف تو مجھ کو بھی — یہ چاہئے کہ کروں شکوہ اس کا پیشِ وزیر

چنانچہ مصحفی نے شکوہ پیشِ وزیر کیا۔ نواب آصف الدولہ کی شان میں ایک طویل قصیدہ لکھا اور قصیدہ کے ساتھ ایک مخمس بھی شامل کیا جس کے چند بند نقل کئے جاتے ہیں:-

اول تو مدح گوئے پیمبر ہے مصحفی، — پھر نغمہ سنجِ مدحتِ حیدر ہے مصحفی
مسکیں فقیر ہے نہ توانگر ہے مصحفی، — ملک سخن کا صاحبِ افسر ہے مصحفی
سب جانتے ہیں اسکو کہ بے شر ہے مصحفی

ہے جائے عدل آصفِ دوراں تری جناب — رکھتا ہے عرض تجھ سے یہ مداحِ بوتراب
پہونچے یہ اپنی داد کو اور ہوئے کامیاب — تاسب کہیں کہ "ناجی" ہے یہ بات بیحساب
ناجی نہیں کسی کا ثنا گر ہے مصحفی،

---

[1] گرم و منتظر یہ دونوں مصحفی کے خاص شاگرد تھے۔ انشاء کے پیچھے پڑ گئے تھے مثنوی "گرم طمانچہ" انھیں نے لکھی تھی۔

آیا تھا لکھنؤ کو سمجھ کر یہ جائے امن — گوشہ میں پا شکستہ پڑا تھا برائے امن
اخبار میں لکھا ہی کیا ماجرائے امن — بگڑی نظر پڑے ہے اب اسکو ہوائے امن
جو حکم ہو سو کہئے کہ مضطر ہے مصحفی

ایسی ہی بدعتیں ہوئیں گر شہر میں عیاں — اہل کمال کا ہے کو رہنے لگا یہاں
کیا وا کرے گا شعر و سخن میں کوئی زباں — ہوئینگی شاعروں کی یہ رسوائیاں جہاں
اس ماجرے سے سخت مکدر ہے مصحفی

اس کا نہ کوئی یار نہ یاور ہے اس جگہ — نے خویش و اقربا نہ برادر ہے اس جگہ
پر کیا کرے جو حادثہ اُس پر ہے اس جگہ — ہر سو اسی کی ہجو کا دفتر ہے اس جگہ
ناحق مغلظات کا مصدر ہے مصحفی

اس مخمس کا نتیجہ مصحفی کے حسب دلخواہ ہوا کیونکہ نواب آصف الدولہ نے انشاؔ کو لکھنؤ بدر کرنے کا حکم صادر کیا[1] اور انشاء لکھنؤ چھوڑ کر عازم حیدر آباد ہوئے۔ انشاؔ حیدر آباد پہونچنے بھی نہ پائے تھے کہ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ میں نواب آصف الدولہ رحلت کر گئے اور انشاؔ چند ماہ باہر رہنے کے بعد لکھنؤ واپس آکر پھر مرزا سلیمان شکوہ کی مجلس میں شامل ہو گئے[2]۔

مرزا وزیر علی خاں کے شش ماہہ دور حکومت کے بعد جب نواب سعادت علی خاں ۳؍ شعبان ۱۲۱۲ھ کو مسند آرائے سریر اودھ ہوئے تو ان کی تہنیت جلوس کے قصیدے مصحفی اور انشاؔ دونوں نے لکھے۔

نواب سعادت علی خاں کے دربار میں انشاء کی باریابی

اس امر کا پتہ ٹھیک نہیں چلتا کہ انشاؔ کس سنہ میں نواب سعادت علی خاں کے دربار میں باریاب ہوئے۔ البتہ اس امر کی سند ہمارے پاس ہے کہ ۱۲۱۵ھ تک انشاؔ مرزا سلیمان شکوہ ہی کی بارگاہ سے وابستہ رہے جیسا کہ انشاؔ کے بارے میں ایک ہمعصر تذکرہ کی عبارت سے ظاہر ہے:-

"بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ میں مرشد زادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے سایۂ عاطفت میں اوقات ساتھ قناعت اور شکستہ بالی کے بسر کرتے ہیں"[3]

قصہ مختصر تفضل حسین خاں علامہ کی سفارش سے سید انشاؔ، نواب وزیر کے دربار میں باریاب ہوئے کچھ ہی عرصہ میں نواب کے مزاج میں اس قدر دخل حاصل کر لیا کہ نواب کو ان کی ایک پل کی جدائی بھی ناگوار ہونے لگی۔ چنانچہ نواب پر اس قدر

---

[1] تذکرہ خازن الشعراء مولفہ سید نجات الہ آبادی بوساطت "حیات مصحفی" از امیر احمد علوی صاحب -- [2] "حیات مصحفی" از امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے۔ [3] "تذکرہ گلشن ہند" از مرزا لطف بوساطت "حیات مصحفی"

حاوی تھے کہ جو چاہتے نواب سے کرا لیتے۔ ۱۲۲۵ھ تک نواب سے تعلقات خوشگوار رہے لیکن اس کے بعد معتوب ہوگئے۔ اور نواب نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سوائے دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں بلکہ دربار میں بھی بغیر طلب حاضری کا ارادہ نہ کریں۔ انشاء نے اسی تکلیف کو مندرجۂ ذیل شعر میں بیان کیا ہے:-

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا
چناں کنم حرکت نوکری است یا بازی[1]

اس عالم میں ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں وفات پائی۔ میرے حساب سے انشاء کی پیدائش ۱۷۵۸ء کے آس پاس ہے۔ اس حساب سے انھوں نے کم وبیش ساٹھ سال کی عمر پائی۔ بسنت سنگھ نشاط نے مندرجۂ ذیل تاریخ کہی:-

خبر انتقال میر انشا　　دل غدیدہ تا نشاط شنفت
سالِ تاریخ او زجانِ اجل　　عُرفی وقت بود انشاء گفت

مصحفی زندہ تھے انھیں بھی انشاء کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ کہتے ہیں:-

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگِ قتیل و مُردنِ انشاء مجھے

اولاد۔ ایک بیٹے تعالی اللہ خاں نامی کا پتہ چلتا ہے جو ایام جوانی ہی میں باپ کو داغ مفارقت دے گیا۔ اس کے علاوہ دوسری اولاد کا ذکر کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزرا۔

رحمت نبی خاں ایم۔ اے

---

[1] صاحب "آبِ حیات" نے انشاء کے آخری ایام کے متعلق جو لکھا ہے وہ پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچتا۔ "حیات دبیر" کے مصنف نے انشاء کے نواسے مرزا اوج کی روایت نقل کی ہے کہ انشاء نہ مجنون ہوئے اور نہ ان کی تنخواہ ہی بند ہوئی۔ صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ دربار کے علاوہ اور کہیں آیا جایا نہ کریں اور دربار میں بھی اسوقت آئیں جب طلب کئے جائیں۔

مذاہب کی قدامت پرست دنیا میں ہلچل ڈال دینے والا
درسِ انسانیت و اخوت عامہ کا پہلا اور آخری صحیفہ

من ویزداں

(اڈیٹر نگار کے قلم سے)

جس میں مذاہب کی تاریخ، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، کتب آسمانی کی حقیقت اور عقاید دینی کی اصلیت پر نہایت بلند انشا اور خطیبانہ انداز میں علمی، تاریخی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے بحث کیگئی ہے۔ کاغذ، طباعت و کتابت بہت نفیس، حجم ۶۴۴ صفحات۔ قیمت مجلد سات روپے آٹھ آنہ علاوہ محصول

فارسی ادب پر ایک تاریخی نظر

اس مضمون میں فارسی ادب سے ایران کے عہد وسطیٰ کا وہ ادب مراد نہیں جسے "پہلوی ادب" کہتے ہیں بلکہ وہ ادب مراد ہے جو عربوں کے حملۂ ایران کے بعد سے اِس وقت تک کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، اس فارسی ادب کی ابتدائی صورت کیا تھی، اس کا پتہ چلانا مشکل ہے اور ہرچند اس کے متعلق کچھ روایات پائی جاتی ہیں، لیکن ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

عربوں کے حملہ کے بعد کئی صدی تک ایران کی ادبی تاریخ، پہلوی ادب کے تدریجی انحطاط کے سوا کچھ نہ تھی اور عرب فاتحین کی زبان کا اثر یہاں اتنا قوی ہو گیا تھا کہ بہت سے فارسی شعرا و ادباء انھیں کی زبان میں شاعری کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ثعلبی کی تصنیف یتیمۃ الدہر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نویں صدی ہجری میں خراسان اور ماوراء النہر کے اعلیٰ طبقوں کی ادبی زبان عربی ہی تھی۔ لیکن چونکہ خلافت کی حکومت اب کمزور ہو گئی تھی اس لئے فارس کے فرمانروا عربی کے اقتدار کی زنجیر اپنے پاؤں سے جدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اسی کے ساتھ یہ کوشش بھی شروع ہو گئی تھی کہ فارسی لٹریچر کو عربی اثرات سے پاک کیا جائے۔ پہلوی مردہ زبان ہو چکی تھی، اس لئے عربی کے مقابلہ میں اب فارسی ہی آ سکتی تھی، لیکن ڈیڑھ سو سال تک عربی اقتدار کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے یہ مقابلہ آسان نہ تھا اور ساسانی دور کی فارسی شاعری کی ٹکنک کا دوبارہ زندہ ہونا ناممکن سا ہو گیا تھا اس لئے فارسی شاعری نے عربی سے علٰحدہ اپنی جگہ تو پیدا کی لیکن عربی کی اُن عروضی پابندیوں سے جدا نہ ہو سکی جو فارسی میں رائج ہو گئی تھیں، تاہم عربی فارسی ملی جلی شاعری ضرور پیدا ہو گئی۔

اس قسم کی شاعری کی مثال میں عباس مَروزی کا وہ قصیدہ پیش کیا جاتا ہے جو بمقام مرو، ۸۰۹ء میں اس نے مامون الرشید کی مدح میں لکھا تھا اور جسے فارسی زبان کی قدیم ترین نظم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسدی کی "لغات فُرس" سے چند اور قدیم فارسی شاعروں کا پتہ چلتا ہے جن میں ابوحفص سُغدی، حنظلہ بادغیسی، محمود وراق ہروی، فیروز مشرقی، اور ابو سالک گورگانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء کے کلام کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے، اس سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی میں فارسی شاعری کی بنیاد پڑ گئی تھی، لیکن اس کا صحیح تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ایک صدی تک فارسی شاعری نے ترقی تو کی لیکن بہت کم۔ البتہ دسویں صدی کے ابتداء میں دفعتہً اس کی حالت بالکل بدل گئی اور فنی حیثیت سے اس میں بڑی تکمیل پیدا ہو گئی۔

آٹھویں صدی کے بعد کے بعد حالت یہ تھی کہ مختلف امراء کے دربار شاعری کا مرکز بنے ہوئے تھے، شعراء ان درباروں

کو گھیرے ہوئے تھے اور اپنے سرپرست و محسن امراء کے ذوق کو سامنے رکھ کر زیادہ تر اُن کو خوش کرنے کے لئے شعر کہتے تھے۔

اس وقت کی درباری شاعری میں ہر چند غنائی شاعری کے ساتھ ساتھ رزمیہ و متصوفانہ شاعری بھی پیدا ہوگئی تھی لیکن ان سب کا انداز تمام امراء کے درباروں میں ایک ہی سا تھا۔

غنائی شاعری سب سے پہلے ہمیں طاہریوں اور صفاریوں کے عہد کی شاعری میں درباری رنگ کا پتہ چلتا ہے جس کی تکمیل سامانیوں کے دربار میں ہوئی۔ ان کا زمانہ اخیر نویں صدی سے دسویں صدی کے اختتام تک سمجھنا چاہئے۔ ان کا پایۂ تخت بخارا تھا۔

اس وقت سامانی دربار میں بڑے بڑے نامور شعراء کا ہجوم تھا جن کی شاعری کے صرف دو موضوع تھے، ایک طرف امیر و فرمانروا کی مدح میں قصیدہ خوانی اور دوسری طرف رقیب شعراء کی ہجوگوئی۔ ان شعراء میں سب سے بلند مرتبہ کا شاعر رودکی (سمرقندی) تھا اور اس کا قصیدہ "مادر مے" بڑے معرکہ کی چیز ہے۔ فارسی کا یہی پہلا شاعر ہے جس نے ایک خاص اسلوب پیدا کیا اور دوسرے شعراء نے اسی کی تقلید کی۔ یہ فطرتاً بڑا رنگین مزاج، خوش باش اور آزاد طبع شاعر تھا اور زندگی کا مسرور و خوشگوار پہلو ہی ہمیشہ اس کے سامنے رہتا تھا، لیکن کلیلہ دمنہ کا ترجمہ کرکے (جو نایاب ہے) اسنے فارسی شاعری میں ناصحانہ انداز کی بھی بنیاد ڈالی اور ایک نئی چیز اور پیش کی جسے "ماتم جوانی" یا مرثیۂ شباب کہنا چاہئے۔ اس سے قبل، اس رنگ کے اشعار فارسی میں کسی نے نہیں کہے تھے۔

اسی کا ہمعصر لیکن کمسن شاعر کسائی تھا۔ اس نے بھی رودکی کی تقلید میں شباب کی سوگواری کا بیان کیا جسے واقعی آپ بیتی کہنا چاہئے، چونکہ دربار میں وہی شاعر زیادہ مقبول ہوتا ہے جو امیر کو خوش رکھنے کے لئے کھلنڈرے پن کی باتیں کرتا رہے، اس لئے کسائی کی زیادہ قدر نہ ہوئی۔ اس رنگ کا ایک اور شاعر شہید بلخی تھا (جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اسی نے اپنے مجموعۂ کلام کو دیوان کی شکل میں ترتیب دیا) اس کی شاعری کا موضوع زیادہ تر شکایت زمانہ تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دربار کا کوئی کامیاب شاعر نہ تھا۔ ان کے علاوہ اس عہد کے دوسرے درجہ کے شاعروں میں معروف بلخی، ابوشعیب ہروی، ابوزرّاعہ جرجانی، ابوطاہر خسروانی، جوئباری، امیر آغاجی، رونقی، معنوی، ابوالفتح بستی اور عمارہ مروزی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

سامانیوں کے زوال کے بعد سلطان محمود اور اس کے جانشینوں کے دربار (غزنا) میں شاعروں کا مرکز بنا۔ اس عہد کے دبستان شاعری کا ئوسس، عنصری بلخی تھا۔ اس نے قصاید کا رنگ بہت کچھ بدل دیا، کیونکہ اس سے قبل تو صرف بادشاہ یا امیر کی شاعرانہ تعریف ہوا کرتی تھی اور زیادہ تر مبالغہ ہی مبالغہ ہوتا تھا، لیکن عنصری نے نقشہ موشگافیاں کرکے ثابت کیا کہ تخت فارس کا مالک محمود کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس کے قصاید ایک لحاظ سے تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں، کیونکہ ان میں اس نے محمود کے غزوات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر عنصری ایسا نہ کرتا تو شاید وہ کوئی جگہ دربار میں حاصل

نہ کرسکتا، کیونکہ محمود ایک خشک مذہبی انسان تھا اور محض شاعرانہ حسن بیان سے اس کے ذوق کی تسکین نہ ہوسکتی تھی۔

اس زمانہ کے دو شاعر اور بھی قابل ذکر ہیں جو امیر نصر کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، ان میں ایک منوچہری مغانی تھا اور دوسرا فرخی سیستانی ــــــ ان دونوں نے قصیدہ گوئی میں ایک نیا رنگ منظر نگاری کا شامل کیا، جو بہ لحاظ تخیل و مصوری بہت عجیب تھا۔ فرخی، جس کو فارسی کا متنبی کہتے ہیں، بڑا ذہین شخص تھا اور اس نے علاوہ مناظر فطرت پیش کرنے کے قصاید کی تشبیب میں مناظرہ کے انداز کو رائج کیا، فنی حیثیت سے اس کا مرتبہ بہت بلند تھا، جس کے ثبوت میں اسکی کتاب "ترجمان البلاغہ" پیش کی جاسکتی ہے۔

سلطان محمود کے جانشینوں میں اگرچہ سلطنت کرنے کی صلاحیت زیادہ نہ تھی، لیکن شاعروں کی عزت انھوں نے بھی کافی کی۔ اس زمانہ کے شاعروں میں ابوالفرج رونی اور اسکے شاگرد مسعود سعد سلمانی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ سلمان چونکہ عرصہ تک مقید رہا اس لئے اس نے اسی حالت قید و بند میں بہت سے قصیدے لکھے جن میں اس نے اپنی شومی قسمت کا گلہ کیا ہے، ان قصاید کو "حبسیات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک اور شاعر عثمان مختاری بھی قابل ذکر ہے جس کی نظموں سے اُس وقت کے علمی معیار کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس زمانہ میں علاوہ غزنوی حکومت کے اور دوسرے خاندان بھی مختلف مقامات میں حکمراں تھے اور ان کے درباروں میں بھی شاعروں کی کمی نہ تھی۔ دربار بویہ میں ایک شاعر کمال الدین بندار (ساکن رے) تھا جس نے علاوہ فارسی کے رے کے مروجہ زبان میں بھی شاعری کی۔ ایک اور شاعر قطران جبلی تھا، جو ہر چند ملازم تھا دربار آذربیجان کا، لیکن بویہ فرمانرواؤں کا بھی قصیدہ گو تھا، عرصہ تک لوگ اس کے کلام کو رودکی کا کلام سمجھتے رہے۔

ترکوں کے الک خانی دربار میں بھی فارسی شاعری کی کافی قدر کی گئی اور اس اسکول کا بہترین شاعر عمعق تھا جسنے رشیدی اور نجیبی فرغانی سے کم شہرت نہیں پائی۔ قصاید میں اس کی نسیب خصوصیت کے ساتھ بہت شگفتہ اور دلچسپ تراکیب کا مجموعہ ہوتی تھی۔

نثر کی طرف اس زمانہ میں کوئی توجہ نہیں کی گئی اور سوائے تین کتابوں کے اور کوئی قابل ذکر نہیں ہے ایک سامانی وزیر ابو علی بلعمی کی تاریخ عالم ہے، دوسری ابوالفضل بیہقی کی تاریخ غزنوی خاندان کی اور تیسری قابوس نامہ شاہزادہ کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس کا۔ اس میں شک نہیں کہ درباری شاعری کا انتہائی عروج سلجوقیوں کے زمانہ میں ہوا (۱۰۳۷-۱۳۰۰) لیکن جو سادگی، جوش اور تازگی سامانی عہد کی شاعری میں پائی جاتی تھی آہستہ آہستہ مفقود ہوگئی اور تکلف و تصنع نے ان کی جگہ لیلی۔ غزنوی عہد کے شعراء کا کلام بہت صاف ہوتا تھا اور معمولی پڑھا لکھا شخص بھی اس سے لطف اٹھا سکتا تھا لیکن سلجوقی عہد کی شاعری میں صنایع بدایع، دقت معانی اور پیچیدگی بیان وغیرہ کی وجہ سے، اس کا سمجھنا لوگوں کے لئے دشوار ہوگیا اور وہ صرف صاحبان فضل و کمال کے مطالعہ کی چیز ہوگئی۔

اس عہد کے شاعروں میں خاص خاص یہ ہیں - ارزقی (ہرات) جس سے فن محبت پر ایک ناصحانہ نظم "الفیہ شلفیہ" منسوب ہے - ادیب صابر جو قصیدہ کا استاد مانا جاتا ہے، یہ ایلچی کی حیثیت سے خوارزم شاہی دربار بھیجا گیا اور وہاں مارا گیا - امیر معزی جو سلطان سنجر کا بڑا محبوب شاعر تھا اور جس کی دولت و امارت کے افسانے مشہور ہیں - لامعی جرجانی - عبدالواسع جبلی جس نے اپنے قصاید میں جانوروں کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے - لیکن سب سے زیادہ مشہور انوری تھا جو قصیدہ گوئی کا پیمبر مانا جاتا ہے - خوارزم شاہیوں نے اس کے جواب میں رشید الدین وطواط کو پیش کیا جو غیر معمولی طنز نگار تھا لیکن شاعری میں انوری سے اسے کوئی نسبت نہ تھی - البتہ خاقانی کا نام ضرور انوری کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے ہرچند خاقانی اپنی مشکل نویسی کی وجہ سے خواص کا شاعر تھا - پھر بھی اسکے قصاید نے بڑی شہرت حاصل کی اور انوری کے پہلو بہ پہلو اس نے بھی ایک خاص جگہ فارسی شاعری میں پیدا کرلی - اسی زمانہ میں ایک اور شاعر سوزنی سمرقندی تھا جو اپنی طنز نگاری اور مضحکات کی وجہ سے بہت مشہور ہے - اس زمانہ میں عورتوں نے بھی شاعری کی جن میں مہستی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے -

سمرقند کا نظامی عروضی بھی اسی عہد کا شاعر ہے جو اپنے تذکرہ چہار مقالہ کی وجہ سے بہت مشہور ہوا اور راخیر میں ظہیر الدین فاریابی اور کمال اسمٰعیل بھی بڑے جید شاعر پیدا ہوئے -

فاریابی کے قصاید اپنی تکنک کے لحاظ سے، انوری کے قصاید کے مقابلہ میں زیادہ صاف اور سلیس ہیں، لیکن وہ درباری تیور جو انوری کے کلام میں پایا جاتا ہے فاریابی کے یہاں مفقود ہے - کمال اسمٰعیل خلاق المعانی کے لقب سے مشہور ہوا - اسنے درباری شاعری ترک کرکے بعد میں متصوفانہ شاعری اختیار کرلی تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس رنگ میں وہ بہت کامیاب ہوا -

رزمیہ شاعری اہل فارس کی رزمیہ شاعری بالکل ان کی چیز ہے اور عربی شاعری سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اسکی ابتدا سامانیوں سے قبل اس وقت ہوگئی تھی جب عربوں کے خلاف ایران میں شورش شروع ہوئی، اسی لئے فارسی رزمیہ شاعری میں عرب روایات کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا اور اس کی روح خالص ایرانی ہے - لیکن افسوس ہے کہ اسکے ابتدائی نمونے اتنے کم ملتے ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی، اور اسی لئے رودکی کو رزمیہ شاعری کا بھی ابوالآباء مانا جاتا ہے - اس سلسلہ میں اس کا سب سے پہلا کام کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ ہے جس کی صرف ۵۰ ابیات ہم تک پہونچی ہیں - اسی دربار میں ایک اور ذہین شاعر دقیقی تھا جس نے ساسانی بادشاہوں کی تاریخ "خدائے نامہ" نظم کی لیکن صرف ۱۰۰۰ ابیات لکھنے کے بعد مرگیا اور یہی ابیات بنیاد ہیں فردوسی کے شاہنامہ کی، جو ساری دنیا کی رزمیہ شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتا - فردوسی نے شاہنامہ کے بعد اخیر عمر میں ایک اور مثنوی یوسف زلیخا بھی لکھی، لیکن شاہنامہ کے مقابلہ میں یہ بہت پھیکی ہے - فردوسی کے بعد دوسرے شعراء نے اس کا تتبع کیا اور گرشاسپ نامہ، برزونامہ اور سام نامہ وغیرہ متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں، لیکن بعد کو یہ جوش عاشقانہ زور آزمائیوں کے بیان میں صرف ہونے لگا جس کی مثال میں عنصری کے وامق و عذرا کو پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن اس رنگ میں نظامی گنجوی نے بڑا مرتبہ حاصل کیا جن کا خمسہ (پانچ مثنویوں کا مجموعہ)

مشہور چیز ہے۔

متصوفانہ شاعری

ایران کی متصوفانہ شاعری کا تعلق درباری شاعری سے بالکل نہیں ہے، بلکہ اُن جذبات سے ہے جو عرب کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے اور بعد کو سیاحوں، تاجروں اور صناعوں کے ذریعہ سے یہاں بھی منتقل ہوئے۔ ان جذبات کا تعلق در اصل "تحریک فُتُوّۃ" سے تھا، یہ تحریک علوئین کی تھی جو علیؑ اور اس کے بعد آلِ علی کو مستحق خلافت سمجھتے تھے اور اس سلسلہ میں کچھ رباعیاں اور قطعات وغیرہ صوفی جماعتوں میں سرگرمی پیدا کرنے کے لئے گیارھویں صدی کی ابتداء میں لکھے گئے۔ اس رنگ کی رباعیات اور قطعات لکھنے کی ابتداء یوں تو دسویں صدی ہی میں ہو گئی تھی لیکن گیارھویں صدی میں اس کو زیادہ وسعت و ترقی ہوئی۔ اس وقت کے صوفی شعراء میں بہت مشہور ایک بابا طاہر عریان تھا جس نے زیادہ تر نثر میں اپنے صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا، رباعیوں میں ان کی شاعری کا وہی رنگ تھا جو اس وقت رائج تھا۔ دوسرا مشہور شاعر بابا کوہی شیرازی تھا جو واقعی ہر حیثیت سے صوفی شاعر تھا جس کے دیوان میں قرآن و احادیث کے حوالہ جات بکثرت پائے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ ابو سعید سب سے پہلا صوفی شاعر تھا، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ خود اس نے عمر بھر میں صرف ایک رباعی کہی اور باقی رباعیاں اس سے غلط منسوب کی جاتی ہیں۔ البتہ انصاری کے کلام میں ضرور صوفیانہ تغزل بلند درجہ کا پایا جاتا ہے۔ یہ پیر انصار اور پیر ہرات کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کی نظم مناجات مشہور چیز ہے یہ تھے شعراء تصوف ابتدائی منزل کے، لیکن اس کے بعد جب سرزمین ایران ان جذبات کے قبول کرنے کے لئے زیادہ طیار ہو گئی تو بعض بڑے بڑے صوفی شاعر بھی پیدا ہوئے، جنھوں نے واقعی صوفیانہ شاعری کو ایک علحدہ فن بناکر پیش کیا۔ ان شعراء میں سب سے پہلا نام سنائی کا ہے۔ ان کے دیوان میں ہرچند غیر متصوفانہ غزلیں بھی کافی پائی جاتی ہیں، لیکن قابل ذکر وہی نظمیں ہیں جو ناصحانہ و متصوفانہ رنگ میں لکھی گئی ہیں اور جن میں قصص و امثال سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس رنگ کو ان کے جانشین فریدالدین عطار نے اور زیادہ پختہ کر دیا اور جلال الدین رومی نے تکمیل کی حد تک پہونچایا۔ سعدی نے بھی ناصحانہ نظمیں بہت لکھی ہیں، لیکن ان کا تعلق زیادہ تر اخلاق سے ہے، نہ کہ تصوف سے۔

اس سلسلہ میں عمر خیام اور ناصر خسرو کا نام بھی لیا جاتا ہے، لیکن ہماری رائے میں صوفیانہ شاعری سے انھیں بہت کم تعلق ہے۔ خیام کی شاعری یکسر رندانہ ہے اور ناصر خسرو اسماعیلی مذہب کا مبلغ تھا اسے تصوف سے کیا علاقہ۔

نثر کلاسکل ایرانی لٹریچر میں ادب انشاء کا وجود بہت کم ہے۔ علمی کتابیں زیادہ تر عربی ہی میں لکھی جاتی تھیں اور ادبی حیثیت سے فارسی نثر اس زمانہ میں کچھ نہ تھی۔ علمی کتابیں لکھنے والوں میں بوعلی سینا خصوصیت کے ساتھ

لہ یہ نام "الافق الاعلیٰ" سے نکلا ہے۔

قابل ذکر ہے جس نے دانش نامۂ علائی لکھ کر فارسی میں فلسفہ کی دائرۃ المعارف پیش کی۔ اور اس کے بعد مرزبان بن رستم کا نام آتا ہے جس نے دسویں صدی کے اخیر میں کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ مرزبان نامہ کے نام سے طبرستانی زبان میں کیا۔ یہ کتاب نایاب ہے اور اگر اس کا ترجمہ سعد وراوینی نے فارسی میں نہ کیا ہوتا تو شاید اس کا پتہ بھی نہ چلتا۔

گیارھویں صدی کی ایک اور مشہور کتاب سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی کا سیاست نامہ ہے جو علاوہ تاریخی واقعات کے اُس عہد کی سیاسیات پر بھی کافی روشنی ڈالتا ہے۔ بارھویں صدی میں کلیلہ و دمنہ کا فارسی ترجمہ ابو المعالی نصر اللہ نے کیا جس کی حیثیت بھی علمی کتاب کی سی ہے اور اسی صدی میں اسی قبیل کی ایک کتاب "فرج بعد الشدہ" کا ترجمہ حسین المایدی نے فارسی میں کیا۔

بارھویں صدی کے اخیر میں قبل اسلام کی روایات کو سامنے رکھ کر بعض کتابیں لکھی گئیں جن میں روایتی رومان سے زیادہ کام لیا گیا ہے مثلاً صدقا شیرازی کی تصنیف "کتاب سمک عیار" بختیار نامہ جسے داستان امیر حمزہ کہنا چاہئے اور داستان حاتم طائی، لیکن اس قسم کی تصانیف سے ایک فایدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ اس سلسلہ میں بعض کتابیں تاریخ و تذکرہ کی بھی لکھی جانے لگیں جن میں عوفی کا تذکرہ لباب الالباب، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

مغلوں کے عہد سے ۱۹ ویں صدی تک

مغلوں کا ابتدائی دور حکومت ایران کے لئے بڑی ویرانی کا دور تھا، اور ہر چند بعد کو مغل فرمانرواؤں نے اپنی تباہکاریوں کی کچھ تلافی کرنا چاہی، لیکن انھوں نے ملک کو اتنا غارت کر دیا تھا کہ اس کا اصلی حالت پر آنا آسان نہ تھا اور ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں وہاں کے لٹریچر میں کیا ترقی ہو سکتی تھی۔ تاہم اس عہد میں مورخین کافی تعداد میں پیدا ہوئے، مثلاً عطا ملک جوینی، وصاف، رشید الدین اور حمد اللہ مستوفی۔

چونکہ شاعری کی قدردانی اس زمانہ میں بہت کم ہو گئی تھی اس لئے ایرانی شعراء نے اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کیا۔ مثلاً بدر چاچ جو مشہور قصیدہ گو تھا، محمد بن تغلق کے دربار میں پہونچا اور اس کے بعد فانی بھی اسی دربار سے متعلق ہو گیا اس وقت ایران کی زبان مغلی اور ترکی زبان کے الفاظ کے اختلاط کی وجہ سے بہت خشک و بے مزہ سی ہو گئی تھی۔ اس لئے شاعری کو کسی ترقی کا موقعہ نہ تھا، تاہم صوفیانہ شاعری میں کچھ نہ کچھ جان ضرور باقی تھی، چنانچہ فخر الدین عراقی کی لمعات اور عشاق نامہ اسی زمانہ کی چیزیں ہیں۔ اس سے کم مشہور ایک اور شاعر اوحد الدین کرمانی تھا جس نے مصباح الارواح لکھی، اوحدی نے البتہ کافی شہرت حاصل کی اور اس کی کتاب جام جم کی ۰۰۴ نقلیں ایک سال کے اندر کی گئیں۔ محمود شبستری کی گلشن راز بھی اسی زمانہ کی تصنیف ہے جس میں سب سے پہلی مرتبہ تعلیمات تصوف کو بہت کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

صوفیانہ رباعیات میں افضل الدین کاشانی نے خاصی ترقی کی اور نزاری کوہستانی نے ایک آزاد خیال شاعر ہونے کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی اس نے قدامت پرست اہل مذہب پر اتنی سخت نکتہ چینی کی کہ لوگ اسے ملحد و بیدین کہنے لگے۔

مغلوں کا دور حکومت تیمور کے زمانہ تک ایرانی لٹریچر کی ناقدری کا زمانہ تھا اسلئے اس عہد کی شاعری میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی لیکن تیمور اور اسکے جانشینوں کے زمانہ میں پھر رنگ بدلا۔ اور اسکا سبب غالباً یہ تھا کہ مغل حکومت کمزور ہوگئی تھی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں پیدا ہوگئی تھیں، جو دربار کی پرانی روایات کو از سر نو زندہ کرنا چاہتی تھیں اس لئے چودھویں صدی میں ایک دوسرا دور کلاسکل ایرانی شاعری کا آیا اور بعض اچھے اچھے شاعر پیدا ہوئے۔ مثلاً ابن یمین جو دربار سبزوار کا شاعر تھا اور جس کو قطعات لکھنے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ خواجہ کرمانی جس کا خمسہ مشہور ہے ۔ عبید زاکانی جو مشہور طنز نگار تھا ۔ سلمان ساوجی جو اپنے صنائع بدائع اور فنی مشکل نگاری کے لحاظ سے بہت مشہور ہوا ۔ لسان الغیب حافظ شیرازی جو تغزل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

نثر نگاروں میں صرف ضیاء الدین نخشبی قابل ذکر ہے جن کی تصنیف طوطی نامہ (جو سند باد نامہ کا ترجمہ ہے) بہت مشہور ہوئی۔

تیمور کے جانشینوں کے زمانہ میں فارسی لٹریچر میں دقت پسندی زیادہ پیدا ہوگئی اور تصوف کا اثر بھی ضعیف ہوگیا۔ اس زمانہ کے بعض مشہور شاعر یہ تھے :-

نعمت اللہ کرمانی، جنھوں نے تصوف کا ایک خانوادہ ہی الگ قایم کیا اور تقریباً ۵۰۰ چھوٹے چھوٹے رسالے تصوف میں لکھے۔ انھوں نے ایک دیوان بھی چھوڑا۔

قاسم الانوار، جنھوں نے اپنے دیوان میں ترکی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔

کاتبی نیشاپوری - جن کے کلام تصوفانہ تلمیحات زیادہ پائی جاتی ہیں۔

عارفی ہراتی - جن کا حال نامہ بہت مقبول ہوا۔

عصمت بخاری - جن کا ادہم نامہ مشہور مثنوی ہے۔

ملا حسین واعظ کاشفی اس زمانہ کا مشہور مصنف تھا جس نے کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ انوار سہیلی کے نام سے پیش کرکے شہرت دوام حاصل کی اور دوسری مشہور ہستی عبدالرحمٰن جامی کی تھی جن کی مثنویاں اور غزلیں بہت مقبول ہوئیں، نثر میں نفحات الانس ان کی بہت مشہور کتاب ہے۔

اس زمانہ میں تاریخ نویسی کی طرف پھر توجہ ہوئی اور حافظ ابرو، عبدالرزاق سمرقندی، میر خوند اور خوند میر مشہور تاریخ نگار پیدا ہوئے۔

صفوی عہد ایرانی شاعری کے لئے بہت انحطاط کا زمانہ تھا، کیونکہ صفوی فرمانروا روایتی قصیدہ خوانی کو پسند کرتے تھے اور مذہبی رنگ کی شاعری کی طرف زیادہ مایل تھے، اسی لئے اس زمانہ میں جو قصاید لکھے گئے وہ زیادہ تر منقبت کے تھے، چنانچہ محتشم کاشی کا ہفت بند اس سلسلہ کی بہت مشہور چیز ہے۔ اس دور کے بعض مشہور شعراء یہ تھے :- ہاتفی، بابا فغانی - اہلی شیرازی - اہلی ترشیزی - ہلالی - لسانی - وحشی۔

سولھویں اور سترھویں صدی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ایران کے بہت سے شعراء ہجرت کرکے ہندوستان چلے گئے اور دربار اکبری میں ان کی بڑی قدر کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان فارسی شاعری کا دوسرا مرکز قرار پایا اور اس میں ہندوستانی میلانات بھی شامل ہو گئے۔ ان شعراء میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر یہ ہیں :- عرفی شیرازی فیضی، صحابی (مشہور رباعی کہنے والا) زلالی (مصنف سبع سیارہ، جن میں محمود و ایاز والی نظم بہت مشہور ہے) طالب آملی اور صائب۔

صفوی فرمانروا، چونکہ تصوف کے خلاف تھے، اس لئے اس زمانہ میں صوفیانہ شاعری بہت کم ہوگئی اور اسکی جگہ مذہبی شاعری نے لی، جسے شیعی لٹریچر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نثر کا رنگ بھی اس زمانہ میں بدلا اور تیموری عہد کی مشکل نویسی زیادہ آسان و سادہ زبان میں تبدیل ہوئی، جسے موجودہ عہد کی فارسی کا پس منظر سمجھنا چاہئے۔ اس زمانہ میں سب سے پہلے ملا صدرا نے فلسفہ کی کتابیں لکھنے کا آغاز کیا اور بعد کو دوسرے اہل قلم نے بھی اس کا تتبع کیا۔

قاچاری عہد سے اسوقت تک قاچاری حکومت اٹھارویں صدی کے اخیر میں قایم ہوئی اور اپنے ساتھ ایرانی لٹریچر کے لئے حیات تازہ لائی۔ ہر چند فتح علی قاچار کے درباری شعراء قدیم رنگ کے شاعر تھے، لیکن بعد کو مغربی اثرات کی وجہ سے اُنیسویں صدی کے وسط میں یہاں کی شاعری کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ دربار فتح علی شاہ کے شاعروں میں نشاط (جس کے تغزل میں کافی نزاکت پائی جاتی ہے)، صبا (جس نے فردوسی کے تتبع میں عباس مرزا اور روسیوں کی جنگ کا حال شہنشاہ نامہ کے نام سے نظم کیا) اور وصال (جسے انیسویں صدی کا جامی کہتے ہیں) اچھے شاعر تھے، لیکن ان کے یہاں کوئی خاص اپج نہیں پائی جاتی۔ البتہ قاآنی، شیبانی، اور یغمہ تین زبردست شاعر اس زمانہ میں پیدا ہوئے۔ قاآنی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کا بھی ماہر تھا اور اس نے ان زبانوں سے بعض کتابیں ترجمہ بھی کیں، لیکن اس کی شہرت کا مدار اس کے قصاید تھے جن میں سے اس نے بڑی دلچسپ مناظر نگاری اور نقاشانہ صناعی سے کام لیا۔ شیبانی کے ساتھ قاچاریوں نے اچھا سلوک نہیں کیا اور یغمہ کی زندگی بھی مصائب ہی میں بسر ہوئی اس لئے ان دونوں شاعروں کے یہاں قنوطی رنگ زیادہ ہے اور قاچاریوں کے خلاف طنزیہ نظمیں بھی ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

یغمہ پہلا شاعر تھا جس نے فارسی سے عربی الفاظ نکالنے کی کوشش کی اور اس تحریک کو زیادہ تقویت پہونچی دار الفنون کے قیام سے (۱۸۵۲ء) جہاں مغربی علوم کی تعلیم دیجاتی تھی اور جس کے تمام اساتذہ یوروپین تھے۔

جب اس ادارہ نے مغربی علوم کی بعض کتابیں فارسی میں منتقل کرنا چاہیں، تو معلوم ہوا کہ قدیم مقفیٰ انداز کی فارسی کام نہیں دے سکتی اور اس طرح اس نے گویا جدید فارسی کی بھی بنیاد ڈالی۔ اس زمانہ میں علاوہ علمی کتابوں کے بعض فرانسیسی ناول بھی فارسی میں ترجمہ کئے گئے اور اس کا اثر فارسی زبان کی معنویت پر بھی بہت پڑا۔

رضا قلی خاں ہدایت جو اس ادارہ کا پہلا ناظم تھا، مورخ بھی تھا اور اس کے شاگردوں میں صنیع الدولہ جو "اعتضاد السلطنۃ" کے لقب سے بھی مشہور ہے، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس کی تصانیف موجودہ ایران کی تاریخ پر نہایت اچھی روشنی ڈالتی ہیں۔

دار الفنون کی تحریک سے جن مصنفین نے علمی کتابیں لکھیں، ان میں مرزا عبدالرحمان نجار زادہ، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے اور اس کی تصانیف میں کتاب احمد اور مسالک المحسنین نے عام مقبولیت حاصل کی۔

اسی زمانہ میں سب سے پہلے یہاں فن طباعت کا رواج ہوا، اور اخبارات کی اشاعت ممکن ہوسکی۔ اول اول یہ اخبار صرف حلقۂ دربار کے لئے ہوتے تھے، لیکن سنہ ۱۸۵۱ء میں سب سے پہلا اخبار (صحیح معنے میں) جاری ہوا۔ اس کے بعد جب مشروطہ (کانسٹی ٹیوشن) کا مطالبہ اہل ملک نے کیا اور یہ ہنگامہ شروع ہوا تو اخبار نویسی کو اور زیادہ ترقی ہوئی اسی سلسلہ میں وہاں کے لٹریچر میں بھی انقلاب ہوا، کیونکہ سیاسی مطالبات کی وجہ سے وہاں کے ادبیات میں بھی تنوع پیدا ہوا اور ایسی نظمیں کہی جانے لگیں جن کا تعلق عوام کی زبان سے تھا اور اس طرح ایرانی شاعری کے پُرانے اسکول کو نئے اسکول کے لئے جگہ خالی کرنا پڑی۔

اسی زمانہ میں صور اسرافیل ایک سیاسی اخبار نکلا، جس میں علی اکبر دہخدا کے فکاہی و طنزیہ تحریریں چرند پرند کے عنوان سے بہت مقبول ہوئیں۔ اس انداز تحریر کا تتبع بعد کو اوروں نے بھی کیا اور دو نہایت اچھی کتابیں اس رنگ کی لکھی گئیں ایک آغا سید محمد علی جمال زادہ (سنہ ۱۹۲۲ء) کی یکے بود یکے نبود اور دوسری محمد مسعود (سنہ ۱۹۳۴ء) کی اشرف مخلوقات۔

پہلے ایرانی لٹریچر میں تمثیل بالکل نہ پائی جاتی تھی اور اگر تھی بھی تو نقلوں یا تعزیہ داریوں کی صورت میں۔ مغربی انداز کی کمیڈی سب سے پہلے وہ ہے جو مرزا جعفر قراجا داغی نے پیش کی۔ یہ فتح علی اخوندزادہ کے تمثیلوں کا آذربیجانی زبان سے فارسی میں ترجمہ تھا جو بہت مقبول ہوا۔ یہ تمثیلیں گویا بنیادی تحریک تھی جس سے متاثر ہوکر مرزا ملکم خان نے طبعزاد تمثیلیں لکھیں جو مشہور سیاسی شخص تھا۔

ایران کے تھیٹر کو ایک طرف آذربیجانی لٹریچر نے متاثر کیا اور دوسری طرف ترکی ڈراموں نے جن کی وساطت سے مولیر کے ڈرامے بھی فارسی میں منتقل ہوسکے۔ لیکن چونکہ وہاں کوئی باقاعدہ اسٹیج نہ تھا اس لئے ڈرامہ کی ترقی زیادہ نہ ہوسکی حال ہی میں چند المیہ تمثیلیں وہاں شائع ہوئی ہیں، جن میں سید عبدالرحمان خلیلی (سنہ ۱۹۲۶ء) کی داستان خونیں، سعید نفیسی کی آخریں یادگار نادر شاہ (سنہ ۱۹۲۶ء) اور صادق ہدایت کی پروین (سنہ ۱۹۳۱ء) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ طنزیہ نگاری کے سلسلہ میں حاجی زین العابدین کا ناول "سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ" اچھی چیز ہے۔

پچھلی جنگ کے بعد ایرانی سیاست کے ساتھ ساتھ وہاں کا لٹریچر بھی کافی اثر پذیر ہوا۔ ہر چند ٹکنگ تو زیادہ تر قدیم ہی

رہی لیکن، مفہوم و مقصود شاعری کا ضرور بدل گیا۔ عہد حاضر کا سب سے بڑا شاعر سید محمد ادیب پشاوری (سنہ ۱۹۳۱ء) ہے جس نے اپنی نظموں میں انگلستان کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا ہے۔ ملک الشعراء بہار کی نظمیں بھی یکسر سیاسی رنگ کی ہیں۔

ابوالقاسم عارف قزوینی کی نظموں نے بھی انقلاب ایران میں بڑی مدد کی اور ایرج مرزا نے ایران کی عورتوں کو آزادی دلانے کے لئے اچھی اچھی نظمیں لکھیں ۔۔ ان کے بعد کے شاعروں میں رشید یاسمی (سنہ ۱۸۹۶ء) بڑا اچھا شاعر ہوا ہے جس کی غزلوں میں مغربی جذبات کا کافی اثر پایا جاتا ہے۔ اور ایک شاعر نیما بھی قابل ذکر ہے جس نے ٹکنک میں بھی کچھ تبدیلی کی ہے اس نے اپنی تصنیف مجلس میں ایرانی کسانوں کی ستم زدگی کا اچھا نقشہ پیش کیا ہے۔ نظام وفا کا نام بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے جس کی دو جذبات سے لبریز چھوٹی چھوٹی مثنویاں بہت مقبول ہوئیں، اور ارمغان (ادبی ماہنامہ) کے اڈیٹر واحد دستگیر دی کی تصنیف سرگزشت اردشیر بھی خاص چیز ہے۔ مردوں کے علاوہ ایران کی عورتوں میں بھی شعر کہنے کا ذوق پیدا ہو گیا ہے، جن میں پروین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

ایران کی شاعری میں انقلابی میلانات کی نمایندگی میرزادہ اسحاق کے کلام میں پائی جاتی ہے جس کی نظم سیر مرد دہقاں بہت مشہور ہوئی، لیکن افسوس ہے کہ یہ سنہ ۱۹۲۶ء میں قتل کر دیا گیا، دوسرا نام اس سلسلہ میں قاسم لاہوتی کا لیا جاتا ہے جو روس چلا گیا تھا، اس کی نظمیں بھی ایران کے انقلابی لٹریچر میں خاص درجہ رکھتی ہیں۔

پچھلی جنگ کے بعد ایران نے نظم سے زیادہ نثر میں ترقی کی اور متعدد تاریخی ناول لکھے گئے، جن میں خاص خاص یہ ہیں:۔ شیخ موسیٰ ہمدانی کا "عشق سلطنۃ" (سنہ ۱۹۱۹ء) آغا مرزا حسن خاں بدیع کا بیژن و منیژہ (جو شاہنامہ سے ماخوذ ہے) صنعتی زادہ کرمانی کے دو ناول مزدک اور مانی کے حالات ہیں ۔ محمد باقر مرزا خسروی کا شمس الطغراء (سنہ ۱۹۰۹ء) جس کے تین حصوں میں مغلوں کے زمانہ کے ایران کا حال درج ہے اور کاظمی کا ناول لازقی جو قومی جذبات سے متعلق ہے۔ ان ناولوں میں زیادہ ایران کی عظمت گزشتہ کو پیش کیا گیا ہے، لیکن بعض ناول ایسے بھی لکھے گئے جن میں تحریکات موجودہ پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً عباس خلیلی کا روزگار سیاہ جس میں ایران کی عورتوں کی موجودہ مشکلات کو پیش کیا گیا ہے ۔۔ اسی مصنف نے کئی چھوٹے چھوٹے ناول بھی لکھے ہیں، جن میں انتقام، انسان اور اسرار شب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ایران کے مزدوروں کی خراب حالت اور حکومت کے مظالم پر مصطفےٰ مشفق کاظمی کا ناول "طہران مخوف" خاص چیز ہے ۔۔ اس نے چھوٹے چھوٹے ناول بھی کئی ایک لکھے ہیں۔

کسانوں کی مصیبتوں کا حال، محمد علی خاں خداداده نے اپنے ناول "روز سیاہ کارگر" میں بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نگار کا آئندہ جوبلی نمبر

پاکستان نمبر ہوگا۔ خریداران نگار سے اسکی قیمت عہ اور غیر خریداران سے تین روپیہ لی جائے گی ۔۔۔ منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

جی ہاں، میں جانتا ہوں آئینِ محبت کیا ہے اور اس سے بھی ناواقف نہیں کہ آپ اس کے بڑے پابند ہیں، چنانچہ آپ نے جو کچھ عزیز کے ساتھ کیا وہ بھی اسی آئین کی پابندی تھی اور جو سلوک میرے ساتھ ہے وہ بھی عین اقتضائے محبت ہے۔ الغرض بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

آپ نے سعدی کا یہ شعر سنا ہوگا:-

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند، سعدی از دست خویشتن فریاد،

لیکن مجھے تو اس شکایت کا بھی موقعہ نہیں کیونکہ آپ کی "بزمِ طرب" کی شرکت کے لئے میرا مقسوم ہی نہیں، پھر بادہ و ساغر پر کیا تہمت رکھوں!

خدا کے لئے ایسی باتیں ان سے نہ کیا کیجئے جو تہیۂ طوفاں کئے بیٹھے ہیں۔ مانا آپ خس و خاشاک نہیں، لیکن سیلاب میں بڑی بڑی سر بفلک عمارتوں کو پابوس زمین ہو جاتے دیکھا ہے۔

نہ آپ کی عنایتوں کی کوئی حد، نہ میری نارسائیوں کی کوئی انتہا۔ لیکن نہ میں اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا ہوں نہ آپ ان کا کوئی صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کا انتہائی خلوص ہے کہ میرے ہر درد دُکھ میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہیں، لیکن میں اگر اسے گوارا کر بھی لوں، تو کوئی دوسرا اس بار کو کیونکر اُٹھا سکے گا، اس کا یقین کیونکر آئے!

از خونِ دلم شیشۂ مے زہر بکام ست
بر حوصلۂ جامِ جم ایں بادہ حرام ست

انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے، جب تدبیر و مصلحت، عقل و دانائی سب بیکار ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان جب سیلاب کا مقابلہ کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو پھر وہ ڈوب جانا ہی پسند کرتا ہے۔ غالب نے اس خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے:-

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

آپ دیکھتے ہیں آجکل کا ہنگامہ دار و گیر۔ معاذ اللہ، کیا انسان سے زیادہ درندہ دنیا میں کوئی اور پیدا ہوا ہے۔ اب تو اپنے آپ کو انسان کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ خیال تھا کہ ملک کی آزادی کے بعد یہاں مسرت و سکون کا ایک

نیادور شروع ہوگا، لیکن یہاں تو رہی سہی عافیت بھی ختم ہوگئی۔

زجوشِ گرمیِ بازار من دُکانم سوخت!

غالبؔ کی فارسی غزلوں میں وہ رنگِ تصوف تو بہت کم ہے جس کی آپ کو جستجو ہے، پھر بھی بعض اشعار ایسے مل جاتے ہیں، جو اصطلاحات تصوف سے علاقہ رکھتے معلوم ہوتے ہیں، میں نے خود ایک بار اس موضوع کو سامنے رکھ کر غالبؔ کے کلام کا انتخاب کرنا چاہا تھا، لیکن اس کی تکمیل کا موقع نہ ملا۔ اب آپ نے اس کا ذکر کرکے پھر اس خیال کو تازہ کردیا۔ مجھے اس سے اختلاف ہے کہ غالبؔ کی سب سے پہلی غزل جو اس نے حمد و نعت میں لکھی ہے اسی سلسلہ کی چیز ہے۔ اس کا پہلا شعر:۔

اے بہ خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا
باہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا

تو بیشک اس رنگ کا شعر ہے جس میں "ہمہ اوست" اور "ہمہ از وست" کا خیال اس نے پیش کیا ہے، لیکن باقی اشعار قصیدہ کے رنگ کے ہیں ــــ اسی خیال کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

قطرہ و موج و کف و گرداب جیحون ست و بس
ایں من و مائی کہ می بالد حجابے بیش نیست

یہی فلسفہ ایک اور پہلو سے اس نے پیش کیا ہے، لیکن کس حُسن کے ساتھ:۔

ماہماں عینِ خودیم، امّا خود از وہم دوئی،
درمیانِ ما و غالبؔ ما و غالبؔ حایل ست

اس رنگ کے اشعار غالبؔ کے یہاں بہت کم ہیں، لیکن اس سے زیادہ لطیف رنگ کا تصوف اس کے یہاں بکثرت پایا جاتا ہے، مثلاً:۔

شورے ست نواریزی تارِ نفسم را،
پیدا نئی اے جنبشِ مضراب کجائی

در ہجوم ظلمت، از بس خویش را گم می کند
قطرہ در دریا ست گوئی سایہ در شبہائے من

اس شعر میں غالبؔ نے بالکل نئی بات لکھی ہے۔ قطرہ و دریا کے تعلق کو اکثر شعراء نے ظاہر کیا ہے لیکن تشبیہی صورت سے جس طرح غالبؔ نے پیش کیا ہے، وہ بیدلؔ کے سوا کہیں نہ ملے گا۔

آپ نے اگر کوئی انتخاب اس موضوع کو سامنے رکھ کر کیا ہے تو بھیج دیجئے، دیکھنا چاہتا ہوں۔

فارسی کے طنزیہ لطایف

اہلِ ایران کی زبان کی یہ خصوصیت غالباً کسی اور زبان کو حاصل نہیں کہ اگر ان کی شاعری کو سامنے نہ رکھا جائے، تو ہم ان کے قومی کلچر اور ثقافت ذہنی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے نثر کی طرف بہت کم توجہ کی اور علوم و فنون سے انھیں زیادہ دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ اب یہ اثر وہاں کی آب و ہوا کا ہو، یا فطری خصوصیات کا، انھوں نے زندگی کے ہر شعبہ کو غنائی نقطۂ نظر سے دیکھا اور صرف وہی چیز ان کو پسند آئی جسے وہ حدود و ترنم میں لا سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ فارسی کا سرمایۂ شعر و شاعری بڑا متنوع ہے اور انداز بیان کے اتنے عجیب و غریب اسلوب اس نے پیدا کئے کہ کسی اور زبان میں مشکل ہی سے نظر آ سکتے ہیں۔

غزل، قصاید، مثنوی اور رباعی وغیرہ کا جتنا اور جیسا ذخیرہ فارسی میں موجود ہے، اس سے ہر شخص واقف ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس سے شعراء ایران کے نہ صرف ذوق شعریہ کافی روشنی پڑتی ہے، بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وسعت بیان اور قدرت شعر گوئی کے لحاظ سے انھیں کتنا بڑا مرتبہ حاصل تھا، لیکن ان کی حذاقت شعری اور لطافت ذہنی کا صحیح پتہ ہم کو زیادہ تر قطعات و متفرق ابیات سے ملتا ہے جو ہر شاعر کے کلیات میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں اور جن کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں جب ہم اُن کے مضحکات، طنزیات، ہجویات، لطایف، معما، چیستان اور دوسری فنی ندرتوں کو دیکھتے ہیں، تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ قوم کس قدر ذہین، کتنی لطیف الخیال اور کس درجہ خوشدل تھی۔

آج کی صحبت میں ہم ان کے بعض طنزیہ لطایف پیش کرتے ہیں جو ہم - ان لوگا کے مجموعۂ انتخاب سے لئے گئے ہیں۔

جب سلطان طغرل ثالث کو جو خاندان سلجوقی کا آخری فرمانروا تھا۔ شاہ خوارزم تکش خاں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو اس کا سر کاٹ کر خلافت بغداد کو بھیج دیا گیا اور جسم تکش خاں کے کیمپ میں رکھ لیا گیا اس واقعہ کو دیکھ کر ایک شاعر نے رباعی لکھی:-

امروز شہا زمانۂ دل تنگی ست، فیروزۂ چرخ ہر زماں بر رنگی ست

دی از سر تو تا بفلک یک گز بود امروز ز سر تا بدنت فرسنگی ست

یعنی اے بادشاہ یہ زمانہ بڑی دل تنگی کا ہے اور آسمان ہر لحظہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کل تیرا سر آسمان کو چھو رہا تھا اور آسمان سے اُس کا فاصلہ ایک گز سے زیادہ نہ تھا، لیکن آج یہ حال ہے کہ تیرا سر تیرے جسم سے میلوں دور ہے۔

ایک ظالم شخص کی وفات پر تاج الدین سرخستی نے ایک رباعی لکھی :-

در ماتمت آں قوم کہ خوں می بارند   مرگِ توحیاتِ خویشں می پندارند
غمناک ازانند کہ تا دوزخیاں،   جاوید چگونہ باتوصحبت دارند

تیری موت تو تیری قوم کی زندگی ہے، اس لئے وہ اگر تیرے مرنے پر غمناک ہیں تو اس لئے نہیں کہ تو اُن سے جدا ہو گیا بلکہ اس لئے کہ وہ سوچتے ہیں کہ اہل دوزخ کیونکر تیری دائمی صحبت کو گوارا کر سکیں گے۔

رشیدی سمرقندی نے وزیر وقت کی مدح کی، لیکن اس کو انعام نہ ملا۔ اس نے آخر کار جھلا کر یہ دو شعر اسکو لکھ بھیجے :-

تو وزیری و منت مدحت گوئے   دستِ من بے عطا روا بینی
تو وزارت بمن سپار و مرا   مدحتے گوئے تا عطا بینی،

تو وزیر ہے اور میں تیرا مدح گو لیکن عطا و بخشش سے محروم۔ اس لئے تو وزارت میرے سپرد کر اور میری مدح کر تاکہ میں تجھے بتاؤں کہ مدح کا انعام کیا ہوتا ہے۔

ملا حوا دنے ایک رباعی میں مولویوں کے کبر و غرور پر بڑا پاکیزہ طنز کیا ہے، کہتا ہے :-

اے مولوی از کبر دماغت گندہ   گاہے کہ کند بر تو سلام ایں بندہ
چنداں حرکت بکن کہ از روئے قیاس   معلوم شود کہ مردۂ یا زندہ،

اے مولوی، اللہ رے تیرا غرور۔ جب کبھی میں تجھے سلام کروں تو اپنے سر کو کم از کم اتنا تو ہلا دیا کر کہ میں سمجھ سکوں تو زندہ ہے، مُردہ نہیں۔

خواجہ نصیر کو کسی حاکم نے کافر کہہ دیا، اس کے جواب میں اس نے دو شعر کہے :-

نظام بے نظام ار کافرم خواند   چراغ کذب را نبود فروغے
مسلماں خوانمش زیرا کہ نبود   سزا وارِ دروغ جز دروغے

اس نے مجھے اگر کافر کہا تو کیا ہوا جھوٹ کی عمر کتنی۔ لیکن چونکہ جھوٹ کا جواب بھی جھوٹ ہی ہو سکتا ہے، اسلئے میں کہتا ہوں کہ تو تو مسلمان ہے۔

جامی کے سامنے کسی شاعر نے مہمل سی غزل لکھ کر پیش کی جس میں یہ صنعت ملحوظ تھی کہ حرف الف کہیں نہیں آیا تھا۔

جامی نے یہ غزل دیکھ کر جو کچھ کہا وہ بھی ملاحظہ ہو:۔

شاعرے خواند پُر خلل غزلے، کیں بہ حذفِ الف بود موصوف

گفتمش نیست صنعتے بہ ازاں، کہ کنی حذف ازاں تمام حروف

یعنی یہ غزل اور زیادہ پُر صنعت ہو جاتی اگر الف کے ساتھ ساتھ اور بھی تمام حروف حذف کر دئے جاتے۔

جمال الدین اصفہانی کو کسی امیر نے شراب تحفتہً بھیجی، لیکن وہ اسے پسند نہ آئی اور شکریہ میں یہ اشعار لکھ بھیجے:۔

آں چہ مے بود کم فرستادی، کہ ہمہ شہر پُر فسانۂ ماست،

اگر آنرا شراب شاید خواند، چاہِ ما بس شرابخانۂ ماست

یعنی اگر شراب ایسی ہی ہوتی ہے، تو میں اپنے گھر کے کنوئیں کو کیوں نہ شراب خانہ کہوں جس میں ایسی شراب بھری پڑی ہے۔

کمال الدین اسماعیل کو کسی امیر نے غلّہ بھیجا، لیکن اس میں مٹی زیادہ ملی ہوئی تھی، اس نے قطعہ لکھ کر بھیجا:۔

غلّہ کامسال داد خواجہ مرا، گرنہ بُد جملہ بود اکثر خاک

نسبتِ خاک وگندمش باہم، ہمچناں بُد کہ تخم اندر خاک

خاک مردم خورد ندانستم، کہ خورد مردم اے برادر خاک

امسال جو غلّہ مجھے ملا ہے اس میں گیہوں اور مٹی کی نسبت ایسی تھی جیسے کھیت میں تخم ریزی کی جائے۔ پھر میں نے یہ تو سنا تھا کہ مٹی آدمی کو کھا جاتی ہے، لیکن یہ آج ہی معلوم ہوا کہ آدمی بھی مٹی کو کھا سکتا ہے۔

مولانا شہاب الدین ایک طبیب کی ہجو میں جس کا نام اصیل تھا لکھتے ہیں:۔

ملک الموت از اصیل طبیب، می بنالید بدرگاہ خدائے

کہ جہاں را زخلق خالی کرد، اندریں دور گم شدہ سروپائے

یا ازیں شغل دور کُن او را، یا مرا خدمتِ دگر فرمائے

ملک الموت نے خدا سے کہا کہ اصیل طبیب نے بستی کی بستی تو اُجاڑ دی ہے، اس لئے یا تو اُس کو اس خدمت سے سبکدوش کیجئے یا پھر مجھے کوئی کام اور بتائیے۔

فنائی چغتائی لعنِ یزید کے جواز میں لکھتا ہے :-

اے کہ گفتی بر یزید و آلِ او لعنت مکن | زانکہ شاید حق تعالیٰ کردہ باشد رحمتش
آنچہ با آلِ نبی او کردہ گر بخشد خدائے | ہم ببخشاید ترا گر کردہ باشی لعنتش

تم کہتے ہو کہ یزید پر لعنت نہ کر کیونکہ ممکن ہے خدا اُس کو معاف کر دے۔ یہ بات ٹھیک ہے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یزید نے آلِ رسول کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اگر خدا اسے معاف کر سکتا ہے تو کیا یزید کو بُرا کہنے والے کو وہ معاف نہیں کر سکتا

محبوب کی لکنت کی تاویل ایک شاعر نے یوں کی ہے :-

زلکنت نیست آں مہ را سخن کز دیر می آید | جُدائی از دہانِ او سخن را عار می آید

اس کی زبان سے جو الفاظ دیر دیر سے نکلتے ہیں اس کا سبب لکنت نہیں ہے، بلکہ صرف یہ کہ گفتگو کو اس کے زبان و دہن کی جدائی گوارا نہیں۔

غالب نے اسی خیال کو کس قدر بلند و لطیف انداز میں ظاہر کیا ہے :

زلکنت می تپد نبضِ رگِ لعلِ گہر بارش | شہیدِ انتظارِ جلوۂ خویش ست گفتارش

عمر و خیام کے یہاں ہم کو اکثر رباعیاں طنزیہ لطایف کی ملتی ہیں، مثلاً :-

من مے خورم و مخالفاں از چپ و راست | گویند مخور بادہ کہ دیں را اعداست
چوں دانستم کہ مے عدوئے دین ست | واللہ بخورم خونِ عدو را کہ رواست

لوگ کہتے ہیں کہ شراب نہ پی، دشمنِ دین ہے۔ لیکن اب تو میں اور پیوں گا کیونکہ دشمن کا خون پینا روا ہے۔

اس قسم کی چھیڑ چھاڑ صرف انسانوں ہی سے نہ ہوتی تھی بلکہ خدا سے بھی ہوتی تھی اور یہ در اصل گویا طعن ہوتا علمائے ظواہر کی مذہبی تعلیمات پر - عام شعراء کے علاوہ صوفی شعراء کے یہاں بھی اس نوع کا طنز بکثرت پایا جاتا ہے۔

فخر الدین رازی خدا سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

در رہگذرم ہزار جا دام نہی | گوئی کُشمت اگر دراں گام نہی
یک ذرہ زمیں ز دامِ تو خالی نیست | گیری و کشی و عاصیم نام نہی

اس رباعی میں، مذہب کی اس تعلیم پر طعن کیا گیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور انسان مجبورِ محض ہے۔

اسی انداز کی ایک رباعی عمر خیام کی ہے :-

من مے خورم و ہر کہ چو من اہل بود   مے خوردنِ من بہ نزد او سہل بود

مے خوردنِ من حق بازل می دانست   گر مے نخورم علمِ خدا جہل بود

یعنی خدا کو معلوم تھا کہ میں شراب پیوں گا، اس لئے اگر میں شراب نہ پیوں گا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ خدا کا علم غلط تھا۔

ایک بار اصمعی، ہارون الرشید کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا، جب ایک قاب میں فالودہ آیا اور اسے چکھا تو تعریف کرتے ہوئے بولا کہ "امیر المومنین، عرب کے بدو ایسی لذیذ غذا سے واقف ہی نہیں"۔

خلیفہ بولا :"تم غلط کہتے ہو"۔ اصمعی نے کہا کہ :" میں غلط نہیں کہتا" ۔۔۔ خلیفہ بولا کہ :- "تم کو اس کا ثبوت دینا ہوگا"۔

اتفاق سے دوسرے دن خلیفہ شکار کو گیا، اصمعی بھی ساتھ تھا۔ صحرا میں ایک بدو نظر آیا، خلیفہ نے اصمعی سے کہا "اسے بلا لاؤ"۔ اصمعی نے جاکر کہا کہ "امیر المومنین یاد فرماتے ہیں" اس نے کہا کہ "کیا مومنین کا کوئی امیر بھی ہوتا ہے"۔ اصمعی نے یہ سنکر اس کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ اس نے اصمعی کی گردن پکڑی اور خلیفہ کے پاس لاکر شکایت کی کہ "اس نے مجھے گالی دی ہے، انصاف کیجئے"۔

خلیفہ نے بدو سے کہا کہ "تم اس کو دو درہم جرمانہ ادا کرو"۔ بدو بولا "ماشاء اللہ، کیا انصاف ہے جو مجھے گالیاں دے وہی انعام پائے"۔ خلیفہ نے کہا "ہاں، یہی انصاف ہے"۔ یہ سنکر بدو نے اُلٹ کر اصمعی کو گالیاں دیں اور خلیفہ سے مخاطب ہوکر کہا کہ :- "اگر انصاف یہی ہے تو مجھے بھی اس سے انعام دلوائیے"۔

ہارون بہت ہنسا اور اپنے ساتھ لے آیا۔ شام کو دسترخوان پر فالودہ کی قاب آئی اور بدو نے اسے بڑے شوق سے کھایا۔ خلیفہ نے پوچھا "یہ کیا چیز تھی"۔ بولا "خدا نے اپنے کلام میں کھجور اور انار کا ذکر کیا ہے، سو کھجور کو تو میں جانتا ہوں، لیکن انار کبھی نہیں دیکھا، اس لئے یہ انار ہی ہوگا۔

اصمعی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ :- "حضور مجھے دونا انعام دلوائیے، کیونکہ یہ صرف یہی نہیں کہ فالودہ سے ناواقف۔ بلکہ خیر سے انار کو بھی نہیں پہچانتا"۔

آریہ اقوام کی قدامت اور انکی نقل وحرکت

(تحقیقی نقطۂ نظر سے)

رگوید کے بھجنوں کے شاعرانہ بیانات کی تاویل کرکے بعض حضرات نے دعویٰ کیا ہے کہ:

(۱) ست جگ وغیرہ رائج الوقت سموتوں کے نام ہیں۔ (مصنفِ ہند و ہسٹری)

(۲) مہابھارت کی جنگ اسی ہزار برس پیشتر ہوئی تھی اور اس سے پہلے جینی پیشوا موجود تھے۔ (ایک جینی مصنف جن کا نام اسوقت یاد نہیں)

(۳) راجہ یدھشٹر کا زمانہ چار ہزار برس پیشتر کا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش)

(۴) موہنجوداڑو کی آبادی ہندو قوم پر مشتمل تھی اور رگ وید کی تصنیف کا زمانہ تین ہزار سال قبل عیسیٰ کا ہے (مصنفین کتاب Hindu Mathematics جو غالباً ریاضی داں ہونے کی وجہ سے کسی قدر احتیاط کو کام میں لائے ہیں)

(۵) "ایک ارب ستانوے کروڑ کئی لاکھ اور کئی برس دنیا کی پیدائش اور ویدوں کے ظاہر ہونے میں ہوئے۔" (اردو ایڈیشن ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۴۷)

(۶) انسانوں کی ابتدائی پیدائش تبت میں ہوئی۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۵)

(۷) آغازِ دنیا میں انسان وغیرہ ہزارہا کی تعداد میں جوان العمر پیدا ہوئے تھے۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۴)

(۸) "شروع دنیا میں انسان کی ایک ذات تھی۔ بعد ازاں شریفوں کا نام آریہ، عالم۔ دیو اور بدوں کا نام دسیو یعنی جاہل ڈاکو ہو جانے سے آریہ اور دسیو دو نام ہوگئے۔" (ایضاً صفحہ ۲۴۵)

(۹) "آریوں میں مذکورۂ بالا طور سے برہمن۔ کھشتری۔ ویش اور شودر چار تقسیم ہوئیں۔ دوج عالموں کا نام آریہ اور جاہلوں کا نام شودر اور اناریہ یعنی اناڑی ہوا۔" (ایضاً صفحہ ۲۴۵)

(۱۰) "آریہ اور دسیوؤں یعنی عالموں (دیو) اور جاہلوں (اسُر) کے درمیان ہمیشہ لڑائی جھگڑا ہوتا رہا۔ جب بہت فساد ہونے لگا تب آریہ لوگ اس قطعۂ زمین کو سب سے عمدہ جان کر یہاں آبسے۔ اسی وجہ سے اس ملک کا نام

"آریہ ورت" ہوا۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۵)

(۱۱) "اِس سے پہلے اِس ملک کا کچھ بھی نام نہیں تھا اور نہ کوئی آریوں سے پہلے اس ملک میں بستے تھے کیونکہ یہ لوگ ابتدائے آفرینش کے کچھ عرصہ کے بعد ہی تبت سے سیدھے اس ملک میں آکر بسے تھے۔" (ایضاً صفحہ ۲۴۶)

(۱۲) "یہ بات جھوٹی ہے کہ آریوں سے پہلے یہاں جنگلی لوگ بستے تھے یا یہ کہ یہاں کے آریوں نے جنگلیوں سے لڑکر اُن کو فتح کر کے نکالدیا کیونکہ کسی سنسکرت کی کتاب یا تاریخ میں ایسا نہیں لکھا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۲۴۶)

(۱۳) آریہ ورت کے باہر چار طرف اند ہمالیہ کے مشرق و مغرب و شمال و جنوب کے ممالک کے رہنے والوں کا نام آسُر ثابت ہے۔ جب یہ لوگ آریوں سے لڑنے کے لئے اُن پر چڑھائی کرتے تھے تو یہاں کے راجہ مہاراجہ اُنھیں ملکوں میں آریوں کے مددگار ہوتے تھے۔ چنانچہ ارجن اور مہاراجہ دشرتھ وغیرہ آریوں کی حفاظت اور آسُر دن کو مغلوب کرنے میں مددگار ثابت ہوئے۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۶)

(۱۴) پرماتما نے اول اول آدمیوں کو پیدا کر کے اگنی۔ وایو وغیرہ چار مہا رشیوں پر ایک ایک وید کو ظاہر کیا اور اُن کے ذریعہ سے برہما کو چاروں وید حاصل کرائے۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۱)

(۱۵) "ویدوں کو اس لئے سنسکرت میں پیش کیا گیا کہ وہ کسی کی ملک کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ ویدوں کی زبان خود تمام زبانوں کا ماخذ ہے۔" (ایضاً صفحہ ۲۲۱)

(۱۶) پہلے سنسکرت اور ویدی زبان سے لوگ ناواقف تھے لیکن جب اگنی وغیرہ رشیوں پر وید ظاہر ہوئے اور اُن رشیوں نے دوسرے رشی۔ مُنی۔ یوگی اور دھرماتما لوگوں کے مراقبہ کے ذریعہ سے اُن کے معنی معلوم کرنے کی وقتاً فوقتاً خواہش کی تو پرماتما نے مطلوبہ منتروں کے معنے ظاہر کئے اور پھر معنے ظاہر ہونے پر جو کتاب رشی منیوں نے معہ اپنی روایات کے لکھی وہ براہمن کہلاتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۳)

(۱۷) لوگوں نے غلط فہمی سے اُن رشی منیوں کو جن پر وید کے منتروں کے معنی وقتاً فوقتاً ظاہر ہوئے منتروں کا مصنف قرار دیدیا۔ جو شخص رشیوں کو منتروں کا مصنف بتلائے وہ غلط ہے۔" (ایضاً صفحہ ۲۲۳)

(۱۸) "جب تک ملک آریہ ورت سے تعلیم نہیں گئی تھی، تب تک مصر۔ یونان۔ یورپ وغیرہ ممالک کے باشندوں کو ذرا بھی علم نہیں ہوا تھا۔" (ایضاً صفحہ ۲۲۲)

ان دعووں کا اکثر حصہ ہندوستان کی مشہور و معروف کتاب سیتارتھ پرکاش (اُردو ایڈیشن) سے انتخاب و نقل کیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ دعوے صحیح ہیں؟ اور کیا واقعی ویدوں سے اس باب میں اس کا ثبوت ملسکتا ہے، اس سوال کا جواب آپ آیندہ صفحات میں پائیں گے۔

دریا۔ رگ وید میں پچیس دریاؤں کا نام لیا گیا ہے۔ اُن میں سے تین (ایک دریائے کابل اور دو اس کے معاون چشمے).

افغانستان کی حدود میں شامل ہیں۔ باقی دریا علاقہ پنجاب میں واقع ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آریہ فرقے ابتدائے ہندوکش پہاڑ کے مغربی دریاؤں سے داخل ہو کر دریائے کابل کے آس پاس سوات و گومل وغیرہ میں رہے اور پھر وہاں سے پنجاب کی طرف چلے۔ پنجاب کے دریاؤں کا تعلق دریائے سندھ (سندھو) سے پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض ندیوں کا نام صرف ایک مرتبہ آیا ہے اور بعض کے نام دو یا تین موقعوں پر لئے گئے ہیں۔ کثرت کے ساتھ جن دریاؤں کے نام آئے ہیں وہ سرستی اور سندھ ہیں۔ دریائے سندھ جن پانچ بڑے دریاؤں سے بنا ہے اُن کے رگویدی نام حسب ذیل ہیں:-

(۱) وِتستی۔ جہلم۔ (۲) اَسکنی۔ چناب۔ (۳) پُرُشنی۔ اِراوتی۔ راوی۔ (۴) وِپاش۔ بیاس۔ (۵) شُتُدری۔ ستلج۔

ایک پورا بھجن (سوکت ۷۵، کتاب دہم) دریائے سندھ کی تعریف میں ہے۔ جس میں اُس کی روانی و تیزی کی ثنا و صفت بیان کی گئی ہے۔ اُس کے اٹھارہ معاون چشموں کا بھی دو بندوں میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے "یہ چشمے اُس دریا کی طرف ایسے دوڑتے ہیں جیسے گائیں پیار کی آوازیں نکالتی ہوئی اپنے بچھڑوں کی طرف جھپٹتی ہیں"۔ لفظ "سندھو" کے ابتدائی اور اصلی معنی محض بڑے دریا کے ہیں لیکن بعد میں یہ لفظ اُس دریا کا مخصوص نام ہی ہو گیا جس کو اب سندھ کہتے ہیں۔ یہی وہ لفظ ہے جس کو یونانیوں نے اِنڈوس بنا دیا اور جس ملک میں انڈوس واقع ہے اُس کا نام انڈیا رکھدیا۔ اسی طرح قدیم ایرانیوں نے اُس ملک کا نام "ہندو" قایم کیا لیکن ایرانیانِ مابعد نے اُس کا نام ہندوستان (یعنی وہ ملک جس میں دریائے ہندو واقع ہے) رکھا۔

رگوید میں الفاظ "سپت سندھوا" کئی مرتبہ سات دریا کے معنی میں استعمال کئے گئے ہیں مگر ایک خاص موقعہ پر اُس ملک سے مراد لی گئی ہے جو ہندی آریوں کا مسکن ہے۔ اسی طرح اوستا میں "ہپت ہیندو" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں لیکن وہاں اُن سے مراد وہ ہندی علاقہ ہے جو مشرقی کابل میں شامل ہے۔ ان سات دریاؤں میں چھ تو آسانی کے ساتھ شناخت ہو سکتے ہیں یعنی جہلم وغیرہ اور دریائے سندھ، لیکن ساتویں کے متعلق شُبہ ہے کہ وہ دریائے کابل ہے یا سرسوتی۔ اکثر کا خیال یہی ہے کہ ساتواں دریا سرسوتی ہے۔

—— یہ دریا اب ریگستان میں غائب ہو چکا ہے لیکن اُس زمانہ میں غالباً دریائے سندھ کا معاون تھا اور بہت مقدس خیال کیا جاتا تھا۔ وہ اُس سرحد کی نمایندگی کرتا تھا جہاں تک رگویدی زمانہ میں آریہ اقوام پہونچی تھیں۔ اسی دریا کے آس پاس کا علاقہ جمنا تک بعد کے زمانہ میں "برہم ورت" کہلایا۔ جمنا کا نام رگ وید میں تین جگہ آیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو ہیں رگ وید ہی زمانہ ہی میں گنگا کی مغربی سرحد یعنی جمنا تک پہونچ گئی تھیں۔ رگوید میں گنگا کا نام صرف ایک جگہ آیا ہے گو بقیہ ویدوں میں گنگا کا نام کہیں نہیں پایا جاتا۔

محققین نے یہ رائے قایم کی ہے کہ رگویدی آریہ قومیں سمندر سے آشنا نہ تھیں۔ رگوید میں لفظ "سمندر" بہ معنی

آسمانی ذخیرۂ آب مستعمل ہونا پایا جاتا ہے اور سمندر کے مفہوم کے ساتھ اس لفظ کا استعمال بعد کے زمانہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ رائے متعدد وجوہ پر قایم کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ رگوید میں مچھلی کا ذکر شاذ پایا جاتا ہے اور دریائی سفر کا ذکر اسی طرح لیا گیا ہے جیسے کوئی ناؤ میں بیٹھ کر کسی ندی کو پار کرے۔ آجکل کا لفظ 'پار' وہی ہے جو رگ وید میں بمعنی 'کنارہ' آیا ہے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ رگوید میں دریائے سندھ کے دہانہ کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ایسی مصطلحات کتاب مذکور میں پائی جاتی ہیں جو سمندر میں جہاز رانی سے متعلق ہوں۔ البتہ 'اتھروید' میں ایسی عبارتیں اور مضمون پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے مصنفین سمندر سے آشنا تھے۔

پہاڑ۔ پہاڑوں کا ذکر بھی رگوید میں اکثر آیا ہے لیکن ایک پہاڑ کی چوٹی کے سوا جس کو 'مجاوٹ' کہا گیا ہے پہاڑوں کو بالعموم "ہمونتہ" (برفستانی کوہستان) کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے۔ کوہِ مجاوٹ کا بجز اس کے کہ وہ 'سوم' کا گھر ہے کوئی اور پتہ یا نشان درج نہیں ہے۔ مابعد کی لٹریچر سے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ایسا پہاڑ تھا جو وادیٔ کابل کے نزدیک کشمیر کے جنوب و مغرب میں واقع تھا۔ اتھروید میں اس سلسلہ کی دو اور چوٹیوں کا ذکر ہے۔ ایک 'ترکٹ'، دوسری 'ناؤپربھرمشن' پہلی کو اب ترکوٹہ کہتے ہیں جس کے دامن میں چناب بہتی ہے۔ دوسری کا نام بعد میں "ناؤبندھن" اور "منوؤ وسرپن" ہوگیا 'ناؤبندھن' وہ پہاڑ ہے جس پر "شت پتھہ" براہمنڑ کے بیان کے مطابق طوفان ختم ہوجانے کے بعد منو کی کشتی ٹھیری تھی رگوید میں وندھیاچل کے پہاڑوں اور دریائے نربدا کا کوئی حوالہ یا ذکر نہیں ہے جو ہندوستان اور دکن کے درمیان حدِ فاصل ہیں۔

بیانات مندرجۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ رگ ویدی زمانہ میں آریہ اقوام ہندوستان میں کابل کی طرف سے داخل ہونے کے بعد سندھ پار کر کے مشرق کی طرف بڑھیں اور جمنا کے مغربی علاقہ تک دریائے سرسوتی کے آس پاس آباد ہوگئیں۔ اس علاقہ کی کیفیت یہ ہے کہ دریائے سندھ (سنگھم کے اوپر کے حصے) اور دریائے ستلج کے درمیان کا حصہ طوفانی کیفیات سے پاک وصاف ہے اور وہاں کے مناظرِ فطرت بہت لطیف و کیف افزا ہیں۔ لیکن دریائے ستلج کے مشرق جنوب کے علاقہ میں تلاطم خیز طوفانوں کی کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ بنابریں محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ رگ وید میں جو بھجن 'اُشس' (صبح کی دیوی) اور ورُن (آسمان کے دیوتا) سے متعلق ہیں وہ دریائے سندھ اور دریائے ستلج کے درمیانی علاقہ کی پیداوار ہیں اور فضائی جنگوں کے قصے دریائے ستلج اور دریائے جمنا کے درمیانی ملک کی کیفیات سے وابستہ ہیں۔

نباتات — اس خیال کی تائید کہ رگویدی زمانہ کے فرقوں کا مسکن علاقۂ مذکورۂ صدر تھا اُمور ذیل سے بھی ہوتی ہے ایک یہ کہ رگوید کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'سوم' کا پودا پہاڑوں پہ پیدا ہوتا تھا اور وہاں سے آسانی کے ساتھ دستیاب ہوجاتا تھا۔ لیکن براہمنڑوں میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ دور دراز مقامات سے بمشکل حاصل کیا جاتا تھا اور اکثر اُس کے میسر نہ ہونے سے ایک دوسری قسم کی نشہ آور بیل استعمال کی جاتی تھی۔ رگ وید میں جو کی کاشت کا تو ذکر ہے لیکن

چاول کا کہیں نام نہیں آیا ہے گو بعد کی تصنیفات میں یہ جنس ضروریات زندگی میں داخل سمجھی جاتی تھی - ظاہر ہے کہ چاول کی کاشت کا تعلق جنوب و مشرقی حصۂ ملک سے ہے جہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے -

تناور درختوں میں رگویدی بیانات کے اعتبار سے اشوتھہ (گھوڑے کی قیام کی جگہ) نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس درخت کو بہت متبرک ظاہر کیا گیا ہے - اُس کے پھل (پھلیاں) پرندوں کی خوراک ہیں - اُس کی لکڑی سے سوم رس کے لئے پیالے بنائے جاتے تھے - اتھروید سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی لکڑیوں کو رگڑ کر آگ بھی پیدا کیجاتی تھی - مابعد کی تصنیفات میں بیان کیا گیا ہے کہ اس درخت کے سایہ میں دیوتاؤں کی نشست ہے - غالباً یہ وہی درخت ہے جس کو رگوید میں اس طور سے بیان کیا گیا ہے کہ اُسکے گھنے پتوں کے سایہ میں بزرگوں کی روحیں بادشاہ یم کے ساتھ عیش و آرام کر رہی ہیں" یہی وہ درخت ہے جس کو اب پیپل کہتے ہیں اگرچہ بڑ کا درخت بھی ہندوستان میں ہوتا ہے لیکن اُس کا کوئی ذکر رگ وید میں نہیں -

وحشی جانور - وحشی جانوروں میں سے رگوید میں شیر ببر کا ذکر بہت آیا ہے - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رگویدی زمانہ کا مشہور و معروف جانور ہے - ابتک ہندو ناموں کے ساتھ "سنگھ" کا لفظ اُس کی یادگار ہے - یہ جانور اب علاقۂ پنجاب میں نایاب ہے اور گجرات میں پایا جاتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رگویدی زمانہ میں وہ دریائے سندھ کے مشرق میں رگوید کے بیان کے مطابق گھنے پہاڑی جنگلوں میں رہتا تھا -

معمولی شیر کا رگوید میں کوئی ذکر نہیں - اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ بنگال جیسے ملک کا جانور ہے جہاں تک رگویدی لوگ نہیں پہونچے تھے - پہلی مرتبہ یجروید میں سوتے ہوئے شیر کو جگانے کا محاورہ استعمال میں آتا پایا جاتا ہے اور اُسکے بعد اتھروید میں مردم خوار شیر کا ذکر ہے - اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کے بعد آریہ اقوام نے کس طرف رُخ کیا -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رگ ویدی آریوں کے لئے ہاتھی ایک نئی چیز تھا - یہ بات اس سے مترشح ہوتی ہے کہ رگ وید میں اُس کا نام "مرگ ہستین" یعنی ہاتھوں والا جانور ہے اور اُس کے نام کا جزوِ اول مرگ ساقط ہو چکا ہے - یعنی ان کتابوں میں یہ محض 'ہستین' کہلاتا ہے - یہی وہ لفظ ہے جو اردو زبان میں ہاتھی اور گنواری زبان میں ہتھی ہے -

"ورکا" یعنی بھیڑئے سے رگویدی لوگ شیر ببر سے بھی زیادہ واقف تھے اور سور کا بھی رگوید میں اکثر ذکر آیا ہے - اس ذکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتوں کے ذریعہ سے اُس کا شکار کیا جاتا تھا - جنگلی اور پالتو بھینسے سے بھی وہ لوگ واقف تھے، ور شاعروں نے اُس کے گوشت کے پکائے اور کھائے جانے کا بھی بہت ذکر کیا ہے - رکشا (ریچھ) کا ذکر بھی رگ وید میں ایک جگہ آیا ہے اور اخیر زمانہ کے ایک بھجن میں بندر کا بھی بیان اس طرح کیا گیا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ وہ پالتو بنالیا گیا تھا - بندر کے لئے لفظ کپی استعمال کیا گیا ہے جو کسی قدیم مقامی زبان کا لفظ ہے بعد کے زمانہ میں سنسکرت

لفظ 'وانر' (جنگل کا جانور) بندر کے معنی میں مستعمل ہوا اور اب تک رائج ہے۔
پالتو جانور — پالتو جانوروں میں بھیڑ۔ بکری۔ گدہا اور کتوں کا ذکر ہے، لیکن گائے اور بیل کا نمبر اول ہے۔ کتوں سے شکار اور حفاظت کا اور سراغ لگانے کا کام لیا جاتا تھا۔ گائے بیل کا شمار دولت میں تھا خصوصاً گائے کا۔ پوجا کرانیوالوں کو گائیں ہی انعام میں دیجاتی تھیں اور ایسے انعام کو 'دکشنا' کہا جاتا تھا اور اُس کے آگے لفظ 'گاؤ' کو محذوف سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی یہی لفظ مستعمل ہے۔ آج کل کی زبان میں اُس کو پوجا کی فیس کہہ سکتے ہیں۔ دراصل اُسکے معنی 'دائیں' اور 'قیمتی' کے ہیں۔ ملک دکن کا نام اسی لفظ سے ماخوذ ہے، کیونکہ آفتاب کے طلوع ہونے کی سمت رخ کیا جائے گا تو ملک مذکور سیدھے ہاتھ کی طرف ہوگا۔ بہرصورت گائے بلکہ اس کی آواز تک شاعروں کے نزدیک محبوب تھی۔ رگ وید میں گائے کے مارنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُس کے نکاح والے بھجن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاص خاص موقعوں پر کھانے کے لئے گائے ذبح کی جاتی تھی اور بیلوں کی قربانیوں کا تو 'اندر' کی پوجا کے سلسلہ میں اکثر ذکر آیا ہے۔ گائیں زیادہ تر دودھ کے کام کی ہوتی تھیں اور چرنے کے لئے چھوڑ دیجاتی تھیں۔ بیلوں سے ہل چلانے اور گاڑی میں جوتنے کا کام لیا جاتا تھا جب یجروید کا زمانہ آیا تو اس وقت گائے مارنے کی سخت ممانعت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ اس جرم کی سزا موت مقرر تھی۔

گھوڑوں کا بھی دولت میں شمار تھا اور جس طرح گائیں ملنے کی دعائیں مانگی جاتی تھیں، اُسی طرح گھوڑوں کے لئے آرزو کی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک گھوڑے سواری کے کام میں نہیں لائے گئے تھے بلکہ لڑائی کے رتھوں میں جوتے جاتے تھے اور رتھوں کی دوڑ میں اُن سے کام لیا جاتا تھا۔ گھوڑے کی قربانی بھی منجملہ دیگر جانوروں کی قربانیوں کے بہت اہم اور موثر قربانی تصور کی جاتی تھی۔

پرندے — پرندوں کی ذیل میں ہنس (ہمس)۔ چکوا چکوی (چکرواک)۔ مورنی (میوری) اور توتا (شوک) ایسے رگویدی پرندے ہیں جو تاریخی اور ادبی دلچسپی کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ ہنس سنسکرت کلاسکل لٹریچر کا معروف و مانوس پرندہ ہے اور رگ وید میں اُس کو پانی میں تیرتا ہوا یا ہوا میں قطار باندھے اُڑتا ہوا بیان کیا گیا ہے۔ یجروید نے اُس کو یہ قوت عطا کی ہے کہ وہ سوم کو پانی سے علٰحدہ کر سکتا ہے۔ بعد کی شاعری میں وہ پانی میں سے دودھ نکالتا ہوا نظر آتا ہے۔
چکوا چکوی کا رگوید میں صرف ایک مرتبہ اشوین دیوتاؤں کے سلسلہ میں اس طریق پر ذکر آیا ہے کہ یہ دیوتا چکوا چکوی کے جوڑے کی طرح صبح کے وقت نمودار ہوتے ہیں۔ اتھروید میں یہ پرندہ ازدواجی محبت کے نمونہ کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ رگوید کے مطابق مورنیوں کی صفت یہ ہے کہ وہ زہر کو دفع کر دیتی ہیں یا چوس لیتی ہیں۔ یجروید کے زمانہ میں توتا انسانی زبان میں بولتا ہوا بیان کیا گیا ہے اور پالتو کر لیا گیا ہے۔

دھاتیں — دھات کی قسم کی چیزوں میں سونے کا رگوید میں بہت ذکر ہے۔ اس کی ڈلیاں انعام میں دیجاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجہ و اُمرا اُس کو بہت فکر سے جمع کرتے تھے۔ اُس وقت غالباً یہ دریائے سندھ سے برآمد ہوتا تھا

اس کے بنے ہوئے زیور بھی بہت استعمال میں تھے جن میں سے کانوں کی بالیوں اور بازو بندوں کا اکثر ذکر کیا گیا ہے۔ تانبے اور کانسہ کا بھی رواج ہونا پایا جاتا ہے البتہ رگوید میں چاندی کا کوئی ذکر نہیں۔ لوہے کی کیفیت مشکوک قیاس کی گئی ہے کیونکہ رگوید میں جو لفظ ایک مروجۂ وقت دھات کے لئے استعمال ہوا ہے اُس کے معنی مخصوص طور پر لوہے کے نہیں اور اُس دھات کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ باعتبارِ رنگ لوہے سے نہیں ملتی۔

مقامی باشندے — مذکورہ ملکی حالات کے علاوہ رگوید سے کچھ مقامی باشندوں کے حالات بھی معلوم ہوتے ہیں کتاب مذکور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں داخل ہونے والی آریہ اقوام مقامی قوموں کو دسیو (داس) کہتے تھے۔ جس کا ابتدائی مفہوم عفریت (یا فارسی لفظ - دیو) تھا۔ اس لفظ کی مفصل کیفیت سنسکرت لفظ "دیوا" کی تشریح کے سلسلہ میں بیان کی جا چکی ہے۔ آریہ فرقوں کو انھیں دیسی لوگوں سے لڑنا بھڑنا پڑا۔ رگوید میں اُن کو کالے رنگ والے (کرشن) اور کالے چمڑے والے کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ فاتح اقوام اپنے آپ کو آریہ (رشتہ دار) کہتی تھیں اور مفتوحہ قوموں کو "ان آریہ" کہنے لگی تھیں۔ (ملاحظہ ہو آجکل کا اُردو لفظ - اناڑی یعنی ناواقف) - رنگ کی تفریق جس کے لئے سنسکرت کا لفظ "ورن" ہے بڑی اہم ہے۔ کرشن (سیاہ) کے مقابلہ میں فاتح اپنے رنگ کو آریہ ورن کہتے تھے۔ یہی لفظ ورن ذات پات کے معنی بھی رکھتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ رنگ کی یہ ابتدائی تفریق آئندہ زمانہ میں ہندو قوم میں متعدد ذاتیں بننے کا باعث ہوئی۔ جب اکثر حصہ مفتوحہ اقوام کا غلام بنا لیا گیا تو لفظ "داس" کے معنی میں بھی تبدیلی ہو گئی یعنی لفظ مذکور لفظ غلام کا مترادف ہو گیا اور غلام بھی دولت میں شمار ہونے لگے۔ چنانچہ ایک شاعر ذکر کرتا ہے کہ اُس کو دان میں ایک سو گؤ ہے۔ ایک سو بھیڑیں اور ایک سو داس ملے۔ جب یہی مفتوحہ قومیں پوری مطیع بنالی گئیں اور رعایا کے زمرہ میں داخل ہو گئیں تو داس کے بجائے وہ چوتھی ذات بن گئیں اور "شدر" کہلانے لگیں۔ ابتدائی زمانہ میں یہ مفتوحہ قومیں زیادہ تر بھیڑ بکری وغیرہ پالنے والی قومیں تھیں جن کی دولت یہی مویشی ہی تھے رگوید کے بیان کے مطابق وہ مٹی کے بنے ہوئے حصاروں میں رہتے تھے جن کو "پُر" کہتے تھے۔ اندر دیوتا کے کارناموں میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ اپنے پرستاروں کے لئے سو سو پُرے فتح کرا دیتا تھا۔ مفتوحہ اقوام کے عقاید کے متعلق رگ وید سے صرف اس قدر واقفیت حاصل ہوتی ہے کہ بھجنوں میں اُن کو کافر و منکر - ناپاک - قربانی نہ کرنے والے اور دیوتاؤں کی پوجا پاٹ نہ کرنے والے بیان کیا گیا ہے۔ انھیں اقوام سے متعلق اعضائے مخصوص کے پرستاروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہی پرستش خود آریہ اقوام میں مروج ہو گئی چنانچہ مہابھارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب مذکور کی تصنیف کے زمانہ میں "شو" کی پوجا اسی شکل میں کی جاتی تھی۔ یوں تو عام طور پر یہ پرستش تمام ہندوستان میں رائج ہے لیکن جنوبی ہند میں اس کا زور زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسوقت جنوبی ہند ہی میں وہ قومیں بہت آباد ہیں جن کی حکومت آریوں سے قبل ہندوستان میں تھی — محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ڈراوڑ قومیں اُنھیں اقوام کی نسل سے نسبت رکھتی ہیں جو سن عیسوی سے ڈھائی

تین ہزار برس پیشتر مہنجو دارو اور ہڑپا وغیرہ میں آباد تھیں اور یہ کہ اعضائے مخصوص کی پرستش کا طریقہ بھی اُس زمانہ سے رائج ہے کیونکہ مہنجو دارو کے آثار میں بہت سی سنگین علامات اُس شکل و صورت کی برآمد ہوئی ہیں جن کی پرستش کیجاتی ہے اس طور پر رگ وید کے بیان کی مطابقت زمانۂ حال کی تحقیقات کے نتیجہ سے بھی ہوتی ہے۔

مندرجۂ بالا بیانات ظاہر ہے کہ آریہ اقوام کی موجودگی ہندوستان میں بہت قدیم نہیں ہے نیز یہ کہ یہ قومیں ہندوستان کی ابتدائی یا قدیم پیداوار نہیں ہیں۔ رگ ویدی ندی۔ نالے۔ پہاڑ۔ چرند۔ پرند اور اشیائے استعمالی سب پنجاب سے ہی متعلق ہیں۔ یہ تعلق بھی تدریجی ہے۔ یعنی رگ ویدی بیانات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شمال و مغربی جانب سے داخل ہونے پر رگ ویدی اقوام کسی طرح اور کہاں کہاں قدم بڑھاتی گئیں اور کس قسم کے مقامی قوموں سے اُن کی مڈبھیڑ ہوئی۔ مقامی لوگوں کے کیا عقاید تھے اور اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ حالاتِ مذکور کا بعد کے حالات سے مقابلہ کرنے پر ان دعوؤں کو صحیح نہیں مانا جا سکتا کہ ست جگ وغیرہ مروجہ سموتوں کے نام ہیں، یا مہا بھارت کی جنگ عظیم اسی ہزار برس یا بقول دیگر چار یا پانچ ہزار برس پیشتر واقع ہوئی تھی۔ یا یہ کہ مہنجو دارو کی تہذیب و تمدن آریہ تہذیب تھی، کیونکہ رگ ویدی تہذیب اور مہنجو دارو کی تہذیب میں باہم سخت اختلاف ہے اور جب آریہ اقوام پنجاب میں داخل ہوئی ہیں تو مہنجو دارو وغیرہ اُس داخلہ سے ہزار پندرہ سو سال پیشتر نیست و نابود ہو چکے تھے۔

ح - ا

شہوانیات کیا ہے؟

منجملہ ۱۴۴ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں:۔

فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا — شادی، طلاق و خلع — مذہبی فحاشیاں۔
فحاشی پر عمومی تبصرہ — استلذاذ بالمثل — استلذاذ بالنفس — استلذاذ بالوحوش۔
فحاشی قرون وسطیٰ میں — عہد جدید اور فحاشی — اخلاق جنسی۔

جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتنا جامع تاریخی، علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئیگا۔ حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اُردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے۔ حجم ۲۱۶ صفحات — کاغذ سفید و دبیز — قیمت علاوہ محصول چار روپئے۔

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرہ

تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد

(سید آغا حامد صاحب)

"نگار" بابتِ ستمبر ۶۰ء میں "آزادی اور تقسیم" کے عنوان سے "نئی زندگی" کے ایک مضمون کا اقتباس شایع ہوا ہے۔ اس مضمون میں چند باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ صاحبِ مضمون نے تقسیمِ ہند کی مخالفت اس بنا پر کی ہے کہ اولاً اس سے مسلمانوں کو مجموعی طور پر سب سے زیادہ نقصان پہونچا ہے اور ثانیاً یہ کہ تقسیم نہ ہندوؤں کی فتح ہے نہ مسلمانوں کی، بلکہ انگریزوں کی اس لئے کہ انگریزوں کی پالیسی ہی کی بدولت دنیا میں متعدد پاکستان بن چکے ہیں۔ لیکن جو واقعات موصوف نے پیش کئے ہیں وہ حقیقت کے خلاف ہیں۔ کناڈا میں نہ پاکستان قایم کیا گیا نہ کسی تاریخ میں اس کا پتہ چلتا ہے کہ کناڈا میں امریکہ کی جنگ آزادی کے دوران میں انگریزوں نے خانہ جنگی کرائی۔ اگر موصوف اس واقعہ کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ جہاں تک مطالبات کا تعلق ہے حق انگریزوں ہی کا تھا۔ مصالحت کی ہر امکانی کوشش کی گئی۔ انگلستان کی طرف سے زیادہ اور ممالک متحدہ امریکہ کی طرف سے کم، لیکن جنگ کا سبب کچھ اور ہی تھا اور چونکہ نفسیاتی اعتبار سے اہل امریکہ حق بجانب تھے اس لئے فتح ان کی ہوئی اور وہ بھی فرانسیسی جنگی بیڑہ کی مدد سے۔ ممالکِ امریکہ نے اعلانِ آزادی سے پہلے نہ تو جداگانہ قومیت کا اظہار کیا اور نہ جنگِ آزادی کا ارادہ کیا۔ بلکہ مصالحانہ گفتگو کے دوران میں جو عرضداشت برطانوی "تاج" کے پاس بھیجی اس میں شدت سے تاج کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا اور بہ حیثیت انگریز ہونے کے اپنی آزادی کا مطالبہ کیا۔ اسی طریقہ سے آئرلینڈ کی مثال بھی موصوف نے صحیح نہیں دی ہے۔ چنانچہ جنگ میں آئرلینڈ نے کا ملاً بے طرف بلکہ ایک حد تک فاسسٹوں کے لئے امید کا سہارا بنکر اپنی خود مختاری کا ثبوت دیا انگریزی فوجیں نہ ایلسٹر میں ہیں نہ کناڈا میں۔ فلسطین سے زیادہ انگریزوں کی شرمناک عہد شکنی کی مثال کسی اور ملک کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی لیکن صاحب مضمون نے پاکستان کی مثال صحیح نہیں دی۔ عموماً نیشنلسٹ اخبارات میں پاکستان کے مطالبہ کو یہودیوں کے مطالبہ کے مثل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ جب فلسطین میں اقلیت کا مطالبہ ناجایز ہے تو ہندوستان میں "اسی طرح کا" اقلیت کا مطالبہ کیونکر جایز ہو سکتا ہے، لیکن یہ آجتک کسی نے نہ

بتایا کہ یہودیوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے مطالبے کس بنا پر" ایک ہی طرح کے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان یہودی اقلیت کے برعکس علم، دولت، صنعت، سب میں فریقِ مخالف سے پیچھے ہیں اور ان کو کسی قسم کا تفوق حاصل نہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ ہندوؤں کو بیدخل کر کے سارا ملک مسلمانوں کے حوالہ کر دیا جائے۔ بڑا نقص ہوتا ہے کہ واقعات سے ہٹ کر ناحق کو حق ثابت کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ یہاں میرا مقصد یہ کہنا نہیں ہے کہ انگریزوں حمایت کروں۔ لیکن یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اپنے نقایص کی ذمہ داری ہمیشہ انگریزوں ہی کے سر کیوں تھوپی جائے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ موصوف نے کس بنا پر دہلی کے بعد راولپنڈی کو انگریزی فوجوں کا مرکز قرار دیا ہے۔ جہاں تک بیانات کا تعلق ہے انگریز ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں سے فوجیں ہٹانے کا وعدہ کر چکے ہیں، اور اگر پاکستان سے وعدہ خلافی کر سکتے ہیں تو ہندوستان سے بھی کر سکتے ہیں اس لئے کہ بہ جبر نہ پاکستان والے انگریزی فوج کو نکال سکتے ہیں نہ ہندوستان والے۔ اسی طرح موصوف نے اس واقعہ کو بھی بالکل نظر انداز کر دیا کہ انگریز فوجی افسر صرف پاکستان ہی نے نہیں بلکہ ہندوستان نے بھی مقرر کئے ہیں، اور یہ ابھی سے کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان نو آبادیات کا درجہ قبول کر لے گا اور ہندوستان مکمل آزادی کا اعلان کرے گا۔ قطع نظر اس سے کہ جہاں تک آئینی مرتبہ اور اختیارات کا تعلق ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ کے فرق کے علاوہ درجۂ نو آبادیات اور مکمل آزادی میں خاص فرق کیا ہے۔

جہاں تک مطالبۂ پاکستان کا تعلق ہے عرصہ سے یہ دلیلیں سننے میں آ رہی ہیں کہ پاکستان کا مطالبہ درحقیقت انگریزوں کا پیدا کردہ ہے۔ مطالبۂ پاکستان میں رجعت پسند تعلقداران اور سرمایہ داروں کے اغراض کارفرما ہیں۔ حالانکہ موصوف نے خود ہی مسلمانوں کی "سرمایہ داری" کا اعتراف کر لیا ہے۔ خود مسلمان پاکستان نہیں چاہتے اور پاکستان نہ صرف مجموعی حیثیت سے ہندوستان بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کے مخالف ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ خود مسلمانانِ پاکستان کے حق میں زہر سے کم نہیں، لیکن اس کی کسی نے بھی تشفی بخش دلیل نہیں پیش کی کہ مطالبۂ پاکستان کس بنا پر حق اور انصاف کے خلاف ہے۔ مشکل یہ ہے کہ انگریزوں سے سیاسی چالیں سیکھنا تو آسان ہے لیکن انکی اخلاقی جرأت اور کردار کی مضبوطی کی طرف توجہ نہیں کی گئی، انگریز مصر اور فلسطین میں جس غرض سے ہنگامہ آرائی کر رہا ہے اس کا سبب ظاہر ہے لیکن انگریز ۱۸۵۷ء کو جس طرح گزارے گئے وہ بھی ظاہر ہے، اور انگریز جہاں اسکے مفاد کا مسئلہ اُٹھتا صاف الفاظ میں اپنا رویہ ظاہر کر دیتا ہے، انگریز نے ہندوستان میں کیا کچھ نہیں کیا لیکن انگلستان اور اسکاٹلینڈ میں جس طرح اتحاد ہوا وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ ہندوؤں سے مسلمانوں کے تعلقات خراب کرائے گئے لیکن اگر اسکی ذمہ داری اسی پارٹی پر ہے جس کے سر الزام تھوپا جا رہا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اُس پارٹی کے مطالبات میں سات سال کے عرصہ میں تمام انقلابات کے باوجود تبدیلی نہیں ہوئی اور وہ بات جو ۱۹۳۹ء میں کو کہی گئی کہ "ہم نے یہ محسوس کیا کہ کافی لوگ ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتے" پہلے ہی کہدیجاتی تو کیوں یہ سب ہنگامہ آرائی ہوتی۔ لیکن یہ بات تو صرف واقعات نے مجبور کر کے کہلوائی۔

یہی بات موصوف کی ۱۶ مئی ۴۶ء والی اسکیم کے سلسلے کے بیانات میں ہے۔ وزارتی اسکیم جس فارمولے کے مطابق مرتب کی گئی وہ کس کا پیش کردہ تھا، لیگ کا یا مولانا آزاد کا۔ اسکیم تین باتوں پر قایم کی گئی۔ مرکزی یونین جس کے تحت صرف دفاع اور امور خارجہ اور وسایل ارتباطی رکھے گئے، مسلم لیگ نے خود ہی یہ تجویز پیش کی لیکن کانگریس کمزور مرکز کیونکر قبول کر سکتی تھی اور اس نے Currency، Customs اور Economic planning کو بھی شامل کرنے پر اصرار کیا۔ لیگ نے بی اور سی، گروپ کی تجویز پیش کی، لیکن کانگریس نے آسام اور سرحد کو ان گروپ میں شامل کرنے کی مخالفت کی۔ لیگ نے بی اور سی گروپ میں سادہ اکثریت کا اصول پیش کیا اور کانگریس نے ہندوستانی مرکز میں اس اصول کی حمایت کی اور ان گروپ میں اسکی مخالفت۔ اسکیم درحقیقت انگریز کے ذہن میں پہلے ہی سے طیار تھی وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ خود ہندوستانی اُسے پیش کریں۔ موصوف نے ۱۶ مئی والی اسکیم کے فواید مسلمانوں کے لئے وضاحت سے بیان کئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کس نے اسکیم کو پہلے اور بلا شرط منظور کیا، کس نے ۲۵ مئی والی وضاحت کو تسلیم کیا اور اس کے برعکس کس نے کہا کہ ہم اسکیم کے جس حصہ کو چاہیں گے مانیں گے جسے نہیں چاہیں گے نہیں مانیں گے، ہم اسکیم کو بہ حیثیتِ مجموعی مانتے ہیں لیکن اسکیم پیش کرنے والوں کی وضاحت کا کوئی حق نہیں ہے، ہم صرف اپنی توضیح کو مانیں گے اور بہر صورت اسکیم میں گروپنگ کے متعلق جو کچھ بھی کہا گیا ہے اس کا اطلاق ہر حالت میں آسام پر نہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ ۱۶ مئی والی اسکیم کیوں ناکام رہی، ان سوالات کے جواب سے اچھی طرح سے ظاہر ہے۔ موصوف نے مسلم لیگ کی حماقت پر کفِ افسوس ملا ہے کہ "مساوات" کی سنہری چڑیا ہاتھ سے جانے دی لیکن سوال یہ ہے کہ اور لوگ اس مساوات کے لئے طیار ہی کب ہوئے؟ جب عارضی حکومت میں "مساوات" کو غیر منصفانہ قرار دیکر ناقابل قبول بتایا گیا تو جس حد تک یونین کی آئینی اسمبلی میں اسکو برتا جاتا ظاہر ہے۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ بدلہ لینے والی تجویز پاکستان ملنے پر خوش ہونے والوں سے کس بنا پر منسوب کی جاتی ہے۔ لاہور رزولیوشن (۴۰ء) میں پاکستان کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے تحفظ کا پورا اطمینان بھی دلایا گیا تھا اور بجائے بدلہ لینے کی دھمکی کے ہر موقعہ پر اطمینان دلانے کی کوشش میں اضافہ ہی ہوتا گیا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ۳ جون کے بیان کے بعد اچاریہ کرپلانی اور سردار پٹیل ہی نے پاکستان والوں کو ہندوستان میں بسنے والے چار کروڑ کی یاد دلائی ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ بہار اور گڑھ مکتیشر کے واقعات کس کی سعی عمل کا نتیجہ ہیں۔ بہر حال، موصوف نے "مسلمانوں کو کیا ملا" کے تحت پاکستان کے فواید اور نقصانات بیان کئے ہیں۔ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں کی آنکھیں صاف طور پر اپنی کمزوری اور قوت کا جایزہ لے رہی تھیں اور اگر انہی کمزوریوں اور نقصانات کو مطمحِ نظر بنانا صحیح ہے تو جتنی قومیں آزاد ہوئی ہیں ان سب کو چاہئے کہ اپنی آزادی واپس کر دیں اور سب سے پہلا قدم امریکہ کو اُٹھانا چاہئے۔ جدلیات اور توازن کا اصول قدرت نے ہر جگہ رکھا ہے۔ سوال اسکا رہتا ہے کہ کیا اسی توازن کی وجہ سے قوت عمل کو فنا کر دیا جائے اگر پاکستان والوں کی یہ خواہش کہ اپنے وسایل سے اپنے حقوق کے مطابق استفادہ کریں حماقت ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ خود ہندوستان میں انگریز دوبارہ کیوں نہ بلائے جائیں،

اس لئے کہ یہاں تو اقتصادی اور صنعتی ترقی کے سوال کے علاوہ نظم ونسق کا بھی مسئلہ درپیش ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے پاس سرمایہ اور ماہرین صنعت کی کمی ہے۔ مگر ہندوستان کے مقابلہ میں اتنی نہیں جتنی امریکہ، برطانیہ اور روس کے مقابلہ میں۔ لیکن اگر اس کمی کی بنا پر پاکستان والوں کا اخلاقی فرض یہ ہونا چاہئے کہ اپنے تمام وسایل نذرِ احباب کر دیں تو ہندوستان والوں کا بھی اخلاقی فرض یہ ہونا چاہئے کہ اپنے وسایل انگریزوں یا اہل امریکہ کے قدموں میں لاکر ڈالدیں اس لئے کہ ہندوستان کی آبادی اور ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے، یہاں بھی نہ سرمایہ کافی ہے نہ ماہرین۔ مشکل یہ ہے کہ موصوف تاریخ کے اس بنیادی ارتقائی اُصول کو تسلیم نہیں کرتے کہ قومیں ارادہ اور قوتِ عمل سے ترقی کرتی ہیں، خوش حال قوم وہ ہوتی ہے جو اس پر تکیہ نہیں کرتی کہ اسکے پاس کیا ہے بلکہ اسکی کوشش کرتی ہے کہ قدرت کی نعمتوں سے سائنٹفک اُصولوں کے ماتحت مستفید ہو اور اُن نعمتوں کو ترقی دے۔ پاکستان ابھی قایم ہوا ہے، اس کے پاس سرمایہ اور کام کرنے والوں کی بہت کمی ہے، لیکن اگر سات سال کے عرصہ میں پاکستان قایم کیا جا سکتا ہے تو اسی مدت میں اقتصادی اور معاشرتی ترقیاں بھی کی جا سکتی ہیں، اگر پاکستان شدید مخالفت کے باوجود قایم ہو سکتا ہے تو شدید مخالفت کی ساری کوششوں کے باوجود پنپ بھی سکتا ہے، اس لئے کہ مواد دونوں کے لئے ایک ہی ہے۔ ۱۵ر اگست کو ایک مہینہ گزرا اس لئے ابھی سے یہ فیصلہ کر لینا کہ بہر صورت "قسمت میں" غلامی ہی لکھی ہے قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ یہی بات موصوف کے مضمون کے آخری حصہ پر صادق آتی ہے۔ اسلامی تمدن، زبان، مزارات کا مرکز ہندوستان ہے، یہ ایک بین حقیقت ہے لیکن اگر اس کی بنا پر پاکستان کا قایم کرنا قابلِ اعتراض ہے تو یقیناً ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے مرکز حجاز میں واپس چلا جانا چاہئے۔ پاکستان کے سامنے جو مشکلات ہیں موصوف نے انکی بالکل صحیح وضاحت کی ہے پھر بھی اس فیصلہ سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ اسکا مستقبل بالکل تاریک ہے۔ ہندوستان میں رہنے والے چار کروڑ مسلمان پہلے بھی اپنی قسمت سے واقف تھے اور اب بھی ہیں۔ لیکن خواہ مخواہ اُن سے وہ خیالات منسوب کئے جا رہے ہیں جو اُنکے نہیں ہیں۔ یہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ "ہندوستان ہمارا وطن ہے، ہم یہیں کے باشندے ہیں، ہم اسی کو اپنا وطن سمجھتے ہیں، اس کی خدمت ہمارا فرض ہے، ہم اسی سے وفاداری کا حلف اُٹھاتے ہیں"۔ اور دنیا کے سامنے ان جذبات کو اس صورت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ "اگر ہندوستان کے مسلمانوں پر مظالم ہوئے تو اس کا بدلہ پاکستان کے ہندوؤں سے لیا جائے گا، پاکستان میں اسلامی حکومت قایم کی جائے گی اور پھر مسلمان منظم ہو کر سارے ہندوستان کو فتح کر لیں گے"۔ حالانکہ ہندوستان کو ہر اعتبار سے یہاں کے مسلمان اپنا وطن سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے، ہندوستانی شہریت پر ان کو فخر رہا اور رہے، ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت اور اخوت کی ہمیشہ انھوں نے کوشش کی اور کرتے رہیں گے، جو خدمت اُنسے ممکن ہے اس میں نہ انھوں نے کبھی کمی کی نہ کریں گے، موصوف نے جس انداز سے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہو وہ بھی خواہ جس لہجہ میں مسلمانوں کی پالیسی اور خطرات کو پیش کیا ہے، اس سے ہمدردی، اور حقیقی دوستانہ فکرمندی جھلکتی ہے، مسلمان اپنی نیت اور ارادہ کا اظہار کر چکے ہیں اور ہندوستان میں سوشلسٹ حکومت کے قیام کے لئے ہر تعاون اور خدمت کے لئے دل وجان سے حاضر ہیں۔

(نگار) ہماری رائے میں اب اس قسم کی بحثوں کا وقت نہیں کہ ہندوستان کی تقسیم مناسب تھی یا نہیں، کیونکہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور اس فیصلہ کو اب ہندو مسلم آبادی ہی منسوخ کر سکتی ہے اگر کسی وقت اسکو یکدلی و یکجہتی کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کی توفیق خدا نے دی۔ موجودہ حالات میں صرف اس بات پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ امن وسکون کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے سو اس پر بھی زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں، کیونکہ انکا مفاد صرف اسی میں ہے کہ وہ حکومت سے تعاون کریں، ہندوؤں کے جذبات کا خیال

خوابِ حسن

سادہ و معصوم ہے اُس کا شباب
ابر آلودہ نہیں وہ ماہتاب !!
اے زمانے دیکھ کر کروٹ بدل
اے حوادث کی ہوا آہستہ چل !!
گردبادو اپنے خیموں کو اُٹھاؤ
اے فضاؤ آگ کی قسمیں نہ کھاؤ!!
زلزلو اُس کے محل سے دور جاؤ
آندھیو اپنے قدم آگے بڑھاؤ!!
قافلے ہوں گے جہاں تک رہ سپار
خون چہروں پر ملیں گے رہگزار !
بجلیاں چمکیں گی طوفاں آئیں گے
دام اندھیرے دور تک پھیلائیں گے!
آندھیوں سے زمزمے کجلائیں گے
قہقہے آہوں سے بجھتے جائیں گے
ساز دہکیں گے، دُھواں دیں گے سبو
وقت کے ماتھے سے ٹپکے گا لہو !
زندگی خطِ حوادث پر سنبھل
اے شبِ تیرہ اُجالا منھ پہ مل !!
شیونو، نغمات میں ڈھلتے رہو
اے چراغو صبح تک سب جلتے رہو، !!
اے ہواؤ اس کو سونے دو ابھی
جاگنے میں دیر ہونے دو ابھی !
چونک کر دیکھو وہ گھبرانے نہ پائے
اُس کے ماتھے پر شکن آنے نہ پائے
صرف عطر و گل ہو جس کی کائنات
اُس کو کیا معلوم عنوانِ حیات !

پروفیسر شور

مطبوعات موصولہ

انسان کا عروج

ایم، ایلین وائی سگال کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے، رضیہ سجاد ظہیر کے قلم سے۔ تصنیف کا مقصود اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا ہے کہ انسان نے ابتدائے تخلیق سے اس وقت تک کیونکر تدریجی ترقی کی۔ ہر چند یہ موضوع پامال بھی ہے اور غیر دلکش بھی، لیکن اس کتاب میں یہ داستان بالکل نئے انداز سے دُہرائی گئی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی فسانہ پڑھ رہے ہیں۔

ترجمہ میں اتنی صفائی و روانی ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، کاغذ دبیز ہے لیکن کتابت و طباعت اچھی نہیں۔ ضخامت ۲۸۵ صفحات قیمت ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ قومی دارالاشاعت بمبئی۔

دیسی رجواڑے

مختصر سا رسالہ ہے احمد حسین صاحب کا لکھا ہوا، جس میں انھوں نے ریاستوں کے حالات سے بحث کر کے وہاں کی بدامنی و بدنظمی کو ظاہر کیا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے مستقبل پر گفتگو کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا ہے کہ ان کو مطلق العنان چھوڑنا مناسب نہیں۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ : قومی دارالاشاعت بمبئی۔

انقلابِ روس

پیج آرنٹ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے محمد کلیم اللہ اور ظ۔ انصاری کے قلم سے۔ یہ کتاب گیارہ ابواب میں منقسم ہے جن میں زارشاہی دورِ حکومت سے لیکر اسوقت تک کی تاریخ سیاست پر گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب معلومات سے پُر ہے اور بالشیوک حکومت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے افادہ سے خالی نہیں۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے اور کتابت و طباعت بھی اچھی ہے۔ ضخامت ۱۰۷ صفحات قیمت عہ/ ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت لاہور

سرمایہ داری کا زوال

ترجمہ ہے ایڈورڈ کارڈیلی کے ایک مقالہ کا جو رسالہ کمیونسٹ میں شایع ہوا تھا۔ اس کا مصنف یوروپ کے مارکسی لیڈروں میں شمار ہوتا ہے۔ جنگ کے بعد جو حالت اس وقت بین الاقوامی سیاست و اقتصاد کی ہے، وہ بڑا پیچیدہ و دلچسپ مسئلہ ہے جس پر ہر مفکر اپنی جگہ غور کر رہا ہے، چنانچہ کارڈیلی نے بھی اس مقالہ پر سیر حاصل بحث کی ہے، جس میں بتایا ہے کہ امریکہ کا اثر روز بروز دنیا پر کس قدر بڑھتا جا رہا ہے اور سرمایہ کا یہ اقتدار فاسسٹی تحریک کی دوسری صورت ہے۔ اس کا ترجمہ شرف اطہر علی صاحب نے کیا ہے لیکن اتنا صاف و سلیس نہیں جتنا ہونا چاہیئے تھا۔ اس قسم کی کتابوں کا ترجمہ لفظی کبھی اچھا نہیں ہو سکتا بلکہ انکا مفہوم اپنی زبان میں ادا کرنا چاہیئے۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت لاہور

دھانی بانکیں

ڈراما ہے عصمت چغتائی کا لکھا ہوا، جس میں موجودہ خونریزی اور بدامنی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ہماری رائے میں ایسی کتابوں کی اشاعت بہ حالات موجودہ مناسب نہیں۔ کیونکہ اس سے اور زیادہ اشتعال پیدا ہونے کا امکان ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ :۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی۔

لمعات

مجموعہ ہے رضی بدایونی مرحوم کے کلام کا۔ رضی مرحوم شاعری کی دنیا میں زیادہ مشہور نہ تھے غالباً اس لئے کہ انھوں نے شہرت کو ہمیشہ دونِ مرتبت سمجھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے صاحبِ استعداد شاعر تھے اور ہر صنفِ سخن میں استادانہ انداز کے کہنے والے تھے، طبیعت میں دقت پسندی ضرور تھی لیکن صرف اسی حد تک کہ ذوق پر گراں نہ ہو۔ انکے کلام کا مجموعہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی کے مقدمہ اور پروفیسر آل احمد سرور کی تقریب کے ساتھ شایع ہوا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ارباب ذوق اسکے مطالعہ سے بہت لطف اندوز ہونگے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

"زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے"

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں

چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ وگلاب اور مختلف قسم

کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا

مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام: "مشکی قوام ہوڑہ"

ٹیلی فون: "ہوڑہ ۷۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ - ہوڑہ

اشتہار

فاسد مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے

خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

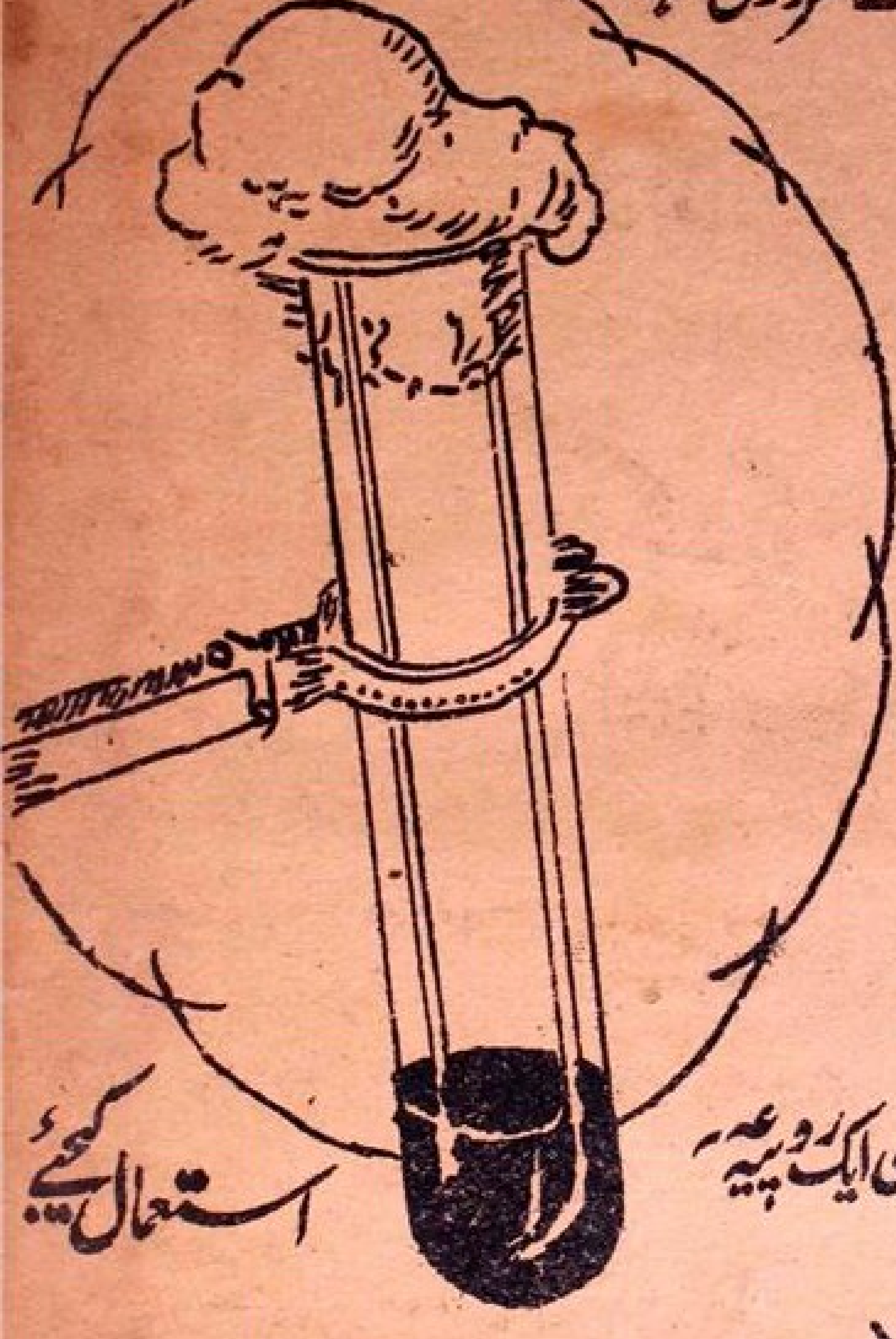

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر سیبکو فر پروفیسر ویانا یونیورسٹی نے فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا وہ کلاس کو پڑھا رہے تھے، اُنکے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے، جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا، مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ بھی نہ ہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا! صرف اسلئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ صافی اسی اُصول کے پیش نظر طیار کی گئی ہے یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوتِ مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

استعمال کیجئے

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

صافی

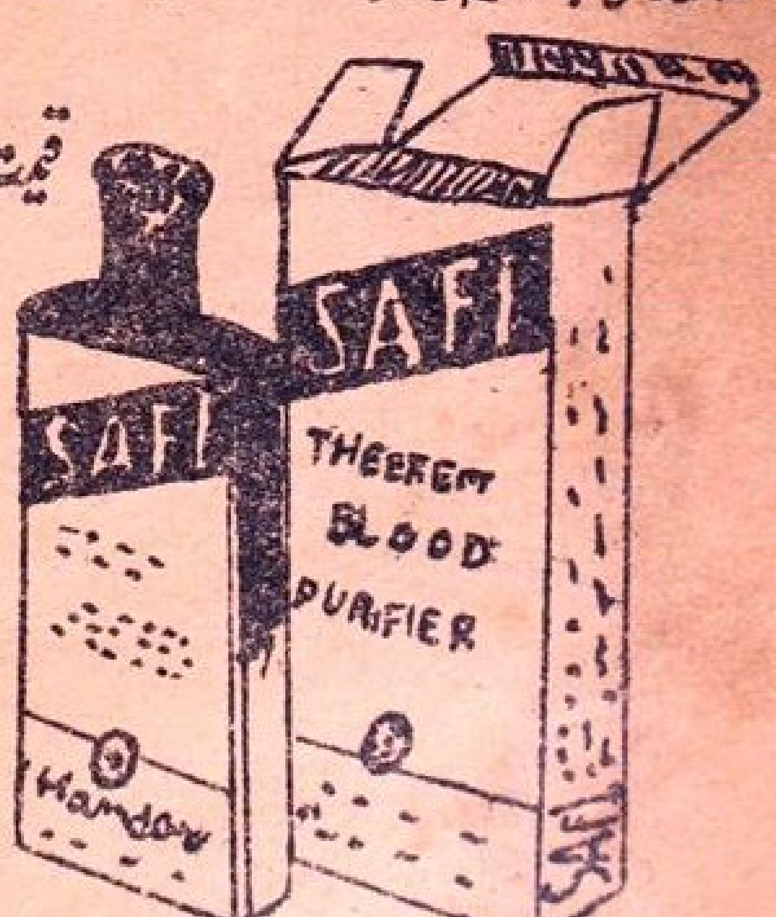

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

نگار

مدیر خصوصی :- نیاز فتحپوری

جلد ۵۲	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۴۷ء	شمار ۶

ملاحظات ---------- ۳
بچوں کی نفسیات ---------- محمد عظیم ۵
انشاء اللہ خاں کی مثنویاں ----- رحمت نبی خاں ام - اے (علیگ) ۱۰
عرفی شیرازی --- (ڈاکٹر) نذیر احمد ام - اے پی - ایچ - ڈی ... ۲۲
عہد عباسی کا ایک تاریخی واقعہ ---------- ۴۵
جذبات عالیہ اور اردو شاعری --- ولی کمال خاں ام اے -- ۴۹
منظومات ---- نازش، عرشی، کلیم، درد ---- ۵۵
دلچسپ معلومات ---------- ۵۷
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۹
اشتہارات ---------- ۶۳

اس سال کا یہ آخری پرچہ ہے

اور

آئندہ جنوری ۴۸ء کا "نگار"

جوبلی نمبر ہوگا

جس کی قیمت خریداران نگار سے بھی عہ زاید لی جائے گی - یعنی یہ پرچہ ہر شخص کے نام ذریعہ وی پی بھیجا جائے گا اور اگر آپ کی خریداری دسمبر ۴۷ء یا جنوری ۴۸ء میں ختم ہوتی ہے تو وی پی چھ روپیہ آٹھ آنے ہوگا ورنہ ڈیڑھ روپیہ کا ---- اگر خریداری منظور نہیں ہے تو اب بھی وقت ہے کہ آپ ہمیں بواپسی ڈاک مطلع کر دیں، ورنہ بصورت خاموشی وی پی بھیجا جائے گا اور واپسی میں ہمیں پانچ آنہ کا نقصان ہوگا -

اس پرچہ کی روانگی نمبر خریداری کے لحاظ سے سلسلہ وار ہوگی اس لئے ۱۵ فروری ۴۸ء تک اسکا انتظار کیجئے -

جوبلی نمبر کس قدر اہم چیز ہے اس کا اندازہ آپ کو صفحہ ۲ کے اشتہار سے ہو سکے گا، نیز اس امر سے کہ غیر خریداران نگار سے اس کی قیمت علاوہ محصول تین روپے مقرر ہے -

منیجر نگار لکھنؤ

جوبلی نمبر ہر شخص کے نام ذریعہ رجسٹری بھیجا جائیگا اور وی پی میں رجسٹری کے مصارف شامل ہونگے اسلئے اگر آپ چندہ پیشگی بھیجیں تو چھ روپیہ آٹھ آنہ روانہ فرمائیں۔

"نگار" کا جوبلی نمبر

پاکستان نمبر ہوگا

اگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو آپ کے سکوت کو رضامندی سمجھکر وی پی بھیجا جائے گا

۱۔ لیکن اس میں نہ حصول پاکستان کی تاریخ ہوگی، نہ مسلم لیگ کے جدوجہد کی داستان، کیونکہ اس سے ہر شخص واقف ہے بلکہ پاکستان اور ہندوستان کی تمام مسلم آبادی کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا جائیگا تاکہ مسلمانوں کی یہ جدید آزاد حکومت اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ گویا بہ لحاظ موضوع یہ

تمدن اسلامی نمبر بھی ہوگا

۲۔ اس نمبر کی ضخامت ۵۰۰ صفحات سے زیادہ ہوگی اور اسکی تیاری میں ہم کو تین ہزار روپیہ زاید صرف کرنا پڑیں گے اس لئے خریداران نگار سے امید ہے کہ وہ اس مخصوص نمبر کے لئے جو کتابی صورت میں ۶۰۰ صفحات کو محیط ہوتا۔ ڈیڑھ روپیہ دینا گوارا فرمائیں گے ہم اُن حضرات کے نام جن کا چندہ دسمبر ۴۷ء یا جنوری ۴۸ء میں ختم ہوتا ہے، جنوری ۴۸ء کا نگار ذریعہ وی پی چھ روپیہ آٹھ آنہ میں (معہ مصارف رجسٹری) روانہ کرینگے اور جنکا چندہ ختم نہیں ہوتا انکے نام کا وی پی ڈیڑھ روپیہ میں (معہ مصارف رجسٹری) بھیجا جائے گا۔

تمام مقالات اڈیٹر نگار کے قلم کے ہونگے

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

"من ویزداں"

جو اپنی انشاء عالیہ اور پرزور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اسے صحیح معنے میں

انجیل انسانیت ——— کہہ سکتے ہیں

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر بسیط تاریخی، علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے

یہ کتاب ادبی حیثیت سے بھی اڈیٹر نگار کا وہ کارنامہ ہے جسے ادب و انشاء میں "حرف آخر" کہا جاسکتا ہے۔

حجم ۴۸۲ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز، جلد مضبوط۔ قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

ملاحظات

ہندوستان کا ہولناک مستقبل

یوں تو قتل و خونریزی کی ابتدا بہت پہلے ہی ہو چکی تھی اور کلکتہ، نواکھالی، بہار اور مغربی یوپی کے بعد لاہور اور مضافات لاہور تک یہ آگ پھیل گئی تھی، لیکن ۱۵ اگست کے بعد جب تقسیم ہند عمل میں آ چکی، تو اس نے زیادہ بھیانک شکل اختیار کر لی، یہاں تک کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کا صدر مقام (دہلی) بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خیر، دہلی کی قسمت میں تو قتل و خونریزی لکھی ہی ہے۔ اس سے قبل بھی بارہا اس کی گلیوں میں انسانی خون پانی کی طرح بہ چکا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اور کتنی بار اس کو اس نوع کی انسانی درندگی کا شکار ہونا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا اثر ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ خراب پڑا۔ پاکستان میں تو یہ کہ وہاں کے لوگوں کو ہندوؤں کی ذہنیت کو مسلم کش ذہنیت ثابت کرنے کا زیادہ موقعہ مل گیا اور ہندوستان میں یہ کہ مسلمانوں کے دل خوف و اندیشے سے بھر گئے اور ان کو یہ خیال پیدا ہو چلا کہ حکومت واقعی اقلیت کی حفاظت نہیں کرنا چاہتی یا کر نہیں سکتی، پھر اگر یہ بات صرف اتنی ہی ہوتی اور یہ جھگڑا محض ہندو مسلم اختلاف کا ہوتا تو بھی غنیمت تھا لیکن اب بات شاید راز نہیں رہی کہ دہلی کی بدامنی ایک ایسی منظم سازش کا نتیجہ تھی جس کا مقصود ہندوستان کی موجودہ حکومت ہی کو معزول کر دینا اور اس کی جگہ خالص ہندو حکومت کو قایم کرنا تھا۔ یہ بات اب کسی سے مخفی نہیں کہ دہلی میں جو کچھ ہوا وہ راشٹر سیوک سنگھ، ہندو مہاسبھا اور سکھوں کے اکالی دل کی منظم سازش تھی جس میں بعض راجپوت ہندو ریاستیں بھی شریک تھیں اور جس کا مقصود موجودہ حکومت اور خصوصیت کے ساتھ پنڈت نہرو کو معزول کر دینا تھا۔ اس کے ثبوت میں ہندو سبھا کے اخبار ہندو اوٹ لک کا وہ بیان پیش کیا جا سکتا ہے، جس نے اس سازش کی طرف اشارہ کیا تھا اور سیوک سنگھ کے اخبار آرگنائزر کا وہ تہدیدی نوٹ جس میں صاف صاف تحریر تھا کہ "پنڈت نہرو اور دوسرے وزراء کا وہی حشر ہوگا جو برما کے وزیروں کا ہوا ہے"۔ اسی کے ساتھ جب ہم جنم بھومی کے خصوصی نامہ نگار کا بیان پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سازش کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور راجپوتانہ کے رجواڑے حکومت ہند کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا کر پٹیالہ سے کاٹھیاوار تک راجستھانی حکومت قایم کرنے کی فکر میں تھے۔۔ الغرض یہ تھی وہ سازش دہلی کے ہنگامہ و فساد کی تہ میں، جس کا علم پنڈت نہرو کو ہو چکا تھا اور انھوں نے اسی لئے بہ لحاظ حفظ ماتقدم مدراس رجمنٹ اور گورکھا فوج کا انتظام کر لیا تھا۔ پھر پنڈت نہرو نے جس دلیری و ہمت سے کام لیا اس کا حال سب کو معلوم ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ اس وقت دہلی میں نہ ہوتے، تو شاید مسلمانوں کا کوئی فرد وہاں باقی نہ رہتا اور حکومت اسوقت مہاسبھائیوں کے ہاتھ میں ہوتی یا یہاں سکھستان و راجستھان قایم ہو گیا ہوتا۔

ہر چند اب دہلی میں نسبتاً امن و سکون ہے اور سردار پٹیل بھی بدرجۂ مجبوری راجستھان و سکھستان وغیرہ کا خواب دیکھنے والوں کو متنبہ کر چکے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ آیندہ کے خطرات کم ہو گئے ہیں، یا مہاسبھائی ذہنیت ختم ہو گئی ہے، وہ برابر بڑھ رہی ہے اور غالباً اسی ارادہ کے ساتھ جس کا اظہار جنرل کری اپّا نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ "ہندوستانی فوج دو سال کے اندر پاکستان کو ہندوستان میں شامل کر لے گی"۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ جارحانہ ذہنیت اسی طرح بڑھتی رہی اور ہندوستان کے اکابر کی طرف سے ایسے ہی غیر دانشمندانہ بیانات شایع ہوتے رہے، تو آتش جنگ مشتعل ہو جانا بعید نہیں ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مہاسبھائیوں کو اپنے مقصد میں آسانی سے کامیابی حاصل نہ ہو جائے گی۔

مانا کہ پاکستان، ہندوستان کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے ضعیف ہے، لیکن اگر ان دونوں حکومتوں میں جنگ چھڑ گئی تو یہ صرف پاکستان و ہندوستان کی جنگ نہ ہوگی بلکہ ساری دنیا کی جنگ ہوگی کیونکہ پھر امریکہ اور روس بھی (جن کے درمیان کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے) خاموش بیٹھے نہ رہیں گے اور یہ دونوں پاکستان پر اپنا اثر قایم کرنے کے لئے بڑی سی بڑی قیمت ادا کرنے پر طیار ہو جائیں گے ۔۔۔ پاکستان میں اب بھی امریکہ اور اسی کے ساتھ ساتھ برطانیہ آہستہ آہستہ اپنے اثرات بڑھا رہا ہے جس کو روس اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا کیونکہ کراچی کی بندرگاہ پر عرصہ سے اسکی نگاہ ہے، اس لئے اگر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو یہ اس قسم کی جنگ نہ ہوگی جیسی اسوقت قبایلی قزاقوں اور ہندوستانی فوجوں کے درمیان کشمیر میں ہو رہی ہے بلکہ یہ بین الاقوامی جنگ ہوگی، ایک عالمگیر جنگ ہوگی جس میں افغانستان، ایران، مشرق ادنیٰ اور روس و امریکہ سبھی شامل ہوں گے اور اس کا کھلا ہوا نتیجہ ہندوستان کی بربادی ہے ۔۔۔ اس لئے ملک کی موجودہ نازک حالت مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ہندؤں کے لئے بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے اور اس خطرہ کو دور کرنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہندوستان سے مہاسبھائی ذہنیت اور پاکستان سے مذہبی تنگ نظری دور ہو اور دونوں حکومتیں آیندہ کے پروگرام پر اس نظریہ کو سامنے رکھکر غور کریں کہ ان دونوں حکومتوں کو آپس میں ملکر ترقی کرنا ہے۔ لیکن اس میں اسی وقت کامیابی ممکن ہے جب ہندوستان کی موجودہ وزارت کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں

مسلم لیگ تو اب باقی نہیں اور نہ اسکے باقی رہنے کی کوئی وجہ، اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو سوچنا ہے کہ انھیں کونسی راہ اختیار کرنا چاہئے ۔ اخیر دسمبر میں بصدارت مولانا آزاد لکھنؤ میں مسلمانوں کا بڑا اجتماع ہو رہا ہے جس میں مسلمانوں کی آیندہ سیاسی پوزیشن پر غور کیا جائے گا اور توقع یہی کی جاتی ہے کہ فیصلہ، شرکت کانگرس ہی کے حق میں ہوگا، لیکن ہماری رائے میں یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ کوئی اپنا بلاک الگ بنا کر شریک ہوں، وہ جمعیۃ العلماء ہو یا نیشنلسٹ جماعت، حزب الاحرار ہو یا جمعیت خاکسار، ان سب کو ختم ہو جانا چاہئے اور مسلمانوں کو کانگرس میں مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ باشندۂ ہندوستان کی حیثیت سے شریک ہونا چاہئے، کیونکہ اب سوال جداگانہ انتخاب کا بھی نہیں ہے اور کانگرس کو مہاسبھائیوں کے مقابلہ میں صرف اسی طرح تقویت پہونچ سکتی ہے اور آیندہ انتخاب میں مہاسبھائیوں کو ناکام بنانے کی یہی ایک صورت ہے۔

بچوں کی نفسیات

بچوں کی نفسیات کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے اور ان لوگوں کو جو بچوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، کچھ خاص قسم کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بالغ آدمی تو بتا سکتا ہے کہ فلاں حالت میں اس کے دماغ کی یہ حالت ہوتی ہے، یعنی نفسی اصطلاح میں وہ آپ کو اپنے مشاہدۂ نفس سے واقف کر سکتا ہے اور آپ اسکی دماغی خصوصیات کا نسبتاً آسانی سے تجزیہ کر سکتے ہیں لیکن اسکے برعکس بچہ جانور کی طرح گونگا ہوتا ہے اور اس لئے اس کے نفسی مطالعہ کے لئے مشاہدہ شرط اولین ہے۔

بچوں کی نفسی و دماغی حالت کا مشاہدہ کرنے کے لئے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ بچوں کے متعلق ڈائری رکھنے والوں میں ڈاروِن کا شمار اولین لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اکثر لوگوں نے جن میں پریئر Preyer کا نام بہت مشہور ہے، بچے کے پیدائش کے بعد ہی سے اس کی روزانہ حرکات تحریر کی ہیں۔ ہر ماں تھوڑی سی تربیت کے بعد بچے کے متعلق اس قسم کا اندراج رکھ سکتی ہے۔ یہ اس کے لئے نہ صرف ایک دلچسپ مشغلہ ہوگا بلکہ اس سے بچے کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے لئے کافی مواد بھی ہاتھ آجائیگا کہ بچے نے کس عمر میں کن حالات کے تحت خارجی اشیاء سے دلچسپی لینا شروع کی، اس کی زندگی کے کس دور میں جذبات ظاہر ہوئے اور کس طرح آہستہ آہستہ عقل کا عروج ہوا۔

انسان بھی دوسرے جانوروں کی طرح ماحول اور وراثت کی پیداوار ہے۔ ہر فرد کچھ خاص طبعی رجحانات لیکر پیدا ہوتا ہے یعنی اچھائی یا برائی کی کچھ خاص صلاحیتیں اس میں ودیعت ہوتی ہیں۔ یہ موروثی میلانات، جب تک مناسب ماحول انکی تکمیل کے لئے نہ ملے، پوشیدہ رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیج کو لیجئے کہ اگر زرخیز اور مناسب جگہ میں تخم ریزی کی جائے اور اس کی پوری طرح نگرانی کی جائے تو اس سے پیدا ہونے والا پودا اپنے طبعی قد کو پہونچے گا ورنہ نہیں۔

موافق حالات میں پرورش پانے سے بچے معیاری آدمی بن جاتے ہیں۔ حالات ناموافق ہونے سے بچہ صرف ناکارہ ہی نہیں بلکہ ہیئت اجتماعیہ کے لئے ایک خطرناک فرد ثابت ہو سکتا ہے۔ ہر بچے میں بگڑنے اور بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں اسی لئے مناسب تربیت بہت ضروری چیز ہے۔

بچوں کے دماغ کو سمجھنے کی کوشش اپنی ابتدائی شکل میں قیاس ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ نوزائیدہ بچہ کو اپنے وجود کا بالکل خیال نہیں ہوتا اور اسکا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ خود کو اپنے ماحول سے ممیز کر سکتا ہے وہ کچھ احساسات تو ضرور رکھتا ہے لیکن یہ احساسات اور اعمال اس کی ذات سے وابستہ نہیں ہوتے، البتہ ماحول سے خود کو ممیز کرنے والے احساس کی ترقی کے تمام امکانات اس میں

ہر چند اب دہلی میں نسبتاً امن و سکون ہے اور سردار پٹیل بھی بدرجۂ مجبوری راجستھان و سکھستان وغیرہ کا خواب دیکھنے والوں کو تنبیہ کر چکے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ آئندہ کے خطرات کم ہو گئے ہیں، یا مہاسبھائی ذہنیت ختم ہو گئی ہے، وہ برابر بڑھ رہی ہے اور غالباً اسی ارادہ کے ساتھ جس کا اظہار جنرل کری اپّا نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ "ہندوستانی فوج دو سال کے اندر پاکستان کو ہندوستان میں شامل کرے گی"۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ جارحانہ ذہنیت اسی طرح بڑھتی رہی اور ہندوستان کے اکابر کی طرف سے ایسے ہی غیر دانشمندانہ بیانات شایع ہوتے رہے، تو آتش جنگ مشتعل ہو جانا بعید نہیں ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مہاسبھائیوں کو اپنے مقصد میں آسانی سے کامیابی حاصل نہ ہو جائے گی۔

مانا کہ پاکستان، ہندوستان کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے ضعیف ہے، لیکن اگر ان دونوں حکومتوں میں جنگ چھڑ گئی تو یہ صرف پاکستان و ہندوستان کی جنگ نہ ہوگی بلکہ ساری دُنیا کی جنگ ہوگی کیونکہ پھر امریکہ اور روس بھی (جن کے درمیان کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے) خاموش بیٹھے نہ رہیں گے اور یہ دونوں پاکستان پر اپنا اثر قایم کرنے کے لئے بڑی سی بڑی قیمت ادا کرنے پر طیار ہو جائیں گے۔ پاکستان میں اب بھی امریکہ اور اسی کے ساتھ ساتھ برطانیہ آہستہ آہستہ اپنے اثرات بڑھا رہا ہے جس کو روس اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا کیونکہ کراچی کی بندرگاہ پر عرصہ سے اسکی نگاہ ہے، اس لئے اگر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو یہ اس قسم کی جنگ نہ ہوگی جیسی اسوقت قبایلی قزاقوں اور ہندوستانی فوجوں کے درمیان کشمیر میں ہو رہی ہے بلکہ یہ بین الاقوامی جنگ ہوگی، ایک عالمگیر جنگ ہوگی، جس میں افغانستان، ایران، مشرق ادنیٰ اور روس و امریکہ سبھی شامل ہوں گے اور اس کا کھلا ہوا نتیجہ ہندوستان کی بربادی ہے۔ اس لئے ملک کی موجودہ نازک حالت مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ہندوؤں کے لئے بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے اور اس خطرہ کو دور کرنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہندوستان سے مہاسبھائی ذہنیت اور پاکستان سے مذہبی تنگ نظری دور ہو اور دونوں حکومتیں آئندہ کے پروگرام پر اس نظریہ کو سامنے رکھکر غور کریں کہ ان دونوں حکومتوں کو آپس میں ملکر ترقی کرنا ہے۔ لیکن اس میں اسی وقت کامیابی ممکن ہے جب ہندوستان کی موجودہ وزارت کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔

مسلم لیگ تو اب باقی نہیں اور نہ اسکے باقی رہنے کی کوئی وجہ، اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو سوچنا ہے کہ انھیں کونسی راہ اختیار کرنا چاہئے۔ اخیر دسمبر میں بصدارت مولانا آزاد لکھنؤ میں مسلمانوں کا بڑا اجتماع ہو رہا ہے جس میں مسلمانوں کی آئندہ سیاسی پوزیشن پر غور کیا جائے گا اور توقع یہی کی جاتی ہے کہ فیصلہ، شرکت کانگرس ہی کے حق میں ہوگا، لیکن ہماری رائے میں یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ کوئی اپنا بلاک الگ بنا کر شریک ہوں، وہ جمعیۃ العلماء ہو یا نیشنلسٹ جماعت، حزب الاحرار ہو یا جمعیۃ خاکسار، ان سب کو ختم ہو جانا چاہئے اور مسلمانوں کو کانگرس میں مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ باشندۂ ہندوستان کی حیثیت سے شریک ہونا چاہئے، کیونکہ اب سوال جداگانہ انتخاب کا بھی نہیں ہے اور کانگرس کو مہاسبھائیوں کے مقابلہ میں صرف اسی طرح تقویت پہونچ سکتی ہے اور آئندہ انتخاب میں مہاسبھائیوں کو ناکام بنانے کی یہی ایک صورت ہے۔

بچوں کی نفسیات

بچوں کی نفسیات کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے اور ان لوگوں کو جو بچوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، کچھ خاص قسم کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بالغ آدمی تو بتا سکتا ہے کہ فلاں حالت میں اس کے دماغ کی یہ حالت ہوتی ہے (یعنی نفسی اصطلاح میں وہ آپ کو اپنے مشاہدۂ نفس سے واقف کر سکتا ہے) اور آپ اسکی دماغی خصوصیات کا نسبتاً آسانی سے تجزیہ کر سکتے ہیں لیکن اسکے برعکس بچہ جانور کی طرح گونگا ہوتا ہے اور اس لئے اس کے نفسی مطالعہ کے لئے مشاہدہ شرط اولین ہے۔

بچوں کی نفسی و دماغی حالت کا مشاہدہ کرنے کے لئے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ بچوں کے متعلق ڈائری رکھنے والوں میں ڈاروِن کا شمار اولین لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اکثر لوگوں نے جن میں پریرد (Preyer) کا نام بہت مشہور ہے، بچہ کے پیدائش کے بعد ہی سے اس کی روزانہ حرکات تحریر کی ہیں اور ہر ماں تھوڑی سی تربیت کے بعد بچے کے متعلق اس قسم کا اندراج رکھ سکتی ہے۔ یہ اس کے لئے نہ صرف ایک دلچسپ مشغلہ ہوگا بلکہ اس سے بچے کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے لئے کافی مواد بھی ہاتھ آجائیگا کہ بچے نے کس عمر میں کن حالات کے تحت خارجی اشیاء سے دلچسپی لینا شروع کی، اس کی زندگی کے کس دور میں جذبات ظاہر ہوئے اور کس طرح آہستہ آہستہ عقل کا عروج ہوا۔

انسان بھی دوسرے جانوروں کی طرح ماحول اور وراثت کی پیداوار ہے۔ ہر فرد کچھ خاص طبعی رجحانات لیکر پیدا ہوتا ہے یعنی اچھائی یا برائی کی کچھ خاص صلاحیتیں اس میں ودیعت ہوتی ہیں۔ یہ موروثی میلانات، جب تک مناسب ماحول انکی تکمیل کے لئے نہ ملے، پوشیدہ رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیج کو لیجئے کہ اگر زرخیز اور مناسب جگہ میں تخم ریزی کی جائے اور اس کی پوری طرح نگرانی کی جائے تو اس سے پیدا ہونے والا پودا اپنے طبعی قد کو پہونچے گا ورنہ نہیں۔

موافق حالات میں پرورش پانے سے بچے معیاری آدمی بن جاتے ہیں۔ حالات ناموافق ہونے سے بچہ صرف ناکارہ ہی نہیں بلکہ ہیئت اجتماعیہ کے لئے ایک خطرناک فرد ثابت ہو سکتا ہے۔ ہر بچہ میں بگڑنے اور بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں اسی لئے مناسب تربیت بہت ضروری چیز ہے۔

بچوں کے دماغ کو سمجھنے کی کوشش اپنی ابتدائی شکل میں قیاس ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ نوزائیدہ بچہ کو اپنے وجود کا بالکل خیال نہیں ہوتا اور اسکا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ خود کو اپنے ماحول سے ممیز کر سکتا ہے وہ کچھ احساسات تو ضرور رکھتا ہے لیکن یہ احساسات اور اعمال اس کی ذات سے وابستہ نہیں ہوتے، البتہ ماحول سے خود کو ممیز کرنے والے احساس کی ترقی کے تمام امکانات اس میں

موجود ہوتے ہیں۔ بچہ جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے اس کو خود اپنے احساسات سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور مسرت کو مسرت کی خاطر حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اسے زندگی کی "خود آسودانہ" (Auto erotic stage) منزل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ترقی کی دوسری منزل اس وقت شروع ہوتی ہے جب بچہ اپنے جسم سے دلچسپی لینے لگتا ہے اور اس میں ابتدائی احساس خودی کا پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً یہ کہ "یہ خوشگوار ہے، یہ ناخوشگوار ہے، مجھے اس کا ذایقہ لذیذ معلوم ہوتا ہے"۔ "مجھے اپنی ٹانگ میں درد محسوس ہوتا ہے"، اس منزل کو منزلِ خود پرستی Narcissism یا منزل نرگسی کہا جاتا ہے اس کا یہ نام اس یونانی روایت سے لیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ نرگس خود اپنی صورت پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ خارجی دنیا سے دلچسپی کا نمبر بچوں میں سب سے بعد آتا ہے۔ اسے ہم خارجی محبت کی منزل کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس منزل میں قدم رکھتے ہی انسانی زندگی غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ ابتدائی ایامِ طفولیت میں بچہ کی رہنمائی اُسکا جذبۂ مسرت کرتا ہے اسے اپنے برے بھلے کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن خارجی محبت کی منزل میں ابتداء ہی سے اس میں خارجی دنیا کو سمجھنے بوجھنے کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔ شروع شروع میں بچہ جاندار اور بے جان اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا، وہ ہر شے کو اپنی ذات کے نمونہ پر ڈھالتا ہے اور وہ جاندار یا بے جان چیز کو اپنی طرح کی شخصیت عطا کرتا ہے۔ بچہ اس عمر میں مخالف جنسوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔

تجزیۂ نفس کی بہت اہم دریافت جس پر بعض لوگ اعتبار نہیں کرتے یہ ہے کہ بچہ میں جنسی میلان بھی ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنسی خواہشات سن بلوغ میں پیدا ہوتی ہیں اور چھوٹے بچے جنسی وقوف سے بالکل معرا سمجھے جاتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جنسی میلان ایسی چیز نہیں جو بچہ میں دفعتاً پیدا ہو جاتا ہو وہ پیدائشی چیز ہے جو آہستہ آہستہ مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بچوں کے جنسیاتی مظاہر، بالغوں کے جنسیاتی طریق مظاہر سے مختلف ہوتے ہیں۔ بہت سے ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ بچوں میں انگوٹھا چوسنے کی عادت جو اس قدر عام ہے، وہ اسی جذبۂ جنسی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ بچے کے جسم کے مختلف اعضاء مثلاً ہونٹ، چوتڑ، بول و براز کے سوراخ اور آلات تناسل میں ایک خاص ذکاوتِ حس پائی جاتی ہے۔ جسم کے ان اعضاء میں سے جب کسی خاص عضو سے بچہ کو سرور حاصل ہونے لگتا ہے تو یہ سرور اپنی بڑھی ہوئی شکل میں اس خاص احساس سے مشابہ ہو سکتا ہے جو جوان آدمیوں میں جنسی جذبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جنسی مظاہر کا بچوں میں بالکل فقدان ہوتا ہے۔ تجزیۂ نفس ہمیں بتاتا ہے کہ ابتدائی طفلانہ زندگی میں بھی بچہ کی محبت کے تعلقات میں جنسی احساسات شامل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ والدین بھائی اور بہنوں کی محبت میں بھی جنسی عنصر کارفرما ہوتا ہے بچہ کے بڑے ہونے پر جب تہذیبی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں تو جنسی عنصر کو لاشعور میں دبا دیا جاتا ہے اور پدرانہ یا برادرانہ محبت جنسی رنگ در دعن سے معرا ہو کر شعور میں داخل ہوتی ہے۔ بچہ کی جنسی زندگی کا دور "خود آسودانہ، خود پرستانہ، خود نگاری" محبت کی ارتقائی منازل ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ خود آسودانہ دور میں بچہ کی محبت اپنے جسمانی احساسات تک محدود رہتی ہے۔ نرگسی دور میں وہ اپنے جسم کو نظرِ محبت سے دیکھتا ہے۔ اپنے ہم جنس سے محبت کرنا یعنی ایک مرد کا

دوسرے مرد سے یا ایک عورت کا دوسری عورت سے محبت کرنا، خود آسودانہ ارتقا کی پہلی منزل ہے۔ جنسیات کی دوسری منزل کے آغاز پر جنس مخالف سے محبت ہونے لگتی ہے۔ ایک مرد عورت سے ہی کیوں محبت کرے، یا ایک عورت مرد سے ہی کیوں اُلفت کی پینگیں بڑھائے، اس قسم کا سوال کرنا صحیح نہیں کیونکہ یہ عین فطرتِ انسانی ہے۔

تجزیۂ نفس اس کے علاوہ ہم کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اکثر اعصابی امراض کی ابتدا بچپن کی جنسیاتی ترقی رک جانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ منزل خود آسودگی میں محبت کے ٹھٹھر کر رہ جانے سے زندگی کا زاویۂ نگاہ مریضانہ ہو جاتا ہے اور تمام مسرتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ نرگسی منزل کے امراض کسی خاص قسم کا خوف خصوصاً موت کا خوف پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنے ہم جنس کی محبت میں مداخلت ہو جانے سے اکثر ہسٹریا یا اسی نوع کے دیگر امراض پیدا ہو سکتے ہیں اور جنس مخالف کی محبت میں خلل پڑ جانے سے بھی زندگی کی روانی میں فرق پڑ سکتا ہے۔ بچہ کی ابتدائی جنسی محبت کا مرکز اس کے والدین ہوتے ہیں اور ترقی کی اس منزل پر رک جانے سے فرد اپنے خاندان کے دایرہ سے نکل کر کسی اور سے محبت کرنے کی اہلیت کھو بیٹھتا ہے۔ اپنے آپ کو حقیر سمجھنا ضرورت سے زیادہ شرمانا اور خطا کا ایک مبہم احساس اس منزل کی خصوصیات ہیں۔ اس طرح آیندہ دماغی زندگی کی ترقی کا دار و مدار بچپن کی جنسیاتی زندگی پر ہے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ بچہ میں ہر قسم کی جنسیاتی گمراہی کے امکانات ہوتے ہیں، لیکن اس کا انحصار بڑی حد تک ماحول پر ہے۔ بچپن کی خرابی بالغ زندگی پر بڑے دور رس نتائج مترتب کرتی ہے اس لئے ہمیں اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ انسان کی زندگی کے بناؤ بگاڑ میں جنسیات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ———— اپنے وسیع معنوں میں یہ جنسیات ہی کا محور ہے جس کے گرد ہماری تمام سرگرمیاں چکر لگاتی ہیں۔ ہر فرد کا دماغی سکون و اطمینان اس کے گھر اور اس معاہدہ پر منحصر ہے ———— جس کے بموجب اس کی گھریلو اور ازدواجی زندگی کے عناصر مرتب ہوتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جنسی زندگی ہی ازدواجی معاہدہ کو مضبوط بناتی ہے۔ جنسیاتی زنجیر سے صرف والدین ہی بندھے نہیں ہوتے بلکہ بچہ کو بھی لاشعوری جنسی معاہدہ سے سہارا اور مدد ملتی ہے اور یہی جنسی معاہدہ اسے خاندان کے دوسرے افراد سے منسلک کر دیتا ہے۔ بالغ آدمیوں میں جنسیاتی زنجیریں لاشعوری بن جاتی ہیں اسی لئے وہ ہماری نظر سے پوشیدہ رہتی ہیں۔

نظری اور میکانکی تفصیلات میں اُلجھے بغیر اب میں آپ کو مختصراً یہ بتاؤں گا کہ بچہ کی پرورش میں کیا کیا احتیاط برتنی چاہئے۔ بچوں میں باقاعدگی کی عادت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ بچہ کا منھ اور بول و براز کے سوراخ خاص طور پر ذکی الحس ہوتے ہیں، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچہ کو چوسنے میں ایک مسرت آمیز احساس ہوتا ہے اور اگر اسے مقررہ وقفوں کے بعد دودھ نہ پلایا جائے تو وہ انگوٹھا چوس کر خود کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ انگوٹھا چوسنا بذات خود اس کی عادت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ عادت صرف جسمانی ہی طور پر مضر نہیں بلکہ دماغ پر بھی اس کا خراب اثر پڑتا ہے۔ بچہ کی صفائی کے ساتھ یہ خیال بھی رکھا جائے کہ اس کے جسم کے حساس اجزا پر بار بار ہاتھ نہ پھرے۔ ابتدائی عمر ہی سے بچہ میں اکیلے رہنے اور تھوڑی بہت دیر اندھیرے میں رہنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ اسے خوب بھینچ بھینچ کر جوش و اشتیاق کے ساتھ پیار نہ کرنا چاہئے۔ ماں اور باپ دونوں

جہاں تک ہوسکے اسے برابر برابر پیار کریں اور اسی طرح اسے دونوں سے محبت کرنے کا موقع دیا جائے۔ والدین میں سے کسی ایک طرف سے نامناسب محبت کا اظہار بچہ کی دماغی صحت کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ یک طرفہ اثرات سخت مضر ثابت ہوتے ہیں۔ بچے کو نہ تو یہ سمجھنے کا موقع دیا جائے کہ اس کا ہر مطالبہ پورا ہوسکتا ہے اور نہ اس کے ہر مطالبہ کو نظر انداز کیا جائے۔ اکثر اکلوتے، سب سے بڑے یا سب سے چھوٹے یا ایسے بچوں کو جو اکثر بیمار رہتے ہیں، من مانے کام کرنے دئے جاتے ہیں، ایسے ہی بچے بڑے ہوکر دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ بچے کو اپنے بہن بھائی اور دیگر بچوں سے ملنے جلنے دیا جائے۔ باہر والوں سے مانوس ہونے میں حتی الامکان اس کی ہمت افزائی کرنا چاہئے۔ بچہ کے شوق تحقیق کو روکنا نہیں چاہئے اور نہ اس کے تکلیف دہ سوالات نظر انداز کرنا چاہئے۔ تجزیۂ نفس ہمیں بتاتا ہے کہ بچوں کو پیدائش وغیرہ کے متعلق غلط معلومات بہم پہونچانے سے کتنا خطرناک نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ بچے اور والدین کو ایک دوسرے پر مکمل اعتماد ہونا چاہئے تاکہ جب بچہ کوئی بات جاننا چاہے تو وہ خود بخود اپنے ماں باپ سے اسے معلوم کرسکے۔ جب اس کی عمر ایک سال سے زیادہ ہوجائے تو اسے والدین کے ساتھ ایک ہی بستر پر نہیں سلانا چاہئے، دو تین سال کی عمر ہوجانے پر بچہ کو بالکل علٰحدہ کمرہ میں سلانا بہتر ہوگا۔ بچہ کی خواہشات اور ضروریات کا بغور مطالعہ کیا جائے اور انکے کھیل اور تفریحات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وہ ان سے پوری طرح مطمئن ہوسکیں۔ بچہ کے میلانات کا مشاہدہ کرنے پر پتہ چلے گا کہ اس کے اکثر میلانات ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنے والدین سے محبت کرنا چاہتا ہے اور انکی محبت کا بھی طالب ہوتا ہے۔ کبھی یہ اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے اور کبھی خود ان کی رہنمائی پسند کرتا ہے۔ اس نوع کے متضاد میلانات کی تسکین کے لئے اس کی حتی الوسع امداد کرنی چاہئے۔ میری رائے میں کسی انسان کی نفسی صحت بڑی حد تک ان ہی تناقضات سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ بچہ کی صحیح تعلیم کے لئے محبت آمیز فضا بہت ضروری ہے بچہ جس سے محبت کرتا ہے اس کی نقل اُتارتا ہے اور اس کے محبوب کا نصب العین اس کی دلچسپی کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایک معلم جو اپنے متعلم میں محبت کی روح پھونک سکتا ہے اس معلم کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔

جس میں اس وصف کی کمی ہو۔ بچوں کی تعلیم کے لئے وقتاً فوقتاً متعدد طریقے ایجاد کئے گئے۔ یہ طریقے اسوقت تک مقبول رہے جب تک کہ ان کا موجد خود ان پر عمل کرتا رہا لیکن جونہی ان پر کسی باہر والے نے عمل کیا ان کی افادیت ختم ہوگئی۔ موجد کی شخصیت اور انہماک نے اس کے طریقۂ تعلیم کو کامیاب بنایا تھا۔ وہ معلم جس کی متعلمین عزت اور محبت نہیں کرتے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اب میں اس سلسلہ میں کچھ ہدایت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ تجزیۂ نفس کے ذریعہ دماغ کی تمام خرابیوں کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ دماغ کے ان امراض میں جو عضوی خرابیوں سے پیدا ہوتے ہیں، خالص دماغی علاج سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ مثلاً جب غدۂ درقیہ کے عمل میں خرابی آجاتی ہے تو دماغی اور جسمانی ترقی رک جاتی ہے۔ درقیہ (جانوروں کے غدود سے طیار ہونے والی دوا) ایسے مریضوں پر اکسیر کا کام کرتی ہے۔ اسی طرح جب کسی بچہ کے دماغ میں پیدائشی خرابی ہوتی ہے تو بھی

علاج کا کوئی فایدہ نہیں ہوتا۔ بچّہ کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بچّہ کی ذہانت میں ایک مقررہ حد کے بعد کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور تعلیمی ذرائع بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اب اس کی اہمیت تسلیم کر لی گئی ہے کہ بچّہ کا کبھی کبھی جسمانی معائنہ کراتے رہنا چاہیئے اور بہت سے ممالک کے اسکولوں میں طبّی معائنہ کیا جاتا ہے لیکن دماغی معائنہ کی ضرورت ابھی تک تسلیم نہیں کی گئی۔ بچّہ کی ترقی کے لئے دماغی صحت جسمانی صحت سے کم ضروری نہیں۔ بدقسمتی سے بہت سے اطبا نفسیاتی اجزاء کے متعلق بہت واضح تصور نہیں رکھتے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ توانا جسم میں توانا دماغ ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں۔ جسمانی طور پر توانا آدمی دماغی طور پر مریض ہو سکتا ہے اکثر حالتوں میں دماغ کے جداگانہ علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں بچّوں کے دماغی علاج کی سہولتیں بہم نہیں پہونچائی جاتیں۔ جسمانی معائنہ کی طرح بچّہ کے نفسیاتی معائنہ کی بھی ازحد ضرورت ہے اور خصوصاً اس وقت جب بچّہ میں کوئی دماغی انوکھاپن ظاہر ہو تو اس کا نفسی معائنہ فوراً نہ کرانا چاہیئے۔ دماغی تکلیف اکثر جسمانی تکلیف کے مقابلہ میں زیادہ شدید اور خطرناک ہوتی ہے اور ہمیں دماغی مریضوں کی امداد میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھنا چاہیئے۔ (ترجمہ)

محمد عظیم

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

منجملہ ۱۳۲ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں:-

فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا — شادی، طلاق و خلع۔
مذہبی فحاشیاں — فحاشی پر عمومی تبصرہ۔
فحاشی قرون وسطیٰ میں — عہد جدید اور فحاشی۔
اخلاق جنسی — غیر فطری فحاشیاں مثلاً:- استلذاذ بالمثل۔
استلذاذ بالنفس — استلذاذ بالوحوش۔

جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتنا جامع تاریخی، علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئے گا،
حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہی ہے

حجم ۴۱۶ صفحات — کاغذ سفید و دبیز — قیمت علاوہ محصول چار روپے

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

انشاء اللہ خاں کی مثنویاں

اُردو میں انشاؔء کی کوئی طویل مثنوی نہیں ملتی، چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں جن میں سے اکثر مضامین ہجو پر مشتمل ہیں۔ کھٹملوں مکھیوں، مچھروں اور بھڑوں کی ہجو میں جو مثنویاں لکھی ہیں وہ قریب قریب مولانا حالیؔ کے پیش کردہ مثنوی پر پوری اُترتی ہیں۔ کیونکہ ان میں ربط بھی ہے، مقتضائے حال کی پابندی بھی ہے اور مافوق الفطرت عنصر بھی مفقود ہے البتہ "گیان چند ساہوکار کی ہجو" اور "چنچل پیاری ہتھنی" کی کہانی کے مضامین بہت رکیک ہیں ان دونوں مثنویوں میں سے پہلی مثنوی سوداؔ کی بیشتر مثنویوں کی یاد دلاتی ہے۔

"کھٹملوں کی ہجو" میں چھیانوے اشعار ہیں، ان میں انشاؔء نے تشبیہ و استعارے کا کمال دکھایا ہے، چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

کچھ یہ کھٹمل پڑے ہیں اب کی سال، — کہ ہوئی سب زمین لالوں لال
چھا گئے ہیں جو سارے یہ بدبخت، — شاخ مرجاں بنے تمام درخت
گھسی ایک ان کی جا بجا لڑ ہے — میخ جو ہے سو مونگے کی جڑ ہے
ہو گئے سُرخ بید سارے سرو — لال مرغے بنے تمام تدرو
بسکہ جا کر جمے قطار قطار — ہو گئی لالہ نرگسِ بیمار،
دشت اور کوہ پر کیا جو دخل — نخل یاقوت بن گئے سب نخل
ان لعینوں کا یہ سہاگ ہوا — تھا جہاں سبزہ لال ساگ ہوا

کھٹملوں کی ہجو میں انشاءؔ کی طرح مصحفیؔ نے بھی زبان کھولی ہے فرماتے ہیں:۔

کھٹملوں کی زبسکہ ہے افراط — تلخ ہے ان سے اپنا خواب نشاط
کافروں نے یہ سر اُٹھایا ہے — سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے
کیا کہوں ان گزندوں کی زشتی — کہ مجھے کر دیا ہے خارشتی،
ہے پھُنکی آگ سی بدن میں تمام — پڑ گئے ہیں ددوڑے تن میں تمام
دم بدم کروٹیں بدلتا ہوں، — ایدھر اُودھر پڑا اُچھلتا ہوں

پائینچے میں کبھی گھس آتے ہیں　　کبھی سینے میں سرسراتے ہیں
اک خلش ساری رات ازار میں ہے　　آنکھ بند اور ہاتھ ازار میں ہے

مصحفی نے سیدھے سادے الفاظ میں وہ تمام واردات بیان کی ہے جو درحقیقت اس شخص کو پیش آتی ہے جس کے بستر و پلنگ میں کھٹمل موجود ہوں لیکن انشاء نے اپنی شاعری کا فن بھی دکھایا ہے۔ مصحفی نے اپنی اسی نظم میں ایک مقام پر کھٹملوں کو راون کی اولاد کہا ہے۔ اس سے زیادہ آگے نہیں چلے۔ لیکن انشاء نے اپنی نظم میں اس دانہ سے خرمن پیدا کیا ہے، دونوں کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

مصحفی ان کی کثرت تعداد سے پریشان ہو کر کہتے ہیں :۔

کوئی کیونکر کرے انھوں کا شمار　　پیدا ہوتے ہیں ایک سے یہ ہزار
ہے بجا بسکہ ہیں زمیں پہ زیاد　　کہئے راون کی ان کو گر اولاد

انشاء کہتے ہیں :۔

کہتے تھے لالہ دیوکی نندن　　پٹیاں بن گئیں رکت چندن،
بان ارجن کے بن گئے سب بان　　اور اودائنوں نے کھائے پان
کبھی ان کی جو کچھ شکایت کی،　　ایک پنڈت نے یوں روایت کی
ایک راون کے پوت تھا جیل　　اس کی اولاد ہیں یہ سب کھٹمل
کیوں نہ دیں چار پائی پہ ڈنکا　　چھن گئی ان کی سونے کی لنکا،
راچھسوں کی سی کیوں نہ باندھیں ساکھ　　ایک سے ہوتے ہیں یہ نوے لاکھ
کیوں نہ ہر فرد ہووے غیرت دار　　قوم کے اپنے یہ بھی ہیں سردار
لاکھوں پستے ہیں مارے جاتے ہیں　　پھر وہی ریلا کر کے آتے ہیں،

اس کے بعد کچھ اشعار ہیں جن کے بعد انشاء گریز کرتے ہیں، شاید مصحفی کے لفظ "زیاد" نے ان کے خیال کو مہمیز کیا ملاحظہ فرمائیے :۔

جھوٹ پنڈت کی وہ روایت ہے　　دو چنوں کی سی ایک حکایت ہے
پر یہی جانتے ہیں اہل یقین　　ہیں یہ سارے لعین ابن لعین
یا تو یہ ہیں یزید کی اولاد،　　یا کہ بے شبہ نسل ابن زیاد
جوں جوں مرتے ہیں بڑھتے جاتے ہیں　　اور لوگوں کو توڑے کھاتے ہیں
کام ہے ان کے ہی مرید دل کا　　ڈھیر جو گنج سے شہیدوں کا،

ایسی ہے کھٹملوں کی آئی فوج، کہ سمندر سے جیسے اُٹھے موج

ہوئے یکبار ہاتھی گھوڑے سرخ اور سواروں کے سارے جوڑے سرخ

میر تقی نے بھی کھٹملوں کی شکایت میں زبانِ قلم کھولی ہے۔ ان کی نظم کے بھی چند اشعار یہاں پیش کرنا بے موقع نہیں ہوگا:۔

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں، "سر بہ روزِ سیاہ لاتا ہوں،

کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے، سانجھ سے کھانے ہی وہ دوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر،، ایک انگوٹھا دکھاوے انگلی پر

گرچہ بہتوں کو میں مسل ڈالا پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا،

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

ہاتھ تکیہ پہ گہہ بچھونے پر کبھو چادر کے کونہ کونہ پر،

سیکڑوں ایک چارپائی میں، ایک ہتھیلی میں ایک گھائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہئے، کب تلک یوں ٹٹولتے رہئے

میر کا آخری شعر مصحفی کے آخری شعر سے ملا کر دیکھئے مضمون قریب قریب ایک ہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مصحفی نے زیادہ واضح کر دیا ہے۔ تینوں شاعروں کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب پر تو درحقیقت یہ واردات گزری جس نے ان سے کھٹملوں کی ہجو کہلا کر چھوڑا۔ مصحفی نے میر صاحب کے تتبع میں طبع آزمائی کی اور مضمون کے ساتھ ہی ساتھ زبان و بیان میں بھی پیروی کی۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے مصحفی کو دیکھ کر انشاء کا بھی دل للچایا کہ کھٹملوں کی بُرائی کیجائے۔ چنانچہ انشاء کی مثنوی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے پر گزری ہوئی کوئی واردات بیان کر رہے ہیں بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک مضمون ان کے ہاتھ آگیا جسے لے اُڑنے اور شاعری کا کمال دکھا گئے۔

انشاء کی دیگر ہجویہ مثنویات بھی قریب قریب اسی طرز اور شاعرانہ جودت کی حامل ہیں جو مذکورہ بالا مثنوی میں پائی جاتی ہیں "مثنوی در ہجو [illegible]" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ان [illegible] نے کیا یہ اب کی قہر کہ ہوا زرہ پوشس سارا شہر

دیکھئے ان کی ٹک جواں مردی سب پہ ایک اپنی پھیر دی زردی

مولی کی زرد زرد [illegible] ہیں یا گل اشرفی کی کلیاں ہیں،

مولسریوں کی نیچے دیکھے جب — کھرنیاں سی بکھر رہی ہیں سب
جا کے کوٹھوں کی کوئی دیکھے بہار — زرد چمیلی کے پڑے ہیں ہار
اڑ گئی وہ سفیدی اور اودی — اب جدھر دیکھو زرد داؤدی
پھر جو شاخوں سے ہر شجر کے اڑے — تو املتاس ہے کہ پھول جھڑے
ساری دیواروں پر قطار قطار — زرد مرچوں کے سوکھتے ہیں ہار
یہاں جو فوارے اب اچھلتے ہیں — سونے کی ڈنڈیاں اگلتے ہیں
اب جو خشکہ کوئی پکاتا ہے — سو مزعفر پلاؤ کھاتا ہے
ہو کے بیچ ان بھڑوں کی آئینہ — بن گئی ٹھیک ٹھاک خاگینہ
چاندنی کا جو پھول تازہ ہے — سو وہ اک نرگسی دو پیازہ ہے
زرد رو کاسۂ شراب ہوئے — سب مگر نرگسی کباب ہوئے

انشاء نے ایک ہی مضمون کو مختلف پیرایوں سے باندھا ہے اور تشبیہات کا جو کمال دکھایا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔ "مثنوی در ہجو پشہ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

مچھروں کو ہوا ہے اب کی اوج — دب گئی جن سے مرہٹوں کی فوج
سوکھے سہمے ہیں کالے کالے ہیں — یہ بھی پر کوئی گھوڑے والے ہیں
بس کہ پٹے ہی رہتے ہیں ہر دم — حبشی ہو گیا ہے اک عالم
چاٹ لی صاف گلدموں کی دم — رہ گئیں وہ بچاریاں گم سم
بس کہ کافر لپٹ لپٹ جو موئے — تختے صندل کے آبنوس ہوئے
ہوئے مچھر بہت سے جو ساتھی — بھنگے بھینے سے بن گئے ہاتھی
لوگ بجلی کی طرح ہیں بیکل — چھا گئے مچھروں کے دل بادل
کیچوے تھے سو کالے ناگ بنے — شعلہ منہ سے نکال آگ بنے
اب یہ کیا قہر اے اللہ ہوا — خون دنیا کا سب سیاہ ہوا
ہر بن مو کی لے چکے ہیں فصد — اور کیا جانے ان کا کیا ہے قصد
بس جدھر دیکھو ان کو ہے ایک راہ — نکلے ہے سب کے دل سے دود سیاہ
خال رخسار نازنیں ہیں یہ — مگس شیر و انگبیں ہیں یہ
وہ کچھ نذر ہے بجا ہیں یہ — یعنی بھڑ دو کے چھپا ہیں یہ

آگے کیا لکھے کوئی ان کا بھید
پڑ گئے کاغذوں میں لاکھوں چھید

آکے مچھر جو پھر دو چار ہوئے
حرف بے نقطہ نقطہ دار ہوئے

الغرض قوم یہ بہت بد ہے
نام دیکھو تو کیا مشدد ہے

کھانے پینے میں سب دخیل ہوئے
آگے پشہ تھے اب تو فیل ہوئے

سونڈھیں ہیں مثل فیل ان کے پاس
کیوں نہ کھو دیویں سب کے ہوش و حواس

نہیں مچھر یہ فیل خانہ ہے،
گجری بن ان سے سب زمانہ ہے

کن نے رکھا ہے مچھر ان کا نام
ان کو کہئے تو کہئے لشکر شام

"مثنوی در ہجو مگس" کے چند اشعار بھی دیکھ لیجئے:

مکھیاں اب کی یہ بڑھیں بے ڈول
کہ لگا آکے ایک جی کو ہول،

کس طرح ہو بہار تازہ دماغ
کرتے ہیں آبشار استفراغ

جان کر مکھیوں کو جنس وغل،
سونگھتے ہیں گل اپنی اپنی بغل

لگی یوں کرنے پھول پہ بھن بھن
جس طرح آ چڑھے کسی پہ جن

تاک جتنے تھے یہ ہوئے مبہوت
جس طرح آ چڑھے کسی پر بھوت

مکھیوں کا ہی کارخانہ ہوا
حبشتان سب زمانہ ہوا،

یہ جو دنیا سواد اعظم ہے
اوڑھے اک کالی جا جم ہے

مکھیوں کا بلند پایہ ہوا،
سایہ سب ان کے زیر سایہ ہوا

قلقل مے کی اُڑ گئی وہ ہوا
چائے سے آکے مل گیا بتھوا

طاق پر ہے دھرا جو شیشۂ مے
لکھی ہے اس کے بھی نصیب میں قے

دیکھ ان کے پردوں کی ایک جھلک
مگسی ہو گیا یہ اسپ فلک،

کھلکھلا کر انار جو ہیں ہنسا،
دام میں مکھیوں کی آن پھنسا

اس کی وہ لال لال بتیسی
نہ لگی کافروں کی جو چیپسی،

لے کے دانتوں کو سب سیاہ کیا
اور ہونٹوں کو سب تباہ کیا

ایک گھوٹا سا جم گیا بس خیر
باغ میں یہ ہوئی عجائب سیر

ایک ذرا اس کو کیجئے آپ نگاہ
کس طرح کی دھڑی جمائی ہے

منہ میں مکھی نے ٹھونس دی مستی
کون ایسی بھلا ہو چتیسی،

مندرجۂ بالا اشعار کے مطالعہ سے واضح ہو گیا ہوگا کہ جہاں مثنوی کے قواعد کی پابندی انشاء نے ملحوظ رکھی ہو وہاں شاعری کے زیور مثلاً تشبیہ، استعارہ، حسن تعلیل اور مضمون آفرینی وغیرہ سے بھی خوش اسلوبی سے کام لیا ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر چند اشعار مصحفی، میر حسن اور میر تقی کی بعض مثنویات میں سے بھی پیش کئے جائیں ؟

انشاء نے علٰحدہ علٰحدہ ایذارساں جانوروں کی ہجو بھی ہے لیکن متذکرہ بالا ہر سہ شعراء نے اپنے مسکونہ مکانات کی ہجو کے سلسلہ میں اس قسم کے حشرات الارض کو بھی لے ڈالا ہے پہلے مصحفی کی شکایت سنئے:

دل کو کاوش ہی رات اور دن ہے — بسکہ پسّوں کی اس میں بھن بھن ہے
الغرض اس میں مجھ کو ہر صورت — رہتی ہے موذیات سے صحبت
کبھی چیونٹی بدن کو کاٹے ہے — کبھی دیمک ہی پائے چاٹے ہے
چار پائی جو ہے ہمارے پاس — کھٹملوں کی رہے ہے اس میں مواس
گھونس نے کر دی ہے زمیں سوراخ — موش کور پر ہے عرصہ فراخ
گر نظر جائے جانبِ دیوار، — نظر آتی ہے چیونٹیوں کی دیوار
گھن نے پایوں کے تئیں جو ہے چاٹا — خوردہ اس کا چھنے کا ہے آٹا

میر حسن صاحب کا شکوہ بھی ملاحظہ فرمایئے چیونٹیوں نے ان کا ناک میں دم کر دیا تھا:

نہ تو بچھو نہ کھٹمل اور نہ مار، — مور نے سب کو کر دیا مسمار
اپنی بانی پہ جب یہ آتی ہے — بوٹیاں توڑ توڑ کھاتی ہے
مردم آزاری پر جو باندھی کمر — تو نکالے ہیں چیونٹیوں نے پر
دیکھکر ہم کو اس جگہ پہ نحیف — پہلوانی کرے ہے مور ضعیف
رات دن ہم سے یہ بگڑتی ہیں — مورچہ باندھ باندھ لڑتی ہیں،

میر تقی میر جھینگروں اور مکڑیوں سے نالاں ہیں اور اپنی مصیبت کا رونا اس طرح روتے ہیں:۔

پھونس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے — بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے
اُڑ گئی گھاس مٹی ہے ڈالا — ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا

انشاء کی عاشقانہ اُردو مثنوی میں کوئی ندرت نہیں ہے بہر حال کہیں کہیں سے اس کے بھی چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں زمانہ نافرجام کی شکایت دیکھئے:۔

کروں کیا، جور گردوں کی شکایت — جہاں دیکھو اسی کی ہے حکایت
نہیں یہ دیکھ سکتا خانہ آباد، — کہ ہو کوئی کسی ڈھب سے کہیں شاد

ستائے بن ہمیں کیا کام اس کو ۔۔۔ کہاں بن دکھ دیئے آرام اس کو
نہیں معلوم منظور اس کو کیا ہے ۔۔۔ بُری چتون سے کافر دیکھتا ہے
مگر بس ظلم پر اس نے ہے باندھی ۔۔۔ یہ ظالم ہے اُڑا دینے کو آندھی

ساقی سے اس طرح خطاب کیا ہے:

شراب تند دے ایسی ہی ساقی ۔۔۔ کہ جس سے غم رہے مطلق نہ باقی
گلابی لا کے رکھ دے وہ مرے پاس ۔۔۔ کہ ہو دلہن پنے کی جس میں بوباس
چمک جاوے جو میرا جوہر عقل ۔۔۔ تو میں تجھ سے حکایت اک کروں نقل

عاشق و معشوق کی پہلی ملاقات اور محبوبہ کے حسن کا بیان اس طرح کیا ہے:۔

گئی آنکھوں تلے بجلی سی اک کوند ۔۔۔ سمند ناز نے ڈالا اسے روند
کہا دل نے مرے دیکھی جو وہ مانگ ۔۔۔ کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دُعا مانگ
حواس و ہوش میرے ہو گئے تار ۔۔۔ ہوا میں مانگ چوٹی میں گرفتار
بہم آنکھوں سے آنکھیں لڑ گئیں خیر ۔۔۔ عجائب نرگستاں کی ہوئی سیر
وہ شوخ و شنگ دیدہ اس پرن کے ۔۔۔ کہ ہو جس طرح دو بچے ہرن کے
نظر آیا وہ مکھڑا سیب کا سا ۔۔۔ بندھا یاں ڈول کچھ آسیب کا سا
یہ رخساروں میں اسکے فربہی تھی ۔۔۔ ہوئی جس سے خجل اکثر بہی تھی
نگاہ مست تھی ایسی ہی بیباک ۔۔۔ کہ بس دیکھے جدھر باندھے ادھر تاک
کہوں اس کی جبیں کو کس طرح چاند ۔۔۔ کہ اس سے لاکھ حصہ ماند تھا چاند
سہانا تھا کچھ ایسا روپ اس کا ۔۔۔ کہ سایہ چاہتی تھی دھوپ اس کا
جنی دونوں بھنویں یہ داد بیداد ۔۔۔ کہ ہو دلچسپ جیسے شعر اُستاد
کروں کچھ بھی جو تعریف دُر گوش ۔۔۔ تو اُڑ جاویں صدف کے سنتے ہی ہوش
گلاوٹ بازوؤں کی چشم بد دور ۔۔۔ وہ دونوں مچھلیاں جیسی سقنقور
نہ کیونکر اس کے خود بینی ہو ایسی ۔۔۔ کہیں دیکھی بھی ہے بینی ہو ایسی
پھڑک نتھنوں کی پھر ایسی ہی اچھی ۔۔۔ تڑپ جوں تیرنے میں جائے مچھلی
یقیں ہو اس کو جو دیکھے وہ پستاں ۔۔۔ کہ بے شک یہ ارم کا ہے گلستاں
بنے دو برج سونے کے یہاں ہیں ۔۔۔ کسوٹی کے کلس ان پر عیاں ہیں،

غلط فہمی تھی کہنا یہ بڑی بات
عبث ضایع ہوئی ناحق کو اوقات

یہ کہنا تھا کہ دو سونے کے تھلکے
لگائے آنکھ جن پر تھے اُچکے،

نہ جی الماس اور نیلم کے کنے
بہم چھوٹے بڑے تھے یا اگنے

زہے تھا صاف سینہ پیٹ بھی صاف
بدن آئینہ ساں براق شفاف

شکم پر رونگٹوں کا ذکر کیا تھا
فقط وہ عکس خوبی کا پڑا تھا،

ستارہ سی دہکتی تھی پڑی ناف
بھلا کوئی کرے کیا اس کا اوصاف

وہی تو حسن کے چشمے کی تھی سوت
نہ تھی وہ ناف تھی ایک جاگتی جوت

یہی کہتی تھی اس کو دختر رز
کہ ہے یہ تو بعینہ ہائے ہوز

کروں کچھ اور اعضا کا تو کیا ذکر
کہ ناحق کی اتنی ہے کہاں فکر

کہے دو شعر لیکن فارسی ہیں
کہ سچ مچ حسن کے وہ آرسی ہیں

زہے مضموں کی عالی دماغی
چڑھا دیں بلبلیں جن کو چراغی

میرس از بند شلوار از دگر پیچ
حکایتہاست اینجا پیچ در پیچ

بناف داں گرہ کن چشم خود باز
کہ زیر بہر دارد بر رہ ناز

اسی میں آگئے مضموں سارے
لگے ہر سمت سے ہونے اشارے

مندرجۂ بالا اشعار سے واضح ہے کہ اس میں لکھنویت حد درجہ غالب ہے۔ رعایت لفظی کی بھرمار اس امر کی طرف خاص طور پر اشارہ کر رہی ہے کہ "گلزار نسیم" کے لئے زمین اسی زمانہ میں تیار ہونا شروع ہو گئی تھی۔

اُردو میں ایک اور مختصر مثنوی "مرغنامہ" کے نام سے ہے اس میں مرغ بازی کی ثنا و صفت کی گئی ہے لیکن وہی اپنے طبعی تمسخر کے ساتھ تمام مثنوی رعایات لفظی سے پر ہے۔ چند نمونے پیش ہیں:

حمد

حمد ہے فرض اس کی وقت سحر
جس نے کاٹے ہیں مرغ روح کے پر

تن کے کھانچے میں کر دیا ہے بند
کہ وہ یک چند واں رہے خورسند

نعت

گر ثنائے رسول راہ نما،
جس کی نعلین کا ہے سایہ ہما

صلوٰۃ اس پہ بھیجے خدا و دید
ہے جو اک آسماں پہ مرغ سفید

گر حمایت کرے نہ اس کی آل
نہ جمیں مرغ عقل کے پر و بال

مرغوں کی تعریف

مثلِ فولاد مرغ ہیں اپنے　　داد بیداد مرغ ہیں اپنے
پہلوانوں کی ہیں انھوں میں صفات　　لات وعزا کو توڑے انکی لات
پاس اپنے جو مرغ ہے جاوا　　ہے وہ اسفندیار کا باوا

فارسی زبان میں انشاؔ کی تین مثنویاں قابل ذکر ہیں (۱) مثنوی شیر برنج (۲) مثنوی شکار نامہ اور (۳) مثنوی بے نقط پہلی مثنوی متصوفانہ ہے جس میں مثنوی مولوی معنوی کا تتبع کیا ہے۔ وہی بحر ہے اور اسی طرح حکایات و امثلہ سے بھی کام لیا گیا ہے مولوی محمد حسین آزاد نے اس مثنوی کے بارہ میں لکھا ہے۔ "نہیں معلوم ہوتا کہ تمسخر کرتے ہیں یا تتبع کرتے ہیں کیونکہ زبان کہیں فقط روزمرہ ہے کہیں عالم جبروت ولاہوت سے پرے کے الفاظ لاکر لفاظی کرتے ہیں اور جا بجا عربی زبان کے کہیں شعر کہیں مصرع ہوتے جاتے ہیں مضامین فقط ظرافت کی باتیں اور حکایتیں ہیں۔ انھیں نظم کرکے معرفت و طریقت میں لاتے ہیں، کھیر میں نون ڈال کر تصوف کو تمسخر کر دیا ہے"۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے اشعار بعض مقامات سے پیش کر دئے جائیں۔ فلسفیوں اور منطقیوں کو نصیحت فرماتے ہیں:

تا کجے باشی چنیں زار و زبوں　　علم میخوانی پئے دنیائے دوں
از مقولات آوری تا کے سخن　　اے حکیم از بجر خود فکری بکن
بدتر از مشکل ہماری اے عبوس　　قید خواہی گفت از شکل عروس
ز اہل اشراق آوری تا کے دلیل　　چند مشائیں صفت باشی ذلیل
چیست از بعد مجرد حاصلت　　میشود آخر جہنم منزلت،
ہیچ از صغرا و از کبریٰ مخواں،　　از نتیجہ خواہی آمد در فغاں
از دلیل انی دلے چہ سود　　تب وقل الحمدللہ الودود،
از ہیولا عقدۂ نکشایدت　　شوق و ذوق ابطال خبر سنجایدت
آخر ایں تفکیک اجزائے رجا　　آسیا ساحی کند فخر ترا،
ایہا المسجون فی قید الذلل،　　لاتقف واکمن علی راس الجبل
رند مشرب باش و عاشق پیشہ شو　　فارغ از افکار و از اندیشہ شو

ایک جگہ اور اس طرح پند و عظمت کے دریا بہائے ہیں:-

لیک گستردی بسان عنکبوت　　دام تلبیس از پئے تحصیل قوت
تار دیود ہستیت بگسستنی است　　ایں زبان صید گیری اندکے است

بس مگسہا طعمہ گردیدہ است — دل ضعیفاں راز تو رنجیدہ است
تا کجا ایں سعی بیجا بہر صید — ایں تکبر تا کجا ایں مکر و شید
تا کجا باشی میان مزبلہ — بہر شیطاں ورد خود کن ہو قلہ
قل ہو اللہ احد آغاز کن، — ذکر الا اللہ را دمساز کن

ایک اور مقام سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

خویش را در فکر رازق ساز گم — خواندہ باشی فی السماء رزقکم
گفت خود روزی رسانِ انس و جاں — رزقہاء مقسوم شد در آسماں
ایں کفالت را نگر اے ذو فنون — واو عطف آورد بر ما توعدون
ما، موصول انچہ باشد فارسیش — سرسری آنرا بداں در زعم خویش
جامعیت لاحق انیمعنی است — گر نہ فہمی وائے بر ایں فکری است
حمد شی را حاوی است ایں لفظ ہا — از فیوض او بود نشو و نما
جملہ افعال و صفاتت اے پسر — شد مقدر بہر تو از خیر و شر
بہرہ داری گر از ترکیب نحو، — خویشتن را خود مکن در ہو محو
تا بروئیت منکشف ایں پردہ شد — میرسد چیزے کہ وعدہ کردہ شد
پس چہ باشد حاصل از سعی و تلاش، — خود بفہم اے نکتہ فہم خوش معاش،
من بفرماں خدا اے خود شام — فای تعقیب است پس دادستم
قصہ آنرا شنیدی کو مدام — ذکر ما ابلیس خواندے صبح و شام
چلہ تا بگذشت شیطاں شد پدید — با عصا و جبہ درویش سفید
گفت اے شخص انچہ گوئی حاضرم — باتو شد خوشنود اینک خاطرم
گفت من ز افلاس نالاں بودہ ام — سخت با حالِ پریشاں بودہ ام

اس حکایت کا خاتمہ اِن اشعار پر کیا جاتا ہے :-

الاماں از مکر ابلیس الاماں، — الاماں از زور تلبیس الاماں،
ایں خطرہا و وساوس با نیاز — جو نجات از لطف حق کردگار
ایں حکایت یاد دار اے پر سبر — تو ازیں تزویر شیطاں درگزر
پختنِ شیر و برنجت خوب نیست — نزدِ اہلِ وجد ایں مرغوب نیست

چیست ایں شیر و بر بخت اے فتا　　خواستی تائید از غیرِ خدا

اِن اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آزاد کی رائے اس مثنوی کے بارہ میں خلاف واقعہ ہے۔
دوسری مثنوی نواب سعادت علی خاں کے شکار کے بیان میں ہے اس کے اشعار سے فردوسی، طوسی کے تتبع کا اظہار ہوتا ہے۔ زبان کی شیرینی اور ترکیب کی چستی اس مثنوی کی خصوصیات ہیں۔ انشاؔ کی چلبلی طبیعت اور خوشگوئی نے مثنوی کے حسن میں مزید چار چاند لگا دئے ہیں۔ مختلف مقامات سے اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

شکارنامہ

اینکہ کنوں میگذرد در شمار　　بست فزوں از دو صد و یک ہزار
ساختہ در خامۂ انشاء وطن　　چند ہزار آہوئے مشکِ ختن،
بہ کہ کنوں صید مضامیں کنم　　بارگیِ ناطقہ را زیں کنم،

در تمہید کلام

از مددِ شیرِ خدائے ودود　　صورتِ عنقائے طرب پر کشود،
ذہن و ذکا رقص چو طاؤس کرد　　مست شدہ آہوئے صحرا نورد
طائرِ اقبال بہ نشو و نما　　سایہ فگن گشتِ بسانِ ہما،
خیزد لا صبح سعادت دمید　　فصلِ گل و بادِ بہاری وزید

در تعریف حضور پر نور

اشرفِ خیلِ وزرائے زماں،　　ناظم ملکِ ہمہ ہندوستاں،
صفدر و منصور و سخی و شجاع　　بست کمر از پئے قتلِ سباع
تاختہ از خانہ بہ عزمِ شکار،　　کرد برو برج اسد جاں نثار

در تعریف خیمہ و خرگاہ و نوبت و نقارہ و ما یتعلق بذلک

تاکہ نبرد خیمۂ زریں طناب　　آمدہ در برجِ حمل آفتاب
گشتِ ز نقارہ صدائے بلند　　زندہ بماں زندہ بماں بے گزند
در دہلِ نقرہ در آمد بجوش　　تا بتواں تا بتواں، ہاں خروش
حلت صید است در آئینِ من،　　دینِ من و دینِ من و دینِ من
واشدہ زیں ساں دہنِ کرنا　　بادیدہ - بادیدہ - بادُعا

دشمن ایں خانہ جگر خوں بود | دوں بود و دوں بود و دوں بود
عیشِ برون از حدِ اندازہ شد | رسمِ کہن از سرِ نو تازہ شد
غلغلۂ کوس بکیوان رسید | آب شدہ زہرۂ دیو سفید
کوہ چو غریدنِ پیلش شنید | صورتِ خرطوم وے از دور دید
گفت بروں آمدہ از زیر ابر | صور اسرافیل پئے صید ببر
وقتِ ہماں است کہ سیمرغ قاف | بگذرد از گفتۂ لاف و گزاف
آنچہ ندیدست فریدوں بخواب | جملہ مہیا است درادر رکاب
چونکہ بدید ایں ہمہ عظم و شکوہ | لرزہ بر افتادہ بر اندام کوہ

تاریخ

فوج ظفر موج بایں عز و جاہ | گرد رسانید چو بر اوجِ ماہ
شوکتش انشاء بخط زر نوشت | فقرۂ تاریخ مظفر نوشت

تعریف اسپ

خود چو بر اسپ عربی بر نشست | آمدہ بر فوج عزالاں شکست
اسپ چہ اسپ اشہب بادِ صبا | اسپ مگو شہ رخِ گلگونِ قبا
اسپ بایں شوخیِ دلچسپ کو؟ | حور بگو - اسپ مگو - اسپ کو؟
اسپ مداں لمعۂ شرق است ایں | اسپ کجا چشمکِ برق است ایں
پیش رو جودتِ طبعِ سلیم | گام نہد بر برو دوشِ نسیم
زیب دہ کوہ و بیابانِ نجد | قیس اگر بنگرد آید بہ وجد
سیرت لیلےٰ رسدش در خیال | باہمہ چالاکی و حسن جمال
بندشش ار نادرِ کشورستاں | وصف کند باہمہ ایرانیاں

تیسری مثنوی کی یہ کچھ کم خصوصیت نہیں ہے کہ اس میں کوئی حرف نقطہ دار نہیں آیا ہے سرخیاں تک بے نقط ہیں مثلاً (۱) لوحہ در حمد مالک الملک (۲) لوحہ در مدح سرورِ کل (۳) لوحہ مدح سوار دلدل (۴) لوحہ در مدح مالک گاہ لوحہ در مدح حاکم عصر ـــــ مثنوی کے خاتمہ پر ایک مناجات ہے وہ یہاں پیش کی جاتی ہے:-

عمر صد سالہ دہ الٰہم | اللہم ارحم ارحم ارحم
اسلام دہ و کمال آرام | آور عملِ مرام در کام

حاصل ہمہ ام سرور گردد ، ہم سدرو دوار دور گردد ،
در دورہٗ دہر دار مرور ، وہ در ارحم امارد و حور ،
در عالم دار کردگارا ، اولادم را و سادہ آرا ،

ایک اور مختصر فارسی مثنوی شرح "مائۃ عامل" ہے - اس میں عربی زبان کے قواعد سمجھائے گئے ہیں - نمونہ حاضر ہے :-

در معارف پنجگانہ

بدانکہ پنج معارف بود میاں عرب ، نیافت است کسے غیر شاں در استقرا
بگوی مضمر و مدخول لام و ہم علم است ، دگر چہ مبہم ایا عقل و ذہن را ملجا
مضاف سوی ہماں ہر چہار پنجم شان ، کتاب نیست بود ایں کلید گنج انشاء

رحمت نبی خاں ام - اے (علیگ)

نگار کے پُرانے پرچے

۲۶ء جنوری ۱۲ر ---- ۳۱ء جولائی ، اگست فی پرچہ ۸ر - اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸ر ---- ۳۲ء فروری ، مارچ فی پرچہ ۱۲ر - مئی ، جون ، جولائی فی پرچہ ۸ر - ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸ر ---- ۳۴ء اکتوبر ۸ر ---- ۳۷ء فروری ۸ر - جولائی ۸ر - اکتوبر ۸ر ---- ۳۸ء فروری ۸ر ، اپریل تا دسمبر فی پرچہ ۸ر ---- ۳۹ء فروری تا جولائی - اکتوبر ، نومبر فی پرچہ ۸ر ---- ۴۰ء فروری تا دسمبر (جون ، جولائی ، اگست نہیں ہیں) فی پرچہ ۸ر ---- ۴۱ء مارچ تا دسمبر (اگست نہیں ہے) للعہ ---- ۴۲ء مارچ تا مئی فی پرچہ ۸ر - اگست ، ستمبر ، اکتوبر و نومبر فی پرچہ ۸ر ---- ۴۳ء مئی ۱۲ر - ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ر ---- ۴۴ء مئی تا دسمبر مسلسل ۱۲ر فی پرچہ ---- ۴۵ء اپریل ۸ر - جون ، جولائی فی پرچہ ۱۲ر - اگست تا دسمبر ۸ر فی پرچہ ---- ۴۶ء اپریل تا اگست فی پرچہ ۸ر - ستمبر ، اکتوبر ، نومبر ، دسمبر فی پرچہ ۱۲ر - (مکمل فایل ۴۶ء عہ)

منیجر نگار لکھنؤ

عرفی شیرازی

فارسی ادب کی تاریخ میں جو سچی شہرت عرفی شیرازی نے حاصل کی اس کی مثال بہت ہی کم ملے گی، اس کی شہرت صرف ہندوستان تک محدود نہ تھی بلکہ ترکی میں بھی اس نے اچھا خاصہ نام پیدا کر لیا تھا۔ گب لکھتا ہے کہ جامی کے علاوہ جن فارسی شعرا کا اثر ترکی ادبیات پر بہت گہرا پڑا وہ فیضی اور عرفی تھے۔ ضیا پاشا نے جو منظوم مقدمہ "خرابات" پر لکھا ہے اس میں عرفی اور فیضی کی بہت تعریف کی ہے۔

نام و نسب تذکروں میں عرفی کے نام کے متعلق اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عبدالباقی نہاوندی (صاحب مآثر رحیمی) نے جو خود عرفی کا معاصر ہے اور جس نے اس کی زندگی کے دلچسپ واقعات بہم پہونچائے ہیں، اس کا نام خواجہ سیدی محمد لکھا ہے۔ دوسرا معاصر تذکرہ نویس عبدالنبی (صاحب میخانہ) ہے جس نے شاعر مذکور کے حالات خود اس کے خالو شمس الانام شیرازی سے سُن کر قلم بند کئے تھے۔ اس نے اس کا نام محمد حسین لکھا ہے، بقیہ تمام تذکرہ نگار جن میں تقی اوحدی (صاحب عرفات) اور تقی کاشی مولف خلاصۃ الاشعار ہیں (اول الذکر کی عرفی سے دوستی کا یہ عالم تھا کہ شیراز کے تمام شعرا اس پر حسد کرتے تھے) اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا نام جمال الدین سیدی ہے۔

مآثر رحیمی کا جو نسخہ بانکی پور کے کتاب خانہ میں ہے اس میں "خواجہ" اور "سیدی محمد" کے درمیان کچھ فصل ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کاتب کو اس کے نام میں شبہ تھا۔ لیکن فہرست کتاب خانہ مذکور میں ایک جگہ اس کا نام "مولانا سید محمد" اور دوسری جگہ خواجہ سیدی محمد ہے جو مآثر رحیمی سے ماخوذ ہے، شعر العجم میں 'مآثر' اور عرفات کے بیان کی تطبیق اس طرح کی گئی ہے کہ "محمد" اس کا نام اور 'جمال الدین' اس کا لقب بتایا گیا ہے۔ حالانکہ عرفات میں نہایت واضح طور پر اس کا نام "جمال الدین سیدی" لکھا ہوا ہے، صاحب مےخانہ نے جو اس کا نام قلم بند کیا ہے وہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ مشہور محقق براؤن نے عرفی کا نام جمال الدین محمد (باضافۂ محمد)، اور بعض دوسرے تذکروں میں صرف جمال الدین (بہ حذف سیدی) پایا جاتا ہے۔

چونکہ عرفی کے متعلق سب سے زیادہ مستند قول تقی اوحدی کا ہے جس کی عرفی سے صرف ملاقات ہی نہ تھی بلکہ دونوں تقریباً پورے ۴ سال (۹۸۹ سے ۹۹۳ تک) ساتھ ساتھ رہے اور عرفی کی وفات کے بعد اس کے بعض عزیزوں کے ساتھ تقی نے اسکے اشعار پراشعار کہے، اور اس کے انتقال کی تاریخ نظم کی، اس لئے مآثر رحیمی اور میخانہ کے اقوال مستند قرار نہیں پاسکتے۔

عرفی کے نام کے متعلق جو اشتباہ پیدا ہو گیا ہے اس کی بظاہر یہ وجہ ہے کہ اس کا نام وہی قرار پایا جو اس کے دادا کا تھا۔

اسی بنا پر بعض تذکرہ نویسوں نے اس کے، اور اس کے دادا کے نام میں فرق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً مؤلف زبدۃ عشق نے اس کا نام جمال الدین اور دادا کا نام کمال الدین لکھا ہے۔

ہمیشہ بہار میں اس کا نام "سیدی" کے بجائے "صیدی" درج ہے۔ اس کو بہت آسانی سے کتابت کی غلطی پر محمول کیا جاسکتا تھا۔ لیکن میخانہ میں "صیدی" اس کا اول تخلص بتایا گیا ہے۔ اس سے اس کو کتابت کی غلطی کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا۔ لفظ "سیدی" سید سے علاقہ رکھتا ہے یا اس کا کوئی خاندانی نشان ہوگا کیونکہ اس کے دادا کے بھی نام کے ساتھ یہ لگا ہوا تھا۔

تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ عرفی کے باپ کا نام زین الدین علی بلوی ہے، صرف میخانہ میں اس کا نام خواجہ بلوی لکھا ہے۔ شعر العجم میں زین الدین علی بلوی کے بجائے زین الدین بلوی ہے، "ملوی" کتابت کی غلطی ہے اور "علی" کا حذف غیر شعوری طور پر ہوا ہے، چند دوسرے تذکروں میں بھی یہ حذف موجود ہے۔ بانکی پور کی فہرست میں بلوی اور علی دونوں لفظ محذوف ہیں، بہرحال یہ مسلم ہے کہ اسکے باپ کا پورا نام وہی ہے جو اوپر مذکور ہے "بلوی" کے متعلق یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ تخلص رہا ہے۔ خاندانی لقب نہیں معلوم ہوتا۔ تعجب ہے کہ پروفیسر براؤن نے تمام ماخذ کے خلاف عرفی کے باپ کا نام بدر الدین لکھا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

بقول مؤلف میخانہ خواجہ بلوی کا مولد شیراز ہی تھا۔ "در دفترخانہ ہائے شاہی بہ شغلے از اشغال حکام آں جا اشتغال داشت" مآثر رحیمی میں نہایت واضح طور پر لکھا ہے کہ عرفی کا باپ شیراز کی دار الحکومت میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا اور چونکہ ایران میں غیر مذہبی محکمہ جات کو عرف کہتے ہیں اسی مناسبت سے اس نے اپنا تخلص عرفی رکھا۔ لیکن میخانہ میں لکھا ہے کہ عرفی بچپن میں مولانا صیدی کے لقب سے ملقب ہوا اور اول جوانی ہی سے مشق سخن شروع کی، چونکہ اس کے اشعار بہت اعلیٰ درجہ کے ہوتے تھے اس لئے اس کے ساتھیوں نے اس کو عرفی تخلص عنایت کیا۔

اس کے دادا کے نام کے متعلق کسی قسم کی اختلاف رائے نہیں۔ اُن کا نام جمال الدین سیدی المعروف بہ "چادر باف" تھا یہی نام اس کے ہونہار پوتے کا بھی تجویز ہوا۔ چادر باف کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اس کے خاندان کو "چادر بافی" سے کسی قسم کا علاقہ رہا ہو۔

عرفی نے اپنے کلام میں جابجا اپنے نام و نسب پر فخر کیا ہے کیونکہ برخلاف عام شاعروں کے وہ ایک معزز خاندان کا رکن تھا چنانچہ لکھتا ہے:

ایں جوہر ذات از شرف نسبت آباست — سوداست بہ ابر ایں دُر اگرچہ سبریم را
ہر چند کہ در کشمکش جاہ و مناصب — گم نام نمودند ہمہ دودۂ ہم را
از نقش و نگار در و دیوار شکستہ — آثار پدید است صنادید عجم را
تا گوہر آدم نسبم باز نہ استد — زاباۓ خود از شرم اصحاب کرم را
اما نبود وصف اضافی ہنر ذات — ایں فتوی ہمت بود ارباب ہمم را
ایں برق نجابت کہ جہد از گہر من — درج است دلے گوہر ذات اب و جم را

وصفِ گل و ریحاں بہ ہوا باز نہ گردد   ہر چند ہوا عطر دہد قوتِ شمّم را

المنۃ للّٰہ کہ نیازم بہ نسب نیست   اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را

شیراز، عرفی کا بھی مولد تھا اور اس کے آباؤ اجداد کا بھی، چنانچہ لکھتا ہے :-

نازشِ سعدی بہ مشتِ خاکِ شیراز از چہ بود   گر نہ می دانست باشد مولد و ماوائے من

البتہ اصفہان میں اس کے بعض عزیز موجود تھے چنانچہ انھیں کے ساتھ تقی اوحدی اصفہانی نے عرفی کے اشعار پر اشعار لکھے تھے

پیدائش

عرفی کے بچپن کے حالات کسی تذکرہ میں نہیں ملتے۔ نہ اس کا سنہ پیدائش کسی نے لکھا۔ اس لئے محض دوسرے واقعات سے اسکی پیدائش کا سال نکالا جائے گا۔ یہ مسلّم ہے کہ اس کی وفات ۹۹۹ھ میں ۳۶ سال کی عمر میں واقع ہوئی اس لحاظ سے اسکی پیدائش کا سال ۹۶۳ھ قرار پاتا ہے۔ اس سلسلہ میں عرفات العاشقین کا ذیل کا قول جو اقتباس ضروری ہے:[1]

"راقم ایں مقال در عنفوانِ حال چوں در جادۂ شانزدہ سالگی قدم وجود در نہادم از اصفہان کہ مولد و موطن اصلیت بود متوجہ شیراز شدم کہ منزل آباؤ اجداد بود، و دراں جا بہ خدمت و صحبت مولانا عرفی رسیدم پنج سال قبل ازاں کہ وے متوجہ سفر ہند شود، اکثر اوقات در ملازمت او شعرائے دیگر کہ مجتمع بودند . . . . بسیار از بابا فغانی وغیرہ طرح می شد و دراں اثنا میانۂ وے و مولانا وحشی مباحثات غائبانہ واقع شد و دراں وقت سی وے تخمیناً بہ سرحد سی سالگی رسیدہ بود و اتحاد وے با مخلص بہ حدے بود کہ اکثر شعراء در رشک بودند۔"

صاحب عرفات کی پیدائش ۹۷۳ھ میں ہوئی تھی، اس حساب سے ۹۸۹ھ میں وہ شیراز آیا ہوگا اور وہاں وہ ۴ سال یعنی ۹۹۳ھ تک مقیم رہا۔ صاحب خلاصۃ الاشعار نے عرفی کے ورود ہند کی تاریخ ۹۹۴ھ لکھی ہے اس لحاظ سے بھی عرفی اور تقی اوحدی کی ملاقات کا سال ۹۸۹ھ قرار پاتا ہے، بہر حال ۹۹۳ھ میں عرفی کی عمر ۳۰ سال کی ہوتی ہے اسلئے اسکی تاریخ پیدائش ۹۶۳ھ صحیح طور پر قرار پاتی ہے۔

عرفات کی مذکورۂ بالا عبارت صاف نہیں ہے۔ ایک بات دوسری بات سے اس طرح ملی ہوئی ہے کہ دونوں کو الگ کرنا دشوار ہے، اس عبارت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ۹۸۹ھ میں جب مولف عرفات شیراز آیا تو یہاں عرفی موجود تھا۔ اسکے پانچ سال بعد وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ ان ایام میں اکثر شاعروں سے مباحثہ رہتا تھا۔ وحشی یزدی سے بھی غائبانہ اور تحریری مباحثے ہوئے، ان دنوں اسکی عمر تقریباً ۳۰ سال کی تھی اور اس کی اور مؤلف کی دوستی قابل رشک تھی۔

وحشی کا انتقال ۹۹۱ھ میں ہوا ہے، اسوقت عرفی کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔ "دراں وقت" کا مطلب ۹۹۲ اور ۹۹۳ ہجری سے ہے۔ اس وقت عرفی کی عمر ۳۰ سال کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

قیام شیراز

بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کو تلاش علم، تلاش معاش اور تلاش ممدوح کے لئے سفر نہ کرنا پڑا ہو عرفی بھی اس کلیئے سے مستثنیٰ نہیں تھا، البتہ چونکہ شیراز دار العلم و دار الفضل تھا اس لئے اسے تلاش علم میں دوسری جگہ جانے کی ضرورت

---

[1] ورق ۵۰۲، ۵۰۳ (نسخۂ رامپور)

لاحق نہ ہوئی چنانچہ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ عرفی نے اپنے ہی وطن میں کسب علوم کئے، وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس نے اولاً عربی صرف و نحو، منطق و عروض کی طرف توجہ کی اور اس میں خاصی استعداد بہم پہونچائی۔ مولف بہارستان سخن نے لکھا ہے کہ معمولی علوم کے علاوہ مصوری و نقاشی میں بھی مہارت تامہ حاصل کی تھی۔

عرفی نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا وہ سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی ۱۲ سال شاہ طہماسپ (۹۳۰ - ۸۴ ہجری) کے عہد حکومت میں گزارے، اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس کا وطن شیراز اس کے قیام ایران یعنی ۹۹۴ کے ۵ سال بعد تک صفویہ کے قبضہ میں براہ راست نہیں آیا تھا بلکہ سرکش سرداروں کی حکومت کا جزو تھا۔ شاہ اسماعیل بانی سلطنت صفویہ (متوفی رجب ۹۳۰) کا تمام زمانہ لڑائیوں میں صرف ہوا تھا۔ شاہ طہماسپ کا بھی بیشتر حصۂ زندگی اسی طرح گزرا، اس نے ترکوں کے ساتھ مسلسل جنگیں کیں۔ ازبکوں کے ہاتھوں اسکو بے حد پریشانی اٹھانا پڑی۔ گرجیوں کے ساتھ جو اس نے لڑائیاں کیں اس میں طرفین کا بہت نقصان ہوا۔ شروانیوں سے اس کی پرخاش جاری رہی، خان احمد والی گیلان سے برسرپیکار رہا۔ تبریز کے شورہ پشتوں کو زیر کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا اٹھایا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے خانگی اور خاندانی تعلقات کے بارہ میں بھی بڑا بد قسمت تھا۔ اس کے بھائی سام مرزا نے اس کے خلاف بغاوت کی اور دوسرا بھائی القاس بھی باغی اور غدار ثابت ہوا اور قلعہ قہقہہ میں بند کر دیا گیا۔

مختصر یہ کہ شاہ طہماسپ نے اگرچہ ۵۰ سال سے زاید حکومت کی لیکن اس کو کبھی یکسوئی و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ مگر اس نے سلطنت صفویہ کی جڑ مستحکم کر دی، دول خارجہ پر اپنا رعب بٹھا دیا اور اندرونی فتنہ و فساد کا سد باب کر دیا۔ ان وجوہ سے علوم و فنون کی ترقی کے موقع نکل آئے۔

شاہ طہماسپ کے مرتے ہی ایران میں کچھ دنوں کے لئے مستقلاً فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے انتقال پر اس کے ۹ بیٹوں میں تخت کے لئے جھگڑا ہوا، اس میں اسماعیل کو کامیابی ہوئی اور وہ اسماعیل ثانی کے لقب سے تخت ایران پر متمکن ہوا اسکا زمانہ "خونیں دور" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اولاً اس نے اپنے دو بھائیوں کو قتل کرایا پھر شاہزادوں کے قتل کا بازار گرم کیا۔ دس ماہ کے اندر ۶ شہزادے موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ صرف خورد سال شاہ عباس میرزا جو شاہ عباس اعظم کے نام سے ایران کا سب سے زیادہ زبردست حکمراں گزرا ہے، باقی بچا۔ اس کے اس طرح بچنے کو اسکندر منشی[1] معجزہ اور تائید غیبی سمجھتا ہے۔ ایک سال چار ماہ کے بعد شاہ اسماعیل کا انتقال ہوا اور جیسی اس کی زندگی شرمناک تھی ویسا ہی اس کا خاتمہ بھی ہوا۔ اس کی وفات پر محمد خدابندہ تخت نشین ہوا تخت پر بیٹھتے ہی اس نے پری خان خانم کو جس نے شاہ طہماسپ کے انتقال کے وقت فتنہ و فساد میں نمایاں حصہ لیا تھا، معہ اسکے ماموں اور شاہ اسماعیل کے خورد سال بچے کے، موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان سفاکانہ قتلوں کا نتیجہ ہوا کہ شاہی خاندان میں صرف خدابندہ کے چار لڑکے باقی بچے غرض اس طرح مادر زاد اندھا خدابندہ ۱۰ سال کی ناتمام حکومت کے بعد ذیقعدہ ۹۹۵ھ میں شاہ عباس کو زمام سلطنت دے کر تخت سے دست بردار ہو گیا۔

---

[1] مولف تاریخ عالم آرائے عباسی

ایسی سیاسی کش مکش کے زمانہ میں عرفی نے آنکھیں کھولیں - بڑھا - پلا اور مشق سخن جاری کی - تعجب ہے کہ مولف شعرالعجم ایران کی سیاسی حالت کا جایزہ لینے میں ناکام رہے ورنہ ان کے قلم سے یہ الفاظ نہ نکلتے :

"عرفی نے جب[1] ہوش سنبھالا تو سلطنت صفویہ کا شباب تھا اور شاہ طہماسپ اور عباس کی علم پروری نے تمام ایران کو علم و ہنر کی نمایش گاہ بنا دیا تھا۔"

جیسا اوپر عرض کیا گیا، عرفی کی زندگی کے بیس اکیس سال واقعی ایسے دور میں گزرے جو کسی قدر پرسکون ضرور تھا - لیکن شاہ عباس کے زریں عہد کی روشنی وہ اپنی آنکھوں سے کبھی نہ دیکھ سکا کیونکہ اس بادشاہ کی تخت نشینی کے تین سال قبل ہی وہاں کی غیر مطمئن حالات سے اُکتا کر وہ ہندوستان چلا آیا تھا - اس کے وطن شیراز پر شاہ عباس نے اپنی تخت نشینی کے تیسرے سال قبضہ کیا -

بہر حال حالات خواہ موافق سمجھو یا ناموافق اس وقت ایران میں شعر و شاعری کا چرچا بڑے زوروں پر تھا - محتشم کاشی (متوفی ۹۹۶) وحشی یزدی، غیرتی شیرازی وغیرہ نے فغانی کے طرز کو اور زیادہ شوخ کر دیا تھا اور تمام ملک ان کی زمزمہ سنجیوں سے گونج اُٹھا تھا - عرفی نے اپنے اظہار کمال کے لئے یہی میدان تجویز کیا تھا اور باوجود کم عمری کے پرانے اور کہنہ مشق اُستادوں سے طبع آزمائی شروع کر دی -

اس وقت شاعری کے مرکز بہت سے تھے جن میں کاشان، یزد اور شیراز کے شعرا سے عرفی نے مباحثہ اور مکالمہ شروع کیا - کاشان میں مناظرہ کا عام طور پر رواج ہو چلا تھا - یہاں کے اساتذہ میں محتشم اور حیدر معمائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - عرفات میں ہے : "محتشم - از اول شاہ طہماسپ تا ظہور شاہ عباس در ایران بہ اُستادی و شاعری مستقل بود۔"

غضنفر، فہمی کاشی، حاتم کاشی، باقر کاشی، سنجر کاشی، مقصود خردہ خاص طور پر مناظر تھے - غضنفر اور وحشی کے جھگڑے، فہمی اور وحشی کے مناظرے، حاتم اور فہمی کی چوٹیں، باقر اور حاتم و فہمی کے مباحثے "خلاصۃ الاشعار"، "مآثر رحیمی" اور "عرفات العاشقین" کے صفحات کی زینت ہیں - شیراز کے شاعروں میں غیرتی، حسین کاشی، عارف لاہجی اور رضائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - یزد کے اُستادوں میں وحشی سب سے زیادہ ممتاز تھا - اس کا بھائی بھی اچھا خاصہ شاعر گزرا ہے - وحشی نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کاشان میں صرف کیا چنانچہ وہاں کے بیشتر شاعروں سے رو برو مناظرے ہونے کے واقعات خلاصۃ الاشعار میں خاص طور پر مذکور ہیں -

عرفی نے ان تینوں مرکزوں کے اساتذہ سے طبع آزمائی کی - شیراز کے شعرا سے تو اس نے رو در رو مقابلہ و مناظرہ کیا جب تقی اصفہانی ۹۸۹ھ میں شیراز گیا تو اس نے مشہور شعرا کے نام دریافت کئے لوگوں نے غیرتی کا پتہ دیا - شیراز میں ایک دکان تھی جو شعرا کا دنگل تھا - یہیں شیراز کے شعرا مشاعرہ کرتے تھے - مشاعرہ میں غیرتی اور عرفی کا مباحثہ ہوا، عرفی نے دعویٰ کے دونوں پہلو لئے اور دونوں میں غیرتی پر غالب آیا - اس طرح[2] کے مناظرہ کا ذکر مآثر میں بھی پایا جاتا ہے -

---

[1] شعرالعجم ج ۳، صفحہ ۸۳ —— [2] مآثر رحیمی (بانکی پور نسخہ قلمی) ورق ۷۲

اس دور میں فغانی کی اتباع کا رواج اس درجہ ترقی پذیر تھا کہ ہر مستند شاعر اس کی غزلوں پر غزلیں لکھتا چنانچہ محتشم کاشانی اور دوسرے کاشان کے شعرا نے فغانی کے طرز پر غزلیں لکھیں اور عرفی نے بھی اسی کی غزلوں کا جواب لکھا ــــ اس طرح سے کاشان کے شعرا سے اس نے تحریری مناظرے کئے۔ اگرچہ کسی تذکرہ سے صاف طور پر پتہ نہیں چلتا کہ اس نے محتشم سے بھی مباحثہ و مکالمہ کیا یا نہیں۔ لیکن فغانی کے طرز کی دونوں نے پیروی کی ہے اس سے شبہ ہوتا ہے شاید دونوں میں تحریری مباحثہ بھی ہوا ہو۔

وحشی اس دور کا سب سے بڑا استاد تھا۔ کاشان کے بیشتر شعرا سے اس نے مناظرے کئے۔ جھگڑے ہوئے۔ رکیک ہجویں لکھی گئیں۔ عرفی باوجود کم عمر ہونے کے وحشی ایسے کہنہ مشق شاعر کے مقابل خم ٹھونک کر آگیا۔ موخرالذکر اس وقت یزد میں تھا اور عرفی شیراز میں، اس لئے دونوں میں کئی بار تحریری مباحثے ہوئے تقی اصفہانی نے اس کی طرف صاف اشارہ کیا ہے۔ اور چونکہ اس وقت شیراز میں عرفی ہی کی صحبت میں تھا اس لئے اس کا قول نہایت ہی مستند ہے۔

عرفی، وحشی سے ۲۵ سال چھوٹا تھا۔ تقی اوحدی کے بیان کے موافق عرفی نے مناظروں اور مباحثوں کے میدان میں ۹۸۹ھ کے قریب قدم رکھا تھا اور چونکہ ۹۹۱ھ میں وحشی مرگیا تھا۔ اس لئے ان دونوں کے مناظرے تقریباً ۲ سال تک جاری رہے ہونگے۔ غرض کہ عرفی نے اپنی زندگی کی ۳۰۔ ۳۱ منزلیں ۹۹۳ھ میں ختم کیں۔

عرفی کی اس زندگی کا کوئی مخصوص کارنامہ باقی نہیں رہا جس سے ہم اس کی شاعری کا اندازہ لگا سکیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس عمر کا بیشتر حصہ شعر و شاعری میں صرف ہوا، ایران کی زندگی ہی میں اس نے اس میدان میں کافی نام پیدا کر لیا تھا، وحشی یزدی محتشم کاشی، غیرتی شیرازی جیسے کہنہ مشق شاعروں کے سامنے ایک نو آموز اور نوجوان کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے لیکن وہ ایک استاد کی طرح ان سے زور آزمائی کرتا ہے۔ تقی اوحدی کے قول کے مطابق ۹۸۹ھ کے قبل ہی جب کہ اس کی عمر ۲۵ سال سے متجاوز نہ تھی شعرا کا ایک گروہ ہر وقت اس کی خدمت میں رہتا تھا، خود تقی نے جو ایک نو آموز شاعر اور ادیب و مورخ تھے اور عرفی کی صحبت سے ۴ سال تک مستفید ہوتے رہے۔ یہ سب واقعات عرفی کا کمال ثابت کرنے کے لئے لکھے ہیں۔ اس کے چھ ہزار اشعار جو ضایع ہوگئے ایران ہی کی زندگی میں کہے گئے تھے۔

ورود ہند یہ مسلم ہے کہ ایران میں عرفی کو کوئی خاص ممدوح نہ مل سکا۔ سبب ظاہر ہے۔ جب اسکی شاعری چمکی تو وہاں کی مرکزی حکومت کی باگ جس کی ترقی کا ابھی عنفوان ہی تھا ایک کمزور ہاتھ میں تھی اسی وجہ سے اہل علم کی حسب دلخواہ قدردانی نہ ہوسکی۔ یہ حقیقت حال ہے کہ طہماسپ اور عباس ایسے جلیل القدر بادشاہوں نے شعرا کی قدردانی معقول طور پر نہیں کی۔ اس کے برعکس ہندوستان میں علماء و فضلا کی قدردانی کا کچھ ایسا قدرتی سامان جمع ہوگیا تھا کہ ایران کے گوشہ گوشہ سے شعرا اور اہل علم کھنچے آتے تھے۔ اس عام سبب کے علاوہ عرفی کے آمد ہند کی کوئی اور خاص وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ عرفات کا مؤلف خاموش ہے۔ البتہ میخانہ میں ذیل[1] کا واقعہ مندرج ہے جو بظاہر بے محل و بے ربط معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] صفحہ ۱۷۶

"وسبب برآمدن او از شیراز ازیں رہگذر است کہ در سن چہاردہ و پانزدہ حسن او قبول تمام عیاری بہم رسانیدہ بود و آبلہ کشیدہ چوں سال عمرش بہ بیست رسید آبلہ سرشاری برآورد، بعد از انقضائے اشتداد و استخلاص آں مرض تغیرے در چہرہ او بہم رسید چنانچہ ہر کس کہ او را می دید از و تنفر می کرد و مولوی ازیں مقدمہ بغایت آزردہ بہم بود و بہ خاطر نمی رسانید کہ

چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

از غرور جبلی کہ داشت بنابراں از وطن خروج کردہ"۔

یہ مسلم ہے کہ وہ ۹۹۴ھ میں ہندوستان آیا جب کہ اس کی عمر ۳۱ سال کی ہو چکی تھی، صاحب خلاصۃ الاشعار نے واضح طور پر یہی تاریخ لکھی ہے، عرفات کے بھی بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ تقی اوحدی نے لکھا ہے کہ اس کے ورود شیراز کے ۵ سال بعد عرفی ہندوستان کی طرف روانہ ہوا، چونکہ ۹۸۹ھ میں تقی کا شیراز جانا مسلم ہے اس لئے عرفی کا ۹۹۴ھ میں ہندوستان آنا قطعی ہے۔ اگر میخانہ کا قول تسلیم کیا جائے تو عرفی کی وطن سے روانگی ۹۸۳ھ میں ثابت ہوتی ہے اور چونکہ ۹۸۹ھ سے ۹۹۳ھ تک اس کا شیراز کا قیام یقینی ہے اس لئے میخانہ کی روایت پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچ سکتی۔ مزید براں جو وجوہ اس نے بیان کئے ہیں وہ بھی قابل قبول نہیں معلوم ہوتے، اول لوگوں کا تنفر بیان کیا ہے، پھر غرور جبلی وجہ تحریک قرار دی ہے۔

شعر العجم میں لکھا ہے کہ بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ شاہزادہ سلیم کے حسن پر "غائبانہ عاشق" ہو کر چلا آیا ہے۔ یہ جملہ الف لیلہ اور چہار درویش کے قصہ کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے محقق نے اس بات کو کیونکر قبول کر لیا۔ میں نے ابتک جتنے تذکرے دیکھے ہیں ان میں سے کسی میں اس کے وطن چھوڑنے کی یہ وجہ نظر نہ آئی۔ جن تذکروں میں شاہزادہ سلیم سے خاص ارتباط رکھنے کا بھی ذکر ہے ان میں بھی اس کے غائبانہ عشق کو وطن سے نکلنے کی وجہ قرار نہیں دی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا اشارہ تمہید ہے ایک بہت بڑے واقعہ کی جس کا بیان آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

قیام احمد نگر تا ۹۹۵ ہجری عرفی کس راستے سے ہندوستان میں داخل ہوا اس کے ذکر سے اکثر تذکرے خالی ہیں۔ معاصر تذکرہ نگار مثلاً عبد الباقی، عبد النبی، تقی اوحدی نے بھی کچھ نہیں لکھا۔ شعر العجم بھی اس بارہ میں صرف اتنا لکھتا ہے[۱] کہ اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اس کی کل کائنات جاتی رہی۔ اس پر یہ رباعی کہی:

دوشینہ کہ بُرد بر دو بر دوشم بود ۔۔۔ زانو چو عروس نو در آغوشم بود

پوشیدنی نہ داشتم غیر از جسم ۔۔۔ چیزے کہ بزیر سر نہم گوشم بود

لیکن دوسرے معاصر اور مشہور تذکرہ نویس یعنی تقی کاشی نے لکھا ہے کہ وہ براہ دریا ہندوستان آیا، ایک تیسرے معاصر امین احمد رازی کے بیان سے بھی اسی قول کی تائید ہوتی ہے، غلام علی آزاد نے ید بیضا اور سرو آزاد دونوں میں لکھا ہے کہ عرفی دریا کے راستہ ہندوستان میں داخل ہوا، ہمیشہ بہار[۲] اور تحفۃ الکرام کے بیانات بھی اسی امر کے موید ہیں۔ فہرست بانکی پور

۱؎ ج ۳ صفحہ ۸۴ — ۲؎ ج ۳ صفحہ ۸۴

میں بھی دکن کے قیام کا ذکر ہے۔ محبوب الزمن میں جو صرف شعرائے دکن کا تذکرہ ہے عرفی کا شمول اس قیاس کی تائید کرتا ہے کہ وہ دکن میں مقیم رہ چکا ہے۔ البتہ نشترِ عشق میں شمالی ہندوستان سے دکن جانے کا ذکر ہے جو پایۂ تحقیق تک نہیں پہونچتا مزید براں شیراز سے ہندوستان آنے کا راستہ یہی تھا۔ دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں بحری سفر بہت آسان متصور ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ہزارہا اہل علوم مثلاً مولانا نظیری، ظہوری، ملک وغیرہ اسی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے اس لئے اگر عرفی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تحفۃ الکرام، یدِ بیضا، سروِ آزاد اور ہفت اقلیم میں لکھا ہے کہ عرفی بندر جرون[2] ہو کر آیا ہے، اس بندر کو اس زمانہ میں خاص اہمیت حاصل تھی۔

ہندوستان میں آکر وہ سیدھا احمد نگر آیا۔ تقی کاشی، اور امین احمد کے علاوہ ہمیشہ بہار[3] نے صراحتاً لکھا ہے کہ:-

"ہنگامے کہ عزم سواد ہندوستان نمود اول بہ دکن آمد و چندے در احمد نگر با مولانا ملک قمی و مولانا ظہوری صحبت داشت وباز متصل اکبر آباد در فتحپور سیکری رسید"

تقی اور امین احمد نے ملک اور ظہوری سے ملاقات نہیں لکھی اور بقیہ تذکروں میں صرف دکن کا ورود لکھا ہے۔ احمد نگر کا نام نہیں لکھا، لیکن چونکہ احمد نگر دکن ہی میں ہے اس لئے ان دو قسم کے بیانوں میں تضاد نہیں ہے۔

بہر حال چونکہ اس دور میں ظہوری اور ملک کا قیام ان دنوں احمد نگر ہی میں تھا۔ اس لئے عرفی اور ان لوگوں کی ملاقات تقریباً یقینی ہے۔ عرفی اور ظہوری کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ ظہوری کا عرفی کے پاس شال کا ہدیہ بھیجنا اور آخر الذکر کا ایک طنز آمیز خط لکھنا اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ دونوں کی ملاقات احمد نگر میں ہو چکی ہے۔

تمام تذکرے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس بات پر متفق ہیں، کہ احمد نگر یا دکن میں اس کی قدر دانی حسب دلخواہ نہیں ہوئی اور ہوتی تو کیوں کر ہوتی۔ وہاں کا بھی حال ویسا ہی تھا جیسا عرفی نے اپنے وطن میں دیکھا تھا۔ یہ دور مرتضیٰ نظام شاہ (۹۷۲ - ۹۶) کی حکومت کا تھا۔ آخر عمر میں وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے سارے انتظام میں خلل پڑ گیا تھا۔ قتل عام کا بازار گرم تھا۔ نظام شاہی سلطنت کی بنیاد متزلزل ہو رہی تھی ۹۹۶ اور ۹۹۸ کے درمیان دو مرتبہ ایسا زبردست قتل عام ہوا کہ جتنے پردیسی تھے ان میں سے بیشتر موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے۔ افواہ اُڑی کہ ظہوری اور ملک بھی اسی ہنگامہ کی نذر ہو گئے۔ (بدایونی)

ایسے حالات میں شعرا کی قدر دانی ناممکن تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عرفی کسی دکنی دربار سے متوسل نہ ہو سکا اور غالباً ایک سال کے اندر ہی وہ وہاں سے شمالی ہندوستان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عرفی کی زندگی میں دکن کا قیام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نہ بادشاہ سے اس کا تعلق ہو سکا اور نہ اہل دول سے۔ اسکا ثبوت

---

[1] ج ۳ صفحہ ۹۴ — [2] جرون (ہرمز نو) جزیرہ است۔ در دریا قریب بہ ساحل فارس (میخانہ صفحہ ۵۸۴) مآثر رحیمی ج ۳ میں اس کا نام "جرون" لکھا ہے دیکھو صفحہ ۹۲۶، ۱۴۷۳، ۱۵۶۶ — [3] نسخہ بانکی پور ورق ۵۸

یہ ہے کہ اس کے موجودہ کلیات میں کوئی نظم یا قصیدہ کسی دکنی امیر یا سلطان کے نام کا نہیں ہے۔

شمالی ہند کا قیام تا ۹۹۹ ہجری

۹۹۴ کے آخر یا ۹۹۵ ہجری کی ابتدا میں عرفی نے شمالی ہندوستان کی طرف رخ کیا اور یہاں اگرچہ سیکڑوں امیر اور قدرداں تھے لیکن ان سب میں اس نے فیضی کو منتخب کیا جسکی وجہ بقول شبلی یا تو یہ تھی کہ اس کے دربار کی رسائی آسان تھی یا یہ کہ سخن شناسی کی جو توقع فیضی سے ہو سکتی تھی اور کسی سے نہیں ہو سکتی تھی۔

عرفی، فتحپور سیکری میں فیضی سے ملا۔ فیضی نے اس کی بڑی عزت کی اسی درمیان میں فیضی نے پنجاب اور سرحد کا سفر کیا۔ صفر ۹۹۴ میں جب یوسف زئی پٹھانوں پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا تھا۔ غالباً اس کا سفر اکبر کے ہمرکاب ہوا ہوگا جس نے ۹۹۴ ہجری میں کشمیر کی فتوحات کے سلسلہ اٹک میں قیام کیا تھا۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ اس سفر میں عرفی اٹک تک فیضی کے ہمرکاب رہا اور اس کی تمام ضروریات فیضی ہی کی سرکار سے پوری ہوتی رہیں۔

لیکن فیضی اور عرفی کی دوستی ایک سال سے زیادہ نہ قایم رہ سکی۔ کیونکہ تمام تذکرے متفق ہیں کہ فیضی کے دامن دولت سے انقطاع کے بعد عرفی نے حکیم ابوالفتح گیلانی سے روابط پیدا کئے اور اس کی صحبت سے اس نے کافی استفادہ کیا۔ اور چونکہ حکیم موصوف کا انتقال ۹۹۷ھ میں ہوا اس لئے اس سے قبل فیضی سے قطع تعلق ضرور ہو گیا ہوگا۔

فیضی سے تعلق منقطع ہو جانے کی وجہ بقول شبلی، عرفی کی نخوت پرستی ہے۔ لیکن بظاہر صرف یہی سبب نہ رہا ہوگا عرفی دربار شاہی سے متعلق ہونا چاہتا ہوگا، لیکن ابوالفضل اور فیضی کے آگے اس کا چراغ نہیں جل سکتا تھا اور اس کے کامیاب نہ ہونے دینے کا سبب یہ ہوگا کہ اس کی جودت طبع، سرعتِ فکر اور دقت نظر کی وجہ سے دونوں کو اس کا خطرہ محسوس ہوا ہوگا کہ اگر اس کو دربار میں باریابی حاصل ہو گئی تو پھر ان کی شہرت کا چراغ گل ہو جائے گا۔ مگر بدایونی نے قطع تعلق کی وجہ ذیل کی طنز آمیز گفتگو قرار دی ہے جو شعر العجم میں بھی منقول ہے:۔

"روزے بہ خانۂ شیخ فیضی آمد چوں سگ بچہ را با شیخ مخادما دید پرسید کہ ایں مخدوم زادہ را چہ نام است با شیخ گفت عرفی، او در بدیہ گفت "مبارک باشد" (مبارک فیضی کے والد کا نام تھا)[1]

یہ واقعہ اکثر تذکروں میں مذکور ہے لیکن خافی خاں نے اس کو سنہ ۱۰۰۱ھ کا قرار دیا ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو یہ واقعہ بالکل غلط ثابت ہو جائے گا اس لئے کہ عرفی اس کے دو سال قبل ہی فوت ہو چکا تھا۔

ایک دوسرا واقعہ صرف شعر العجم میں خافی خاں کے حوالے سے منقول ہے "ایک دفعہ (عرفی) ابوالفضل سے ملنے گیا دیکھا تو ابوالفضل قلم دانت میں دابے ہوئے سوچ میں بیٹھا ہے، سبب پوچھا۔ ابوالفضل نے کہا بھائی صاحب کی تفسیر بے نقط کا دیباچہ اسی صنعت میں لکھ رہا ہوں۔ ایک موقع پر والد کا نام آ گیا ہے چاہتا ہوں کہ نام بھی آئے اور صنعت کا التزام بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ عرفی نے کہا تردد کی کیا بات ہے اپنے لہجہ میں ممارک لکھ دیجئے"۔

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۸۵

یہ واقعہ بھی سنہ ۱۰۰۱ھ کا بتایا گیا ہے، اگر یہی تاریخ صحیح مان لی جائے پھر بھی اس واقعہ کے سرتاپا غلط ہونے میں کسی کا شبہ نہیں رہ جاتا کیونکہ عرفی کا انتقال دو سال قبل ہی ہوچکا تھا، لیکن اس واقعہ کو سنہ ۱۰۰۱ھ کے بہت بعد کا سمجھنا چاہئے کیونکہ "سواطع الالہام" (فیضی کی تفسیر بے نقط) ربیع الثانی سنہ ۱۰۰۲ھ میں تکمیل کو پہونچی اور اس کا دیباچہ اس سنہ کے بعد لکھا گیا ہوگا بلکہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ابو الفضل نے فیضی کے انتقال کے بعد اس کام کو پورا کرنا چاہا ہوگا اور چونکہ فیضی کا انتقال صفر سنہ ۱۰۰۴ھ میں ہوچکا تھا اس لئے اس واقعہ کو اس کے بعد کا سمجھنا زیادہ قرین صحت ہے۔ حالانکہ اس کے پانچ سال قبل ہی عرفی سفر آخرت اختیار کرچکا تھا۔ شعر العجم جیسی معتبر تاریخ میں ایسے لا یعنی واقعات کا جگہ پاجانا حیرت انگیز ہے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ مخزن الغرائب اور نشتر عشق میں موجود ہے، ابو الفضل اور فیضی نے عرفی کو اکبر کے سامنے ذلیل کرنے کی کوشش کی لیکن آخر میں خود ذلیل ہوئے، مخزن نے یہ واقعہ نقل کرکے خود اس کی تردید کی ہے۔

ابو الفتح گیلانی سے تعلقات تا سنہ ۹۹۷ ہجری

حکیم ابو الفتح اگرچہ منصب کے لحاظ سے امرائے دربار اکبری میں سب سے کم پایہ کا تھا لیکن بڑا زبردست عالم اور علم و فضل کا بڑا قدر دان تھا۔ اسی وجہ سے عرفی نے اس سے تعلقات پیدا کئے۔ اول اس نے ایک قصیدہ مدحیہ لکھ کر پیش کیا۔ غالباً یہ سب سے پہلا قصیدہ تھا جو کسی کی مدح میں لکھا گیا۔ اس سے عرفی کی آن ٹوٹی، اس کا اسے بے حد صدمہ ہوا، چنانچہ قصیدہ میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں:

۱- خیال بندگیت دوش نقش می بستم　　　زروے کسب شرف نے زروے استعداد

۲- بہ خدمت آمدم اینک بگو چہ مصلحت است　　　بر آستان تو باید نشست یا استاد

عرفی نے اس کے فیض صحبت سے بڑی ترقی کی، اس کا اشارہ حکیم صاحب نے ایک رقعہ میں جو خان خاناں کے نام ہے کیا ہے، میخانہ میں بھی لکھا ہے[1]:۔ "از فیض تربیت آں صاحب عیار دانش از حضیض پستی بہ مقام اوج بلندی رسید"

عرفی نے حکیم مذکور کی احسان مندی کا پورا حق ادا کردیا۔ جس زور کے قصیدے حکیم صاحب کی شان میں لکھے اکبر و خان خاناں کی مدح میں نہ لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ عرفی حکیم ابو الفتح کے دامن دولت سے ایک سال سے زیادہ وابستہ نہ رہ سکا کیونکہ حکیم کا انتقال سنہ ۹۹۷ھ میں ہوگیا[2]، عرفی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا چنانچہ اس وقت جو قصیدہ خان خاناں کی مدح میں لکھا اس میں کہتا ہے:۔

---

[1] میخانہ صفحہ ۱۶۱ ۔ [2] سنہ ۹۹۴ھ میں حکیم ابو الفتح سرحدی پٹھانوں کی مہم پر بھیجے گئے تھے۔ فیضی بھی ان دنوں اسی طرف تھا، عرفی فیضی کے ہمراہ اٹک تک جہاں شہنشاہ اکبر مقیم تھے، گیا تھا۔ کشمیر کی مہم بھی انہیں ایام میں شروع ہوئی، جب اس پر قبضہ ہوگیا۔ تو سنہ ۹۹۷ھ میں شہنشاہ اکبر اس کی سیر کو گئے، ان کے ہمراہ ابو الفتح اور فیضی وغیرہ تھے۔ عرفی بھی حکیم مذکور کی معیت میں وہاں گیا۔ وہاں سے واپسی پر حکیم درد شکم میں مبتلا ہوگئے، حسن ابدال میں قیام ہوا، ان کا مرض بڑھتا گیا۔ بادشاہ دو دفعہ عیادت کو گئے۔ آخر کو وہیں انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ انہیں دنوں میں علامہ فتح اللہ شیرازی جو کشمیر کی سیر میں اکبر کے ہم رکاب تھے، راہی ملک بقا ہوئے اور حسن ابدال ہی میں مدفون ہوئے، احری ساوجی نے تاریخ وفات نظم کی ؎

امروز دو علامہ ز عالم رفتند　　　رفتند و موخر و مقدم رفتند

چوں ہر دو موافقت نمودند بہم　　　تاریخ بشد کہ ہر دو باہم رفتند

عرفی نے یہ سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لئے اس کے دل پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا، جیسا کہ عرفی کے اس وقت کے قصیدہ سے صاف ظاہر ہے۔ اس تفصیل سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عرفی کی شہزادانہ تنہائی، تندی زندگی کا مختصر حصہ کشمیر، پنجاب اور سندھ کی سیر و سیاحت میں گزرا اور آگرہ کا قیام محض ضمنی تھا۔ ممکن ہے کہ وہاں سے جب

چہ احتیاج کہ گویم کہ مرد عرفی را　　چہ بر سر از ہوس مرگ ناگہاں آمد

دریں مصیبت عظمٰی کہ دہر سنگیں دل　　زگریہ ہر سر مو چشم خوں فشاں آمد

برفت و لطف تو برمن گزاشت و ایں بدل است　　بہ نزد عقل کہ تاوان آں زیاں آمد

تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید　　چہ گنج ہائے سعادت زیان جاں آمد

حکیم ابو الفتح اور خانِ خاناں سے بہت اتحاد تھا چنانچہ حکیم مذکور کی فرمائش سے اس نے ایک زور دار قصیدہ لکھا اور بقول صاحب میخانہ دکن بھیجا جس کے عوض میں خان خاناں نے لائق صلہ بھیجا۔ لیکن میخانہ کا قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ۹۹۷ھ کے قریب یہ قصیدہ لکھا گیا ہوگا اور ان ایام میں خان خاناں کشمیر و سندھ کی فتوحات میں مشغول تھا۔ اس قصیدہ میں دونوں کی محبت و ارتباط کا ذکر نہایت لطیف پیرایہ میں ہوا ہے:۔

ازاں نہ دیدہ شنا گویمت کہ می بینم　　ترا و او را یک تن بہ چشم روحانی

دلیل وحدتم ایں بس کہ مدح خود می خواست　　مرا بہ مدح تو فرمود گوہر افشانی

دیکھئے ایک سال کی مداحی میں کس قدر گوہر بے بہا اکٹھا کئے ہیں، معلوم ہوتا ہے ایسے شخص کا مذکور ہے جس سے برسوں کی محبت ہے۔ اور جس نے عرفی کی زندگی کا تجزیہ نہیں کیا ہے وہ اس بات کو جلد قبول نہیں کر سکتا کہ عرفی حکیم مذکور سے کم و بیش ایک ہی سال وابستہ رہ سکا۔

خان خاناں اور عرفی تا ۹۹۹ھ

حکیم ابو الفتح کے فوت ہو جانے پر عرفی نے خان خاناں کے ساتھ وابستگی پیدا کی۔ اگرچہ جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے خود حکیم مذکور کی زندگی ہی میں خان خاناں کی مدح میں اس نے قصیدہ لکھ بھیجا تھا لیکن اس وقت اس سے وابستہ نہیں ہوا تھا کیونکہ حکیم ہی اس کا مربی اور آقا تھا۔ بہر حال جو قصیدہ اس موقعہ پر لکھا ہے اس کا مطلع یہ ہے:

ز آسمان و زمین مژدہ ناگہاں آمد　　کہ آفتاب زمین تاج آسمان آمد

خان خاناں کے دربار میں پہونچ کر عرفی نے خاطر خواہ ترقی کی، مآثر رحیمی میں ہے:[1]

"بہ اندک فرصتے بہ یُمن تربیت و شاگردی و مداحی ایں داتائے رمز پختگی کلام و ترقی مال کلام در منظومات خویش بہم رسانید"

خان مذکور کے متوسلین میں نظیری، شکیبی، انیسی وغیرہ تھے۔ ان سے برابر مقابلہ رہتا تھا، اس لئے عرفی کا کلام روز بروز ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ تقرب و اختصاص میں وہ سب سے ممتاز ہوا، یہ بات اسی کو نصیب ہوئی کہ دربار میں جس جگہ چاہتا اور جس طرح چاہتا بیٹھ جاتا چنانچہ مآثر رحیمی میں ہے[2]:۔

"الحق ہیچ شاعرے ایں رتبہ و حالت در ملازمت بار شاہان زمان واکابر دوراں بہم نرسیدہ بود، چناں کہ در ایام ملازمت تسلیم و کورنشے کہ در میانہ متعارف ست کہ بعوض سلام بہ صاحبان می کنند بہ صاحب خود نمی کرد و بہ ہر طور و در ہر جائے کہ می خواستہ در مجالس می نشستہ و اہل عالم تقدیم او را قبول نمودہ اند"

عرفی خان خاناں کے ساتھ سفر و حضر میں رہا چنانچہ ۹۹۹ھ میں جب خان خاناں نے مرزا جانی بیگ ترخان والی ٹھٹھہ پر حملہ کیا تو عرفی اس کے ساتھ رہا اور غالباً اسی سفر سے واپسی میں اسی سال شوال کے مہینہ میں لاہور میں انتقال کیا۔

---

1. جلد ۳ ص ۲۶۲ ب؟

خان خاناں نے عرفی کے ساتھ جو فیاضیاں کیں اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک قصیدہ پر ستر ہزار روپے انعام دلوائے۔

عرفی اور اکبر

عرفی نے خان خاناں اور ابو الفتح کے سوا کسی امیر کی مدح سرائی گوارا نہ کی کیونکہ مدح سرائی سے اسے طبعاً نفرت تھی جیسا کہ خود کہتا ہے :۔

قصیدہ نظم ہوس پیشگاں بود عرفی   تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

لیکن فرمانروائے وقت سے یہ بے نیازی ممکن نہ تھی۔ اس لئے خود اپنی خواہش سے یا خان خاناں اور ابو الفتح کی فرمائش سے اکبر کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے۔ معلوم نہیں کہ اس کو شاہی دربار کی باریابی حاصل ہوئی یا نہیں کیونکہ تمام تذکرہ اس بارہ میں خاموش ہیں صرف بدایونی نے لکھا ہے کہ اس کی رسائی ہوئی تھی، چنانچہ بادشاہ کے ہمراہ ۹۹۶ھ میں کشمیر گیا تھا اور کسی موقع پر بادشاہ نے ایک گھوڑا انعام میں دیا تھا لیکن عرفی نے بجائے اظہار تشکر کے اُلٹے گھوڑے کی ہجو کی۔

شاہنشہا حقیقت اسپے کہ دادۂ   بشنو ز لطف تو بہ سانم بعز عرض

ہستم برا و سوار و بہ معنی پیادہ ام   گامے بطول می زدم اکنو زنم بعرض

کشمیر کے سفر میں فیضی بھی بادشاہ کے ہم رکاب تھا۔ ممکن ہے کہ پرانے تعلقات کی بنا پر فیضی کی معیت میں عرفی کشمیر کی سیر کو چلا گیا ہو۔

عرفی اور شاہزادہ سلیم

خان خاناں اور اکبر کے علاوہ عرفی نے کسی اور آستانہ کی "ناصیہ سائی" کی تو وہ شاہزادہ سلیم ہے، یہ معلوم نہیں کہ عرفی نے شاہزادہ سے رابطہ کب پیدا کیا۔ نہ تذکروں میں اس کے بارہ میں کچھ لکھا ہے اور نہ قصیدوں سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال شمالی ہندوستان میں آکر اس نے شہزادے سے ارتباط پیدا کیا ہوگا۔ عرفی کی تاریخ زندگی میں اس واقعہ کو جتنی اہمیت حاصل تھی اس سے زیادہ اہم بنا کر پیش کیا گیا ہے، مولانا شبلی نے اس میں بہت کافی حصہ لیا ہے، چنانچہ شعر العجم میں بار بار عرفی کو شہزادہ سلیم کا عاشق قرار دیا گیا ہے۔ مجھے مولانا سے اختلاف ہے اس لئے میں ان کے اقوال کو ہر حیثیت سے جانچنے کی کوشش کروں گا۔

اس سے قبل مولانا کا وہ قول لکھا جا چکا ہے جس میں انھوں نے عرفی کا غائبانہ عشق بیان کیا ہے۔ اگر اس میں کسی قسم کی حقیقت ہوتی تو عرفی کسی دربار یا کسی امیر سے تعلقات کیوں پیدا کرتا۔ سیدھا ہندوستان آتا اور شاہزادہ سے متعلق ہو گیا ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ احمد نگر آیا۔ وہاں قدر دانی نہ ہو سکی تو شمالی ہندوستان آیا اور فیضی سے تعلقات پیدا کئے۔ پھر جب اس سے نہ نبھ سکی تو حکیم ابو الفتح نے اس کو نوازا اور آخر میں خان خاناں نے اس پر احسانات کئے۔ درمیان میں کبھی کبھی اس نے بادشاہ وقت اور شہزادہ دونوں کی مدح سرائی بھی کر دی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں سے تعلقات کی نوعیت محض ضمنی اور ثانوی تھی۔ دوسری جگہ مولانا رقم طراز ہیں :۔

"عرفی ایک طرف نکتہ سنج، نکتہ شناس اور ذوق عرفان سے آشنا تھا، دوسری طرف شباب میں نہایت خوش رو اور حسین اور لوگوں کا "منظور نظر" رہ چکا تھا۔ ہندوستان میں آیا تو شاہزادہ جہانگیر پر عاشق ہوا۔ ان اسباب کی بنا پر وہ عشق و محبت کی ایک ایک ادا سے واقف تھا۔"

لہ شعر العجم ج ۳ صفحہ ۱۱

مولانا کا یہ قول محض طبع زاد اور خود ساختہ ہے۔ کسی تذکرہ میں نہ اس کے حُسن و خوش روئی کا بیان ہے اور نہ اسکے "منظورِ نظر" رہنے کا۔ شعر العجم میں جن جن تذکروں کا ذکر آیا ہے وہ سب میرے پیشِ نظر ہیں۔ ان میں سے کسی میں یہ واقعہ مذکور نہیں، اس غیر ذمہ دارانہ بات کی بظاہر دو وجہیں ہو سکتی ہیں (۱) مولانا کو اس کے شباب کی کوئی تصویر ہاتھ لگ گئی ہو اور اس کو دیکھ کر انھوں نے دو نتیجے نکالے یعنی وہ دوسروں کا "منظورِ نظر" رہ چکا تھا اور پھر خود جہانگیر کا عاشق ہوا۔ (۲) انھوں نے عرفی کے کلام کا مطالعہ کیا تو وہ عشق و محبت کی ایک ایک ادا سے واقف نکلا اس پر مولانا نے مذکورۂ بالا حکم لگا دیا ــ ایک اور مقام پر مذکور ہے[1]:۔

"تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شاہزادہ مذکور کا جاں دادہ ہے، یہ امر اگرچہ بظاہر خلاف قیاس ہے لیکن عرفی کے قصاید میں بلاشبہ یہ جھلک پائی جاتی ہے۔ شاہزادہ موصوف کی شان میں اس کے جو قصیدے ہیں ان کے دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ اور کوئی جوش ہے جس کا رنگ مداحی کے لباس میں جھلک رہا ہے"۔

اگر اوپر کے بیان میں "تمام" کے بجائے "کچھ" ہوتا تو یہ بیان کسی قدر درخور اعتنا ہوتا۔ کیونکہ تمام تذکروں میں عرفی کی فریفتگی کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ معاصر تذکرہ نویس سب کے سب خاموش ہیں، نہ مآثر رحیمی میں یہ واقعہ مذکور ہے، نہ عرفات العاشقین میں، نہ میخانہ میں اس کی طرف اشارہ ہے، نہ بدایونی میں، نہ خلاصۃ الاشعار میں یہ بات درج ہے اور نہ ہفت اقلیم میں، یہ چھ تذکرے عرفی کی تاریخ زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں ــ متاخرین میں والہ داغستانی پہلا تذکرہ نویس ہے جس کا بیان قابلِ توجہ ہے:۔

"او با شاہزادہ سلیم، خصوصیت و محبت مفرط داشتہ چنانچہ بعضے بہ عشق شاہزادہ متہمش کردہ اند"

اس بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خود مؤلف کو اس واقعہ سے انکار ہے جو لوگ اس کو شاہزادہ کا عاشق سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ یہ محض تہمت و الزام بیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاہزادہ سے اس کو بے حد محبت و خصوصیت تھی اور محبت و خصوصیت عشق مذموم ہی کا لازمی نتیجہ نہیں ہوا کرتا۔

بتلا بھی کچھ اسی طرح کا راگ الاپتا ہے لیکن اس کا بیان بہت واضح نہیں ہے:۔

"با شاہزادہ سلیم خصوصیت و محبت مفرط داشتہ"

اول تو یہ "جملہ والہ" کے بیان سے ماخوذ ہے، دوم اس میں عشق و عاشقی کا مطلق ذکر نہیں ہے اور نہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شاہزادہ کا عاشق تھا اور نہ یہ کہ یہ الزام محض ہے۔

مؤلف مراۃ آفتاب نما لکھتا ہے:۔ "حساوش بہ عشق شاہزادہ متہم کردہ" ــ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہزادہ سے عشق محض الزام تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

جو تذکرے میرے پیشِ نظر ہیں، ان میں صرف تین متذکرہ بالا تذکرے ایسے ہیں جن میں شاہزادہ کے ساتھ خصوصیت و محبت کا بیان ہے، یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ ان میں سے کسی کے بیان سے یہ ہرگز مترشح نہیں ہوتا کہ عرفی کو شاہزادہ سے عشق تھا بلکہ ہی نے تو صاف صاف اور ایک نے دبی آواز میں اس بات سے قطعی انکار کیا ہے، پھر اب وہ کون سی تمام کتابیں یا تمام تذکرے ہیں جنکی

[1] شعر العجم ج ۳، صفحہ ۸۹

بنا پر مولانا شبلی جیسے مورخ و محقق نے "عرفی" کو مورد الزام ٹھہرایا۔

اب ذرا ایک قصیدے کے چند اشعار کو جانچ لیجئے جن کو مولانا شبلی صرف جھوٹے عشق اور ہوس ناکی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:[1] "عرفی کو اس خوش قسمتی پر ناز ہو سکتا ہے کہ شہزادہ نے خود اس کو یاد کیا اور دربار میں بلا کر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی عرفی جس شان سے دربار پہونچا ہے اور شاہزادہ نے جس طرح نگاہ پنہاں سے باتیں کی ہیں اس کی تصویر خود عرفی نے نہایت خوبی سے کھینچی ہے:۔

کہ ناگہاں ز درم در رسید مژدہ دہے	چناں کہ از چمن طالعم بہ مغز شمیم
چہ گفت گفت کہ اے مخزنِ جواہر قدس	چہ گفت گفت کہ اے مطلب بہشت نعیم
بیا کہ از گہرت یاد می کند دریا	بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم
بہ رہ فتادم و گشتم چناں شتاب زدہ	کہ دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم
مرا چو دید بروش ادب بدید استاد	بہ لطف خاص بدل کرد التفات عمیم
رموز کورنش و تسلیم را ادا کردم	بداب مردم دانا نہ بذلہ سنج ندیم
نگفت و من بشنودم ہر آنچہ گفتنی داشت	کہ در بیان نگہش کرد بر زباں تقدیم
لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت	فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

دوسری جگہ پھر رقمطراز ہیں:[2]— "چونکہ عرفی جہانگیر کا عاشق تھا ہمہ تن شوق اور بے تابی کے عالم میں گیا، جہانگیر نے نگاہ لطف سے دیکھا اور اشاروں میں باتیں کیں پھر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی"۔

میری رائے ناقص میں مذکورہ بالا اشعار میں کوئی شعر عشق و عاشقی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں رکھتا۔ البتہ یہ بہترین قسم کی شاعری اور ایک نفیس واقعہ کی زندہ تصویر ہے، ان کے مطالعہ سے حالات کا بعینہ سماں نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شاعر نہایت کامیابی سے اپنی تعریف کرنے میں عہدہ برآ ہوا ہے۔ اپنے کو "مخزنِ جواہر قدس" اور "مطلب بہشت نعیم" قاصد کی زبان سے کہلواتا ہے۔ پھر اسی کی زبان سے اپنے کو "گہر" اور رسیلم کو "دریا" قرار دیتا ہے۔ چوتھے شعر میں "تیز رفتاری" کو "اہل کرم کے" "دست سخا" سے مقابلہ کرنا کس قدر عمدہ اور برمحل ہے۔ "التفات عمیم" کا "لطف خاص" میں بدل دینے کی وجہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ نگاہ کا زبان پر پیش دستی کرنا بالکل فطری ہے۔ اس کا بیان جس انداز سے کیا ہے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ پھر ہونٹوں کے بیان سے محظوظ ہونے کی حالت کو کامیابی کے ساتھ نظم کرنا معجز نگاری کی دلیل ہے۔

دوسری چیز جو مولانا شبلی نے عرفی کا عشق مذموم ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے وہ عرفی کا ایک قطعہ ہے۔ یہ قطعہ سعدی کے ایک قطعہ کا جواب ہے جس میں یہ مضمون بندھا تھا کہ اس شاعر کو عاشقی کا نام نہ لینا چاہئے جو قصیدہ میں دو چار شعر عشقیہ کہکر مداحی شروع کر دیتا ہے، عرفی کے قطعہ کا مفہوم خود مولانا کی زبان قلم سے یوں ادا ہوا ہے:۔

[1] شعر العجم ج ۳، صفحہ ۹۹ — [2] شعر العجم ج ۳ صفحہ ۱۰۹

"سعدی گو ممدوح کو معشوق پر ترجیح نہیں دیتے لیکن بہرحال معشوق کے علاوہ ان کا کوئی اور ممدوح بھی ہے،
لیکن میرا تو ممدوح بھی وہی ہے جو معشوق ہے"

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جب یہ قطعہ شاہزادہ سلیم سے متعلق نہیں ہے تو پھر اس میں جو لطیف اشارہ ہے اس کو شاہزادہ مذکور کی معشوق کی طرف کیوں سمجھا جائے۔ دوم یہ کہ شاعر اپنے ممدوح کے لئے معشوق کا لفظ عموماً استعمال کیا کرتے تھے۔ فارسی شاعری میں اس کا عام طور پر رواج ہو چکا تھا۔ مثلاً اسی دور کے ایک دوسرے ممتاز شاعر ظہوری نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸-۱۰۳۷) کے لئے صدہا شعروں میں نہ صرف "معشوق" اور "محبوب" جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں بلکہ اس کی چشم، رخسار، ابرو، کاکل، چال وغیرہ کی تعریف مختلف انداز اور عنوان سے کی ہے۔ باوجود اس کے یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہوس باز عاشق تھا۔

فارسی زبان کے ماہر اور ادیب کا بغیر کسی خارجی روایت کے کسی شاعر کے کلام کو اس کے ذاتی عشق و بوالہوسی کا لازمی نتیجہ سمجھنا حیرت انگیز ہے، عرفی کی بددماغی اور ناقابل برداشت غرور کی بہتوں نے شکایت کی ہے، اور اسی وجہ سے دربار اکبری میں اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود فیضی جو اس کا سب سے بڑا حریف تھا اس کی شریف النفسی کی تعریف اس طرح کرتا ہے:- "واز تہذیب اخلاق چہ گوید کہ در خاکی نہاد شیراز ذاتی می باشد نہ کسبی"

اگر وہ رند و اوباش ہوتا تو اول اس کی رسائی دربار اکبری میں نہ ہوتی، اگر ہوتی بھی تو اس کی فضیحت بری طرح ہو جاتی۔ دوم یہ کہ زبردست حریف جن کی تعداد کم نہ تھی یقیناً اس کی گندگی کو اچھالتے، لیکن معاصرین کی خاموشی جن سے اس کی چشمک بھی تھی بلکہ بعض کی ستائش اس بات کی بین دلیل ہے کہ وہ خصائل رذیلہ سے پاک تھا۔ چنانچہ خود مولانا شبلی نے اقرار کیا ہے کہ برخلاف اور شعراء کے وہ رند و اوباش نہ تھا۔ ایک بار کسی نے اس پر فسق کا الزام لگایا تھا جس کا اس کو بے حد صدمہ ہوا، چنانچہ کہتا ہے:-

اہل دنیا ہمگی تہمت گیر ند و فساد
عیسیٰ ایں را متحمل شدہ مریم برداشت

ایسے بلند اخلاق انسان اور بے بدل شاعر کو بغیر کسی سند کے ایک سنگین الزام کا مورد ٹھہرانا بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔

قیام ہند پر اجمالی نظر

تفصیل بالا سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عرفی کی مختصر زندگی کا زیادہ حصہ ایران ہی میں گزرا عمر کا کچھ حصہ کسب علوم میں اور کچھ شاعروں کے دنگل میں بسر ہوا، وہیں وہ بڑھا، پلا، پروان چڑھا۔ وہیں اس کی شاعری چمکی اور اس کی روشنی دور و نزدیک پہونچی، وہیں اس نے غیرتی، محتشم، وحشی جیسے شعراء سے مقابلہ کیا، لیکن اسکے کلام کا بیشتر حصہ جو اس کی شہرت کی اصل وجہ ہے، ہندوستان کی چار سالہ زندگی کا نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا معلوم ہے اس کے جو ہزار اشعار جو ایران کے قیام میں کہے گئے تھے ضایع ہو گئے، موجودہ دیوان کا تقریباً کل حصہ ہندوستان کے قیام میں معرض وجود میں آیا، قصاید تو تمام یہیں کے ہیں البتہ غزلیات کا کچھ حصہ ممکن ہے کہ پرانا بھی ہو۔ اس کے کلام پر نظر ڈالنے سے مطالعہ کرنے والا حکم لگا دیگا کہ اس شاعر کی زندگی تمام تر ہندوستان میں گزری، چنانچہ براؤن جیسے محقق نے لکھ دیا ہے کہ "اگرچہ وہ شیراز میں پیدا ہوا اور وہیں اسکی پرورش بھی ہوئی لیکن اس کی مختصر زندگی زیادہ تر ہندوستان میں بسر ہوئی" کیونکہ "کم سنی ہی میں وہ ہندوستان چلا آیا تھا۔"

عرفی سنہ ۹۹۴ھ سے سنہ ۹۹۹ھ تک ہندوستان میں رہا، ان چار پانچ سالوں میں اس کو یکسوئی غالباً بہت ہی کم نصیب ہوئی ہوگی۔ ہندوستان کے بیشتر حصوں کا اس نے اس زمانہ میں سفر کیا جبکہ آمد و رفت کی آسانیاں بہت کم تھیں۔ سنہ ۹۹۴ھ میں احمد نگر میں تھا۔ اسی سنہ کے آخر میں یا سنہ ۹۹۵ھ کے شروع میں وہ فتحپور سیکری پہونچا، اسی سال جبکہ فیضی، یوسف زئی پٹھانوں کی مہم پر سرحد کی طرف روانہ ہوا تو وہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں اس نے اٹک میں بھی قیام کیا ہوگا کیونکہ اکبر بادشاہ بھی ان دنوں کشمیر کی مہم کے قبل یہیں آگئے تھے۔ یہیں سے دوسرے سال اکبر، کشمیر کی سیر کو گئے عرفی اور فیضی بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔ دونوں نے کشمیر کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ اسی سال یعنی سنہ ۹۹۷ھ ہی میں اکبر پشاور میں تھے فیضی بھی اس کے ساتھ تھا ممکن ہے عرفی بھی رہا ہو۔ لیکن اسی سال حکیم ابوالفتح فوت ہوا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ عرفی آگرہ واپس آگیا ہو۔ سنہ ۹۹۹ھ میں خان خاناں کے ساتھ وہ سندھ گیا، وہیں سے واپسی میں لاہور پہونچ کر شوال سنہ ۹۹۹ھ میں راہی ملک بقا ہوا۔

ایسی غیر مطمئن زندگی میں اسے کیا کیا پریشانیاں نہ اُٹھانا پڑی ہوں گی۔ باوجود اس کے اس نے ایسے ایسے جواہر پارے چھوڑے ہیں کہ رہتی دنیا تک ان کی روشنی دل کی آنکھوں کو جلا بخشتی رہے گی۔ اگر عرفی کی زندگی کے یہ چار سال نکال دئے جائیں تو اسکی حیثیت معمولی انسان سے کسی حالت میں بھی بلند نہیں رہ جاتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کچھ دنوں وہ اور زندہ رہ جاتا تو دنیا کے عظیم ترین شاعروں کی صف اول میں جگہ پاتا۔

وفات سنہ ۹۹۹ھ

عرفی کی وفات اور سنہ وفات کے بارہ میں مختلف قسم کی روایتیں ہیں۔ تمام تذکروں میں اس کی وفات کا سنہ سنہ ۹۹۹ھ ہجری قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معتبر نہاوندی، ابوالفضل اور بدایونی کے اقوال ہیں۔ مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ تقی اوحدی نے اس کی تاریخ وفات "بادی کلام عرفی شیرازی" سے نکالی ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تقی بھی نہاوندی کے ہم نوا ہیں۔ "ہمیشہ بہار" اور "ریاض الشعراء" میں بھی یہی تاریخ منقول ہے۔ لیکن اس کے مؤلف کا نام نہیں درج ہے۔ تعجب ہے کہ تقی کے تذکرہ میں عرفی کے حالات کے ذیل میں نہ اس کی تاریخ وفات ہی لکھی ہے اور نہ مذکورۂ بالا تاریخی قطعہ ہی مندرج ہے۔ تقی اوحدی کا یہ قطعہ یا عرفی کی وفات کے ۱۶ سال بعد ہندوستان میں لکھا گیا کیونکہ مؤلف کے ورود ہند کی تاریخ سنہ ۱۰۱۵ھ ہے، یا ایران میں مرتب ہوا۔

ابوالفضل نے اکبر نامہ میں عرفی کا انتقال سنہ ۹۹۹ھ کے ذیل میں لکھا ہے۔ بدایونی نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے اور ساتھ ہی دو تاریخیں بھی لکھی ہیں "دشمن خدا" "جوانا مرگ شدے"۔ ان دونوں سے یہی سنہ برآمد ہوتا ہے۔ کلمات الشعراء اور ہمیشہ بہار میں عرفی کے کسی شاگرد کا فقرہ تاریخ (استاد البشر) دیا ہے۔ مولانا آزاد نے آیۂ کریمہ "متکئین فیہا علی الارائک" سے اس کے انتقال کی تاریخ نکالی ہے۔

ان کے علاوہ خان آرزو، ابراہیم خلیل، والہ وغیرہ بھی اسی قول کی تائید کرتے ہیں۔ سبھوں نے یہ لکھا ہے کہ انتقال کے وقت اسکی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ صرف مراۃ آفتاب نما اور نشتر عشق میں اس کی عمر ۳۵ سال کی تجویز ہوئی ہے۔ پروفیسر براؤن اور مولانا شبلی نے

اس کی وفات ۹۹۹ھ میں بیان کی ہے اور عمر ۳۶ سال تجویز کی ہے۔

بہر حال تاریخی قطعوں، ہم عصر شہادتوں، اور دوسرے مشہور تذکرہ نگاروں کے بیان سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ عرفی کی وفات کا سال ۹۹۹ھ ہے، مگر دو معاصر مؤلفوں کے قول نے ذرا اشکال پیدا کر دیا۔ ان میں ایک تقی کاشی مؤلف خلاصۃ الاشعار اور دوسرے عبدالنبی صاحب میخانہ ہیں۔ اول الذکر نے عام رائے کے خلاف اس کا سنہ وفات ۱۰۰۱ھ قرار دیا ہے، البتہ میخانہ کے نسخوں میں اختلاف ہے، ایک نسخہ میں یہی تاریخ یعنی ۱۰۰۱ ہجری درج ہے، مگر دوسرے نسخہ میں ۱۰۲۰ھ لکھ کر بعد کو ۱۰۰۲ھ بنایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ قول دونوں نسخوں میں بغیر اختلاف موجود ہے کہ (عرفی) کی عمر ابھی ۴۰ سال بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ فرشتۂ اجل نے رشتۂ زندگی قطع کر ڈالا، عرفی کی تاریخ پیدائش ۹۶۳ھ تجویز کی گئی ہے اس لحاظ سے ۱۰۰۲ھ میں اس کی عمر ۳۹ سال کی ہوتی ہے۔

عرفی نے لاہور میں انتقال کیا۔ بعض لوگ اس کی وفات کا سبب عارضۂ پیچش قرار دیتے ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید اسے زہر دیا گیا، زہر دینے کا واقعہ ریاض الشعراء، تذکرہ مبتلا اور مرآۃ آفتاب نما میں مذکور ہے، تینوں کے بیان سے صاف طور سے ظاہر ہے کہ شہزادہ سلیم سے بے حد خصوصیت تھی۔ بعض لوگوں کی نظر میں یہ محبت اس درجہ کھٹکی کہ عرفی کو بدنام کر ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عین جوانی میں حاسدوں نے اسے زہر دیدیا۔ اگرچہ اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے کہ عشق کا قصہ سراسر غلط اور خلاف قیاس ہے، لیکن زہر دینے کے بیان کی تردید کے لئے بظاہر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ ممکن ہے واقعۃً ایسا ہی ہوا ہو۔ لیکن معاصر مؤلفین کی خاموشی کی وجہ سے ہم اس کو تسلیم نہیں کر سکتے۔

ہڈیوں کی منتقلی

تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی لاہور ہی میں مدفون ہوا، ہمیشہ بہار میں ہے کہ میر حبیب اللہ کے مقبرے میں اس کو دفن کیا گیا تھا۔ ریاض میں لکھا ہے کہ چند سال کے بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف لے گیا اور وہیں دفن کیں۔ لیکن یہ غلط ہے اس وجہ سے کہ اس کتاب میں رونقی کا وہ قطعۂ تاریخ منقول ہے جو اس نے اس واقعہ کے لئے نظم کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کی لاش دھوکے سے نکالی گئی تو پھر اس پر اہتمام کے ساتھ قطعۂ تاریخ لکھا جانا سراسر بے معنی ہے، دوسرے یہ کہ تمام تذکروں میں یہ بیان ہے کہ ایک قلندر کے توسط سے اس کی ہڈیاں نجف اشرف پہنچیں ان سب میں مآثر[1] کا بیان بہت صاف ہے:۔

"میر صابر اصفہانی نے جو ایک اچھا خاصہ شاعر ہے اور غیاث بیگ طہرانی کی خدمت میں ہے، ایک درویش کو رقم کثیر دی کہ مولانا عرفی کی لاش لاہور سے نجف اشرف پہونچا دے، اس بزرگ کی عرفی کی لاش کھود دی، اس کو مشہد لے گیا اور وہاں دو ماہ بطور امانت رکھا پھر نجف اشرف لے گیا۔ رشید لے کاشی جو اس دور کا ایک مشہور شاعر ہے ۱۰۲۸ھ میں نجف میں موجود تھا۔ وہ ایک شخص سید حسین نقیب نجف کے پاس گیا اور مولانا کی لاش کو دفن کرنے کے لئے زمین کا طالب ہوا، وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا اور ۳۰ سال کے بعد عرفی کی لاش کے ریزے مقام "بجیرہ" میں دفن ہوئے۔ اس کے بعد سید حسین نے جشن قائم کر کے غربا میں خاصی رقم تقسیم کی، انکا ارادہ

[1] ورق ۴۹۰ ب

ایک مقبرہ طیار کرانے کا ہے۔"

اس کے بعد مولانا رونقی کا متذکرہ بالا قطعہ تاریخ ہے، جس میں "بکاوش مژہ از گور تا بنجف آمد" سے اس واقعہ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ بہرحال عرفی کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

بکاوش مژہ از گور تا بنجف بردم | اگر بہ ہند ہلاکم کنی و گر بہ تتار

میخانہ میں ایک دوسرا قول پایا جاتا ہے جس کا درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا:۔

"۱۰۲۳ھ میں ملک الشعرائے خراسان مرزا صیحی نے ایک شخص کو لاہور بھیجا کہ وہ عرفی کی ہڈیاں مشہد مقدس لے آئے۔ لیکن اس شخص کے لاہور پہونچنے کے دس روز قبل ہی میر صابر اصفہانی ہڈیاں نجف اشرف پہونچا چکا تھا۔"

اس واقعہ کی تاریخ میں کسی قدر اختلاف ہے، مآثر کے بیان کے مطابق ۳۰ سال بعد یعنی ۱۰۲۹ھ میں اس کی ہڈیاں نجف اشرف میں مدفون ہوئیں، اس کی تائید مجمع النفائس، کلمات الشعراء، ہمیشہ بہار اور مخزن الغرائب وغیرہ تذکروں سے ہوتی ہے لیکن رونقی کے قطعہ سے، جو بغیر اختلاف سب کتابوں میں مندرج ہے ۱۰۲۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہ قطعہ مآثر میں موجود ہو تو پھر اس واقعہ کو ۱۰۲۹ھ کا کیوں قرار دیا۔ اس میں مزید یہ بھی مذکور ہے کہ ۱۰۲۸ھ میں رشید او ہاں موجود تھا۔ حالانکہ خود مؤلف مآثر کے بیان کے مطابق اس تذکرہ کے اختتام کا سال ۱۰۲۵ھ ہے، ۱۵ رجمادی الثانی ۱۰۲۶ھ میں اس کا مقابلہ کرکے کچھ حاشیے اور خاتمہ کا اضافہ کے ساتھ یہ کتاب خواجہ سلطان محمد اصفہانی کو پیش کی گئی۔ اس کے بعد ۲۳ رجب ۱۰۳۱ھ کو خواجہ سے لے کر اپنے مخدوم قاضی عبدالعزیز کے پاس بھیجی گئی لیکن مقابلہ نہ ہو سکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں جمادی الثانی ۱۰۲۶ھ تک کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ پھر ۱۰۲۹ھ کا واقعہ کیونکر مندرج ہوا یا اگر یہ واقعہ ۱۰۲۷ھ ہی کا ہو پھر بھی اس میں درج نہیں ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً اس کتاب میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ نشتر عشق میں رونقی کا قطعہ درج ہے لیکن اس میں لکھا ہے کہ ۲۸ سال بعد عرفی کی ہڈیاں دوبارہ دفن ہوئیں۔ مگر میخانہ میں یہ قطعہ مندرج نہیں ۔۔ اوپر کی بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس واقعہ کو ۱۰۲۳ھ کا سمجھنا چاہئے کیونکہ رونقی کے قطعہ سے یہی تاریخ برآمد ہوتی ہے ۔۔ عرفات العاشقین میں بھی اس کی وفات لاہور میں بتائی گئی ہے اور مزید یہ بھی لکھا ہے کہ وہیں اسکا مرقد بھی ہے۔ اس میں عرفی کی ہڈیوں کے نجف لے جانے کے واقعہ کو بالکل نہیں لکھا گیا۔ مؤلف ایسا کرنے میں حق بجانب ہے کیونکہ یہ تذکرہ ۱۰۲۲ھ اور ۱۰۲۴ھ کے درمیان لکھا گیا (حالانکہ اختتام کی تاریخ یہ ہے ۔ بدو سال ایں نوی تمام شدہ ۔ جس سے ۱۰۲۰ھ برآمد ہوتا ہے) اور یہ واقعہ اس کے تین سال بعد وقوع پذیر ہوا۔

عرفی نے انتقال کے وقت حسب ذیل رباعی لکھی:۔

عرفی دم نزع است و ہماں مستی تو | آیا بچہ مایہ رخت بربستی تو
فرداست کہ دوست نقد فردوس بکف | جویائے متاع ست و تہی دستی تو

ترتیب دیوان

تمام تذکرے معہ مآثر رحیمی کے متفق ہیں کہ عرفی نے خود ۹۹۶ھ میں ایک دیوان مرتب کیا جس میں ۲۶ قصیدے، ۲۷۰ غزلیں اور ۷۰۰ شعر کے قطعات اور رباعیاں تھیں، اس دیوان کی خود ہی تاریخ کہی :-

این طرفہ نکات سحری و اعجازی | چوں گشت مکمل بہ رقم پردازی
مجموعہ طراز قدس تاریخش یافت | اول دیوان عرفی شیرازی

مگر میخانہ میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی دیوان ترتیب نہیں دیا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے ایک دوست نے مروجہ دیوان مکمل کیا۔ جس میں ساڑھے بارہ ہزار اشعار تھے۔ بہر حال یہ غلط ہے۔

عرفی نے جو دیوان مرتب کیا تھا وہ اس کی زندگی کا آخری کلام تھا۔ اس سے پہلے ۶ ہزار شعر کہے تھے۔ وہ بد قسمتی سے ضایع ہوگئے۔ اس کے ماتم میں ایک پر درد غزل لکھی جو تمام تذکروں میں منقول بھی ہے :-

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام | عمر در باختہ را بار دگر باختہ ام
رصد شرع ہنر چوں نہ شود محو کہ من | شش ہزار آیت احکام ہنر باختہ ام
گفتہ گر شد ز کفم، شکر کہ ناگفتہ بجاست | از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

آخری شعر میں کہتا ہے کہ اگر کہا ہوا جاتا رہا تو پروا نہیں، شکر ہے کہ بن کہا ہوا تو موجود ہے۔

عرفی جیسے خوش نصیب دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد اس کی ہڈیوں کے ریزے نجف اشرف پہونچے ہیں اور اسی طرح انتقال کے ایک عرصہ بعد اس کا دیوان بڑے اہتمام کے ساتھ مدون ہوتا ہے، مآثر رحیمی کے بیان کے مطابق مرتے وقت اپنا دیوان جو اس کے ہاتھ کا مسودہ تھا۔ خان خاناں کے کتاب خانہ میں تدوین کی غرض سے بھیجدیا تھا۔ چنانچہ اسکی وفات کے ۲۵ سال بعد ۱۰۲۴ھ میں خان موصوف نے محمد قاسم سراجا کو اس کام پر مامور کیا، اس نے سال بھر کی محنت شاقہ کے بعد دیوان کی ترتیب پوری کی، اس میں کل ۱۴ ہزار اشعار تھے۔ موصوف نے محمد قاسم کو انعام سے مالامال کر دیا۔ سراجا نے ایک قطعہ میں ان واقعات کا ذکر کیا ہے جو مآثر میں منقول ہے اس قطعہ کے ذیل کے شعر میں تاریخ بھی موجود ہے۔

از خرد خواستم چو تاریخش | گفت ترتیب دادہ دیوانے

"ترتیب دادہ" سے ۱۰۲۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ صاحب مآثر نے اس پر دیباچہ لکھا تھا جس میں عرفی کی زندگی کے دلچسپ واقعات قلم بند کئے تھے افسوس کہ اب نایاب ہے۔

نشتر عشق میں ناظم تبریزی کے حوالے سے یہ واقعہ کسی قدر مختلف طور سے بیان ہوا ہے۔ ناظم نے لکھا ہے کہ مرنے سے قبل اس نے اپنا دیوان خان خاناں کو دیا کہ اس کی تدوین ہو جائے۔ سنہ ۱۰۳۰ھ میں اس نے ایک محرر کو اس کام پر مقرر کیا، وہ مسودات لے کر رفوچکر ہو گیا۔ ناظم نے حسن اتفاق سے اسے کہیں دیکھا اور مسودات واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں ۱۵ ہزار اشعار تھے۔

بہرحال جو دیوانِ خان خاناں کے زیرِ اہتمام مدون ہوا اس میں بقول ناظم ۱۵ ہزار اشعار، اور بقول صاحب میخانہ ساڑھے بار[ہ] ہزار اور بقول دیگر تذکرہ نویسان ۱۴ ہزار اشعار تھے۔ اس میں آخری قول صحت سے قرین ہے۔ کیونکہ اولاً تمام تذکروں سے اسک[ی] تصدیق ہوتی ہے، ثانیاً مآثرِ رحیمی میں، ابھی یہی موجود ہے ثالثاً خود سراجا کا تاریخی قطعہ اس امر کا مؤید ہے، انھیں وجوہ سے دیوان کی ترتیب کی تاریخ بجائے ۱۰۳۰ھ کے ۱۰۲۶ھ سمجھنا چاہئے۔ ۱۰۲۶ھ مآثر کی تاریخ تصنیف ہے جس میں یہ قول پورے اعتماد کے [ساتھ] مذکور ہے۔

مولانا شبلی نے بہارستانِ سخن کے حوالے سے لکھا ہے کہ عرفی کا ضائع شدہ کلام بھی حاصل ہوا جو دیوان میں داخل کر دیا گیا مولانا کے نزدیک یہ بیان قرینِ قیاس ہے۔

کیرکٹر عرفی ایک بلند ہمت، غیور اور خود دار انسان تھا۔ اس کے کلام میں یہی عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً لکھتا ہے:

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را — ہمت نہ خورد نیشترِ لا و نعم را

از رغبت دنیا الم آشوب نہ گردم — زیں باد پریشاں نہ کنم زلف الم را

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ — آثار پدید است صنادید عجم را

اما نہ بود وصف اضافی ہنرِ ذات — ایں فتویِ ہمت بود ارباب ہمم را

قصاید میں شعرا کی مجال نہ تھی کہ اپنا ذکر کر سکیں، عرفی چونکہ بالطبع نہایت ہی غیور تھا اس لئے مدحیہ کلام میں اپنے فضایل او[ر] اوصاف جی کھول کر بیان کرتا اور مزے لے کر کہتا ہے، شاید ہی کوئی قصیدہ ایسا ہو جس میں کافی شعر فخریہ نہ ہوں، چنانچہ کہتا ہے:

خدایگانہ بگویم بہ مدح خویش دو بیت — کزاں نیارد پرہیز کرد طبعِ سلیم

مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ اہل ادب نے انواعِ شاعری میں فخریہ کو ایک خاص صنف قرار دیا ہے، فارسی میں اس خاص صنف میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں۔ عجیب عجیب نئے اسلوب سے فخریہ لکھتا ہے اور اس جوش سے لکھتا ہے کہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے:

نیم تحسین مکن ار گوید صد بیت بلند — کہ دماغش شدہ از حسن طبیعت مختل

گوہر آمائے رموزست نہ دریا و نہ کاں — حکمت آموز عقول ست نہ علم و نہ عمل

انچہ ذرات معانی ست کہ بروے جوشند — ہمہ خورشید شود گر بشناسند محل

اگر او نام ز ننگ شد از ذلتِ شعر — شعر از عزت او نیک بر آید ز ذلل

مختصر یہ کہ عرفی کا کلام اس طرح کے مضامین سے بھرا پڑا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ عرفی کی آزادیِ طبع اور خودداری منجر بہ "کبر" ہو گئی تھی۔ چنانچہ تمام مولفوں نے اس کو بد دماغ، مغرور اور خودستا لکھا ہے، اساتذہ سلف کو اپنے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے صاف ظاہر ہے:

انصاف بدہ بو الفرج و انوری امروز — بہر چہ غنیمت نہ شمارند عدم را

تفرّجے کہ من از بہر روح ساز دہم | نہ انوری نہ فلانے دہد نہ بہمانی
دم عیسی تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد | بہ امداد صبا اینک فرستادم بہ شروانش

پروفیسر براؤن کا قول ہے

"ان موانع اور خود اپنی مسلّمہ قابلیت کے باوجود عرفی کے ناقابل برداشت غرور اور بد دماغی نے اسے ہر دل عزیز نہ ہونے دیا اور اس کے کئی دشمن پیدا ہوگئے جو شاعر خود اپنے متعلق یہ دعوی کرے:

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز از چہ بود | گرنمی دانست باشد مولد و ماوائے من

وہ گویا خود اپنے ہاتھ تنقید اور تنقیص کے دروازے کھولتا ہے۔۔ اپنے ابنائے وطن میں مقبول نہ ہونے کی بڑی وجہ اسکی یہی بد دماغی ہے، کیونکہ ظاہر ہے ایرانی اپنی قوم اور اپنے مشاہیر ملک کی اس طرح توہین و تذلیل کیوں گوارا کرنے لگے"۔

لیکن ان اشعار میں جن کی بنا پر پروفیسر براؤن نے عرفی کو بد دماغ سمجھا ہے، اور جن کی وجہ سے پوری ایرانی قوم اور مشاہیر ملک کی توہین و تذلیل ہوتی، غرور اور نخوت کے بجائے شاعرانہ تعلّی کو زیادہ دخل ہے، اور اگر جستجو کی جائے تو کم و بیش ہر شاعر کے یہاں اس طرح کے دو چار شعر ضرور مل جائیں گے

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس میں خود رائی و خود ستائی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ بدایونی لکھتا ہے:۔

"اما از بس عُجب و نخوت پیدا کرد از دلہا افتاد"۔ یہ قول بھی عصبیت سے پاک نہیں، حالانکہ مولانا شبلی بدایونی کو عرفی کا بڑا مداح سمجھتے ہیں، اگرچہ واقعہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جو اس کی وفات کی تاریخ "دشمنِ خدا" سے نکالے وہ اس کا (عرفی) دوست کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

ابوالفضل نے اس کے فخر و ادعا کو برا کہا ہے لیکن یہ بھی عرفی کا بڑا حریف تھا اس لئے اس کے قول میں صداقت کا عنصر کم سمجھنا چاہئے۔

"درے از سخن سرائے بر و کشودہ بودند در خود نگریست و بر باستانیاں زبان طعن کشود، غنچۂ استعداد نشگفتہ پژمرد"۔

حیرت ہے کہ جب عرفی کے "غنچۂ استعداد" کو "نشگفتہ" کہا گیا ہے تو پھر کونسا شاعر ہو سکتا ہے جس کی استعداد کو "شگفتہ" کہا جائے گا۔ مولف میخانہ نے اس سلسلہ میں بہت دلچسپ معلومات بہم پہونچائی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ عرفی میں بے ادبی کے سوا کوئی دوسرا عیب نہ تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ نظامی کی تحقیر کی وجہ سے اس کو برے نتائج دیکھنے پڑے یعنی

(۱) ابھی پورے چالیس سال کا بھی نہ ہوا کہ فرشتۂ اجل نے اس کی روح قبض کر لی۔

(۲) مرتے وقت کلمۂ شہادت کے بجائے بے معنی فقرات زبان پر جاری تھے۔ عرفی کے مرض الموت کے وقت مرزا نظام قزوینی جو کشمیر کے بخشی اور دیوان تھے اکبر بادشاہ کے حکم سے اس کے پاس گئے۔ مزاج دریافت کرنے پر اس کی حالت بے حد خراب پائی۔ اس کے منھ سے سوائے مزخرفات کے کچھ نہ نکل سکا۔

(۳) جب مؤلف مذکور عرفی کے حالات لکھ رہا تھا، ایک بزرگ اسکے کمرے میں داخل ہوئے اور مولوی معنوی کے حسب ذیل اشعار پڑھے:-

از ادب پر نور گشتست ایں فلک		وز ادب معصوم و پاک آمد ملک
بد ز گستاخی کسوفِ آفتاب		شد عزازیلے ز جرأت ردِّ باب
از خدا جوئیم توفیقِ ادب		بے ادب محروم ماند از لطفِ رب

مولف نے دل میں سوچا کہ یہ اشارہ ہے من جانب اللہ "بنا بر سروش غیبی"

(۴) صاحب میخانہ نے شبِ جمعہ میں خواب دیکھا کہ عرفی درویش مذکور کے ساتھ ایک پرفضا باغ میں ٹہل رہا ہے۔ مؤلف کو دیکھ کر مخاطب ہوا کہ حضرت شیخ نظامی کے ساتھ مجھ سے جو بے ادبی ہوگئی اس کی وجہ سے میں اس قدر پریشان ہوں کہ قیامت تک میرا سر نہیں اُٹھ سکتا۔ لیکن خدا کا ہزار شکر ہے کہ حضرت امیر المومنین کی مداحی کے صلہ میں میرے گناہ معاف ہو گئے اور حضرت شیخ نے بھی میری خطا درگزر کی، حضرت درویش نے آپ کے سامنے جو اشعار پڑھے تھے وہ ان کے پڑھنے میں حق بجانب تھے۔ وہ بزرگ اب میرے حال پر مہربان ہیں اور کل آپ کے پاس جائیں گے"

دوسرے دن دو نمازوں کے درمیان وہی فقیر مولف کے پاس آیا اور خواب کا واقعہ جیسا مولف نے دیکھا تھا ہو بہو بیان کیا۔

اس تمام تفصیل میں مولف کے اعتقاد کو بہت زیادہ دخل ہے، اجمالاً اس کی یہ ہے کہ عرفی نے بزرگان سلف کے ساتھ ادب کا برتاؤ نہیں کیا۔

عرفی نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھا، اس کی حاضر جوابی کے سلسلہ میں شعر العجم میں دو واقعہ مذکور ہیں، ایک فیضی کے ساتھ واقع ہوا، دوسرا ابو الفضل کے ساتھ، اوپر اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے کہ اول الذکر ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن آخر الذکر سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

عرفی نے کسی شخص کی ہجو سے اپنی زبان آلودہ نہ کی، البتہ اس کو یہ چیز نہایت ناگوار تھی کہ کوئی ایسی چیز تحفۃً بھیجے جو قابل پیش کش نہ ہو۔ ایک بار ظہوری نے معمولی شال عرفی کے پاس روانہ کی۔ اس نے جواب میں ایک طنز آمیز خط مع تین رباعیوں کے جو شال کی ہجو کے بارے میں تھی، لکھا، اکبر بادشاہ نے اس کو ایک گھوڑا انعام میں دیا چنانچہ ایک رباعی اس گھوڑے کی ہجو میں سپرد قلم کر کے روانہ کر دی۔

عرفی کی زندگی فسق و فجور سے پاک تھی۔ ایک بار کسی نے اس پر فسق کا الزام دیا جس کا اسے بے حد صدمہ ہوا اور ایک قطعہ میں افسوس کا اظہار کیا اور خاتمہ میں اپنے دل کو تسلی دی۔

غرض عرفی جیسے بلند پایہ شاعر اور خوددار انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

(ڈاکٹر نذیر احمد ام - اے - پی - ایچ - ڈی)

عہد عباسی کا ایک تاریخی واقعہ

(جسے تاریخ نے نظر انداز کر دیا)

عباسی خلیفہ "المتوکل علی اللہ" مسند پر جلوہ افروز ہے سامنے ایک نہایت حسین کنیز (سناؔ) سر جھکائے مودب کھڑی ہے، اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں شکر و مسرت کے آنسو جھلک رہے ہیں۔

خلیفہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا:- "کل میں تیرا گانا سنکر بہت خوش ہوا اور خصوصیت سے ساتھ تیرا وہ نغمہ تو مجھے بہت پسند آیا جو تو نے روم میں سیکھا اور وہیں کی زبان میں سنایا۔ یہ زیور لے۔ میں تجھے اظہار خوشنودی میں دیتا ہوں"۔

سناؔ نے یہ سنکر نہ اپنا سر اُٹھایا نہ کوئی بات کی بلکہ اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔

خلیفہ بولا:- "اے سناؔ، اگر تو کچھ اور چاہتی ہے تو بتا وہ کیا ہے"۔

سناؔ نے نہایت نرم و شیریں آواز میں جواب دیا کہ "امیر المومنین کے لطف و کرم نے اس کنیز کو اتنا کچھ دے رکھا ہے کہ اب اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، لیکن اے میرے آقا، میرے دل میں ایک بات ہے جو میں اس وقت کہنا چاہتی ہوں"۔

خلیفہ نے کہا:- "ضرور کہو اور اگر وہ کوئی راز ہے تو بھی مجھ سے نہ چھپاؤ"۔

سناؔ بولی کہ:- "اگر امیر المومنین کی زندگی خطرہ میں نہ ہوتی، تو شاید میں اسے ظاہر نہ کرتی، لیکن ایسی صورت میں، اس کو چھپانے کی قدرت مجھ میں نہیں ہے"۔

خلیفہ نے حیرت سے کہا کہ:- "اے سناؔ، جلدی کہہ وہ کیا بات ہے، کیا خطرہ ہے جو میری جان سے تعلق رکھتا ہے"۔

سناؔ نے کہا کہ "اے میرے آقا، آپ اُس نصرانی طبیب سے ہوشیار رہیں، جس پر آپ کو اس قدر اعتماد ہے اور جس پر امیر المومنین انعامات کی بارش فرماتے رہتے ہیں، وہ آپ کی ہلاکت کی فکر میں ہے کیونکہ آپ اسکے ہم مذہب لوگوں پر سختی کرتے رہتے ہیں"۔

خلیفہ نے حیرت سے پوچھا:- "کیا تو حُنین العبادی کے متعلق ایسا کہتی ہے"۔

اس نے جواب دیا:- "ہاں، اے میرے آقا، وہی"۔

خلیفہ نے کہا:- "تعجب ہے میں نے تو ملک کے تمام علماء و اطباء میں اُسے سب سے اونچی جگہ دے رکھی ہے اور میں اپنی نصاریٰ رعایا پر سختی بھی نہیں کرتا، البتہ جو کسی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں انھیں ضرور سزا دی جاتی ہے"۔

سنا ، بولی کہ " اے میرے آقا یہ درست ہے ، لیکن حُنین تو ایسا ہی سمجھتا ہے کہ آپ نصاریٰ پر ظلم کرتے ہیں اور اس لئے وہ آپ کی ہلاکت کی فکر میں ہے ۔ بہرحال اس کنیز کی التجا یہی ہے کہ امیرالمومنین ہوشیار رہیں ، ممکن ہے حُنین دوا یا غذا میں کسی وقت زہر ملا کر کھلا دے "۔

یہ سنکر امیرالمومنین کے دل میں بھی اندیشہ پیدا ہوگیا اور سوچنے لگا کہ حقیقت کا علم کیونکر ہو سکتا ہے اور اس راز کے بے نقاب ہونے کی کیا صورت ہے ۔

" سنا " نہایت حسین کنیز تھی اور اس قدر خوش آواز کہ جو شخص اس کا گانا سنتا مسحور ہو جاتا ۔ روم کے بردہ فروش اسے پکڑ کر دارالخلافہ میں لے آئے تھے اور یہیں وہ " کنیز روم " کے نام سے قصر امارت میں داخل ہوئی تھی ۔ خلیفہ اسکی بڑی قدر کرتا تھا اور جس وقت وہ رومی گانے سناتی تھی تو مست ہو جاتا تھا ۔

طبیب کا نام جس کی شکایت کی گئی تھی ابوزید حنین بن اسحاق العبادی تھا اور حیرہ کی نصاریٰ جماعت سے تعلق رکھتا تھا ۔ اس کا باپ دوا سازی کی دوکان رکھتا تھا اور اسنے اپنے لڑکے حُنین کو یوحنا بن موسویہ کی خدمت میں تحصیل علم طب کے لئے بھیجدیا تھا ۔ لیکن کچھ دن بعد یہ یوحنا سے خفا ہو کر اپنے وطن گیا اور وہاں سے بلاد روم کا سفر کیا ۔ یہاں اس نے یونانی زبان حاصل کر کے مختلف علوم میں مہارت پیدا کی اور یونانی کتابوں کا ترجمہ سریانی اور عربی زبان میں کیا ۔

مامون الرشید کا آخری زمانہ تھا جب وہ بغداد آیا اور دفتر ترجمہ سے متعلق ہوگیا ، اس نے فن طب کی بڑی خدمت انجام دی اور طبیب حاذق کی حیثیت سے بہت مشہور ہوگیا ۔ جب خلیفہ المتوکل علی اللہ کا زمانہ آیا تو اس نے بہت عروج حاصل کیا اور خلیفہ نے علاوہ قیمتی عطایا کے زمین کا ایک بڑا رقبہ بھی جاگیر میں دیدیا ۔

حُنین :۔ " امیرالمومنین نے مجھے یاد فرمایا تھا اس لئے میں حاضر ہوا ہوں اور ارشاد گرامی کے سننے کا منتظر ہوں "

خلیفہ :۔ " ہاں ، اے حُنین میں نے تجھے ایک بڑی اہم خدمت انجام دینے کے لئے طلب کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی شخص اس خدمت کو انجام نہیں دے سکتا "

حُنین :۔ " اے امیرالمومنین ، یہ خاکسار ہر خدمت کے لئے حاضر ہے ، ارشاد ہو "۔

خلیفہ :۔ " اے حُنین تم جانتے ہو کہ میرے دشمن بہت ہیں اور بغاوت کے لئے وقت کے منتظر ہیں ۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ قبل اس سے کہ وہ مجھ پر قابو پائیں ، میں ان کا فیصلہ کر دوں "

حُنین :۔ " امیرالمومنین کا یہ خیال بالکل درست ہے اور اس سے زیادہ مسرت میرے لئے کیا ہو سکتی ہے کہ میں امیرالمومنین کی تدابیر کو کامیاب بنانے میں مدد کروں ۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ دشمن کون ہیں اور ان کا شر دور کرنے کی کیا تدبیر

امیر المومنین نے سوچی ہے"۔

خلیفہ :- "اب یہ نہ پوچھو کہ دشمن کون کون ہیں، تم تو ان کا شر دور کرنے میں میری مدد کرو اور وہ یہ ہو سکتی ہے کہ تم مجھے نہایت مہلک زہر طیار کر کے دو"۔

حُنین :- "اس میں شک نہیں میں نے حصول طب میں کافی وقت صرف کیا ہے اور علوم کیمیاوی کی تحقیق میں بھی بڑا سر کھپایا ہے، لیکن اے امیر المومنین، خطا معاف، میں نے زہر طیار کرنا نہیں سیکھا"۔

خلیفہ :- "اے حُنین، میں تجھ کو پانچ ہزار دینار دیتا ہوں، جس طرح ممکن ہو اس کام کو انجام دو"۔

حُنین :- "اے امیر المومنین، باور فرمایئے کہ مجھے صرف انھیں دواؤں کا علم ہے جو موت سے بچانے والی ہیں اور موت لانے والی دواؤں کی طرف سے میں بالکل جاہل ہوں"۔

خلیفہ :- "کیا تو انکار کرتا ہے"

حُنین :- "ہاں، انکار کرتا ہوں، اس لئے کہ یہ میری قدرت سے باہر ہے"۔

اس گفتگو کے ختم ہونے کے بعد ہی ایک گھنٹہ کے اندر حُنین قید خانہ میں تھا جہاں اسے طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائی جا رہی تھیں جب صبح ہوئی تو خلیفہ نے اسے پھر طلب کیا اور پوچھا:- "کیا تو ابتک اپنی ضد پر قایم ہے"۔ اس نے جواب دیا کہ "اے امیر المومنین یہ ضد و نافرمانی نہیں ہے، بلکہ استقامت ہے اس عہد پر کہ میں صرف وہی دوائیں بناؤں گا جو موت سے بچانے والی ہیں اور ہلاک کرنے والی چیزوں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا"۔

خلیفہ نے یہ سنکر کہا کہ "بہتر ہے، اب تم اپنی موت کے لئے طیار ہو جاؤ کیونکہ میں تمہارے قتل کئے جانے کا حکم دے رہا ہوں"

حُنین نے کہا کہ "امیر المومنین کو اختیار حاصل ہے، میں مر سکتا ہوں لیکن کسی کو مار نہیں سکتا"۔

یہ سُن کر خلیفہ مسند سے اُٹھ کھڑا ہوا اور حُنین کو اپنے گلے لگاتے ہوئے بولا کہ "اے حُنین، میں تو صرف تیری شرافت اور علوئے نظر کا امتحان لے رہا تھا اور شکر ہے کہ تو اس میں کامیاب ثابت ہوا" اور یہ کہکر خلیفہ نے اس کو ہدایا و عطایا کی بارش سے اور زیادہ گرانبار کر دیا۔

خلیفہ حسب معمول دربار میں جلوہ افروز ہے، سناء اور حُنین دونوں سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور وہ ان دونوں کی صورت دیکھ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد خلیفہ نے سناء سے مخاطب ہو کر کہا:- "اے سناء، تو اس شخص کو جانتی ہے" لیکن اس کا کنیز نے کوئی جواب نہ دیا، اس کے بعد خلیفہ نے حُنین سے کہا "اے حُنین، یہ کنیز کہتی ہے کہ تم مجھے زہر دیکر ہلاک کرنے کی فکر میں ہو، کیا یہ صحیح ہے"۔

حُنین نے کنیز سے مخاطب ہو کہا۔ "اے انستاسیا، کیا یہ صحیح ہے"۔

خلیفہ کنیز کا یہ نیا نام سنکر حیران رہگیا اور حُنین سے پوچھا کہ کیا تو اس سے واقف ہے اور تو نے اس کا یہ نام کیونکر جانا۔"

لیکن حنین کے جواب دینے سے پہلے ہی سنآر، خلیفہ کے قدموں پر گر پڑی اور رو رو کر کہنے لگی کہ "اے امیرالمومنین، میں قصوروار ہوں اور میں نے اس پر تہمت لگائی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں بہت چھوٹی تھی جب بحر روم کے ایک ساحلی مقام پر اس سے متعارف ہوئی۔ یہ اُس وقت وہاں کے علمائے طب سے جن میں میرا باپ بھی شامل تھا طب پڑھ رہا تھا۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی لیکن اس نے میری محبت کو رد کر دیا اور کہا کہ "میں اپنے وطن ہی کی عربی لڑکی سے شادی کروں گا"۔ یہ سن کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ اس کے بعد میں اپنے باپ کے گھر سے بھاگ گئی اور حیرہ کی طرف جانے والے ایک قافلۂ تجار کے ساتھ مل گئی۔ تاکہ حیرہ پہونچکر پھر اس سے ملوں، لیکن حیرہ پہونچکر معلوم ہوا کہ وہ بغداد میں ہے اس لئے میں بغداد کی طرف چل پڑی، لیکن راستہ میں کُردوں کے ایک گروہ نے مجھے گرفتار کر لیا اور میں کنیز کی حیثیت سے امیرالمومنین کی خدمت میں پہونچ گئی۔ یہاں پہونچکر جب مجھے معلوم ہوا کہ جس کے پیچھے میں تباہ ہوئی تھی وہ یہیں ہے اور صاحب اہل و عیال بھی ہے تو آتش انتقام میرے دل میں بھڑک اُٹھی اور اس لئے میں نے اس پر تہمت لگائی تھی"۔

یہ کہکر وہ حُنین کی طرف مخاطب ہوئی اور بولی کہ "اے حُنین، یقین کر کہ جس طرح تجھ سے جدا ہو کر میری محبت مر چکی تھی اب تجھے دیکھ کر میری نفرت بھی ختم ہو گئی ہے اور میں اپنے آقائے ولی نعمت کے سامنے اپنی خطا کا اعتراف کرتی ہوں"۔

خلیفہ نے طبیب سے پوچھا "اے حُنین کیا تم اس کی غلطی کو معاف کر دوگے"۔

حُنین نے کہا "اگر امیرالمومنین معاف فرما دیں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔

خلیفہ نے سناو سے کہا کہ "میں اور حُنین دونوں تیری خطا سے درگزرتے ہیں، لیکن آئندہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا"۔

سنآر، جو اس وقت فرط تاثر سے زار زار رو رہی تھی حُنین سے مخاطب ہو کر بولی کہ "اے حُنین اب میری صرف ایک التجا ہے اور وہ یہ کہ تم امیرالمومنین سے مجھے مانگ لو تاکہ میں باقی عمر تمھاری خدمت میں بسر کر دوں اور تمھارے بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں"۔

خلیفہ نے یہ سنکر کہا کہ "اے سنآر، میں تجھے آزاد کرتا ہوں اور اگر تو چاہے تو حُنین کے ساتھ جا سکتی ہے"۔

سنآر، حنین کے ساتھ چلی گئی اور حُنین کی زندگی بھر ۲۶۴ھ تک برابر اس کی خدمت کرتی رہی۔

ایک ذاتی کتب خانہ فروخت ہو رہا ہے

جس میں بعض نہایت نادر کتابیں ہیں۔ ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کیجئے:۔

ام۔ عبدالحمید نعمانی۔ پوسٹ بکس ۴۹ ۔۔۔ راولپنڈی

جذبات عالیہ اور اُردو شاعری

۱۔ انسان، فطرت، زندگی، ماحول و کائنات ۔ یہی وہ پانچ موضوع فکر و ادب ہیں جن کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں، اور مفکرین زیادہ تر انھیں پر غور کرتے ہیں، لیکن ان سب میں اہم ترین موضوع خود انسان ہے۔

۲۔ انسان نہ عقل ہی عقل ہے اور نہ محض جذبات کا پتلا، وہ عقل کی مدد سے چیزوں کی ماہیت اور اشیاء عالم کی حقیقت پر غور کرتا ہے اور وجدان کی راہ سے اپنے جذبات کو اُبھارتا اور پھر ان سے خوشی یا غم محسوس کرنے لگتا ہے، چنانچہ قدیم کتابوں میں جا بجا یہ بات نظر آتی ہے کہ انسان نے کائنات کی اشیاء پر غور کرتے کرتے جذبات کی راہ سے، خیال کی دنیا بسائی اور اُس میں ایسی لذت محسوس کی کہ ان تحریروں کو آسمانی حیثیت دیدی ۔ رگوید مقدس کے گیتوں، زبور کے نغموں میں یہی بات آپ کو ملے گی۔

۳۔ انسانی جذبات کو بہترین طریقے پر پیش کرنے کا کام فنون لطیفہ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے ۔ اگرچہ افلاطون نے چیزوں کی افادیت کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہوئے فنونِ لطیفہ کو غیر ضروری ٹھہرایا، یہاں تک، کہ اس نے شاعری اور شاعر کو اپنے مجوزہ دستور "ریاست" سے خارج کر دیا، لیکن انسان نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ احساسات کی نزاکتوں اور جذبات و تاثرات کو کامل طور پر محفوظ کرنے کا طریقہ فنون لطیفہ ہی ہیں اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ شاعری ۔ افلاطون نے یہ کہکر کہ "شاعری نقل کی نقل ہے" اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے شاگرد ارسطو نے اپنی معرکہ آرا تصنیف بوطیقا میں نظریۂ شعر کی کافی تردید کر دی ہے۔

شاعری پر غور کرتے وقت زمانۂ گزشتہ کے نقاد زیادہ تر بحث کی ابتدا افلاطون کے نظریۂ نقل (Theory of Imitation) سے کرتے رہے ہیں اور قسینگ تک یہی رنگ فکر غالب رہا، لیکن رفتہ رفتہ تحقیق و تجسس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شاعری یعنی فنونِ لطیفہ کا اظہار فطرت انسانی کے بنیادی اصولوں کے تحت کئی وجوہ سے ضروری اور ناگزیر تھا اور وہ اس لئے کہ شاعری اور فنونِ لطیفہ کا سرچشمہ، عقل محض نہیں، وجدان ہے، جس کا طریق کار عقل سے جداگانہ ہے۔

انسانی ذہن میں دو مختلف صلاحتیں ہیں: عقل اور وجدان ۔ عقل کا کام حقائق و معلومات کو بغیر آمیزش جذبات کے فراہم کرنا اور نتائج حاصل کرنا ہے ۔ برخلاف اس کے وجدان کی راہ، عقل سے ایک حد تک مختلف ہے ۔ وہ چیزوں کی ماہیت کے مطالعہ میں ذہن کی ان قوتوں سے بھی مدد لیتا ہے جن سے سائنس وغیرہ میں بالکل مدد نہیں لیجاتی ———— اسی لئے شاعری جس لطافت کا مطالبہ کرتی ہے، وہ عقل محض کی خشکی میں نشوونما نہیں پا سکتی۔

ہر بلند شاعری میں شفائی قوت (Healing Power) اور سکون بخش صفات کی موجودگی ضروری ہے مثلاً نرمی و لطافت، نزاکت و معصومی، گم شدگی، وغیرہ وغیرہ، اس میں حقایق کا سا تلاطم اور افکار کا انتشار نہ ہونا چاہئے ورنہ وہ اس خاموش تبسم کو کھو دیگی جو طلوع سحر یا غروب آفتاب کی طرح اس میں ہونا چاہئے، یہ صفتیں اس وقت تک صحیح طور پر پرورش پا نہیں سکتیں جب تک وجدان کے نور کی ہدایت، فکر شاعر کی دستگیری نہ کرے۔ عقل محض سے یہ راہ طے نہیں ہوتی۔

وجدان کی حکمرانی کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ عقل کو شاعری سے بالکل خارج کر دیا جائے کیونکہ انسانی ذہن کی کوئی قوت شاعری کی دُنیا سے الگ نہیں کی جاسکتی۔ انسانی زندگی میں ہم برابر یہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ کہیں عقل، وجدان پر غالب آجاتی ہے اور کبھی وجدان عقل پر۔ اسی طرح شاعری میں بھی یہی جنگ و جدل جاری ہے

شاعری اور جذبات میں وہی رابطہ ہے جو جسم و روح میں جس طرح روح کی پاکیزگی اور نفس و ضمیر کی طہارت پر وجود کی عزت و قدر و منزلت کا انحصار ہے۔ اسی طرح جذبات کی شعری صداقت و بلندی پر شاعری کی قدر و قیمت بڑی حد تک منحصر ہے۔ اُردو شاعری میں جان صاحب، سعادت یار خاں، رنگین اور میاں چرکین کے کلام کو جو کم وقعتی حاصل ہے اس کا خاص سبب یہی ہے کہ ان کے جذبات میں وہ بلندی و رفعت موجود نہیں، جو میر و غالب، ولی اور مومن کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

مشہور انگریزی شاعر شیلی (Shelley) کی رائے میں شاعری جذبات کی مصوری کا نام ہے اور کارلائل کی نظر میں شاعری موسیقیانہ خیال ہے۔ گویا ان دو ناقدوں کی نظر میں شاعری میں حسب ذیل صفات ہونا چاہئے:۔ (۱) جذبات۔ (۲) مصوری۔ (۳) موسیقی اور (۴) خیال و افکار

بے شک اگر شاعری، جذبات کی صداقت و رفعت، پاکیزگی اور لطافت، آئین مصوری و کمال موسیقی اور تازگیِ فکر و خیال پر نظر رکھے تو وہ فنون لطیفہ کی بہترین نمایندہ بن جائے گی۔ بشرطیکہ وہ ان اوصاف سے بھی متصف ہو، جو شعری صنعت گری کے لئے ضروری ہیں، چنانچہ انگریزی میں ٹنی سن کی نظم (The Sleeping Beauty) "حسن خوابیدہ" اور اُردو میں اقبال کی متعدد نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں صداقتِ جذبات اور خیال و افکار کی تازگی غیر معمولی شگفتگی پیدا کر رہی ہے۔

شاید کہا جائے کہ اُردو شاعری، جذبات کی رفعت اور احساسات کی نزاکت و پاکیزگی کی جو مثالیں پیش کر رہی ہے وہ جدید شاعری کا نتیجہ ہیں جن پر مغربی ادب و شعر کا گہرا اثر ہے۔ بے شک مغربی شاعری نے آزاد اور حالی کی وساطت سے مشرقی شاعری کو متاثر کیا تاہم قدیم اُردو شاعری میں بھی انسانی فطرت کی تنقید و ترجمانی اور جذبات عالیہ کی عکاسی و مصوری انتہائی کمال سے کی گئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہوگیا — میر

خانہ خراب عشق نے دُنیا سے کھو دیا — کیا پوچھتے ہو حال ہمارا سُنا نہیں — فغاں

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر — کیا دوانے نے موت پائی ہے — میر

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا — میر
غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے — پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا — قائم
میرے غم خانہ کی قسمت جب رقم ہونے لگی — لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے — غالب
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو — "
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں — انشاء
انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاتا — چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے — انیس

ان اشعار کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر بہ آسانی پہونچ سکتے ہیں کہ شاعری فطرت انسانی کے چہرے سے نقاب اٹھا دیتی ہے اور ہمیں چھوٹی چھوٹی باتیں بہت انوکھی اور دلچسپ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ہمارے قدیم غزل گو شعراء نے انسانی فطرت کی صداقتوں اور حیات انسانی کی سچائیوں کو جس اختصار اور جامعیت سے بیان کیا ہے، اس کی مثال مغربی شاعری میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مغربی شعراء کا طرز بیان زیادہ تر بیانیہ ہوتا ہے۔ پہلے وہ کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں اور پھر اپنے تاثرات و احساسات پیش کرتے ہیں۔ اہل مغرب کا دل و دماغ عموماً واقعہ بینی اور تجزیہ پسندی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بہ خلاف اس کے مشرق کے نازک خیال شعراء اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار پر زیادہ توجہ کرتے ہیں۔

ہماری قدیم شاعری کے یہ نمونے صاف طور سے یہ بات واضح کرتے ہیں کہ:۔ (۱) انسانی فطرت کی بہترین ترجمانی ان میں جابجا موجود ہے (۲) کائنات کو جس وجدانی اور شعری نگاہ سے ان شعراء نے دیکھا، اس میں اچھی خاصی وسعت اور گہرائی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جو وسعت اور تنوع انگریزی شاعری میں ملتا ہے، وہ اردو غزل گوئی میں موجود نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک گہرائی کا تعلق ہے اردو شاعری مغربی شعر و شاعری سے کسی طرح کم نہیں اور اردو کے ممتاز شعراء نے جب فطرت و حیات کی طرف توجہ کی تو فکر و تخیل کی مدد سے جو اشعار ظہور میں آئے، وہ انسان کے جذبات عالیہ کو تسکین دینے کے لئے آج بھی موثر ہیں۔ مثلاً میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے وہ حصے جہاں وہ عاشق شہزادی کے جذبات الفت کی ابتدائی حالت کی مصوری کرتے ہیں یا مثنوی زہر عشق کے وہ اشعار جن میں "اس کی" وفات اور وصیت کا ذکر ہے؛ یا یہ اشعار:۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق ہے اس کارگہ شیشہ گری کا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا
رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں مری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے — نہ کھینچو تم جو اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا
ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا نہ گیا

مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اُسے
پھر وہ تا صبح میرے جی سے بھلایا نہ گیا

رواج عشق کے آئین وہی ہیں کشور دل میں
رہ رسم و وفا جاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھکر

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اُردو شاعری کا گراں بہا سرمایہ غزل ہے اور اس لئے ان کی غزلیہ شاعری زیادہ تر داخلی شاعری ہے چونکہ اہل مشرق کا فطری میلان یہی ہے کہ وہ داخلیت سے زیادہ دلچسپی نہیں - پھر چونکہ اہل مشرق فلسفیانہ مسایل میں ( ) کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے اور شعر و ادب میں واقعہ نگاری سے زیادہ خیال آرائی پر توجہ دی اسلئے یہاں کی شاعری میں رزمیہ واقعات کو وہ جگہ نہ مل سکی جو یونان میں ہومر کی بدولت حاصل ہوئی - یہاں دل کی آنکھ سے کام زیادہ لیا گیا ہے اور وہاں چہرہ کی آنکھ سے - یہی سبب ہے کہ مغربی شاعری میں بیانیہ اور واقعاتی شاعری کا جو سرمایہ ہے وہ ہمارے یہاں موجود نہیں - اگر فردوسی کی شاہنامہ، والمیک کی رامائن اور میر انیس کے مراثی کو نظر انداز کر دیا جائے تو مشرق میں یقیناً بیانیہ اور رزمیہ شاعری کی کمی محسوس ہوگی ــــ تاہم معیار اور پختگی کے اعتبار سے مشرق کی بیانیہ شاعری بھی کم گرانقدر نہیں -

جب اُردو شاعری نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو ماحول کی صعوبتوں نے اس کی راہ میں دقتیں پیدا کر دیں نتیجہ یہ ہوا کہ خارجی شاعری کا نشو و ارتقاء زیادہ نہ ہو سکا - سیاسی طوائف الملوکی نے افکار و خیالات میں وہ تازگی اور وحدت و پختگی پیدا نہ ہونے دی جو یوروپ کے بعض شعراء مثلاً ڈانٹے، گوئٹے، ورڈس ورتھ اور کیٹس کے یہاں پائی جاتی ہے ہمیں اس کا کھلا ہوا اعتراف ہے کہ وہ پختگی فکر اور حکیمانہ نظر جو شیکسپیر اور ملٹن وغیرہ کے کلام میں پائی جاتی ہے، اُردو شعراء میں کم ہے، میر اور غالب نے البتہ فلسفہ الٰہیات اور تصوف سے مدد لی اور بعض عمدہ باتیں کہہ گئے - مثلاً جبر و اختیار کا مسئلہ کہ انسان مجبور محض ہے اور خدا فاعل مختار - میر نے اس کو یوں ادا کیا ہے

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

یہ خیال کہ صاحب فکر و نظر صدیوں میں کہیں جاکر پیدا ہوتا ہے - میر کی شاعری میں اس طرح محفوظ ہے :-

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردوں سے انسان نکلتے ہیں

یا یہی خیال اخلاقی نقطہ نظر سے اس طرح کہ :

میر صاحب تم فرشتہ ہو تو ہو
آدمی ہونا بڑا مشکل ہے میاں !

یا غالب کا یہ شعر لیکن دوسرے نقطۂ نظر سے :۔

بسکہ دشوار ہے ہر چیز کا آساں ہونا   آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ خیال کہ توحید خالص کا لازمی نتیجہ رسوم سے احتراز ہے، غالب کے یہاں اس آب و رنگ سے آراستہ ہے :۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ خیال کہ جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا یعنی ایک ہستی قدیم ازلی ہے، جب کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ——— غالب کے نگارخانۂ ادب میں شعر و سخن کے دلکش لباس میں یوں آراستہ کیا گیا :۔

نہ تھا جب کچھ خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا   ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

تصوف کا مشہور مسئلہ ہے کہ ہستی مطلق کا جلوہ اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب نفس معرفت میں کمال حاصل کر لیا جائے، میر نے اس خیال کو شعری حُسن صنعت گری کے ساتھ اس طرح پیش کیا :۔

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم   یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

مایا فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ہستی فریب ہے، اس سے الگ ہی رہنا بہتر ہے۔ ہندوستانی تصوف کا یہ خیال اُردو شاعری اور ادب میں بھی بہت مقبول ہے، چنانچہ غالب اس خیال کو اس طرح پیش کرتا ہے گویا اس میں ان کی زندگی کا تجربہ بھی پوشیدہ ہے :۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج   شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کے اس شعر میں قنوطی رنگ کے باوجود، وہ وقت شفا موجود ہے جو غمگین دلوں کو تسکین اور ربودگی کی لذت بخشی ہے اور یہی باعظمت شاعری کی بڑی خوبی ہے۔

کیٹس نے لکھا ہے کہ ایک اچھی نظم میں چند خصوصیات کا ہونا ضروری ہے (۱) خیال کی ابتدا اس طرح ہو جیسے طلوعِ سحر کے وقت مہر عالم تاب کی پُر سکون آمد (۲) نظم میں خیال کا عروج فطری رفتار سے ہو اور (۳) نظم کا اختتام اس طرح ہو کہ فن کاری کی رنگینیوں اور شعر کی معنوی تاثیر سے ہماری روح سکون اور اطمینان محسوس کرنے لگے اور یہ خصوصیات ہم کو اُردو شاعری میں اکثر نظر آتی ہیں۔ اور میر۔ درد۔ ذوق۔ مومن۔ انیس۔ آتش اور غالب کے یہاں اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انھوں نے شاعری کو وہ وسعت تو نہیں بخشی جو شیکسپیر، اسپنسر اور ملٹن سے انگریزی کو نصیب ہوئی لیکن خالص عشقیہ شاعری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

ہماری شاعری میں نصرتی، وجہی، ولی، سودا، نظیر اور میر حسن ایسے شاعر ہیں جن کی طبیعت میں خارجیت پسندی

زیادہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ماحول و معاشرت پر اس طرح غور کیا جیسے ناول نویس انسانی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے کوئی شک نہیں کہ میر انیس نے رزمیہ جذبات کو مراثی میں عمدہ طریقے پر ظاہر ہے لیکن سچ پوچھئے تو ان کی شاعری مرثیہ نگاری کے سوا اور کچھ نہیں ہے - وہ نہ رزمیہ جذبات کی ترجمان ہے نہ عشقیہ داستان و تاثر کی بلکہ وہ شدید مخلصانہ اظہار ہے ان اشک ہائے درد و الم کا جو شاعر کو حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا تصور کرکے بے چین کئے دیتے ہیں - ان کی فن کاری اور موضوع سخن سب سے جدا ہے - انیس اپنے جہان سخن کو خود آباد کرتا ہے اور یہی ہر صاحب نظر فن کار کی انفرادیت ہے !

جذبات عشق کا تجزیہ اُردو میں میر حسن اور نظیر اکبر آبادی، پنڈت دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق لکھنوی سے بہتر اور کوئی نہ کر سکا - ہو سکتا ہے کہ ان کے کلام میں عریاں نگاری کا عیب ہو، لیکن ان کی جذبات نگاری میں خیال کی صداقت اور فطری تازگی ضرور ملے گی - میر حسن، نظیر اکبر آبادی اور مرزا شوق لکھنوی اُردو کے تین ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی مثنویوں میں ایک حد تک خارجی پہلو کو برتا ہے - یہی سبب ہے کہ ان کی مثنویوں میں ہم کو کہیں کہیں شیلی، بائرن، کیٹس کی مصورانہ شاعری کا خیال آنے لگتا ہے -

انسانی فطرت کے وہ جذبات جو حسن قدرت سے متاثر ہو کر ہمارے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اُردو شاعری میں مقدار کے اعتبار سے کم ہیں، میر انیس نے طلوع و غروب کے جو مرقعے ہمارے سامنے پیش کئے ان میں حسن اور صداقت تو ضرور ہے لیکن ان پر مرثیہ کا اثر غالب ہے -

سحر البیان اور شوق قدوائی کی مثنویوں میں حسن فطرت کو ایک حد تک نمایاں کیا گیا ہے مگر یہ ایسا ہی ہے جیسا دال میں نمک ! — اُردو شاعری کی یہی وہ کمزوری تھی جس پر آزاد اور حالی نے توجہ کی اور پھر اُردو شعراء کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا جس نے متعدد نظمیں حسن فطرت اور قدرت کی نیرنگیوں پر وقف کر دیں -

ولی کمال خاں ایم - اے

مجھ کو اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی
ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اس کے مداح موجود ہیں - دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں - اس دوا کے مقابلہ میں سینکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں، اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آب حیات کے تصور فرمایئے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے - ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی، اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سُرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی - یہ دوا نئی نہیں ہے ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں - یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے، القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی - تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے -

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس - فہرست دواخانہ مفت منگایئے -
میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے -
نقالوں سے ہوشیار رہئے، میری ۲۸ سالہ شہرت پر غور فرمایئے

پتہ :- **حکیم ثابت علی پنج زبان، خوش کلام**
(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ - یو - پی

کلام نازش پرتاب گڈھی

تم نے تو آج کھو ہی دیا تھا وقارِ غم
وہ تو یہ کہئے سعیِ کرم رائیگاں گئی

جانے کون اُٹھا ہے اسکے آستانے سے
حُسن خود نکل آیا اپنے ناز خانے سے
ظلمتیں نہ کم ہوں گی اشکِ غم بہانے سے
ہو گی شامِ غم روشن صرف مُسکرانے سے

کچھ اس ادا سے میری طرف وہ نظر اُٹھی
جیسے کہ میں نیا ہوں، نیا غم، نئے حواس

دے رہے ہیں صدائیں وہ مجھکو
میں سمجھتا ہوں دل کی دھڑکن ہے

ستارے ڈوبتے ہیں سانس اُکھڑی جاتی ہے
یہ وقت وہ ہے کسی کا اب انتظار نہیں
ستارے مجھ سے دمِ صبح کہہ گئے نازش
جو ختم ہو نہ سحر پر وہ انتظار نہیں

کلام عرشی بھوپالی

یہ رات سہانی، یہ موسم، یہ مست ہوا، مخمور فضا
اے کاش کہ ایسے عالم میں وہ جانِ تمنا آجائے
دز دیدہ نگاہی پر ان کی محفل میں اشارے ہوتے ہیں
ایسا نہ ہو میری نظروں پر الزام تماشا آجائے
بیتابیِ دل کے اِن نازک لمحوں کا تصور تو کیجئے
جب عہدِ محبت ہوتے ہی فرقت کا زمانا آجائے

بیانِ درد و اظہارِ الم ممکن سہی لیکن
میں کن آنکھوں سے دیکھوں گا ترے حسنِ پشیماں کو
تری نیچی نظر کی یاد کا عالم ارے توبہ
چبھو کر دل میں جیسے توڑ ڈالے کوئی پیکاں کو

ان کا خیال ان کی تمنا ہے ان کا غم
کیا کیجے عشق پھر بھی اگر ناصبور ہے

کلام کلیمؔ برنی

ہٹ گئیں نظروں سے نظریں میکدہ سا لُٹ گیا — مل گئیں نظروں سے نظریں میکشی ہونے لگی

بارِ خاطر گر نہ ہو تو اس طرف بھی اک نظر — پھر مرے دردِ محبت میں کمی ہونے لگی

اوّل اوّل چھیڑ انسے آنکھوں آنکھوں میں ہوئی — آخر آخر روح سے وابستگی ہونے لگی

اے کلیمؔ اس جانِ گلشن کا نظارہ کچھ نہ پوچھ — میں تو کیا پھولوں پہ طاری بیخودی ہونے لگی

رقص کرتی کائناتِ عشق میں روحِ نشاط — تم نے دیکھا ہی کہاں قلبِ پریشاں کی طرف

کلام دردؔ سعیدی ٹونکی

کچھ ایسے گر گئے ہیں کسی کی نظر سے ہم — ہوں جیسے ہر نگاہ میں نامعتبر سے ہم

اب اُن کے در سے کوئی تعلق نہیں مگر — سر پھوڑتے ہیں آج بھی دیوار و در سے ہم

اکثر بیانِ غم میں اُلجھتے ہیں اس طرح — جیسے کہ اپنے حال سے ہوں بے خبر سے ہم

دیکھے ہیں انقلاب شب و روز ہم نے دردؔ — کچھ مطمئن نہیں ہیں نمودِ سحر سے ہم

یہ چونکا دیا آج کس کی ہنسی نے ؟ — بہت طول کھینچا غمِ زندگی نے ؟

نہ وہ راستے ہیں، نہ وہ منزلیں ہیں — بدل ہی دیا جیسے رُخ زندگی نے

ابھی آدمی کا ہے دُشمن — ابھی خود کو سمجھا نہیں آدمی نے

جہاں سیکڑوں بتکدے ڈھا دئے ہیں، — خُدا بھی تراشے ہیں کچھ بندگی نے

دلچسپ معلومات

امریکہ کا شاندار ہوٹل نیویارک میں سب سے پہلا شاندار ہوٹل ولیم ایسٹر اور اُسکے چچا زاد بھائی جیکب ایسٹر نے بنوایا تھا اسکا ٹھیکہ بعد میں ایک شخص برکٹ نے لے لیا اور ایسے یورپین فیشن کے مطابق آراستہ کیا۔ نغمہ و سرود کی چوکیاں، رقص گاہیں اور لوگوں کے مستقل قیام کا انتظام یہ ایسی باتیں تھیں جن کے باعث وہ بہت جلد مشہور ہوگیا۔ لیکن جب شہر کی تعمیر نو کا مسئلہ درپیش ہوا تو ۱۹۲۹ء میں اس بات کا اعلان کردیا گیا کہ اس ہوٹل کو اُڑا دیا جائے اور اسکی جگہ امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی داغ بیل ڈال دی جائے جسے دُنیا کی سب سے اونچی عمارت ہونی چاہئے۔ اس پر بہت جلد عملدرآمد کیا گیا، لیکن لوگوں کے دل و دماغ سے یہ ہوٹل محو نہ ہوسکا اور نیویارک کے چند لکھ پتیوں نے ۱۹۳۱ء میں چالیس لاکھ ڈالر کے صرف سے اسی نام کا ایک دوسرا ہوٹل بنوانا شروع کیا جو ۴۷ منزل کی عالیشان عمارت تھا اور جس میں ۲ ہزار ۲ سو کمرے تھے۔ جب اس کا افتتاح ہوا تو ۲۵ ہزار تماشائی اسکے دیکھنے کے لئے آئے اور صدر امریکہ نے مبارکباد کہلا بھیجی ــــ اس وقت اس کا شمار نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہوتا ہے اور امرا و روساء یہیں قیام کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ٹیلیفون سے پوچھا "کیا بادشاہ سلامت موجود ہیں" نگراں نے فہرست پر سرسری نگاہ ڈال کر پوچھا "آپ کی مراد کس بادشاہ سے ہے" کیونکہ اُس وقت ہوٹل میں شاہ یونان اور شاہ یوگوسلیویا دونوں مقیم تھے۔

اسی طرح ایک موقعہ پر اس ہوٹل میں بیک وقت ۲۵۰ خارجی سیاست داں اور ۹ سفیر موجود تھے۔

یہ ہوٹل ضیافتوں کے لئے بہت مشہور ہے اور حکومت امریکہ اگر اپنے مہمانوں کو اس ہوٹل میں نہیں ٹھیراتی تو وہ اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ایک موقعہ پر جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی ہونے والی تھی تو احکام موصول ہونے پر یہاں ۲۰۰ کمرے خالی کرادئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ اُنکا سوئچ بورڈ بھی الگ کردیا اور اُس پر ایسے نگراں مقرر کئے جو انگریزی، فرانسیسی اور روسی تینوں زبانیں جانتے تھے ــــ انتظام طعام کی خوبی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک موقع پر اس نے ۳ ہزار مہمانوں کے لئے ۴۲ ہزار چاندی اور ۳۶ ہزار چینی کے ظروف اور ۱۲ ہزار گلاس آناً فاناً مہیا کردئے، اُس وقت وہاں سات بڑھئی، سات ماہرین برق، ۱۵ مختصر نویس اور چار درجۂ حرارت پر قابو رکھنے والے ماہر بھی موجود تھے کھانا ختم ہونے پر جھوٹے برتنوں کو ۱۴۳ نوکر سمیٹ لے گئے اور ۵۰ نوکروں نے صرف آدھ گھنٹہ میں انھیں دھو ڈالا۔

۱۹۵۳ء میں اس کی آمدنی کا اندازہ ۱۲۰ لاکھ کیا گیا تھا۔

مغربی اہل قلم کی دولت آفرینی ہرچند اسکی پوری تفصیل تو معلوم کہ مغرب کے بہترین اہل قلم کتنا کماتے ہیں، لیکن وقتاً فوقتاً جو اعداد و شمار اس باب میں شائع ہوئے ہیں، اُن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مغرب میں قلم کی دولت آفرینیوں کا کیا عالم ہے۔

برطانوی مصنفین میں Sir Jhons Barrie بڑا دولتمند انسان سمجھا جاتا تھا۔ اسنے اپنے بعد ۴۷۰۰۰ پونڈ نقد اپنے ورثاء کے لئے چھوڑا اور تمام عمر اُمور خیر میں اپنی دولت صرف کرتا رہا۔ رڈیارڈ کپلنگ کی دولت کا اندازہ بھی کم و بیش اتنا ہی کیا جاتا ہے ــــ

چارلس ڈکنس کا زمانہ ان سے بہت پہلے ہوا ہے، جب مغرب میں تعلیم اتنی عام نہ تھی، لیکن پھر بھی تمام عمر اسنے فراغت سے بسر کی اور جب مرا تو

۹۳۰۰۰ پونڈ کی املاک چھوڑ گیا۔ جارج مور نے اپنے بعد ۷۵۰۰۰ پونڈ اور ٹامس ہارڈی نے ۹۱۰۰۰ پونڈ کی جائیداد چھوڑی۔ اسٹانلی وے مین نے جو اپنی تاریخی رومان نگاری کے لحاظ سے بہت مشہور تھا، ایک لاکھ پونڈ اپنے بعد چھوڑے۔ جان گالسورڈی نے ۸۸۰۰۰ پونڈ، اور رائڈر ہیگرڈ نے ۶۱۰۰۰ پونڈ۔ انفرادی حیثیت سے کتابوں کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ ایلین ہرڈی کی صرف ایک کتاب Anthony Adverse کی رائلٹی کا معاوضہ ابتدائی چار سال میں ۴۰ ہزار پونڈ سالانہ ملا۔ ایک اور مصنف بیری کو اسکی کتاب Little Minister کی رائلٹی ۵۰ ہزار پونڈ ملی، اور میری کوریلی کو اس کی ایک کتاب پر ۲۰ ہزار پونڈ۔ ایلیس ہیگین رائس نے اپنی صرف ایک کتاب سے ۲۰ ہزار پونڈ کمائے۔ یہ کتاب صرف ۲۰ ہزار الفاظ کی تھی اسلئے اسکو گویا فی لفظ ایک پونڈ ملا۔ کپلنگ کو ایک بار آٹھ فسانوں کا معاوضہ صرف انگلستان کی رائلٹی سے ۴۲ پونڈ اور دوسرے ممالک کی رائلٹی سے ۸ ہزار پونڈ۔ اسکی ایک کتاب Kim ہے اسکی رائلٹی اسے ۵ ہزار پونڈ ملی اور ایک اخبار نے اسکی صرف ایک مختصر نظم کا معاوضہ ۲۰۰ پونڈ دیا۔ سومرسٹ مانگھم کو ایکبار صرف ایک فسانہ کا معاوضہ ایک ہزار پونڈ ملا۔ بلڈاگ ڈرمنڈ کے سلسلہ کی کتابوں کا معاوضہ سترہ سال میں اسکے مصنف کو ایک لاکھ پونڈ ملا اور بیوری ٹکوس نے اپنے سلسلہ کی کتابوں سے ۲۵ ہزار پونڈ کمایا۔ سوانح عمری کی کتابوں میں لارڈ مارلے کو اپنی کتاب لائف آف گلیڈسٹون سے ۱۵ ہزار پونڈ ملے، اور مسٹر چرچل نے اپنے باپ کی سوانح حیات لکھنے پر ۸ ہزار پونڈ کمائے وارک ڈیپنگ اور Milne کو اپنی تصانیف سے ۳۰ ہزار پونڈ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے اور بڈنگٹن کلانڈ اپنے مضامین سے ۲۵ ہزار سالانہ کماتا ہے۔ ہالی ووڈ میں مصنفین کو ۱۰۰ سے ۲۰۰ پونڈ تک فی ہفتہ ملتا ہے۔ فلم کے لئے فسانے اور ڈراما لکھنے والوں کو ہر فسانہ یا ڈرامہ کے لئے ۱۰۰۰ سے ۳۳ ہزار پونڈ تک ملتا ہے۔

دی مغل لائن لمیٹیڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازران کمپنی)

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ۔

بمبئی سے :- عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی جہاز بھیج سکیں گے۔

تفصیلات کے لئے لکھئے :-

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹیڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

مطبوعات موصولہ

نکتہ چین ہے غم دل

ترجمہ ہے برنارڈ شا کی مشہور تمثیل (Man & Superman) کا۔ اس کے مترجم آغا افتخار حسین بی، اے نے ترجمہ میں ایک بدعت تو یہ کی ہے کہ انگریزی نام بدل کر ہندوستانی نام رکھے ہیں اور دوسری یہ کہ کہیں کہیں حذف و اختصار سے بھی کام لیا ہے۔

برنارڈ شا کا یہ ڈرامہ اس میں شک نہیں، بڑا معرکۃ الآرا ڈرامہ ہے جس سے مصنف کی تمام ادبی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں اور اس کا ترجمہ کرنا آسان نہ تھا، لیکن فاضل مترجم نے بڑی قابلیت سے اس فرض کو انجام دیا ہے۔ زبان صاف اور جملے سلجھے ہوئے، لیکن اگر مترجم چاہتے تو عبارت میں اس سے زیادہ صفائی و روانی پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کا نام "نکتہ چین ہے غم دل" کیوں رکھا گیا، اس کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا حرج تھا اگر غالب کا پورا مصرعہ لے لیا جاتا۔ میری رائے میں "انسان و انسان اعلیٰ" بہتر ہوتا۔

طباعت و کتابت نفیس ہے اور کاغذ سفید و دبیز۔ حجم ۲۸۸ صفحات۔ قیمت تین روپیہ چار آنے، ناشر:- نفیس اکاڈیمی حیدر آباد دکن۔

حیرت انگیز ملاقات

ترجمہ ہے ایک مصری فاضل عبداللہ عنان کی عربی تصنیف کا جس کا نام درج نہیں کیا گیا (حالانکہ ضروری تھا) یہ کتاب اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں تاریخ اسلام کے ایک خاص اہم واقعہ کو لیکر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کوئی تاریخی اہمیت تو نہیں رکھتی، لیکن تبصرہ تاریخی کی حیثیت ضرور رکھتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ وہ ابواب جن میں عربوں کی دینی سیاست، قرون وسطیٰ کی غلامی، اسلامی بحری سیاست، مارکوپولو کی سیاحت اور مذہبی افسانوں سے بحث کی گئی ہے، بہت دلچسپ ہیں۔ ترجمہ بہت صاف و شگفتہ ہے لیکن بعض جگہ مقامات کے نام کو واضح نہیں کیا گیا۔ عرب مصنفین، ناموں کو بھی اپنی زبان میں ڈھال لیتے ہیں اور ان کی صورت بالکل بدل جاتی ہے، ترجمہ میں اس کی وضاحت ضروری تھی۔ مثلاً مارکوپولو کے نام کے ساتھ بندقی لکھا گیا ہے، اور کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ بندقی کیا چیز ہے۔ مترجم کو چاہئے تھا کہ حاشیہ میں ظاہر کر دیتے کہ وینس کو اہل عرب بندق یا بندقہ کہتے ہیں

ضخامت ۱۰۱ صفحات۔ طباعت و کتابت وغیرہ بہت نفیس، قیمت تین روپیہ بارہ آنے۔ ناشر: نفیس اکاڈیمی حیدرآباد دکن

اسلامی نظریۂ اجتماع

جناب حیدر زماں صدیقی کی تصنیف ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں اجتماعیت و قومیت پر گفتگو کی گئی ہے لیکن خالص اسلامی نقطۂ نظر سے، عقل و ضرورت کو سامنے رکھ کر اظہار خیال نہیں کیا گیا۔ اس لئے یہ کتاب صرف اُن لوگوں کے کام کی ہے جو مصالح قوم و تمدن میں بھی مذہب سے استناد ضروری سمجھتے ہیں اور بنابراں اس کی افادیت بہت محدود ہے۔

اسلام کا نظام اجتماع اور نظریۂ سیاست و قومیت خواہ کتنا ہی اچھا اور مکمل کیوں نہ ہو، لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل کی چیز ہے اور عہد حاضر میں جبکہ انسانی آبادی کو ہزاروں پیچیدہ مسایل تمدن و سیاست سے واسطہ پڑ رہا ہے، وہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے جوں کا توں ہمارے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ ہر قانون وقت کے لحاظ سے مرتب ہوتا ہے اور حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل ضروری ہے، پھر اگر اسلام کا قایم کیا ہوا نظام اجتماعی بھی کوئی قانون ہے، تو اس میں بھی حالات کے لحاظ سے تغیر ضروری ہے مگر افسوس ہے کہ اس موضوع پر قلم اُٹھانے والے اکثر و بیشتر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اس کتاب میں سب سے زیادہ غیر افادی بلکہ ایک حد تک گمراہ کن باب وہ ہے جس میں قومیت پر بحث کی گئی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں قومیت کی تعیین مذہبی کتابوں اور علماء قدیم کے فتووں کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے سخت مضرت رساں ہے۔

کاش اس کتاب میں کوئی ایسی بات بھی ہوتی جس سے ایک غیر قدامت پرست اور غیر متشدد مسلمان بھی فایدہ اُٹھا سکتا۔ ضخامت ۲۸۴ صفحات، طباعت وغیرہ نفیس۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنے۔

ناشر:۔ نفیس اکاڈیمی حیدر آباد دکن۔

ہندوستان کی سیاسی اُلجھنیں

ترجمہ ہے مولانا محمد علی مرحوم کے اس انگریزی خطبہ کا جو انھوں نے کوکناڈا میں صدر کانگرس کی حیثیت سے دیا تھا۔ یہ خطبہ انگریزی کے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ایک بہترین سیاسی مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ حضرات جو ہندوستانی تحریک آزادی کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

ترجمہ شاہین فاروقی نے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ حجم ۱۳۸ صفحات، قیمت دو روپیہ بارہ آنے۔

ناشر:۔ نفیس اکاڈیمی حیدر آباد دکن۔

اُردو ہندی ہندوستانی

ایک پمفلٹ ہے سجاد ظہیر صاحب کا لکھا ہوا، جس میں انھوں نے اُردو، ہندی اور ہندوستانی تینوں کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق پر روشنی

ڈالی ہے۔

زبان کا مسئلہ حصول آزادی سے قبل ہی بہت اُلجھا ہوا تھا، لیکن اب حصول آزادی کے بعد تو اس نے اُردو داں طبقہ کو بہت فکرمند بنا دیا ہے۔ سجاد ظہیر صاحب نے جو موجودہ ترقی پسند ادیبوں کے سرخیل ہیں، اس مسئلہ پر نہایت سلجھی ہوئی بحث کی ہے اور اخیر میں بتایا ہے کہ ہندی اور اُردو دونوں کے بقا کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ :- کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی۔

فرہنگ غالب

تالیف ہے مولانا عرشی رامپوری کی جس میں انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور اُردو لغات کی وہ تمام تحقیق و تشریح پیش کر دی ہے جو خود مرزا غالب نے اپنی تحریروں میں بتائی تھی۔ گویا یہ ایک ایسا فرہنگ یا لغت ہے جسے لکھا تو تھا غالب نے لیکن اس کو ترتیب دیا مولانا عرشی نے۔

مولانا نے غالب پر اس وقت تک جتنا ریسرچ کیا ہے، وہ اس قدر قیمتی ہے کہ اسے اُردو لٹریچر کے مورخین کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کے دیباچہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں نے فارسی زبان کی جو خدمت کی ہے وہ ایرانی ادیبوں سے بھی ممکن نہ ہوئی، غالب اور کلام غالب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ :- ناظم صاحب کتاب خانہ رامپور۔

نئی دُنیا کو سلام

مجموعہ ہے جناب سردار جعفری کی دو نظموں کا۔ پہلی نظم کا عنوان ہے "نئی دنیا کو سلام" اور دوسری نظم کا "جمہور"۔ پہلی نظم تمثیلی انداز کی ہے جس کو ہم منظوم ڈراما بھی کہہ سکتے ہیں یہ نظم ۱۵۵ صفحات کو محیط ہے اور رمزی انداز میں لکھی گئی ہے نظم کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، جس میں حصول آزادی کے بعد کے انسان کا روشن مستقبل پیش کیا گیا ہے۔ نظم کے بعض حصے قدیم شاعرانہ ٹکنک کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اور بعض جدید ٹکنک کے حامل ہیں، جو ردیف و قافیہ اور عروضی توازن سے بے نیاز ہیں۔ سردار جعفری صاحب ترقی پسند جماعت کے ایک ممتاز رکن ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی ادب کے ذریعہ سے قومی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی وہ ایک خاص درجہ رکھتے ہیں ـــــ دوسری نظم جمہور سیاسی مثنوی ہے جو اُردو میں اپنی قسم کی سب سے پہلی چیز ہے۔ ان دونوں نظموں میں ہمیں بہت سی ایسی شاعرانہ بلندیاں بھی نظر آتی ہیں، جن میں نہ صرف غیر معمولی ندرت و لطافت پائی جاتی ہے، بلکہ صداقت و خلوص بھی۔ افسوس ہے کہ جدید ٹکنک کی آزاد اور ساقط الوزن شاعری سے ہم کوئی لطف نہیں اُٹھا سکے، کیونکہ ہم اسکے سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ طباعت و کتابت میں غیر معمولی اہتمام سے کام لیا گیا ہے، اور کاغذ بہت قیمتی لگایا گیا ہے۔

حجم ۱۷۶ صفحات، قیمت تین روپیہ۔ ناشر :- کتب پبلشرز لمیٹڈ۔ ۱۷۔ گن بو اسٹریٹ بمبئی (۱)

مُمتاز

افسانہ ہے عابدی جعفر کا لکھا ہوا۔ جو چھوٹے سائز کے ۹۰ صفحات پر شایع ہوا ہے، سرورق پر عابدی صاحب

کی تصویر کے نیچے ان کی بعض مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کا اشتہار بھی درج ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کا ایک اور ناول اس سے پہلے بھی شایع ہو چکا ہے، جو ہماری نگاہ سے نہیں گزرا۔

فسانہ کی عبارت صاف و سلیس ہے۔ قیمت عہ/ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ کتابی دنیا۔ لکھنؤ

شبنمستان اور رمز و کنایات جناب فراقؔ گورکھپوری کی غزلوں کے دو مجموعے جو حال ہی میں شایع ہوئے ہیں، ان مجموعوں میں ۱۹۱۸ء سے لیکر ۱۹۴۶ء تک کی غزلیں شامل ہیں اور اس رُبع صدی کے اندر مختلف سِنین کی غزلوں کو دیکھ کر فراق کی غزلگوئی کی تدریجی ترقی کا بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ فراق کے کلام میں فنی و لسانی غلطیاں پائی جاتی ہیں، لیکن بااینہمہ ان کے حقیقی شاعر ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، اور ان کے کلام کی معنویت ہمیں ظاہری نقائص کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتی۔ فراقؔ کے کلام میں ہم کو مختلف رنگ نظر آتے ہیں، لیکن میں ان کے جس رنگ تغزل کا دلدادہ ہوں وہ صرف یہ ہے:۔

جہاں میں تھی بس افواہ تیرے جلووں کی — چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا
وہ اک ذرا سی جھلک برق کم نگاہی کی — جگر کے زخم نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا

یہ مجموعہ مجلد عمدہ کاغذ پر شایع ہوا ہے۔ شبنمستان کی قیمت چھ روپیہ ہے اور رمز و کنایات کی تین روپیہ آٹھ آنے، جو سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے مل سکتی ہیں۔

روح کائنات مجموعہ ہے فراقؔ گورکھپوری کی نظموں کا اور اُن رباعیوں کا جو بہ لحاظ موضوع روپ کی رباعیوں سے مختلف ہیں۔ نظموں کی تعداد ۴۸ ہے جن میں سے اکثر غزلیاتی رنگ کی ہیں، لیکن بہت عمیق۔ سب سے طویل نظم "روح کائنات" ہے جس میں "انسان و انسانیت" کی حقیقت کو مرموز لیکن نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ باقی نظمیں بھی بہ لحاظ موضوع و انداز بیان اپنی جگہ مکمل ہیں۔ "ایطاؤ شایگاں" کا عیب، چونکہ فراق کے نزدیک کوئی عیب نہیں، اس لئے اس کا ذکر فضول ہے۔

قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ سنگم پبلشنگ ہاؤس۔ الہ آباد۔

"نگار" کے ایجنٹوں سے

آیندہ جنوری ۱۹۴۸ء کا پرچہ "جوبلی نمبر" ہے، جس کا مفصل اشتہار صفحہ (۲) پر درج ہے۔ اس کی قیمت غیر خریداران نگار سے تین روپیہ علاوہ محصول لی جائے گی اور ایجنٹوں کو فی کاپی ایک روپیہ کمیشن ملیگا۔ اس لئے جلد از جلد اطلاع دیجئے کہ آپ کو کتنی کاپیاں درکار ہیں۔ بار بار آپ اس نمبر کو نہیں منگا سکتے، اس لئے پہلا آرڈر سوچ سمجھ کر دیجئے۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھکر کہا تھا اگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کرکے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ وگلاب اور مختلف قسم
کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا
مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام: "مشکی قوام ہوڑہ"
ٹیلی فون: "ہوڑہ ۵۵۴"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۸۱ ہوڑہ روڈ - ہوڑہ

فاسد مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے

خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

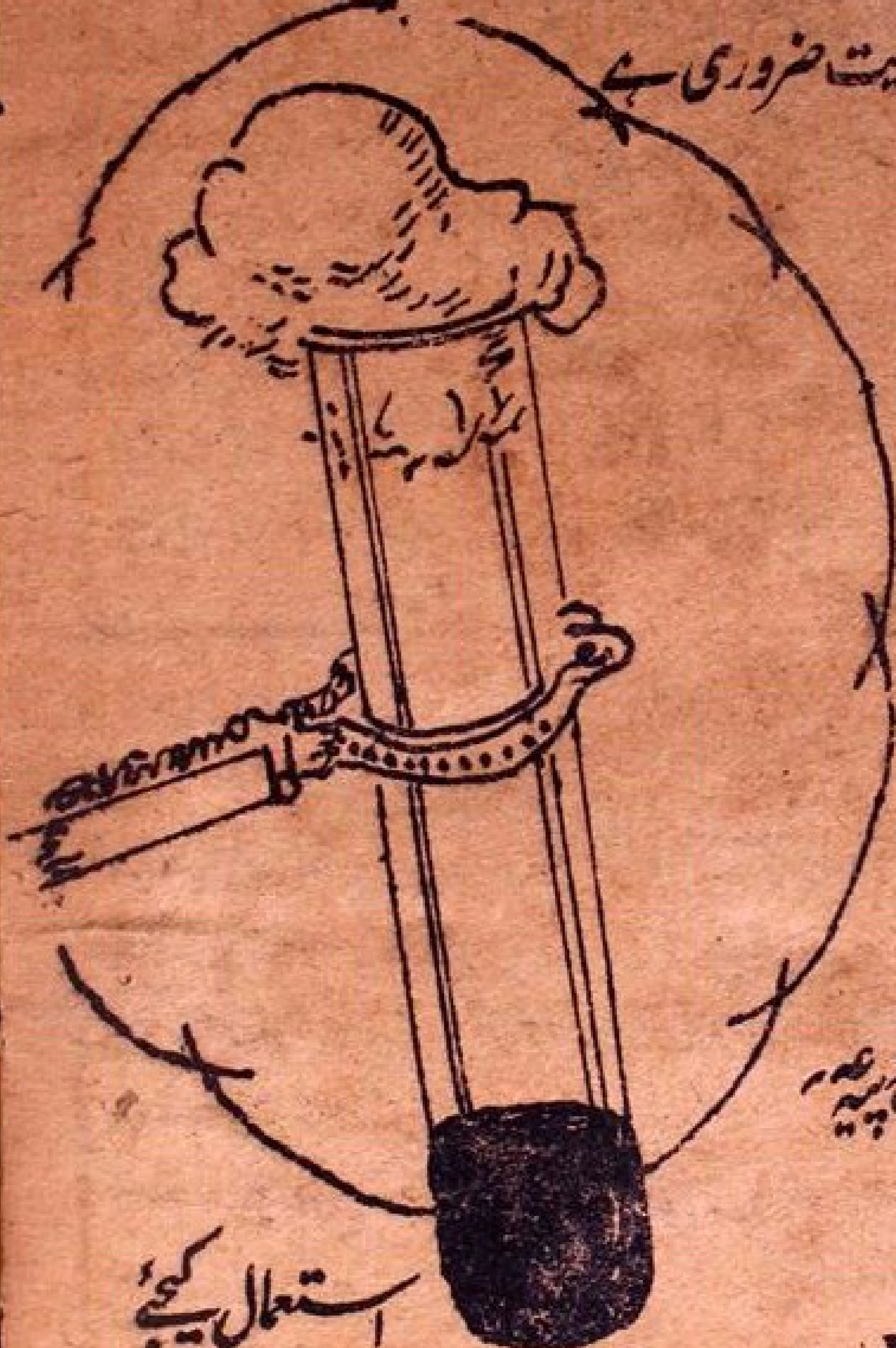

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر اسپیکو فریڈ فیسر ویانا یونیورسٹی نے فیصلہ کرلیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا وہ کلاس پڑھا رہے تھے، اُن کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے، جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا، مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ بھی نہ ہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کرڈالا! صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا

اور یہی ڈاکٹر کا دعوے تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ **صافی** اسی اصول کے پیش نظر طیار کی گئی ہے یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوت مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ ۸ آنہ

استعمال کیجئے

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱— چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲— مادئیّن کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ
علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ، حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

زیر طبع

مطالعات نیاز

حضرت نیاز کے علمی و تاریخی مقالات کا مجموعہ

طیار ہے

من و یزداں

حضرت نیاز فتحپوری کے اُن مذہبی مقالات کا مجموعہ جنھوں نے دنیائے مذہب میں ہلچل ڈالدی تھی

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۴۳ء	جنوری سنہ ۴۲ء	جنوری سنہ ۴۱ء	جنوری سنہ ۴۰ء	جنوری سنہ ۳۹ء
اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول	اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول	یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعرا نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول	(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: نظیر کا مسلک، شاعری پر تبصرہ، نظیر اور عوام، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول	(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: حیات مصحفی۔ اردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء (قرآن نمبر) اس میں ڈاکٹر ٹسڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں۔ حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ ——— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری، مارچ سنہ ۴۶ء یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم و ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں۔ قیمت ہر حصہ کی ہر۔

جنوری سنہ ۴۷ء اس سالنامہ کا نام "ماجدولین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	یک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
یک صفحہ	۴۰۰ روپیہ	۲۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
نصف صفحہ	۲۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۵۰	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۲ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ۔ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند دس روپیہ۔

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

— کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات — اور قواعد طلب کیجئے۔ منیجر

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔